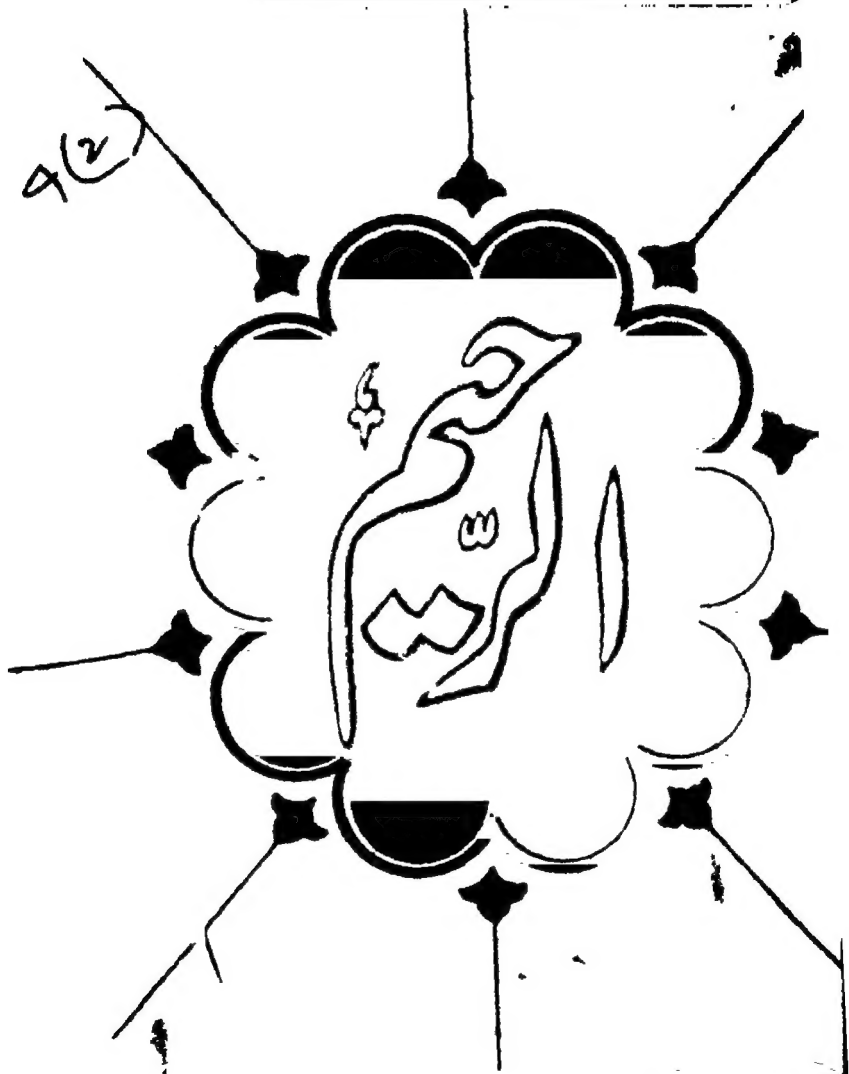


شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ :



پیشہ ورانہ شاعری شاہ ولی اللہ اکیڈمی ۔ صدحید آباد

مجلت ادارت

ڈاکٹر عبدالواحد ملے پوتا،

مخدوم امیر احمد

مدرسہ:

پروم مصطفیٰ قاسمی

# الحکیم حیدر آباد

جلد ۴	مطابق ماہ جولائی ۱۳۶۶ھ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ	نمبر ۲
-------	--	--------

## فہرست مضامین

۸۲	مدیر	شذرات
۸۵	مولانا عبد الحکیم چشتی	تذکرہ شاہ ولی اللہ از الروض المظہور
۹۸	ترجمہ خالد مسعود	قضاۃ اسلامی کے مثالی نمونے
۱۰۸	چودھری عبدالغفور	سترہویں صدی کا ایک مثالی مجاہد { شاہ ولی اللہ کے جدامحمد شیخ وجیہ الدین
۱۲۴	مصنف، ڈاکٹر عبدالواحد بانی پورہ مترجم - سید محمد سعید	{ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ حصہ اول مبادیات - اخلاقیات
۱۴۱	ڈاکٹر بنی بخش قاضی	شیخ الاشراق شہاب الدین السہروردی المقتول
۱۴۵	ابو سلمان شاہجہاں پوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات
۱۵۳	فضل حمید	ہماری چند بنیادی قومی قاسمیاں

## شدت

ایک مسلمان ملک کی سب سے بڑی قوت یہ ہوتی ہے کہ جہاں اس کی حکومت کو دوسرے طبقوں کا تعاون حاصل ہو، وہاں حضرات علماء بھی اس کی پشت و پناہ ہوں، اور ان کا تعاون ملے طے واقف یہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں یہاں تک کہ ہمارے اس دور میں بھی، جب کہ ہر طرف سے یہ شکایت سنی جاتی ہے کہ لوگ مذہب سے دور ہوتے ہیں، عوام مسلمانوں میں اسلام ایک بڑی فعال اور موثر طاقت رہا ہے اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ اس مادی کے اندر مسلمان قوموں میں اپنی حکومتوں کے خلاف جو بھی تحریکیں اٹھیں ان میں سب سے زیادہ کام مذہبی جذبے اور مذہبی اوپل سے لیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض ملکوں میں تو مذہبی تحریکیں ہی واصل آزادی کی تحریکیں تھیں۔

ترکی میں ۱۹۲۳ء سے سیکولر حکومت ہے۔ اور اتنا ترک اور اس کے جانشینوں نے ترکوں کو ذہنی و عملی طور پر لینے میں اپنی طرف سے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی لیکن کچھ سالوں سے ترکوں کو فریضہ حج ادا کرنے کی جو آسانیاں دی گئی ہیں اس کے بعد وہ جس کثیر تعداد میں حج کے لئے آ رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ ترکوں کے ہاں اب بھی مذہب کا بڑا اثر ہے۔

مسلمان عوام کو خواہ وہ کسی بھی مسلمان ملک کے ہوں، اسلام سے غیر معمولی وابستگی اور شغف رکھتے ہیں اور انفرادی طور پر خواہ ان میں کتنی بھی کوتاہیاں ہوں، لیکن اجتماعی لحاظ سے جب وہ کوئی اقدام کرتے یا حرکت میں آتے ہیں تو ان کے ہاں اسلام ہی سب سے بڑی محرک قوت ہوتی ہے بے شک ۱۹۲۰ء کے بعد سے مسلمان ملکوں میں قومیت اور وطنیت کے جذبات ابھر رہے ہیں اور بعض ملکوں میں یہ جذبات کافی شدید بھی ہیں لیکن اسکے باوجود جہاں تک ان ملکوں کے عوام کا تعلق ہے ان میں اسلامیت اور قومیت کچھ اس طرح مل جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان خط و فصل کھینچنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے مثال کے طور پر پاکستان عام ترک یہ تصور نہیں کر سکتا کہ ترکیت اور اسلام دو الگ الگ چیزیں ہیں اسی طرح جیسے عرب قومیت عرب عوام میں عام ہے اس میں اسلامیت زیادہ آتی جاتی ہے۔ جہاں تک نامہ ملک پاکستان کا تعلق ہے اس کا تو مطالعہ ہی اسلام کے



میں سے ہوا۔ اسلام ہی اس کے حصول کی جدوجہد میں سب کے فعال عنصر رہا۔ اہلِ ملک اسلامی بن گئے۔  
اور اس کی قومیت کا دعائیہ و فکری اساس اسلام ہے۔

غرض مسلمانوں میں یکجہت مجموعی اسلام سب سے بڑی حرکت آفریں اور موثر قوت ہے اور اس کی وجہ سے یقیناً وہ حضرات علماء و محدثین و قلم کاروں میں امام بننے کا رعبہ میں غلبہ دے دینی علوم پر توجہ اور ان کے عامل و محافظ ہیں۔ مسلمان عوام و خواص میں ان کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ بالعموم ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے اور اکثر مسائل میں عوام اپنی طرف رجوع کرتے اور ان سے رہنمائی چاہتے ہیں۔

اب اگر ایک مسلمان ملک کی اسلامی حکومت کو حضرات علماء کا ہلچلہ تعاون ملے دونوں میں باہم بیگانگی بعد از غلط فہمیاں نہ ہوں۔ ملکی و قومی معاملات میں ایک فریق دوسرے کو اپنا دست و بازو رکھے اور پچھلے مجموعی دونوں میں باہم اعتماد ہو تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ حکومت کتنی مضبوط ہوگی اور اپنے عوام تک پہنچنے اور ان تک پہنچانے نظر پہنچانے میں کتنی آسانیاں ہوں گی۔

ہیں بڑے اندوس کے ساتھ کہنا چاہتا ہے کہ کچھ عرصے سے حکومت پاکستان اور حضرات علماء کے ایک بڑے طبقے کے درمیان کچھ اس طرح کی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ ان دونوں میں بعد پیدا ہو گیا ہے اور باہم تعاون اور ایک دوسرے پر اعتماد رکھا جائے۔ بدترین مبدعوں ہوتی جا رہی ہیں۔ ہمارے نزدیک نہ یہ حضرات علماء کے حق میں اچھے اور نہ آگے چل کر حکومت کو اس سے فائدہ پہنچنے کا ضرورت اس بات کی کہ یہ غلط فہمیاں اور بُرے دور ہو، اور حکومت اور حضرات علماء ایک دوسرے کے قریب آئیں۔

برصغیر پاک و ہند میں برطانوی عہد حکومت کے دوران سچے و منبر، منہ و عطا و ارشاد اور دینی عربی مدارس حکومت کے اثر و نفوذ سے کلیتہً آزاد رہے اور ان کے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کی یہ ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ اس کی بدولت ہمارے یہاں کے مسلمانوں کی ڈیڑھ سو سال کی محکومی کے اسلام آزاد رہا اور اجنبی غیر مسلم حکومت اس پر براہِ راست زیادہ اثر انداز نہ ہو سکی، اگرچہ بالواسطہ اسے نقصان پہنچانے میں کوششیں پراہر ہوئیں۔ ماسجد دینی مدارس اور مجالس و عطا و ارشاد کا حکومت کی ہر قسم کی دخل اندازی سے محفوظ رہنا اس دور میں بہت ضروری تھا۔ کیونکہ یہ حکومت باہر سے آئے ہوئے لیے لوگوں کی تھی، جنہیں اس ملک سے کوئی ہمبندی نہ تھی، اور پھر وہ عیسائی تھے اور اسلام اور مسلمانوں سے انہیں نہ ہی منافرت اور تاریخی کد تھی۔ وہ علمائے گرام جو اجنبی غیر مسلم حکومت کے عہد میں ماسجد اور

مدارس دینی کی آزادی اور انہیں حکومت وقت کی ہر طرح کی دخل اندازی سے مامون رکھنے کے لئے لگا رہے۔ ہمارے دل کی احترام کے مستحق ہیں۔ اور ان کے اس احسان کو امت دین شریا اور کھے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ان کوششوں سے اس برصغیر میں اسلام کو بچایا اور اس کے شاندار مستقبل کی راہ ہموار کی۔

ایک اجنبی غیر مسلم حکومت کے دور میں تو یہ بہت ٹھیک اور بے حد ضروری تھا کہ ہماری مساجد اور ہمارے دینی مدارس اس حکومت کے اثر سے آزاد رہتے۔ لیکن اب وہ صورت نہیں رہی۔ باوجود ایک ہزار ایک انتظامی خرابی کے جس کی ہر شخص شکایت کرتا ہے یہ ہماری اپنی قومی اور اسلامی حکومت ہے اور اسے پہلے کی اجنبی غیر مسلم حکومت کی سطح پر رکھ کر اس کو اس امر کا مجاز قرار نہ دینا کہ وہ مسلمانوں کے عام دینی معاملات میں ملنے کے لئے اور ان میں دلچسپی لے ایک حقیقت سے بعید بات ہوگی آج سے پہلے نہ کبھی مسلمان حکومتوں کے ہاں یہ ہوا اور نہ آئندہ یہ ہو سکے گا۔ مسجد و منبر، منبر و عطا و ارشاد اور مدارس دینی جس طرح دور برطانوی میں ہمارے ہاں آزاد رہے نہ اس دور سے پہلے کبھی یہ اس طرح آزاد تھے اور نہ آج بھی دوسرے مسلمان ملکوں میں وہ یوں آزاد ہیں۔

ترکمنی، اتاترک سے پہلے وزارت اوقاف تھی۔ جو تمام مساجد اور مدارس کی نگرانی اعلیٰ تھی اتاترک نے اس کی پوری ہیئت بدل دی، اور ائمہ خطباء و عاظ اور مدسین دینی کو بے خاص حکم سے متعلق کر دیا، جس کی پالیسی حکومت بناتی تھی۔ مصر میں معلوم نہیں کب سے مساجد کا انتظام وزارت اوقاف کے سپرد ہے اور نہ صرف ائمہ اور خطباء اس کی طرف سے مقرر ہوئے ہیں۔ بلکہ جمعہ کے خطبوں کے لئے ایک عمومی رہنمائی بھی وزارت اوقاف دیتی ہے۔ جلعلا قاہرہ میں ہیں، جہاز ہزار طالب علم ہیں باوجود ایک خود مختار ادارہ ہونے کے حکومت مصر کی نگاہ میں ہے اور شیخ الازہر کا تقراری کی صوابدید سے ہوتا ہے۔ یہی صورت حال دوسرے مسلمان ملکوں میں ہے۔ ہمارے خیال میں شاید ہی کوئی مسلمان ملک ہوگا جہاں مسجد و منبر، منبر و عطا و ارشاد اور مدارس دینی کو اس طرح کی آزادی ہو، جیسی ہمارے ہاں پاکستان میں ہے۔ پچھلے پچھلے تو یہ آزادی انہیں، انار کی اور نرائے ہے جس کے فوائد بہت کم اور نقصانات بہت زیادہ ہیں

## تذکرہ شاہ ولی اللہ از الروض الممطور

مرتبہ، مولانا عبدالحلیم چشتی

مولانا ذوالفقار احمد نقوی بھوپالی مرحوم نے علامہ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی کتاب شرح الصدور فی احوال الموقی والقبر کی اردو میں شرح لکھی ہے، جو طے الفراسخ فی منازل البرازخ کے نام سے تین جلدوں میں مطبع مفید عام آگرہ سے سنہ ۱۳۳۷ھ میں شائع ہوئی تھی اب نہیں ملتی ہے۔ یہ کتاب عالم برزخ اور احوال آخرت کے موضوع پر اردو زبان میں سب سے زیادہ بسوط، جامع اور مفید کتاب ہے۔ اس کتاب میں جن بزرگوں کے نام دوران شرح آئے ہیں، مولانا ذوالفقار احمد نقوی نے ان کا مختصر تذکرہ الروض الممطور فی رجال شرح الصدور کے نام سے اردو میں کیا ہے جو طے الفراسخ کے ساتھ شائع ہو گیا ہے۔ اس میں بجلہ اور ناموں کے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا نام بھی آیا ہے۔ اس لئے موصوف نے اس میں شاہ صاحب کا بھی تذکرہ نقل کیا ہے۔

مولانا ذوالفقار احمد نقوی کی عربی تحسین پر عیسیٰ رواں اور شگفتہ ہوتی ہے اردو تحسین پر ایسی نہیں۔ اس میں عربی کے بعض بوجھل الفاظ بھی آجاتے ہیں۔ پھر انماذنگارش بھی ان کا یکسر ہوتا ہے۔ تاہم ان کا یہ تذکرہ اردو میں اس حیثیت سے بہت ممتاز ہے کہ اس میں انہوں نے ان اصول

کی نشا پوری بھی کی ہے جو شاہ عبدالرحیم دہلویؒ نے شاہ ولی اللہؒ کی تربیت میں ملحوظ رکھے ہیں اور جن پر تاریکی کا رنڈا رہنے کی ان کو تاکید کی تھی اور وہ اس پر شاہ صاحبؒ تمام عمر کا بند رہے ہیں اس سے شاہ صاحبؒ کی شخصیت کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ سیرت کی تعمیر میں اصول تربیت خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مولانا ذوالفقار علی نقویؒ نے ان اصول کو انفس العارفين سے نقل کر کے ان کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ افسوس ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کے تذکرہ نگاروں نے ان اصول سے یا تو بحث ہی نہیں کی ہے یا پورا اعتبار نہیں کیا ہے۔ اس لئے مولانا ذوالفقار احمد نقویؒ کا تذکرہ خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

ہم نے شاہ صاحبؒ کا تذکرہ الروض المصطور سے مجسمہ نقل کر دیا ہے اور اس میں ذیلی سرخیوں کے علاوہ کسی قسم کا تصرف نہیں کیا ہے۔

(چشتی)

**نام و نسب** ولی اللہ قطب الدین احمد بن عبدالرحیم بن وجیہ الدین الشہید بن معظم بن منصور بن احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قواذن بن قاضی قاسم بن قاضی کیسے عرف قاضی برہان بن عبدالملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین الملقی بن شیر ملک بن محمد عطا ملک بن ابو الفتح ملک بن عمر الحاکم ملک بن عادل ملک بن قاضی بن جریر بن احمد بن محمد شہر یار بن عثمان بن ہامان بن ہمالوں بن قریش بن سلیمان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن حفص بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کہذا ذکرہ فی الامداد فی آثار الابداد۔

پس نسب آپ کا طرف فلیقہ ثانی حفص بن عمر رضی اللہ عنہ کے تیس واسطے سے پہنچتا ہے خود آپ نے اپنا حال برکت اشتمال جزء لطیف نامی رسالے میں لکھا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ

ولادت آپ کی روز چار شنبہ شوال مقدس طلوع شمس سہ ہجودہ میں بارہویں  
**ولادت** قرن ہجری کے واقع ہوئی یعنی ۱۱۸۵ھ میں بعض دوستوں نے عظیم الدین تاج  
 فی الدنیا والدین وایک جماعت صلحاء نے بشارات بسیار حق میں اس فقیہ کے قبل ولادت  
 وبعده ولادت کے دیکھے چنانچہ بعض اخوان اعزہ و فلان اجلہ نے تفصیل ادن و قائلے کی مع اور واقعات  
 کے ایک رسالہ میں ضبط کی اور اس کا نام القول الجلی رکھا ہے۔

**تعلیم کا آغاز** جب پانچویں برس آئی تو مکتب میں بیٹھا ساتویں برس پندرہ برس گوارنے نادر  
 پر کھڑا کیا اور روزہ رکھنے کو فرمایا اور غنتہ بھی اسی برس میں واقع ہوئی۔  
 اور دل میں ایسا آ رہا ہے کہ اسی سال کے آخر میں تشران عظیم ختم کیا اور کتب فارسیہ و مختصرات  
 پڑھنی شروع کر دیئے دسویں برس میں شرح ملا پڑھتا تھا مطالعہ کی راہ فی الجملہ کھل گئی۔  
**شادی** چودھویں برس بیاہ کی صورت ہوئی۔

پندرہویں برس والد سے بیعت کی اور اشغال صوفیہ خصوصاً نقشبندیہ میں  
**بیعت** مشغول ہوا۔ اور اسی سال کچھ بیضاوی پڑھی والد نے بہت سا کھانا تیار کیا اور  
 خاص و عام کی دعوت کی اور فاتحہ اجازت درس پڑھی فنون متعارف سے حسب رسم اس دیار کے  
 تکمیل علوم پندرہویں برس فراغ حاصل ہوا۔

مختلف علوم و فنون کی جن کتابوں کو علمی اور صحیح بخاری سے ساری شکوہ پڑھی  
**سبقاً سبقاً** پڑھا ان کے نام تک اور شمائل البیہ تمام اہل کچھ بیضاوی  
 و مدارک اور چند بار مدارست تشران کریم میں ساتھ تدریس معانی اور شان نزول تفاسیر کی  
 طرف رجوع کر کے خدمت میں والد کے حاضر ہوا۔ یہ معنی فتح عظیم کا سبب ہوا۔

اور فقہ سے شرح وقایہ و ہایہ تمامہا مگر کچھ ذرا سادوں سے

اور اصول سے حامی اور کچھ توحید و تلویح سے

اور منطق سے شرح شمسہ اور کچھ شرح مطالع

اور کلام سے پورا شرح عقائد مع بعض خیالی کے اور شرح مواقف

سلوک سے کچھ عوارف اور ایک پارہ رسائل نقش بندہ وغیرہ سے  
اور حقائق سے شرح بیایات مولوی حامی رحمہ اللہ اور مقدمہ شرح لمعات  
اور مقدمہ نقد النصوص

اور خواص اسماء و آیات سے مجموعہ خاص والد کا ادراکات فوائد

اور طب سے موجبہ القانون

اور حکمت سے شرح ہایۃ الحکمت

اور نحو سے کاچہ و شرح ملّا

اور معانی سے مطول و مختصر

اور ہدیت و حساب سے بعض رسائل مختصرہ

اور اس درمیان میں بلند باتیں ہر فن کی دل پر گزرتی تھیں۔

شاہ عبد الرحیم کا انتقال اور سترہویں برس والد بیمار ہو کر انتقال فرما گئے اور بیعت و  
بیعت اور شادی کی اجازت ارشاد کی اجازت دیدی اور مکرر یدہ کبھی کا کلمہ فرمایا۔  
سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ والد نے نہایت رضامندی میں فقیر کے انتقال  
فرمایا۔ اور ان کی توجہ طرف فقیر کے ادس توجہ کے مانند نہیں ہے جو آبا کو آبا کے ساتھ  
ہوتی ہے۔

بارہ برس کتب درسیہ کی تعلیم دینا۔ اور ان کی وفات کے بعد بارہ سال کم و بیش کتب  
دینیہ و عقلیہ کے درس کے ساتھ مواظبت کی۔

فقہاء محدثین کی روش کا حاصل ہو جانا۔ بعد ملاحظہ کتب مذاہب اربعہ اور ان  
کے اصول اور ادنیٰ حدیثوں کے جو ادنیٰ کا متمک ہیں بمسودہ قدوسی روش فقہائے محدثین  
قرار دیا و خاطر ہوئے۔

سفر حجاز۔ بعد اس کے ۱۲۳۳ھ میں مشرف ہوئے۔ اور ایک سال مجاورت حرمینہ  
ور وایت حدیث شیخ ابو طاہر مدنی وغیرہ مشائخ سے موفق ہوا۔ اور ہمراہ متوطن نماز  
حرمین۔ علماء وغیرہم کی رنگین صحبتوں کا اتفاق ہوا۔

شیخ ابو طاہر سے فرقہ جامعہ کا ملتا۔

یہ فرقہ جامعہ ابو طاہر کا پڑنا کہ جس کو بیچ فرقہ ہائے صوفیہ کا عادی کہہ گئے ہیں۔

اس سال کے آخر میں بھی ادا کر کے ادا کیلئے ۱۳۳۵ھ میں متوجہ وطن کا ہوا۔ رند جمعہ چودھویں روز  
بوسمک وسلم وطن میں پہنچا۔

نعمت عظمیٰ - نعمت عظمیٰ اس صفت پر وہ ہے کہ اس کو فنا حیات کا خلعت دیا اور دورہ  
باوریں کا فتح اوس کے ہاتھ پر کیا اور ارشاد فرمایا کہ

اسرار و مصالح احکام کی تدوین مرضی فقہ میں کیا ہے اوس کو جمع کر کے فقہ حدیث کی سر  
سے بنیاد کی اور اسرار حدیث و مصالح احکام و ترقیات اور اس سب کو جو مفسر ت  
ملی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ سے لائے ہیں۔

اور یہ وہ فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے اس فقیر کی بات سے مضبوط تر بات اس  
کو کسی نے ادا نہیں کیا ہے باوجود جلالت اس فن کے، اگر کسی کو اس حرف میں شبہ ہو تو اس  
سے کہہ کہ قواعد کبریٰ کو دیکھ کہ شیخ عز الدین نے اوس جگہ کیا کچھ جسد کیا ہے۔ اس فن کے عشر  
بشیر کو نہیں پہنچے۔

فریقہ سلوک کا الہام کیا جانا۔ اور طریقہ سلوک کا الہام فرمایا جو کہ اس زمانے میں مرضی حق  
ہے اور اس دورے میں فائز ہوتا ہے۔ اس کو محلات الطاف القدس میں ضبط کیا ہے۔ اور  
دائے اہل سنت کے عقائد کا دلائل و محبتوں سے اثبات کیا اور اس کو معقولوں کے حسن و قسا  
سے پاک کیا اور ایسے طور پر مقرر کیا کہ بحث کا کل نہ رہا۔

کمالات اربعہ اور علم کمالات اربعہ یعنی ابداع و خلق و تدبیر و تدلی کا باوجود اس عرض و طول  
نے علم استعدادات نفوس انسانہ کا بہ جہیہ اور کمال و آل ہر شخص کا افاضہ فرمایا۔ اور یہ دو  
مہیل ہیں اس فقیر سے پہلے کوئی اس کے گرد نہیں پھرا ہے۔

تعلیمی کا افادہ۔ اور حکمت عملی کہ جس میں اس دورے کی صلاح ہے بوسنت تمام افادہ  
توفیق اس کے مضبوط کرنے کے ساتھ کتاب و سنت و آثار صحابہ کی دی۔

اور علم دین کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے اور جو محرف و مدخل

ہے اور جو سنت ہے اور جو کچھ ہر فرقے نے بدعت نکالی ہے اس سب کی تمیز پر ناقدہ کیا۔ ۶  
دلوان لی فی کل منبت شعرة

ما نالما استوفیت واجب حمودہ ، انتہی کلامہ

تفصیلات۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں اور سب کے سب نافع اور مفید اور بعض ان میں سے اپنے باب پر عظیم النظر غیر مہجور منھا۔

۱۔ بحمت اللہ البالغہ

۲۔ ازالتہ الخفا، یہ دونوں ۱۲۸۵ھ میں بصرف منشی محمد جمال الدین خان مرحوم مطبوعہ  
بھوپال طبع ہو چکی ہیں۔

۳۔ مصنفی شرح فارسی موطا (۴) سوئی شرح عربی موطا

۵۔ فیوض الحرمین (۶) انسان العین فی مشائخ الحرمین

۷۔ قواعد الکبیرۃ : اصول التفسیر (۸) قول الملیل

۹۔ جمعات (۱۰) الطاف القدس (۱۱) تادیل الامادیث (۱۲) مقالہ وفیہ

فی النعمۃ والوعیۃ - (۱۳) عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (۱۴) انصاف فی بیان

سبب الاختلاف (۱۵) سرور المحزون (۱۶) لمحات (۱۷) سلطات (۱۸) المقدمۃ

السنیۃ فی انتصار الفرقۃ السنیۃ (۱۹) فتح الرحمن ترجمہ فارسی قرآن۔

(۲۰) انفس العارفين (۲۱) خیر کثیر (۲۲) شفاء القلوب (۲۳) فتح الجنیر

۲۴۔ قرۃ العین فی تفصیل الشیخین (۲۵) البدور البانغہ (۲۶) الزہرہ راوین۔

ان کے سوا ایک کتاب تہیات ہے اس میں دو سو سالوں سے زیادہ بلکہ کئی سو ہیں۔

الی غیر ذلک بلکہ تہیات میں فرمایا ہے۔

ومن نعم اللہ علی دلائلہ ان جعلنی اللہ ناطق ہذا الذی دسقا و

لے ان کا یہ بیان مبالغہ سے خالی نہیں۔ کتاب التہیات دو جلدوں میں مجلس علمی دہلی

نے شائع کر دی ہے۔ اس میں تہیات سب آگئی ہیں۔



حکیم ہا دقتاً ہذا الطبقة وزعیمہا تطلق علی سانی و ثلث فی نفسی  
 ثمان نطقت یا ذکار القوم و اشغالهم فطقت بمواضعہا و اتیت علی مذاہبہم  
 جمعہا و ان تکلمت علی نسب القوم فیما بینہم و بین دہم ذویت لی منکم  
 و بطلت فی جوانبہا و اتیت ذر وۃ سنیاتہا و قبضت علی جمیع خطا مہا۔  
 و ان خطبت ہا سرار اللطائف الانسانیۃ قفوصت قاموسہا و تلست  
 ناعوسہا و قبضت علی جلا بیہا و اخذت بلبابہا و ان تمیبت طہر علی النفوس  
 و مبالغہا فانا ابو عذرتہا آتینہم لبجای لا تمحی و غراب لا تکتشہ و لا  
 اکتاہما یرجی، و ان بحثت عن علم الشرائع و البوات فانا لیث عربہا  
 و حانقہا یرینہا و وارث خزانہا و باعث مغایبہا۔

و کم للہ من لطف خفی

یدق حقاہ عن نعم الزکی

شرف الدین صاحب کتاب وسیلۃ الی اللہ کا بیان شیخ اکمل شرف الدین محمد نے  
 اپنی کتاب سنی پوسیلۃ الی اللہ میں کہا ہے۔

ومن کان له لطف تریحۃ و طالع معینۃ الشریفۃ و تحقق  
 بقوائیمہا و تواعدہا لم یبق لہ ریبۃ فی تصدیق ہذا المطلب الا حق  
 و المقصد الا قضی قتل الحق من سبکم فمن شاء فلیؤ من و من شاء  
 فلیکفر خصوصاً کتاب حجۃ البالغہ و اللہجات و لطاف القدوس و  
 اللہجات و المکتوب المرسل الی المدینۃ و الموسی و غیر ذلک انتہی  
 تفسیرات میں نسخہ پایا ہے۔

لما تحت فی دوسرۃ الحکمۃ البسی اللہ خلعة المجد و ارجہ فعلت علم الجمع

بین المتعلقات انتہی

انصاف کی بات - انصاف یہ ہے کہ اگر ان کا وجود صدرا اول اور زمانہ ماضی میں ہو تا تو امام الائمہ و تاج المجتہدین میں شمار کئے جاتے ثنائے علمائے عصر و مشائخ دہر کی ادن پر اس قدر ہے کہ یہ مختصر اس کے نقل کی طاقت نہیں رکھتا۔

اولاد - ایک جمع بے شمار نے ان کے ماضیہ بساط علوم ظاہر و باطن میں تبصر حاصل کیا اور اعلائے مدارج کمالات صوری و معنوی کو فائز ہو گئے خصوصاً ان کی اولاد امجاد کہ ان میں سے ہر ایک بے نظیر وقت و فرید و ہر دو جید عصر علم و عمل و عقل و فہم و قوت تقریر و فصاحت تحریر و تقوی و دیانت و امانت و مراتب و ولایت میں تھا۔ اور اسی طرح ان کی اولاد کی اولاد ہے

ایں خانہ تمام آفتاب ست

ایں سلسلہ از طلعت ناب ست

شاہ صاحب کی پیشنگوئی اور اس کا مصداق - قول ملی میں ان کے کلام فیض نظام سے ذکر کیا ہے کہ فرمایا کہ یہ لڑکے کہ لطف الہی نے ہم کو عطا کئے ہیں سب سعداء ہیں ایک نوع کی ملکیت ان میں ظہور کرے گی لیکن ہمہ بغیر غیب تقاضا کرتی ہے کہ وہ شخص اور پیدا ہوں کہ مکہ و مدینہ میں سالبا اچانے علوم دین کریں اور اسی جگہ وطن اختیار کریں ماں کی طرف سے اون کا نسب ہماری طرف متشکل ہو کیونکہ آدمی زادہ ماں کے وطن کی طرف میلان طبعی رکھتا ہے انتقال ایک جماعت کا جو اپنی والدہ کے وطن میں شملن ہوں کسی اور سرزمین کی طرف بالطبع مستجیل ہے مگر بقسر تا سر انتہی بلقلم

مگر بطور کہتا ہے کہ مصداق اس آگاہی کا وجود ہر دو نواسہ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ قدس سرہ کا ہے۔

مولوی محمد اسحاق اور مولوی محمد یعقوب رحمہما اللہ تعالیٰ کی دہلی سے ہجرت کر کے مکہ مکرمہ میں اقامت فرمائی اور سالبا باجائے روایت حدیث شریف با اہل عرب و عجم مشغول رہے۔ واللہ اعلم

لیکن اس وقت میں یہ خاندان علم و کمال کا بقا ہا منقرض ہو گیا اور کوئی ایک ادن میں سے باقی نہ رہا۔ یفعل اللہ ما یشاء و بحکم مایرید

نمونہ کلام عربی و فارسی۔ میل طبعیت کبھی طرف نظم عربی و فارسی کے بھی فرماتے  
تھے بنجملہ ادن کے منظومات کے ایک قصیدہ طویل الذیل ہے۔ لغت نبوی میں اول اس  
کا یہ ہے۔ ۵

کان بنجوماً ادمضت فی الغیاء

عیون الافاعی ادمضت العقارب

الی آخر القصیدۃ اور اشعار فارسی سے یہ اشعار ہیں۔

علی کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی ست      واللہ کہ سیرانی اذان تشنہ لہی ست  
جائے کہ بود جلوة حق حاکم وقت      تابع شدن حکم خود بولہی ست

کہ بادہ دار و این حسرت از فقیر خاکسار سن  
کہ ظلم عالم قدس ست انکار متجول او  
ندارد باطلش از خویش آئینہ صفت رنگ  
ظلم حیرت آمد دست متکین و فضول او  
شعاع آفتاب از راہ این روزن ہی بیزد  
بجسارین نکتہ نتوان بست مضمون و مول او

نخستین بادہ کاندہ جام کردند      مزاجش عکس آن گلجام کردند  
شرباب وحدت از غمناہ غیب      مرامی ازل وہ کام کردند  
چو غلطیدم ز ستیہا پر سرو      حریفان مستی از من دام کردند

دلے دارم ز خود جہا بش میتوان گفتن      درو کیفیت جوش شرابش میتوان گفتن  
سویلے دل مایابی اندر پیچ و تاب او      نفوس عالم ام الکتابش میتوان گفتن

تا بجے محنت جہوری و دوری بکشم  
نازنین و طم سوائے وطن باز روم  
تا بجے باخ و قاشاک بود صحبت من  
صدر بزم چمن سوائے چمن باز روم  
تا بجے ہمدے سنگ شود شیدہ من  
گوھر از عدنم سوائے عدن باز روم

وقات . ۱۷۱۱ میں وفات پائی تاریخ وفات یہ مصرع ہے ۔

ادب و امام اعظم دیں

رضی اللہ عنہ دارضاء آئین کذا فی الاتحاف

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے کتاب الفاس العارضین خاص ذکر والد ماجد  
حضرت شاہ عبدالرحیم رضی اللہ عنہ اور عم بزرگوار شاہ ابوالرضا محمد رضی اللہ عنہ میں تالیف  
فرمائی ہے ۔ اس میں ان کے احوال و مقامات و کرامات و ملفوظات ذکر کئے ہیں ۔ چونکہ  
اس کے حصہ اول کے آخر میں چند کلمات سود مند لکھے ہیں ان کا لکھنا یہاں مناسب معلوم  
ہوا فرماتے ہیں کہ

اس فقیر نے بعض یاروں سے سنا تھا کہ نام ان کا عالم ملکوت میں ابوالفیض ہے  
میں نے تنہائی میں اس کا استفسار کیا ۔ تبسم فرمایا اور کہا اسی طرح ہے ۔ اور تیسرا نام  
ابوالفیض ہے ۔

شاہ عبدالرحیمؒ کی نصیحتیں ۔ ایک دن منقل نماز ظہر کے طرف متوجہ ہوئے ۔ اور  
فی البدیہہ یہ دو بیتیں فرمائیں ۔

مگر تو را و حق بخوابی لے پیر خاطر کس را مرتجاں الحذر

و طریقت رکن اعظم رحمت است این چنین فرمود آں خیر البشر

اس وقت فرمایا کہ دوات و قلم حاضر کرو اور اس کو لکھو ۔ حضرت حق سبحانہ

ناگاہ دل میں انقاس پایا ہے تاکہ تجھ کو اس کی وصیت کروں اس وقت اشاؤ فرمایا کہ یہ ایک عظیم نعمت ہے شکر اوس کا لازم ہے۔ انقاس نفیہ ایشاں سے یہ دو بیت ہیں۔

اے کہ نعمت ہائے تو از عد فزدوں

شکر نعمت ہائے تو از حسد ہروں

عجز از شکر تو باشد مشکر ما

گر ہو و فضل تو مارا رہنمون

اس فقیر کو مجلس صحبت میں حکمت عملی اور آداب معاملہ بہت سکھاتے تھے بمجلد ان کے جو کچھ حافظہ میں رہا ہے یہ بے کہ فرماتے تھے کہ

مجلس میں برائی مت کر کہ اہل پلہ پ میں ایسے ہیں۔ اور اہل پسنبالیہ

ہیں اور افغان ایسے ہیں اور مغل ایسے ہیں شاید درمیان ان کے کوئی آدمی اس قوم کا اہل حیمت اس قوم سے ہو تو اس کو ہرانگے اور صحبت منقص ہو جائے،

فرماتے تھے کہ کوئی بات مخالفت جمہور کے عام مجلس میں ہرگز زبان پر مت لا۔

گو وہ بات نفس الامر میں صحیح ہی کیوں نہ ہو کہ وہ اس پر انکار کریں اور صحبت منقص ہو جائے

فرماتے تھے اگر تجھ کو کسی سے کوئی حاجت ہو تو اس کے واسطے ایک تہید شائستہ کر اور

اس حاجت کی طلب میں تدبیر بچ کر ایسا نہ چلیے کہ بات کو ہتھ کی طرح ڈال دے فرماتے تھے

مجلس عام میں ہرگز کسی پر رد و صریح مت کر۔

فرماتے تھے کہ آدمی کا لباس و زنی ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی صنعت و کمال پر

مشعر ہو مثلاً جو آدمی دانشمند ہے اسے چلیے کہ دانشمندوں کا لباس پہنے۔ اور

انہیں کے آئین کے ساتھ زندگانی کرے۔ اور جو فقیر ہے اس کو چلیے کہ فقیروں کا لباس

پہنے اور انہیں کے آئین سے زندگانی کرے۔

فرماتے تھے کہ بزرگوں کے مخاطبہ میں سخن مغلط و موجب زواہت روا نہیں ہے

فرماتے تھے کہ اگر تجھ سے شجاعت یا سخاوت یا فتوت ظہور میں آئے تو چاہیے

کہ امانتے روزگار اس کو چہ سے دیکھیں۔

عیادت کے مقصود اعظم اس سے رہنمائی مریض کی ہے نہ محض اطلاع اس کی کیفیت مزاج پر اور اس طرح تعزیت اور ایسے سفارش اور دل ان کے پس جو شخص یہ سب کام بجالائے اور صاحب معاملہ کو محنت پر مطلع نہ کیا تو اپنی محنت کو ضائع کر دیا اور اسی طرح ہر وہ چیز جس سے مقصود اقامت مصلحت موافقت و تالیف میان جمہور مردم کے ہو۔

محل تو دین یا راں میں ادران کی وصیت میں یہ بیت بہت پڑھتے تھے۔

آسانس دو گیتی تفسیر میں دو حرف ست

باد و ستان تملطف باد شمنان مدارا

فرماتے تھے جن لوگوں کا مرتبہ تیرے مرتبے سے فرد تر ہے اگر وہ ابتدا یا اسلام کریں تو اس کو ایک نعمت نعم الہی سے جان اور شکر اس کا بجالاؤ اور ان کے دہمرو منبٹ ہو اور ان کے حال کا تلفد کر بہت ہوتا ہے کہ ادنی انتفات جو تیرے نزدیک کچھ قدر نہیں رکھتے وہ ادنی کی آنکھ میں عظیم دکھائی دیتا ہے۔ اور وہ اس کے ساتھ پورا اعتنا کرتے ہیں اور اگر اس کو نہیں پاتے ہیں تو غمگین ہوتے ہیں۔

مد ملک دل بہ نیم نگہ می توان خسرید

خواب و دریں معاملہ تفسیری کنند

فرماتے تھے احمقوں کی خصلت سے ہے کہ ساتھ کسی لباس و عادت کے نشانہ ہوتے ہیں یا تکیہ کلام مقصد کرتے ہیں یا کوئی کھانا مقصد کر لیتے ہیں کہ اس سے منفرد ہوتے ہیں اور لوگ اس کے بدب سے سخر اپن کرتے ہیں۔

فرماتے تھے بعض آشنا محبت ذاتی رکھتے ہیں کہ اگر محبت بتدریج ادنی کے دل میں جگہ پکڑتی ہے۔ بعد اس کے کسی حالت میں ادنی کے دل میں سے باہر نہیں جاتی ہے نہ سترائیں نہ خرائیں اس یا کہ کو غنیمت شمار کرنا چاہیے اور نہ رنج سے بہتر رکھنا چاہیے۔

اور بعض آشناؤں کی آشنائی کا سبب ظہور کسی نفیلت کا ہے مجھ سے یا ارتباط کسی حاجت کا ساتھ تیسکر۔

قدر ہر آدمی کی پہچاننا چاہیئے اور سب کو ایک منزلت دے دیتے ہیں نہ رکھنا چاہیئے اور آدمی پر زیادہ اس لئے جو اس کا مرتبہ ہے اعتماد نہ کرنا چاہیئے۔  
 فرماتے تھے کہ مافلوں حکیموں کا یہ کام ہے کہ فقط استیفاء لذت مقصود نہ ہو بلکہ پورے  
 ہیں کہ وہ ممن میں کسی دفع حاجت یا کسی فضیلت کے اقامت یا کسی مذلت کی ادائی میں  
 تھے ہو۔

فرماتے تھے بات کہنے، رستہ چلنے، پیٹھنے اونٹنے میں اتویا کی رسم و عادت پر کام کر  
 کر چہ تو ضعیف ہی کیوں نہ ہو اور اگر کوئی عرب یا جن یا بخل ناگاہ تجھ سے صادر ہو جائے  
 اور اس کے کتمان را اختیار میں کوشش کرتا چاہیئے اور اس سے شرعیں ہونا چاہیئے اور خود  
 لو تکلف صفت مقابل ظاہر کرنا چاہیئے تاکہ نفس اور اس آغاب کے ساتھ خوگر ہو جائے۔  
 جب بات چیت سفر کے مال میں ہوتی تو چوروں اور چکوں سے بچاؤ کرنے میں  
 نلو کرتے احساس باب میں اپنے وقتائے جو کہ غما کبریا میں دیکھتے تھے بیان فرماتے۔

## سَطَعَات

مجرد محض اور عالم شہادت کے میان رابطے، اور اس کے بعض خواص ادا شمار کے بیان  
 پر حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ کتاب مشتمل ہے۔ اس میں وجود حقیقی کے منزلات اور  
 جمالیات کے علاوہ تفسیر حقیقت قرآن و حدیث مدسی، پر بھی بحث ہے  
 "سطعات" میں شاہ صاحب کی حکمت الہی کا نظامہ آگیا ہے۔

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

شاہ ولی اللہ المدعوں حیدر آباد

## قضاء اسلامی کے مثالی نمونے

ترجمہ۔ خالد مسعود

یہ کتاب اس روشنی کی چند جھلکیاں پیش کرتی ہے جسے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کرائے اور ساری دنیا نے اس سے ہدایت پائی۔ یہ جھلکیاں جن آثار کی عکاسی کرتی ہیں وہ آج بھی دائم و قائم ہیں۔

اسلام ایک دائمی انقلاب کا نام ہے اور جو زندگی کے لئے سچی مسکن کی دعوت ہے یہ عدل انصاف اور امن و آشتی کی دعوت ہے۔ اندھیروں کے لئے روشنی اور مسائل کے لئے حل مہیا کرتا ہے۔ معاشرہوں اور افراد کی تنظیم کرتا ہے۔

اسلامی دعوت نے جہاں اعلیٰ اقدار، عظیم انسانیت، پاکیزگی اور تقویٰ کے حامل ایک مثالی معاشرہ کی بنیاد رکھی وہاں اس قلیل عرصے میں تاریخ عالم کو جلیل القدر شخصیات بھی دیں۔ ایک طرف معاویہ بن ابی سفیان، زیاد بن ابیہ اور عمرو بن العاص جیسے سیاست دان تھے جنہوں نے من تدبیر سے اسلامی سیاست کا لوہا بنوایا۔ تو دوسری طرف سعد بن ابی وقاص، خالد بن ولید، مصعب بن زبیر جیسے اولوالعزم سپہ سالار تھے۔ جنہوں نے میدان ہائے کار نزاریں

---

یہ عربی کی ایک کتاب "المثل العليا من قضاء الاسلام" مصنفہ محمود الباجی کے ایک باب کا ترجمہ ہے قضاے اسلامی کے مثالی نمونوں کو اس کتاب میں آج کے اسلوب میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ (مدیر)



اپنی جنگی فراست اور شجاعت کی حامل۔ پھر اسی دعوے نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بن معاویہ  
ابن قاضی بھی پیدا کئے جو بصیرت اور قیام عدل میں مثالی شخصیات ہیں

اسلامی شریعت کے مصادر و مذاہب، مبادیات اور قواعد، مباحث اور فقہی مسائل کا  
مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ تمام تعینات اور اصول و فروع کی اہم ترین کتابیں احکام اور  
واقعات پر مشتمل کم بنتی ہیں۔ درحقیقت اسلامی شریعت کا ذخیرہ تمام تر عدالت نبوی کے  
فیصلوں سے لے کر مختلف زمانوں کے مسلمان قاضیوں کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔

شریعت اسلامی کا یہ عظیم سرمایہ آج بھی ایک قابل فخر منبع و معدن رہے۔ یہ آج بھی  
قانون سازی کے لئے دوسرے تمام ذرائع سے بے نیاز کر دینے والا ذخیرہ ہے قانون والوں کے  
لئے یہ ہر زمانے میں شعل راہ رہا ہے اور دور جدید کی فہم و بصیرت کے لئے ایک عظیم ماہنامہ ہے۔  
اس کی عظمت و اقیامت باقی رہے گی۔ یہ ایسی دولت ہے کہ اگر نذر زمان اسلام اس سے  
چشم پوشی کرے، بھی تو اس کی معاونت ان کے ہمراہ رہے گی۔

یہ عظیم میراث اگرچہ شمار تالیفات اور فقہ کے متفرق ابواب اور فردی مسائل میں بھری  
ہوئی ہے تاہم صدق و صفائی یہ آج بھی حق کے قیام اور باطل کی تباہی کا سامان ہے۔  
اس کوشش سے قبل مؤلفین نے عام طور پر اسلامی عدالتوں کے فیصلے جمع کرنے کی جو کوشش  
کیں وہ کسی خاص شخصیت اور قاضی تک محدود ہوتی ہیں۔ مثلاً حضرت علی کے فیصلے بیک نعمت  
قسم کے دیوانی، فوجدار، مقدموں کے مثالی فیصلوں کو یکجا کرنے اور اسلامی سلطنت کے اہم  
شہروں مکہ، مدینہ، بغداد، دمشق، قیسردان اور قرطبہ میں جو مشہور عدالتی فیصلے ہوئے  
ان کو جمع کرنے کا کام اس سے پیشتر نہیں ہوا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس ضرورت کو پورا کیا جائے۔  
چنانچہ میں نے کتاب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ مقدمہ اور اس کی پس منظر کی جتنی جاگتی تصویر اسی  
زمانے کے ماحول اور رنگ میں پیش کی جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ آج کے قارئین بھی اس طرز  
بیان سے مانوس ہوں۔

واقعات کو نقل کرنے میں اختصار کو ترک کر دیا گیا کیونکہ اس طرح واقعات کے محرکات  
اور عوامل نظر انداز ہو جاتے ہیں اور فیصلہ کی عظمت اور اجتہاد اور استدلال کی قدر و قیمت کا

اعداد نہیں ہو پاتا۔ میں نے کوشش کی ہے واقعات کو بیان کرتے وقت اس کے کردار و مقامات، حادثات، ماحول اور دوسری جزئیات کی جتنی جاگتی تفصیل آجائے اور اس کا فیصلہ ذکر کرتے وقت واقعہ کا مختصر تجزیہ اور نتائج کی ممکن تفصیل پیش کر دی جائے۔

شاید اس کوشش سے میں اسلامی عدالت کے صحیح مدو حال واضح کر سکوں اور ان اقدار کو اجاگر کر سکوں جن میں اس شاندار میراث کی عظمت و شرف زندہ و تائیاں ہے مجھے امید ہے کہ اسلامی ممالک کے قافیوں کے لئے یہ مثالی ٹیبل مشعل راہ ثابت ہوں گے اور صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کریں گے۔ اور لوگ ان فیصلوں کی روشنی میں اسلاف کی عظمت کے ہی نہیں بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے مثالی کردار بنیں گے۔

محمود الباقی

تونس جمادی الاول ۱۳۷۶ھ

## توبہ پر سزا معاف

زنائے ہم میں سے محمد بن یحییٰ بن کشیر، عمرو بن حماد بن طلحہ اور بساط بن نصر نے انہوں نے سماک بن علقمہ سے، انہوں نے وائل سے، اور انہوں نے اپنے باپ سے بیان کیا کہ صبح منہ اندھیرے میں ایک عورت نماز کے لئے مسجد کی طرف جا رہی تھی کہ ایک شخص نے اسے پکڑ لیا اور نہ بدستی اس سے منہ کالگایا۔

اس عورت نے شور مچایا اور مدد کے لئے پکارتی۔ چیخ اور پکار سن کر ایک راہ گیر اس طرف آیا۔ لیکن مجسوم لات کے اندھیرے میں اس کے ہاتھوں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجرم کو جب احساس ہوا کہ اس مجرم کی پادش میں اسے عدالت نبوی میں حاضر ہونا پڑے گا اور وہاں اس پر سزا کی حد قائم ہوگی تو وہ بھاگ نکلا۔ اسی اثنا میں کچھ اور لوگوں کا بھی اودھ سے گزر ہوا۔ عورت اسی طرح فریاد کر رہی تھی۔ اس نے انہیں بھی واقف نہ کیا وہ نو مجرم کی تلاش میں چل کھڑے ہوئے۔

یہ لوگ تیزی سے اوجھڑا دھر پھیل گئے اور تھوڑی دیر میں انہوں نے ایک شخص کو جالیا جو اسی راستہ پر بھاگا جا رہا تھا۔

اس شخص کو پکڑے ہوئے وہ عورت کے پاس لے کر آئے تاکہ عدالت بنوی میں پیش کرنے سے پہلے تصدیق کر لیں۔ عورت نے کہا ہاں یہی مجسدم ہے۔  
مگر کارِ شخص کا کہنا تھا کہ میں مجرم نہیں ہوں۔ آپ لوگ خواہ مخواہ مجھ پر شبہ کر رہے ہیں؛ لیکن جب عورت نے بھی تصدیق کی تو لوگوں کا یقین پختہ ہو گیا۔ اس شخص نے کہا مجھے اس عورت سے ذرا پوچھ لینے دو۔

”کیا تمہیں یقین ہے کہ میں ہی مجرم ہوں۔“

”ہاں ہاں تم ہی مجرم ہو۔“ عورت نے پھر یقین سے کہا  
”کیا تم مجھے پہچانتی نہیں ہو۔ میں نے تو تمہیں مجرم سے چھڑایا تھا اور مجرم بھاگ نکلتا تھا“  
”نہیں تم صریحاً جھوٹ بول رہے ہو“

لوگ اس شخص کو پکڑے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ عورت بھی حاضر تھی۔ عدالت نے سب کے سامنے دعویٰ پیش کیا کہ اس شخص نے جبراً مجھ سے زنا کیا۔ باقی لوگوں نے اس کی گواہی دی کہ ہم نے اسی راستہ پہنچے اسے بھاگتے جاتے پکڑا ہے۔ ملزم نے بیان دیا کہ میں تو اس عورت کی چیخ پکار سن کر اس کی مدد کو آیا تھا۔ اور مجرم سے اسے چھڑا لیا۔ لیکن وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور میں اس کو پکڑنے کے لئے بھاگ رہا تھا۔

عورت نے ملزم کے بیان کی تردید کی اور اصرار کیا کہ یہی شخص مجرم ہے۔  
نبی اکرمؐ نے استغاثہ کا دعویٰ اور شہادتیں اور ملزم کی صفائی سن کر فیصلہ دیا کہ عورت کے بیان اور قوم کی شہادت کی بنیاد پر یہی شخص مجرم ٹھہرتا ہے۔ اس لئے اسے سنگسار کیا جائے۔

ابھی لوگ ملزم کو رجم کے لئے جانے کو تیار ہی ہو رہے تھے اور ابھی فیصلہ کا اعلان ہوا ہی تھا کہ ایک شخص مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔  
”اے سنگسار نہ کرو۔ مجرم میں ہوں۔ اس عورت کے ساتھ میں نے یہ فعل کیا تھا۔“

لوگ اس ٹڈا مائی اندازہ حیران و ششدر رہ گئے۔ مجمع پھر بیٹھ گیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کہنا تھی۔ مقدمہ کی نوعیت بالکل تبدیل ہو گئی تھی اب اس کے فوق بین تھے۔ ایک وہ شخص جو اس عورت سے زنا کا اقبال جرم کر رہا تھا ایک وہ شخص جس کے بارے میں لوگ گواہی دے چکے تھے لیکن وہ جرم سے انکار کر رہا تھا۔ تیسرے عورت۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے بارے میں فرمایا۔  
”تجھے اللہ نے معاف فرمایا“

کیونکہ وہ جرم میں شریک نہیں تھی اور جبراً اس سے بھی یہ فعل کیا گیا۔ پھر اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ مجرم کو پہچان بھی نہیں سکتی تھی۔ پہلے شخص کو بے لوگ عدالت کو پکڑا کر لائے تھے آپ نے فرمایا۔  
”متہارار دیہ قابل تعریف تھا“

کیونکہ اس نے اس عورت کی مدد کی تھی۔ اور ترائن سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ وہ اس جرم سے بری ہے اور خواہ مخواہ شبہ کی بنیاد پر سزا پارہا تھا۔ ابھی دوسرے شخص کے بارے میں حضورؐ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ عمر بن خطاب اٹھے اور کہا۔  
”اے سنگسار کیا جائے کیونکہ اس نے زنا کا اعتراف کیا ہے۔“

لیکن رسول اللہؐ نے فرمایا: نہیں۔ اس شخص نے جرم سے توبہ کر لی ہے اور اس کی توبہ اس درجہ کی ہے کہ اگر سامے مدینہ کی طرف سے یہ توبہ ہو تو اللہ سب کی طرف سے اسے قبول کر لیتا عدالت نبوی کے اس فیصلے سے بڑے اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ جو قوانین اور عدالت کے لئے بلند اور شاندار اصول ہیں۔

۱۔ جس شخص کے ساتھ جرم واقع ہوا ہے محض اس کے اقرار اور گواہی کی بنیاد پر اور مجرم کے بھانپتے ہوئے پکڑے جانے پر زنا کا حکم صادر ہوا۔

۲۔ مجرم کے بارے میں مظلوم کی طرف سے اشتباہ کا امکان ہو سکتا ہے۔ وضاحت کے لئے مکمل تفتیش کی ضرورت تھی۔ چنانچہ خارجی شہادتوں سے مدد لی گئی۔

۳۔ اگر کسی کو یا مجسہد کسی جرم میں شریک کیا گیا اور اس کا ارادہ اس میں شامل نہیں تھا تو اس پر جرم کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

۴۔ اگر مجرم دل سے حقیقی توبہ کر لے اور قرائن سے توبہ کا مقصود ظاہر ہو تو اس کا جرم معاف کر دیا جائے۔ جیسا کہ مقدمہ زیر بحث میں مجرم نے اپنے کوسنگساری کے لئے پیش کر دیا تھا جب کہ عدالت میں جرم کسی اور پر ثابت ہو چکا تھا اور اس نے صرف ایک گناہ کبیرہ کے ارتکاب کے احساس کی وجہ سے اپنے کوسنگسار کے لئے پیش کیا ہمارے معزز قاضیوں کے سامنے بارگاہ نبوت کے یہ عادلانہ فیصلے ہیں۔ یہ ایسی دفعات کا درجہ رکھتے ہیں۔ جن کی طرف رجوع کرنا چاہیے، ان میں دقت نظر بھی ہے اور حکمت و دقت بھی۔ ہمارے قاضی اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں اور ان کی روشنی میں ایسے اصول اخذ کر سکتے ہیں جو قوی دلائل اور صائب دلائل پر مبنی ہیں۔

## فوجی راز کا افشا

حاطب بن ابی بلتعجہ ایک صحابی ہیں جو غلام سے آزاد ہوئے تھے۔ آپ مکہ میں اشیائے خدوئی کا کاروبار کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ ہجرت کر کے مدینے آ گئے۔ لیکن آپ کے اہل و عیال مکہ میں ہی رہے۔ ان کا اللہ کے سوا کوئی مددگار نہ تھا۔ رسول اللہ کے حضور میں آپ کو بڑا اعتماد حاصل تھا چنانچہ آپ ہی نے مصر میں حضور کی طرف سے سفارت کے فرائض انجام دیئے تھے اور مقوفس شاہ مصر کے پاس اسلام کی دعوت لے کر پہنچے تھے۔ اس کے علاوہ بھی آپ کو جس منصب پر فائز کیا گیا، آپ نے ہمیشہ اسے بحسن و خوبی انجام دیا۔ آپ نے بدر کے معرکے میں بھی شرکت کی تھی اور بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ لیکن آپ کا دل دو دنیاؤں میں بٹ گیا تھا۔ ایک بھڑبھڑا خلاص کا تھا جو دین اسلام، رسول اللہ اور اپنے مسلمان ساتھیوں کی طرف انہیں کھینچے رکھتا تھا دوسرا بھڑبھڑاتا تھا جس سے آپ کا دل بھی مکہ میں اپنے اہل و عیال میں اٹکا رہتا تھا۔ اسی طرح آٹھ سال گزر گئے۔

مکہ پر حملے کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن جنگی معلومات کی وجہ سے یہ تمام تیاریاں دشمن سے خفیہ رکھی گئیں۔ پروگرام یہ تھا کہ حملہ دفعۃً ہو۔ طالب کو اندیشہ ہوا کہ جو بھی اس حملہ کی اطلاع ملے گی وہ مسلمانوں کا پہلا دستہ مکہ میں داخل ہوگا قریش وہاں کے کمزور اور ضعیف مسلمانوں کو فوراً قتل کر دیں گے۔

مدینہ کی مسجد پر متعین جاسوسوں نے حضور کو اطلاع دی کہ ایک سوار مشتبہ انداز میں ایک غیر معروف راستے سے مدینہ سے مکہ کی طرف جا رہا ہے۔ بنی کریم نے فوراً دو سوار جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق مکہ کی طرف دوڑا دیئے۔ ایک سوار بڑے بڑے سوارانہ انداز میں عام راستہ سے ہٹ کر کھجوروں کے جھنڈوں میں سے چھپ چھپا کر مکہ کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے سوار ہونے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ علی بن ابی طالب اور زبیر بن عوام جو اس کا تعاقب کر رہے تھے تھوڑی ہی دیر میں اس کے قریب پہنچ گئے۔

پراسرار تاہم دفعۃً پکڑے جانے پر بالکل گھبرا گئی تھی۔ حضرت علیؓ کے دہکاتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ مزنیہ قبیلہ سے ہے اور اس کا نام کنودہ ہے۔ اطلاع کے مطابق وہ ایک خط لے کر مکہ جا رہی تھی۔

زبیر بن عوام نے اس عورت سے خط کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا مجھے خط کا کوئی علم نہیں حضرت علیؓ نے اسے دھمکایا کہ اگر وہ خط حوالے نہیں کرے گی تو اس کے تمام بدن اور کپڑوں کی تلاشی لی جائے گی۔ کنودہ نے جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو اپنے ہاتھوں کے جوڑے میں چھپایا ہوا خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

خط طالب بن ابی بلتعہ نے قریش کے نام لکھا تھا اور اس میں مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کی تیاری اور مختصر معلومات لکھی ہوئی تھیں کنودہ نے بتایا کہ اس کام کا معاوضہ طالب نے پانچ سو دینار دیئے تھے۔

طالب حضورؐ کی عدالت میں لائے گئے۔ یہ عدالت خفیہ تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عمرؓ بن خطاب موجود تھے طالب نے اس خط کا اقرار کیا اور اپنا سارا اندیشہ بیان کیا اور کہا کہ مجھے تو قلعہ تھی کہ قریش اس عذری کے عوض میرے بال بچوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔

مکہ پر حملے کی تیاریاں ہونے لگیں لیکن جنگی معلومات کی وجہ سے یہ تمام تیاریاں دشمن سے خفیہ رکھی گئیں۔ پروگرام یہ تھا کہ حملہ دفعۃً ہو۔ عاتب کو اندیشہ ہوا کہ جو بنی اس حملہ کی اطلاع ملے گی اور مسلمانوں کا پہلا دستہ مکے میں داخل ہوگا قریش وہاں کے کمزور اور ضعیف مسلمانوں کو فوراً قتل کر دیں گے۔

مدینہ کی سرحد پر متعین ہاسوسوں نے حضورؐ کو اطلاع دی کہ ایک سوار مشتبہ انداز میں ایک غیر معروف راستے سے مدینہ سے مکے کی طرف جا رہا ہے۔ بنی کریم نے فوراً دو سوار جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق مکے کی طرف دوڑا دیئے۔ ایک سوار بڑے پرہیزگار انداز میں عام راستہ سے ہٹ کر کھجوروں کے جھنڈوں میں سے چھپ چھپا کر مکے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ اس کے سوار ہونے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہے۔ علی بن ابی طالب اور زبیر بن عوام جو اس کا تعاقب کر رہے تھے تھوڑی ہی دیر میں اس کے قریب پہنچ گئے۔

پراسرار قاصد دفعۃً پکڑے جانے پر بالکل گھبرائی تھی۔ حضرت علیؑ کے دہسکانے پر اس نے بتایا کہ وہ مزنیہ قبیلہ سے ہے اور اس کا نام کنودہ ہے۔ اطلاع کے مطابق وہ ایک خط لے کر مکہ جا رہی تھی۔

زبیر بن عوام نے اس عورت سے خط کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہا مجھے خط کا کوئی علم نہیں حضرت علیؑ نے اسے دھمکایا کہ اگر وہ خط حوالے نہیں کرے گی تو اس کے تمام بدن اور کپڑوں کی تلاشی لی جائے گی۔ کنودہ نے جب کوئی چارہ کار نہ دیکھا تو اپنے بالوں کے جوشے میں چھپایا ہوا خط نکال کر ان کے حوالے کر دیا۔

خط عاتب بن ابی بلتعہ نے قریش کے نام لکھا تھا اور اس میں مسلمانوں کے مکہ پر حملہ کی تاریخ اور مختصر معلومات لکھی ہوئی تھیں کنودہ نے بتایا کہ اس کام کا معاوضہ عاتب نے پیشگی دس دینار دیئے تھے۔

عاتب حضورؐ کی عدالت میں لائے گئے۔ یہ عدالت خفیہ تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت عمر بن خطابؓ موجود تھے عاتب نے اس خط کا اقرار کیا اور اپنا سارا اندیشہ بیان کیا اور کہا کہ مجھے توقع تھی کہ قریش اس خبری کے عوض میرے بال بچوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔

حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ غالب و دشمن کے ہاتھ فوجی راز کے افشا کے مرکب ہوتے ہیں یہ بہت بڑا جرم ہے۔ ان کی گردن اڑا دی جائے۔ لیکن حضورؐ دیکھ رہے تھے کیا ان بچوں کی محبت میں غالب سے یہ جرم سرزد ہوا ہے ورنہ انہوں نے ماضی میں اسلام کی بہت خدمت کی ہے۔ حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تم نہیں جانتے۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے بارے میں ہی کہا تھا کہ تم جو چاہے کرو اللہ نے تمہیں بخش دیا۔

یہاں کریمؐ نے غالب کو بڑی کھدیا۔

اللہ تعالیٰ کی حکمت کو منظور متا کہ یہی واقعہ اس آسمانی شہر علی کا باعث بنے اور اس واقعہ سے ملتے جلتے واقعات کے لئے نظیر بنے انسان کے فطری جذبات اور دینی فرائض میں جہاں تصادم ہو وہاں نظیر فیصلہ کن ثابت ہو سکے۔ تاکہ جو شخص مرے وہ ثبوت کی بنیاد پر مرے اور جو بے وہ ثبوت پر ہے۔

اس طرح مسلمان اس بنیادی حکم سے آگاہ ہوئے اور اپنی بشری کمزوریوں پر غالب آئے۔ اپنے ذاتی اور جذباتی فیصلوں کو دینی اور اجتماعی فیصلوں کے ماتحت کر لے گئے۔

غالب مدینہ منورہ میں سترہ میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں فوت ہوئے۔ حضرت عثمانؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ کے جنازے کے ساتھ صحابہ کی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔

## عوامی مذمت، ایک سزا

ایک صحابی کے پڑوس میں ایک شخص نہایت بہ اخلاق، نیک خواہ اور کم ظرف رہتا تھا۔ معاشرتی زندگی کے بارے میں رسول اللہؐ کے احکام تھے کہ پڑوسی ایک دوسرے سے نیکی، محبت اور ہمدردی کے رشتہ سے وابستہ ہوں، ان میں قربابت و ادا کا یہ عالم ہو کہ لوگ انہیں ایک گھر کا وارث سمجھتے ہوں۔ ایک کی غیر موجودگی میں دوسرا اس کے گھر کا نگراں ہو۔ لیکن یہاں معاملہ قطعاً برعکس تھا۔ صحابی جتنا اس کی برائیوں کو درگزر کر کے نیک سلوک کرتے اتنا ہی وہ قریادہ بدسلوکی کرتا۔ ہر وقت بدکلامی اور گالی گلوچ پر آمادہ رہتا۔ صحابی کی نیک فطرت سے وہ ناجائز فائدہ اٹھاتا۔ صحابی نے پوری کوشش کی کہ اس سے مصالحت ہو جائے لیکن اس کی



ایذا رسانیوں میں امانہ ہی ہوا۔ جب پانی سے گزر گیا تو صحابی نے معاملہ عدالت نبوی میں لے جانے کا ارادہ کیا۔

صحابی نے بنی اکرم کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور دعویٰ پیش کیا کہ ان کا پڑوسی حقوق ہمسائیگی کو توڑنے کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اپنے دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے تمام حالات پوری تفصیل سے پیش کر دیئے۔

رسول اللہ نے حکم فرمایا کہ آخری مرتبہ معافیت کی کوشش کرو دیکھو اور اسے سمجھا بھگا کر حقوق کی ادائیگی کے لئے تیار کرو۔

صحابی واپس آئے اور اپنے پڑوسی کو انتہائی لطیف پیرائے میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ انتہائی بدگلائی سے پیش آیا اور زیادہ ایذا رسانی پر اتر آیا۔ صحابی دوبارہ شکایت لے کر عدالت نبوی میں پیش ہوئے اور تفصیل عرض کی۔ اور انہوں نے کہا کہ اس کی زیادتیوں کی وجہ سے ان کا محلہ میں رہنا دو بھر ہو گیا ہے اور اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ میں کسی دوسرے محلے میں اٹھ جاؤں اور مسجد نبوی کے پڑوس اور بلال کی اذان کے سننے سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ دیا کہ تم اپنا گھر کا سارا سامان نکال کر باہر کی سڑک پر رکھ دو۔ صحابی نے پس و پیش کے بغیر جو حکم ہوا تھا اس پر عمل کیا۔

صحابی کو معلوم نہیں تھا کہ نبی کریم نے یہ حکم اس لئے دیا تھا کہ اس طرح لوگوں کو جب اس پڑوسی کی زیادتیوں کا علم ہوگا تو وہ لعنت ملامت کریں گے۔ اور وہ پڑوسی لوگوں کی بے عزتی کے در سے راہ راست پر آجائے گا۔

صحابی سامان باہر نکال رہے تھے۔ راستہ مسجد نبوی کا تھا آتے جاتے ان کو سامان نکالنے دیکھ کر دم بدم بچھنے لگتے۔ ہوتے ہوتے کافی لوگ جمع ہو گئے۔ صحابی ان کو بتاتے کہ اپنے پڑوسی کی زیادتیوں کی وجہ سے گھر چھوڑنے پر مجبور ہیں۔ لوگ جانتے تھے کہ یہ صحابی بہت ہی نرم خور اور حلیم الطبع ہیں۔ ان پر زیادتیوں کا سنکر وہ اس پڑوسی کو برا بھلا کہنے لگے۔ بعض تو بالکل بلند لہجہ میں کہنے لگے۔

پڑوسی کو جب پتہ لگا کہ اس کا ہمسایہ سامان باہر نکال کر بیٹھا ہوا ہے اور لوگ اکٹھے

جو کہ لغتِ طاعت کہہ رہے ہیں اور یہ قبرِ مدینہ میں ہر طرف پھیل چکی ہے۔ تو وہ گھبرایا اسے  
نظرہ ہوا کہ بہت جلد وہ ہر طرف لوگوں کی انگلیوں کا نشانہ بنے گا۔ لوگ اس سے قطعِ تعلق  
کر لیں گے۔

وہ بھاگتا ہوا آیا اور اپنے لئے کی معافی چاہی اور سنت کی تم اپنے گھر میں اطمینان سے رہو  
ہیں آئندہ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ لیکن صحابی تو رسول اللہ کے حکم کے پابند تھے۔ پٹوسی  
نے بہت منت ساجت اور گریہ و زاری کی۔ بلکہ ان کا سامان اٹھا اٹھا کر رکھنے لگا۔ صحابی وضامند  
ہوئے اور گھر میں چلے گئے۔

اس دن کے بعد ان کو کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی بلکہ ان کے درمیان محبت اور  
دستی اس درجہ ہو گئی کہ ایک دوسرے کے بغیر کھانا نہ کھاتا۔

اس واقعہ سے قیاس کرتے ہوئے فقہائے اسلام نے یہ کہہ کے کہ ظلم کے روکنے کے لئے  
ڈیڑھ سیر اختیار کرنا بھی شرعی وسیلہ ہے۔

اس حکم میں جو وسیلہ اختیار کیا گیا وہ ایک تدبیر تھی جس سے مقصود یہ تھا کہ  
لام اپنی ایذا رسانی سے باز آجائے۔ ظاہر ہے کہ عوامی غم و غصہ کو حرکت میں لانے سے بڑھ کر  
دوسرے تدبیر کیا ہو سکتی ہے۔ اس سے فرد کو معاشرے میں اپنے مقام اور وقار پر زبردستی  
ظرف آتی ہے۔ چنانچہ عدالت نبوی نے اسی تدبیر کو اختیار فرمایا۔ اس تدبیر کے کارگر نتائج  
اس واقعہ میں ہی تھیں بلکہ ظلم کے روکنے کے لئے اس قسم کی تدبیروں کے استعمال کی تصدیق  
بھی ہوتی ہے۔ اور ساتھ ہی زیادتی کے مقابلہ کی بھی۔

آج کے قوانین جن میں عوام کے سامنے مجرم کی تشہیر ضروری خیال کی جاتی ہے دراصل اسی  
اسلامی اساس پر قائم ہیں۔ عدالت کی طرف سے یہ حکم کہ فیصلوں کی تفصیل اخباروں میں مکمل طور  
پر شائع کی جائے یا سزا کے وقت لوگوں کی موجودگی، یا جاننا وغیرہ پر مجرم کا دینا وغیرہ ایسے  
نہیں ہیں جن میں ہی بنیادی اصول کار فرما ہے کہ مجرم کے معاشرے میں مقام کو دھچکا پہنچ سکے۔

## سیرِ ہویں صدی کا ایک مثالی مجاہد شاہ ولی اللہ کے جدِ امجد شیخ وجیہ الدین چودھری عبد الغفور

ہندوستان کی تاریخ میں صوفیائے کرام اور علمائے عظام نے ملکی تحفظ کا حق ادا کیا ہے۔ ہمارے علمائے شائدارامی، علما کی مجاہدانہ جذبات کی ایک عجیب ایمان افروز داستان ہے اور جنگِ آزادی کا سہرا تو ان ہی علماء کے سر ہے۔ ان کے جوشِ جنوں کو نہ تو کالے پانی کے قید بند کم کر سکی اور نہ ہی پھانسی اور ملا وطنیان صوفیائے کرام بھی اسلامی عہد کے ابتدائی زمانے سے ہی فوجی خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ شیخ وجیہ الدین ایک ایسے دور کے مجاہد ہیں جب مغلیہ سلطنت پر انحطاط کا دور دورہ تھا۔ اور ابتدائی جذبہِ اسلامی اور جوشِ ایمانی کھنسے بنا۔ سیلاب اپنا زور بہت کچھ کھو چکا تھا۔

آج بھی ہندوستان کی سرزمین ان بزرگوں کے مزارات کی منظرِ انوار ہے جنہوں نے ناموسِ اسلامی کے تحفظ میں جائیں قربان کر دیں اور شہادت کے درجہ پر فائز ہوئے۔ ان کے سرخیل حضرت مسعود اللہ غازی تھے۔ جن کا مزار پیر پٹنج میں ہے۔ یہ اور ان کا تعلق

---

عام روایت کے مطابق ان کو سلطان محمود غزنوی کا بھانجا بتایا جاتا ہے۔ سکر اس کی کوئی تاریخی شہادت نہیں ان کے مزار کا ذکر سب سے پہلے فتوحاتِ فیروز شاہی میں آتا ہے۔ فیروز دہلی خدو مزار پر حاضر ہوا تھا اور اس نے وہاں جو بدعات اور منہیات مشاہد کیں ان کے بارے میں احکامات بھی صادر کئے تھے۔

عمود غزنوی کے عہد سے ہے۔ ان کے بعد بھی روض اسلامی کی اس تیغ آبدار کے جوہر اکثر تاریخ کے صفحات پہ چمکتے نظر آتے ہیں۔

حضرت امیر خسرو نے بنگال، ملتان، دولت آباد اور دسکرمقامات ہر دفعا کو اپنے ترانوں اور نغموں سے ہی مترنم نہیں کیا بلکہ ان کی شمشیر فاراشکات نے ظلمت کفر کی اندھیاریوں کو چمکا چوند کر دیا۔

اقبال نے اپنے اس شعر میں حضرت شمس الدین ترک پانی پتی کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلادیا ہے

وہ مردود پیش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ

شمس الدین ترک علاء الدین غلی کی اس فوج میں شامل تھے جن نے چٹوڑ کا محاصرہ کیا ہوا تھا سلطان کو فتح و نصرت کا مشورہ بھی ان ہی کے لطیف حاصل ہوا تھا۔ شیخ وجیہ الدین نے ایک پکے جہاد کی طرح اپنی پوری زندگی اسلامی سلطنت کی حفاظت میں صرف کر دی اور اپنی اس بے پناہ قربانی اور سرفروشی کے بدلے میں کبھی کسی خاص مراعات یا انعام و اکرام کی خواہش نہیں کی۔

شیخ وجیہ الدین کا روزانہ وظیفہ

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ان کے والد شاہ عبدالحسین کے قول کے بموجب ان کے والد وجیہ الدین کا روزانہ وظیفہ یہ تھا کہ شب و روز میں قرآن کے سو پارے تلاوت فرماتے تھے اور سرفروغ و راحت کسی حالت میں بھی اس وظیفہ میں خلل نہیں آنے پاتا تھا جب ان کی عمر زیادہ ہو گئی اور قوت بنیائی کمزور ہو گئی تو ایک جلی حروف کا قرآن اپنے ہمراہ

امیر خسرو نے عسکری خدمت کے ضمن میں جو کما کمائے انجام دیئے ان کا تذکرہ انہوں نے اپنی مثنویوں اور مثنوی کی کتابوں میں کیا ہے ان کے یہ حالات مثنوی دیول دیول و خضر خاں دیباچہ تحفۃ العفر اور خسران الفتوح میں ہیں۔

رکھتے تھے۔ یہ قسمان ان سے سفر اور حضر کسی حالت میں علیحدہ نہیں ہوتا تھا۔ شہادت کے روز جس وقت ڈاکوؤں نے آپ کے قافلہ پر حملہ کا ارادہ کیا ادا آپ کو اس کی خبر پہنچائی گئی تو اس وقت بھی آپ قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔  
تورع اور تقویٰ کا بے مثال نمونہ

شیخ وجیہ الدین اپنی سپاہیانہ زندگی میں جہاد کے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ رسول کریم کی ہدایت گرامی ہی ہے کہ جنگ میں کھیتوں اور باغوں کو تباہ و برباد نہ کیا جائے۔ حضرت ابو بکر صدیق بھی اسلامی لشکر کو رخصت کرتے وقت ایسی ہدایات دینے کا خاص التزام کرتے تھے۔

ان شرعی احکام کے مطابق شیخ وجیہ الدین کبھی بھی اپنا گھوڑا کسی کھیت میں سے نہیں گزارتے تھے۔ خواہ تمام لشکر کھیت میں سے گزرتا چلا جائے۔ لیکن آپ ہمیشہ اس سے احتراز کرتے تھے۔

آخری دور میں مغلیہ لشکر کا نظم و نسق بہت کچھ ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ اور جہاں تک اشیائے خوردنی کی قرہا ہی کا تعلق ہوتا تھا لشکر کے راستہ کے قصبے اور دیہات کم ہی محفوظ رہتے تھے۔ لیکن شیخ وجیہ الدین اس معاملہ میں ہمیشہ کمال اعتیاد سے کام لیتے تھے۔ شاہ عبدالرحیم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ان کا ہار برداری کا وہ جانور گم ہو گیا جس پر رسد کا سامان لٹا ہوا تھا۔ فوج کے دیگر لوگ گاؤں والوں کے جانور پکڑ لیتے تھے اور ذبح کر کے کھا جاتے تھے۔ لیکن شیخ وجیہ الدین اپنے تورع اور تقویٰ پر جمے رہے اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ دو تین روز تک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہ گئی۔ جب دو تین فاقے گزرد گئے اور طبیعت میں نقاہت بڑھ گئی تو رزاق حقیقی کی رزاقیت نے عجیب صورت میں جلوہ فرمایا۔ ایک دن اسی فسر میں پڑے پڑے چابک سے زمین کریدنے لگے وہاں کہیں چنے کے دانے دبے ہوئے تھے۔ ان کے کریدنے سے اتنے دانے نکل آئے جن سے کام چلی گیا۔ شرعی لحاظ سے یہ چنے لفظہ یعنی گری پڑی

اشیاء میں سے شمار کئے جاسکتے تھے اور ایسا نقطہ جس سے اس کا مالک مستغنی ہو۔ ان چنچل کو  
 بک عاف کر کے تیار کیا اور اس طرح زندگی اور موت کی کش مکش سے رہائی پائی بلکہ  
 شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ وہ اپنے نوکر چاکروں اور گھوڑوں کے لئے چار بیچے دیئے  
 کے ساتھ جس نرمی اور انصاف کے ساتھ معاملہ کرتے تھے وہ متقیان روزگار سے کم شامدہ  
 میں آیا ہے۔

### ایک تاریخی جنگ

شیخ وجیہ الدین نے اپنے زمانے کے ایک تاریخی معرکہ میں بھی حصہ لیا۔ شاہ جہاں کے  
 آخری زمانے میں اس کے بیٹوں کے مابین جو خانہ جنگی ہوئی تھی اس میں اورنگ زیب اور اس کے  
 بھائی شاہ شجاع کا محاربہ تاریخی شہرت رکھتا ہے۔ چونکہ شاہ شجاع بنگال کا صوبیدار تھا۔ اس لئے  
 اس کی فوج میں باقیوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ شیخ وجیہ الدین نے اس معرکہ میں اپنی تلوار کے  
 خوب خوب جوہر دکھائے۔ ان کی استقامت اور پائے مردی حقیقت میں اس جذبہ جہاد اور شہر فروشی  
 کی آئینہ دار تھی جو ان کی زندگی کا ایک زندہ جاوید اصول تھا مسلمان مجاہد اللہ کی راہ میں جنگ کرتا ہے اسی  
 عقیدہ کے بموجب جب اورنگ زیب نے ان کی بے مثال شجاعت اور کارکردگی کا بدلہ دینا چاہا تو  
 انہوں نے اس کو لینے سے انکار کر دیا۔ شاہ ولی اللہ نے اس واقعہ کا حال اپنے والد شاہ عبدالرحیم کی  
 زبانی بیان کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں جب عالمگیر تخت سلطنت پر شمعن ہوا تو اس کے بھائی  
 شاہ شجاع نے بنگال میں بغاوت کر دی اور عالمگیر نے خود فوج لے کر ادھر کا رخ کیا۔ شیخ وجیہ الدین  
 بھی اس فوج میں شامل تھے۔ دونوں لشکروں میں زبردست تقادم ہوا اور ایسی زبردست ٹکڑ ہوئی  
 کہ دونوں فوجیں تھک کر چود ہو گئیں۔ اس موقع پر شاہ شجاع کے لشکر کی طرف سے دو تین

۱۵۰ الفاس العارین ص ۱۵۰

لکھ شاہ جہاں کے تخت سلطنت سے علیحدہ ہونے کے بعد اس کے بیٹوں کے مابین جو خانہ جنگی  
 ہوئی اس میں ایک کو ساموگڑھ کا معرکہ مشہور ہے۔ جو دارا شکوہ اور اورنگ زیب کے  
 مابین ہوا اور دوسرا سلطنت کے مشرقی حصہ میں شاہ شجاع اور اورنگ زیب کے مابین۔

مست ہاتھیوں کے ذریعہ حملہ کیا گیا ہر ہاتھی کے پیچھے زور بکتر پہنے ہوئے سپاہیوں کا ایک دستہ تھا جو ہاتھی کی اوٹ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔ ان ہاتھیوں سے ادھنگ زیب کے لشکر میں کھلبلی مچ گئی۔ اس موقع پر ہر کسی نے جان بچانے کی کوشش کی عالمگیر خود ہاتھی پر تھا۔ لیکن افراطی کا یہ عالم ہوا کہ ادھنگ زیب کے ہاتھی کے ساتھ بھی چند ایک لوگوں کے سوا کوئی نہ رہا۔

### شیخ وجیہ الدین کی عزیمت

اس وقت شیخ وجیہ الدین کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ان مست ہاتھیوں میں سے ایک پر حملہ کیا جائے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ وقت جان کی بازی لگانے کا ہے ایسے موقعوں پر ثابت قدم رہنا کسی کسی کا کام ہوتا ہے۔ تم میں سے جو پیچھے رہنا چاہتا ہے اسے میری طرف سے اس کی پوری اجازت ہے۔ اس پر ان کے بہت سے ساتھی پیچھے ہٹ گئے امدان کے ہمراہ محض چار آدمی رہ گئے وہ بعد میں بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ اگر ہماری محبت میں کوئی شریک ہے تو وہی چار آدمی ہیں ان چاروں جواں مردوں نے ان کے شکار بند پر ہاتھ رکھ کر آپس میں قسم کھائی کہ شیخ وجیہ الدین جہاں بھی ہوں گے وہ بھی ان کے برابر میں رہیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے حملہ کے لئے ایک ایسے ہاتھی کو انتخاب کیا جو میدان جنگ میں سب سے زیادہ طوفان ڈھارہا تھا۔ پہلے تو یہ لوگ بڑی ثابت قدمی سے اپنی جگہ پر کھڑے رہے اتنے میں ہاتھی نے سونڈ بڑھا کر یہ کوشش کی کہ شیخ وجیہ الدین کو گھوڑے کی پیٹھ سے اٹھا کر پھینک دے اس وقت انہوں نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ دیا کہ اس کی سونڈ نیچے سے کٹ گئی۔ اس پر ہاتھی نے زبردست چنگھاڑ ماری اور وہیں سے پھلے پیروں پلٹا اور اپنی غوطہ کو روندنا چلا گیا۔ اس واقعہ کے لڑائی کا روضہ پھر دیا۔ ان کی اس کارگزاری کو خود عالمگیر بھی مشاہدہ کر رہا تھا۔ فتح کے بعد بادشاہ نے چاہا کہ ان کے منصب میں اضافہ کر دے مگر انہوں نے قبول نہ کیا بلکہ

### مقامی بغاوتیں

ملکی جگہوں کے علاوہ شیخ وجیہ الدین نے مقامی بغاوتوں کو طرد کرنے میں بھی بڑی ہی داری

سے کام کیا جب مالوہ کے چند خود سر مقامی سرداروں نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تو شیخ وجیہ الدین کو سید حسین کے ہمراہ بھیجا گیا۔ اس وقت شاہ عبدالرحیم کی عمر محض چار سال کی تھی۔ سید حسین نے اپنے دستکے ساتھ قصبہ دھاموئی کا رخ کیا اس سفر میں شاہ عبدالرحیم گھنے ولہ کے ساتھ تھے وہ کہتے ہیں کہ ایک ہندو سردار حکومت سے باغی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے علاقہ میں عجمت دہلیوری کے لئے بہت مشہور تھا۔ سید حسین نے اسے اپنے کیمپ میں حاضر ہونے کا حکم دیا وہ بڑی شکل سے آیا لیکن کیمپ میں اس کا چرک پر سر والوں سے جھگڑا ہو گیا۔ وہ سید حسین کی خدمت میں ہتھیاروں سمیت آنا چاہتا تھا اور پہلے کے لوگ اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب بات نہ ہو پڑھ گئی تو اس ہندو نے سید حسین کو پیغام بھجوایا کہ تم خود سپاہی پیشہ ہو اور ہتھیارے پاس محافظوں کی کوئی کمی نہیں تمہیں اس بات سے عار نہیں آتی کہ اکیلے آدمی کو ہتھیاروں سمیت اندر آنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ بات سن کر سید حسین کی رگ حیمت کو بوش آیا اور انھوں نے حکم دے دیا کہ کوئی شخص اس پر معترض نہ ہو۔

شاہ عبدالرحیم کہتے ہیں کہ میں خود اس مجلس میں موجود تھا اور اگرچہ کم سن تھا لیکن اس ہندو رئیس کے چہرے پر اس وقت جو بشارت تھی وہ مجھے آج تک یاد ہے وہ پان چار ہاتھ اور مجلس میں اس آرام اور اطمینان کے ساتھ داخل ہوا تھا جیسے کسی شاہی کی محفل میں شریک ہو رہا ہو۔ شیخ وجیہ الدین نے اسے دیکھا تو کہنے لگے کہ یہ شخص اس مجلس میں کچھ نہ کچھ کر گزرے گا۔ انھوں نے اسی وقت ایک خدمت گار کو حکم دیا جس نے مجھے اٹھا کر ایک اونچے طاق میں جو دیوار میں بنا ہوا تھا بٹھا دیا۔ اس کے عنوان دیکھ کر ان کو یقین ہو گیا تھا کہ تھوڑی دیر میں تلواریں نکل پڑیں گی۔ اس لئے بچے کو محفوظ رکھنے کی یہی صورت تھی۔ جب وہ ہندو رئیس تسلیم و کورٹش کرنے کی جگہ پہنچا تو خادم نے کہا کہ یہیں رک کر تسلیم بجالاؤ۔ اس نے اس کے کہنے کی بالکل پرواہ نہ کی اور کہنے لگا میں تو سید کے پاؤں کو چومنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اور اس طرح اپنے خطاؤں کی بخشش حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ جو یہی کہ وہ سید حسین کے قریب پہنچا تو اس نے دفعتاً ان پر تلوار سے حملہ کر دیا۔

سید حسین پھرتی سے ایک جانب کو ہو گئے اس کی تلوار گاؤں کی طرف پڑی اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا اس ظالم نے دوبارہ حملے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ شیخ وجیہ الدین نے اپنی جگہ سے چھپٹ کر حملہ کیا۔



اور اسے غنیمت کے ایک ہی وار سے ختم کروا۔

تین مشہور سرداروں سے مقابلہ

اسی علاقہ میں ان کو ایک ایسا موقع بھی پیش آیا جہاں انہیں پہلے پہلے دشمن کے تین مشہور

سرداروں سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔

شاہ عبدالرحیم بیان کرتے ہیں کہ اس جنگ میں جب دونوں گروہ آتے آتے آئے تو ہندوؤں کا باغی سردار گھوڑے پر سوار تلوار لے آگے بڑھا۔ اور بلند آواز سے کہنے لگا کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں اور میدان جنگ میں تنہا موجود ہوں کسی کی ہمت ہو تو آئے اور مجھ سے دو دوا تھ کر لے اور بھاگی کی تیغ شرط ہے کہ یہ تین مجھ سے اکیلا دودھا تھ کر لے۔ اس پر تین کرشن آیا اور سواروں کے نکل کر اس پر حملہ کر دیا۔ ہندو سردار نے ہایت چابک دستی سے تلوار سے حملہ کیا۔ سید حسین نے اس کے وار کو ڈھال پر روکا۔ تلوار ڈھال کی ایک نوک کا قبی ہوئی دوسری نوک پٹھانی اور اس میں پھنس کر رہ گئی۔ ہندو سردار نے جھٹک کر تلوار کو کھینچا تو اس کے زور میں سید حسین گھوڑے سے گر گئے۔ اس پر وہ ہندو سردار چھلانگ مار کر نیچے کودا اور سید حسین کے سینہ پر سوار ہو گیا۔ قریب تھا کہ وہ تلوار سے ان کو ذبح ہی کر ڈالتا۔ کہ اتنے میں شیخ وجیہ الدین موقع پر پہنچ گئے اور ایک ہی وار میں اس کو جہنم واصل کیا۔

اس کے بعد جب دونوں دوبارہ صفت لشکر میں واپس آئے تو ایک اور شاہ سوار میدان میں آکر اعلان مبارزت کرنے لگا اور کہنے لگا کہ میں مقتول کا بھائی ہوں جس کی ہمت ہو میرا مقابلہ کرے۔ لیکن شرط انصاف ہی ہے کہ میں نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے وہی سامنے آئے۔ شیخ وجیہ الدین نے بڑھ کر حملہ کیا۔ آپس میں زبردست چوڑیں ہوتی رہیں لیکن آخر کار یہ بھی جہنم واصل ہوا۔ اس کے کچھ دیر کے بعد پھر ایک اور سوار اسی صورت اور ہمت کا میدان جنگ میں نمودار ہوا اور اس نے بھی ان ہی الفاظ میں اعلان مبارزت کیا۔ شیخ وجیہ الدین سامنے آئے۔ تو اس نے ان کی دونوں کلائیوں کو معجوبی سے پکڑ لیا اور کوشش کرنے لگا کہ ان کو

ترین پر گرا دے یا اپنے گھوڑے پر کھینچ لے۔ انہوں نے بھی پوری قوت سے مقابلہ کیا۔ لیکن  
مقابلہ جہانی لحاظ سے آپ سے زیادہ طاقتور تھا۔ اس پر آپ نے خدعہ یا جھگڑ جال کے طور  
پر وقتاً کہاں کہاں ہاں پیچھے سے لینا ملا تا کہ اس کے عقب میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اچانک مڑ کر  
بھاگا اس کے بازوؤں کی گرفت کمزور پڑ گئی اس پر شیخ وحید الدین نے اپنے آپ کو  
لڑا لیا اور اسے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد ان کے ساتھی دشمنوں پر ٹوٹ پڑے اور  
ہر کسی کی نافرمانی ہو گئی۔

### انسانی تعلقات کی گہرائی اور گیرائی

اس زمانے میں انسانی تعلقات میں عجیب قسم کی گہرائی اور گیرائی تھی۔ اس کا ایک  
واقعہ اس لڑائی کے بعد ہی پیش آیا۔ اس لڑائی کے تین روز کے بعد ایک بڑھیا پتہ ایسی ایسی شیخ  
جسید الدین کے خیمہ میں پہنچی اور کہنے لگی میں ان تینوں مقتولین کی والدہ ہوں مجھے خیال تھا کہ  
میرے تینوں بیٹوں سے زیادہ دنیا میں کوئی شہید باادب اور بہادر نہیں مگر خدا تم پر رحمت کرے  
نہ ان سے بھی بڑھ کر نکلا۔ آج سے تم میرے منہ بولے بیٹے ہو۔ میرے دل کی یہ تمنہ ہے کہ  
نہ مجھے اپنی اماں کرو۔ چند دن میرے گھر میں رہو تاکہ میں تمہیں جی بھر کر دیکھ لوں۔ اور  
اپنے مقتول بیٹوں کے غم کو ہلکا کر دوں۔ یہ سنتے ہی شیخ وحید الدین نے اپنے خادم کو حکم دیا  
کہ گھوڑے پر زین کس جائے۔ ان کے ساتھیوں میں سے بعض ان کے عزیز واقارب بھی تھے۔  
ان رب نے بہت روکا۔ کہنے لگے۔ عجیب بات ہے کہ آپ جیسا عاقل و فرزانہ ایسی بات کے  
لئے تیار ہو جائے۔ لیکن شیخ وحید الدین نے ان کے کہنے کا کچھ اثر نہیں لیا۔ اس پر لوگوں نے  
یہ بات سید حسین تک پہنچائی وہ سنتے ہی ان کے خیمہ میں آئے اور قسم لی کہ وہ بڑھیا کے ساتھ  
جائے پر اصرار نہیں کریں گے۔ اس پر شیخ وحید الدین مجبور ہو گئے اور اس ضعیفہ کو بلا کر کہنے لگے  
اماں اس وقت تو یہ لوگ مجھے آنے کی اجازت نہیں دیتے مگر کچھ دنوں کے بعد میں فسرہ ر آؤں گا  
جب لوگوں کو یہ بات بھول بسر گئی تو یہ اس بڑھیا کے گھر گئے۔ وہ ایسی محبت اور غلوں سے

پیش آئی گویا سپحہ چمچ کی ماں ہو۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ میں بھی اکثر اس کے گھر جایا کرتا تھا۔ اور اس کو دادی جان کہہ کر پکارتا تھا۔ وہ بھی محبت و شفقت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھی۔ میری دادی جان کا انتقال ہو چکا تھا اور میں نے اپنے ہوش میں ان کو نہیں دیکھا تھا اس لئے بچپن میں مجھے اس بات کا تصور بھی نہیں تھا کہ اس بڑھیا کے سوا میری کوئی اور بھی دادی ہو سکتی ہے شجاعت و بہالت جزو ایمان

جنگ کے جوش میں معمولی انسان بھی بہت کچھ کر گزرتا ہے لیکن شیخ وجیہ الدین کی شجاعت و بہالت ان وقتی محرکات سے بالاتر تھی۔ اس کا خمیر اسی جوش علی سے بنا تھا جو ان کا جزو ایمان تھی شاہ عبدالرحیم اپنے والد کی ولیری اور حرأت کے بارے میں ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک وفد زہر دست جنگ ہوئی اور ہائین سے بہت لوگ مارے گئے بالاخر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی جب شلم کو شکر گاہ میں واپس آئے تو امیر لشکر کی مجلس میں مقتولین کی تعداد پر بحث ہونے لگی۔ ہر شخص اپنی سی کہتا تھا۔ شیخ وجیہ الدین کہنے لگے کہ میری رائے میں جانین کے مقتولین کی تعداد کوئی دوسو یا قدسے کم و بیش ہوگی۔ جو لوگ میدان جنگ سے فرار ہو گئے۔ وہ اس حساب میں شامل نہیں۔ مجلس کے حاضرین نے اس کو بعید از قیاس خیال کیا۔

ان کے دل کو یہ بات لگ گئی۔ اور انہوں نے دل ہی دل میں ٹھان لی کہ وہ مقتولین کی تعداد کا صحیح اندازہ لگائیں گے تھوڑی دیر کے بعد وہ کسی پہانے سے اس مجلس سے نکل گئے۔ اس وقت رات کے اندھیرے میں بادل گھسے ہوئے تھے اور گرج چمک سے فضا میں عجیب ہولناک کیفیت طاری تھی۔ انہوں نے اسی حالت میں میدان جنگ کا راستہ لیا اور اس اندھیا رے میں مردوں کی لاشوں کو ایک ایک کر کے شمار کیا۔ تاہم یہی میں ٹٹولتے ٹٹولتے ان کا ہاتھ ایک زخمی کو لگا اس نے ڈر کر چیخ ماری تو انہوں نے اسے قتل دی اور اسے اپنا نام بھی بتا دیا اس کے بعد آپ کو خیال آیا کہ بعض جھڑپیں تو عین گاؤں کے پیچ میں ہوتی ہیں ان کے بارے میں بھی تحقیق کرنی چاہیئے۔ اس طرح انہیں جہاں جہاں لاشوں کے موجود ہونے کا احتمال تھا سب جگہ اپنی طرح دیکھ بھال

کی۔ یہاں بھی ان کا اتھ اندھیرے میں ایک بڑھیا کے جسم کو لگا جو لڑائی کے وقت ایک کونے میں چھپ گئی تھی۔ ان کی انگلیوں کا چھونا تھا کہ اس نے زور سے چیخ ماری۔ آپ نے اس کو بھی تسلی دی اور اسے بھی اپنا تام بتا دیا۔ مقتولین کی تعداد ان کے اندازے کے مطابق نکل۔ اس کے بعد وہ لشکر گاہ میں آ گئے۔ لوگ ابھی تک اسی حالت میں بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے جو کچھ دیکھا ماضین کو بتایا ان لوگوں کو ان کی باتوں پر یقین نہ آیا اور امیر لشکر نے تقریباً سو آدمیوں کو شعلوں کے ساتھ اس بات پر مقرر کیا کہ مقتولین کی تعداد کا شمار کریں اور اس زخمی بڑھیا کو بھی حاضر کریں۔ اس وقت اندھیری رات کی ایسی کیفیت تھی کہ لوگوں کو جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ لیکن بوجہ مجبوری جانا پڑا۔ جب لاشوں کی گنتی کی گئی تو ان کی تعداد شیخ وجیہ الدین کے شمار کے مطابق نکل۔ زخمی اور بڑھیا دونوں کو حاضر کیا گیا تو ان کے بیانات سے بھی شیخ وجیہ الدین کے قول کی تصدیق ہوئی اور انہوں نے شیخ کا نام بھی حاضرین مجلس کو بتایا۔

### محیر العقول جسانی قوت

شیخ وجیہ الدین محیر العقول جسانی قوت کے مالک تھے۔ اور ان کے پاس ان چیزوں سے قوت جیسی پیدا کرنے کا اکسیر تھا اور وہ تھی ان کی قوت ایمانی۔

ایک بار ایک امیر سید شہاب الدین کا دربار شاہی میں محاسبہ ہوا اور اس کے ذمہ بہت سا روپیہ نکلے شیخ وجیہ الدین نے اس کی ضمانت دے دی۔ اس نے او ایسی میں چیر لگائی تو سکار نے شیخ وجیہ الدین سے مطالبہ کیا۔ آپ نے سید شہاب الدین سے شکایت کی تو وہ کہنے لگا کہ میرے پاس روپیہ تو نہیں البتہ تلوار حاضر ہے۔ اس پر آپ نے مسکرا کر کہا کہ تلوار اٹھانا تو آسان ہے لیکن اس کا حق ادا کرنا اتنا آسان نہیں۔ اس پر وہ غصہ کے مارے ہوئے قابو ہو گیا اور اس نے اپنا خنجر آپ کی سمت پھینک کر مارا۔ آپ نے اسے بائیں ہاتھ سے تمام لیا اور دائیں ہاتھ سے اس کے منہ پر ایسا طمانچہ رسید کیا کہ وہ الٹ کر زمین پر ڈھیر ہو گیا اس کے بعد آپ نے ایک خادم کو حکم دیا کہ ایک رسی سے اس کی مشکیں باندھ لو اور اس کے

طویٹے سے اس کے ادنٹ اور گھوڑے یا ہرنکال لادے۔ اس کو کہیں ایک ساعت کے بعد ہوش آیا تو آپ نے کہا کہ تمہارا دل و گزاف کہاں گیا کہنے لگا مجھ پر زیادتی ہوئی ہے۔ آپ کا ہاتھ میرے ہاتھ سے پہلے حرکت میں آگیا اور پیچڑ کی وجہ سے ہوش ہو گیا۔ اس پر آپ نے کہا ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے ساتھ ہی غلام کو اشارہ کیا کہ رسی کے بند کھول ڈالو اور اسے خنجر دے دو۔ اس نے خنجر لے کر آپ پر دوبارہ حملے کا ارادہ کیا۔ لیکن رعشہ طاری ہو گیا اور حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا۔ یہ واقعہ شاہ عبدالرحیم کا چشم دید ہے جس کی قوت کا یہ خدا داد عطیہ شیخ وجیہ الدین کو اپنے فائدہ سے ورثہ میں ملا تھا۔

محمد مراد شاہ وجیہ الدین کے والد شیخ معظم کے سوتیلے بھائی تھے۔ شاہ عبدالرحیم نے ان کو ۸ سال کی عمر میں دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ ان کی انگلیوں میں ابھی تک اتنا زور تھا کہ سب کو ہاتھ سے دوہرا کر دیتے تھے۔

بارہ سال کا مجاہد

شیخ شاہ ولی اللہ کے پردادا اور شاہ وجیہ الدین کے والد شیخ معظم بھی اپنی شجاعت اور عزیمت میں آیت خداوندی میں سے تھے۔

ایک بار شیخ معظم کے والد شیخ منصور کا مقابلہ علاقے کے ایک ہندو راجہ سے ہو گیا انہوں نے فرج کا یہ منہ شیخ معظم کے سپرد کیا۔ اس وقت ان کی عمر محض بارہ سال کی تھی جب میدان کارزار گرم ہوا تو دونوں جانب سے کشتوں کے پشے لگ گئے۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ شیخ منصور جام شہادت نوش کر چکے ہیں۔ اس خبر کو سنتے ہی پوری فوج درہم برہم ہو گئی۔ اس پر شیخ معظم کی رگ غیرت جوش میں آئی اور انہوں نے تلوار کھینچ کر سیدھا راجہ کا قہد کیا اور دائیں بائیں تلوار چلائے اور مزاحمین کو مارتے کاٹتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ راجہ کے ہاتھ تک پہنچ گئے۔ وہ راجہ ہندوؤں کا ایک بہت بڑا سردار اور شہور

شجاع تھا۔ آپ نے ایک ہی وار میں اس کی تلواریں دو ٹکڑے کر دیئے اور اسے زمین پر گر گیا۔ اس پر ان کو راجہ کے محافظین نے گھیر لیا۔ راجہ نے سب کو بڑی سختی سے منع کیا اور کہنے لگا جو بچہ اس عمر میں ایسی جواہری اور جرات کا مظاہرہ کرتا ہے وہ تو عجب گار میں سے ہے۔ اس کے بعد اس نے شیخ معظم کو دونوں ہاتھوں کو چروان کا بڑا احترام کیا اور کہنے لگا آخر اتنے غیض و غضب کی کیا وجہ ہے۔ انہوں نے کہا مجھے یہ خبر ملی تھی کہ میرے والد شہید ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ میں جب تک غنیم کے سردار کو قتل نہیں کر لوں گا آرام نہیں لوں گا۔ وہ خود میدان جنگ میں کھیت نہ ہوں گا۔ راجہ کہنے لگا تمہیں غلط خبر ملی ہے تمہارے والد بقید حیات ہیں۔ وہ دیکھوان کے جھٹے اس جگہ نظر آ رہے ہیں۔ اس کے بعد راجہ نے فوری طور پر شیخ منصور کے پاس اپنا آدمی بھیجا اور کہا کہ ہم اس بچے کی فاطمہ صلح کرتے ہیں آپ کی جو بھی شرائط ہیں وہ ہمیں منظور ہیں یہ رعیت کا تحفظ

شیخ معظم کی خاندانی جاگیر شکوہ پور میں تھی۔

شاہ عبدالرحیم نے موضع شکوہ پور کے ایک دیہاتی سے شیخ معظم کی رعیت پر مدعی کی ایک عجیب و غریب داستان سنی۔ شکوہ پور شیخ معظم کے تعلقہ میں تھا۔ انہیں خبر ملی کہ قریباً تیس ڈاکوؤں نے علاقہ پر حملہ کر دیا ہے۔ اور رعیت کے مولیٰ بانک کر لئے گئے ہیں اس وقت شیخ معظم تعلقہ میں اکیلے ہی تھے ان کے سگے بھائیوں یا بچازاد بھائیوں میں سے کوئی وہاں نہیں تھا۔ انہیں جس وقت یہ خبر ملی ہے اس وقت وہ کھانے پر بیٹھے تھے۔ اس حالت میں ان سے کسی قسم کی عجلت یا شتاب زدگی کا اظہار نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق نہایت اطمینان سے کھانا کھایا۔ مگر وہ دھوئے اور اس کے بعد حکم دیا کہ ان کا گھوڑا اور ہتھیار لانے جائیں۔ تعلقہ کے لوگ بھی ہتھیار لے کر تیار ہوئے لیکن آپ نے ان سب کو واپس لوٹا دیا اور فرمانے لگے میں تو اس تیزی سے جاؤں گا کہ تم میرے گھوڑے کی گرد بھی نہیں پاسکو گے البتہ انہوں نے ایک رہنما کو ساتھ لے لیا تاکہ جس وقت ڈاکوؤں سے تصادم ہو تو وہ دیہاتیوں کو اس کی خبر کر دے شیخ معظم گھوڑے

سرہٹ دوڑاتے ہوئے ڈاکوؤں کے پیچھے پیچھے ہوئے۔ آگے جا کر پتہ چلا کہ وہ لوگ اپنی منزل پر پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے ان کی بستی کے باہر کھڑے ہو کر چند کلمات بلند آواز سے ایسے بچے میں کہے کہ ان کی رگ غیرت جوش میں آگئی اور پوری جماعت مقابلے میدان میں نکل آئی۔ اس پر شیخ مغلم نے تیرا بھکاری شروع کی اور ایک ایک تیر سے دود کو لینا شروع کیا۔ جب ایسے دو تین قادیانہ از قسم کے تیر نشانہ پر پڑے تو ڈاکوؤں پر رعب عظیم طاری ہو گیا اور وہ زندگانی سے مایوس ہو کر جان کی امان مانگنے لگے اور کہنے لگے خدا ہمارا قصور معاف کر دیجئے۔ شیخ نے فرمایا تمہاری توبہ اسی وقت قبول ہو سکتی ہے جب تم سب کے سب ہتھیار ڈال دو۔ ایک دوسرے کے ہاتھ رسیوں سے باندھو اور تمام ہتھیار اور جانور لے کر گھاؤں پہنچو۔ وہ سب کے سب اسی حالت میں حاضر ہوئے اس وقت شیخ مغلم نے ان سے ان کے رسم و رواج کے مطابق قسم لی کہ وہ آئندہ اس گھاؤں کے قریب نہیں پھٹکیں گے اور شیخ کے حکم سے سر مو تہاؤز نہیں کریں گے۔

شیخ وجیہ الدین کی شہادت  
سیواجی کے قتل کا ارادہ

شاہ عبدالرحیم کے والد کو شہادت کا جوشوق تھا۔ اس کو انہوں نے عجیب اثر انگیز میں بیان کیا ہے۔ ان کی زندگی جہاد میں گزری تھی اور انہیں جب ایسی مرض الموت کا تصور آتا تھا جس میں مریدین ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہوتا ہے تو ان کی روح کا نہپ اٹھتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے دل میں ان برکتوں اور بشارتوں کی امنگ بھی بار بار اٹھتی تھی جن کا قرآن کریم میں فہرہ کے لئے وعدہ کیا گیا ہے۔ ان کے اپنے خاندان میں علمی اجتہاد کے ساتھ ساتھ جہاد کا سلسلہ بھی برابر چلتا تھا اور ان کے اکثر اقربا درجہ شہادت پر فائز ہو چکے تھے۔ یہ اورنگ زیب عالمگیر کا زمانہ تھا اور سیواجی نے دکن کے علاقہ میں مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اور اس علاقہ میں شاعر اسلام کا کوئی احترام نہیں رہا تھا۔ ان کے تحت الشہود

میں بی بی خدیجہ ہسپتال کے راجھا کہ وہ ان حالات کے اصل ذمہ دار سیوا جی کو کیفر کر دانا تک پہنچا رہی  
شاہ عبدالرحیم بیان کرتے ہیں کہ ایک ملازم میسر والہ تہجد کی نماز گزار رہے تھے کہ ان کا ایک  
سجدہ بہت طویل ہو گیا۔ اٹا طویل کہ مجھے ڈر ہو گیا کہ کہیں روح شریفہ جد خاکی سے پرواز نہ کر  
گئی ہو۔ کچھ عرصہ کے بعد سجدے سے سر اٹھایا تو میں نے اس کے بارے میں استفسار کیا فرماتے  
تھے مجھ پر خود فراموشی کی ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس میں مجھے ان عزیز و اقارب  
کے احوال کے بارے میں بتایا گیا جن کو شہادت نعیم ہو چکی ہے۔ میں نے جب ان کی منازل اور  
درجات عالی پر نگاہ کی تو وہ میرے دل کو بہت بھلے معلوم ہوئے۔ اس پر میں نے بھی حضرت  
حق سبحانہ سے اپنے لئے شہادت کی دعا کی اور الحاج و تضرع سے التجا کی۔ مجھ پر کشف کیا گیا کہ تہجد  
و عاسجاب ہو گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی ملک دکن کی طرف اشارہ کیا گیا گویا میری شہادت  
کی جگہ وہاں ہے یہ

شہادت کا واقعہ

اس زمانے میں شیخ وحید الدین نوکری چھوڑ چکے تھے اور انہیں اس شغل سے بہت نفرت  
پیدا ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے دوبارہ سامان سفر تیار کیا۔ اور گھوڑے خرید کر دکن  
کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان کا ظن غالب یہ تھا کہ ان کے مقدر میں یہ ہے کہ سیوا جی کا خاتمہ ان کے  
ہاتھ سے ہوگا۔ سیوا جی کا اس زمانے میں دکن پر تسلط تھا اور اس نے مسلمانوں کے قاضی کی بے  
حرمتی کی تھی۔ شیخ وحید الدین جب یہ جان بوری پہنچے تو انہیں کشف ہوا کہ شہادت کا مقام پہنچے  
نہ گیا ہے۔ وہیں سے واپسی کا ارادہ کیا۔ راستے میں ان کی ملاقات ایک سوداگر سے ہوئی جو اہل  
صلاح اور تقویٰ میں سے تھا جب فقیر ہندیا سے دہلی کی جانب روانہ ہوئے تو عین اسی وقت  
ایک بڑھیا عورت اختاں خیراں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہنے لگی میں بھی دہلی جانا  
چاہتی ہوں۔ آپ نے حکم دیا کہ تمہیں ہمارے ملازمین سے سفر خرچ کے لئے ہر روز تین پیسے دی  
جائیں گے۔ وہ بڑھیا ہندو ڈاکوؤں کی جاسوس تھی جب ان کا قافلہ سرائے نوہریہ پہنچا



پہنچا جو دیکھا تو اس کے ساتھ ہی ڈاکوؤں کے ایک گروہ کٹھنہ سرانے پر حملہ کر دیا۔ اس وقت شیخ وحید الدین تلاوت قرآن فرما رہے تھے۔ ڈاکوؤں میں سے دو تین آدمی ان کے آگے اور پوچھنے لگے تم میں سے شیخ وحید الدین کون ہیں۔ اہلبی انہیں آپ کا پتہ چلا تو کہنے لگے کہ میں آپ سے کوئی غرض نہیں میں یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے پاس کوئی مال اسباب نہیں۔ آپ کا ہماری جماعت کے ایک فرد یعنی اس بڑھیا پر حق تک بھی ہے۔ مگر آپ کے ہمراہ جو سوداگر ہیں ان کے پاس فلاں فلاں مال ہے۔ ان کو ہم کسی صورت میں بھی نہیں چھوڑیں گے آپ کی نظر میں اس سفر کی علت غائی روشن تھی۔ اس لئے آپ نے اپنے ہمراہیوں کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ اس جنگ میں انہوں نے ۲۲ زخم کھائے اور آخری لمحے میں ان کا سر جد مبارک سے علیحدہ ہو گیا۔

شاہ عبدالرحیم کا کہہ ہے کہ آپ کے جد مبارک سے برابر تکبیر کی آواز بلند ہوتی رہی اور اس نے دشمنوں کا ایک پر تاپ تیر کے فاصلہ تک تعاقب کیا اس وقت کسی عورت نے جد مبارک کو دیکھا تو حیرانی سے چیخ ماری اس وقت آپ کا جد شریعت زمین پر گر گیا۔ آپ کی لاش کو اسی جگہ دفن کیا گیا۔

شیخ وحید الدین عالم مثال میں

شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ میں روز شاہ وحید الدین کی شہادت ہوئی ہے اسی دن ان کی صورت میرے سامنے عالم مثال میں سامنے آئی اور آپ نے مجھے خود جسم پر زخموں کے نشان دکھائے۔ میں نے اس وقت ان کی روح کے ثواب کے لئے صدقہ دیا۔ شاہ عبدالرحیم فرماتے ہیں کہ میں نے بعد میں یہ ارادہ کیا کہ آپ کے جد مبارک کو دہلی منتقل کروں۔ لیکن آپ ایک روز عالم مثال میں سامنے آئے اور مجھے اس ارادے سے منع فرمایا۔

ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی حفاظت کی سب سے بڑی ضمانت وہ بے اختیار جذبہ شہادت تھا جو مجاہدین میں پایا جاتا تھا۔ ادران میں سے جو غازی ہوتے تھے ان کو جہاد فی سبیل اللہ میں جو زخم لگتا تھا اس پر نازاں ہوتے تھے اور جو چوٹ کھاتے تھے اس پر شاداں اور فرماں۔ شاہ عبدالرحیم کو جب ان کے والد شیخ وحید الدین شہادت کے دن عالم مثال میں نظر آئے تو وہ انہیں اپنے جسم کا ایک ایک زخم اس طرح دکھاتے تھے جیسے کوئی طرہ امتیاز اور نشان انتظام و انضام ہو۔

شیخ محمد بھلّی جو شاہ ولی اللہ کے نانا تھے بیان کرتے ہیں کہ ان کے ایک عزیز محمد سنی پورب کے کسی علاقے میں شہید ہو گئے تھے۔ ایک دن وہ ان ایام میں مسجد جوڈ کے عہدہ میں اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ سجدہ جٹو اگرہ میں تھی اور شاہ عبدالرحیم کے اکثر مکاشفات اسی مقدس جگہ ہوئے ہیں۔ اتنے میں ناگہاں محمد سنی عالم مثال میں ان کے سامنے آئے اور اس شان سے آئے کہ ان کے لباس اور ہتھیاروں سے شعا عین پھوٹ پھوٹ کر نکلتی تھیں اور ان سے زمین جھل جھل کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا آپ کے ساتھ کیا گندہ۔

کہنے لگے کہ میدان جنگ میں مجھے زخم لگتا تھا تو اس میں ایک لذت محسوس ہوتی تھی۔ ان زخموں کی لذت اور جلالت آج تک میرے دل میں موجود ہے۔ فی الحال بادشاہ کی فوج فلاں بت خانہ کو ہندم کر لے کے لے بھی گئی تھی۔ میں بھی ان کی رفاقت پر ماورن تھا اس تقریب سے ادھر بھی آنا ہو گیا۔ چونکہ تم سے شوق ملاقات تھا اس لئے ہمارے حجرے میں آ گیا۔

# شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

## حصہ اول

### مبادیات اخلاقیات

معنی، ڈاکٹر عبدالواحد علی پورہ

مترجم، سید محمد سعید

(۲)

#### باب ۱۔ نفسیاتی پس نظر

تعارف سے۔ مزاج اور عمل کا رشتہ وہی ہے جو سبب اور سبب کا ہوتا ہے اس لئے اخلاقیات پر کہنے والے، نفسیات کو نظر انداز نہیں کر سکے، حضرت شاہ ولی اللہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں، انہوں نے نفسیات کا ارتقاء، حیوان سے اس انسان تک واضح کیا ہے جو تصورات قائم کرنے، نتائج اخذ کرنے، بحث کرنے اور کیلئے بنانے کا اہل ہے، وہ علم سے آگے بڑھ کر غیر جانبداری، الہام اور ہدایت تک پہنچتے ہیں، مگر چونکہ یہ موقوفہ اخلاقیات ہے (یعنی معنوں میں اسے علم طیبہ سمجھا جاتا ہے) اس لئے بیان اخلاق اعلیٰ کا تجزیہ کرنا مناسب نہیں ہے، نفسیات میں بھی بحث کو اس حد تک محدود رکھا جائیگا جہاں تک ان کے ساتھ اخلاق فاضلہ سماجی ہدایات اور رسوم کو جو چار عمرانی درجوں کی وجہ سے معروض وجود میں آتی ہیں، اور جن کو ارتقاءات کہتے ہیں، سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ نفسیات میں تعلیمیت پسند تھے اور اخلاقیات میں افادیت پسند تھے، مگر نفسیات اور اخلاقیات دونوں میں ان کے اتنوم و بنیاد، محض عارضی ہیں کیونکہ وہ ارتقاء کے تسلسل کو پس منظر میں جبری مانتے ہیں، متواتر تبدیلی کا تصور، ترقی کا بہاؤ اور نئی استعداد کا وضع ہونا جس کی شکل اپنی

اصل سے مختلف ہو، یہ سب باتیں ان کے ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوتیں، ان کی نفسیات میں تعاملیت پسندی یہاں تک کام کرتی ہے کہ وہ ان پر پوری طرح مادی ہو جاتا ہے اور حتیٰ احساس اور ان تمام چیزوں سے جو جسمانی نفسیات کے دائرے میں آتی ہیں بالاتر ہو جاتا ہے، یہاں ان کے وہ نظریات جو انہوں نے کام چلانے کے لئے عائد کر لئے تھے ختم ہو جاتے ہیں۔

حسن لائسنہ (چھوٹے احساس سے شروع کر کے جو جسم پر پورے طور سے پھیلا ہوا ہے اور بعد میں 'ظاہری حیات اور ان کے مقامات کو لے کر وہ ان مخصوص مرکبوں کے وجود پر غور کرتے ہیں جو جسمانی، علمی اور عقلی قوتوں سے متعلق ہیں۔ وہ جگر کو جسمانی تندرستی کے عملیات کا خزانہ و ماغ کو علم کا اور عقل کو پورا کرنے کا اور دل کو قوت اور ادی کا خاص عضو بتاتے ہیں، یہ مثلث اسی وقت تک عمل کرتا ہے جب کہ وہ عالم آتلہے میں ہے، آزاد ہو جاتا ہے اور اپنا الگ وجود رکھنے لگتا ہے، اس عالم کے حاصل ہونے سے پہلے انسانی جسمانی زندگی میں اس کا جسم نسائی جسم کے ساتھ وہی مقعد ادا کرتا ہے، جیسا کہ تخیل کے لئے اس کا خون یعنی غلظت انجام دیتا ہے۔

اخلاقی عمل کی بنیاد اس چیز پر ہے جسے شاولی اللہ فطرت کہتے ہیں یا جس کے معنی ہوں مخصوص انسانی مزاج جو اپنے کو حیوان سے ممتاز کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے پہلے شاولی اللہ کے حیوانی نفسیات کا مختصر مطالعہ دلچسپ ہو گا۔

### حیوانی نفسیات

شاہ ولی اللہ کے مابعد الطبیعیات کے مطابق ایک حیوان، مختلف بنیادی صورتوں کی پیٹا دار ہے جن میں سے ہر ایک مخصوص صفات رکھتی ہے حیوان اس دنیا میں جس صورت میں بھی موجود ہے وہی جان ماؤں کے صفات اور نباتات کی صفات بھی رکھتا ہے،

‘من جملہ ان صفات کے، جو حیوانوں کے لئے مخصوص ہوتی ہیں

### حیوانی مزاج

حیوان کو شعور، حسیات کے ذریعہ ہوتا ہے، وہ اعضاء جن کو شاولی اللہ الحی الظاہر

(ظاہری حس) اور (الحس الباطن) (مخفی حس) یا تصور یا عمل کہتے ہیں، اور اس کے علاوہ خوشی اور تکلیف کے احساس اور کچھ ذہن کے نیچے صوبے کی خصوصیات، حیوان کو اپنا شعور حاصل کرنے میں مدد کرتی ہیں۔ حقیقتاً ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حیوان نیچے درجے کی مخلوق سے ”نسمہ“ یا روحانی جسم یا عقلی خودی کی وجہ سے مختلف ہے، اس کے پانچ خارجی اور پانچ داخلی حس ہوتے ہیں ”نسمہ“ تصور کی قوتوں، عمل اور مادہ کا بھی مخرج ہے اور ان احساسات کا بھی جو حیوانی مخرج ہے اس کے لئے رجحانات پیدا کرتی ہیں۔

ایک خصوصیت جو انسانی مزاج کو حیوانی مزاج سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس میں ایک جزو ہے جس کو ”نفس“ یا طبع کہتے ہیں جس کے ساتھ مثلث کے دو اور عناصر ذہن عقل اور قوتِ ارادہ (قلب) بالکل مطوہیت کے عالم میں وابستہ ہیں، انسانی مزاج میں برعکس اس کے انسانی عقل سب سے اہم عنصر ہے، یہ بات آگے چل کر واضح ہو جائے گی! ان صفات کے عام بیان سے جو ذہنی مثلث کے ہر حصے سے وابستہ کرتے ہیں۔ یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ عمل اور ارادہ کے علاوہ قلب، مختلف قسم کے نفسیاتی احساسات نفسِ خوشی اور تکلیف کا بھی حامل ہے نفس کا اہم کام یا بھوک، جس حفاظت وغیرہ کی جہانی خواہش، قلب پر اس کی تمام خصوصیات پراثر کرتی ہیں اور عقل اس کی تمام حسّی قوتوں پر بھی اور اس سے حیوانی مزاج کی صفات اور احساسات پیدا ہوتے ہیں، ان کے انسانی دماغ کے مقابلہ میں سادگی اور بے ڈھنگاپن کی وجہ سے، حیوانی مزاج کی ان خصوصیات کو جبلتیں کہا جاسکتا ہے!

### حیوانی مزاج کی خصوصیات

حیوانی مزاج کی خصوصیات کا جائزہ لینے کے لئے ذیل اللہ ایک ایسے نر حیوان کے طرزِ عمل کا تجزیہ کرتے ہیں جو بالغ اور تندرست ہو اور یہ دکھاتے ہیں کہ وہ غصہ، ہمت، انتقام خود اعتمادی، اقتدار کا شوق، ماہ کی طرف رجحان، محبت اور حسد نمایاں کرتا ہے۔ حیوانا کے لئے عام طور سے ذیل اللہ فرماتے ہیں کہ وہ ایسی جبلتوں کے بھی آثار دکھاتے ہیں جیسے محبت، انگار، خوف، غم، اپنے ہم جنس سے تعلق، بچوں پر شفقت وغیرہ کہا جاتا ہے،

ان کے انسانی مزاج اور اس کے صفات کے تصور سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ حیوان کے سلسلہ میں سندرہ بالا صفات مقابلہ سادہ ہیں۔ ان میں وہ توجیب اور تبدیلی نہیں ہوتی جو ذہن کے اثر سے انسانی مزاج میں ارتقا پذیر ہے، حیوانی مزاج کی نفسیاتی صفات جس کو سادہ اور بے ڈھنگی صورت میں جبلتوں کا نام دیا گیا ہے۔ اور انسانی مزاج کی صفات جو زیادہ منظم اور پیچیدہ ہوتی ہیں۔ جن کو جذبات اور احساسات کہا جاتا ہے ان کے درمیان فرق شاہ ولی اللہ کے لئے واضح ہے۔ حالانکہ اپنی اصطلاحات میں وہ حیوانی جبلت اور انسانی جذبات و احساسات میں فرق نہیں کرتے۔ مثلاً حیوان و انسان دونوں میں ہمت کو وہ شجاعت کہتے ہیں۔ مگر انسانی بہادری کے بیان میں یہ واضح ہے کہ وہ حیوانی بہادری سے تربیت اور ارتقا میں آگے ہے۔ اس لئے یہ ان کے خیالات کے خلاف نہ ہوگا اگر ہمت جیسی پیچیدہ صفت کو حیوان کی جبلت تخریج کہا جائے جس کو وہ غضب کہتے ہیں، اس کو دوسرے نقطہ نظر سے خودی کی جبلت اور نفرت (اطراح) کی جبلت کہا جائے اس طرح دوسری صفات میں سے جن کا ذکر اوپر ہوا ہے، مختلف جنموں کے آپس میں ملنے کی جبلت کو جنسی جبلت کہا جائے اور مختلف افراد کے باہم میل جول کو گروہی جبلت کہا جائے۔ اسی طرح دوسری جبلتیں جیسے پداندہ جبلت، جنسی رفاقت کی جبلت، خوف، تسلیم وغیرہ بھی حیوانی مزاج کی مناسب صفات کے متوازی تصور کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ متواتر تبدیلی اور ارتقا کا خیال ان کی بحثوں کی ہمیشہ بنیاد ہے اس لئے حیوانی مزاج کی صفات کو جبلتیں مان لیتے ہیں اس طرح ان کے خیال کی تکمیل ہوتی ہے۔ بلکہ ان کو انسانی مزاج کی زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ صفات سے مختلف کہا جائے۔ یہی نقطہ نظر ڈاکٹر اللہ کے سات اخلاقی مضامین کو سمجھنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ یہ آگے واضح ہوگا کہ فیضانی زیادہ پیچیدہ صفات ہیں جن کا مخرج حیوانی مزاج کی مختلف جبلتیں ہیں۔

حیوانی طرز عمل

نفس کا غلام ہونے کی بنا پر حیوان اپنے ظاہری برتاؤ میں ہمیشہ ایسا عمل کرتا ہے جو اس کی جبلتوں کو تسکین دے اور اس کی جسمانی ضروریات جیسے کھانا، پینا، جنسی خواہش

وغیرہ کو پیدا کرے کسی فرد کی انفرادی ضروریات اور ذاتی رجحانات کی تسکین جیلتوں اور جسمانی ضرورتوں سے پیدا ہوتی ہیں مثلاً اللہ اس کو زائے الجہزی کہتے ہیں۔ اس لئے ان کے مطابق حیوان کا طرز عمل ہمیشہ انفرادی مقصد کے ماتحت ہوتا ہے۔ فردی اور ذاتی مقصد اور ضروریات کو تسکین دینے کی طرف رجحان دور (مستقبل) اور آخری مقاصد کا شعور نہ ہوتا اور زیادہ دینے معنوں کے مقاصد کا فقدان وہ صفات ہیں جو حیوان کے برتاؤ سے ظاہر ہوتی ہیں، وہ بھی ایک حیوان دیکھتا ہے جو کچھ وہ دیکھتا ہے اپنی انفرادی ضروریات کی تسکین سے آگے نہیں جاتا یہ چیزیں وہ ضرورت کے دباؤ میں آکر دیکھتا ہے۔

## الإنسانی نفسیات

انسانی مزاج جیلتیں اور محرکات :-

حیوان کا ایک مخصوص مثلث صفات کا مزاج ہوتا ہے جن کو ظاہری اللہ نے عقل، قلب اور طبیعت کہے یہ تین صفات جن کو بنیادی تین صفات کہا جاسکتا ہے انسان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ مثلث اس کے مخصوص مزاج کی بنیاد تعمیر کرتا ہے جو اس سے ترقی پذیر ہوتا ہے اس طرح حیوان کی جیلتیں اور محرکات بھی انسان میں موجود ہوتی ہیں جو اس بنیادی مثلث کی صفات میں شامل اللہ کے مطابق حیوان اور انسان دونوں وہ شے رکھتے ہیں جس کو روحانی کیفیات کہتے ہیں اور وہ ان کو ملکات کہتے ہیں۔ یہ ان کی جیلتوں اور محرکات سے متوازی ہیں۔ اور ان سے ملتی بھی فرق محض یہ ہے کہ حیوان کی روحانی کیفیات و ملکات ساتھ ہوتی ہیں۔ اور انسان کی ملکات اس کے گہرے اور اک، تصور اور استدلال کے ساتھ ساتھ زیادہ پیچیدہ ہوتی جاتی ہیں۔ سات اخلاق فاضلہ کا جن پر آگے بحث ہوگی، انہوں نے ہی سرِ خط لگایا ہے اسی اصول کی بنیاد پر جس کے مطابق حیوان اور انسان دونوں میں ابتدائی جیلتیں اور محرکات ہوتی ہیں۔ اس بنیاد پر بہت سے انسانی جو شس اور جذبات کو اس مندرجہ سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔ انسانی جو شس، جذبات اور اوصاف کی پیچیدگی، مخصوص انسانی ذہانت اور عقل کے زیر اثر تہمید اور تشکیل پاتی رہتی ہے جن سے تین ظاہری صفات ہوتی ہیں اور جو انسانی ذہانت کو حیوان

ذہانت سے ممتاز کرتی ہیں۔

### صفات ذہن کا مثلث

ارتقاء کے دوران میں خالص توہم، اور تصرف اور ذہانت کی دوسری صفات جو کہ انسان اور حیوان میں عام طور پر پائی جاتی ہیں، انسان کے معاملہ میں اس کی کلیہ سازی کی مخصوص صفت اور صفتِ آفاقیت کو تخلیق کرتی ہیں جو کہ ذہنی اللہ کے بیان کے مطابق رائے کلی میں نمودار ہوتی ہیں اور یہ ان کے منابطہ اخلاقیات میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں جیسا کہ ہم آگے جائزہ لیں گے اور انسانی طرز عمل کے لئے ایک نئے محرک و مقصد کی تعمیر کرتی ہیں۔ یہ تکمیلِ کاملیت نفس اور ایک نئے جوشِ جمالیاتی صفت جسے وہ 'ظرافہ' کہتے ہیں کی ضرورت بھی پیدا کرتی ہے اور یہ عام انسانی طرز عمل اور انسانی زینت اور جمل اور حسن کی قدر و قیمت کی صورت میں زیادہ شدہ صفت کا نمونہ نظر آتی ہے۔ اس طرح مخصوص انسانی مزاج کی صفات کا مثلث، 'بنیادی مثلث' سے نمودار ہوتا ہے اور روحانی کیفیات، 'جوش'، جذبات اور دوسری روحانی خصوصیات ان دو مثلثوں کے اثر اور تعاملیت کے تحت منسوخ و باقی ہیں اور یہ انسانی مزاج کی خصوصیات نشانیاں بن جاتی ہیں۔

### روحانی مزاج کے تین درجے اور مندرجہ ذیل۔

یہاں یہ امر ضروری ہے کہ مزاجوں کے تنوع کے بارے میں مختصراً لکھا جائے تاکہ ذہنی اللہ کے نظامِ اخلاق پر بصورت کیا جاسکے۔ روحانی مزاجوں کی متعدد اقسام میں سے جو انہوں نے بیان کی ہیں، ایک قسم روحانی اور جسمانی اجزاء کے تعلق اور ان کی قوت اور غلبہ پر قائم نظر آتی ہے۔ اس نظریہ کے مطابق روحانی امزجہ کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے ان کو ہم اصطلاحات میں 'جسمانی'، 'جسمانی نفسیاتی' اور روحانی قرار دے سکتے ہیں۔ اولین کو وہ 'نفس'، دہنی نورانی پیکر یا روحانی مسئلہ دوم کو 'ناتیم الطبع'، دیسی خفہ روحانی مزاج اور رسوم کو 'نقطہ ان الطبع'، یعنی پیدار روحانی مزاج، قرار دیتے ہیں۔

مزاج کی نائیدگی و ترجمانی کرنے والے جو بنیادی مثلث سے بنے ہیں اور حیوان میں بھی ہے جیسے نسبہ، یعنی روحانی مزاج، ایسی خصوصیات کا علمبردار ہے جن کے تحت اس میں



حرکات نمودار ہوتے ہیں جو خودی طور پر جسم کا عجز کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے خاطر حرکت میں لاتے ہیں اور اس دوران 'قوانت کے باب میں ذہن کی وہ بیانی سرگرمی کو محسوساتی طور پر وہ نہ تو کوئی شکل دیتے ہیں اور نہ ہی ان پر قابو پاتے ہیں۔ خفہ روحانی مزاج نسیم یا روحانی مزاج کے مقابلہ میں ذہن کی صلاحیت سے زیادہ ترقی اور شکل پاتے ہیں لیکن ان کے تصورات اور استدلال 'ان کے قاصر مشاہدے تک محدود ہوتے ہیں۔ اور وہ بڑی حد تک 'احساسات کے خودی مشاہدات کے باہر خالص تصورات یا صحت قائم کرنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ ان کا علم بھی حیوانات کی طرح اس دائرے میں آجاتا ہے جہ شاہ ولی اللہ علوم انسانیہ کہتے ہیں۔ بیدار امرزجہ کے مقابلہ میں 'خفہ امرزجہ 'مردہ مزاج کے دائرے میں آتے ہیں۔

خفہ امرزجہ کے مقابلہ میں بیدار امرزجہ زیادہ ترقی یافتہ زیادہ طاقتور اور زیادہ ترقی پزیر ہوتے ہیں۔ جسی ادراک کی معادنت کے بغیر اور طرز عمل کی خارجی اشکال کو مرتب کرتے ہوئے وہ ادراک کی تصورات قائم کرتے ہیں اور کوئی بھی انداز (مکان) اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ مطالعہ باطن کرتے ہیں اور وسیع تر کلیہ اور آفاقی مقاصد کی طرف جدوجہد کے حامل ہیں وہ مخصوص اشیاء میں مضمر روح اور آفاقی تصورات کا احاطہ کر سکتے ہیں اور اشیاء کے اسباب و علل کے علم اور فہم کی جستجو کرتے ہیں۔ وہ کثرت میں وحدت کا ادراک کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے غم اور سوئیں بھی ان ہی حالتوں سے نکلتی ہیں۔ ان ہر دو حالتوں کے برخلاف جن کا غم اور تنہائی کسی ایک شکل یا کسی دو سکے قابل ہی عمل پر منحصر ہوتا ہے۔ البتہ طبعی ضروریات اور تصورات یا روحانی کیفیات کے مقاصد انہی سے براہ راست تعلق رکھتے ہیں۔

خفہ امرزجہ 'ان صفات سے محروم ہوتے ہیں وہ خود کو اشیاء کی تکثیر و تنوع میں گم کر دیتے ہیں۔ وہ کثرت سے وحدت کی طرف اپنی منزل نہیں پاسکتے اور وہ کم دینیں اپنے ماحول مغلوب الحال میں محصور رہتے ہیں۔ دوسری طرف بیدار امرزجہ جن مقاصد اور روح کی تربیتی کرتے ہیں اور جن اصول کی صراحت کرتے ہیں وہ دراصل مناسبات کی جستجو کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانوں کی کثرت خفہ اقسام کے مزاج سے تعلق رکھتی

وہ لاشعوری یا احساس ذات کی حامل ہوتی ہیں۔ انہیں موثر رابطہ اور ترتیب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس، بیدار مزاج ان کے برخلاف زیادہ آزادی سے فروغ پاتے ہیں خفتہ مزاج کے لئے اعلانیہ سرگرمی، شکل اور روایت دکاہ ہوتی ہے۔ جب کہ بیدار مزاج کو اپنی نشوونما اور ترقی کے لئے شکل یا اعلانیہ سرگرمی کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے مزاج کی یہ دو اقسام، مختلف انداز میں اپنے مقاصد کی تشکیل بھی کرتی ہیں۔ اول الذکر میں برسر عمل محرکات 'فک المہمۃ' بالعموم طبعی اور بنیادی ضروریات سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور موثر الذکر میں برسر عمل محرکات بالاتر ہو جاتے ہیں اور بالعموم ذہن اور روح سے تعلق رکھتے ہیں۔ اخلاقیات علمہ کی بنیاد وہ طرز عمل ہے جو اول الذکر کی حالت عمومی کے لئے فطری ہے۔ اس کے برعکس اخلاقیات اعلیٰ کی بنیاد وہ طرز عمل ہے جو اعلیٰ تر اور بلند تر صفات کے فروغ کی حالتوں کے لئے فطری ہے اور جو نمایاں طور پر بیدار مزاج کی خصوصیات بھی ہیں۔ بنی نوع انسان کے برآمد اعلیٰ افراد مثلاً پیغمبر اور سالکوں کے مزاج بیدار مزاجہ ہوتے ہیں۔

## تعاملیت

شاہ ولی اللہ تعاملیت پسند ہیں۔ یہاں ان کے استدلال کے بارے میں مختصر سی بحث کی جاتی ہے ان کے خیال کے مطابق روحانی، جسمانی اور طبعی حالتوں کے درمیان ایک تعلق کا وجود پایا جاتا ہے اور اسی تعلق کے ذریعے، ذہن یا روحانی مزاج طرز عمل کی خارجی اشکال پر قابو پاتا ہے۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ انسانوں اور حیوانوں کی خارجی خصوصیات کے مشابہے کے ذریعے، کس طرح ان کے داخلی ذہن کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ عام طور پر ہوتا ہے کہ غصہ اور خود نمائی کے جذبات، ہیشہ اکثری ہوئی گردی، سخت چہرہ اور سختے ہوئے عضلات کے ساتھ ہائے جلتے ہیں حالانکہ جب تقدس، خوف خدا یا انکساری برسر عمل ہوتی ہے تو انسان کا سر جھک جاتا ہے۔ جسم ڈھیلا پڑتا ہے۔ اور عضلات ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ یہ مشاہدات

ذہن اور خارجی طرز عمل سے انسان کی طبعی حالتوں کے تعلق کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کس طرح ذہن، انسانی جسم پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہ بتاتے ہیں کہ عام انسانوں کے معاملہ میں ان کی طبعی حالتیں، ان کے ذہن پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کے مزاجوں کی تشکیل کرتی ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایک خاص درجہ پر جب کہ روحانی مزاج ترقی یافتہ نہیں ہوتا تب طبعی حالتیں روحانی کیفیات پر غلبہ رکھتی ہیں۔ یہ یہاں تک ہوتا ہے کہ ایک طاقتور جسم، ایک طاقتور دماغ ہی تعمیر کرتا ہے اور ایک کمزور جسم کا نتیجہ ایک کمزور دماغ ہی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں خارجی حقائق جو طبعی جسم (خود) کی بیاری عمر وغیرہ) پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جسم پر اخراجات کے ذریعہ روحانی مزاج پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ حالانکہ اعلیٰ اور مستحکم روحانی امزجہ مزاج المہدیہ میں ذہن کا جسم پر اسی قسم کا اثر نمایاں سمیت رکھتا ہے۔ ایسی صورت حال میں اس قسم کا اہلدادیہ طاقتور ذہن، طاقتور جسم زیادہ مناسب ہو جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں یہ واضح ہے کہ ذہن اور جسم ایک دوسرے پر قوت اور اثر کے مختلف درجات میں تعامل کرتے ہیں یہ عمل جسم کی بیماری اور ذہن کی غمراہی (فاجر العقلی) کی مدت تک پایا جاتا ہے یہاں تک کہ، مادی جسم میں سے طبعی موت یا روحانی عروج، آزادی کی ایک مادی حالت حاصل کرتے ہوئے جسے شاہ ولی اللہ نے موت الاختیار قرار دیا ہے روحانی مزاج اخراج کر لیتا ہے۔

## مزاج کا فروغ

شاہ ولی اللہ کے امزجہ عامہ کے فروغ کا تصور، تعاملیت کے نظریہ پر قائم ہے وہ کہتے ہیں کہ ہر شعوری اور بلاوی عمل یا سرگرمی ذہنی خارجی طرز عمل، فروغ پاتی ہے یا ایک اعتبار سے ذہن کی تعمیر کرتی ہے یہی نہیں کہ معنی، محرک ہی عمل کا سبب ہے بلکہ ہر عمل ہر آمیزہ کے عمل کے لئے محرک کو مستحکم بناتا ہے۔ مستحکم محرکات، مستحکم روحانی کیفیات کی تائیدگی کرتے ہیں۔ یہ ذہن کے شعور کی تعمیر کرتے ہیں۔ جو کارکردگی عمل اور زیادہ تیز و شعور پیدا کرتے ہیں پھر یہ مزاج کے عظیم تر فروغ اور قوت میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں جب کہ دوسری طرف زیادہ

مستحکم مزاج، عمل میں مستعدی اور کارکردگی بڑھادی تاکہ مزاج کی قوت اور اس کے عمل کی کارکردگی مسلسل تکرار و ترقی سے بڑھتی رہتی ہے۔ اسی طرح، شعوری قوت کی ہر کمی اور محرک کی قوت اسی تناسب سے ارادی قوت کو کم کرتی رہتی ہے۔ ترک و اعطام عمل سے قوت کا نیا یا تغیل پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح بنیادی مثلث کے اندر بھی تعامل واقع ہوتا ہے، جو صفائی مثلث اور نیلایا مثلث کے درمیان بھی ہوتا ہے۔ محرک عمل اور لوہا، ایک دوسرے سے منسلک نظر آتے ہیں اور ایک دوسرے پر تعامل بھی کرتے ہیں اور اس طرح وہ ایک دوسرے کی قوت میں اضافہ یا تغیل کرتے رہتے ہیں۔ حیوانی لحاظ پر، انسانی برتری یا امتیاز، اس حقیقت میں ہے کہ انسان کی اندرونی تعاملیت میں صفائی مثلث کے اکثر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں، وہ ان اور ذہانت کا اثر انسان کے مزاج پر عادی ہوتا ہے جو محرکات یا جبلتوں کو روکتا ہے ان کی آزمائش کرتا ہے اور عمل کی مقصدیت میں مدد دیتا ہے حالانکہ عمل اور رد عمل، جو جبلتوں سے حس اور غریزہ کے ذریعے سدھ پزیر ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک مقصدی اور شعوری عمل، مزاج کی پوشیدہ صفات کو فروغ دینے کے لئے اچھے وہ اس کی قوتوں کو ابھارتا ہے تاکہ ایک مکمل شخصیت کی تعمیر ہو سکے جس کو وہ 'سیرت الشفیہ' کہتے ہیں۔ یہ موزوں اور فطری، اخلاقی طرز عمل اسی تعامل کی معاد کرتا ہے جو فطری ترقی میں اپنا کردار ادا کرتا ہے اور جس میں یہ عقلی مداخلت، محرک اور عمل کے درمیان عادی ہوتی ہے۔

شعوری عمل اور غریزی طرز عمل کے تعلق کی جزئیات جاننے کے لئے یہ مفید رہے گا کہ شاہ ولی اللہ کی بحث 'سوق العمل' کا مطالعہ کیا جائے جس میں وہ بیان کرتے ہیں بے شک ایسے اعمال کا نتیجہ، جو انسان شعوری طور پر اور خاص مقصد کے ساتھ انجام دیتا ہے حالانکہ بنیادی طور پر اس کے حقیقی مخرج دلینی اس کی روح اور مثلثوں آہٹا ہوتا ہے مگر یہ مزاج کی طرف رجعت کرتا ہے اس سے وابستہ رہتا ہے۔ اس کے سوا میں اضافہ کرتا ہے اور اس کو وسیع کرتا ہے۔

یہاں منیٰ طبع پر ایک کم اہم امر کا ذکر، صرف یہ ثابت کرنے کے لئے ضرور کر دینا چاہیے کہ شاہ ولی اللہ کی رائے کے مطابق انسانی جسم کے تمام حصوں اور اس کے مزاج میں کتنا گہرا رشتہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایسی روحانی صفت حاصل کرنا چاہے جس کا اس میں، اس لئے فقدان ہو کہ اس میں، اس کے موافق جبلت نہیں ہے تو وہ تدبیر العلیٰ (یعنی ذہنی اور ظاہری کلیات) سے حاصل کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں وہ اس تدبیر کو خارجی شکل اور ذہنی ساخت سے انجام دے سکتا ہے جو ان اشخاص، جو روحانی صفات یا اخلاق بدرجہ اتم رکھتے ہیں، کے خارجی طرز عمل کے طریقوں اور شکلوں کے جاننے اور تقلید کرنے کی مدد سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس طرح، مزاج میں وہی صلاحیت رفتہ رفتہ وجود میں آئے لگے گی۔ جس کا اس میں فقدان ہے یہ مفروضہ کہ پیدا کر دہ صفت، جو تم میں نہیں ہے۔ شاہ ولی اللہ کے اصولِ تعاملیت میں پایا جاتا ہے۔

## اختلاف طبائع

انسان کے نظام الاعضاء میں ان مخصوص مقامات کے وجود کا ذکر ہو چکا ہے جن پر روحانی صلاحیتوں کے دونوں صفاتی مثالوں کا قیام ہے یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ مثلث ایک دوسرے پر عمل کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں، جسم و ذہن کے درمیان بھی کافی مقدار میں تعامل واقع ہوتا ہے صفت، قوت اور تناسب کا فرق، جس میں کہ وہ ایک دوسرے پر عمل اور تعامل کرتے ہیں نہ صرف حیوان اور قدیم دور کے انسان میں مزاجوں کے اختلاف کا سبب ہوتا ہے بلکہ یہ ترقی یافتہ، نئی نوع انسان میں بھی مزاجوں کا اختلاف پیدا کرتا ہے جس طرح کہ ذہن فروغ پاتا ہے اسی طرح روحانی مثلث تعاملیت اور ساخت میں زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں اور بے پایاں تنوعات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

مزاجوں کے تنوعات کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے تصورات کا تجزیہ کرنے سے ذیل کے نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔

(الف) ایک طاقتور اور گہرے مزاج کے وجود کے لئے ایک طاقت اور گہرے

بنیادی مثلث "کی ضرورت لازمی ہے۔

(ب) افعال اور تکالیف، مزاج کے متعدد حصوں یا اس کے طبعی حصوں اور روحانی مثلثوں کے درمیان، ایک متوازن اور اعلیٰ ترین مزاج اور شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔

(ج) بنی نوع انسان کے وہ مزاج، جو ذہنی قوت اور ذہانت سے مطلوب ہیں اور ان کی صفات، ان مزاجوں سے اعلیٰ تر ہیں جو جسمانی اور جسمانی و حیاتیاتی، فطرت سے تعلق رکھتے ہیں اور جیسا کہ یہ حیوان میں نظر آتا ہے جس میں کہ ایک محرک ہی عمل پیدا کرتا ہے اور محرک عمل انفرادی مقاصد اور خود نمائی کے سوا کسی اور شے سے روشنی حاصل نہیں کرتا۔

## انسانی مزاج میں دوئی پسندی

شاہ ولی اللہ حیوانات کے کردار کے مطالعہ کی ہدایت کرتے ہیں تاکہ ان حیوانی جبلتوں یا صفات کا سراغ لگایا جاسکے جو انسانی فطرت میں بھی موجود ہیں اور جو ان کے خیال کے مطابق انسان میں برقرار بھی رہتے ہیں۔ اسے وہ حیوانیہ یا ہیمنیڈ یعنی انسانی مزاج کا حیوانی پہلو قرار دیتے ہیں ساتھ ہی وہ اس امر پر بھی زور دیتے ہیں کہ کارکردگی عمل اور خارجی طرز عمل کے لئے مزاج کا ایک مستحکم حیوانی پہلو ضروری ہے۔ انسانی مزاج کا اعلیٰ تر روحانی پہلو، جو کہ بنی نوع انسان کا ایک حیوان سے نشان امتیاز ہے شاہ ولی اللہ اسے ملکیت یعنی انسانی مزاج کا فرشتہ صفت پہلو کہتے ہیں۔

یہ بالعموم ان صفات کا حامل ہوتا ہے جن کو وہ "لئے کئی" یعنی ایک وسیع تر اور عظیم تر متمم کی صفت و نظرافت، یعنی جمالیاتی صفت اور تکمیل، یعنی کامیت نفس کی خواہش قرار دیتے غیر معمولی حالات میں، جہاں فرشتہ صفت پہلو کی اعلیٰ سطح (یعنی ملکیت العالیہ) ہوتی ہے یہ اعلیٰ ترین صفات اور مافوق الفطرت وادارے اور پاک کی تباہ حالتوں کا انہماک کوئی ہے ایک اعلیٰ درجہ العالیہ کا فرشتہ صفت پہلو، جب کسی طاقتور حیوانی پہلو یا جسم پر چھا جاتا ہے تب یہ نہایت اعلیٰ عمل اور ایک طاقتور و برتر شخصیت پیش کرتا ہے صرف وہی افراد اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کرتے ہیں جو ان دونوں پہلوؤں کو ہم آہنگی کے ساتھ مجتمع

کرتے ہیں۔

ان مزاجوں میں، جن میں یہ دونوں پہلو ہم آہنگ اور ہم ماہ نہیں ہوتے بلکہ متماثل، یعنی تضاد میں ملتے ہیں۔ تب یہ وہاں عام طور پر عمل کے لئے زیادہ پُر زور اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اگر فرشتہ صفت پہلو طاقتور ہے اور حیوانی پہلو (جسم) اس کا اثر قبول نہیں کرتا تو انسان کی اعلیٰ تر فطرت آزادانہ فروغ پاتی ہے اور ایک مکمل حالت شعور اور علم کو کامیاب عمل کے بغیر، جو اسی علم کے ہمراہ گامزن ہو سکے، حاصل کر لیتی ہے۔ اگر حیوانی پہلو طاقتور ہے اور وہ فرشتہ صفت پہلو کو مغلوب کر دیتا ہے تو پھر حیوانی اور وحشی محرکات زیر عمل آتے ہیں۔

یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ مزاجوں کی تقسیم کے متعلق، شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق جو ان دونوں پہلوؤں کے درمیان رشتہ سے منسلک ہیں۔ ایک طاقتور اور اعلیٰ درجہ کے فرشتہ صفت پہلو کے زیریں ایک طاقتور حیوانی پہلو ایک ایسا مزاج پیدا کر دے گا جو قیادت اور بڑے پیمانہ پر تنظیموں کے امور کو بہت عمدہ طریقہ پر انجام دے سکے گا۔ جب کہ ایک طاقتور حیوانی پہلو (یا مثلاً طبعی قوت اور صلاحیت کے بغیر) کی معادنت کے بغیر فرشتہ صفت پہلو، ایسے انسان کو دنیاوی امور سے سبکدوش اور رہبانیت کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ حیوانی پہلو، بذات خود اپنے بہترین عالم میں جمائی محنت کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ اور اپنے بہترین عالم میں معاشرہ کے لئے خطرات کا منبع و مخزن ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ نے مزاجوں میں تنوع اور اختلاف کا جو بیان لکھا ہے وہ اتنا وسیع ہے کہ ان سب اقسام کو تفصیل سے بیان کرنے کے لئے جو انہوں نے بتائی ہیں ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے ہر حال یہ ضروری ہے کہ ان مزاجوں کی نمایاں خصوصیات بیان کر دی جائیں جن کو امزجہ گمراہ کہا جاتا ہے۔

عام انسانی مزاج کے برخلاف، جس میں عقل یا فرشتہ صفت پہلو، حیوانی پہلو پر غالب رہتا ہے، ایک مزاج گمراہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ذہنی صلاحیت یا فرشتہ صفت پہلو، حیوانی پہلو کے ماتحت ہوتا ہے۔ اور اس کے انفرادی مقاصد کی تکمیل کرتا ہے۔

اپنے افراد شعوی اور مادی طور پر معاشرے کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنے خود غرضانہ انفرادی مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔ لہذا 'معاشرہ کو لیے افراد سے بچانا'، 'ملکت اور پولیس کا فرض بن جانا'۔ جتنے زیادہ، یہ دونوں پہلو مستحکم ہوں گے اتنے ہی زیادہ یہ افراد معاشرے کے لئے خطرناک بنتے جائیں گے اس لئے اس بنیاد پر ہم استعارہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ صرف ایک منہ رشتہ ہی، شیطان ہو سکتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے نفسیاتی انہارات میں انسانی مزاج کے امراض کو بھی بہت کافی جگہ دی گئی ہے مگر یہ اتنا پیچیدہ مسئلہ ہے کہ اسے یہاں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

## حجابات

انسانی مزاج کا قدرتی فروغ، دونوں پہلوؤں کے قدرتی رشتہ کی بنیاد پر قائم ہے جس کے تحت عقل یا فرشتہ صفت پہلو، حیوانی پہلو پر حکمرانی کرتا ہے مگر بعض اوقات حیوانی پہلو کی قوت فروغ کی قدرتی ترقی اور فروغ کی راہ میں ایک 'حجاب' (رکاوٹ) میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی قسم کی رکاوٹ کو شاہ ولی اللہ حجاب الطبع (جسمانی و حیاتی حجاب) کہتے ہیں۔ اس پیدائشی حجاب کے علاوہ دو اور حجابات ہیں جو فطری ترقی اور فروغ کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔ یہ عیب فیزی ہیں۔

(الف) حجاب الرسم، رسم و رواج کی رکاوٹ ہوتی ہے یہ ایک عام فروغ کی ترقی کو اس وقت روک دیتی ہے کہ جب وہ اپنی افادیت سے زیادہ زندہ رہتا ہے اور ایک رکاوٹ بن جاتا ہے۔ اس طرح ترقی یافتہ افراد کی راہ ترقی میں، رسم و رواج رکاوٹ بن جاتے ہیں جو اگر چہ عام افراد کے لئے مفید ہوتے ہیں۔

(ب) حجاب سوا المعرفہ :- غلط ہدایت و مغایرت اور بے حقیقت رہنمائی کی رکاوٹ ہوتا ہے یہ تیسرا حجاب ہے جو کسی مزاج کے فطری فروغ کی راہ میں رکاوٹ ہوتا ہے۔ حجابات نہ صرف انسانی افراد کی داخلی نظرت ہیں بلکہ معاشرہ میں بھی بالواسطہ لگاؤ پیدا کرتے ہیں یہ اخلاقیاتی حمزہ کے لئے براہ راست اور بالواسطہ موانع بن جاتے



ہیں یا نفوس اعلیٰ اخلاقیات ان میں مجاہدات سے ذہن کو آزاد کرانے کے مقصد کی علمبرداری ہوتا

## مسرت اور غم

شاہ ولی اللہ کے مطابق، مسرت یا غم کا بنیادی محرک کسی محرک کی تسکین یا محرومی پر ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر، محرکات، افراد کے مفادات کے تحفظ کے لئے وجود میں آتے ہیں یا زیادہ واضح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی ایک یا دونوں، حیوانی اور فرشتہ صفت پہلوؤں کے لئے ہوتے ہیں چونکہ وہ ان دونوں سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لئے حیوانات میں مسرت اور غم بہت کم اور مناسب رہبری کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان کی مسرت ایسی شے ہوتی ہے جو حیوانات کے نظام الاعضاء کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ ان کی جبلتوں اور محرکات کو تسکین دیتی ہے۔ اور ان کے غم وہ ہیں جو ان کے بہتر وجود کے فوری محرکات کو شکست دیتے ہیں۔

جب مزاج کی نوعیت اتنی پیچیدہ ہو جاتی ہے جیسا کہ انسانی مزاج کا فاصلہ ہے۔ اور مزاج میں دونوں پہلوؤں میں جو تضاد وجود میں آتا ہے۔ اور روحانی محرکات اور مقاصد اور عقل میں جو کش مکش عادی ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسرت و غم کی تقسیم آسان کام نہیں۔ جب حیوانی اور فرشتہ صفت پہلوؤں کے درمیان کش مکش ہوتی ہے اور جسمانی حیاتیاتی محرکات (طبیعی) کی شکست سے غم پیدا ہوتا ہے اس لئے یہ طے کرنا آسان بات نہیں کہ غم ایک فرد کے لئے کہاں تک مفید ہے۔

ایسا ہی معاملہ اس وقت پیش آتا ہے کہ جب مسرت، جسمانی و حیاتیاتی تسکین کی خواہش سے مزاج کی اندرونی کش مکش کے باوجود، حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح، انسانی مسرت و غم حیوانات کے مقابلہ میں زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے نیز انسانی مسرت و غم دائمی اور دیر پا ہوتے ہیں۔ ذہن، مسرت و غم کے مشاہدات کے تاثرات کو، خواہ وہ جسمانی ہوں یا ذہنی، قائم رکھتا ہے۔ یہ آئندہ کے مسرت و غم کے لئے بٹے محرز ہو جاتے ہیں اور پیچیدہ قسم کی شعوریت اور ناکامی، دباؤ اور نفس کشی اور سوچ بچار کی یادیں، اور پھر مسرت کی یادیں، تسکین، نفس، اور صبر و قناعت کی خوش گوار یادیں بھی ذہن محفوظ رکھتا ہے یہاں پر نہ مسرت

ماہر نفسیات یا ماہر علم الامراض بلکہ روحانیت کے ایک طالب علم کے لئے بھی بہت وسیع میدان ہے۔

وہ پیچیدگیاں جو شاہ ولی اللہ تصور کرتے ہیں نہ صرف جسم کی خواہشوں پر دباؤ اور ان کی شکست سے پیدا ہوتی ہیں بلکہ وہ جنسی محرکات اور معمولی حیوانی خواہشات جو ذہنی پریشانیوں اور دوسری رکاوٹوں سے بھی پیدا ہوتی ہیں بالخصوص ان رکاوٹوں اور محافضوں سے جو ناقابل گرفت حیوانی پہلو یا پھر حیوانی نظام الاعضاء اور اس کی 'بے نکان' اور بے کار سرتوں سے یہ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس وہ سمجھتے ہیں کہ غم کا دائمی اور قائم عنصر بالخصوص وہ ہے جس میں فرشتہ صفت پہلو کا فروغ رک جاتا ہے۔ اور غم سے موت کے بعد بھی تعلق برقرار رہتا ہے کیونکہ یہ بحث مافوق البشر نفسیات اور روحانیت سے زیادہ تعلق رکھتی ہے جب کہ اخلاقیات اور عام نفسیات کے لئے اس کا بیان ضروری نہیں

## غم کا اثر

یہاں غم کے اثر اور مادہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق غم ایک دہانے اور کمزور کرنے والا اثر ہے۔ غالب حیوانی پہلوؤں کی سرتوں کا عقل کی محکومی کے ذریعہ، فرشتہ صفت پہلو پر چھا جائے غم پیدا ہوتا ہے وہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ لیکن حیوانی پہلو کے لئے ایک حد تک غم اٹھانا کارآمد اور مفید اثر رکھتا ہے چونکہ وہ اس کی طاقت کچل دیتا ہے اور گھٹا دیتا ہے اور اس طرح وہ فرشتہ صفت پہلو کو حیوانی سرتوں اور غلبوں کے غم ناک اثرات سے آزاد کر دیتا ہے انسان کے طبعی وجود کے دوران اس کے جسم کی بیماری، جسمانی محنت و مشقت اور بے آرامیوں کا اثر یکساں ہوتا ہے یہ اس اثر کی بنیاد پر ہے کہ معدے، تریکیہ نفس اور نفس کشی کے طریقے اس نے رائج کئے گئے ہیں کہ فرشتہ صفت پہلو کو حیوانی پہلو کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے مددگار ثابت ہو سکیں۔ اس کی تفصیلات کا تعلق اعلیٰ اخلاقیات، اعلیٰ یا مافوق البشر نفسیات اور روحانیت سے ہوتا ہے۔

## خوشی

شاہ ولی اللہ کے مطابق، خوشی، سعدہ، ان مزاجوں کو وہ عام حالت ہے جو اپنا فطری فروغ اور کمال حاصل کرتی ہے اور اس کے کسی پہلو پر غیر فطری دباؤ یا اس کے محرکات کی شکست سے اسے، نہ کوئی نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی مستقل غم ہوتا ہے ایک عام اور فطری راستہ میں مزاجی کام کے دھڑکے پہلو کی خواہشات اور رجحانات ہوتے ہیں اور فرشتہ صفت پہلو یا حیوانی پہلو میں سے کسی کو بھی، زبردست نقصان یا مستقل غم نہیں ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ، حالانکہ رہبانیت کے طریقوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اور یقیناً رکھتے ہیں کہ صرف انسانی مزاج کے حیوانی پہلو کو، جتنا زیادہ دیا یا اور کچلا جاسکے اور اس سے نجات حاصل کی جائے اتنا ہی فرشتہ صفت پہلو کو آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق، بنیادی مثلث یا حیوانی پہلو (جسمانی و حیاتیاتی فطرت)، انسانی مزاج میں پیدا کنسی امر ہے یہاں کہ اس کے محرکات کے غیر فطری دباؤ یعنی نوع انسان کے معاملہ میں، فائدہ کی بجائے زیادہ تر نقصان کرتے ہیں البتہ اس معاملہ میں، فائدہ کی بجائے زیادہ تر نقصان کرتے ہیں البتہ اس معاملہ میں، بہت ہی کم مستثنیات ہیں۔ انتہائی فائدہ مند حالت جو کہ فطری ترقی کے لئے، حقیقی مسرت (سعدہ الحقیقیہ) سے مربوط ہے۔ مزاج کی وہ حالت ہے جس میں کہ غیر فطری اور نقصان دہ حد تک، دردناک طریقوں سے حیوانی حیوانی پہلو دبا یا جاتا ہے مگر جسمانی و حیاتیاتی فطرت کو نہیں دبا یا جاتا، اور ایک طرح فرشتہ صفت پہلو کے تحت ڈھالا جاتا ہے اور اسی فرشتہ صفت پہلو کے ذریعہ اس کی خواہشات اور محرکات کی رہنمائی اور ہدایت کی جاتی ہے۔ فرشتہ صفت پہلو و روشن اعلیٰ ہوتے ہیں، جو اپنے رجحانات کی علیحدگی کے بغیر تسکین پاتے ہیں اس لیے آزادی و شکست کو ناکام بناتے ہیں۔ اس وضوح پر مزید بحث، ہمیں عملاً انسانی فطرت کی اعلیٰ صفات کی طرف لے جائیگی اور انکی نشوونما دہ ترقی، ایسے مومنوعات میں کہ جن کا تعلق، فوق البشر نفسیات اور اعلیٰ اخلاقیات سے ہوتا ہے۔ (مسل)

# شیخ الاشراق شہاب الدین السہروردی المقتول

ڈاکٹر بنی بخش قاضی

(۱)

توں وسطیٰ میں مسلمانوں کی ثقافتی تاریخ میں چار مشہور سہروردی عالم گزے ہیں

۱۔ شہاب الدین ابوالفتوح یحییٰ بن جش بن امیرک السہروردی  
المقتول (متوفی ۱۱۹۱ھ)

۲۔ ضیاء الدین ابوالغیب عبدالقادر السہروردی (متوفی ۱۱۶۳ھ) احمد الشرائی  
کے شاگرد اور آداب المریدین کے مصنف

۳۔ شہاب الدین ابو حفص عمر بن محمد بن عبداللہ بن عمویہ السہروردی (متوفی ۱۲۳۲ھ)  
شیخ سعدی کے استاد اور عارف المعارف کے مصنف

۴۔ محمد بن عمر السہروردی (ابو حفص عمر بن محمد السہروردی کے فرزند)  
زاد المسافر و ادب المحاضر کے مصنف

اس مقالے میں ہم صرف شہاب الدین ابوالفتوح یحییٰ بن جش بن امیرک  
السہروردی المقتول جو شیخ الاشراق کے لقب سے مشہور ہیں کے متعلق کچھ لکھیں گے  
شیخ الاشراق کے سوانح حیات پر ساتویں صدی ہجری، تیرہویں صدی میلادی کے

نوٹ ہے۔ اس مضمون کی آخری قسط کے آخر میں حواشی درج ہونگے۔ (مدیر)

تین اہم تذکرہ نویسوں نے مختصر لکھا ہے۔

۱۔ یاقوت الحموی (۵۷۵ھ - ۶۲۷ھ) نے ارشاد الاریب الی معرفۃ الاریب میں

(ص ۲۶۹ - ۲۷۲)

۲۔ ابن ابی اصیبعہ (۱۲۰ھ - ۲۴۹ھ) نے عیون الانباء فی طبقات الاطباء و

جلد دوم (ص ۱۶۷ - ۱۷۱) میں۔

۳۔ ابن خلکان (۶۸۸ھ - ۷۸۲ھ) نے کتاب وفيات الاعیان (ص ۹۷ - ۱۰۱)

میں ابن خلکان نے شیخ الاشراق کا پورا نام لکھا ہے: "ابوالفتوح یحییٰ بن حبش بن امیرک الملقب شہاب السہروردی الحکیم المقتول بجلب اس کے ساتھ یہ الفاظ بڑھادیئے: وقیل اسمہ احمد (اور کہا جاتا ہے کہ اس کا نام احمد تھا) ابن ابی اصیبعہ نے ان کا نام دوسرے سہروردی سے ملا دیا۔ (شہاب الدین السہروردی) ہو الامام العالم الفاضل ابو حفص عمر بن الخ یاقوت نے صرف یحییٰ بن حبش: شہاب الدین ابو الفتوح السہروردی تک اکتفا کیا۔

لیکن اسی مدی کے ایک اور مصنف نے شیخ الاشراق کی مفصل سوانح حیات لکھی امدان کے تصنیفات کی فہرست دی۔ اس مصنف کا نام ہے شمس الدین بن محمد بن محمود الاشراقی الشہر زوری جنہوں نے اپنی کتاب نزهة الارواح وروضة الافراح میں شیخ الاشراق کی زندگی پر لکھا۔ اس عربی کتاب کا فارسی ترجمہ ضیاء الدین زوری نے کیا ہے جو ۱۳۵۷ھ / ۱۳۱۷ھ قمری میں تہران میں طبع ہوا۔ الشہر زوری خود بھی اشراقی طریقے سے وابستہ تھا۔ شیخ الافراق سے اس کی وابہانہ عقیدت مندی تھی۔ شیخ الاشراق کی سوانح حیات کی ابتدا ان الفاظ سے شروع کرتے ہیں۔

ترجمہ السہروردی المقتول الحکیم المعظم والفیلسوف المکرم العالم الربانی والمتألف الروحانی العالم العاقل الفاضل الکامل شہاب الملة والدین المطلع علی الاسرار والہیة والراقی الی العوالم النورانیة ابوالفتوح یحییٰ بن امیرک السہروردی روح اللہ رسمہ وقدس نفسہ

شیخ الاشراق نے ایران کے شہر زرخان کے نزدیک "سہرورد" نامی ایک گاؤں میں ولادت پائی۔ چونکہ ان کے قتل کا سال ۵۹۶ھ بتایا جاتا ہے تبہ اور اس وقت ان کی عمر مستند روایات کی بنا پر ۳۸ برس بھی گئی ہے۔ ان کی ولادت ۵۵۹ھ میں واقع ہوئی ہوگی۔ (مولنا جامیؒ اور فراسوی عالم سینوٹ نے شیخ الاشراق کے قتل کے وقت ان کی عمر ۳۶ برس بتائی ہے)۔ عنفوان شباب میں مراۃ گئے اور محمد الدین البیلی کے درس میں شامل ہوئے۔ اس کے بعد اصفہان گئے جہاں الظاہر الفارسی سے ابن سہلان السادی کی کتاب "البصائر" پڑھی ۵۸۹ھ میں حلب گئے۔ اس وقت حلب میں سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک الظاہر کی حکومت تھی۔

حلب میں علادیہ مدرسہ میں قیام کیا اور افتخار الدین کے درس میں شامل ہوئے۔ شیخ الاشراق افتخار الدین کے شاگردوں کے ساتھ جو فقہ میں ماہر تھے مباحثہ کرتے تھے اور ہمیشہ مباحثوں میں ان شاگردوں سے سبقت لے جاتے تھے۔

یا قوت کہتے ہیں (ص ۲۶۹)

تم رحل ابوالفتوح الی حلب عند خلدی فی زمن الظاهر غازی بن ایوب سن۵۷۹ و نزل فی المدرسة الخلدیة وحضر درس شیخہا الشریف افتخار الدین و بحث مع الفقہاء من تلامیذہ و غیرہم و ناظرہم فی عدۃ مسائل فلم یجاسرہ احد منهم و ظہر علیم و ظہر فضله للشیخ افتخار الدین ف قرب مجلسہ۔

جیسے زمانہ گزر گیا وہیے شیخ الاشراق کی شہرت الملک الظاہر تک پہنچی اور سلطان الظاہر شیخ کو عزت اور تکریم سے دیکھنے لگے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ علماء جو شیخ الاشراق سے مباحثوں میں ہار گئے تھے وہ ان کے دشمن بن گئے انہوں نے شیخ الاشراق پر لہاؤ کا فتویٰ دیا اور سلطان صلاح الدین الملک الظاہر کے والد کو لکھ کے بھیجا کہ شیخ الاشراق کی محبت میں الملک الظاہر کے اعتقادات ناسد ہو گئے ہیں۔ اس پر سلطان صلاح الدین نے الملک الظاہر کو شیخ الاشراق

واقعات ہیں جو تاریخ کے بر طالب علم کی توجہ کو اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ یہ تمام واقعات حضرت شاہ ولی اللہ کے سلسلے گزرے تھے۔

سادات بارہہ

شاہ صاحب کی عمر چار سال کی تھی کہ سلطان اورنگ زیب عالم گیر کا انتقال ہوا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا بہادر شاہ اول تخت و تاج مغلیہ کا وارث بنا۔ اس کی موت پر معز الدین جہاندار شاہ اور فرخ سیر میں جنگ ہوئی۔

سادات بارہہ کے دو سید بھائیوں کی مدد سے فرخ سیر نے کامیابی حاصل کی۔ یہ کامیابی چونکہ بالکل برہم کے سیدوں میں سے دو بھائیوں حسین علی خاں اور من علی خاں کی رہنمائی میں تھی، اسی بنیاد پر فرخ سیر کے عہد میں حکومت پران ہی دو بھائیوں کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اور ایسا اقتدار کہ بادشاہ بے چارہ شاہ شطرنج ہو کر رہ گیا۔ قندار فرخ سیر کے لئے یہ صورت ناقابل برداشت بنتی پہلی بار ہی تھی۔

سید بھائیوں اور فرخ سیر میں ان بن ہو گئی اور اسی مخالفت اور معاندت نے بالآخر ان تاریخ کو پیدا کیا جن کا خمیازہ آج تک مسلمان بھگت رہے ہیں۔ طباطبائی کو سید برادران سے باوجود رشتہ ہم مشرئی لکھنا پڑا کہ آہستہ آہستہ ہندوستان کی ساری مملکت کا اس فساد نے احاطہ کر لیا اور تیموری سلاطین کا اقتدار قطعی طور سے فنا کی آمدنی کے نذر ہو گیا۔ فرخ سیر ان بھائیوں کے ہاتھوں مقتول ہوا اور انتہائی بے دروی اور شرافت قلبی میں اس کی گردن کھینچ دی گئی۔

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی نے تاریخ لکھی۔

دید کی کہ چہ بادشاہ گرامی کروند  
مد جو رو جف از رہ خالی کروند  
تاریخ چو از خردو بنجتم فرمود  
سادات بولے نک حسری کروند

فرخ سیر کا ان بھائیوں کے ہاتھوں سے قتل ہونا تھا کہ ملک میں ایسے زلزلے شروع ہو گئے کہ انہوں نے پھر مسلمانوں کو ہینٹلے کا موقع نہ دیا۔

فرخ سیر کا قتل ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) کا واقعہ ہے۔ اس وقت شاہ صاحب کی عمر ۱۷ برس کی تھی۔ اسی سال آپ اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم کی مسند تدریس پر جلوہ افروز ہوئے تھے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ فرخ سیر کے مطلوبانہ قتل سے برہمی کے نتیجے میں ہرج و مرج عظیم دست داد۔ یعنی سخت کشت و خون ریزی ہوئی خصوصاً توڈانی امراء سخت برہم ہوئے۔ آصف جاہ جنہوں نے عہد دل اور منصبوں کو خیر باد کہہ دیا تھا اس واقعہ سے سخت مشتعل ہوئے۔ سید برادران نے بڑی کوشش کی کہ ان کو کسی طرح بام کیا جائے لیکن وہ دلی چھوڑ کر وکن چلے گئے اور سید برادران کے خلاف لوگوں کو ابھارنا شروع کیا مشہور ہے کہ حسین علی خاں نے ایک خط بڑی منت سماجت کا ان کو مالوہ لکھا۔ جواب میں مسرف یہ شعر لکھ کر حضرت آصف نے بھیج دیا۔

من بے وقایم بوفانی خورم قسم  
من چون شہانیم بشامی خورم قسم

بہر حال فرخ سیر کو ختم کر کے ان بھائیوں نے پہلے ریح الدہات کو پھر ریح الدولہ کو دلی کے تخت پر بٹھایا چونکہ دونوں مدقوق تھے۔ تین چار مہینوں کے اندر اندر دونوں کا خاتمہ ہو گیا تب سید برادران نے محمد شاہ کو اپنا نوکر بنا کر مغل تخت پر بٹھایا۔

لیکن سید برادران اچھی طرح جانتے تھے کہ آصف جاہ ان کے راستہ کا سب سے بڑا کاٹنا ہے اور اس سے قبل کہ یہ کاٹنا ان کے پیسر کی جگہ حلق میں پھنسنے سے راستہ سے ہٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ محمد شاہ کو تخت پر بٹھاتے ہی اسے یہ سبھانا شروع کیا کہ تخت کے لئے سب سے بڑا خطرہ آصف جاہ ہے اور اس خطرے سے نجات حاصل کر لینا آپس ضروری ہے۔ محمد شاہ جس کی بادشاہت ہی ان دونوں بھائیوں کی رہیں منت تھی، ان کی رائے سے سر تابی کی ہمت کہاں سے لاتا۔ اپنے تین پیش روؤں کا انجام دیکھ چکا تھا۔ وہ خود اگر ہر بادشاہ تھا لیکن ان دونوں بھائیوں سے سخت خائف تھا۔ جب دونوں بھائیوں نے



آصف جاہ کے خلاف لشکر کا مشورہ دیا تو وہ فوراً آمادہ ہو گیا اور حسین علی خاں کو ساتھ لے کر  
تورانوں کے سردار آصف جاہ کو ختم کرنے کے لئے ایک فوج لے کر دکن کی طرف روانہ  
ہوا۔ جہاں آصف جاہ نے قبضہ جمایا تھا مگر دلی سے چند منزل ہی آگے بڑھے تھے کہ آخر  
جس شاہین بلند آشیاد کے لشکر کے لئے نکلے تھے اس کی دعا ہاتے نیم شبی یا اس کی حکمت عملی  
کے لشکر ہو گئے۔ آصف جاہ کے بچاؤ بھائی امین خاں کے اشارے سے میر حیدر کا بخشی نے  
حسین علی خاں کا کام تمام کر دیا۔ سفر میں جب حسین علی خاں کی بارگاہ لوٹی گئی تو طباطبائی کے بیان  
کے مطابق اس وقت اس کے خزانہ میں ایک کروڑ روپیہ تھا۔ ایک بارو کا ٹوٹا تھا کہ دوسرا  
بازو بھی ایرانوں کا بظاہر ٹوٹ گیا۔ یعنی دو لشکر بھائی قطب الملک حسن علی خاں نے محمد شاہ  
کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قید خانے میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیں۔ تورانی امیروں کی مغل  
دہار میں یہ بڑی کامیابی تھی۔ محمد شاہ کی جان میں ہان آئی۔ آصف جاہ کو دکن سے بلا کر دیر غلام  
بنایا۔ لیکن کچھ ہی دن کے بعد حالات بالکل بدل گئے خود غرض اور جاہ پرست امیروں نے محمد شاہ  
کو پھر تورانیوں کی بجائے ایرانیوں کے زیراثر ڈالا۔ بادشاہ نے مذہب نہیں بدلا لیکن مشرب  
ضربہ بدل گیا۔ اہر سیاہ ان کا نقیب قرار پایا عام حکم تھا کہ ادھر ہمالیہ کے دامن سے گھٹا  
اٹھے، بادل گرے کہ خیمہ خرگاہ صحرانہ ہو ہر طرف۔

می دید مسجد کلمہ بیتہ سبحان

الصیوح الصیوح یا اصحاب

زالہ بارید بر رخ لالہ

المدام المدام یا اصحاب

کا شور تھا۔ اسی لئے بچاؤ آخر میں رنگیلے کے نام سے بدنام آؤں گا۔ آصف جاہ دہار کے  
اس رنگ کو دیکھ کر پھر دکن کی پہاڑیوں اور جنگلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

کہا جاتا ہے کہ ایرانی امراء آصف جاہ کی وارسی پر نقشہ چمت کیا کرتے تھے۔

آصف جاہ جب قلعے میں داخل ہوتے تو پڑھانہ رکھنے کا فقرہ آپ کی شان میں استعمال  
کیا جاتا ایک دن جھلا کر آصف جاہ نے کہا مجھے جو چاہو کہ لو لیکن میری آنکھیں اس دن

کو دیکھ رہی ہیں جب لال قلعہ کی دیواروں پر بندرا چلتے پھریں گے۔ اس کے بعد ہی انہوں نے دربار سے علیحدگی کا معصم ارادہ کر لیا تھا۔

## سکھ تحریک

ایک طرف اندرونی قوتوں سے مغلیہ سلطنت کی بنیادیں ہل چکی تھیں خود شاہ صاحب کے بقول ان حالات کی ذمہ سے امور سلطنت میں عظیم انتشار اور بد نظمی تھی۔ دوسری طرف بیرونی سازشیں اور اختیار کی ریشہ دوانیاں تھیں کہ چین سے نہ بیٹھنے دیتی تھیں۔

۱۱۲۲ھ مطابق ۱۷۱۰ء میں جب کہ حضرت شاہ ولی اللہ کی عمر تقریباً ۸۷ سال کی تھی کہ راجپوت راجاؤں نے اجیر کے قریب ایک اجتماع میں مغل سلطنت سے بغاوت کا اعلان کیا تھا۔ اور مغلیہ سلطنت کے خلاف کھلم کھلا جنگ کے معصم ارادے کا اظہار کیا تھا راجپوتوں کی طرح سکھوں نے بندہ کی سرکردگی میں مسلمانوں کو تباہ کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اور وہ جہاں بھی گئے انہوں نے مسلمانوں کے قتل و غارت کا بازار گرم کیا ۱۱۲۶ھ میں سر ہند میں چار روز تک غارتگری اور ظلم و ستم کا دور دورہ رہا مسجدیں گمراہی گئیں۔ مسلمانوں کے گھر جلانے گئے عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں اور مسلمانوں کا خون بہا یا گیا سکھ مذہب کے بانی گردوانک ایک صوفی مشرب بزرگ تھے۔ آپ قبیلہ تلونڈی میں جسے اب ننکانہ کہتے ہیں ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ مگر نتھ صاحب جو سکھوں کی مقدس کتاب ہے اس کے مطالعہ سے صاف ظہور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ سکھوں کے مذہب میں اسلامی تصوف کے اجزا بہت کثرت کی سے پائے جاتے ہیں گویا یہ کتاب اس روحانی میل جول اور نزدیکی تر رشتہ کا اظہار ہے۔ جو سکھ مذہب اور اسلام میں ہے۔ گردوانک خدا کو ایک ماننے تھے، بت پرستی سے نفرت تھے۔ لیکن گورو گوبند کی کوششوں سے اس تحریک نے ایک قطعی سیاسی رنگ اختیار کیا۔ سیر المتاخرین میں ہے۔

گورو گوبند نے اپنے باپ تیغ بہادر کی جگہ بیٹھ کر اپنے فرقہ کے براگندہ اور مستشارانہ کو آہستہ آہستہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ ہتھیار، گھوڑے اور دوسرے جی سازوسامان

جولائی ۱۹۵۰ء

۱۵۰

الرحیم حیدر آباد

بھی فراہم کئے ادا کرنے کے لئے یہ سب کچھ تقسیم کرنے لگا۔ یوں آہستہ آہستہ اس نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کئے اور دوڑ دوڑ کر ہونٹ کی ابتدا کی۔

مگر گو بنہ سنگھ کے بعد جب بندہ اتنی شخص سکھوں کا گرو قرار پایا تو اس نے ظلم و ستم انتہا کو پہنچا دیا۔

لبا لبائی کا بیان ہے۔

اہل اسلام کے گاؤں اور آبادیوں پر جہاں کہیں قابو پایا تھا چڑھ دوڑتا تھا اور باشندوں میں جس کسی کو پایا باقی نہیں چھوڑتا تھا خواہ وہ چھوٹے کسے ہی کیوں نہ ہوں۔ قنات و بطیش شدید و جاریت کا یہ عالم تھا کہ مالہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ کو باہر نکال کر مار ڈالتے تھے :

لبا لبائی مزید لکھتے ہیں

مذکورہ بالا بندہ، بادشاہی فوج کا بہت کم سامنا کرتا تھا۔ بلکہ زیادہ تر گوریلا واسکے طور پر چھپ چھپا کر حملے کرتا تھا۔ ادا طراف و جوائب میں پھرتے ہوئے راہزنی کیا کرتا تھا وہ کبھی ایک جگہ اپنا ٹھکانہ بنا کر نہیں رہتا تھا۔ جہاں کہیں موقع ملتا وہ قتل و غارتگری لوٹا اور ساہو و مقابر کے لٹنے اڑنے اور تباہ ویراں کرنے میں کمی نہیں کرتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے سکھوں کے مظالم کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور بقول مولانا مناظر احسن گیدڑی۔ اس وقت حضرت شاہ صاحب جو ان ہو چکے تھے۔ اگرچہ سکھوں کے مظالم کی داستان حضرت شاہ ولی اللہ کے دور حیات سے بہت طویل ہے۔ لیکن ہم اس مضمون کو حضرت شاہ صاحب کے عہد کے سیاسی حالات تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں۔

مرہٹہ تحریک

ایک طرف پنجاب سے یہ آمدھی اتلی تھی اور تدریجاً تیسرے سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی سلطنت و حکومت بھی اس کے مقابلہ میں بسا اوقات اپنے کو مجبور دیکھتے ہیں پاتی تھی دوسری طرف شیواجی کے دفاع نے دکن میں جو لالہ جوڑا تھا حال گیسر کی بدست سالہ

لسل کوششوں سے اگرچہ کبھی کبھی دب جاتا تھا۔ لیکن سچی بات یہی ہے اور جیسا کہ بلال بلالی نے لکھا ہے کہ عالمگیر نے ہدات خود دکن کی طرف رخ کیا۔ اور پورے ۲۵ سال مرہٹوں کی دشمنی میں صرف کئے۔ لیکن شاہی رکاب میں جو امراء تھے۔ ان کی سستی و کاہلی سے جس میں ان کے اغراض پوشیدہ تھے معاملہ کا قطعی فیصلہ نہ ہونے پایا یا امراء اپنے ذاتی اغراض کے تحت مرہٹوں کے ہنگاموں کو فتنہ مینا ہی نہیں چاہتے تھے۔

اورنگ زیبی پنجب فولاد کی گرفت و دراز ہو جانے کے بعد مرہٹوں کو نہ صرف دکن اور نوکن میں بلکہ ہندوستان کے اکثر علاقوں میں تگ و تار اور تاخت و تاراج کا کھلا میدان مل گیا۔ ”بزدگی“ جو مرہٹہ غارت گروں کا کپکا دینے والا نام تھا۔ اس سے ملک کے اکثر و بیشتر صوبے پامال ہو رہے تھے۔ خود دہلی پر اکثر مرہٹوں کے حملے ہوتے تھے۔ اور حکومت ان کے مقابلہ سے دن بدن اپنے کو عاجز پاتی چلی جا رہی تھی۔ مرہٹی تحریک کے مقصد اور نصب العین کے بارے میں غلام علی آباد بگلہاری خزانہ محاصرہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

لوگوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہے کہ دونوں فرقوں مرہٹہ اور کوکن برہمن کی یہ نیت ہے کہ جہاں ان کو قابو حاصل ہو جائے۔ وہاں خدا کی ساری مخلوق کے ذرائع معاش کو بند کر کے اپنی طرف ان کو سمیٹ لیں۔

زمینداری، مقدمی، پٹواری کا کام ان پیشوں کو بھی پرانے لوگوں کے ہاتھوں میں باقی نہیں چھوڑا ہے۔ جو پچھلے ان لوگوں کے وارث ہیں ان کی جڑ تک نکال کر انہوں نے پھینک دی۔ اور سب پر اپنا عمل و ظل قائم کر لیا۔ آخر میں ان کے اندرونی منصوبے کا ذکر ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

”یہ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ تمام روئے زمین کے مالک بن جائیں۔“

چنانچہ سیرالٹا فرین میں ہے کہ جہاں کہیں آبادی انہوں نے پائی اسے جلا کر لوٹ لوٹ کر زمین کے برابر کرنے چلے گئے۔ بہر حال ایک طرف پنجاب سے سکھوں کا فتنہ تھا جو آدمی کی طرح اٹھا تھا اور اسلامی منہ کے سیاسی مصلح پر چھاتا چلا جاتا تھا۔

دوسری طرف جنوبی ہند کامرہٹی سیلاب تھا۔ جس میں جنوب سے شمال اور مشرق سے مغرب تک کے مسلمان اپنے ڈوبنے اور بہنے کا تماشہ دیکھنے کا انتظار کر رہے تھے۔

۱۱۳۷ھ مطابق ۱۷۲۴ء میں شاہ صاحب کی عمر ۱۷ سال کی تھی کہ حسین علی خاں بالاجی دشوانا تھ پیشوا کی سرکردگی میں گیارہ ہزار مرہٹہ فوج دہلی میں لے آیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت مرہٹے کمزور ثابت ہوئے اور بہت بڑی تعداد میں مارے بھی گئے لیکن آئندہ کے لئے ان کے واسطے رستہ کھل گیا کہ وہ مغل سلطنت کو نقصان پہنچا کر اس علاقہ میں اپنا اثر و نفوذ بڑھاتے۔ اور ملے کرتے رہیں۔

۱۱۵۴ھ تک جب کہ شاہ صاحب کی عمر تقریباً ۴۸ برس تھی مرہٹوں کا خطرہ تشویش ناک مد تک بڑھ چکا تھا۔

۱۱۵۴ھ میں باجی راؤ پیشوا کو اتنی جزا ہو گئی کہ وہ دہلی پہنچا اور اس نے دہلی کے نواحی علاقوں کو لوٹا۔ اس کے بعد ۱۱۶۳ھ میں پھر ایک بار دہلی مرہٹہ گروہ کا نشانہ بنی۔  
(سلسلہ)

## لمحات

شاہ دلی اللہ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے۔ اس میں دجھو، دجھو سے کائنات کے ظہور تہلی اور تہلیات پر بحث ہے۔ یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی۔

مولانا غلام مصطفی قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت - دو روپے

## ہماری چند بنیادی قومی خامیاں نفل عید

ہمارا معاشرہ روز بروز اپنے مطالع میں مادیت پرست ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم قلب و نظر کے صحیح تقاضوں سے غافل ہو گئے ہیں۔ بے نفسی و بے غرضی یعنی حسن عمل کا ہم میں فقدان ہے۔ ہم ان تمام محرکات اور عوامل و عوامل کو جو ہماری روحانی زندگی اور مکارم اخلاق کے تقاضات ہیں، فراموش کرتے جا رہے ہیں، اسی طرح ہم نے ان افتادہ کی قیمت مقابلہ کم کر دی ہے۔ جن کا تعلق علوم مجرہ یا ادب سے ہے۔ یا ان اکتسابات سے جو ذہن کو مجلا اور روح کو مصفا کرتے ہیں، لیکن براہ راست معیشیاتی قدر و قیمت نہیں رکھتے ہی وجہ ہے کہ ایک محکمہ یا ادیب کی عزت بمقابلہ ایک ماہر علوم طبیعیات کے کم ہوتی ہے۔ ان دونوں پر ایک اعلیٰ منصب دار کو فضیلت تادمہ حاصل ہوتی ہے اس کی لم یہ ہے کہ اول الذکر طبقہ کے لوگ خالصتاً ہماری روحانی و اخلاقی ضرورتوں کے کفیل ہوتے ہیں اور ثانی الذکر قسم کے لوگ ہماری مادی و معاشی ضرورتوں کے پورا کرنے میں ہماری رہبری کرتے ہیں۔ اور آخر الذکر طبقہ کے افراد ہمارے خدا و عمان مجازی یعنی صاحب اقتدار و متعشر روزگار ہوتے ہیں۔ غالب دیدہ و دراز نکستہ۔ بچنے لے ہیں مادی تن پروردی کے کھوکھلے پن سے جو اخلاقی سر بلندی سے معزاً ہوں یوں شنیہ کیا ہے۔

ناکس ز تو مندی ظاہرہ شو کس چوں سنگِ سرور کہ گری است و گرانیت

ایک مثالی تصویریت اور روحانی عینیت رکھنے والے معاشرہ کے لئے یہ لازمی ہے کہ وہ مادیت و روحانیت کے دونوں پہلوؤں کے درمیان توازن قائم رکھے ان کی ساری ساری سے ہی انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ عصر حاضر کے آلام و امراض جو داس گیسرا انسانیت ہیں، اس حقیقتِ نفس الامری کی آئینہ داری کرتے ہیں کہ ہماری تہذیبِ نفس اور مقاصدِ حیات کی سر بلندی طبعیاتی علوم اور فنی و صنعتی ترقی کے قدم بہ قدم اور دوش بدوش نہیں ہوئی مغرب کی میکائیکی تہذیب نے اخلاقیات پر مناسب زور دینا ترک کر دیا ہے اور خوب وقت کے باطن عدم تمیز نے جائز مقاصد کے لئے جائز وسائل کے رابطہ کو غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ مغربی ممالک جہاں جمہوری طرز زندگی کی آزادی ہے سائنسی مادیت پرستی کے صدمہ سے ایک حد تک جان بڑھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور کلیسیائی روایات کی قوت نے بعض اخلاقی و روحانی قدروں کو اس بنا پر پھالیا ہے کہ وہ قوی سیرت و کردار کا جزو لاینفک بن چکی ہیں۔ لیکن وہ ایشیائی یا افریقی ممالک جنہوں نے اپنے ماضی کا استحقاق و استغفات یا رد و انکار کیا ہے اپنی ثقافتی روایتوں اور تمدنی معتقدات پر خطِ تیغ کھینچ رہے ہیں۔ اور اگر آج نہیں تو کل یہ نصرت ضرور آئے گی۔ بانی جو کچھ بچا ہے یا جو بچے گا وہ بے یقینی کے سوا کچھ نہ ہوگا بے یقینی تشکیک و اکتساب سے بھی بدتر ہے۔ تشکیک میں طلب حقیقت کا پہلو مضمر ہے اور عدم یقین میں بجز بے اطمینانی و بے رخی کے کیا رکھا ہے۔ نصب العین سے معرکوں کی مثال ایسی ہے جیسے تند ہوا میں اڑتے ہوئے تنکے۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہم مادی ترقی و پیش قدمی کے ناگزیر تقاضوں کو نظر انداز کریں مادی دولت و مادی آسودگی کی تلاش انسان کے لئے ایک امر طبعی ہے۔ لیکن متمدن انسان کا جذبہ تمیز لازماً اس بات پر مہر ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے ذرائع بھی اچھے اور حق بجانب ہوں۔ میری مراد یہ ہے کہ ہماری معاشرتی قدیں سر تا پا مادیاتی یعنی اتنی نیم انسانی خود غرضی پر مبنی نہ ہوں کہ تمام روحانی و اخلاقی محرکات جو آدمی کو کم درجے کے حیوانات سے تمیز کرتے ہیں، منقود ہو جائیں۔

اگرچہ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہم اپنے مطامع و مقاصد اور مادی حیات میں مغرب کی

نہت بہت زیادہ روحانی ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہ استثناء معدودے چند نفوس کے یہ معاملہ بالعکس ہے مغرب کے خلاف یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کی تہذیب اور تمدن ازسرتاپا مادیاتی ہیں۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ ارتقاءاتِ انسانیہ ان کے ہاں ہماری نہت زیادہ کارفرما ہیں۔ اداستِ خیرہ صدقات جاریہ اور معاشرتی فلاح کی دوسری تحریکیں و تدبیریں ان کے سماجی اداروں اور کلیائی نظام میں بہت نمایاں حیثیت رکھتی ہیں اس کے برخلاف ہمارے معاشرہ میں معاشرتی فلاح اور سماج سدھار کی روح ناپید ہے۔

انجمن و دیگرے نیت کی ادبیات ہے۔ جہاں تک ہماری یاد کا تعلق ہے، ہماری ساجد کسی غلامی یا خیراتی عزیمت کی حامل نہیں ہیں۔ یہ خارجِ بحث ہے کہ کسی گزشتے ہوئے وعدہ میں کیا کیا غویاں تھیں۔ ہمارے کروڑ پتیوں اور بڑے بڑے سرمایہ داروں کی بہت کم یہ توفیق نصیب ہوئی ہے کہ وہ اوقات اور خیراتی ہسپتال مفت تعلیم دینے والی درس گاہوں اور دیگر ادارتِ خیرہ کا قیام عمل میں لائیں۔ ناداروں، ابا جوں اور تانیناؤں کی دیکھ بھال کے لئے غریب خانے بنائیں یا کم از کم فائدہ کشوں کے لئے نگہبہ جاری کر دیں منظم طریقہ کی خیرات تو ہمارے ہاں تقریباً مفقود ہے۔ انفرادی طور پر بعض اصحابِ خیر خیرات کرتے ہیں لیکن وہ مستحقین کے لئے قطعاً ناکافی ہے۔ خیرات کی اس رسم سے درپوزہ گری کی البتہ حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

ہمدردی بنی نوع انسان کے جذبہ کی کمی اور صدقاتِ جاریہ کی روح کے فقدان کا سبب یہ ہے کہ ہمارا مقصود حقیقتاً مادی انتفاع اور نفس پروری ہے۔ ہم شافو نادہی کوئی ایسا کام کرتے ہیں جو ذاتی طور پر ہمارے لئے براہِ راست مفید یا شہرت کا باعث نہ ہو۔ خیرات برائے خیرات اور نیکی برائے نیکی جن کا معاہدہ فی الحقیقت خود فعل میں مضمر ہوتا ہے یعنی انعام بر ذاتِ خود کا مصداق ہوتا ہے۔ ایسے تصورات و مفہومات میں جن سے ہم بخوبی آئینا نہیں یہ تحریک کہ کسی کام کو محض اس لئے سرانجام دیا جائے کہ وہ بنفسہ جمیل و لطیف ہے ابھی تک ہمارے غلیاتِ دماغی میں خوابیدہ ہے اور فعالی شعور کی جولانگاہ میں نہیں آئی۔ شاید خیالی حسن میں حسنِ عمل کا خیال اس وقت پیدا ہوگا جب قبر میں خلا کا در کھلے گا۔



یہ فکری عاوت کہ ہر کام کا اصلہ یا عوض دینا و آخرت میں ہمیں ضرور ملنا چاہیے، ورنہ حسن عمل اور اعمال خیر یہ بیکار محض ہیں، ہمارے ذہن پر چھائی ہوئی ہے۔ اس لئے ہم خیرات برائے مکانات محض تمیلاً و امتثالاً کرتے ہیں۔ نہ کہ اس لئے کہ ہم میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجزن ہے اور انسانیت کے لطیف عواطف اور شفیق محرکات سے ہمارے قلوب متاثر ہیں۔ یہ خیالات بھی محض ایک رسم ہے جس کی بناء پر ہمیں یہ توقع ہے کہ جنت میں ہمیں راحت و آرام میسر ہوگا، اس بے نفسی کے نہ ہونے نے ہماری خیرات کی غیر ملکی صورتوں کو پیدا کیا ہے۔ اس واہمہ سے کہ آخرت میں جنت محض بعض مذہبی رسوم و عبادت یا اور اود و ظائف کے ادا کرنے سے مل جاتی ہے اور نجات و جنت کا تعلق حسن معاملت حقوق العباد، تزکیہ نفس، تصفیہ باطن اور فضائل و مکارم اخلاق سے نہیں ہے۔ یا اتنا نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے اخلاقی و روحانی برگ و ساز کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

### جذبہ تعظیم

ہم میں جذبہ تعظیم کی بھی کافی حد تک کمی ہے۔ اس لئے ہم جمال و کمال اور مجدد و شرف یعنی اس چیز کا جو ہم سے بہتر ہے۔ ادب و احترام نہیں کرتے یہ حقیقت موجودیت و صورت، بحیثیت و مثالیت، تمجیل و تصویریت الغرض جملہ مظاہر و اعتبارات پر صادق آتی ہے۔ ثقافتی روایات کا تسلسل اور قومی خودی کا تعین اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اس کا ہری ہیئت کا احترام نہ کریں، جو قوم کی اجتماعی روح کی تمثیلی مظہر ہے ہمارے معیاری و مثالی نظریات یعنی دل و دماغ کی وہ خوبیاں جن کی ہم قدردان و مشرکت کرتے ہیں اور ان کی نشو و نما چاہتے ہیں اس وقت تک معرض وجود میں نہیں آسکتیں جب تک کہ ہم ان مثالی شخصیتوں کا احترام نہ کریں جو ان کی آئینہ دار ہیں۔ اس شخصیت احترام المظاہر عقیدت سے فرد علی طور پر اپنی باطنی عزیمت اور ارادہ کا اظہار کرتا ہے کہ وہ ان جمالیاتی و معنوی مطالب و مقاصد عالیہ کے لئے بدل و جان کو شاں ہوگا۔ قدردان اور تعصب العین کے ساتھ ساتھ وہ اہم و اہم عقیدت و اسبقی اس وقت تک ممکن نہیں جب کہ اس شخص کے ساتھ محبت و عقیدت نہ ہو جس کی ذات میں بدرجہ کمال ان اوصاف کا ظہور اور عبادت و اعتبار سے

ان کا تعین ہوا ہے قوم کی عظیم شخصیتوں کی تعظیم و تکریم اسی لئے ہمارے قومی کردار کی تعمیر میں ایک حیثیت رکھتی ہے۔

کلام کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ایک ایسا روحانی و اخلاقی انداز فکر پیدا کریں جس کی بنیادیں انسانیت کبریٰ کے جاذبہ سے کی جائیں۔ اس انداز فکر و عمل کی تخلیق و تشکیل میں اسلامی الہیات اور علم الاخلاق یا دینی تصورات و دعائیات مثالی تعذرات اور معیاری مطامع کی صورت میں مرکز ثقل کی طرح اہم جاذبہ کی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں۔

ہمارے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس سلسلے میں ہم غیر ملکی خیالات کی درآبد کریں ہیں صرف انکار کرنا ہے کہ ہم اسلامی ثقافت کے ان پہلوؤں پر زور دےیں جن کا تعلق براہ راست انسانی فلاح و بہبود سے ہے۔

### پراگندگی

اس قسم کا طرز عمل جو اجتماعی خیالات و افکار میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کا رجحان پیدا کرے اور بلاتح کو حب الوطنی کے نقطہ ارتکاز سے ہٹا دے، ہمارے معاشرہ میں پایا جاتا ہے یہ نتیجہ ہے عدم توازن شعور تناسب کی کمی اور مزے کی زندگی گزارنے کی خواہش کا۔ یہ الفاظ دیگر سے خوش باش دے کہ زندگی کافی این است۔ کا معاملہ ہے۔ قومی تعمیر دور اندیشی اور عاقبت الامور پر غائر نظر کی منتقاضی ہے۔ ایسے معاشرہ میں جہاں محنت و دیانت سے کام کرنا مفید ثابت نہیں ہوتا اور الطاف و عنایات ذاتی مہربانی کی بنا پر ہوتی ہیں یا ذاتی ناراضگی کی بنا پر روک لی جاتی ہیں بالآخر اختلال و انتشار کا راہ پایا جاتا ناگزیر ہو جایا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر طالب علموں میں جو بے ضابطگی یا بے راہروی پائی جاتی ہے، اس کا سبب اساتذہ کی تااہلیت ناقص فن شعاری اور طالب علموں کی فلاح سے دلچسپی کا نہ ہونا ہے۔ اگر کسی تعلیمی ادارہ میں بے ضابطگی و بد نظمی پائی جائے تو یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اساتذہ یا توننا اہل ہیں یا اپنے فرض سے شعوری یا لاشعوری طور پر غافل ہیں یعنی اپنے طالب علموں کے لئے حکیم لوبیب رہنا ئے جہیم اور رفتی خفیتی کے طور پر اپنے قبیلی فرائض منعی انہام دینے سے قاصر ہیں۔ اس کے معنی ہیں کہ معلمین، معلمین کے قلوب میں

عجبت و تعظیم کے جذبات کی نشوونما نہیں کر سکتے۔ یعنی ان جذباتی عوامل و محرکات سے ماری ہیں جن سے ہیئت اجتماعیہ میں منبط نظم کی محاسین محکم ہوتی ہے۔ جیسا کہ کارلائل نے کہا ہے۔

”محبتانہ رہبری کے معاوضہ میں محبتانہ اطاعت انسان کی بنیادی ضرورت ہے، عباد کا بھلا اور قوی شعائر کی تعظیم اور علماء و حکماء اور بالخصوص ان شخصیتوں کا عقیدہ تہذیب و احترام جن میں وہ خوبیاں تجسم ہوتی ہیں، جنہیں قوم نے اپنا نصب العین قرار دیا ہے۔ طلبہ کے نظم و ضبط کے اہم اجزائے ترکیبی ہیں۔ بالخصوص ان کے لئے جو ذہنی نشوونما کے ابتدائی مراحل سے گزر رہے ہیں۔“

یعنی بچے لڑکے اور لڑکیاں جو ابھی سن بلوغ کو نہیں پہنچے۔ اس منزل میں استاد کی شخصیت ایک خاص اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اگر یہ ممکن ہو تو کسی ایسے شخص کو استاد مقرر نہیں کرنا چاہیے جو اپنے طلبہ کو صحیح ہدایت و تربیت نہیں دے سکتا۔ اور ان کے لئے ذہنی و اخلاقی برگ و ساز فراہم نہیں کر سکتا۔ جہاں کسی استاد میں شخصی جاوید نہیں ہوتا یا اس کی سیرت طلبہ میں اعتماد و احترام پیدا نہیں کرتی، وہیں یہ دیکھا جاتا ہے کہ طلبہ بے راہ ہو جاتے ہیں۔ اس ضمن میں ہماری درس گاہوں میں مذہبی و اخلاقی تعلیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تعلیم جیسا کہ ہمیں بخوبی معلوم ہے محض معلومات یا علم برترے میا کر کے کو نہیں کہتے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جو قابلیتیں اور صلاحیتیں فطری طور پر طلبہ کے ذہن میں دو لیعت ہیں، انہیں برآمد کیا جائے۔ ان کی نشوونما کی جائے اور انہیں قوت سے فعل میں منتقل کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ حقیقت بھی مضمحل ہے کہ طالب علموں کی جتنی خصلتوں اور صلاحیتوں کا طبع کی تعالیٰ کی جلتے۔ اور زندگی کے جمال و کمال کے حصول کے لئے ان میں ایک فعال تحریک پیدا کی جائے۔ وہ تعلیم جس میں زندگی کے اخلاقی اور جمالیاتی پہلو نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں مکمل نہیں کہلا سکتی۔ مدعا یہ ہے کہ طالب علموں کی بد نظمی و بے اعتدالی ایک اخلاقی مسئلہ ہے جسے محض والدین اگر یا شعور ہوں اور اساتذہ اگر اہل ہوں، حل کر سکتے ہیں۔ شد و مد و طوطی

پڑھتے پڑھانے سے نیاورہ طلبہ کی شخصیت کی نشوونما اور تئیر کی تشکیل پر ہونی چاہیے اس میں دیانت سے روزی پیدا کرنے کی صلاحیت بھی شامل ہے۔

تعلیم، دانشوری، فکری تعالیٰ اور روحانی تنویر کے وسیع مبادیات پر مبنی ہونی چاہیے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ایسی شخصیت کی نشوونما کی جائے جو اپنے وجود کو خیر و خوبی کے ساتھ دنیا میں قائم رکھ سکے۔ فی الحال ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اساتذہ کی دلچسپی محض یہ ہے کہ ان کے شاگرد امتحانات میں کامیاب ہو جائیں۔ انہیں شریعت انسان یا دنیا تیار شہسری بنانا ان کا درجہ نہیں۔

اساتذہ میں مطہیت یعنی مثبت تخیل و تصویری معیاریت کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے نوجوان جب اپنی درس گاہوں سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں تو ان کے ذہن متزلزل ہوتے ہیں۔ ان کی روح اخلاقی شعور اور ایمان و جان سے متفیض ہوتی ہے۔

## جائز مقاصد کیلئے جائز وسائل

ہم میں یہ رجحان پیدا ہو گیا ہے کہ ہم ایک ایسے مقصد کے لئے جس کے بارے میں ہم اپنے آپ کو یقین دلا دیتے ہیں کہ وہ حق بجانب ہے۔ ہر قسم کے ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز۔ یہ غلط انداز فکر بہت سی مخرب اخلاق عادات و رسوم کا باعث ہے۔

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ مبنی برحق مقاصد کے لئے مبنی برحق وسائل سے کام لیا جائے کوئی مدعا خواہ وہ کتنا ہی عالی و معدلت پرور کیوں نہ ہو، مکروہ فریب یا ناحق و سائل کے استعمال کو جائز نہیں بنا سکتا۔ اساتذہ اور معلمین اخلاق اور سیاسی حکم کو خاص طور پر اس بات پر زور دینا چاہیے کہ جائز مقاصد کے لئے جائز وسائل لا بدی ہیں بصورت دیگر صحیح قومی سیرت و کردار کی تعمیر از قبل محالات ہے۔

ہمارے معاشرہ میں تحمل و روحانیت کی بڑی کمی ہے۔ فکری اعتبار سے بھی اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔ جوہی ہمیں کسی شخص سے اختلاف رائے ہو تو ہم اس کے اخلاقی

کو مشتبہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک ایسی کمزوری ہے جو بظاہر ہمیں اپنے ماضی سے ورثہ میں ملی ہے۔

ہم روادار نہیں ہیں باوجود اس کے کہ بنیادی طور پر اسلام نے ہمیں دینی و مذہبی قسم کی رواداری کا عقیدہ دیا ہے اور منکرات و فواحش یعنی وہ ممنوعات و محرمات جنہیں عالم انسانیت نے متفقہ طور پر معاشرہ کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر ضرر رساں قرار دیا ہے، کو روکنے کے علاوہ اس کے ہاں اور کوئی جبر و کراہ نہیں۔

## جلی دلیہ کا سال مطالعہ نمبر

یکم اگست ۱۹۶۷ء کو شائع ہوگا

- تحفے کے سالانہ خریداروں کو یہ نمبر مفت ملے گا۔ آپ آج بھی آٹھ روپے بھیج کر سالانہ خریدار بن سکتے ہیں۔
- قیمت تین روپے ہوگی۔ جو حضرات سالانہ خریدار بننے بغیر تنہا ہی نمبر حاصل کرنا چاہیں وہ ڈاک خرچہ ملا کر چار روپے روانہ فرمائیں۔
- ایجنٹ حضرات و سب جولائی تک اپنی مطلوبہ تعداد سے دفتر کو آگاہ کر دیں۔ تاخیر مناسب نہ ہوگی۔

نمبر مکتبہ تحفہ دلیہ بند (یو۔ پی)

- ایسے منتخب مضامین کا نمبر جو ہمہ جہت آپ کے لئے توجہ نادرہ ثابت ہوں گے۔
- لکھتے ہیں کہ کتنی کے مستقل عنوانات مثلاً "تحفہ کی ڈاک" اور "مسجد سے سینا تک" بھی اس میں موجود ملیں گے۔
- ملاحظہ فرمائیے اس نمبر کے صفحات پر ایک ایسے ناولٹ سے داخل ہوا ہے کہ شاید دوسرا نہ ملے۔ آپ اسے بھلا سکیں۔
- اس مختصر اعلان میں تعداد کی گنجائش کہاں۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ ہر طرح آجنگ تجلی نے آپ کو مایوس نہیں کیا اور اشارہ نمبر بھی آپ کے ذوق مطالعہ کے لئے خاصے کی چیز ثابت ہوگا۔

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دو سکاہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
محنت دلی اللہی اور اُن کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔  
شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفین کی کتابیں شائع کرنا۔



Monthly

"AR-RAHIM"  
Hyderabad

(فارسی)

ہممت

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہممت" کا موضوع ہے۔  
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے بغیر انسانی  
تربیت و تزکیہ سے جن بلب و منازل پر گزرتا ہوتا ہے، اس میں اس کا بھی بیان ہے۔  
قیمت دو روپے

(عربی)

لمحت

شاہ ولی اللہ کے فلسفہ تصوف کی یہ بنیادی کتاب عربی سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا نقل سنو  
ما موصوف نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی عبارات سے اس کا معنی بڑھایا۔  
اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔  
قیمت دو روپے

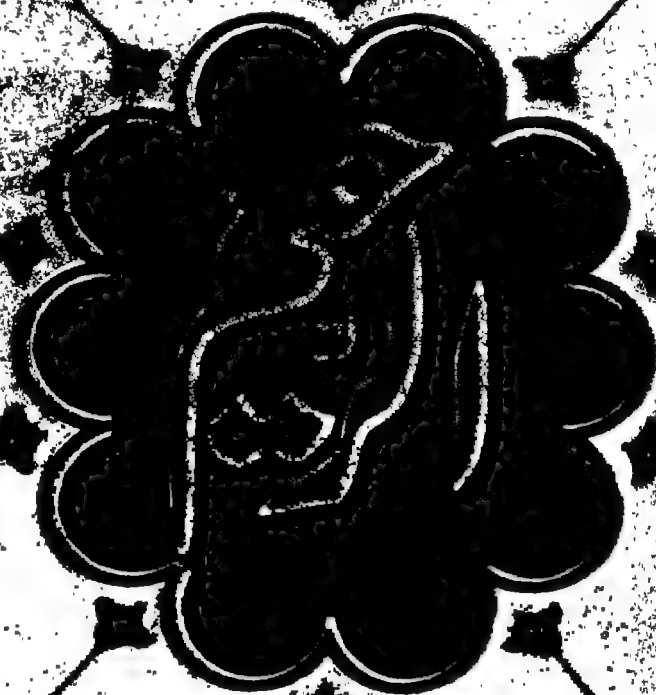
(فارسی)

سطعشا

انسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے  
اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ و بالغ سلوک کے ذریعہ جس طرح خطرۂ اعتدال  
سے اتصال پیدا کیا ہے، سطعات میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

شاه ولی الله اکبری کا علمی سلسلہ

۹۷۵



شیخ رشید احمد شاہ ولی الله اکبری کا علمی سلسلہ



مجلس اذاعت  
\_\_\_\_\_

ڈاکٹر عبدالواحد علی پوتا،

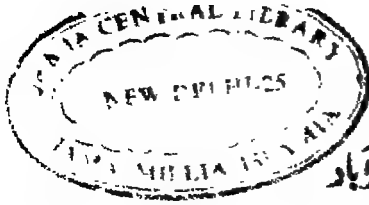
مخدوم امیر احمد

\_\_\_\_\_ مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

قیمت سالانہ :- آٹھ روپے

لی بک :- ۱۹۶۶ء



# الحیمر

جلد ۴	مطابق ماہ اگست ۱۹۶۶ء ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ	نمبر ۳
-------	---	--------

## فہرست مضامین

۱۶۲	مدیر	شذرات
۱۶۵	مصنف ڈاکٹر عبدالواحد دہلی پوتہ	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ
	مترجم، سید محمد سعید	حصہ اول
		مبادیات، اخلاقیات
۱۷۷	ابو سلمان شاہ جہان پوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات
۱۸۸	عبد الہادی ناصر ایم اے	تدوین حدیث کے ادوار
۱۹۹	پروفیسر عبدالغفور محمد ری	شاہ ولی اللہ کا سفر حرمین
		ادارہ
		اس کے تعلیمی اثرات
۲۳۰	۱- سس	تنقید و تبصرہ

# شذرات

ایک موقر بہت بڑا دینی رسلے میں اس کے محترم مدیر ملک میں بتدیگ بگڑتی ہوئی مذہبی فسق و فساد تھا پرتھرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں دہتے بھی فرتے اس ملک میں مذہب کے نام پر پائے جاتے ہیں ان سب میں اتحاد و عافیت موجود ہی نہیں روز افزوں ہے۔ اور حدود بغض، غیر صحت مندانہ مباحثت، نفع تیل کی خاطر نقصانی عظیم کو برداشت کرنے کا طرز عمل جاری و ساری ہے؛ اور صفت یہی ہیں، بلکہ وقتاً فوقتاً یہ فرقہ وارانہ حدود بغض قتل و مقتادہ تک پہنچ جاتا ہے۔ مذہبی عام جلسوں کے علاوہ مذہبی رسالوں میں ایک دوسرے کے خلاف جو تلخ لڑائی ہوتی ہے اس کی طرف ہم انہی صفحات میں اس سے پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔

یہ صورت حال خواہ کئی بھی افسوس ناک ہو، اس پر رنج و غم کا اظہار کر دینا ہی کافی نہیں ہے۔ قوموں اور ملتوں کو جب اس طرح کے حالات سے سابقہ پڑتا ہے تو ان میں کے اہل فکر و علم افراد ان کے اسباب دریافت کرتے ہیں، اور ان کا تجزیہ کر کے انہیں درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس وقت یہ کرنے کی ضرورت ہے۔

پاکستان کے مذہبی فرقوں کی زندگی میں اس وقت جو غلط فہمیاں برپا ہے، ہمارے نزدیک اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جس دین میں ہم آج رہتے ہیں، یا کہنے پر مجبور ہیں، اس میں اور ہمارے ذہنوں میں سخت قسم کا تضاد ہے اور جیسے جیسے دن گزر رہے ہیں اور ہماری معاشی اور اجتماعی زندگی میں دور رس تبدیلیاں آ رہی ہیں یہ تضاد شدت اختیار کرتا جا تا ہے، بکا ہر یہ نظر آتا ہے کہ یہ تضاد اور بڑھ رہا ہے، اور جب تک اسے پہلے دہنی لگا پر اور بعد میں علانی نہیں کیا جائیگا، ہماری قوم کی مذہبی زندگی کا اختلال پڑتا ہی جائے گا۔

موجودہ صورت حال کو سدھارنے کے لئے دو چیزوں کا اثبات بہت ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ آٹھ سے دو سو سال پہلے انگریزوں کا نظام کو لے کر اس پر منحصر میں آئے تھے، وہ صرف ان کی اپنی اچھاوہ قسمی، یہ نظام معیشت مجموعی انسانیت کی گزشتہ ترقیوں کی ایک شکل تھی، جس میں اچھائیاں بھی تھیں اور غریبیاں بھی۔ یہ نظام سب کو بانٹتا ہوا۔ اس کی جڑیں ہمارے معاشرے میں دو در دو رنگ پھیلیں۔ اس نے ہماری معیشت کو بدلا۔ سیاست کو بدلا، معاشرت کو بدلا بلکہ ہمارے فہموں اور معتقدات تک کو متاثر کیا۔ اور یہ لازمی تھا، چونکہ یہ نظام بڑا ہمہ گیر تھا سبے شک اس سے ہمارے ہاں بڑی غریبیاں بھی پیدا ہوئیں۔ لیکن جہاں تک اس نظام کا تعلق ہے، وہ ہمارے ہاں نفوذ پذیر ہے اور زیادہ سے زیادہ ہوتا جائیگا۔ اس نظام سے ہماری مراد اجتماع و سیاست اور تہذیب و تمدن کے خاص تصورات اور زندگی کا سائنسی اور تکنیکی رعبا ہے۔ پاکستان میں صنعتی دور شروع ہو چکا ہے اور ہماری یہ پوری کوشش ہے کہ ہمارے ہاں زیادہ سے زیادہ صنعتیں لگیں۔ کیونکہ لوگوں کے لئے روزگار مہیا کرنے اور پاکستان کو مستحکم بنانے کی یہی واحد صورت ہے۔ اب جب کہ صنعتیں عام ہوں گی، توان سے نکلنے والے نتائج سے کیسے مفر ممکن ہے، البتہ ایسے حالات میں ضرورت اس کی ہوئی ہے کہ پیدا ہونے والی غریبوں کی بل پر نشان دہی ہوتی ہے اور ان کو ٹھیک کر کے کی کوشش بھی جاری رہے۔

یہ منصب مذہبی ماعتوں کا ہوتا ہے۔ اور اکثر وہی اس فریضہ کو انجام دیتی ہیں

اس سلسلے میں دوسری چیز جس کا اثبات ضروری ہے، وہ پاکستان میں مسلمانوں کے جو مختلف مذہبی فرقے موجود ہیں ان کا مجموعہ ہے، یہ فرقے یہاں ہیں۔ اور اگر بحث و مناظرہ سے ان کا ختم ہونا ممکن ہوتا تو وہ اب تک ختم ہو چکے ہوتے۔ ان فرقوں کا وجود ہیں تسلیم کرنا ہوگا اور پاکستان کی ملت میں انہیں وہ حیثیت دینا ہوگی، جس کے وہ اپنی تعداد اور دوسرے اشرار و سونے کی بنا پر مستحق ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ باہم بحث و فکر کا دروازہ ہی بند کر دیا جائے اور مذہبی معاملات میں سکڑے اختلاف آراء نہ ہو۔ اگر ہم مسلمانوں کی مذہبی تاریخ کا غور سے مطالعہ کریں، تو ہم دیکھیں گے کہ اپنی طویل تاریخ میں مسلمانوں کا یا عموم ہی علی رہا ہے۔ جب اسلامی دنیا میں یونانی فلسفہ و رآیا، تو اس کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی اور اس کے پڑھنے پڑھانے پر سخت تکبیر ہوئی، لیکن بعد میں مسلمانوں نے اس کا وجود تسلیم کر لیا۔ اور اسے تسلیم کر کے اسے ملت کے مجموعی مزاج کے لئے

قابل قبول بنانے کی کوششیں ہوئیں۔ معتزلہ کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اور اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثالی تصوف کی ہے۔ امام غزالی نے جن طرح تصوف کو راسخ العقیدہ مسلمانوں کے ذہن کے قریب بنایا وہ سب جانتے ہیں۔ ایک چیز کے وجود کو تسلیم کرنا اور اس کے بعد اس کی اصلاح ایک جیتی کی یہی راہ ہے۔

خود اس برصغیر میں آٹھ سے دو سو سال پہلے حضرت شاہ ولی اللہ نے اہل تصوف اور اباب شریعت علمائے محدثین اور فقہاء و فقہ کے چار مذاہب اور وحدت الوجود و وحدت الشہود میں جس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی اس کا ذکر ان صفحات میں بار بار ہو چکا ہے۔

امام غزالی، شاہ ولی اللہ اور ان جیسے دوسرے مجددین عظام نے اپنے اپنے زمانے کے مذہبی فرقوں کی یا بھی منافرت کو حتی الوسع کم کرنے کی جو کوششیں کیں، اگر ہم ان کو اپنے سامنے رکھیں، اور ان کے بنیادی فکر کو اپنا کر اس دور کے فرقہ وارانہ ترعات کو سلجھانے کی تدبیر کریں، تو ہمیں یقین ہے کہ اس وقت پاکستان میں جن طرح کی فرقہ وارانہ فتنہ پیدا ہو گئی ہے، اس میں کافی اصلاح ہو سکتی ہے۔

یہ زمانہ تو خاص طور سے پر امن بقائے باہمی کا ہے۔ اور حالات ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سودیت یونین ایسے ملکوں کو جن کے نظام بنیادی طور سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مل جل کر رہنے پر مجبور کر رہے ہیں، تو مسلمانوں کے مختلف فرقے جن کے بنیادی عقائد ایک ہی ہیں، کیوں باہمی منافرت اور کشاکش کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کے وجود کو تسلیم کرے۔ اسے حقیقت واقعی مانے، اور یہ نہ ہو، جیسا کہ عام طور سے آج کل دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض فرقے دوسروں کو حرف غلط سمجھتے ہیں، جن کا مثلاً تانہ ان کے نزدیک مقدم ترین دینی فریضہ ہے، اس عقیدے کے ساتھ یقیناً فرقہ وارانہ جھگڑے رہیں گے۔ اور پاکستان کی مذہبی فضا کبھی روبہ اصلاح نہیں ہو سکے گی۔

# شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصہ اول

## مبادیات اخلاقیات

مصنف ڈاکٹر عبدالواحد بلی پوتہ

مترجم، سید محمد سعید

(۳)

## باب دوم سات اخلاق فاضلہ

تمہید۔

سات اخلاق فاضلہ، بہتر ترقی یافتہ اور مستحکم عام انسانی مزاج کے نشانات ہیں۔ جو حیوانی مزاجوں سے نمایاں فسرق رکھتے ہیں۔ ان اوصاف کو شاہ ولی اللہ نے اخلاق فاضلہ تسلیم دی ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ خصوصیات انسانی مزاج کی حیوانی مزاج پر نہ صرف برتری بلکہ فرق بھی واضح کرتی ہیں۔

پہچیدہ جذبات، جوش اور ممتاز انسانی محرکات کی شکلیں اختیار کرتے ہوئے انسانی مزاج کے مخصوص نشانات، مثبت صفات کے اثر کے تحت فروغ پاتے ہیں۔ جو ان میں مقصد کی آفاقیت جمالیاتی رجحان، ترقی و کامیابی کے عناصر عطا کرتے ہیں جو کہ مزاج کے جوش و جذبات کی متعدد شکلوں میں نمودار ہوتے ہیں۔ انسانی مزاج کے جو مخصوص نشانات، اس طرح ترقی پاتے ہیں وہ انسانی طرز عمل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کو اس کارکردگی و صلاحیت کے تناسب کے پیش نظر اخلاق فاضلہ کا طرز عمل کہا جاسکتا ہے، جو ان اوصاف کا اظہار کرتے ہیں۔ جو شاہ ولی اللہ کے نزدیک واضح طور پر نفسیاتی خصوصیات ہیں۔ جن مخصوص نشانات کا اظہار ذکر کیا گیا ہے اور جب ان کا اخلاق

فاضلہ کے طرز عمل میں اظہار ہوتا ہے۔ تب وہ شاہ ولی اللہ کے نزدیک روح کی عظمت ذہن کی وسعت، قلب کی گہرائی اور مزاج کی اعتدالیت کی قابل تعریف خصوصیات پیش کرتے ہیں۔ یہ خصوصیات مقصد کی آفاقیت اور ہمہ گیری (ملنے لگنے) کی علامات ہیں جو حیوانی مزاج سے فرق پیدا کرتے ہوئے انسانی مزاج میں اختلاف اور معیار کے طور پر کام کرتی ہیں۔ اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر وہ علامت جو انسان کو حیوان سے ممتاز کرتی ہے اور حیوان پر انسان کی عظمت و برتری ظاہر کرتی ہے۔ اسے اخلاق فاضلہ کہا جاسکتا ہے ہر وہ نشان یا علامت جو ان صفات کے کسی فقدان یا خرابی کی طرف اشارہ کرتی ہے وہ بد خصلت یا برائی کہلا سکتی ہے۔

خارجی طرز عمل بذات خود اس وقت تک نہ تو اخلاق فاضلہ ہوتا ہے اور نہ ہی بد خصلت ہوتا ہے جب تک کہ نفس مزاج میں اس کا مخرج نہ ہو اور وہاں سے وہ ابھرا نہ ہو۔ اس لئے شاہ ولی اللہ کے خیال کے مطابق، طرز عمل کی دو یکساں شکلیں، اپنے نفسی مخرج کی وجہ سے ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہیں۔ ادران میں ایک بد خصلت اور دوسری اخلاق فاضلہ کی حامل ہو سکتی ہے۔

### خلق متنوع اور ارتقائی حیثیت

اگرچہ خلق کا مادہ، حیوانی مزاج کے مقابلہ میں انسانی مزاج کے امتیاز اور برتری کی علامات میں پایا جاتا ہے، یہ اپنے مادہ میں مربوط طرز عمل پیدا کرتا ہے، تب بھی خلق انفرادی طور پر انسانوں کے لئے قطعیت کی حیثیت نہیں رکھتا۔ یہ اضافی ہوتا ہے۔ یہ مخصوص حیوانی طرز کے مقابلہ میں ہر مزاج کی حاصل شدہ برتری اور امتیاز کی وسعت یا قوت کے ساتھ مختلف ہو جاتا ہے۔ جس طرح کے مزاج ترقی پاتا ہے اسی طرح اس کی موافق نفسیاتی حالتیں اور مخصوص علامات اخلاق بھی فروغ پاتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایک ترقی یافتہ مزاج کے معاملہ میں اس کے اخلاق کی سطح اور معیار ان مزاجوں سے مختلف ہے جو اتنے ترقی یافتہ نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی مزاج کے معاملہ میں، اخلاق کے معیار اور اس کے ارتقار اور فروغ کے ساتھ مختلف ہو سکتی ہیں۔

کوئی طرز عمل جب اپنے معیار سے گر جاتا ہے تو بد فعلت ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ اس معیار سے وابستہ ہوتا ہے جو کہ مقابلہ حیوانی مزاج سے قریب تر ہوتا ہے۔ اس بات کو اس طرح زیادہ واضح کیا جاسکتا ہے کہ یہ حیوانی مزاج سے مقابلہ کم نمایاں ہوتا ہے اور مزاج کی موجودہ حالت سے برتر ہوتا ہے۔ تعلیمیت کے اصول کے مطابق لیئے ناموزوں اور ناکافی طرز عمل، مزاج کو اس کی اعلیٰ سطح سے بدرجہ ذل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ مزاج کو اس کے اخلاق میں کمی کی وجہ سے قریب سے قریب تر لاتے ہیں۔

لہذا یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ایک عام اخلاقی طرز عمل جو بہت معمولی ہو سکتا ہے، اس مزاج کے معاملہ میں بد فعلت ثابت ہو سکتا ہے جس نے کہ لطافت اور کمال کی حالت حاصل کر لی ہو۔ عام مزاجوں کے ادا عات اور پیرایوں کے معیار ان معیاروں سے مختلف ہوتے ہیں جو اخلاقی طور پر برتر یا مافوق العادہ مزاج ہوتے ہیں اس کتاب کے موضوع بحث عام اخلاقیات ہے۔ اس لئے یہ بات مناسب ہوگی کہ ہم اپنے مباحث کو عام مزاجوں اور اس کے اخلاق کی حد تک محدود رکھیں اور مزاج کی اعلیٰ تر اقسام پر ایک علیحدہ رسالہ میں بحث کی جائیگی۔ جو کہ اعلیٰ تر اخلاقیات سے تعلق رکھتی ہیں۔

### اخلاق کی تعداد

ایک عام انسانی مزاج جیسا کہ وہ بنیادی مثلث کی بنیاد پر مثلث صفات کے داخلی تعامل کے عمل کے ذریعہ فروغ پاتا ہے وہ انتہائی اعلیٰ مخصوص خصوصیات کو فروغ دیتا ہے جو کہ متعدد پیچیدہ جوش و جذبات کے اجزاء ہیں۔ ان اعلیٰ تر پیچیدہ نفسیاتی خصوصیات کو شاہ ولی اللہ نے سات مخصوص نفسیاتی پہلوؤں میں تقسیم کی ہے جن کو وہ سات اخلاقی فاضلہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ یہ اخلاق فاضلہ بنیادی مثلث کی بنیاد پر عقلی صفات کے مثلث کے تعامل کی پہلا مار ہیں اعلان کا خاص منبع اور منسرج ان کے حیوانی پہلو اور جبلتوں میں اور مزاج کی منتشر و ناچختہ تحریکوں میں ہوتا ہے۔ آفاقیت کی صفت، مقصد کی وسعت اور ہمہ گیری جب ہر خلق میں شامل کی جاتی ہے تب صفت عقل کی آفاقیت "رائے کلی" کا رجمان پیدا ہوتا ہے۔ ہر خلق کی ترقی اور تکمیل کی صفت اور اس کی وسعت



تقسیم جو اس کے مختلف درجوں میں ہوتی ہے۔ اور اس کے ہمراہ امتیازات، ترجیحات اور بہتری کی قدریں ہوتی ہیں وہ باقی دو عقلی صفات مکمل (حکیم)، اور طرنت یعنی جمالیاتی صفت کے زیر اثر ہوتی ہے۔

سات اخلاق فاضلہ کے علاوہ کے دوسرے چار اخلاق فاضلہ بھی ہیں۔ جو کہ مزاج کی حقیقی مسرت و سعادت میں ہوتے ہیں وہ مزاج کی اعلیٰ تر قسموں کے مرعلوں کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی ترقی ایک عام مزاج کے استحکام کا پہلے ہی سے پتہ دیتی ہے کہ جو سات اخلاق فاضلہ اور عام رجحانات کی پیداوار اور سرورغ کی طرف لے جاتی ہے اور یہ رجحانات صفت عدالت یعنی عام معاشرتی و شخصی طرز عمل کی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ باقی کے تین اخلاق فاضلہ سماعت، طہارت اور انہات کے مرعلوں کو پیش کرتی ہیں زیر نظر کتاب میں ان چار اخلاق فاضلہ کے متعلق بحث کرنا مقصود نہیں اس کا تعلق مافوق العادہ نفسیات اور اعلیٰ اخلاقیات کے دائرے سے ہے۔

### طبعی اوصاف

بنیادی مثلث کے ساتھ، سات اخلاق فاضلہ مستحکم مزاجوں میں طبعی حیثیت رکھتے ہیں ہر خلق کی حقیقی قوت اور روح، ہر مزاج کی قوت اور گہرائی کے ساتھ مختلف ہو جاتی ہے مزاجوں کی لاتعداد اقسام ہیں اور وہ اپنی صفات اور خصوصیات میں ایک دوسرے سے متنوع ہوتی ہیں اسی طرح وہ اپنے اوصاف کی قوت اور روح میں بھی متنوع ہوتی ہیں ایک سابقہ باب میں اس پر مفصل بحث کی جا چکی ہے یہاں صرف یہ اشارہ کر دینا کافی ہے کہ سات اخلاق فاضلہ میں سے ایک کا ذریعہ وحشی مزاج ہوتا ہے۔ جو کہ بنیادی مثلث سے ترقی پاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ یہ ان جبلتوں میں سرورغ پاتے ہیں جو کہ انسان کے مزاج کے حیوانی پہلو میں ہوتی ہیں اگر کوئی موافق جبلت یا صلاحیت ذہن کمزور ہے جس میں کہ ایک خلق اپنی بنیاد یا مخرج رکھتی ہے تو ایسا مزاج یقیناً کمزور ہو گا یا اس میں موافق خلق کا فقدان ہو گا۔ اگر اس کی موافق جبلت یا صلاحیت ذہن، اس کے مزاج میں مستحکم ہے تو ایسے مزاج کی موافق خلق بھی مستحکم اور نمایاں ہو گی سوال یہ باقی رہتا ہے کہ اگر طبعی مزاج

اپنی موافق جبلت یا صلاحیت ذہن میں کس نہ درہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایک خلق فاضلہ فردوظ پاسکے۔

کیا اخلاق فاضلہ قابل حصول ہیں؟

اگر کسی شخص کے طبعی مزاج میں ایک خلق فاضلہ کی قوت اور جذبہ میں کمی ہے تو ایسا شخص اس خلق فاضلہ کو حاصل نہیں کر سکے گا۔ خواہ وہ اس کو حاصل کرنے کی کتنی ہی کوشش کرے مثال کے طور پر ایک شخص میں جنسی جبلت کی کمی ہے تو اس کے لئے خلق عفت کوئی وجوہ نہیں رکھتی اسی طرح دوسرے افراد میں شجاعت، عقل وغیرہ کے اوصاف کی کمی ہو سکتی ہے جس کی وجہ سے ایسے اشخاص کی موافق صلاحیت ذہن یا جبلتوں میں کوئی خرابی یا کمی ہو سکتی ہے۔ لہذا ایسے لوگ، اپنی لوگوں کے مقابلہ میں ہمیشہ کمتر اور کمزور ہی سمجھے جائیں گے جو کہ ان اخلاق فاضلہ کو کثرت سے رکھتے ہیں اس کمی یا خرابی کا بدل ایسی حالت میں کیا جاسکتا ہے کہ جب یا تو وہ اپنے متصرف اخلاق فاضلہ کو فروغ دیں یا مہارت و پاکیزگی کی ایسی حالت پہنچیں کہ جہاں وہ ان صفات کو اللہ کے فضل و کرم سے حاصل کر لیں مزاج کی پاکیزہ حالت، حالت اخلاق فاضلہ کی سطح سے بہت بلند اور لطیف ہو جاتی ہے جو کہ براہ راست وحشیانہ حیوانی خلق سے تعلق رکھتے ہیں اس طرح لطافت کے ذریعہ مزاجوں کی کمی یا خرابی کا بدل تلاش کیا جاسکتا ہے یہ ان مزاجوں کی صورت حال ہے جن میں کہ مخصوص اخلاق فاضلہ کی قوت نشوونما کی، ہوتی ہے۔ جو اس صورت حال میں مختلف ہو جاتی ہے کہ جہاں یہ توفیق یا جبلتیں اخلاق فاضلہ کی بنیادی عنصر ہوتی ہیں لیکن وہ اپنے خارجی طریقہ عمل میں موافق اخلاق فاضلہ پیش نہیں کرتی ہیں جس کی وجہ سے کمزوری ہوتی ہے کہ جو مزاج میں کسی طبعی کمزوری کی بنا پر نہیں بلکہ ان اخلاق فاضلہ کے عمل اور مشق کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہیں یا پھر صرف اسی قسم کے بعض خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

طاقتور اخلاق فاضلہ کو ترقی دی جاسکتی ہے اور ان کی کمزوریوں کی اصلاح ہو سکتی ہے نفسیاتی مزاج کی ترقی کے اصولوں کے مطابق طاقتور اوصاف و فضائل کو متحرک بنایا جاسکتا ہے اور انہیں مشق اور مسلسل عمل کی بدولت ترقی دی جاسکتی ہے۔ اگر ایک وصف

حقیقتاً ایک ترقی یافتہ شکل میں پایا جاتا ہے۔ لیکن تکمیل و عسجدگی میں کمی رکھتا ہے تو ایسے ہی ایک عمل سے اسے ترقی دی جاسکتی ہے۔ یہاں پر یہ بہتر ہوگا کہ شاہ ولی اللہ کی کتاب حجتہ اللہ البالغہ سے ایک عبارت کا خلاصہ پیش کیا جائے نہ مفسر شجاعت میں بلکہ تمام فضائل و اوصاف میں انسانی افسر و ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں ان میں بعض ایسے ہیں جن میں کوئی خاص اوصاف نہیں اور نہ ہی یہ امید ہے کہ وہ اپنے فطری حوافز میں کسی پیدائشی خرابی اور ان کی راہ میں کسی رکاوٹ کی وجہ سے، کبھی ان اوصاف کو حاصل کر سکیں گے۔ ایک نامزد شخص جو حسی جبلت سے محروم ہوتا ہے یا جو شخص ایک کمزور بدل رکھتا ہے وہ ہمیشہ جرأت اور مردی کے وصف کی کمی کا شکار رہتا ہے ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو اگرچہ بعض مخصوص اوصاف کے حقیقی حامل نہیں ہوتے، تاہم ان کے لئے یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان اوصاف کو حاصل کر سکتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب وہ ان اعمال کو بار بار کرتے رہیں اور ان کی ایسی مختلف اقسام و اشکال کو عملاً اختیار کرتے رہیں جو ان کی ترقی کی وجہ بنتی ہیں، وہ ان افراد کے اعمال کا مسلسل اعادہ کر کے ایک ذہنی حالت پیدا کرتے ہیں جو کہ ان مخصوص اوصاف کے لئے اعلیٰ شہرت رکھتے ہیں اس طرح وہ مسلسل اعمال ذہن کی خفہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور ایسے طریقے اختیار کرنے سے، اوصاف و فضائل قوت سے واقعیت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسانوں کی اکثریت اسی قسم سے تعلق رکھتی ہے، وہ کم و بیش محنت و مشقت سے ان اوصاف و فضائل کو فروغ دے سکتے ہیں۔ جو بالعموم ان میں خفہ ہوتے ہیں۔

ان میں وہ لوگ شامل ہیں جو کسی ایک یا زائد اوصاف کے حقیقی حامل ہوتے ہیں اور ان میں ان اوصاف و فضائل کی روح بھی موجود ہوتی ہے لیکن وہ ان کی کاملیت و عسجدگی سے محروم ہوتے ہیں حالانکہ ان کی پیدائشی صلاحیتیں، ان اوصاف کی طرف جن سے وہ دوچار ہیں، نہایت مضبوط رجحانات رکھتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ مزاحمت پیدا کر نیوالے حالت کی قوت سے پیچھے ہٹ جاتی ہیں لیکن اگر موافق و سازگار حالت ہوں تو یہ صلاحیتیں فوری ترقی کرتی ہیں اور کمزوریوں کی اصلاح کروچی ہیں بالکل اس طرح کہ جب گندھک کے سامنے آگ آتی ہے تو وہ بھڑک اٹھتی ہے۔

ان میں ایسے لوگ شامل ہیں جو اپنے فطری مزاج میں خاص اوصاف و صفات کے حامل ہیں اور وہ انہیں صحیح اور مکمل حالت میں بھی رکھتے ہیں اور وہ اتنے زیادہ صحیح ہوتے ہیں کہ وہ ایک ایسا طرز عمل پیدا کر دیتے ہیں کہ جن کو کوئی قوت اور طاقت دور نہیں کر سکتی۔ اگرچہ ایسے لوگ مطلوبہ طرز عمل، فطری طور پر اختیار کر سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ ان مخصوص اوصاف و صفات کی ترقی و کاملیت کے طریقوں کے لحاظ کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتے وہ اوصاف و صفات ان میں پہلے ہی سے مستحکم و کامل ہوتے ہیں۔ بیدار مزاجوں کے لوگ، جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ قطعی نفسیاتی حالتوں کے حامل ہوتے ہیں جو کہ اپنے فطری مزاج کے لئے خارجی نمائندگی و ترجمانی پر بالکل منحصر نہیں ہوتی ہیں۔

جو لوگ کسی نمونہ کی تقلید کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، وہی عوام کے حقیقی رہنما ہوتے ہیں وہ اپنے مخصوص اوصاف میں مددگاروں کے لئے نمونہ ہوتے ہیں۔ ان معاملات میں ان کا طرز عمل، ان کے لئے دستہ فراہم کرتا ہے جو ابھی ان اوصاف کی سطح تک نہیں پہنچ سکے ہیں، دوسرے لوگوں کو اپنی کمزوریوں کو درست کرنے کے لئے ان لوگوں کو اپنے نمونہ بنانا چاہیئے اس طرح اوصاف حاصل کرنا چاہیئے، اس طرح سے انہیں اپنے مخصوص اوصاف و صفات کی ترقی اپنی پیدائش توکوں کے مطابق کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب الہد و البازغہ میں اسی تصور کو نہایت مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔

”جو لوگ سات اخلاق فاضلہ میں سے کسی ایک میں محرومی کا اظہار کرتے ہیں یا تو وہ لوگ میں جن کے پیدائشی مزاج، مستحکم اور کامل ہیں لیکن ان کی محرومی و رکاوٹ جو ان کے خارجی کردار کی مفروضہ شکل مظان میں مسلسل مشق کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض ایسے لوگ ہیں جن کے پیدائشی مزاج میں کمزوریاں ان کے جثہ کے فطری و نسلی اثرات کا نتیجہ ہوتی ہیں ان لوگوں کے طرز عمل سابقہ کمزوریوں کا علاج اگسٹے مشاہدے سے ہو سکتا ہے جو کہ مکمل طور پر ان اوصاف کے حامل ہوتے ہیں لیکن مؤخر الذکر کی اصلاح، ان مخصوص اوصاف کی مدد تک کسی طرح ممکن نہیں وہ اپنا نقصان، بعض اعلیٰ صفات کو ترقی دے کر ہی پورا کر سکتے

ہیں جو کہ ان اوصاف کا متبادل ثابت ہو سکیں جن سے وہ محروم ہیں۔  
کیا اوصاف و فضائل کی ترقی میں خارجی عناصر اثر انداز ہوتے ہیں یا اپنا حصہ  
ادا کرتے ہیں۔

ایسے مخصوص خارجی عناصر بھی ہیں جو بنیادی شلک کہ اجزاء پر اثر انداز ہوتے ہوئے  
پیدائشی نفسیاتی مزاج پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہی بات ان اوصاف کے لئے بھی درست ہے  
جو انسان کے نفسیاتی مزاج میں ہوتے ہیں جو خارجی اجزاء نفسیاتی مزاج پر اثر انداز  
ہوتے ہیں اور حالانکہ وہ اوصاف کار و عمل بھی پیش کرتے ہیں، وہ خوراک، مشروبات  
صحت، جسمانی قوت، عمر، بیماری، نامیاتی تنظیم، لاعصار معاشرتی و طبعی ماحول، عادات  
اور تربیت ہیں۔ ان میں بعض مابعد الطبیعیاتی اثرات کا اضافہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ جن کی بنیاد  
انسان کی مابعد الطبیعیاتی فطرت میں ہوتی ہے اور اس کا تعلق عالم مثال اور عالم احوال یا مابعد الطبیعی  
ترکیب و تنظیم سے ہوتا ہے جو کہ ایک فرو کی زندگی پر اثر ڈالتی ہے، یہی وہ ترتیب و تنظیم ہے  
جس کے لئے شاہ ولی اللہ نے اصطلاح ”نحت“ (مقدر) استعمال کی ہے۔

اس بیان کے مطابق، بالعموم یہ پایا جاتا ہے کہ ایک مخصوص وصف کی قوت اظہار  
کی عام حالت خارجی اجزاء کے ساتھ چلتی ہے کبھی کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ پوشیدہ  
اور مابعد الطبیعیاتی اسباب کا اثر اور ایک مزاج کی پیدائشی حالت رکاوٹ بن جاتی ہے۔

بالعموم صحت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص میں ایک مخصوص وصف کا مناسب  
اندازہ اس کی جسمانی قوت اس کی صحت کی عام حالت اور ماحول کے دوسرے حالات سے  
لگایا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک چوتھے سینہ والا قوی الجذہ انسان بالعموم جرات  
و سعت نظری اور خود اعتمادی کا مجسمہ ہوتا ہے اس کے برعکس ایک ایسا شخص جس کا سینہ  
تنگ اور چپٹا ہو یا بالعموم بزدل اور متلون مزاج ہوتا ہے۔ یہ بات علم لوہ سے صحیح ہوتی  
ہے لیکن بعض پوشیدہ یا مابعد الطبیعیاتی اسباب کے وجہ سے ہمیشہ صحیح بھی نہیں ہوتی  
کبھی ہیں ایک ایسا شخص بھی ملتا ہے جو ایک کمزور اور محدود جسم کا مالک ہوتا ہے۔ لیکن  
اس میں جرات بہت زیادہ ہوتی ہے جو اس کی نفسیاتی ساخت اور اس کے خارجی عناصر

کے انہار کے مقابلہ میں غیر متناسب ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے مطابق، ایک وصف اس وقت صالح کہلاتا ہے کہ جب اس کی وسعت و قوت خارجی اجزاء اس شخص کی صحت اور حیاتی قوت کے متناسب ہوتی ہے اس کے برعکس وہ اس وقت حدید ہوتی ہے کہ جب وہ ان اجزاء کے مقابلہ میں وسعت اور قوت میں عظیم تر ہو۔

اول الذکر صودت حال میں وصف کی قوت خارجی اسباب میں تنوعات و اقسام کے ساتھ متنوع و مختلف ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس موخر الذکر صودت حال میں وہ ایسے تنوعات سے اتنا زیادہ اثر انداز نہیں ہوتا اسی لئے خارجی اجزاء اول الذکر صودت حال میں خاص طور سے نظر انداز نہیں کئے جاسکتے۔

سات اخلاق فاضلہ کی معاشرہ میں اہمیت

جیسا کہ سات اخلاق فاضلہ کی صحیح ترقی کی بنیاد مستحکم مزاج میں ہوتی ہے اور ان افراد کے طرز عمل میں ہوتی ہے جو مستحکم مزاج رکھتے ہیں اور ان افراد کے لئے ایک معیار فراہم کئے ہیں جو ایسے مزاج سے محروم ہوتے ہیں۔ ایک صحت مند اور مستحکم معاشرہ کے وجود، معاشرہ کے ایسے افراد کی اکثریت کے وجود پر منحصر ہوتا ہے جو ایسے مستحکم اعلیٰ اوصاف کے مزاجوں کے حامل ہوتے ہیں جیسا کہ یہ علی طور پر ممکن نہیں کہ معاشرہ کے تمام افراد کامل اور مستحکم ترین مزاج کے حامل ہوں ایک معاشرہ زیادہ سے زیادہ عمدہ صحت اور اپنے افراد کے طبائع کی صفت معاشرہ میں موجود مستحکم طبائع کے افراد کے تناسب سے حاصل کر سکتا ہے۔

ہر صفت یا اخلاق فاضلہ، معاشرہ کی یہودی اور سالمیت کی تعمیر کرتا ہے۔ ایک معاشرہ کے افراد کے درمیان خیر سگالی اور دوستی کے جذبات پیدا کرنے کے لئے صفت ساحت (فیاضی) لازمی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے نزدیک کسی فائدہ ان کا سربراہ ایک ایسا شخص ہونا چاہیے جو صفت سمت العالی کا حامل ہو۔ لوگوں کے رہنما کو سات اخلاق فاضلہ کا حامل ہونا چاہیے اور ان کے ہمراہ 'صفت' حکمت اور دوسری متعلقہ صفات بھی ہونی چاہئیں۔

دماغ کے ادارے میں، جس کے لئے بعض اوقات جگہ دجھاوی ضروری ہو جاتی ہے۔

تب شجاعت سب سے لازمی صفت ہوجاتی ہے۔ زن و شہد کے درمیان مستقل خوشگوار اور قائمان کی ترقی و تعمیر کے لئے، صفت صفت بہت نمایاں کردار ادا کرتا ہے اسی طرح دوسرے اخلاق فاضلہ بھی اپنے معاشرتی مقاصد رکھتے ہیں اور ان کی اہمیت ان لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی جو ان کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔

### حکمت

حکمت عقل کا وصف ہے۔ اس کا اظہار خود بخود ذہن کی تیسری اور ذکاوت کے ذریعہ ہوتا ہے اور یہ اس علم کو حاصل کرتی ہے محفوظ رکھتی ہے اور عملی فائدوں کے لئے کام میں لاتی ہے، جو حسی ادراک، استدلال یا انولراہی یعنی وجدان ادوی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے اور یہ علم بنی نوع انسان کی آئندہ نسلوں کے لئے باقی رہتا ہے اور اسے شریعت کہا جاتا ہے اسی تعریف کی روشنی میں وصف حکمت کے دو لسانی اجزاء ہوتے ہیں۔  
(الف) حصول علم کی صلاحیت، اگر اعلیٰ قسم کا علم نہیں تو کم از کم عام دنیاوی علم تو حاصل کر سکتی ہے۔

(ب) ذہن کی تیسری، جہارت و ذکاوت، علم کے استعمال اور اس کے عملی فائدے کے لئے ضروری ہوتی ہے اگر کسی شخص میں ان میں سے ایک جزو کی کمی ہوگی تو وہ دلائل کسی حد تک وصف حکمت کا ضرورت مند ہوتا ہے۔

اس کو صاف طور پر واضح کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو لوگ وصف حکمت سے محروم ہیں ان کی خصوصیات کو بیان کرنا چاہیے۔ جس شخص میں صلاحیت فہم کی کمی ہوتی ہے وہ معنی و مفہوم کو صاف طور پر نہیں سمجھتا جو شخص اپنے علم کو بروئے عمل نہیں لاسکتا وہ صحیح دکارآمد اور غلط و نقصان دہ استیبار کے درمیان فرق نہیں کر سکتا۔ جس شخص میں صلاحیت ادراک نہ ہو وہ پیچیدہ سوالات میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ جو شخص تدریس و تدریسی (حکمت) کے عنصر سے محروم ہوتا ہے تو وہ اپنے موجودہ علم سے کسی فیصلہ یا نتیجہ پر پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ جو شخص ایک سست اور غیر فعال ذہن رکھتا ہے وہ سوچ بچار کو نظر انداز کرتا ہے اور انہی ذکاوت و تیسری کے باوجود گہرے تصورات کی تلاش و جستجو

زحمت گوارا نہیں کرتا ہے۔

اور جو شخص ایک اچھے ماقظہ سے محروم ہے تو وہ صحیح طور پر تصورات کو دوبارہ پیش نہیں کر سکتا ہے اور ان کے اظہار میں تسلسل برقرار رکھنے میں ناکام رہتا ہے۔ جو لوگ وصف حکمت کے حامل ہوتے ہیں، مذکورہ کمزوریوں کا شکار نہیں ہوتے۔ وہ فطانت، بشارت، تفہیم، احصار، ادراک، ذکاوت، اور حدس خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام خصوصیات ذہن کی مستعدی کو ظاہر کرتی ہیں اور واقعات کو صحیح طور پر محفوظ رکھنے اور ان کو ماقظہ میں محفوظ رکھنے اور ان سے صحیح فائدہ اٹھانے کی صلاحیت یا مستعدی کا اظہار کرتی ہیں۔

جو لوگ وصف حکمت کے حامل نہیں ہوتے اس سے مختلف صفات کا اظہار کرتے ہیں۔ جن کو بے حیائی، بیوقوفی، حماقت، ذہنی سستی (جمود)، سادہ لوحی اور کند ذہنی کہا جاسکتا ہے ان کے ساتھ بے توہمی، غیبر، مستعدی اور بھولنے کی عادتیں بھی ہوتی ہیں۔

اس وصف کی مزید وضاحت کرنے کے لئے "البدور البازخہ" میں سے ایک حوالہ دینا مناسب ہو گا جس میں غناہ ولی اللہ اسی وصف کی مزید تشریح کرتے ہیں جسے وہ وصف حکمت کہتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں "حکمت نہ تو اعلیٰ اور پیچیدہ فلسفیانہ تصورات کے علم میں ہوتی ہے جو اصحاب فلسفہ کی خصوصیت ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس علم میں ہوتی ہے جو موفیاء اور تارک الدنیا افراد کی صفت ہوتی ہے جسے وہ گہرے وجدان اور روشنی سے حاصل کرتے ہیں جو ان کے ذہن یا روح سے پیدا ہوتی ہے۔

لیکن حکمت، ایک ایسی صلاحیت ہے جس سے مستحکم طبائع رکھنے والے افراد اپنی زندگی میں ہدایت پاتے ہیں، اپنے علم و مشاہدہ میں روشنی حاصل کرتے ہیں اور یہ فطرتاً ہی سے تعلق رکھتی ہے جو ایک نفسیاتی مزاج ہے اور یہی دنیاوی و علمی علوم کا مخزن ہے۔ حکمت ایک نفسیاتی حالت یا رجحان کا نام ہے جو ذہن میں ہوتی ہے۔ یہ اشیاء کے کلی نظری علم سے زیادہ کوئی شے ہے۔ یہ ان دور افتادہ مسائل اور باریکیوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی جن کا کوئی عملی استعمال نہیں ہوتا ہے۔ وصف حکمت کو حاصل



کرنے کے لئے یہ مزدوری نہیں کہ انسان سائنٹفک علم حاصل کرے بسا اوقات تم ایک بددہیاتی  
عرب کو دیکھو گے جو اس حقیقت کے باوجود کہ وہ ان علوم سے بے بہرہ ہے جو ایک مسلم  
بہذب شہری ہاں تلے اودان کا اپنی روزمرہ زندگی میں کیا حقہ فائدہ اٹھاتا ہے لیکن  
وہ حکمت بالغہ سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

حکمت محض اس صلاحیت تک محدود نہ ہوتی ہے اس وصف کو اپنے طور پر نقصان

پہنچاتا ہے۔

شجاعت

انسانی فطرت میں حیوانی مزاج کی ددروخت کی جبلتوں سے، اوصاف کی ترقی و  
فروع کے اصول کے مطابق جسے شاہ ولی اللہ نے پیش کیا ہے، وصف شجاعت کی جڑیں  
غضب اور نزاع پسندی میں پائی جاتی ہیں۔ یہ عقل اور رائے کلی کے تحت ہوتی ہے جس سے  
یہ جبلت، غصہ کی صحیح حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اس طرح وصف شجاعت، وجود میں  
آتا ہے۔

عقل انسانی کی صفات کے مثلث کی ایک نمایاں خصوصیت رائے کلی ہے جو کہ وسیع تر  
مقام کی تکمیل اور لازمی افادے کی غرض کے لئے غصہ کی جبلت کے استعمال کی طرف رہنمائی  
کرتی ہے۔ یہ انسان کو اتنا موقع نہیں دیتی کہ وہ اضطراری طور پر غیض و غضب کا  
مظاہرہ کرے جیسے کہ حیوانات کرتے ہیں جب کسی یا وصف شخص کو غصہ آتا ہے تو اس کے  
رد عمل کی بنیاد غصہ کی فوری آمد نہیں ہوتی، جو کسی مددہ کی وجہ سے ہوتی ہے۔

(سلسلہ)

# حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات

ابو سنان شاہ جہانپوری

(۲)

## جاٹ اور ان کی تباہ کاریاں

اس دور کی ایک فتنہ انگیز قوت جاٹوں کی تھی۔ حکومت پر حملہوار رہا تھا اور جس کا اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جاٹوں نے بھی اس ادھار کو بڑھانے اور مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ گروہوں اور مرہٹوں کے ظلم و ستم سے انسانیت نالاں تھی۔ لیکن جاٹوں کی لوٹ مار اور قتل و غارتگری مرہٹوں کی لوٹ کھسوٹ اور جبر و تشدد کی یاد کو بھلانے لگی۔ حکومت اپنی پوری کوشش کے باوجود ان کی سرکوبی کرنے میں ناکام رہی۔ بالآخر ۱۷۲۲ء ۱۱۳۵ھ میں دکن سے آصف جاہ نظام الملک کو قلعہ دکن وزارت اس کے سپرد کیا گیا۔ نظام الملک نے حالات کو درست کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن خود غرض امراء کی مخالفت کے سامنے نظام الملک کی ایک نہ چلی اور دارالخلافہ میں دو سال کے بعد ۱۷۲۶ء کے آخری مہینے میں وہ دکن واپس چلا گیا۔

جاٹوں کی عملداری میں مسلمان ختم و تباہ حال ہو گئے تھے۔ ان کی تمام دولت جاٹوں نے کھینچ لی تھی۔ جہاں موقع مل جاتے مساجد تباہ کر دیتے، اذان دینے کی اجازت نہ تھی۔ احمد شاہ ابدلی کے نام ایک خط میں حضرت شاہ صاحبؒ ان تباہیوں کی جانب اشارہ کرتے

ہوئے فرمائے ہیں۔ جب جاٹوں نے بیاض کے شہر پر جہاں سات سو سال سے علماء اور صوفیاء رہ رہے تھے، قبضہ کیا تو انہوں نے تمام مسلمانوں کو دیاں سے لگا لیا۔

یہ زمانہ وہ تھا جب مرہٹوں کا فطروہ کافی تشویش ناک ہو گیا تھا۔ انہوں نے مجسرات کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ اور بندھیل کھنڈ کو ہانٹ لیا تھا۔ اور سیٹھاڑان کے قدموں میں بٹھا شاہی افواج ان کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں ناکام رہیں اور جلد ہی گوالیار سے لے کر اجیر تک کے علاقے علاؤان کے تسلط میں آ گئے۔ ۱۱۵۴ھ میں ہامی راجہ پٹوا کو اتنی مجسرات ہو گئی کہ وہ دہلی پہنچا۔ اور اس نے دہلی کے لواحقین کو لوٹا۔

جاٹوں کی ستم رانیاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں۔ سکھوں نے مسلمانوں پر عرصہ جات تنگ کر رکھا تھا۔ ایرانیوں کی سازشوں نے تورانیوں کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی۔ ان معائب سے چھٹکارے کے لئے کوئی کوشش باآوردہ ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ ان حالات میں محمد شاہ نے مجبور ہو کر نظام الملک کو دکن سے دوبارہ واپس بلائے کا فیصلہ کیا یہ ٹھیک ۱۱۵۱ھ کا واقعہ ہے نادر شاہ کا حملہ اور اس کے نتائج

نظام الملک دہلی پہنچا تو نادر شاہ کے حملے کے آثار صاف ظاہر تھے۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ نادر شاہ کو بعض تورانی امراء نے اصلاح حال کی امید پر بلایا تھا۔ مولوی محمد بشیر مرحوم نے تو نظام الملک آصف جاہ کو نادر کا داعی قرار دیا ہے مولانا سناظرن گیلانی فرماتے ہیں۔

”سچ یہ ہے۔ اور واقعات اس کے مزید ہیں کہ ایرانیوں کی قوت کو سادات کی ہمت ہی سے جو کمزوری ہوئی تھی اس کی تلافی کے لئے عزیز تورانیوں پر نادر شاہ کو اکا کر بلایا گیا تھا بہر حال نادر شاہ کو کسی کی طرف سے بلایا گیا ہوا وہ اگرچہ اس دعوت دینے میں کتے ہی مخلصانہ جذبات کا رنسرما ہوں۔ لیکن اس کے عذاب الہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا گیا۔

نادر شاہ آیا اور خون آشامی اور لوٹ کھسوٹ لے سکھوں مرہٹوں اور جاٹوں کی قتل و غارت گری اور لوٹ مار کی یاد لوگوں کے دلوں سے شادی اور مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ دلت و نکبت کے تیر ہمیشہ اغیار رہی کی طرف سے نہیں آتے بلکہ کبھی اپنوں کی تلوار بھی نامرادی و غوری کی ٹنگمیس کا

فرز انجام دیتی ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ مسلمان ہند نے نادر شاہ کے ہاتھوں جو شکست کھائی تھی۔ اس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ نادر گروہ کی دہشت اس حد کو پہنچ چکی تھی کہ دہلی کے شہر کا جوہر کا المیہ کھینچ گئے۔ اس موقع پر حضرت نادر شاہ دلی اللہ نے جب مسلمانوں کو واقعہ کربلا اور امام حسین علیہ السلام کے مصائب یاد دلانے اور بتایا کہ وہاں بھی تو مال و جان کے ساتھ اہل بیت کی عزت و ناموس و خطرو کی آخری شکل میں گھر چکا تھا۔ لیکن حضرت امام حسین نے جو ہر کا فیصلہ نہیں فرمایا۔ بلکہ صبر و رضا کی راہ اختیار کی تو لوگ اس المیہ سے باز آئے۔

اس جوہر کی رسم سے شاید عام لوگ واقف نہ ہوں۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ ہندوستان کی ایک قدیم رسم تھی جب دشمن کا غلبہ اور تسلط اس حد کو پہنچ جاتا تھا کہ بھارت و غلامی کی راہ مسدود ہو جاتی تھی۔ تو پاس ناموس و عزت کے لئے آگ کا لاد جوڑ کر عورتیں مرد بچے سب اس میں کود جاتے تھے۔

یوسف حسین صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

ایک عرصہ تک دہلی کی گلیاں لاشوں سے پٹی رہیں۔ شہر راگہ کا ڈھیر بن گیا اور وہ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے کوئی میدان ہو جہاں آگ لگ چکی ہو شہر کے خوبصورت بازار اور اس کی عمارتیں یوں تباہ و برباد ہو گئی تھیں کہ برسوں کی محنت ہی سے انھیں ان کی پہلی شاندار حالت پر بحال کیا جاسکتا تھا۔ جب شہر میں امن قائم ہو گیا تو حملہ آور فوج نے لوگوں سے روپیہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ کوئی گھر بھی اس سے محفوظ نہ رہا شہر کے ہر محلے کو روپیہ دینا پڑا۔ یہ روپیہ بہت ہی بے رحمانہ طریقے سے جمع کیا۔ لوگوں کو سخت اذیتیں دیں گئیں۔ بہت لوگوں نے تو خودکشی کر لی۔ شمالی ہندوستان سے تمام دولت پنچوڑی گئی۔ صنعت اور تجارت مکمل طور پر اس طرح تباہ ہوئی کہ ایک عرصہ دہلی تک ان کی پہلی حالت بحال نہ ہو سکی۔

نادر شاہ نے دہلی کو کس طرح لوٹا اس کا اندازہ ان بیانات سے لگایا جاسکتا ہے۔

فریہ لکھتا ہے کہ مال غنیمت کا اندازہ ستر کروڑ تھا۔

آنند رام مخلص کا بیان ہے کہ صرف جو اہرات کی قیمت پچاس کروڑ سے کم نہ تھی۔ اسی مال غنیمت میں تخت طاووس اور کوہ نور میرا بھی تھا۔ اودتین سو یا تھی دس ہزار گھوڑے اور اتنے

ہی اونٹ تھے۔

مولانا محمد میاں صاحب نے علمائے ہند کا شاندار باغی میں لکھا ہے۔

بائیں کروڑ روپے نقد خزانہ شاہی سے اور تقریباً نوے کروڑ کے جواہرات اور تخت  
طادس بھی قلعہ سے لوٹے گئے۔

ذوالکمال صاحب نے قتل عام میں مرے والوں کا اندازہ آٹھ ہزار سے ڈیڑھ لاکھ تک  
لگایا ہے۔

ساری خوار و ذلت اور بربادی و تباہی کے پادچودہمے ہوئے بادشاہ محمد شاہ نے  
نادر شاہ کی باضابطہ ہفتوں مہمانی کی۔ وہاں کے بڑے بڑے امراء نادر شاہ کی خدمت پر مقرر  
ہوئے۔ عہدۃ الملک جیسا امیر و کبیر بیچارہ نادر کو قہر پلانے پر مامور ہوا تھا۔ اور یہی حال  
دوسرے امیروں کا ہوا تھا۔ پھر حال محمد شاہ ضیافت نادر شاہ بکمال تکلف قرار داد۔ اور بات  
اس پر ختم نہ ہوئی بلکہ اس کے ساتھ نادر شاہ نے شاہ جہاں بادشاہ کی پوتیوں میں سے ایک  
لڑکی نادر کے چھوٹے لڑکے نصر اللہ مرزا کے نکاح میں دے دی۔ جو اس کے ساتھ ایران سے  
ہندوستان آیا تھا۔

نادر شاہ آیا، اس نے لاکھوں انسانوں کو قتل کیا اور کروڑ روپے کے زر جواہر اور ملالیا  
سمیٹ کر چلا گیا لیکن اس کے نتیجے میں اسلامی ہند کے ہاتھ جو کچھ آیا وہ یہ تھا۔

”نادر شاہ کے قتل و غارت نے دہلی کو اقتصادی لحاظ سے تباہ کر دیا تھا۔ صوبے مرکزی  
حکومت سے آزاد ہو چکے تھے۔ ہمایہ خاں بنگال و بہار میں مختار بن بیٹھا تھا اور نظام الملک دکن  
میں اودھ کے صوبے میں صفدر جنگ کی حکومت تھی۔ اور فرخ آباد میں بنگلش رئیس اور وہیل  
کھنڈ میں روہیلہ سردار آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈال چکے تھے۔ مرکزی حکومت کی یہی کمزوری تھی  
جو آخر کار سبب بنی سرکش سکھوں، بالٹوں، اور مرہٹوں اور سب سے بڑھ کر چالاک اور  
کسی اصول کی پروا نہ کرنے والے انگریزوں کی طاقت کے وجود میں آنے اور بڑھنے کا۔“

حضرت شاہ دلی اللہ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

نادر شاہ نے مسلمانوں کی طاقت کو تو ختم کر دیا لیکن اس نے مرہٹوں اور چالوں کی طاقت

کو قائم رہنے دیا۔ نادر شاہ کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا اور مرکزی حکومت بچوں کا کہیں بن کر رہ گئی۔ نادر شاہ کی واپسی کے بعد ایرانی اور تورانی پارٹیوں کی آویزش نے بڑی خطرناک صورت اختیار کر لی۔

بادشاہ کے تورانی پارٹی سے شکوک و بدبینی بڑھتے گئے اور اس کی وجہ سے ایرانی پارٹی کی سرپرستی شروع کر دی۔ نظام الملک دل برداشتہ ہو کر ۱۱۵۷ھ میں واپس دکن چلا گیا روہیلوں کی آمد اور مسلم ہند کی سیاست میں ان کا اثر و نفوذ اس دور کی مسلم سیاست میں ایرانی اور تورانی امراء کی کش مکش تاریخ کا ایک معلوم و معروف باب رہا ہے۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد اس کش مکش میں ایک اور قوی عنصر کا اضافہ ہو گیا۔ یہ قوی عنصر روہیلوں کا تھا۔ نادر شاہ کا دل و قصد ہمارے راستہ پاکستان ہند میں داخل ہوا تھا۔ راستہ میں ان علاقوں کے باشندوں نے اس کی مزاحمت کی لیکن نادر کے مقابلہ میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ نادر نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اداہنوں نے اپنے علاقوں سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ ڈھونڈی۔

احمد شاہ ابدالی کو شروع سے روہیلوں کی امداد و اعانت حاصل رہی تھی۔ ہند پاکستان پر اس کے تمام حملوں میں روہیلے اس کے ساتھ تھے اس طرح نادر شاہ کے نظم و ستم اور احمد شاہ ابدالی کی اعانت اور امداد نے انہیں مسلم ہند کے سیاسی افق پر نمایاں کیا۔

مغلیہ حکومت دن بدن کمزور سے کمزور ہوتی جا رہی تھی ہر طرف طوائف الملکوں کی کاؤ دورہ تھا۔ امراء سازشوں میں مصروف تھے۔ ان تمام حالات نے روہیلوں کو اپنا اثر و نفوذ بڑھانے کے کافی مواقع فراہم کر دیئے اور انہوں نے اس مواقع سے فائدہ بھی اٹھایا۔ ملک کا ایک بڑا حصہ ان کے تسلط و قبضہ میں آچکا تھا۔ اور جب ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) میں عالم گیر ثانی کے بیٹے علی گوہر کو شاہ عالم کے لقب سے احمد شاہ ابدالی نے تخت پر بٹھایا اور نجیب الدولہ روہیلہ کو امیر الامراء مقرر کیا تو اس سے صاف یہ معلوم ہوا تھا کہ اس وقت تک روہیلے اتنی بڑی سیاسی قوت بن چکے تھے کہ ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔

مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں۔

ملک میں جن عنصر پیدا ہو گئے تھے۔ یعنی ایرانی۔ تورانی اور دہلیے اسی لئے احمد شاہ ابدالی نے بادشاہی تو تورانی عنصر میں رکھی کہ وہی اب تک اس کے خاندان کے طور پر مستحق تھے۔ وزارت ایرانوں کو یا لوں کیے کہ شیعوں کو دی گئی اور امیرالامرائی کا عہدہ ایک روہیلہ نجیب الدولہ کے سپرد ہوا۔ روہیلوں کا حکومت دہلی کے لیے جلیل منصب پر اقتدار حاصل ہونے کا لازمی نتیجہ تھا کہ روہیلے جواب تک اپنا ماویٰ و بلجا زیادہ تر روہیل کھنڈ کو بلکے ہوئے تھے اب دہلی میں بھی اقتدار و قوت کے منظر ہر بن کر اپنے وجود کو محسوس کرنے لگے۔

علامہ محسن البہاری الترمذی "ایضاح" میں لکھتے ہیں۔

"جب احمد شاہ ابدالی جو دہلی کے لقب سے مشہور ہیں اور مقامی کوہستانوں کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ ہیں، ان کا تسلط دہلی پر ہو گیا اور دہلی کی گلیوں میں بکثرت ان کی قوم کے لوگ بھر گئے اور لوگ قبیلہ کلب کی بکریوں کے بالوں سے بھی تعداد میں زیادہ تھے۔"

اسی زمانے کا ذکر تھا کہ برہیلی میں حافظ الملک رحمت خاں۔ نجیب آباد میں نجیب الدولہ اور ان کے سوا اور بھی دو کٹر مقامات میں روہیلوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں قائم ہو گئیں حتیٰ کہ اس وقت برہیل۔ ٹونک بھوپال ان ہی روہیلوں کی یا دھامیں نیم آزاد ریاستوں کی صورت میں موجود ہیں۔

جن حضرات کی زندگیاں انیسویں صدی کے آخر میں اور خاص طور پر بیسویں صدی میں گزری ہیں وہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اٹھارہویں صدی میں ان مسلم ریاستوں کے قیام اور امرا کے افتراق و تشتت نے مسلمانوں کی اجتماعی و سیاسی زندگی کو اور ان کی طاقت و قوت اور عجب و دہلہ پر کو کس قدر نقصان پہنچایا تھا۔

مرہٹوں کے دہلی پر حملے، سکھوں کی تاخت و تاراج جاٹوں کی لوٹ مار اور نادرا گروہی کے پلوے دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلی میں موجود رہے اور ان تمام واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہ وقت انہوں نے درس و تدریس تعینات و تالیف اور غور و فکر میں گزارا تھا۔ پھر وہ اصلاح مال کی طرف سے بھی ہرگز غافل نہیں تھے۔ حالات کو درست کرنے کی جو کوششیں کی گئی تھیں ان میں شاہ صاحب کا بھی حصہ تھا۔ اور بہت بڑا حصہ تھا لیکن اس وقت یہ مسئلہ

ہمارے پیش نظر نہیں ہے بلکہ صرف آپ کے دوسرے سیاسی حالات کا ایک مختصر جائزہ لینا چاہتے ہیں  
احمد شاہ ابدالی اور اس کے حملے

ابتداء میں ابدالی یا درانی قبائلی نے اپنے ہم سایہ غلزنہوں کی مخالفت میں نادر شاہ کی زبردستی  
کی اور صلے میں ان اصلاح کی عمل داری حاصل کی۔ ۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ اندرونی سازشوں کے  
بھینٹ جڑھا تو ایران کے جنوب مشرقی صوبے ابدالیوں کے قبضے میں آ گئے ان کی سب سے  
مستند برادری سدوزئی اور اس کا سردار وہ احمد شاہ تھا۔ اس کی تخت نشینی کی رسم ادا ہوئی  
تو شمال میں بلخ اور دوسری طرف کشمیر و سندھ تک مقامی حکام نے احمد شاہ ابدالی کا  
خطبہ پڑھوایا۔ یہ دولت خدا داد اور عظیم قوت کا تھ آئی تو ابدالیوں نے پنجاب پر بس نہیں  
کیا بلکہ دہلی تک نادر شاہی اقتدار کی تحدید کرنی چاہی۔ مغلیہ حکومت کی کمزوری امراء کے  
اختلافات رقابتوں اور اندرونی سازشوں نے اس کی ہمت بڑھائی۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۷۷ء)  
میں اس نے مسلم ہند پر پہلا حملہ کیا۔ مغلیہ تخت کا مالک اس وقت محمد شاہ تھا ادا گرجہ  
وہ اس وقت سخت بیمار اور مرض الموت میں مبتلا تھا لیکن اس نے ولی عہد احمد شاہ کو ایک  
معتولی فوج اور توپ کے ساتھ اپنے وزیر قمر الدین کی قیادت میں مقابلے کے لئے بھیجا سرحد  
کے قریب مقابلہ ہوا اور ابدالی کے آتشیں اسلحہ کے ذخیرہ میں اچانک آگ لگ جانے سے  
اسے ناکام و نامراد لوٹنا پڑا۔ اکتوبر ۱۱۷۱ھ میں احمد شاہ ابدالی نے پھر دلی کا رخ کیا۔  
دلی کو ابدالی کی فوجوں نے دل کھول کر لوٹا۔ شرفار کی عورتوں نے خودکشی کر لی۔ متھرا  
کو بری طرح لوٹا گیا۔ اور قتل عام ہوا۔ جتنا کا پانی شتغفن ہو گیا۔

جب ابدالی کی فوجوں میں مبینہ پھوٹ پڑی تو مجدد اس نے واپسی کی ٹھہرائی۔ چلتے چلتے  
اس نے حضرت بیگم دختر محمد شاہ سے شادی کی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کی عالمگیر ثانی کی لڑکی  
سے۔ عالمگیر ثانی کی سفارش پر نجیب الدولہ کو امیر لاهور مقرر کیا۔ ابدالی واپسی کے وقت  
دوبارہ دلی کو لوٹ کر چلتا بنا۔ لوٹ کے مال کا اندازہ لاکھوں روپے سے بارہ کروڑ تک کیا گیا ہے۔  
سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں۔

دہلی کی دولت کو بھوکے انسانی نہ چھوڑ سکے تھے کامل اطمینان سے دوہیلے تک شہر



کو لوٹا خانہ تلاشی بلکہ جاہر تلاشی میں بھی کوئی رو رعایت جائز نہ رکھی۔ بڑے بڑے امیروں کو بھی فقیر بنا دیا۔ عائد شہر کی وہ خواریاں دل آفاریاں جو ہیں کہ بعض شریف خود کشی کر کے مر گئے بہت سے منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ اور وطن عزیز چھوڑ کر جد ہر سنگ سیلانی نکل گئے۔ یہ بربادی اور خانہ خرابی وسط ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۷۵۷ء کے واقعات ہیں۔

لیکن مسلم امراء کی اس پر آنکھیں نہ کھلیں وہ ایک دوسرے کو بچاؤ کھانے کی کوششوں میں لگے تھے مقلید حکومت کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ مرہٹوں اور سکھوں کی لوٹ مار حد کو پہنچ چکی تھی۔ حالات کے بہتر ہونے اور سدھرنے کی کوئی امید نہ تھی ملک میں کوئی ایسی قوت اور مرکزی شخصیت نہ تھی جو مسلمانوں کو جمع کر کے امراء کے افتراق و تشتت کو ختم کرتی۔ اور مرہٹہ گردی کا مقابلہ کرتی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر نگاہیں احمد شاہ ابدالی پر پڑتی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح اسے مسلمانوں کی مدد کے لئے دہلی آنے کی دعوت دی گئی۔

ملہا بائی کا بیان ہے کہ

نجیب الدولہ اور مہندستان کے مختلف راجہ اڑے مرہٹوں اور عواما الملک کے ہاتھوں جاں بلب ہو کر دیکھنے لگے کہ ان کی حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل مرہٹوں کے قبضے میں جا رہی ہے۔ اپنی آنکھوں سے یہ تماشائے کوفظ آ رہا تھا تب انہوں نے احمد شاہ ابدالی کی خدمت میں عرض لکھ کر بھیجے اور اس بات کے خواہش مند ہوئے کہ شاہ ابدالی خود مہندستان پہنچیں۔ مرہٹوں نے جب شجاع الدولہ کو ابدالی کی رفاقت سے روکنے کے لئے اپنے سفراء بھیجے تو اس کے جواب میں بھی شجاع الدولہ نے یہی کہا تھا جس کا ذکر پہلے بھی آیا ہے۔ یعنی لوگوں کا مرہٹوں کے ہاتھوں ناک میں دم آ گیا ہے۔ اپنی عزت آبرو اور دین کی آسائش و امن کے لئے ابدالی کو خوشامد آمد کر کے ولایت سے بلایا گیا ہے۔ اور ابدالی سے جو نقصانات پہنچیں گے انہیں مرہٹوں کی معیت سے آسان خیال کر کے ایسا کیا گیا۔

سید ہاشمی فرید آبادی کہتے ہیں۔

مکتی محکومتوں، ریاستوں کی درخواستیں اور صوبہ مظلوموں کی عرضیں احمد شاہ ابدالی کے پاس پہنچ جاتی تھیں۔ پنجاب سے افغانیوں کی پس پائی نے اس کے غیظ و غضب کا پارہ اڑ چڑھایا۔

تیسری مرتبہ پھر غزنوی سنت یاد کی۔ تانہ دم چیدہ لشکر لے کر پاکستان میں داخل ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے نام شاہ ولی اللہ کے ایک خط سے جس کا حوالہ اس سے پہلے گزر چکا ہے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اسلامی ہند کے ناگفتہ بہ حالات اور مرہٹوں اور سکھوں کے ظلم و ستم سے اسے اٹکا کیا مولانا عبد اللہ سندھی فرماتے ہیں۔

نواب نجیب الدولہ شاہ ولی اللہ کے خاص عقیدتمندوں میں سے تھے۔ اور شاہ صاحب ہی کے مشورہ پر انہوں نے امدان کے رفقاء نے احمد شاہ ابدالی کو بلایا تھا۔

احمد شاہ ابدالی کی آمد میں مرہٹوں کو صاف اپنی موت نظر آرہی تھی۔ انہوں نے سازشوں کا جال بچھایا۔ بھاؤ نے صلح کر لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے شجاع الدولہ کو ایک سفید کاغذ بھیجا اور کہلایا اس پر جو شرطیں چاہو لکھ دو۔ میں انہیں منسلح کرنے کو تیار ہوں۔ احمد شاہ ابدالی کا دلیر اس پیش کش کو قبول کرنے کو تیار ہو گیا۔ اگر بھاؤ رسم کی مقدار اور بڑھلے۔

جب نجیب الدولہ نے یہ سنا تو اس نے بہت سخت مخالفت کی اور کہا میں نے تو خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے لئے کمر باندھ رکھی ہے ؟

بہر حال جزوی صلح میں پانی پت کے مقام پر یہ معرکہ پیش آیا۔ اور معلوم ہے کہ اس معرکہ میں فتح نے احمد شاہ ابدالی کے قدم چھسے۔ مشہور ہے کہ اس لڑائی میں کوئی دو لاکھ مرہٹہ سپاہیوں اور ساتھیوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

پانی پت کا خون ریز معرکہ پہلی دو لڑائیوں سے جو تاریخ میں اسی کے نام سے منسوب ہیں نقصان جان میں زیادہ خون ریز اور نتائج کے اعتبار سے زیادہ انقلاب انگیز ثابت ہوا۔ اکثر انگریز مورخ اسے اپنی قوم کے آئندہ باب کشورستانی کا مقدر قرار دیتے ہیں۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جنگ نے مرہٹوں کی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ لیکن اسی جنگ میں تاریخ کا یہ فیصلہ بھی ہو جاتا ہے کہ برصغیر کی آئندہ حکمرانی مسلمانوں کے قبضہ میں باقی نہ رہے گی بلکہ ایک تیسری طاقت کو جو تدریجاً اپنا اثر و نفوذ بڑھا رہی ہے آگے بڑھنے کا موقع ملے گا اور آئندہ برصغیر ہند کے مالک انگریز ہوں گے۔

ابدالی کا یہ مشہور حملہ جس میں مرہٹے تباہ ہوئے۔ مرہٹوں کے علاوہ عماد الملک غازی الدین

کے خلاف بھی تھا۔ جس کی چیسرہ دستیاں مد سے بڑھ گئی تھیں اور ان سے مدظل بادشاہ محفوظ رہے تھے نہ امراء اور وزراء۔ جب پانی پت میں یہ معرکہ کارزار گرم تھا۔ مولانا کا اللہ خان کے الفاظ میں وہ (عماد الملک) جان بچا کر سوہج مل جاٹ کے ہاں پناہ گزین ہو گیا۔ احمد شاہ ابدالی نے عالم گیر ثانی کے بیٹے علی گوہر (عالی گوہر) ملقب بہ شاہ عالم ثانی کو تخت پر بٹھایا اور نجیب الدولہ امیر الامراء اور نائب سلطنت بنائے گئے احمد شاہ ابدالی کی یہ آمد ۱۱۷۵ھ (۱۷۶۱ء) کا واقعہ ہے۔

اس سربسری ہانکہ سے اعلازہ ہو تلبے کہ سلم امراء کو ذاتی رہنمائیوں۔ رہتاہوں حصول اقتدار کے لئے ریشہ دواہیوں اور لشکر کشیوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی طاقت کو کس طرح پارہ پارہ کر دیا تھا وہ اس حد تک کمزور ہو گئے تھے کہ خود اپنی زندگی ان کے لئے وبال تھی کسی دشمن کی مداخلت بھلا وہ کیا کر سکتے تھے۔

مسلمان ہند کی یہ تمام بر بادیاں اور غوریزیاں ایک ایک کمر کے حضرت شاہ دلی اللہ کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہی تھیں۔ ہندوستان میں پنج صد سالہ حکومت اسلامی کا نقش قدم مٹایا جا رہا تھا۔ اور فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ اور عالم گیر ثانی اور شاہ عالم ثانی اگرچہ خود کچھ نہ تھے لیکن تاج و تخت منلیہ کے وارث اور ہندوستان کے فرمانروا تھے اور ان کا مٹنا گویا اسلامی عظمت و سلطنت کا مٹنا تھا، ان کی عزت کا لٹنا گویا اکبر و شاہجہاں اور عالمگیر اورنگ زیب کی عزت کا لٹنا تھا۔

نادر شاہ کے ہاتھوں جو عالم گیر مصیبت اشرف واعیان دہلی پہننازل ہوئی اور شاہ بہلول کی جن سرکوں پر کبھی صاحبقران عظیم کی سواری کے لئے جمنے کا پانی کا چھڑکا گیا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے خون کے نوار بہتے حضرت شاہ دلی اللہ نے دہلی میں رہ کر اس کے تمام مناقب و خیرات اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان چیزوں کو اپنے کانوں سے سنا جو عرصہ تک دارالخلافت کی گلیوں اور کوچوں سے بلند ہوتی رہی تھیں۔ دہلی پر مرہٹوں، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں جو بر بادیاں آئیں ان کے لئے اگر تمام حیوانات ارضی کی آنکھیں اشکبار ہو جائیں۔ اور جن کے غم میں اگر آسمان سے پانی کی جگہ خون برستا۔ جب بھی ان کے ماتم کا حق ادا نہ ہوتا۔

حضرت شاہ صاحب دہلی میں زندہ تھے اور یہ سب دیکھ رہے تھے۔ یہ حوادث ہیں جن پر غیروں کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے ہیں ممکن نہ تھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے یہ سب کچھ دیکھا ہو اور ان کے دل و جگر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو گئے ہوں۔ جس وقت یہ تمام حالات پیش آرہے تھے حضرت شاہ ولی اللہ دہلی میں موجود تھے اور نہ صرف اپنی آنکھوں سے حالات کو دیکھ رہے تھے بلکہ نجیب الدولہ کے ذریعہ حالات کے سدھارنے کی کوششیں لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے ساحل پر کھڑے ہو کر مسلمانوں کی کشتی کو بچانے اور ساحل تک پہنچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مسلمانوں کی کشتی جس گرجاب میں پھنس چکی تھی اس کے لئے نہ شاہ ولی اللہ کی کوششیں کام آسکتی تھیں نہ نجیب الدولہ کی معرکہ آرائیاں اور احمد شاہ ابدالی کی ترک تازیان ہی کافی ہو سکتی تھیں یہے شاہ ولی اللہ کے درحیات کے سیاسی حالات کا ایک مختصر جائزہ ہی حالات تھے کہ حضرت شاہ صاحب کا ۷۹ محرم ۱۱۷۷ھ مطابق ۲۲ اگست ۱۷۶۳ء کو دہلی میں انتقال ہوا تھا۔

## ملحات

شاہ ولی اللہ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے اس میں دھود سے کائنات کے ظہور ندی اور تجلیات پر بحث ہے۔ یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت - دودھ پے



# تدوین حدیث کے ادوار

عبدالہادی ناصر ایم اے

ہر علم کی صحیح تاریخ جاننے کے لئے اس کی ابتدا اور مختلف ادوار کو جن میں سے گزر کر وہ علم اپنے عروج کو پہنچا ہو، جاننا بہت ضروری ہے۔ اس مضمون میں تدوین علم حدیث کے مختلف ادوار اور اس سلسلے میں محدثین علماء کی ساعی کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ آغاز اسلام ہی سے احادیث کی حفاظت اور اشاعت کا خاطر خواہ اہتمام کیا گیا تھا۔ اور اس کی اہمیت کے پیش نظر عہد نبوی سے لے کر عصر حاضر تک کسی نہ کسی رنگ میں اس علم کے مختلف پہلوؤں پر علماء طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ کسی دور میں کم اور کسی میں زیادہ ہم مجموعی طور پر اس تمام عرصہ کو چار اہم ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

## پہلا دور - عہد نبوی

صحابہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سید و مولیٰ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق تھا۔ وہ آپ کی ہر بات سننے کے لئے ہمتیں گوش رہتے اور آپ کے ارشادات سے آگاہ رہنے کی کوشش کرتے۔ اور پھر ان کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیتے۔ وہ آپ کے نقش قدم پر چلتے اور آپ کے طرز عمل کی نقل کرنے کی کوشش کرتے گویا ان کی زندگی

مقام مقصد و چار طاقت رسول اور اسوہ نبی پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ ہر ممکن کوشش کرتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں مدینہ سے دو تین میل دور ایک انصاری بھائی عقیبان بن مالک کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم نے اپنی باری مقصد کی ہوئی تھی۔ ایک دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں حاضر ہوتا اور حضور کے ارشادات سنتا اور تسلیم کو واپس آکر اپنے انصاری بھائی کو سنا دیتا۔ دو سب کو دن وہ حاضر ہوتے اور میں کام کاج کرتا۔ اور وہ شام کو واپس آکر مجھے ارشادات نبوی سے آگاہ کرتے۔

حصول علم دین کی تڑپ نے صحابہ کرام کے دلوں سے دنیا کی جہت بالکل محو کر دی تھی۔ انہوں نے اپنی زندگیاں اسی مقصد کے لئے وقف کر دیں کہ حضرت نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں رہ کر زیادہ سے زیادہ آپ کی صحبت سے فیض یاب ہوں۔ ان میں سے بعض تو دنیا سے بالکل کنارہ کش ہو گئے اور مسجد نبوی میں ڈیرا لگا دیا۔ یہی وہ لوگ تھے جنہیں اصحاب الصفہ کہا جاتا ہے۔ وہ قہر و لاہوت اور معمولی لباس پر گزراوقات کرتے اور حضور سے تربیت پا کر دوسروں کی تربیت کرتے۔ حضرت ابو ہریرہ بھی انہیں میں سے تھے۔ انہوں نے حضرت ربیع بن کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کو محفوظ کیا اور ان سے دوسرے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ باوجود بعد میں اسلام لانے کے سب سے زیادہ روایات آپ نے بیان کی ہیں اس کی وجہ وہ خود یوں بیان کرتے ہیں۔

”تم یہ خیال کرتے ہو کہ ابو ہریرہ بہت کثرت سے حدیثیں بیان کرتا ہے ہم سب نے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے (یعنی میں جہوت کیلئے بول سکتا ہوں) اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ایک سکیں آدمی تھا اور جو کچھ کھانے کو مل جاتا، اسی پر قناعت کرتا اور ہمیشہ حضور کی خدمت میں حاضر رہتا۔ ہمارے سرین باز امدوں میں تجارت کی وجہ سے اول انصار اپنے اموال کی حفاظت کی وجہ سے مشغول رہتے۔ ایک دن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھا تو حضور نے فرمایا۔ جو شخص اپنی چاند بچھلے رکھے، جب تک میں اپنی بات ختم نہ کر لوں اور پھر اسے اکٹھا کرے، تو اس کے بعد جو کچھ وہ مجھ سے سنے گا وہ اسے نہیں بھولے گا۔“

ہیں میں نے اپنی چادر پھٹائی جو میں اور بٹھے ہوئے تھا۔ مجھے اس عدا کی قسم، جس نے میرے نبی کو حق کے ساتھ مبعوث کیا۔ اس کے بعد میں نے حضور کی زبان سے جو کچھ سنا، وہ مجھے بھی نہیں نہیں بھولا۔ ﷺ

حضرت ابوہریرہ کے علاوہ بھی کشمیر تعداد ایسے صحابہ کی تھی، جو حفاظ حدیث تھے اس طرح دواہل سے ہی احادیث کے حفظ کرنے اور انہیں سینہ بہ سینہ منتقل کرنے کا طریقہ چلا آتا ہے۔

اگر حفاظ حدیث کا ذلیلہ کتابت ہی کو قرار دیا جائے تو بھی تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کتابت احادیث کا آغاز بھی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہو چکا تھا۔ گویا ہر پہلو سے علم حدیث کی تدوین دور نبوی میں باقاعدہ شروع ہو چکی تھی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ مجھ سے زیادہ حدیثیں ابن عمرؓ کو یاد ہیں کیونکہ وہ انہیں لکھ لیا کرتے تھے اور میں لکھتا نہیں تھا۔ ﷺ

عبداللہ بن عمرو بن العاص نے کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو لفظ سنتا تھا اسے لکھ لیا کرتا تھا اس ارادے سے کہ اسے یاد کر دوں گا۔ لیکن قریش نے مجھے اس سے منع کر دیا۔

اور کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنتے ہو، وہ لکھ لیتے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشارتیں دیتے ہیں۔ کبھی غصہ میں بھی کچھ فرمادیتے ہیں۔ اس پر میں نے لکھنا بند کر دیا۔ پھر میں نے آپ سے اس بات کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا۔ تم لکھ لیا کرو۔ مجھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ میری زبان سے حق کے سوا کچھ نہیں نکلتا ﷺ

۱۔ بخاری کتاب الاعتصام

۲۔ بخاری کتاب العلم

۳۔ تفسیر ابن کثیر ج ۵۔ ص ۳۷

آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

ما یطق عن الہوی

ان ہر روایات سے بالبداحت یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہی بعض صحابہ آپ کی احادیث لکھا کرتے تھے اس ارادہ سے کہ انہیں بعد میں حفظ کر لیں گے۔ اسی طرح بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کتابت کا ارشاد فرمایا۔ سدرجہ ذیل روایت اس پر روشنی ڈالتی ہے۔

عن ابو ہریرۃ قال کان رجل من الانصار یجلس الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیسمع من النبی صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث ولا یحفظ فنتکا ذالک الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم استعن بيمينك وامامیۃ للنظ - ۵

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کی باتیں سنا چاہتا ہوں۔ مجھے مجھے وہ یاد نہیں رہتی، آپ نے فرمایا: تم اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لیا کرو۔ یعنی میری باتیں لکھ لیا کرو۔ مذکورہ بالا روایت سے بھی کتابت حدیث کا ثبوت ملتا ہے۔ جب خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو اپنے ارشادات حیطہ تحریر میں لانے کی اجازت دے دی تو بھلا صحابہ کیوں اس پر عمل نہ کرتے ہوں گے بلکہ بعض روایات سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ کے پاس احادیث کے مجموعے بھی موجود تھے۔

حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص کے پاس احادیث النبی کا ایک مجموعہ تھا جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھا تھا اور اسے وہ بہت عزیز رکھتے تھے

۱۰ ترمذی الواب العلم۔ باب ما جاء فی الرخصۃ فی الکتابۃ

۱۱ سنن دارمی باب من رخص فی کتابۃ العلم



حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی ایک میحفہ موجود تھا، جس میں زکوٰۃ، خون پر اسیروں کی رہائی، کافروں کے بدلے میں مسلمانوں کا قتل نہ کرنا۔ حرم مدینہ کے حدود وغیرہ کے احکام و مسائل درج تھے۔ اور یہ میحفہ آپ نے خود لکھا تھا چنانچہ فرماتے تھے۔  
ما یستحبنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا القرآن وما فی هذه الصحيفة۔  
ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بجز قرآن کے اور جو کچھ اس میحفے میں درج ہے، کچھ نہیں لکھا،

اس میحفہ سے ان کی مراد وہ مجموعہ احادیث تھا جو خود انہوں نے تیار کیا تھا۔ خواہ رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی بعض احکامات و مسائل نوشتوں میں لکھوا کر اپنے پاس رکھے۔ ان میں سے ایک مجموعہ کا نام کتاب الصدقة تھا۔ جس میں زکوٰۃ وغیرہ کے احکام درج تھے۔

علاوہ انہیں کتب احادیث میں بعض دیگر محائف کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ پس اس دور میں احادیث کی تدوین اصحاب کی حفاظت کے ذرائع کا انتظام و اہتمام ہو چکا تھا۔ اس طرح وہ بنیاد رکھی جا چکی تھی، جس پر بعد ازاں علم حدیث کی عظیم الشان عمارت تعمیر ہوئی۔

## دوسرا دور

آفتاب نبوت کے مطلع عالم پر موجودگی تک تو صحابہ بڑا براہ راست اس سے کسب ذکر کرتے رہے، لیکن جب تقدیر ایزدی سے وہ آفتاب عالم تاب بظاہر اس عالم سے رد پوش ہو گیا تو صحابہ کو احساس ہوا کہ اب دینی و دنیوی امور میں راہ نمائی کے لئے قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کے اقوال و افعال کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اور ان کے دوسرے مسلمانوں تک پہنچانا بھی ان کا فرض اولین ہے۔ کیونکہ اب وہی ان کی خاطر خواہ تعلیم و تربیت کے

یہ صحیح بخاری باب ثم من عاہدتم عذرہ

اس احساس ذمہ داری کے ساتھ انہوں نے اس گراں قدر علمی خدمت کے حفاظت کے لئے ذرائع اختیار کئے۔ صحابہ نے احادیث نبوی کو ضبط تحریر میں لانا شروع کر دیا۔ نیز ان کو دوسرے مسلمانوں تک پہنچانے کی سعی بھی کی اس دور میں کثرت حدیث کا فریضہ قائم دینے میں عن صحابہ نے نمایاں خدمات انجام دیں، ان کے اساریہ ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت مغیرہ بن شعبہؓ، حضرت جابر بن سمرہؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

احادیث کی ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر صحابہ کرام نے درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا۔ اس طرح مختلف طبقے کے درس قائم ہو گئے۔ جن میں مدہا سلمان شامل ہوئے اور وہ ارشادات نبوی سے آگاہ ہوئے۔ کئی احادیث ایسی ہوئیں جن کا علم صرف چند لوگوں کو ہوتا۔ جب ان کو درس میں بیان کیا جاتا تو عام لوگوں کو بھی ان کا علم ہو جاتا۔ مشہور صحابہ جنہوں نے درس حدیث کا باقاعدہ انتظام کیا یہ تھے۔

حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت جابر بن عبداللہؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ وغیرہم۔ خلفائے راشدین نے احادیث کی اشاعت اور استحکام کے لئے صحابہ کرام کو دوسرے شہروں میں بھیجا تاکہ ان لوگوں کو جو خود تحصیل حدیث کے لئے سفر وغیرہ کی استطاعت نہیں تھے ان کو علم حدیث و علم قرآن و سنت نبوی سے روشناس کرائیں۔ چنانچہ ایک دفعہ نے موقع پر حضرت عمرؓ کے تمام مال لوگوں کو بیع کیا اور تقریر کرتے ہوئے فرمایا:-

يا ايها الناس افي ما ارسل اليكم عمالا ليضربوكم وليأخذوا اموالكم وانما ارسلهم اليكم ليعلموكم دينكم ولسنة فيكم

اے لوگو! میں نے ہمتاری طفرہ جو کام بھیجے ہیں، وہ اس لئے نہیں بھیجے کہ تمہیں رد و کوب کریں اور تم سے تمہارے مال لیں۔ بلکہ میں نے اس لئے اہلین ہمتاری طرف بھیجا ہے کہ وہ تمہیں ہمتا دین اور تمہارے بچی کی سنت سکھائیں۔

صحابہ اپنے فرض کو کما حقہ پورا کر کے رفتہ رفتہ اس واد فانی سے جب رخصت ہونے لگے یہاں تک کہ وہ ایک ایک کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، تو اس فرض کا سارا پارتا بعین کے کندھوں پر آ پڑا۔ اب وہ اپنے اساتذہ صحابہ کی جگہ مستند آ رہے۔ اہلین کے نقوش پاکی پیسروی کی۔ انہوں نے بھی کتابت حدیث کا اہتمام کیا اور صحابہ کے جاری کردہ سلسلہ ہائے درس کو جاری رکھا۔ اس طرح علم حدیث روز افزوں ترقی کرتا چلا گیا۔

تابعین میں سے چند ایک مشہور تابعی جنہوں نے اس بارے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ تھے:-

حضرت سعید بن مسیب۔ حضرت عروہ بن زبیر۔ حضرت سالم بن عبداللہ۔ حضرت علقمہ بن قیس۔ حضرت مسروق بن الامدح۔ حضرت ابو عمرو النخعی۔ حضرت ابو جاد غیرم۔

## تیسرا دور

پہلی صدی کے آخر سے دوسری صدی کے نصف تک بے شک پہلے اور دوسرے دور میں تدوین حدیث کا کام ہو رہا تھا، لیکن اس کی حیثیت باقاعدہ علم اور فن کی نہ تھی۔ لوگ انفرادی طور پر اس میں دلچسپی لیتے اور اس کی اشاعت کیتے تھے۔ لیکن دوسرے دور کے اختتام پر بعض امور نے علماء کو مجبور کر دیا کہ وہ اس علم کی حفاظت و تدوین کا باقاعدہ انتظام کریں۔ چنانچہ اس دور میں وسیع پیمانے پر تدوین حدیث کا آغاز ہوا۔ جس کی چند وجوہ مختصراً یہ تھیں۔

۱۔ عہد نبوی کے بعد سے روز بروز جمع و حفاظت حدیث کا کام مشکل ہو رہا تھا۔

۲۔ صحابہ اور تابعین جن کو احادیث نبوی نہانی حفظ تھیں۔ وہ رخصت ہو چکے تھے اور دیگر حفاظ حدیث بھی کم ہونے لگے اور آئندہ لوگوں نے حفظ حدیث کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ دی۔ اس لئے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں احادیث ضائع ہی نہ ہو جائیں۔ نئی احادیث کا پتہ

پہنا تو آپ نامک تھا۔ البتہ معلوم احادیث کی حفاظت ممکن حد تک انتہائی ضروری تھی۔ ایک بڑی ایک لحاظ سے نہایت خطرناک بھی، وجہ یہ ہوئی کہ ایک مخالف اسلام عنصر اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے اسلام میں داخل ہو گیا۔ اور ان لوگوں نے آئی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایسی باتوں کو منسوب کرنا شروع کر دیا۔ جو ان کے اپنے ناپاک ذہن کی اختراعات تھیں اس طرح انہوں نے فرمودات نبوی میں تلبیس کی کوشش کی۔ چنانچہ اسی فتنہ وضع حدیث کے تباہ کن نتائج سے بچنے کے لئے صحیح احادیث کی حفاظت کے لئے اہتمام کیا گیا۔ اس بارے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کا نام جو بنو امیہ کے خلفاء میں سے ایک تھے۔ اور ۹۹ ہجری میں مسند آرائے خلافت ہوئے سرفہرست ہے۔ جن کی دودس نگاہیں اس نظر کے کو اسی زمانے میں بھانپ گئیں۔ چنانچہ انہوں نے اس علم کی باقاعدہ تدوین کے لئے اس اقدام کئے۔ آپ نے اپنے والی مدینہ ابو بکر بن حزم کو لکھا۔

آئی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو حدیث ملے اس پر نگاہ رکھو اور اسے لکھ لو۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں علم (حدیث) ضائع نہ ہو جائے اور علماء سب رخصت ہو جائیں۔ اور سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے اور کچھ قبول نہ کرو۔ علم کو پھیلاؤ اور علمی مجالس قائم کرو تاکہ جو ناواقف (بے علم) ہیں، ان کو بھی علم حاصل ہو جائے (یا درکھو) علم اس وقت تباہ ہوتا ہے جب وہ مخفی ہو جائے۔

اسی طرح آپ نے درس اسلامی ممالک کے عمال کو بھی جمع و حفاظت حدیث کے بارے میں احکام ارسال کئے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کی اس آواز پر سب سے پہلے امام محمد بن مسلم زہری نے ہیکل کہی اور احادیث کی کتابت باقاعدہ شروع کر دی۔ ان کے علاوہ امام شعبی امام سکول دمشقی، قاضی ابو بکر بن حزم وغیرہ نے بھی تعانیف کیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کی نقول مختلف علاقوں میں پھیل گئیں تاکہ ہر جگہ علم پھیل جائے۔ اور عوام احادیث نبوی سے آگاہ ہو جائیں۔ سعد بن ابیہم کہتے ہیں۔

اسرونا عمر بن عبدالعزیز یجمع السنن فکتھا دفترہ۔۔۔۔ الخ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے کچھ جمع حدیث کا حکم دیا تو ہم نے احادیث کے بڑے بڑے مجموعے تیار کر لئے اور انہوں نے ایک ایک مجموعہ جہاں جہاں ان کی حکومت تھی بھیج دیا۔ اسلامی مملکت کی حدود چونکہ کافی دور دور تک پھیل گئی تھیں، اس لئے علم حدیث میں بھی وسعت پیدا ہو گئی۔ ہر شہر کے علماء نے اپنے شہر کے لوگوں سے احادیث حاصل کر کے ان کو مدون کیا۔ اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان کو یکجا کیا۔ کسی پر تفسیر کا رنگ غالب تھا تو کسی پر فقہ کی۔ کسی پر سیرت کا۔ ان میں سے چند ایک مشہور و معروف محدثین علماء کے اسامہ درج ذیل ہیں، جنہوں نے اس بارے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

امام مالک بن انس مدینہ میں۔ امام ادراعی شام میں۔ امام سفیان ثوری کوفہ میں۔ ابوسلمہ خادین دیمار بصرہ میں۔ معمر بن راشد یمن میں۔ عبداللہ بن مبارک قراسان میں اور موسیٰ بن عقبہ اور محمد بن اسحاق۔

ان سب میں سے امام مالک بن انس کی تعینیت ”موطأ“ کو لازوال شہرت حاصل ہوئی۔ اس میں فقہی رنگ غالب ہے۔ اس کی صحت روایات انتہائی درجے پر ہے۔ اس لئے بعض علماء نے اسے صحاح ستہ میں شمار کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ المعروف امام اعظم بھی اسی دور میں ہوئے۔

الغرض یہ دور تدوین حدیث کا اہم ترین دور ہے، جس میں اس علم کو بعض مایہ ناز محافظ اور سرپرست ملے، جنہوں نے علم حدیث کو ایک فن کی شکل دے دی۔ اور اس کی ترقی کے لئے راہیں استوار کر دیں، جن پر گامزن ہو کر بعد کے علماء نے اس علم کو انتہائی کمال تک پہنچایا۔

## چوتھا دور

### دوسری صدی ہجری کے نصف پانچویں صدی کے نصف

ادوار سابقہ میں فن حدیث کی بنیاد رکھی جا چکی تھی، جس پر علم حدیث کی عمارت تعمیر ہو رہی تھی۔ چنانچہ دوسری صدی کے نصف تک اس کا ایک قاکہ سا مرتب ہو چکا تھا۔ اس کے بعد یہ فن سرعت تمام ترقی کی منازل طے کرنے لگا تاہم اس چوتھے دور میں ہر ملک میں اس کی تکمیل ہو گئی۔ اس لحاظ سے تدوین حدیث میں چوتھے دور کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ دوسرے دور میں احادیث شہرہ شہرہ جمع ہونے لگی تھیں۔ اس نے اتنا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ جن میں بعض فقہ پرعاوندوں نے اپنے اپنے مقاصد کے لئے اپنی طرف سے احادیث وضع کر کے ان کو پھیلانے کی کوشش کی۔ چنانچہ محدثین نے اب حدیث کے متن و منبع اور صحت و سقم کو جاننا اور صحت احادیث کے مستحکم معیار مقرر کئے۔ ان شرائط پر ہر کھنے کے بعد صحیح احادیث کو الگ کر دیا اور ضعیف اور موقوف روایات کی نشاندہی کی۔ ان مختلف امور کی وجہ سے محدثین علم کے کام میں بہت اضافہ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مختلف دیگر علوم کی بنیاد بھی پڑی۔ جن کا تعلق علم حدیث کے ساتھ تھا۔ مثلاً علم اسامی الرجال یعنی تفسیر یا ڈیڑھ لاکھ راویوں کے حالات زندگی جمع کئے گئے، جس سے یہ معلوم کرنا آسان ہو گیا کہ کون سے راوی قابل اعتبار ہیں اور کون سے قابل اعتبار نہیں۔ یہ علم ایک بالکل نیا علم تھا۔ اس سے پہلے اس قسم کا کوئی علم موجود نہ تھا۔ احادیث کی اسناد اور متون کو ہر کھنے کے لئے اصول روایت و درایت وضع کئے گئے۔ اب علماء کی بھی تقسیم ہو گئی۔ پہلے ایک ہی عالم فقہ حدیث اور تفسیر وغیرہ میں دسترس رکھتا تھا۔ لیکن وقت کے گزرنے سے علوم میں بہت وسعت ہو گئی۔ اس نے بعض علماء نے فقہ کے علم میں کوشش کی، بعض نے علم حدیث میں، بعض نے تاریخ میں اور بعض نے تفسیر میں۔ اور اس طرح اپنے اپنے علم میں کمال حاصل کیا۔

اس دور میں علم حدیث کے ہر پہلو پر کتب مدون ہوئیں۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی

بعض جلیل القدر حفاظ گزیرے، جنہیں لاکھوں احادیث کئی کئی طریق سے ازبر تھیں۔ لیکن انہوں نے اس پر اکتفا نہ کیا، بلکہ ان میں سے صحیح احادیث کا انتخاب کر کے ضخیم مجموعے تیار کئے، جو آئندہ نسلوں کے لئے ایک گراں قدر علمی خزانہ ثابت ہوئیں اور مشعل راہ بنیں۔ ان میں سے سب سے زیادہ شہرت صحاح ستہ کو ملی۔ ان کے علاوہ بھی کثیر علماء نے ہدایت جالفتائی اور عرق ریزی سے مختلف کتب مدون کیں۔

## المسوی من احادیث الموطا

عربی

حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب آج سے ۳۴ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبد اللہ ندوی مرحوم کے ذریعہ تمام چھپی تھی اس میں جگہ بہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کی الموطا کی فائرس کی شرح المصنفی پر مولف امام نے جو موطا مقدمہ لکھا تھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ولادت کی پڑنے کی نفیس جلد کتاب کے درجے ہیں

قیمت

بیس روپے

## شاہ ولی اللہ کا سفرِ حرمین اور اس کے تعلیمی اثرات

پروفیسر عبدالغفور چودھری

شاہ ولی اللہ کا سفرِ حرمین ان کی زندگی کی شاہراہ پر سنگ میل ہی نہیں ایک روشنی کے مینار کا حکم رکھتا ہے۔ اس کی گہرائی اس عالم مثال یا حظیرۃ القدس کی طرف رہنمائی کرتی ہیں جسے وہ عالم تمثیل سے رنگ دلو کی دنیا میں لانا چاہتے تھے۔ شاہ صاحب نے ارض مقدس کی زیارت کا پروگرام بنایا۔ سولہ سال کے طویل عرصے کی درس و تدریس کے بعد اس وقفے کو انہوں نے ایک زبردست علمی جہاز پر عین صرف کیا تھا۔

شاہ صاحب کو ان کے والد شاہ عبدالرحیم کی طرف سے ان کی زندگی میں ہی دوسری کی اجازت مل چکی تھی بلکہ وہ الجزء اللطیف میں لکھتے ہیں۔

میں پندرہ سال کا تھا کہ والد صاحب سے بیعت کی اور موفیہ کے اشغال، خاص طور سے نقشہ ہندوستان کے اشغال میں

---

۱۔ حضرت اللہ الباقی مترجمہ عبدالحق حق کے دریا چھ صفحہ (ف) پر بتایا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۱۳۳ھ میں منارِ شاہ پر جلوہ افروز ہوئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ لیکن الجزء اللطیف کے مطابق آپ کی پیدائش ۱۱۳۳ھ میں ہوئی اور آپ نے پندرہ سال کی عمر میں ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا (دیکھیں الجزء اللطیف ص ۱) رسالہ عبدالرحیم اکتوبر ۱۹۴۷ء



مشغول ہوا۔ اس سال بیٹھا دی کا ایک حصہ پڑھا۔ والد بزرگوار نے دعوت کا بڑا اہتمام کیا۔ خاص و عام کی ضیافت کی اور درس کی اجازت دی۔

شاہ عبدالرحیم کی وفات ۱۳۳۷ھ میں ہوئی گویا شاہ ولی اللہ نے اپنے والد کی زندگی میں چار سال تک درس و تدریس کا فریضہ ادا کیا اور اس طرح ان کے سامنے طریقی و دانشمندی اور طریقی کتاب چینی کے ذریعہ پڑھانے کی مشق کی۔ شاہ ولی اللہ رسالہ دانشمندی میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ان طریقوں کو اپنے والد سے حاصل کیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۳۸ھ تک شاہ ولی اللہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کے کام میں مشغول رہے۔ ۱۴ سال مطالعہ کتب اور معقولات و منقولات کی تعلیم میں گزر گئے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے شاگرد عزیز شیخ محمد عاشق اور چند ایک اور ساتھیوں کو ساتھ لے کر حجاز کا سفر اختیار کیا۔ شیخ محمد عاشق وہی بزرگ ہیں جو حجتہ اللہ بالغہ کی تالیف کے محرک ہوئے۔ شاہ صاحب نے کتاب کے دیباچہ میں ان کے اس شاگردانہ "امان" کا تذکرہ بڑے دل نشین انداز میں کیا ہے۔ شاہ صاحب کی زندگی کا تالیفاتی و درس حجاز سے ہی شروع ہوتا ہے اور اس کا افتتاح فتوح المحرمین سے ہوتا ہے۔ یہ سفر ان کی طرز فکر اور انداز تفسیر ان کے مکاشفات اور مشاہدات کے لئے انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ان کے سامنے ذہنی اور روحانی تعمیر کی نئی راہیں کھول دیں۔ شاہ صاحب کو خود تو اس داخلی تبدیلی کا احساس تھا۔ لیکن ان کے ملنے والوں اور شاگردوں کو اس تبدیلی کا ادراک بھی شدیداً محسوس تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں اس انقلاب کا ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

"حجاز سے واپس آنے کے بعد والد صاحب کی نسبت باطنی اور علم تفسیر کی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔ جو آپ کے پرانے شاگرد تھے وہ آپ کی حالت حاضرہ کا حالت سابقہ سے مقابلہ

رتے تو ان کی نوعیت میں نمایاں فسری نظر آتا تھا۔

شاہ صاحب کی کتاب فیوض الحرمین جہاں لے ایک حد تک اس ذہنی اور دماغی انقلاب کی عکاسی کرتی ہے جو قیام حرمین کے دوران ان پر گزرا۔ اس نے شاہ صاحب کی شعوری زندگی نہیں بلکہ تحت الشعور میں بھی ایک طوفان برپا کر دیا۔ ان کے مکاشفات اور مناسبات اسی انقلاب کے روحانی پہلو کے آئینہ دار ہیں۔ سفر حرمین کے دوران ان کو اس عظیم مشن کا بھی شعور حاصل ہوا۔ جس کے لئے قدرت ان سے ایک "چارحہ" یا ذریعہ کا کام لینا چاہتی تھی۔ ان کے مکاشفات کے دھند لکوں میں بعض الفاظ بجلی کے کوندے کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں اور اس سنگسار راستہ پر نشان رہنمائی کا کام دیتے ہیں جس کو شاہ صاحب نے زیادت حرمین کے بعد اختیار کیا تھا۔ مثلاً یہ مکاشفہ امر و وقت و قسرت و تست و زماں زمان تو: یا یہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس دلدیا وائے کا ناطق بنایا ہے اور اس کے حکیم کا رتبہ دیا ہے۔ مجھے اس کا قائد اور زعمی مقرر کیا ہے وہ میری زبان سے بولتا اور اس نے میرے نفس میں (اس روح کو) پھونک دیا ہے۔

اس شن کے احساس نے ان کے الفاظ میں ایسی خطابت کا رنگ پیدا کر دیا جس میں ایک عظیم جاہ جلالی کی جھلک ہے۔

علموا اولم تعلموا فان علموا فازداد ان جہلوا فالجلا۔

ان کو فاقہیت۔ ممدویت اور دورۃ الحکمت کے خاتم ہونے کا احساس بھی اسی

فسر کے دوران میں پیدا ہوا۔

انقلاب کے نئے القابات ان کی اہمیت

شاہ ولی اللہ کے یہ مکاشفاتی دعوے بیشتر فیوض الحرمین میں ہیں لیکن چند ایک تنبیہات

میں بھی ہائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے جو مختلف القاب معین کئے ہیں، ان میں سے ہر

ایک ان کی زندگی کے ایک خاص پہلو اور ان کے عظیم مشن کے کسی خاص شعبہ کی علامتی نمائندگی

کرتا ہے مثلاً فیوض الحرمین کے چوالیسویں شاہدے میں انہوں نے اپنے آپ کو قائم الزماں

کہا ہے۔ اور یہ ان کے سیاسی مطمح نظر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔



کہتے ہیں کہ اس آخری دور کی فتح میرے ہاتھ میں رکھی گئی ہے۔ اس سے مراد رحمت خداوندی کی متابعت میں معاشرہ کی شیرازہ بندی ادا ان کے انفرادی کو اتفاق میں تبدیل کیا ہے واقعات کی عصری ترتیب

شاہ صاحب کے سوانح حیات ادا ان کے مختلف ادوار و سنین کے بارے میں ہیں زیادہ

مواد دستیاب نہیں ہوتا۔

الجزء اللطیف میں ان کی خود نوشتہ سوانح حیات نہایت مختصر طور پر دیئے گئے ہیں۔ خود حیات ولیؑ کے مولف کو بھی مواد کی اس تشنگی کا احساس ہے اور چونکہ اکثر تعلیمات میں سنہ تعلیمات نہیں دیا گیا اس لئے ان کو کسی عصری ترتیب میں رکھنا بھی آسان نہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ مل کر ہمیں کوئی ایسے ماخذ مل جائیں جن سے اس پہلو پر مزید روشنی پڑ سکے لیکن موجودہ مواد کے پیش نظر تو بعض اوقات ان کے سوانح حیات کی عصری ترتیب میں دو ہوا کھا جانے کا احتمال ہوتا ہے۔ مثلاً حیات ولیؑ میں اس سلسلہ کو اٹھایا گیا ہے کہ بعض لوگوں کے بموجب شاہ صاحبؑ کے عازم سفر ہونے کی ایک وجہ وہ شورشیں تھیں جن کو ولیؑ کے ملاؤں نے ترجمہ تشریف آن کی وجہ سے اٹھایا تھا۔ حیات ولیؑ کے مصنف نے اس روایت کی تضعیف اس بنا پر کی ہے کہ شاہ ولی اللہ بڑے ولی گردے کے انسان تھے اور وہ ایسی دھکیلوں میں اگر میدان چھوڑ دینے والے نہیں تھے یہ لیکن اگر ہم اس چیلنج کو سنیں و شہرہ کی روشنی میں دیکھیں تو یہ گنہگار ہوجاتی ہے۔ عبدالحق عقیقی کے ترجمہ حجتہ اللہ البالغہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ مراجعت حرمین کے بعد آپؑ نے یہ صورت حال دیکھ کر ان کی اصلاح کی خاطر قرآن مجید کا دواں کی مروجہ زبان میں ترجمہ کرنا شروع کیا۔

سلسلہ درس و ارشاد کے ساتھ ساتھ اس ترجمہ کا آغاز ۱۱۵۷ھ میں ہوا اور ۱۱۵۸ھ

اس کی تکمیل ہوئی پھر ۱۱۵۹ھ سے اس کی تدریس کا سلسلہ ہوا۔

شاہ ولی اللہ کا سفر ۱۱۶۳ھ میں شروع ہوا اور ۱۱۶۴ھ دہج ادا کرنے کے بعد

شاہ ولی اللہ نے فیوض الحسین میں اس سفر کا مقدمہ بہت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد کے سال میں اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مقدس گھر کے حج کی اور اپنے نبی کریم کی زیارت کی توفیق دی۔ لیکن اس سلسلہ میں اس نعمت سے بھی کہیں زیادہ بڑی سعادت جو مجھے میسر آئی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس حج کو میرے لئے مشاہدات باطن اور معرفت حقائق کا ذریعہ بنایا۔ اور اسے محض حجاب اور بے علی کا حج نہیں رہنے دیا۔ اور اسی طرح اس نے نبی کریم کی اس زیارت کو میرے لئے بصیرت افروز بنایا اور اسے بے بعری اور اندھے پن کی چیمڑ نہ رہنے دیا۔

الغرض اس حج و زیارت کے ضمن میں جو نعمت مجھے عطا کی گئی وہ میرے نزدیک سب سے زیادہ بلند مرتبہ ہے۔ اور اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے حج کے ان مشاہدات باطنی میں جو اسرار و رموز مجھے تلقین فرمائے ہیں ان کو ضبط تحریر میں لے آؤں نیز اپنی زیارت کے دوران میں نبی کریم کی روحانیت سے جو کچھ میں نے استفادہ کیا اس کو لکھ دوں۔ تاکہ ایک تو یہ چیز میرے لئے خود یادداشت کا کام دے اور دوسرے میرے اور بھائیوں کو اس سے بصیرت حاصل ہو سکے۔

### مکتوبات اور سفر حجاز

فیوض الحسین میں شاہ صاحب نے محض اپنے مکاشفات اور مشاہدات بیان کئے ہیں اور اس روحانی سفر اپنے کو سمیٹتے وقت ان کے سامنے حرمین کے سفر کا یہی پہلو تھا۔ لیکن اگر ہم ان مکتوبات کا مطالعہ کریں جو انہوں نے وقتاً فوقتاً خود حجاز میں اور اس کے بعد ہندوستان سے حرمین کے علما اور اساتذہ کو بھیجے۔ تو ان سے اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے علی لحاظ سے اس سفر میں کیے کیسے بے بہا تجربات حاصل کئے۔

۱۔ تہذیب فیوض الحسین مترجمہ محمد سرور ص ۵۰

۲۔ ملاحظہ ہو مجموعہ مکتوبات مطبوعہ مجتہبی پریس دہلی، نیز حیات ولی کے آخر میں دیئے ہوئے مکتوبات

ان کے حرمین کے اساتذہ اودان کی اسناد کے سلسلوں میں ایسی اثر انگیز امتیاز شامل ہیں کہ جب شاہ صاحب اپنے مکتوبات میں ان کا تذکرہ کرتے ہیں تو صریحاً یہ کہ وہ گزبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا۔ "کا معذاق بن جاتی ہے اور شاہ صاحب کی زبان پر بار بار یہ شعر آتا ہے۔

و علی تفتن من کتب و صفہ یعنی الزماں و فیہ عالم صفہ

(ترجمہ) ان کی تعریف کرنے والا خواہ رہتی دنیا تک ان کی تعریف کرتا رہے پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسا پہلو رہ جاتا ہے جہاں تک اس کی نظر نہیں پہنچی۔ ایک بات قدرے تعجب انگیز ہے کہ شاہ صاحب تو اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے ایسے کھوجاتے ہیں جیسے کوئی شاعر محبوب کی تعریف و توصیف میں لیکن بعض سوانح نگاران کے اساتذہ کے شمار کرنے میں بھی غلطی کھا گئے ہیں۔

مثلاً مولانا عبدالحق حقانی کی مترجم جتہ اللہ البالیہ کے دیباچے میں بیان کیا گیا ہے کہ شاہ ولی اللہ شیخ احمد شنادی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے بیعت کر کے کسب فیض کیا۔ شیخ احمد تشاشی سے بھی کچھ فیضان حاصل کیا۔ ان کے علاوہ سید

۱۔ شاہ ولی اللہ اور ان کے والد شاہ عبدالرحیم نے اس شعر کا اکثر جگہ استعمال کیا ہے۔ ویسے تو ایک ہی توصیفی شعر کو کئی ایک شخصیتوں کے بارے میں استعمال کیا جائے تو وہ لطف معنی کھودیتا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے فیوض الحرمین کے دو شعر مشابہے میں بتایا ہے کہ دو نفوس کی باہمی تائید کے ضمن میں جو اتحاد ہوتا ہے وہ ضروری نہیں کہ مطلقاً اتحاد ہو۔ اکثر اوقات یہ ایک قوت یا جزو کا اتحاد ہوتا ہے۔ گویا وہ مختلف بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ان سے ذہنی اور روحانی اتحاد کرتے ہیں تو ان کے کسی ایک پہلو کو نقطہ اتصال بناتے ہیں۔ اس لحاظ سے مختلف لوگ گزبانگوں اور ہر قلموں صفات کا مظاہرہ کرتے ہیں اور یہ شعر بھی نئے معنی اور نئی جہات پیش کرتا رہتا ہے۔

عبدالرحمن ادیبی، شمس الدین محمد بن علاء بانی، شیخ حبیبی جعفری، شیخ حسن عجمی، شیخ احمد علی۔ اور شیخ عبداللہ بن سالم بصری سے بھی کتاب فیض کیا ہے۔

شاہ صاحب کے حرمین کے اساتذہ کے حالات بیان کرنے میں اکثر سہو ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنے مشائخ الحرمین کا ذکر انفس العارفين اور اپنے رسالے انسان العین فی مشائخ الحرمین میں کیا ہے۔

ان کے اپنے قول کے مطابق اس رسالے میں انہوں نے صرف دو گروہ شامل کئے ہیں۔ مشائخ صوفیہ اور علمائے محدثین۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ان اساتذہ کے ضمن میں فقہ اور علم الکلام یا عقائد کا ذکر نہیں کیا گیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ان بزرگوں کے واسطے سے خسرو صوفیہ اور اسناد حدیث حاصل ہوئی ہیں۔ ان الفاظ سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ شاہ صاحب نے ان سب لوگوں کے سامنے زانوئے تلمذ کھڑے کیا ہے۔ حقیقت میں ایسا نہیں۔ شاہ صاحب نے اپنے اساتذہ کی اسناد بھی دی ہیں۔ یعنی ان اساتذہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جز سے روایت کا سلسلہ آپ تک پہنچا۔ یہ ضروری نہیں کہ شاہ صاحب نے ذاتی طور پر ان سب سے استفادہ کیا ہو۔

مثال کے طور پر شاہ ولی اللہ کو بھی شیخ احمد شادانی سے فیض اٹھانے کا موقع نہیں ملا۔ انفس العارفين میں ان کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ ان سے شیخ احمد شادانی نے روحا فتوح حاصل کیں۔

شیخ احمد قشاشی ابراہیم کردیؒ شاہ ولی اللہ کے استاد ابوظاہر الکردی کے شیخ تھے۔ ابراہیم کردی اور شیخ احمد قشاشی کی آپس میں عجیب ہست اور روحانی تعلق تھا۔ ابراہیم کردی

۱۔ ملاحظہ ہو دیباچہ حمۃ اللہ الہالذہ مترجمہ عبدالحق متقانی

۲۔ انفس ص ۱۴۸ انسان العین ص ۱-۲

۳۔ انفس ص ۱۴۹ انسان العین ص ۲-۳

۴۔ انفس ص ۱۴۸ انسان العین ص ۴-۸

نے ان سے حدیث روایت کا خرچہ پینا اور ان کی محبت میں کمالات عالیہ کا کتاب کیا۔ شاہ دلی اللہ کو شیخ احمد قشاشی تو کیا ابراہیم الکردی سے بھی ذاتی تلمذ کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح ابراہیم کردی نے سید عبدالرحمن الادریسی سے فیض حاصل کیا تھا۔ ایک مرتبہ جب شیخ احمد قشاشی اور ابراہیم کردی کے درمیان کچھ رنجش ہو گئی اور ابراہیم کردی پر انقباض کی حالت طاری ہو گئی تو سید عبدالرحمن الادریسی نے اپنے روحانی تصرف سے اس کو دور کیا۔ شاہ دلی اللہ کو ذاتی طور پر سید عبدالرحمن الادریسی سے کبھی ملنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

اسی طرح شمس الدین محمد بن العلاء الباقلیؒ کی وفات ۸۷۰ھ میں ہو چکی تھی۔ وہ بھی شاہ صاحب کے اسناد حدیث میں سے تھے لیکن ان کا زمانہ آپ سے پہلے کا ہے۔

شیخ عیسیٰ الجمعفری المغربيؒ کی وفات بھی ۸۷۰ھ میں ہو چکی تھی۔ یہ بھی پہلا زمانہ کے بزرگ ہیں۔ اسی طرح محمد بن محمد بن سلیمان المغربيؒ سے بھی شاہ دلی اللہ سے پہلے ہو چکے ہیں۔ شاہ دلی اللہ نے ان کی صحیح روایات کے اجازہ کو ان کے بیٹے وفد اللہ سے حاصل کیا تھا۔ اس باب میں حیات دلی کے مؤلف سے بھی ایک سہو ہو گیا ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اشارہ کے متن میں وفد اللہ کے حالات دیئے ہیں، لیکن اس کے تحت القاس العارفين میں سے وہ حالات دیئے گئے ہیں جن کا تعلق ان کے والد محمد بن محمد بن سلیمان سے ہے۔

شیخ حسن عجمیؒ کی وفات ۱۱۳۰ھ میں اور شیخ عبداللہ بن سالم البصریؒ کی وفات ۱۱۳۰ھ میں ہوئی۔ اس طرح ان کا زمانہ بھی شاہ صاحب کے سفر حرمین سے پہلے کا ہے۔

۱۔ القاس العارفين ۱۳۰ نیز ملاحظہ ہو انسان العین فی شاخ الحرمین ص ۳

۲۔ القاس ۱۸۳ - انسان العین ۶

۳۔ القاس ۱۸۳ - انسان العین ۶ - ۷

۴۔ القاس ۱۸۳ - انسان العین ۷

۵۔ القاس ۱۸۶ - انسان العین ۹

۶۔ القاس ۱۸۹ - انسان العین ۱۲ - ۱۳



شیخ احمد علی بھی ان کے سلسلہ استاد کی ایک کڑی ہیں۔ لیکن شاہ صاحب کو ان سے بھی ذاتی طور پر استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شاہ صاحب نے ذاتی طور پر جن اساتذہ سے استفادہ کیا یا اجازت لیا وہ تاج الدین قلعی حنفی، ابو طاہر الکروٹی اور فدا اللہ بن محمد بن محمد بن سلیمان ہیں۔

**پختگی اور پختہ کاری کی منزل**

اس میں شبہ نہیں کہ شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے تدریس و تربیت کی غرض سے انہیں طریق دانشمندی اور طریق کتاب بینی کے ذریعے تعلیم دی۔ طریقت میں ان کی تعلیم نظری کی بھی اور عملی بھی۔

شاہ عبدالرحیم اپنے بیٹے کے لئے ایک شالی استاد تھے۔ چنانچہ ان کی تربیت سے شاہ ولی اللہ کے سامنے ان کے آئندہ تعلیمی لائحہ عمل کے ضوابط اچھے خٹک ابھر آئے۔ سفر حرمین سے اس لائحہ عمل کی مزید توثیق و تصدیق ہو گئی۔ فیوض الحرمین کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے لئے عالم مثال اور حقیقۃ القدس کے گویا نئے دریچے کھل گئے۔ ان کی ابتدائی جھلکیاں تو ان کو شاہ عبدالرحیم کی تربیت سے ہی حاصل ہو چکی تھیں۔ لیکن طبعی عمر کے لحاظ سے وہ ابھی تک پختہ کار نہ تھے، سفر حرمین کے دوران انہیں مذہبی اور روحانی لحاظ سے بغایت رجاؤ حاصل ہو گیا۔ ان کی روح کی وسعتیں اس نرم ناک سنی کی طرح تھیں جو طوفان رنگ بوکا چولا بہ لئے کے لئے بالکل آمادہ تھی۔

حرمین کے اساتذہ اور وہاں کی علمی دفنائے اس کے لئے ایک عمر کا کام کیا۔ قرآن مجید گہرا مطالعہ تو شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار کی زیر ہدایت کیا تھا۔ حرمین میں انہیں عہدِ حدیث کی تعلیم اور اس کے طریق تدریس کے مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ ان کے اس

۱۔ انقاس ۱۸۸، انسان العین، ۱۰-۱۱

۲۔ انقاس ۱۹۲، انسان العین، ۱۵-۱۶

۳۔ انقاس ۱۹۰، انسان العین، ۱۳-۱۴

ابو طاہر کردی حدیث میں طریق سرود کی پیروی کرتے تھے بلکہ وہ حدیث کے اسما الرجال، اسناد کی تقویت یا تضعیف کے بجائے حدیث کے حسن و جمال اور انسانی اقدار سے مترنم پیغام پر زیادہ زور دیتے تھے۔ مدینے کے تعلیمی ملقوں میں ان کا حدیث کا درس پوری آبادی کے لئے ایک صلائے عام تھا۔ شاہ ولی اللہ نے بھی انکی پیروی میں اس علم کو زیادہ سے زیادہ آسان بنا کر اسے زیادہ سے زیادہ سامعین تک پہنچانے کی کوشش کی۔

### توافق فقہی و سلاسل صوفیا

حرین میں قیام کے دوران شاہ صاحب کو ایسے مشائخ سے اکثر ملنے کا موقع ملا جو سنیہ لشرب اور بالغ نظر تھے۔ ہندوستان کے مسلمان موجودہ زمانے کی طرح شاہ ولی اللہ کے دور میں بھی فرقہ بندی کی ہنگامہ آرائیوں میں مصروف تھے فقہاء اور صوفیاء کی کاندھاری اس کے طبعی فروغ پارہی تھی۔ شاہ عبدالرحیم کے ایک مکاشفے میں تو ان کو ایک پورا بازار دکھایا گیا جس میں صوفیائے مختلف خانوادوں یا سلسلوں کی دکانیں بھائی گئی تھیں بلکہ

مسلمانان عرب آج بھی فرقہ بندیوں کے اس قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں ہمارے ہاں کے نازنین بیچ کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمانوں اور مختلف فرقوں کے بوجھوں کو ایک ساتھ ناز اور ارکان بیچ ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو شجب ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کی ملاقات حرین میں اکثر ایسے مشائخ سے بھی ہوئی جو توافق مذاہب کے قائل تھے اور اپنے اقوال و

---

طریق سرود سے مراد تحقیق اور معان کے برعکس حدیث یا کسی اور فن کی کتاب کا مطالعہ کرنا اور لغت زبان تعلیمات وغیرہ کی تفصیل سے بچ کر فن کے مجموعی پیغام کو پیش کرنا ہے۔ اس طریق میں سامعین کو سمجھنے کے لئے کسی خصوصی جہارت کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے پیغام کا حلقہ وسیع ہوتا ہے۔

شیخ احمد علی بھی ان کے سلسلہ استاد کی ایک کڑی ہیں۔ لیکن شاہ صاحب کو ان سے بھی ذاتی طور پر استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ شاہ صاحب نے ذاتی طور پر جن اساتذہ سے استفادہ کیا یا اجازت لیا وہ تاج الدین قلعی شافعی، ابو طاہر انکروی اور فاضل اللہ بن محمد بن محمد بن سلیمان ہیں۔

**پختگی اور پختہ کاری کی منزل**

اس میں شبہ نہیں کہ شاہ ولی اللہ کے والد شاہ عبدالرحیم نے تدریس و تربیت کی غرض سے انہیں طریق دانشمندی اور طریق کتاب بینی کے ذریعے تعلیم دی۔ طریقت میں ان کی تعلیم نظریہ کی تھی اور عملی بھی۔

شاہ عبدالرحیم اپنے بیٹے کے لئے ایک مثالی استاد تھے۔ چنانچہ ان کی تربیت سے شاہ ولی اللہ کے سامنے ان کے آئندہ تعلیمی لائحہ عمل کے حدود و احوال اچھے خالص ابھر آئے۔ سفر حرمین سے اس لائحہ عمل کی مزید توثیق و تصدیق ہو گئی۔ فیوض الحرمین کے مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کے لئے عالم مثال اور حظیرۃ القدس کے گویا نئے دریا کچے کھل گئے۔ ان کی ابتدائی جھلکیاں تو ان کو شاہ عبدالرحیم کی تربیت سے ہی حاصل ہو چکی تھیں۔ لیکن طبعی عمر کے لحاظ سے وہ ابھی تک پختہ کار نہ تھے۔ سفر حرمین کے دوران انہیں مذہبی اور روحانی لحاظ سے بغایت بچاؤ حاصل ہو گیا۔ ان کی روح کی دو سستیاں اس نم نم ناک سنی کی طرح تھیں جو طوفان رنگ و بو کا چولہا بننے کے لئے بالکل آمادہ تھی۔

حرمین کے اساتذہ اور وہاں کی علمی دفنانے اس کے لئے ایک محرک کا کام کیا۔ قرآن حکیم کا گہرا مطالعہ تو شاہ صاحب نے اپنے والد بزرگوار کی زیر ہدایت کیا تھا۔ حرمین میں انہیں علم حدیث کی تعلیم اور اس کے طریق تدریس کے مطالعہ کرنے کا بھی موقع ملا۔ ان کے استاد

۱۔ انقاس ۱۸۸، انسان العین، ۱۰-۱۱

۲۔ انقاس ۱۹۲، انسان العین، ۱۵-۱۶

۳۔ انقاس ۱۹۰، انسان العین، ۱۳-۱۴

بطاہر کردی حدیث میں طریق سرودی کی پیروی کرتے تھے یہ وہ حدیث کے اسما الرجال اسناد کی نقویث یا تصنیفات کے بجائے حدیث کے حن و جمال اور انسانی اقدار سے مترنم پیغام پر زیادہ زور دیتے تھے۔ مدینے کے تعلیمی حلقوں میں ان کا حدیث کا درس پوری آبادی کے لئے ایک صلائے عام تھا۔ شاہ ولی اللہ نے بھی انکی پیروی میں اس علم کو زیادہ سے زیادہ آسان بنا کر اسے زیادہ سے زیادہ سامعین تک پہنچانے کی کوشش کی۔

## توافق فقہی و سلاسل صوفیا

حرین میں قیام کے دوران شاہ صاحب کو ایسے مشائخ سے اکثر ملنے کا موقع ملا جو وسیع الشرب اور بالغ نظر تھے۔ ہندوستان کے مسلمان موجودہ زمانے کی طرح شاہ ولی اللہ کے دور میں بھی فرقہ بندی کی ہنگامہ آرائیوں میں معروف تھے فقہاء اور صوفیاء کی دکانداری اس کے طویل فردغ پار ہی تھی۔ شاہ عبدالرحیم کے ایک مکاشفے میں تو ان کو ایک پورا بازار دکھایا گیا جس میں صوفیاء کے مختلف خانوادوں یا سلسلوں کی دکانیں سمائی گئی تھیں یہ

مسلمانان عرب آج بھی فرقہ بندیوں کے اس قسم کے اثرات سے محفوظ ہیں ہمارے ہاں کے ناسرین بیچ کے موقع پر تمام دنیا کے مسلمانوں اور مختلف فرقوں کے لوگوں کو ایک ساتھ نماز اور ارکان بیچ ادا کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو شجب ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کی ملاقات حرین میں اکثر ایسے مشائخ سے بھی ہوئی جو توافق مذاہب کے قائل تھے اور اپنے اقوال و

طریق سرود سے مراد تحقیق اور ایمان کے برعکس حدیث یا کسی اور فن کی کتاب کا مطالعہ کرنا اور لغت زبان تعلیمات وغیرہ کی تفصیل سے بچ کر فن کے مجموعی پیغام کو پیش کرنا ہے۔ اس طریق میں سامعین کو سمجھنے کے لئے کسی خصوصی مہارت کی ضرورت نہیں ہوتی اس کے پیغمبر کا حلقہ وسیع ہوتا ہے۔

افضل سے اس کی تصدیق کرتے تھے۔ وہاں ایسے مشائخ صوفیہ کی بھی کمی نہیں تھی جو مختلف سلاسل صوفیہ کے توافقی کے قائل تھے۔ شاہ ولی اللہ کے بعض مشائخ اساتذہ کا تو جامعیت پر وہابانہ ایمان تھا۔ مثلاً ابو طاہر کروی کا عقیدہ تھا کہ احادیث میں توافقی مذہب کرتے ہوئے کسی قسم کی قیمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ خود رسول کریم کی شخصیت مبارک نہایت جامع ہے اور ان کی یہ جامعیت ایسا سلطانی مملوک ہے جس میں مذاہب و اختلاف کے سنگریزے اپنے اپنے آپ حل ہو کر نیت و تابود ہو جائے ہیں۔

سلاسل صوفیہ کے توافقی کا بیج شاہ عبدالرحیم نے اپنے ہونہار بچے کے دل میں پہلے ہی بودیا تھا۔ شاہ عبدالرحیم کو خود چشتی قادری نقشبندی سلسلوں سے نسبت خرقہ حاصل تھی۔ لیکن ابو طاہر کروی نے تو اس میدان میں "خدا ما صفا و دعا ماکد" کو شاہ ولی اللہ کی زندگی کا ایک اعلیٰ اصول بنا دیا۔ انہوں نے شاہ ولی اللہ کو کئی ایک سلسلوں کی بیعت اور خرقہ سے شرف یاب کیا۔ ان کے اپنے الفاظ میں میں نے شیخ ابو طاہر سے ایسا خرقہ حاصل کیا جو صوفیوں کے تمام خرقوں پر حاوی ہے۔

ہندوستان میں شاہ صاحب کو ایسے بزرگوں سے فیض پانے کا موقع ملا تھا جو طریقت اور شریعت دونوں کے حامل تھے۔ یعنی شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ طبقہ علماء و فقہاء میں بھی ایک حیثیت رکھتے تھے ان میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت تو خود ان کے والد شاہ عبدالرحیم کی تھی۔ لیکن حرمین کے سفر میں ان کو بہن مشائخ سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ تقریباً سب کے طریقت و شریعت دونوں کی دولتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ شاہ صاحب نے "آلہ العین فی الحرمین" میں ایسے مشائخ صوفیہ اور فقہاء کے سوانح حیات دیئے ہیں جن سے انہوں نے حدیث کی سند یا طریقت کی نسبت حاصل کی۔ ان میں سے اکثر مشائخ اس لحاظ سے

جامع الصفات تھے کہ اہل طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ عام فقہاء اور علماء کی طرح درس و تدریس کے سلسلہ کی بھی مداومت کرتے تھے اور ظاہریت کے لحاظ سے اپنے لباس اور طرز حیات میں کسی تمیز اور مخصوص لباس یا انداز زندگی کو اختیار کرنے سے احتراز کرتے تھے اور یہی کوشش کرتے تھے کہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ عوامی انداز میں بسر کریں۔ مثال کے طور پر شیخ احمد تاشاشؒ کی عادت تھی کہ وہ نہ تو فقہاء کے انداز میں زندگی بسر کرتے تھے اور نہ ہی زہاد کی طرز پر ان کا طریقہ توسط اور بے تکلفی کا تھا۔ وہ کبھی امراء کے دروازوں پر نہیں جاتے تھے اگر یہ لوگ ان کے ہاں حاضری دیتے تو ان سے خوش خلقی اور بشارت سے پیش آتے اور ہر ایک کے ساتھ اس کے مرتبہ کے حسب حال سلوک کرتے۔ ان میں جو اباب سحر و سموات و مروت میں سے ہوتا تھا اس کا خصوصیت سے احترام کرتے اور بڑے ملامت الفاظ میں امر و معروف کی نصیحت کرتے بلکہ

شاہ صاحب نے انفس العارضین میں اپنے بڑے چچا شیخ ابو الرضا محمد اور اپنے والد کی روزمرہ کی زندگی کا نقشہ کینچا ہے۔ وہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے عالمگیر اصولوں نے اچھے اساتذہ اور اچھے شیوخ کو ایک ہی سانچے میں ڈال دیا تھا اور انہیں ایسے صبغۃ اللہ یا اللہ کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ جو نہ تو کسی نسل اور قومیت کی کمی پر جھڑھ کر اترتا تھا اور نہ ملکی اور قومی تعصب کی آنچ سے مدھم پڑتا تھا۔

ابو الرضا عبدالحق حقانی کی مترجمہ رحمۃ اللہ الباقیہ کے دیباچہ کے بموجب شاہ ولی اللہ ریا و نمود اور ظاہری نمائش و نشان و شوکت سے ہمیز فرماتے تھے۔ بازاری میں نکلتے تو ہم عصر ہیروں اور مشائخ کے برخلاف بالکل معمولی حیثیت سے مریدین کا کوئی پیرایا جہوم ساتھ نہ ہوتا تھا بلکہ

۱۔ انفس العارضین، ۱۸۰۔ انسان العین

۲۔ شاہ ولی اللہ نے انفس العارضین میں اپنے والد ادیب چچا کے ملفوظات اور کرامات پر تفصیل ابواب شامل کئے ہیں۔ ۳۔ دیباچہ رحمۃ اللہ الباقیہ مترجمہ عبدالحق حقانی

شاہ ولی اللہ کے حرمین کے اساتذہ بھی ان کی طرح سادگی کے نمونہ تھے۔ ان کے اساتذہ ابو طاہر کردی کے والد شیخ ایلا رحم کردی بڑے بڑے علموں اور دوز آستین اور لباس خوب اور کا دک سے نفرت کرتے تھے۔ ان کے کپڑے متوسط قسم کے ہوتے تھے۔ ان کا علم و تقاریب ہوتا تھا اور دھار پدار صوف اور کوفیہ لاطیہ جو عام اہل حجاز کا لباس ہے، پہنتے تھے۔ اور مجلس میں کبھی صدر بننے اور کلام میں تقدیم کی خواہش نہیں کرتے تھے بلکہ

شیخ احمد قشاشی کے دادا شیخ یونس کا نام قشاشی اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ اپنی روحانی حالت کو سیفہ راز میں رکھنے کے لئے مدینہ میں قشاشہ فروش کا کام کرتے تھے یعنی گرا پڑا سامان اور پرانی جوتیوں کا کاروبار کرتے تھے۔ شیخ یونس القشاشی مدینہ میں عبد البی کے نام سے مشہور تھے۔ ان کا یہ نام اس لئے پڑ گیا تھا کہ وہ لوگوں کو اپنے پاس سے دام دے کر مسجد نبوی میں بٹھاتے تھے اور انہیں کہتے تھے کہ وہ رسول کریم پر درود بھیجیں۔ شاہ صاحب کے اساتذہ اہل حلال کے معاملے میں بے حد محتاط تھے۔ شیخ عبد اللہ بن سالم المصری ان کے صبیح بخاری کے اسناد میں سے تھے۔

شاہ ولی اللہ اناس العارفین میں لکھتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ ان کے بیٹے شیخ عالم شریف الشرفاء مکہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے۔ شریف الشرفاء ترک کی حکومت کی طرف سے مکہ کا حاکم ہوتا تھا۔ اس دن سے شیخ عبد اللہ کھانے کے معاملے میں بڑے محتاط ہو گئے۔ ان کی سب سے بڑی احتیاط یہ ہوتی تھی کہ ان کا کھانا بلکہ ٹک تک بھی شیخ سالم کے کھانے میں نہ مل جائے۔

شاہ صاحب کے حرمین کے اساتذہ محض علما و فقہا نہیں تھے۔ ان میں سے

۱۔ دیباچہ حجتہ اللہ البالغہ مترجمہ عبد الحق حقانی

۲۔ انسان العین، فی شیخ الحرمین ص ۵

۳۔ اناس العارفین ص ۱۶۹

۴۔ انسان العین، ص ۲

اکثر و بیشتر ارباب طریقت اور صاحب دل تھے۔ ان میں سے بعض سماع کو جائز سمجھتے تھے اور مجالس میں شریک ہوتے تھے۔ بعض کی طبیعت میں بے انتہا گداز تھا اور ان کے کردار میں غشونت نہ تھی جو خشک ملائی ذہنیت کا خاصہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے ملفوظات میں ہیں شاہ ولی اللہ کی زندگی کا جو اجمالی خاکہ ملتا ہے اور خود شاہ عبدالعزیز کی مجلسی زندگی میں ان کے والد کے اثرات کا جو عکس نظر آتا ہے۔ اس میں ان کی وسعت قلب اور انسانی کمزوریوں کے لئے عفو و درگزر کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ اس ضمن میں شاہ صاحب نے اپنے استاد ابو طاہر کردی کے والد ابراہیم کردی کے بارے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔

ایک مرتبہ ابراہیم کردی حج کے لئے مکہ میں آئے ہوئے تھے۔ بعض لوگوں کو ملنے کے لئے نکلے تو ان کا گزر چند گانے والی لڑکیوں کے قریب سے ہوا جو گانے اور لغو و لہجہ میں مشغول تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے شاگرد اجل سید محمد برزنجی بھی تھے۔ انہوں نے ان کی ڈنڈے سے خبر لی۔ شیخ ابراہیم نے انہیں منع کیا۔ چونکہ سید محمد برزنجی سنت طبیعت کے تھے اس لئے وہ ان کی روک روک سے ریجیدہ خاطر ہوئے جب مجلس مقصود میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں بھی ایک گانے والی اشعار پڑھ رہی ہے۔ اگرچہ اشعار خود عروض کے مطابق نہیں تھے اور عامیانہ تھے لیکن جب شیخ ابراہیم نے انہیں سنا تو ان پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی انہوں نے چپکے کو کپڑے سے ڈھانپ لیا اور زار و قطار روئے گئے۔ اہل مجلس میں جو شیخ کی آواز سنایا ان کے چہرہ کو دیکھتا اس پر بھی گرمی طاری ہو جاتا۔ اس میں قسب القلب اور رقیق القلب سب کی حالت یکساں تھی یہاں تک کہ خود سید محمد برزنجی پر بھی رقت طاری ہو گئی اور ان کے دل میں جو غبار تھا آنسوؤں کے واسطے دھل گیا۔

۱۔ انفس العارفين، ۱۸۹-۱۹۰

انسان العین، ۱۲-۱۳

۲۔ انسان العین فی مشائخ الحرمین، ۷-۸ انفس، ۱۸۴-۱۸۵



اسی طرح شیخ اور میں محبوب کے لقب کے بارے میں شاہ ولی اللہ کا یہ کہنا ہے کہ وہ اکثر اپنے چہرے کو ڈھانپنے بہت تھے۔ لیکن جب مجلس سماع گرم ہوتی تو کپڑا اتار دیتے۔ اس وقت ان کے چہرے پر عجیب و غریب قسم کے انوار برسنے لگتے تھے۔ ان کو اس بات کا علم شیخ احمد غفری سے ہوا تھا۔

## تصنیف و تالیف کے اصول

حرمین کے قیام کے دوران شاہ صاحب کو اصول تصنیف و تالیف پر بھی توجہ کرنے کا موقع ملا جب دنیائے اسلام میں تخلیقی قوت کا بے پناہ زور کم ہونے لگا تو اس کی وجہ سے تصنیف و تالیف کے اصولوں پر بھی اضطراب پیدا ہو گیا۔ ایک مصنف اچھی فہم کتاب کی تخلیق کرتا تھا دوسرا تلخیص و رد تلخیص تیار کرتا تھا اور یہ سلسلہ چلتے چلتے بالآخر دو چار صفحے کے بدلے پر شیخ ہوتا تھا۔ ابن عابدون نے اس تالیفاتی رجحان پر شدید نکتہ چینی کی ہے یہ اوسر ایوان توران اور ہندوستان میں شروح در شروح کا رواج تھا۔ علم الکلام اور علم عقائد کی کتابیں دلیل بازی کے گورکھ دھندوں اور معقولیات کے عقلی پھندوں کا ملغوبہ بن کے رہ گئی تھیں۔ شاہ ولی اللہ ان رجحانات سے نا آشنا نہیں تھے۔ ان کی اور ان کے والد کی کتابیں نہ تو عقلیات کی شعبہ بازی کا مظاہرہ کرتی ہیں اور نہ وہ شروح در شروح کے گورکھ دھندے ہیں۔ ان کی تالیفات در حقیقت ایک عجیب و غریب والہانہ بے نفسی کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کی اپنی ذات تحقیق اور تصدیق کے تقاضوں کے سامنے ایسی ہے جیسے غزال کے ہاتھوں مردہ۔

ان کی تصنیفات ایسی حس و فاشاک نہیں جن کو ذاتی بحر نہیں بلکہ ذاتی بخت کی لہروں

نے ساحل پر لا ڈالا ہو۔ بلکہ وہ تانک موتی ہیں جو بے نقی کے انتہاء ساگر کی تہ میں جا گزریں تھے  
 لیکن تھا کہ ان کے صدف بے ہوا سمندر کی ہزار ہوں بے نکل کر کبھی سورج کی روشنی نہ دیکھ  
 اپنے حجتہ اللہ البالغہ کی طرح شاہ صاحب نے اپنی اکثر کتابوں میں کھلے الفاظ میں اس بات کی  
 صراحت کی ہے کہ ان بے ہوا موتیوں کو سمندر کی تہ سے نکالنے والے کون لوگ ہیں۔ انہوں  
 نے اپنے دیباچوں میں ان تلامذہ کا نام لے کر شکر ادا کیا ہے جن کے سوالات کے جواب  
 میں انہوں نے کوئی خاص رسالہ یا تعینت مرتب کی ہے یہ تعلیمی کتابوں کی سب سے بڑی  
 خوبی ہے کہ وہ کسی عظیم تعلیمی آئیڈیل کے تحت تیار کی گئی ہوں ادا ان کے لئے اس سے مقدس  
 اور معزز مقصد کیا ہو سکتا ہے کہ اسے طالب علم کے ذہنی اور روحانی تقاضوں کی تسکین  
 کے لئے لکھا جائے۔ شاہ ولی اللہ کے بعض دیباچوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شاگرد  
 نے اس موضوع بحث کو اٹھا کر استاد پر اتنا بڑا احسان کیا ہے جس کا حق وہ ادا نہیں کر سکتا  
 تعلیمی تعینت و تالیف کے اصولوں کو عربین کے ایک استاد نے جس طرح چند الفاظ میں مقرر  
 و مقرر کر دیا وہ بھی اپنی مثل آپ ہے۔ شمس الدین محمد بن العلاء الباہلی مصر اور عربین کے ان  
 اساتذہ میں سے ہیں جو شاہ ولی اللہ کی استماع حدیث کے سلسلہ اسناد میں سے تھے۔  
 ان کے تعینت و تالیف کے اصولوں کو شاہ صاحب نے الفاس العارین میں بیان کیا ہے۔  
 شمس الدین الباہلی کہا کرتے تھے کہ میں نے جو کچھ تالیف کیا، اس کو سات اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے  
 یا تو کوئی ایسی تالیف کی ہے جس میں کسی نے پہلے کبھی جہت نہ کی ہو یا کسی ناقص تالیف کو بہتر  
 بنایا۔ یا مغلط کتاب کی شریح کی۔ یا طویل کتاب کا اختصار دیکھن اختصار کرتے وقت اس بات  
 اخیال رکھا کہ کہیں عبارت کثرت اختصار سے بے معنی نہ ہو جائے، یا کوئی چیز باہم غلط  
 غلطی تو اسے نئے سحر سے ترتیب دیا یا کسی کتاب میں معنی نے غلطی کی تو اس پر متنبہ کہ

---

شاہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں اپنے شاگرد محمد عاشق پھلتی کا جو سفر عربین میں  
 ان کے ہمراہ تھے۔ اس کتاب کی تالیف کے ضمن میں خاص شکر یہ ادا کیا ہے۔

یا کوئی کتاب پر آگندہ تھی تو اس کو جمع کر دیا۔ شمس الدین الباہلی کی رائے ہے کہ تعینف و تالیف میں اس کے سوا کچھ اور کیا جائے گا تو وہ محض تفتیح اوقات ہو گا یہ

## طریق دانشمندی یا طریق تدریس

شاہ ولی اللہ نے اپنے والد سے تحصیل علوم ہی نہیں کی بلکہ طریق تدریس بھی سیکھا۔ کو وہ طریق دانشمندی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کے اصول و ضوابط رسالہ دانشمندی میں بیان کیا ہے یہ

طریق تدریس کی اہمیت کا احساس انہیں شاہ عبدالرحیم نے ہی دلایا تھا۔ حرین۔ قیام میں انہوں نے وہاں کے اساتذہ کے تدریسی طریقوں پر خاص توجہ دی اس زمانے میں حرین کے علمائے نام پڑھانے کا اجازہ تو کئی ایک اساتذہ سے لیتے تھے لیکن درس طریق کسی خاص استاد سے ہی حاصل کرتے تھے۔ شیخ تاج الدین قلعی حنفی مکہ کے مفت تھے انہوں نے اس دور کے کئی ایک کبار علماء سے اجازے حاصل کئے تھے۔ لیکن درس طریق شیخ احمد قحطان سے حاصل کیا تھا۔ ان کی خدمت میں انہوں نے کئی سال گزارے شاید طریق تدریس کی اس خوبی کی وجہ سے ہی جب شیخ احمد کا انتقال ہوا تو دوسرے اساتذہ نے جن میں شیخ عبداللہ بصری اور شیخ احمد غفلی بھی تھے۔ شیخ تاج الدین کو مجبور کیا شیخ احمد قحطان کی جگہ کعبہ کے زیر سایہ مصلیٰ لنگی پر بیٹھیں اور جس طرح شیخ کی عادت تفرات کریں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میرے لئے یہ ایک امر عظیم القدر تھا کہ ایسے اکابرین کے ہونا ان کے سامنے ایسی جہالت کر دوں۔ اس لئے میں نے قبول نہ کیا۔ لیکن ان کی طرف سے

۱۔ انفس العارفين، ۱۸۲، انسان العین ۵-۶

۲۔ رسالہ دانشمندی مطبوعہ مجتہائی پریس دہلی۔ اس فارسی رسالے میں شاہ صاحب نے تعلیمی طریق اور کتاب بینی کی منازل دی ہیں جسے انہوں نے اپنے والد سے تحصیل کیا تھا۔

حد سے بڑھتا گیا۔ اس وقت شیخ حسن عجمی طائف میں تھے۔ انہیں اس بارے میں خط لکھا تو جواب میں انہوں نے مشائخ کی درخواست کو قبول کرنے پر ہی زور دیا۔ میں نے اس سلسلہ میں ہر کتاب سے استدعا چاہی استخارہ کے بعد ان کا حکم بجالانے کا فیصلہ کیا اور بخاری کی قرأت اس جگہ سے شروع کی جہاں سے شیخ احمد قحطان نے اسے چھوڑا تھا۔ جب اس کا ختم ہوا تو اس میں تمام علما اور مشائخ نے ماضی دی بنیہ

شاہ ولی اللہ نے شیخ صالح الدین قلعی حنفی سے بعض احادیث کی کتابیں سماعت کیں۔ قدرے کتب سنیہ میں سے اور قدرے مولانا امام مالک و مسند دارمی و کتاب الآثار امام محمد مولانا کو بھی ان سے سماعت کیا۔ انہوں نے تمام جماعت کو ان کتابوں کا اجازہ دیا اور بقول شاہ ولی اللہ وہ خود بھی اس جماعت میں شریک تھے بنیہ

## شیخ ابو طاہر الکروری

شاہ عبدالرحیم کے بعد شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر سب سے زیادہ اثر شیخ ابو طاہر بن ابراہیم کروری کا معلوم ہوتا ہے۔ شاہ صاحب کو اپنے اس مدنی شیخ سے کچھ ایسی ہی والہانہ عقیدت تھی جیسی ان کو اپنے والد سے تھی شیخ ابو طاہر سے ان کی اس گہری نسبت کے کئی ایک اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ ابو طاہر کروری بھی حدیث کا درس اسی واسطہ رنگ میں دیتے تھے جس کی جھلک ہمیں مدرسہ رحیمیہ کی روایات میں ملتی ہے۔ اس میں روحانی رچاؤ اور جذباتی گہراؤ ذہنی علوم اور میانت کی دلچسپ آمیزش تھی۔ شاہ صاحب کہتے ہیں کہ ابو طاہر الکروری جب احادیث رفاق پڑھتے تھے تو آنکھیں آنسو سے بھر آتی تھیں اور جب کبھی مذکرہ کی نوبت آتی تھی تو تھوڑے بہت اعتراض پر بھی جب تک پورا

غور و خوض نہیں کر لیتے تھے اور مآخذوں کا مطالعہ نہیں کرتے تھے اس وقت تک جواب نہیں دیتے تھے بلکہ توافقی مذاہب، توافقی حدیث اور توافقی سلاسل اولیاء شاہ صاحب کی فطری اور علی زندگی کے اہم ارکان ہیں۔ اور اگرچہ شاہ عبدالرحیم کی تربیت سے ان کا ذہن اس توافقی کے لئے تیار ہو چکا تھا لیکن ابھی اس پر حرمین کے ایک مستند شیخ کی مہربانیت ہونا باقی تھی۔ ویسے بھی اسلامی دنیا میں ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ ایسے اختلافی مسائل پر جن کی اہمیت آفاقی قسم کی ہوتی ہے۔ حرمین کے علماء اور شیوخ سے استنباط کیا جاتا ہے۔

ابو طاہر الکردی اور شاہ ولی اللہ دونوں میں ایک وجہ مماثلت یہ بھی تھی کہ انہوں نے بھی شاہ صاحب کی طرح اپنے والد سے تحصیل علوم کی تھی۔ اس زمانے میں اکثر علم و روحانیت کا سلسلہ المذہب خاندانوں میں پشت در پشت چلتا تھا اور علماء اپنے خاندان کے بزرگوں سے نہ صرف علمی اجازہ حاصل کرتے تھے بلکہ سلوک کا فیضان بھی حاصل کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کے استاد شیخ ابو طاہر محمد بن ابراہیم الکردی المدنی نے بھی اپنے والد سے خرقہ حاصل کیا تھا۔ ان کے والد نے ان کے لئے بہت سے بزرگوں سے اجازت حاصل کی تھی۔ ان میں سے شیخ محمد سلیمان مغربی بھی تھے۔ انہوں نے کتب عمریہ سید احمد ادیس مغربی سے پڑھی تھیں۔ یہ اپنے زمانہ کے سیبویہ یعنی نحو کے امام تھے۔

## اعتقاد اور اجتہاد

شاہ ولی اللہ اپنے استاد کے علمی اور روحانی کمالات سے بے حد متاثر تھے۔ لیکن اس والہانہ جذبے کے باوجود انہوں نے اپنی انفرادیت اور اجتہاد کو براہِ محفوظ رکھا ان کے استاد خود بھی ان کی خوبیوں کے معترف تھے۔ ابو طاہر کردی کہتے تھے کہ شاہ ولی اللہ مجھ سے حدیث کے الفاظ لیتے ہیں۔ میں ان سے معنی لیتا ہوں۔ یہ ان الفاظ میں کیسی

جامعیت، کس قدر اختصار اور کتنا انکسار ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد کی شخصیتیں گھل مل کر یک جان دو قالب ہو گئی تھیں۔ اگر ہم اس مجلس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیں کہ درس حدیث کے میدان میں استاد اور شاگرد نے آپس میں تقسیم کار کر لیا تھا تو ہم حقیقت سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔

شاہ ولی اللہ نے واہانہ عقیدت کے ساتھ ساتھ جس طرح اجتہاد اور آزادی رائے کو قائم رکھا۔ اس کی مثال ہمیں ایک واقعہ سے ملتی ہے۔ شاہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ شیخ ابو طاہر اپنے استاد سید احمد ادریس کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ایک مرتبہ ان کے شاگردوں میں سے ایک نے مسجد نبوی میں نماز کی امامت کرتے ہوئے سورۃ بقرہ پڑھا کی قرأت کی۔ جب وہ سید احمد ادریس کے پاس آیا تو انہوں نے بڑی غفلت کا اظہار کیا۔ اور کہنے لگے کیا تم رسول کریم کے سامنے ایسی سورت قرأت کرنے کی جرأت کرتے ہو جس میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے چچا کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تو اپنے رسول کو جس طرح چاہے خطاب کر سکتا ہے۔ لیکن یہ ہماری عداوت نہیں کہ ایسی جارحیت کر سکیں۔ شاہ ولی اللہ کے اس واقعہ کے بیان کے قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے شیخ ابو طاہر اپنے شیخ کی رائے سے متفق تھے۔ لیکن شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ ایسی باتیں رسول کریم کے ساتھ محبت و عقیدت کے جذبے کی بنا پر کہی جاسکتی ہیں لیکن اصل معیار صحابہ اور تابعین کی عادت کو رکھنا چاہیے۔ ہم یہ کہیں کہ یہ سورت حضرت پیغمبر کی منقبت عظیمہ اور فضل کبیر پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں خدا نے تعالیٰ نے حضور کے ایک جانی دشمن پر اس لئے لعنت کی ہے کیونکہ اس نے حضور کی شان میں سؤ ادب کا اظہار کیا تھا یہ

مولانا عبید اللہ سندھی کو ان تعلیمی اثرات کا جو شاہ صاحب پر قیام حرمین کے دور میں مترتب ہوئے پورا احساس تھا۔ شیخ ابراہیم کردی اور شاہ ابراہیم کی ذہنیت متعارف تھی کیونکہ ان دونوں کا سلسلہ تلمذ جلال الدین دوانی تک پہنچتا ہے یہ بنا بریں شیخ ابو طاہر

کی محبت شاہ ولی اللہ کو بہت راس آئی۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں۔

ہم نے شیخ ابراہیم کردی کے بہت سے رسائل مطالعہ کئے۔ وہ شریعت اسلام کو ابن عربی کے فلسفہ سے حل کرتے ہیں اور اس بات میں وہ ایک مستقل مفکر اور امام کا درجہ رکھتے ہیں۔

شیخ ابراہیم کی تاثیر شیخ ابوطاہر کے ہر قول اور فعل میں نظر آتی ہے۔ ہماری سمجھ میں ان دو مختلف طریقوں کا شاہ صاحب کے والد اور چچا کا طریق اور دوسرا شیخ ابوطاہر مدنی اور شیخ ابراہیم کے دوسرے شاگردوں کا طریق جو عربین میں تھے، ایک فکر پر متحد ہونا۔ شاہ صاحب کی ذہنیت کا بنیادی مسئلہ ہے۔ کوئی عالم خواہ کسی مذہب و ملت کا ہو اگر اس کی تعلیمات شاہ صاحب کے اساسی فلسفہ پر پوری اترتی ہے تو وہ سب عالم شاہ صاحب کے ہاں مصیب ہیں۔ ان کے مختلف قول جمع کرنا ان میں تطبیق دینا شاہ صاحب کا علمی کمال ہے

## طریق تعلیم

ابوطاہر کردی کا طریق تعلیم، تحقیق اور انصاف پر مبنی تھا۔ مذاکرات میں اگر معمولی اعتراض بھی کیا جاتا تو جب تک اس کے جواب میں پوری تحقیق اور پورا غور و فکر نہ کر لیتے

۱۔ ان کے صاحب زادے ابوطاہر الکردی نے بیان کیا ہے کہ ان کے والد ابن عربی کی تابعت کو نظری لحاظ سے ہی نہیں بلکہ عملی زندگی میں بھی پیش نظر رکھتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے الجزء اللطیف میں معقولیات کی اسناد دی ہیں۔ جن میں اکثر سرآمد روزگار معقولین کے نام ہیں ان اسناد کا سلسلہ صدر الدین شیرازی اور امام اشعری تک پہنچتا ہے۔

۲۔ فرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر مضمون مولانا عبید اللہ سندھی ص ۲۵

جواب نہیں دیتے تھے۔

ان کے والد ابراہیم کر دی کا طریق تدریس بھی مناظرہ اور مفادضہ کا تھا۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ کیا کہا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کرتے تھے کہ کس نے کہا ہے۔ اگر کسی مسئلہ میں کوئی اعتراض کرتا تھا تو وقت کرتے اور جب تک طریق تحقیق اور اتفاق سے اس کی دفع مشکل نہیں کر لیتے تھے اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے۔ اسی لئے عبداللہ عباسی نے کہا تھا کہ ان کی مجلس ریاض الجنۃ کا ایک باطل ہے بلکہ

شاہ صاحب کے اساتذہ حرین اور ہندوستان کے اساتذہ میں ایک دم مشترک یہ بھی تھی کہ ان کے والد شاہ عبدالرحیم اور ابو طاہر کر دی کی معقولیات کی اسناد جلال الدین دوانی سے جاملتی تھیں۔ اس لئے فلسفہ اور تصوف کے بارے میں ان کے حرین کے اساتذہ کے موقف میں وہی ٹھہراؤ اور توازن تھا جو ان کے والدین کا تھا۔ شیخ ابراہیم کر دی جب حکمت کے مسائل پر تقریر کرتے تھے تو کلام صوفیہ کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے فلسفی لوگوں نے حق کے معاملے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں اور اس کی جانب ہریت نہیں پاسکے۔

ہمارے ان پرانے معنفین کے بارے میں جہیزوں نے سوانح حیات، تذکروں یا اسرار الرجال پر کام کیا ہے۔ مستشرقین کا یہ اعتراض ہے کہ یہ لوگ سوانح حیات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض ایسی ہکالی قسم کی توصیفی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں جو توازن استعمال کی وجہ سے گھس پٹ چکی ہیں اور اپنی خصوصی اور امتیازی معنویت کھو بیٹھتی ہیں۔ یہ اعتراض دوسرے معنفین کے بارے میں تو ایک مدت تک جائز ہوگا۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے اپنے اساتذہ اور شیوخ کے بارے میں جو مختصر قسم کے ٹیپس "پیر و قلم" کے ہیں، وہ اکثر اوقات ان باکال معصوموں کا اتنا زہ رکھتے ہیں جو چند ایک تخلیقی خطوط سے شخصیت کا کردار اہاگر کر دیتے



ہیں۔ اس ضمن میں وہ جستہ جستہ عربی اور فارسی کے اشعار بھی لاتے ہیں جو اکثر ان کے اپنے ہوتے ہیں۔ یہ اشعار زبیر عثم شغفیت کے مددِ خال کو ایسی جامعیت اور ایسے والہانہ اور جذباتی انداز میں اجاگر کرتے ہیں، جیسے کسی دھندلکے میں بجلی سی چمک گئی ہو۔ یہ چہرے زیر تبصرہ شغفیت کے اخلاقی، ذہنی اور روحانی پہلوؤں کو ہی نہیں پیش کرتے بلکہ خود شاہ صاحب کو اس ہستی سے جو منسوب اور تعلق ہے، اس پر بھی دل چرپ روشنی ڈالتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے حرمین کے اساتذہ کے حالات الفاس العارفین اور انسان العین فی شیوخ الحرمین میں دیئے ہیں۔ لیکن ان کی والہانہ عقیدت کا اندازہ ان مکتوبات سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے مثنوی وقت ابوطاہر انکروی، ان کے صاحبزادے اور دوسرے لوگوں کو لکھے ہیں۔

## مکتوبات کا آئینہ

شاہ صاحب کے مکتوبات کی اہمیت محض رسائل اور انشائیات ہی کی نہیں۔ اپنے زمانے کے دوسرے بزرگوں کی طرح ان کے مکتوبات ایک عظیم تعلیمی پیغام کے حامل ہیں اور بعض پہلوؤں سے ان کی تعلیمی افادیت، نصیاتی کتب سے بھی زیادہ ہے۔ مکتوبات کا لکھنے والا اپنے مخاطب سے براہ راست رابطہ قائم کرتا ہے۔ اس رابطے میں گہرے انسانی تعلقات کا رنگ جھلکتا ہے۔ چونکہ لکھنے والا مخاطب پر بھرپور اثر ڈالنا چاہتا ہے اور اس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے۔ اس کی زبان میں تکلف اور بناوٹ کو بہت کم دخل ہوتا ہے اور ان کا بیان جذبات کی سچی ترجمانی کرتا ہے۔ مکتوبات میں انسانی اور جذباتی رابطوں کی ایسی حسرکاری ہوتی ہے جس کا مخاطب پر بھی بھرپور اثر ہوتا ہے اور مکتوب کے دوسرے قارئین بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

اس بات کا افسوس ہے کہ شاہ صاحب کے مکتوبات کا کوئی مکمل مجموعہ نہیں دستیاب نہیں ہو سکا۔

۱۔ شیخ منظور نعمانی نے فسر قان کے شاہ ولی اللہ نے مکتوبات کے ایک اور مجموعہ مکتوب العارف معہ مکتب ثلاثہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

اپ کے مکتوبات کا وہ مجموعہ جو محمد الامجد صاحب کی فرمائش پر چھپائی ہے جس میں دہلی میں چھپا  
 اس میں مکتوب مدنی کے علاوہ آپ کا حرمین کا کوئی مکتوب شامل نہیں۔ البتہ حیات دلی کے  
 زلف نے اپنی کتاب کے آخر میں چند ایک لمبے مکتوب دیئے ہیں جن کا تعلق قیام حرمین  
 سے ہے ان میں چند ایک مکتوب شیخ ابو طاہر الکریمی کے نام ہیں۔ ایک خط میں ان کی فرط حقیت ایک باب  
 ہام کی طرح چمک چمک جاتی ہے یہ مکتوب اس مسرت و بشارت کی تصویر پیش کرتا ہے جو استاد کی  
 آمد آمد کا سحر شاگرد کے دل میں کر دینے لگتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کو غائب کعبہ کا خادم شیخ عمر عیوب سے  
 پتہ چلتا ہے کہ ابو طاہر الکریمی جمع کئے مدینہ سے تشریف لا رہے ہیں یہ خط اسی جو شش و ہفتہ کے  
 عالم میں شروع کیا گیا ہے۔ ابو طاہر رمضان کے روزے مکہ میں رکھ رہے ہیں۔ عشرہ  
 کا اعتکاف بھی غائب کعبہ میں کر رہے ہیں شاہ صاحب شیخ عمر سے خبر سنتے ہیں تو خبر  
 سناتے دلتے کہ وہ عادیقہ ہیں۔ اور کہتے ہیں پیچھے اس نے مجھے خوش کیا ویسے خدا اسے  
 بھی خوش کرے۔ شیخ عمران کے قیام کے لئے مکان کا انتظام کر رہا ہے۔ شاہ صاحب فور  
 مسرت سے اپنے آپ میں کہتے ہیں۔

فناطی شراب و کنت قبلا اکاد افض بالماء الفرات

مکتوب میں ابو طاہر الکریمی کا نام آتا ہے تو ان کی کیفیت غالب کے اس شعر  
 کے مصداق ہو جاتی ہے۔

زبان پر بار خدا یا یہ کس کا نام آیا

کہ میرے نطق نے بس مری زبان کے لئے

کہتے ہیں جناب کی پررنگی اور فضیلت اس سے بلند ہے کہ اس کے بارے میں کلام کیا  
 جائے اور آپ کی ذات گرامی اس سے بالاتر ہے کہ میں جناب کا نام صراحتاً لے سکوں یا کسی  
 رمز اور نشان سے معین کروں۔

ومن العجائب ان افوه بذكره

وقدر اغار بان يمر بمطري

اگر میں اس کا ذکر زبان تک بھی لاؤں تو یہ عجائبات میں سے ہوگا۔ مجھے اس بات

سے بھی غیرت آتی ہے کہ وہ خیال میں بھی میرے دل سے گزر کر رہے آپ ان ہستیوں میں سے ہیں جن کو میں اپنے دل میں حاضر پاتا ہوں اور جو زندگی بھر مجھ سے کبھی غائب ہو سکتی ہیں اور نہ غروب۔ میں آپ کی ہستی کو اپنی نظموں کے سامنے متبہل و یکنفا ہوں اور وہ کبھی میرے سامنے سے دور نہیں ہوتی۔

ابو طاہر کردی کی شخصیت، علمی اور روحانی اقتدار کا عجیب و غریب مجموعہ تھی اور جس محبت اور ملاحظت سے وہ شاگردوں سے پیش آتے تھے۔ اس کے تاثرات طلباء کے دلوں پر ایک ابدی نقش چھوڑ جاتے تھے۔  
شاہ صاحب ایک خط میں اسی ملاحظت کا تذکرہ کرتے ہیں۔

اخذتمونی سنی فی ملاحظتہ فلت اعرف غیسر اقدر فتمکم  
تم نے مجھے اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور جب سے میں نے تم کو پہچانا ہے۔ کسی اور کو نہیں پہچانا۔

وعلى تفضن واصفيہ بوصفہ لیفنی الزماں وفيہ عالم بوصفہ

## استاد سے الوداع

شاہ ولی اللہ استاد سے جب ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے لگے تو اس وقت ان کے دل میں ایک بے پناہ قسم کا اضطراب اور بے چینی تھی۔ شاہ صاحب کی زندگی میں یہ ان کے عقیدہ یا جالیاتی تجربات کا تو پتہ نہیں چلتا لیکن ان اشعار میں محبت کے اس طوفا سمندر کی لہروں کی گونج سائی دیتی ہے جو ان کے قلب کی گہرائیوں میں موجیں مار رہی تھیں۔ جدائی کی اس گھسٹری میں دل پر جو کچھ گزری ہے اس کو ان الفاظ میں لود کیا ہے۔

واللہ لو حلف العشاق انھم

تقلوا من الحب یوم البین ما حثوا

خدا کی قسم اگر فراق نے دن عشاق یہ حلف اٹھا کر کہیں کہ وہ جدائی کے روز محبت کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے تو جھوٹ نہیں ہو گا۔

استاد سے رخصت ہو گئے لیکن رنج کے مارے راستہ نہیں سو جھتا۔ کہتے ہیں۔

نصیت کل طبعی کنت اعرفہ

الاطریقا یوقین لربکم

میں جتنی راہیں جانتا تھا سب بھلا بیٹھا ہوں بس ایک وہی راہ یاد ہی ہے جو مجھے بتا رہے

گھر تک لے جاتی ہے۔

مبارک تھا وہ زمانہ جب معلم اور متعلم کے مراسم ان بلندیوں پر نئے عاشق و معشوقہ  
دات شہیداً بیٹا اور مرزا ان ہی لوگوں کا تھا۔

شیخ ابوطاہرا نکروی کی وفات ۱۲۵۷ھ میں ہوئی۔ شاہ ولی اللہ نے اس سال حج  
سے مراجعت فرمائی تھی۔

## اہل حجاز سے خط و کتابت

مکتوبات سے معلوم ہوتا ہے کہ حرمین سے واپسی کے بعد حرمین کے شائق کے ساتھ  
شاہ ولی اللہ کا سلسلہ خط و کتابت برابر جاری رہا۔ ان میں سے ایک محمد بن محمد بن سلیمان  
الغزنی کے صاحبزادے وصالہ بھی تھے۔ جن سے آپ نے بعض صحیح مرویات کے اجازت  
حاصل کئے تھے۔ ان میں سے بعض خطوط ابوطاہرا نکروی کے صاحبزادے ابراہیم کے نام  
تھے۔ شاہ صاحب اپنے ایک خط میں شکایت کرتے ہیں کہ اس سے پیشتر بہت سے خطوط  
آپ کی خدمت میں روانہ کئے گئے، لیکن آپ نے جواب سے شرف یابی نہیں بخشی اس  
پر درخواست کرتے ہیں کہ آپ اس خط کے حامل کی معرفت جواب تحریر فرمائی اور ان شرف  
مقامات سے جو بھی کوئی آئے والا ہو اس کے ہاتھ خط بھیجیں۔ ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کے

شاہ ولی اللہ نے انفس العارفين میں ذکر کیا ہے کہ جب وہ ابوطاہرا نکروی سے  
رخصت ہوئے تو انہوں نے یہ شعر پڑھا جسے سن کر استاد آہ و بکا کی وجہ سے بیقرار ہو گئے

نیز دیکھئے انسان العین، ۱۴

## تنقید و تبصرہ

### تحریک جماعت اسلامی، ایک تحقیقی مطالعہ

تالیف ڈاکٹر اسرار احمد ایم اے، ایم بی بی ایس۔ شائع کردہ دارالاشاعت الاسلامیہ۔ کرشن نگر لاہور

زیر نظر کتاب کے مصنف ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جماعت اسلامی کے رکن رہ چکے ہیں، اور ان کی یہ کتاب دراصل ایک بیان ہے جو انہوں نے بحیثیت رکن جماعت اسلامی اکتوبر ۱۹۷۷ء میں جماعت اسلامی کی مفسر کردہ جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ گو اس بیان کے کچھ عرصہ بعد موصوف نے جماعت اسلامی سے قطع تعلق کر لیا۔ لیکن انہوں نے فوراً ہی اس بیان کو شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اب تقریباً دس سال کے بعد وہ اس بیان کو کتابی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔

مصنف نے جماعت اسلامی سے مستعفی ہوتے وقت جو خط لکھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس غلو ص سے جماعت میں داخل ہوئے اور کن باطنی مجبوریوں نے انہیں قطع تعلق پر آمادہ کیا۔ اس خط کا ایک اقتباس یہ ہے:-

”..... اپنے بیان جائزہ کمیٹی کے تحریر کرنے کے ایک سال قبل سے میں ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوں اور اس واقعہ کو بھی آج چھ ماہ سے ادھر کا عرصہ ہو چکا ہے، جس میں میں نے جذبات سے خالی ذہن کے ساتھ بھی اور جذبات کی رفاقت کے ساتھ بھی دونوں

طریق مسلسل غور کیا ہے اور آخر میں اللہ تعالیٰ سے رہنمائی کی دعا کرتے ہوئے ایک فیصلہ کیا ہے۔ جب امداد آیا تھا تو رینالڈ تھریٹفلو بنیاد امداد دھیتنا کے ساتھ رب اور خلقی مدخل مدتی دعا کرتا ہوا آیا تھا۔ اور آج جب باہر جا رہا ہوں تو اپنے اللہ سے واخر جی مخرج مدتی کی دعا کرتا ہوا جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ (تحریر ۲۹ رمضان المبارک ۱۴۰۶ھ بحالت اعتکاف)

ڈاکٹر صاحب کے اس پسے بیان کا لب لباب یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے دو دور ہیں، ہاں تک اس کے پہلے دور کا تعلق ہے محمد تمام پاکستان سے پہلے کا ہے۔ وہ مجملہ صحیح تھا۔ اور اس دور میں اس کی حیثیت ایک اصولی اسلامی تحریک کی تھی۔ لیکن بقول ان کے دہد ثانی ہیں ایک اصولی اسلامی جماعت کی خصوصیات کہیں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ یہ ایک بالکل بے اصولی قومی جماعت کا نقشہ پیش کرتے ہیں جو یا تو واقعی اسلام پسند ہے یا اپنی دم میں برسرِ اقتدار آنے کے اسلام کو بطور وسیع استعمال کر رہی ہے،

مصنف نے صفحہ ۴۸ سے لے کر صفحہ ۱۰۵ تک تحریک جماعت اسلامی کے دو اقل کے بنیادی افکار و نظریات پیش کئے ہیں۔ ادا ان سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔

” واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک کا یہ دو اقل کم از کم ظاہری اعتبار سے بالکل وہی نقشہ پیش کرتا ہے، جو ہیئت سے اپنی لئے کرام علیہم السلام کی تحریکوں کا خاصہ رہا ہے بالکل وہی افکار و نظریات و عقائد۔ اور بعینہ وہی دعوت پیش کی گئی کہ جو اپنی لئے کرام پیش کرتے آئے ہیں اور بہت حد تک وہی لقب العین اختیار کیا گیا اور اس کے لئے وہی طریق کار اختیار کیا گیا کہ جو ان کی تحریکوں میں اختیار کیا جاتا رہا ہے۔ ان دونوں کے نقوش میں بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور منظر ظاہر ان میں کوئی نمایاں فرق محسوس نہیں ہوتا۔“

ہمارے نزدیک محترم ڈاکٹر صاحب کا جماعت اسلامی کے بارے میں یہ محض حسن ظن ہے اور جماعت اسلامی کی یہ تحریک میں ایک شخصیت کی ذہنی اور عملی سرگرمیوں کا پھل ہے

اگر ہم مصنف کو اس حقیقت کے ماننے میں تامل ہے، اس میں یہ سب خوبیاں "افدغریاں" مضمر تھیں، جن کی نشان دہی ڈاکٹر صاحب نے دودا دل اور ثانی میں کی ہے۔ اس تحریک کے دودا دل کو انیسے کلام کی تحریکوں کے مشابہ قرار دینا، جیسے معاف کیا جائے، اگر ہم عرض کریں، انیسے کلام کی تحریکوں کو نہ سمجھنے پر مبنی ہے۔ مولانا دودوی کی تحریک جماعت اسلامی سے اور ہم اسے یہی نام دیں گے، دور ثانی میں جو کچھ ظہور میں آیا، وہ اس کے دودا دل کا لازمی نتیجہ تھا۔ کیونکہ یہ تحریک جیسا کہ مولانا نے اس کا تصور بنایا، اور اسے پیش کیا، اسی مثل ایک پہنچنے والی تھی۔ تحریکوں کو ان کے زبانی دعوؤں اور ناشی مظاہر سے نہیں جاننا چاہیئے ان کا تاریخی کے ایک خاص دور میں کیا کردار ہو تلمے۔ اور وہ عطا عناصر کی ترجمان بنیں اور کن مقاصد کی تکمیل کرتی ہیں، دراصل انہیں پر کھنے کی یہ کوئی ہوتی ہے، ہم مصنف سے متوقع ہیں کہ وہ اپنے اس نقطہ نظر پر نظر ثانی کریں گے، اور کم سے کم اس بارے میں جن حقائق تک ان کے پیش رو اور جماعت اسلامی کے ایک رکن رکین جناب وجیہ الدین خاں پہنچے تھے ان کو قابل لحاظ سمجھیں گے،

آج سے کوئی تین سال پہلے تعبیر کی غلطی کے نام سے وجیہ الدین خاں صاحب کی ایک کتاب شائع ہوئی تھی۔ اس کی بھی کم و بیش وہی نوعیت تھی، جو ڈاکٹر صاحب کی کتاب کی ہے، لیکن وہ اس ضمن میں جن نتائج پر پہنچے، وہ بالکل برعکس تھے اس کتاب کے نتائج سے خاں صاحب کا کہنا یہ ہے کہ مولانا دودوی نے قرآن مجید کی جن آیات سے اپنی تحریک کا تانا بانا تیار کیا، ان کے وہ معنی ہی نہیں، جو مولانا نے کئے۔ یعنی اس تحریک کی اصل بنیاد ہی صحیح نہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

"دین کا ایک نظام ہونا بذات خود غلط نہیں ہے۔ مگر جب نظام کے تصور کو یہ حیثیت دی جائے کہ یہی وہ سبب جامع ہے جو اس کے متفرق اجزاء کو ایک کل میں سمو تہے تو یقیناً غلط ہو جاتا ہے۔ اور یہی اس فکر کی اصل غلطی ہے۔"

بہر حال ایک غلطی تو یہ ہے کہ وہی کوئی نظام کا متراویہ قرار دیا گیا۔ اور اس سے کہیں

بڑی غلطی مولانا مودودی نے یہ کی کہ اس نظام کی انہوں نے جو تفصیلات پیش کیں، ان میں حقیقی دین کا خدمت بہت کم تھا۔ چنانچہ خان صاحب نے تعبیر کی غلطی میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس طرح دین اسلام کا جو نظریہ پیش کیا گیا یہ نہ تو قرآن کی آیات پر چسپاں ہوتا ہے اور نہ ملحدانہ امت کی زندگیوں اس کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔ دین کا وہ مخصوص نقشہ جو اس فکر کے نزدیک دین کا صحیح ترین نقشہ ہے اس کے حق میں سامنے قرآن میں کوئی بھی صریح آیت نہیں .... یہ اس استدلال کی غلطی کی غامی ہوئی، اس طرح عملی اعتبار سے دیکھئے تو امت کی سادھی تاریخ کی کوئی بھی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے اس ڈھنگ پر جامع انقلابی تحریک چلائی ہو۔

ڈاکٹر صاحب کو جماعت اسلامی کا دوراؤل اس لئے بہت روشن نظر آتا ہے کہ اس میں تمام نظریات و افکار بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں دعاوی کی بھرمار رہی۔ اور ان دعاوی کو عمل میں لانے کی نوبت نہ آئی تھی لیکن جیسے ہی اس تحریک کا عملی دور آیا، تو اس میں جو اصل حقیقت پہناں تھی وہ ادا ہو گئی، اور یہ ثابت ہو گیا کہ انی و منکر تحریک کے پیش نظر اسلام کے نام سے سیاسی اقتدار حاصل کرنا ہے اور ہم نے پھر عرض کیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ جن بزرگوں نے مولانا مودودی کی دعوت پر شروع شروع میں لبیک کہا اور جماعت اسلامی سے وابستہ رہے، وہ خالص نہ تھے، یا وہ اسلام کی سر بلندی کا مقصد لے کر اس میں شامل نہیں ہوئے تھے، بے شک ان کی غالب اکثریت مخلصین پر مشتمل تھی لیکن جماعت اسلامی کی طرح کی اس دور میں کتنی اور اسلامی تحریکیں ہیں کہ لوگ بڑے خلوص سے ان میں شامل ہوئے لیکن آگے چل کر وہ کچھ اور نکلیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں مخلص مقتدین کی ایک کافی بڑی تعداد موجود ہے، جو دل سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور جب بھی انہیں کسی کوٹنے سے اس کی دعوت ملتی ہے، تو اس کی طرف وہ لبیک پڑتے ہیں، اور بڑے خلوص اور لبیت سے فلیفہ اقتدا ادا کرتے ہیں، لیکن جب نظریات یا دعاوی سے عمل پر معاملہ آتا تو ان میں سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جیسے تنقیدی بصیرت رکھنے والے ایسی دعوتوں تضادات پر چونک پڑتے ہیں، اور ان سے قطع تعلق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، یہی قصہ جماعت اسلامی کا ہے اس کا دواول بھی ہر ثنائی کے سے تضادات سے بھرپور بہت ضرورت صرف اسے دیکھنے کی تھی لیکن جب تک کوئی تحریک دائرہ نظریات تک محدود رہتی ہے اس



یہ تفادات سطح پر نہیں آتے، اور اکثر لوگ خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں۔

مثال کے طور پر ۱۵ نومبر ۱۹۷۷ء کو جب ڈاکٹر صاحب نے رکنیت جماعت کے لئے درخواست دی، تو ان کے جو جذبات تھے ان کی عکاسی درخواست کے اس اقتباس سے ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں:۔  
 ہمیں یہ محسوس کرتا ہوں اور آج سے نہیں بلکہ آج سے چار سال قبل سے محسوس کر رہا ہوں کہ اقامت دین میرا فرض ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس دور میں پیدا ہوا جب کہ خالصتہً اقامت دین کے کام کے لئے جماعت اسلامی قائم ہو چکی ہے۔ اور میں آسانی کے ساتھ اس میں شریک ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سعی کر سکتا ہوں۔ اس لحاظ سے میں جماعت اسلامی کے وجود کو اپنے لئے ایک نعمت تصور کرتا ہوں۔۔۔۔۔

موصوف کے ان جذبات کے خلوص پر کسے شک ہو سکتا ہے، لیکن ابھی دو سال نہیں گزرے تھے کہ اس خالصتہً اقامت دین کا کام کرنے والی جماعت کے عمل کو قریب سے دیکھ کر وہ اتنے منفعص ہو گئے کہ ان کو اس سے مستغنی ہونا پڑا، اور انہوں نے اور باتوں کے علاوہ اپنے استغناء میں یہ لکھا۔

”جائزہ کمیٹی کی رپورٹ پیش ہونے سے لے کر اجتماع ماچھی گوٹھ تک جماعت اسلامی پاکستان کے حلقوں میں جن ناخوشگوں اور کربہہ واقعات کا پیکر چلا ہے، ان کو محض یاد کرنے ہی سے انسان کو سخت اذیت اور کرب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ پھر اس (قرارداد) کی مختلف توجہیں اور جماعت کے مختلف حلقوں کی طرف سے مختلف رد عمل، اس کے نتیجے کے طور پر سازشوں کی بر ملا ہمتیں۔ اکابرین جماعت کا ایک دوسرے کے بارے میں انتہائی گہری ہوتی رائیوں کا اظہار۔۔۔۔۔ یہ سارے معاملات میرے لئے اس اعتبار سے تو غیر متوقع نہ تھے کہ میری تو رائے ہی یہ تھی کہ اب جماعت ایک خالص سیاسی جماعت بن گئی ہے۔ اور یہ اس کے ناگزیر ثمرات ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ ترقی دینے والے تھے کہ جماعت میں اخلاق و منزلت اور گراؤ کے بارے میں اتنی پست طائفے میں نے ابھی قائم نہیں کی تھی۔۔۔۔۔

سچ پوچھئے تو مولانا مودودی مشروح ہی سے ایک سیاسی آدمی تھے، اور ان کی یہ تحریک ان ایک سیاسی تحریک تھی۔ اور اس میں اصلاً کوئی قیادت نہیں، کیونکہ ہمارے نزدیک سیاسی زندگی عیب کی بات تھیں، لیکن مولانا کی زیادتی یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اپنی سیاسی تحریک کے لئے سیاسی معیار بناتے تاکہ ان پر اسے جانچا جاسکتا انہوں نے اس تحریک کو امتیاز کا نام دے کر ہر طرح کی عقلی و مادی جانچ سے ماوراء بنالیا، اور اولاً اور آخراً سیاسی ڈر ہوتے ہوئے اپنے اقتدار کا سرچشمہ الوہی طاقت کو منوانا چاہا۔ ان کی شخصیت اور سیاست کا تمام تر فقدان یہ ہے۔

اب ہم ان کی بنیادی افکار و نظریات کا ذکر کرتے ہیں، جو بقول مصنف، جماعت اسلامی کے دوران کے ساتھ مخصوص تھے۔ ان کے نزدیک سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت یہ کہ اس نے ظاہری اسلام، اور حقیقی اسلام اور منسلک مسلمان، اور اصلی مسلمان میں فرق اور امتیاز قائم کیا، اور مسلمانوں کو حقیقی اسلام کو شعوری طور پر اختیار کرنے اور اصلی مسلمان بننے کی دعوت دی۔ مصنف نے اس کے ثبوت میں مولانا مودودی اور مولانا امین امین اصلاً کی تحریروں سے اقتباس پیش کئے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اس خصوصیت کی تمام تر حیثیت منفيانہ تھی۔ اور اس پر تھا کہ یہ جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، یہ درحقیقت حقیقی مسلمان نہیں اب حقیقی مسلمان کون ہیں؟ جو ان نظریات کو مانتے ہیں، گویا معاملہ محض نظری لحاظ سے ماننے کا تھا۔ اور جہاں تک عمل کا تعلق ہے، اس دور میں حقیقی مسلمان وہ تھے جو کہ کانگریسی علماء، سے بھی بیزار ہوں اور مسلم لیگی لیڈروں سے بھی، جمہوریت کو شریک سمجھیں اور وطن کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا کفر گردانیں۔

مصنف کے نزدیک اس دور کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اس (تحریک جماعت اسلامی) سے اپنی دعوت اور اپیل کو مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسے غیر مسلموں تک عام کر دیا۔۔۔۔۔ ہمارے خیال میں یہ بھی ایک بہت مغالطہ ہے اور جماعت کے دعوتی *Paradigm* سے خواہ مخواہ یہ معنی اخذ کئے گئے ہیں۔ جو جماعت اس کی قائل ہو کہ مسلمانوں کا مسلمانوں کی قومی حکومت کے لئے جدوجہد کرنا کفر ہے اور جو جمعیت العلماء کے ایسے ارکان

کو بے نقطہ سنائے جو احکام اسلام کے سختی سے پابند ہونے کے باوجود کانگریسی ہندوؤں کے ساتھ مل کر استقلال وطن کی جدوجہد کریں۔ اسی جماعت کی دعوت کو عمومی گرواٹا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ اسی دور میں جماعت اسلامی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے کانگریزی اقتدار کے خلاف جدوجہد کرنے والی دونوں سیاسی جماعتوں کانگریسی اور مسلم لیگ کی سخت مخالفت کی اور اس مخالفت ہی کو بین اسلام قرار دیا۔

اس کے بعد مصنف لکھتے ہیں :-

”مسلم قوم پرستی کی بجائے اسلام پرستی جماعت اسلامی کے بنیادی خصال میں سے وہ تیسری اہم خصوصیت ہے جو پہلے دو خصال کی ترکیب سے وجود میں آئی۔ قوم پرستانہ نصب العین کو چھوڑ کر جماعت اسلامی نے جو نصب العین اختیار کیا اور بے قبول اور اختیار کرنے کی دعوت اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو دی وہ حکومت الہیہ کا قیام ہے۔“

بے شک ”حکومت الہیہ“ کو بطور ایک نصب العین کے اپنانا ایک جماعت کے لئے قابل اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ جب ہندوستان کے عوام مسلمان اور ہندو دونوں، برطانوی اقتدار کے خلاف رزم آراتھے عین اس وقت ان کوششوں کو طعنوں کرنا اور ایک غیر معین بہیم نظری تصور کی مسلمانوں کو دعوت دینا علاً کیا معنی رکھتا ہے۔ فاضل مصنف کو اسی مسئلے پر اسی نظر سے بھی غور کرنا چاہیے تھا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے جماعت اسلامی کی اس دور کی بعض اور خصوصیات بھی گنتی ہیں اور آخر میں انہوں نے تحریک کے مؤسس اور قائد کی اس رائے پر صاف کیا ہے کہ یہ تحریک پورے حق کو پیش کر رہی تھی اور اس اعتبار سے ابنائے کرام کی تحریکوں کی وارث اور بنی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک کی جانشین تھی۔

اپنی دعوت کے اس طرز پر پورے حق ہونے کا یہی مفاد تھا، جو اس جماعت اور اس کے قائد کی جملہ غریبوں کا باعث بنا۔ اور ان کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ اس

سلسلے میں مولانا مودودی کا یہ دعویٰ ملاحظہ ہو:-

”..... اس قسم کی ایک دعوت کا، جیسی کہ ہماری یہ دعوت ہے، کسی مسلمان قوم کے اندر اٹھنا اس کو ایک بڑی سخت آزمائش میں ڈال دیتا ہے..... جب پورا حق بالکل بے نقاب ہو کر اپنی خالص صورت میں رکھ دیا جائے اور اس کی طرف اسلام کا دعویٰ رکھنے والی قوم کو دعوت دی جائے تو اس کے لئے ناگزیر ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا ساتھ دے..... یا نہیں تو اسے رد کر کے وہی پوزیشن اختیار کر لے جو اس سے پہلے یہودی قوم اختیار کر چکی ہے“

اور اس پورے حق پر مشتمل دعوت کے مخاطب صرف مسلمانان ہند نہ تھے، بلکہ مولانا نے دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو بھی اسی عید کا مخاطب بنایا، چنانچہ لکھتے ہیں۔  
اب چونکہ یہ دعوت ہندوستان میں اٹھ چکی ہے۔ اس لئے کم از کم ہندی مسلمانوں کے لئے تو آزمائش کا وہ خوفناک لمحہ آ ہی گیا ہے۔ رہے دوسرے ممالک کے مسلمان تو ہم ان تک اپنی دعوت پہنچانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں اس کوشش میں کامیابی ہو گئی تو جہاں جہاں یہ پہنچے گی، وہاں کے مسلمان بھی اسی آزمائش میں پڑ جائیں گے۔  
ڈاکٹر صاحب کا فرض تھا کہ وہ اس قسم کی تعلیموں پر انتقاد کرتے، جیسے کہ تعبیر کی غلطی کے مصنف نے کی تھی، کیونکہ اس تحریک کی اصل بنائے خرابی اس قسم کے زعم اور خود فریبی ہے۔

کتاب کے ایک باب میں جو ۱۰۹ صفحہ سے ۲۲۸ صفحہ تک متدہم جماعت اسلامی کے دور ثانی کی خصوصیات بیان کی گئی ہے۔ اور اس کے سرعنوان بالکل بجا طور پر یہ مصرعہ درج ہے۔

تھا جو تا خوب بتدریج وہی خوب ہوا

مصنف لکھتے ہیں کہ پاکستان کے قیام کے بعد جماعت اسلامی نے سب سے پہلا جن کو یہ بدلا کہ وہ ایک خالص اصولی اور بین الاقوامی، بلکہ انسانی بنیادوں پر دعوت کا، حالہ والا، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱

لیا۔ یہ بھی موصوف کی خوش فہمی ہے۔ جماعت نے پاکستان میں اکبر مسلم قوم پرستی کا نہیں خالص فرقہ پرستی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ اسی طرح کی فرقہ پرستی جیسے اس وقت ملک میں بعض دوسری فرقہ پرستیاں ہیں۔ اب اسے اپنی اس فرقہ پرستی کو بقول عوام بنانے کے لئے وہ سب حرکتیں کرنا پڑیں جو ہمارے ہاں کے دوسرے مذاہب فرقتے کرتے ہیں۔

چنانچہ بقول مصنف "اب غیر مسلموں کے لئے کسی اتمام حجت کی سکر سے ضرورت باقی نہ رہی اور انہیں جوں کے توں کافر تسلیم کر لیا گیا۔ پہلے انگریزوں، پارسیوں، ہندوؤں اور سکھوں تک کو کافر کہنا (باعتبار حقیقت مذکورہ باعتبار قانون) صحیح نہ تھا۔ اور اب لوگوں کی تکفیر کے لئے بھی سنی و جہد میں باقاعدہ حصہ لیا گیا، جو حکم ازکم اہل تہلہ تھے اور جن کو خود اپنے اسلام پر اصرار تھا۔ اور اس لئے کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک "دورثانی میں اس کا مزاج اور مذاق بالکل عوامی سطح پر آگیا۔"

اس سطح میں مصنف نے بڑی تفصیل سے انٹیلی قادیانی تحریک کے بارے میں جماعت اسلامی کے مشہور و معروف "رول" کا ذکر کیا ہے، کہ کس طرح پہلے جماعت اس قسم کی باتوں کے خلاف تھی، لیکن جب عام مسلمانوں کا اس طرف رجحان دیکھا تو وہ بھی اس میں شریک ہو گئی، اور بعد میں اس کا نام تک نہ لیا، پہلے جماعت کا موقف یہ تھا کہ قادیانیت بذات خود نہ تو سکر سے اس قابل ہے کہ اسے ایک مسئلہ بنایا جائے اور بنایا جائے تو اس مسئلے کے ابطال کا وہ طریق کار جو مجلس اصرار نے اختیار کیا ہے، نہ اصولاً صحیح ہے اور نہ نتائج کے اعتبار سے مفید، لیکن جب عوام کے جذبات مشتعل ہو گئے تو جماعت اسلامی اپنی تمام اصول پسندی اور اصول پرستی کو ذبح کر کے ان کی قیادت کرنے کو تیار ہو گئی اور اس ہنگامے کے فرو ہونے کے بعد بقول مصنف: "..... جماعت نے بھی مسئلہ کا نام لینا بند کر دیا اور آج ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ سرے سے پیدا ہوا ہی نہیں تھا۔ یہ پوری داستان بے اصول ہے اور عوام پرستی کا شاہکار نہیں بنوا کر کیا ہے۔"

اس بیان کی تہذیب کے بعد غلاف کعبہ کی نمائش اور صلیبی انتخاب میں ایک عورت

امیدوار کی تائید کر کے اپنے پہلے نظام و دعویٰ اور اصولوں کی جماعت اسلامی کی قیادت نے جس طرح مٹی پلید کی اس کی یاد اب تک تازہ ہے۔

۱۹۷۷ء کے بعد جماعت کی پالیسیوں میں یہ تبدیلی کیوں آئی، ڈاکٹر صاحب نے آخر میں اس پر بھی روشنی ڈالی وہ کہتے ہیں: "۱۹۷۷ء میں پاکستان میں کچھ اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ تحریک اسلامی کے لئے ایک نظام آسان اور مختصر راستہ **SHORT CUT** و فتنہ نگاہوں کے سامنے آ گیا اور وہ یہ کہ غیر مسلموں کے انخلاء کی وجہ سے پاکستان میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو گئی ہے۔ اور اس سیکڑل میں اسلام کی محبت کسی نہ کسی درجہ میں موجود ہے خاص طور پر اس وقت دس پندرہ سال کی قومی تحریک نے اس محبت یا کم از کم اس محبت کے اظہار کو عطا دے دی ہے۔ لہذا اس وقت ان کی محبت کو خواہ وہ محض جذباتی اور سطحی ہی ہو کام میں لا کر اس ملک کے دستور کو صحیح بنیادوں پر اٹھایا جاسکتا ہے اور اسی محبت کے بل پر اور کچھ اس بنا پر کہ قیادت میں ایک خلا پر مالی پیدا ہوگا، انقلاب قیادت کا مرحلہ بھی آسانی سے طے ہو سکتا ہے۔ لہذا بڑھو اور اس **SHORT CUT** سے اقتدار ہاتھ میں لے کر بیچے سے اوپر کی طرف ایک نظری طریقہ پر انقلاب لانے کا کھیکٹر مول لینے کی بجائے اوپر سے نیچے کی طرف انقلاب لانے کا ایک موقع جو مل رہا ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

مصنف کا یہ تجزیہ بہت حد تک صحیح ہے، ہمارے نزدیک نہ صرف جماعت اسلامی کے قیام کے بعد بلکہ جب سے کہ مولانا مودودی قلم و قریط اس کی مدد سے قیادت کے میدان میں آئے ہیں ان کا اس طویل دور کے ہر مرحلے میں ہمیشہ یہ نصب العین رہا کہ خدا نے انہیں جو صلاحیتیں دی ہیں ان سے کام لے کر وہ آگے آئیں، اس آگے آنے کے لئے وہ ان مرحلوں میں جن میں عناصر کو اپنے لئے موزعہ پاتے تھے، وہ ان کے ساتھ ہو جاتے تھے کانگریس اور مسلم لیگ کی آویزش کے دوران انہوں نے جمہوریت کی مخالفت کو آگے بڑھنے کے لئے سازگار پایا قیام پاکستان کے بعد دستور اسلامی کا نعرہ کام آیا۔ اور اس کے لئے وہ ان تمام علماء کو ساتھ لینے کے لئے تیار ہو گئے۔ جن سے انہیں کئی اختلاف تھا۔ یہ سمجھ کر کہ مغربی پاکستان میں زمینداروں کا زور ہے، انہوں نے زمینداروں کی حمایت کر لی تھی۔ پھر ایسی ہی قادیانیت تحریک کو معقول پاکر اس کے ہم کوا ہو گئے۔ اور آخر میں

ان کے نزدیک جمہوریت اور وہ بھی پارلیمانی جمہوریت اصل اسلام تشریفاتی اور اب وہ اس کے قیام میں کوشاں ہیں۔

ہمارے نزدیک مولانا کے اس کے طرح سوچنے اور اس پریوں عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہ تھا، اگر وہ اس ذیل میں دو باتیں کرتے۔ ایک تو یہ کہ اب زمانہ قہد یوں "اور" اماموں کا نہیں۔ اس زمانے میں قیادت اور اقتدار جماعت کا ایک فرد بن کر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ آج جماعت مقدم ہے۔ اور فرد بعد میں آتا ہے۔ اسٹان کی اس کے مرنے کے بعد جو درگت بنی، وہ اس کی ایک مثال ہے۔ مولانا کو یہ مقام منظور نہیں، وہ اول و آخر قائم ہیں اور قائم رہنا چاہتے ہیں۔ اور یہ رجحان ان میں شروع سے ہے۔ ۱۹۲۴ء میں ان کو جب مولانا محمد علی مرحوم روزنامہ "ہمدرد" کے ادارہ تحریر میں شامل ہونے کو کہا گیا، تو انہوں نے بقول خود "مسدود" پر "الجمیعت" کو اس لئے ترجیح دی کہ وہاں وہ کسی کے ماتحت نہ ہوتے اور یاد رہے کہ اس وقت مولانا کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ عنوان شباب میں مولانا ابداً کلام آزاد میں بھی یہ رجحان موجود تھا۔ لیکن جلد ہی سدھر گئے، لیکن مولانا مودودی اب تک اسی طرح سوچتے ہیں۔

دوسرے مولانا مودودی اپنے سامنے کی چیزوں کی باریکیوں کو خوب سمجھ جیتے ہیں، اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قدرت نے انہیں تہہ و تبرہ تنظیم کی تمام صلاحیتیں بھی عطا کی ہیں، لیکن ہمتی سے ایک توان کے ذہن کا کینوس بہت چھوٹا ہے، دوسرے وہ دوزک نہیں دیکھتے اور تاریخی، معاشی اور سیاسی قوتیں آج جس طرح بروئے کار ہیں، ان پر ان کی نظر نہیں چنانچہ ہوس اقتدار میں وہ اکثر عجلت پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے دراصل مولانا کی عظیم شخصیت کا المیہ۔

زیر نظر کتاب کی قیمت چار روپے ہے۔

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکر و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دو سہ اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا جہز۔  
شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا۔



# المسکون اجادیش الموطا (عربی)

تألیف: الامام والی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکتبہ کرم میں مولانا حبیب اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی۔ اس میں مکتبہ کرم نامہ اور شاہ ولی اللہ کے تشریحی مباحثے میں شرف میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح اصفی پر اپنے برسرہ مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ ہے شاہ صاحب نے الموطا امام مالک کے نسخے سے ترتیب دیا ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال ہیں جو باقی محدثین سے منفرد تھے حدیث کریمہ کے مکتبہ الموطا کے بواجے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات دیئے گئے ہیں الموطا کے بواجے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات دیئے گئے ہیں الموطا کے بواجے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات دیئے گئے ہیں۔

## شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جالبانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جالبانی ایم اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے۔ اس میں محنت نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر جابر صلی بخش کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

(فارسی)

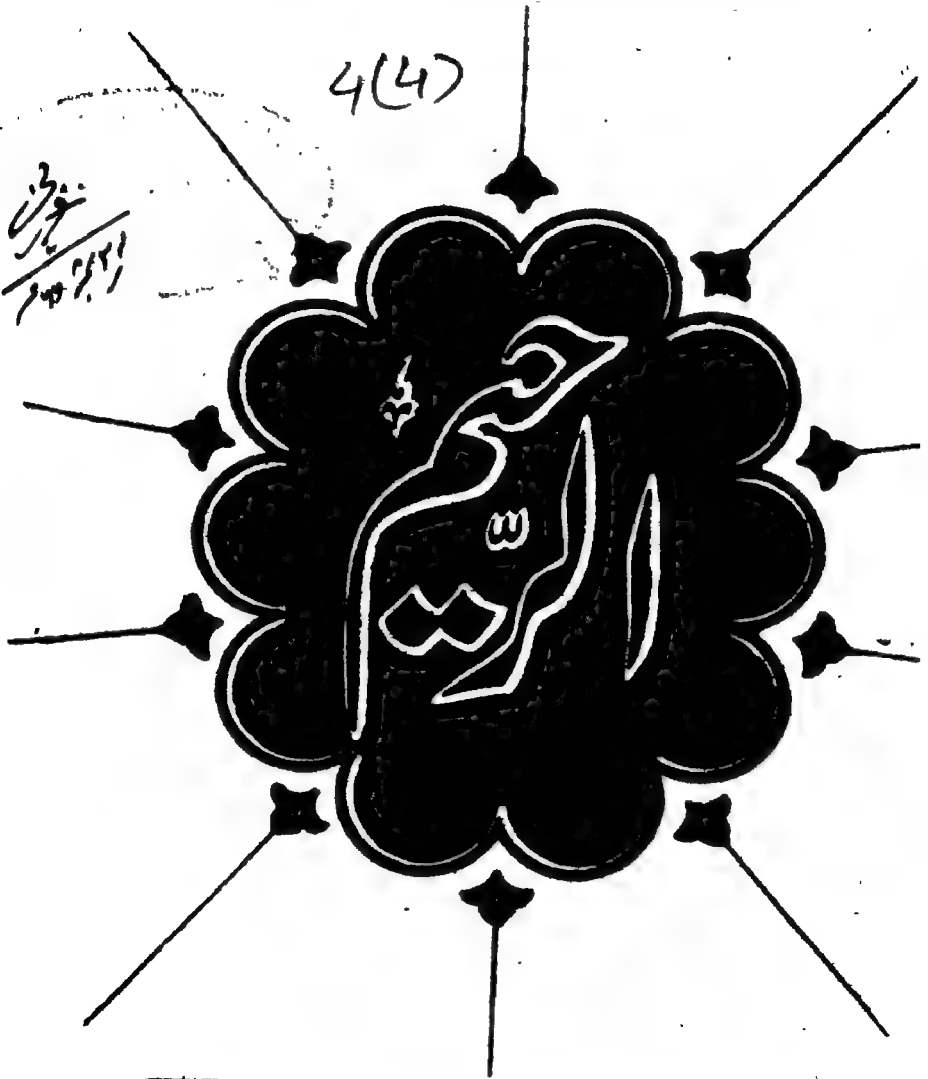
## سطح

انسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حقیقۃً العقلمند سے اتصال پیدا کرتا ہے، سطحات میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ چھپاس پیسے

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

4(47)

نور  
الہی



شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدھیا آباد

مجلس اذارت

ڈاکٹر عبد الواحد علی پوتا،

مخدوم امیر احمد

مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

# الترجمہ

جلد ۴	ماہ ستمبر ۱۹۶۶ء مطابق جمادی الاولیٰ ۱۳۸۶ھ	نمبر ۴
-------	--	--------

## فہرست مضامین

۲۴۲	میر	شذرات
۲۴۵	مصنف ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتہ	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ
	مترجم سید محمد سعید	
۲۶۱	محمد مسعود ایم۔ ایس۔ سی	مسلمانوں کے ہاں علم ہیئت
	ابوسلمان شاہجہان پوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی
۲۶۳		حالات
۲۸۶	طفیل احمد قریشی	علامہ ابن حزم
۲۸۹	محمد ایوب قادری	مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے
	مولانا محمد ولی نعمانی	آئی آیتوں کا ربط حضرت شاہ ولی اللہ
۲۹۹		کی نظر میں
۳۱۴	(۱- ص)	تقید و تبصرہ

## شذرات

۱۹۴۶ء تک ہم مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس سرزمین سے برطانوی تسلط کے مخوس سائے ہٹیں، اور برصغیر میں ہماری اپنی آزاد مملکت قائم ہو۔ خدا نے کیا، یہ ہو گیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد اب ہمارے سامنے پہلے کی طرح صرف ایک مسئلہ نہیں ہے، بلکہ چند در چند مسائل ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ بڑا، اہم اور ہماری فوری توجہ کا طالب ہے۔ سب سے مقدم مسئلہ تو پاکستان کے دفاع کا ہے، لیکن اس زمانے میں دفاع کا تعلق ملک کے داخلی استحکام، اُس کی معاشی و صنعتی ترقی اور اہل ملک کے اتحاد و یکجہالت سے ہوتا ہے۔ چنانچہ اس طرح دفاع اور داخلی استحکام دونوں مل کر آئندہ میں ایک ہی مسئلہ بن جاتے ہیں۔ پاکستان کی معاشی و صنعتی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ہاں ہر نوع کی صنعتیں قائم ہوں اور میکینیکل اور سائنسی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ جب ایک ملک زرعی و دیہی معیشت سے صنعتی معیشت میں قدم رکھتا ہے تو اُس کی آبادی کثیر تعداد میں دیہات سے شہروں کا رخ کرتی ہے، جہاں کہ کارخانے ہوتے ہیں۔ اس نقل آبادی سے معاشرے میں بڑا فتنہ پیدا ہوتا ہے اور وہ سب معاشی پرورش پاتے ہیں جن کی خبریں آج کل اعلیٰ اخبارات میں بھی جاتی ہیں، اور ہمارے علماء کرام آئے دن جن کی اپنے عقول اور خطبوں میں نشان دہی فرماتے ہیں۔

بے شک کارخانے بڑی اچھی چیز ہیں اور آج کی دنیا میں ان کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ لیکن کارخانے جس معاشرتی زندگی کو جنم دیتے ہیں، اُس میں بڑی خرابیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان خرابیوں کی لازماً اصلاح ہونی چاہیے۔ اور عقل مند اور نورانیدیش لوگ جب کارخانے بناتے ہیں، تو اُن سے پیدا ہونے والی خرابیوں کی اصلاح کا بھی سوچتے ہیں۔

پاکستان کے داخلی استحکام کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ یہاں بڑی سرعت سے اور کثیر تعداد میں کارخانے لگیں۔ ہماری زرمی پیداوار بڑھے، اور ہم معاشی لحاظ سے خود کنیل ہوں،

وہاں یہ بھی لازمی ہے کہ جیسے پاکستان ایک سیاسی و جغرافیائی وحدت ہے، ویسے پاکستان کے سامنے باشندوں میں بھی ایک بنیادی وحدت ہو اور ان میں جذباتی ہم آہنگی پائی جائے۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مختلف علاقوں میں آباد ہیں۔ وہ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ سب کا مذہب بھی ایک نہیں۔ اور پھر جو ایک مذہب کے ہیں، ان کے بھی کئی فرقے ہیں اور ان میں سے بعض فرقوں کے آپس میں بڑے تاریخی اختلافات ہیں اور بعض کے معمولی — غرض جیسا کہ اوپر عرض ہوا، پاکستان کا دفاع بے شک مقدم ترین مسئلہ ہے لیکن اس کے لئے داخلی استحکام اولین شرط ہے اور داخلی استحکام کے لئے ضروری ہے کہ چھوٹے اور بڑے مذہبی اختلافات کے باوجود جو اہم ہیں ایک بنیادی وحدت ہو اور ہم سب جذباتی طور پر اپنے آپ کو ایک قوم محسوس کریں۔

یہ جو اوپر بیان ہوا، ہمارے خیال میں اس سے کوئی شخص بھی اختلاف نہیں کرے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اس ملک کے دفاع کے لئے داخلی استحکام ضروری ہے، تو کیا اس وقت ہمارے ہاں مذہبی فرقوں کے درمیان جس وسیع پیمانے پر قلمی و لسانی عداوت ہے ہو رہے ہیں، ان کی موجودگی اور انہیں اسی طرح جاری رہنے دینے سے پاکستان کا داخلی استحکام ہو سکے گا؟ ظاہر ہے نہیں، اور یقیناً نہیں۔ تو پھر اس صورت میں ہمارے اکثر علمائے کرام کا پاکستان کے دفاع کے بارے میں لمبی لمبی تقریریں کرنا، جہاد کے مسئلے مسائل بیان کرنا اور ساتھ ہی فرقہ وارانہ منافرت کو بڑا دینا اور مذہبی اختلافات کے خدیوہ قوم و ملت میں افتراق و انتشار کے بیج بونا کہاں کی عقل مندی ہے۔ کیا پاکستان کا دفاع اس طرح ہو سکے گا اور اس اظہار رائے کی آزادی کے ہوتے ہوئے ہم ایک متحد، ترقی خواہ اور مضبوط قوم بن سکتے ہیں۔

پاکستان میں ہر مذہب کے لوگ ہیں، اور پاکستان کے دستور نے ہر شخص کو قانون کی حدود میں رہتے ہوئے مذہبی آزادی کی ضمانت دی ہے چنانچہ حکومت پاکستان دستور کی اس دفعہ کی پابند ہے۔ اور اس کا اعتراف دنیا میں ہر جگہ کیا جاتا ہے اب ہمارے اکثر دینی حلقے پاکستان کے دستور کی اس دفعہ اور حکومت پاکستان کی اس دفعہ کی پابندی پر ناراض ہیں۔ اور جب بھی انہیں موقع ملتا ہے وہ اس پر قلم اور زبان دونوں سے حکومت کو مٹھوں اور اس کے خلاف رائے عامہ کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے یہ جنگ یہ سمجھنے کی کبھی زحمت گوارا نہیں فرماتے کہ پاکستان کا ایک بتوسہ

اور حکومت اس دستور پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔ پھر پاکستان کی بین الاقوامی ذمہ داریاں ہیں اور اس نسلے میں ہر ملک عالمی رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے۔ قائد پر احتساب مسیحی دنیا کا فائدہ رہا ہے، مسلمانوں کے ہاں تو تعمیر کی آنادی ایک مستند قاعدہ ہے اور لاکھ لاکھ رافنی اللہ یون اس کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

دوسرے مذاہب والوں کا تو مسئلہ الگ رہا، خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بارے میں ہمارے اکثر علمائے کرام کا جو رویہ ہے کیا اُسی پر قائم رہنے کے بعد اہل پاکستان میں بنیادی وحدت پیدا ہو سکتی ہے اور جب ہم دن رات ایک دوسرے کو گمراہ، غلط کار، بلکہ دائرۃ اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں گے، تو کیا ہم میں وہ جذباتی یگانگت و ہم آہنگی کا رفرما ہو سکے گی، جو ایک ملک کے داخلی استحکام کے لئے لازمی ہے۔ ہم سب پاکستانی ہیں پاکستان ہمارا وطن ہے اس وطن کے کچھ حقوق اور ذمہ داریاں ہیں۔ اور ہم سب کو بلا تفریق مذہب ان حقوق اور ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔ ایک سے حقوق اور ایک سی ذمہ داریوں میں ملک کے ہر باشندے کا مساویانہ اشتراک قومی وحدت کی بنیاد ہوتی ہے۔ اور بدقسمتی سے ہماری موجودہ فرقہ وارانہ سرگرمیاں اسی کو کمزور کرنے کے لئے وقف ہو گئی ہیں۔ آخر اس صورت میں داخلی استحکام کیسے ہو گا اور اگر داخلی استحکام نہ ہوا، تو ہمیں بیرونی دشمنوں سے پاکستان کا دفاع کس طرح کر سکیں گے۔

ہم اپنے بزرگوں سے ہادب التماس کریں گے کہ وہ وقت کی نزاکت کو سمجھیں، اور مذہبی فرقوں کے پراسے اور نئے اختلافات کو آراء و افکار ہی کا اختلاف رہنے دیں، اور انہیں جماعتی غماست اور دھڑوں کی لڑائی کا ذریعہ نہ بنائیں۔ اس لڑائی سے عہد گزشتہ میں مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا، انسان کی سلطنتیں تباہ و برباد ہوئیں، اُس کا کسے علم نہیں۔ ہمیں اپنی تاریخ کے ماضی سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔

اس ضمن میں ہم یہ بھی کہیں گے کہ اگر خود ہمارے ان بزرگوں نے کوئی ایسی راہ نہ نکالی کہ موجودہ فرقہ وارانہ کشمکش ختم ہو جائے، اور مختلف مذہبی فرقے آپس میں رواداری پرستے لگیں تو پھر حکومت کو اس بارے میں ضروری اقدام کرنا ہو گا اور وہ اس لئے کہ بہر حال کوئی حکومت بھی ملک کے داخلی استحکام کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ اور اس وقت ہماری اکثر مذہبی جماعتوں کی سرگرمیاں اس کی نقیض ثابت ہو رہی ہیں۔

# شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصہ اول

## مبادیات اخلاقیات

مصنف ڈاکٹر عبدالواحد علی پورہ

مترجم، سید محمد سعید

(۴)

لیکن اس کا انجام اس کی عقل سے رہنمائی پا رہا ہے خواہ وہ کسی مکافات یا انتقام ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو۔ مختصر یہ کہ وصف شجاعت یہ ہے کہ کوئی انسان غصہ اور شرع پسندی پر عقل کے اصولوں کے مطابق قابو پائے اور اسے ایک رائے کلی کے طور پر استعمال کرے۔

اسی اصول کے مطابق، غصہ و نزاع پسندی کی جہالت کیا۔ عقل کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ اور اسی کے قوانین کے تحت ظاہر ہونا یا غائب ہونا چاہیئے۔ اس میں شخصی انتقام کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کسی شخص کو ذاتی طور پر تکلیف نہیں پہنچانا چاہیئے۔ اور اسے اپنے ذاتی نقطہ نگاہ سے غصہ نہیں کرنا چاہیئے اور اپنے حریت سے نہیں لڑنا چاہیئے۔

لیکن اگر ایک آفاقی مفکر کی خاطر اس کی عقل اسے لڑنے کی ہدایت کرتی ہے تب اس کی غصہ کی صلاحیت اس کی عقلی تدبیر کے تحت ہونی چاہیئے اور اسے ایسے ہی حالات میں غصہ اور لڑنا چاہیئے۔ اگر اس کی عقل اس کے باوجود اس کے حریت کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے روکتی ہے جس نے اسے تکلیف پہنچائی ہے اور وہ اس سے لڑنے سے باز رہتا ہے تو اس صورت میں وہ شخص ذاتی طور سے دشمن کے ہاتھوں تکلیف اٹھاتا ہے۔



یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ غضب یا نزاع پسندی اور غصہ کی صلاحیت ہے جو کسی شخص کو اپنے حریت کے مقابلہ میں تشدد استعمال کرنے کے قابل بناتی ہے۔ لیکن وہ اسے زبردست خطرہ کا مقابلہ کرنے کے قابل بھی بناتی ہے۔ لیکن جائیداد اور حیثیت کا نقصان ایک معاشرتی یا انفرادی قسم عزت و مصیبت کا خوف؟

اپنی کتاب الہدور البازغہ میں شاہ ولی اللہ وصف شجاعت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں وصف شجاعت خود اعتمادی (ذہنی) کی حالت اور خطرناک معائب فالطم اور تشددانہ نفی کی طویل گھڑیلوں میں ثابت قدمی کا نام ہے۔ کسی حریت کے غصہ کی شدت یا دردناک تکلیف کا خطرہ نہ تو اسے پیچھے ہٹنے دیتا ہے اور نہ ہی اسے مقابلہ کرنے کے لئے نااہل بناتا ہے۔ اس لئے ایسی صورت میں اسے کلی کے اصولوں کے مطابق خطرہ کا مقابلہ کرنا ایک تسلیم شدہ منصب و المصلوالبافہ کا حصہ ہی ہے۔

کسی خطرہ کا مقابلہ کرنے کے دوران ایک رخصانہ حقیقی اور اعلیٰ تر مقصد لازمی ہے تو اگر کوئی شخص ہلاک ہو جاتا ہے تو وہ بہادر نہیں ہے۔ اس اصول کے تحت شجاعت و مردانگی، موت اور تکلیف کا سامنا کرنے میں ہے اور اس کے لئے ایک حقیقی اور عقلی مقصد ہونا چاہیے جیسے عزت و احترام وغیرہ کا تحفظ کرنا۔

اکثر اوقات، عقل یا آفاقی مقصد میدان جنگ میں جان دینے سے بھی پورا نہیں ہوتا اس کے برعکس شجاعت یہ ہوگی کہ میدان سے بھاگ کر جان بچالی جائے۔ ایک شخص جو موت کے خوف سے اپنے اعلیٰ نظام کی کمزوری کی وجہ سے میدان سے بھاگ نہیں سکتا اور وہاں مارا جاتا ہے تو اسے بہادری نہیں کہا جاسکتا۔ اس کا یہ عمل بہادری و شجاعت کے متضاد ہے۔ جو مقصد کسی شخص کو اپنے حوصلے و جرات کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے اسے

آفاقی یا عقلی درجہ کا ہونا چاہیے یا پھر اسے ایک اہم مقصد غرض ہم سے وابستہ ہونا چاہیے۔ اسی لئے ایک ہائی اور اچھڑ شخص فخر جو چھوٹے چھوٹے معاملات پر لوگوں سے لڑ کر خوش محسوس کرتا ہے۔ اس میں وصف شجاعت نہیں ہو سکتا۔ نہ ہی ان افراد کو شجاع اور بہادر کہا جاسکتا ہے جو اپنے اچھڑ پن، خود رانی اور خود اعتمادی کے زعم میں بغیر کسی اہم مقصد

عقلی سبب کے خطروں میں کود پڑتے اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کا کیا ہوگا۔ نہ ہی ایسے افراد بہادری شجاع ہیں جو دولت کے لالچے میں، یا اپنی حیوانی خواہشات کی تسکین یا جھوٹی خواہشات یا ذاتی اغراض کے لئے اپنے آپ کو بڑے خطرہ یا تباہی کے منہ میں پھینک دیتے ہیں۔ ایسے افراد خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنی خواہشات اور محرکات کے غلام ہوتے ہیں نہ کہ اس لئے کہ وہ ہجرات مند ہوتے ہیں۔

## عفت

ایک اور وصف، جو انسانی طبائع کے حیوانی پہلو میں پائی جانے والی جبلت سے صاف تسکیر اثر اور عقل کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ عفت کہلاتا ہے۔ یہ انسانی ذہن کے اس رحمان میں پایا جاتا ہے جس میں جنسی جبلت پر قابو پانے اور اس کو کارآمد بنانا اس سے اعلیٰ تر قدریں حاصل کرنے کے محرکات ہوتے ہیں۔

انسانی طبیعت کے حیوانی پہلو اور صفات عقل کے مثلث کے اثر کے دو حیاتی عناصر ہیں اس وصف کی بنیاد ہوتی ہے۔

یہ حیاتیاتی عناصر حسب ذیل ہیں۔

(الف) جنسی جبلت اور اس کے محرکات کی قوت، جیسا کہ وہ مستحکم طبائع میں ایک مضبوط اور صحت مند طبعی جسم کے ساتھ بالعموم پائے جاتے ہیں۔

(ب) مرد کا امکانہ اور برتری کا طرز عمل، جو اسے وصف قوت کی بناء پر حاصل ہے عورت پر چھا جاتا ہے۔ مرد کے مقابلہ میں عورت کا محکومانہ و تابعدارہ طرز عمل اور شرمیلا پن، اس کی طبیعت میں پیدا ہونے کی طور پر نرمی اور نزاکت ہوتی ہے۔

یہ دو خصوصیات میمان میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور انسانی طبائع حیوانی پہلو میں بھی پیدائشی طور پر ہوتی ہیں۔ اور ان سے دونوں اصناف کے ارکان میں فطری طرز عمل کی بنیاد فراہم ہوتی ہے لیکن بنی نوع انسان کے معاملہ میں جیسے جیسے یہ فروغ پاتی ہیں مختلف النظم حالتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں جیسا کہ نیچے بحث کی جائے گی۔

## حیوانات میں مخالف اصناف کا طرز عمل

حیوان کے دو تذکرہ بالا جایا جاتی عناصر ہی میں مخالف صنفوں کے باہمی طرز عمل اور رحمان کی بنیاد پائی جاتی ہے۔

حیوانات کے معاملہ میں نزدیک وقت کئی ماداؤں سے سلطت سکتا ہے۔ اس کے برعکس مادا میں ہمیشہ اسی ایک نر کے ماتحت رہتی ہیں جو ان کی تابعدارانہ فطرت پر حکومت کرتا ہے دو سکڑ نروں کو بھلگئے پر محبوب رکھ دیتا ہے۔

یہ طرز عمل مخالف صنفوں کے باہمی رحمانات کے اختلاف میں ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ جنسی خواہش و تحریک نر و مادہ دونوں میں یکساں ہوتی ہے۔ اسی لئے دونوں ایک دوسکر کے لئے فطری رغبت کا اظہار کرتے ہیں لیکن مسلسل ایک نر کے طبعی تعلق میں پہنچنے کے نتیجہ میں مادہ میں اسی ایک نر کے لئے ایک جنس رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس مرد میں اسی ایک مادہ کے لئے یکساں رغبت کی حس پیدا نہیں ہوتی۔ وہ پہنچنے گردہ میں فرداً فرداً ہر مادہ سے ایک مختلف قسم کا تعلق اور علیحدگی کا برتاؤ کرتا ہے۔

نر کی شدید جنسی خواہش بحیثیت مجموعی مخالف صنف کے افراد کے لئے بڑی شدت کا اظہار کرتی ہے اور بالعموم ماداؤں کے لئے ہوتی ہے۔

اس بات کو مشاہدہ ولی اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "کیا تم نہیں جانتے کہ مضبوط اور قوی نر حیوان، کئی ماداؤں کو اٹھا لیتا ہے جو اس کی قوت و برتری کے آگے سرعہ کا دیتی ہیں، اور وہ ماداؤں پر حکمرانی کرتے ہوئے ان سے دود بھی رہتا ہے۔"

## مرد میں یکساں خصوصیات کا فروغ

اس قسم کی خصوصیات، مرد کے عام مزاج میں فروغ پاتی ہیں وہ عام طور سے عورتوں کو شدت کے ساتھ پسند کرنے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اس شدت پسندی کے ساتھ ہر کسی ایک یا دوسری عورت کے لئے والہانہ محبت و شینگی کے بغیر، ایک عارضی جوش

بھی ہوتا ہے، حالانکہ وہ رحمت کی حس فروغ پاتی رہتی ہے۔ ایک عورت ہی میں سب سے شدید محبت و انسیت، اس مرد کے لئے ہوتی ہے جو اس کا شوہر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان فطری طور پر اپنے مزاج کی وجہ سے کثرت پسند ہوتا ہے اور متعدد عورتوں سے جنسی تعلق رکھنے کا رجحان رکھتا ہے اور ان کو اپنی زوجیت میں رکھتا ہے۔ ایک عورت اپنی پیدائشی نظرت کی وجہ سے، اپنے تعلقات نہیں رکھ سکتی۔ وہ ایک وقت میں ایک ہی مرد سے تعلق رکھے گی اور وہ اس کا شوہر ہوتا ہے اور قدرتی طور پر یہی مرد اس کی شدید محبت اور انسیت کی شے بن جاتا ہے۔ چونکہ مرد عورت کے طبع کی پیدائشی خصوصیات کے مطابق فطری صلاحیتیں، رجحانات اور اختلافات ہوتے ہیں اور اختلافات ہوتے ہیں اور ہم تاریخ میں یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ کمرہ ارض پر آباد ہوئی والی تمام اقوام کی یہی رائے رہی ہے کہ ایک مرد کئی عورتیں رکھ سکتا ہے مگر ایک عورت کے لئے ایک ہی وقت میں متعدد مرد رکھنا بڑی بڑی ہمت ہے یہ ایک غلطی ہے کہ ایک عورت، ایک ہی وقت میں ایک شوہر سے زائد مرد رکھے۔ یہ اس کی جسمانی و حیاتیاتی ضرورت کے برعکس ہے اور یہ عمل مرد کے فطری مزاج، محبت کے خلافت بھی ہے۔ کیونکہ مرد کی جبلت خود داری اور شدید حاکمانہ انداز اس کے مستحکم مزاج کے نمایاں نشانات ہیں۔ اگر کئی مرد ایک عورت سے شادی (یا جنسی تعلق پیدا کرنے پر متفق ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان میں مذکورہ صفت، محبت کا فقدان ہوگا۔ اور ان کے طبع میں ایک کی ہوگی جس سے کہ طبعی اور نفسیاتی کمزوریاں واقع ہوتی ہیں۔ اس بات کو شاہ ولی اللہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ اپنی بیویوں اور بچوں کے معاملہ میں محبت مرد کے مزاج کا لازمی خاصہ ہے لہذا یہ بات اس لئے ناقابل قبول ہوگی کہ ایک ہی عورت پر متعدد مرد قابض رہیں۔ یہی بات ان حیوانات میں بھی پائی جاتی ہے جو شدید جبلت محبت کے مالک ہیں۔

## یہ خصوصیات کب وصف بن جاتی ہیں؟

یہ وحشیانہ جبلتیں اور جذبات، جب عقل کی صفات مثلث کی کسی ایک خصوصیت رائے کلی سے شائستگی حاصل کرتی ہیں تب یہ وصفِ عفت پیدا کرتی ہیں اور اخلاقی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

عورتوں کے لئے شدید پسند کا رجحان، کسی ایک نغمہ، عورت کی طرف تابعدارانہ رجعت کے بغیر اس وقت وصفِ عفت میں تبدیل ہو جاتا ہے جب اسے رائے کلی کوئی شکل اور ہدایت دیتی ہے۔

رائے کلی جنسی خواہش اور اس کے رجحانات کو قواعد کے مطابق ڈالتی ہے اور اس کی شکل ترتیب دیتی ہے جو ان رائے کلی کا حامل نہیں ہو سکتا، نہ ہر بارز علی بن اس کا مقصد انفرادی اور مخصوص ہوتا ہے اور ان خواہشات کی تکمیل۔ تشکیں ان حیوانات کے لئے بجائے خود ایک مقصد ہوتی ہے۔ لیکن مرد کے معاملہ میں، جنسی خواہش کی تشکیں یا اس سے متعلق دوسرے رجحانات، بجائے خود مقصد قرار نہیں دیتے جاسکتے۔ اس کے برعکس مرد بالعموم اپنی جنسی تشکیں لازمی مقاصد اور وسیع تر و آفاقی قدروں کی خاطر کرتا ہے۔

ان مقاصد کو معاشرہ یا اس کے دانش ور افراد یا قابل احترام افراد معیار قرار دے دیتے ہیں۔ اکثر اوقات، یہ مقاصد اور قدریں، انسانی مقاصد کی خاطر شادی کرنے میں پائی جاتی ہیں۔ یہ انسانی مقاصد انسانیت کی بقا، قوت مردانگی کی ترقی، کسی قوم کی قوت، اور خاندان وغیرہ کی خوش حالی سے تعلق رکھتے ہیں۔

جب رائے کلی کے مطابق مرد اپنی جنسی خواہش پر قابو پا تا ہے تو وہ اپنی مرضی سے، اپنی جنسی تحریک کو کام میں لیتا ہے جو عقل کے مطالبات اور تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے اور وہ خارجی و داخلی حالات، نفسیاتی اور روحانی ضروریات کے مطابق بھی ہوتی ہے۔ لہذا اگر کوئی شخص رائے کلی کے ذریعہ اپنی جنسی جبلت پر قابو پا لیتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ کثرتِ انواع، ایک آفاقی یا اعلیٰ تر مقصد کے لئے لازمی ہے اور وہ جنسی جبلت

کی تقریجوں کے آگے سر جھکائے بغیر ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے اعلیٰ شخص شاہ ولی اللہ کے مطابق عفت (محبہ عفت) ہے۔

## وصف عفت کے لوازمات

ایک شدید جنسی تحریک اور اس تک رسائی حاصل کرنے والے رجحانات کے بغیر جساکہ اوپر ذکر کیا گیا ہے وصف عفت وجود میں نہیں آسکتا کیونکہ ایک شخص جو جنسی اعتبار سے نامرد ہوتا ہے اس میں وصف عفت نہیں پایا جاتا۔

جنسی تحریک پر قابو پانا، ہیکر اوپر بتایا گیا ہے، اور جنسی تحریک کے غلبہ سے نجات پانا شاہ ولی کے نزدیک عفت کا لوازم ہے جنسی تحریک پر قابو پانے کی صلاحیت میں کمی دراصل، وصف عفت کا فقدان ہے۔ عودت کے معاملہ میں، اس کا وصف عفت فطری طور پر شوہر کی محبت اور بچوں سے شفقت کو بڑھاتا ہے۔

### سماحت

ترقی اور ارتقاء کے اصول کے مطابق وصف سماحت (فیاضی، شیشنی و غزور کے جذبہ عجب اور تہوال طرح یعنی خود پسندی اور نفرت کے محرکات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اپنی ابتدائی اور وحشیانہ شکل میں جبلتیں ہوتے ہیں جو ترقی پاتی ہیں تو آدمی، ان کو حیوان یا ابتدائی دور کے انسان کی طرح انفرادی مقاصد اور شخصی الطاف و کرم کے لئے کام میں نہیں لاتا۔ لیکن وہ ان کو اعلیٰ مقاصد اور آفاقی سیرت کے مقاصد کے لئے بروئے عمل لاتا ہے۔ جس میں خودی ایک عظیم تر خودی سے تمیز پیدا کرتی ہے۔ خود رانی کی جبلت، اس وقت خود نائی کی جبلت بن جاتی ہے جب وہ متذکرہ بالا دو دوسری جبلتوں سے امتزاج کرتی ہے اور برتری پلندی اور فوقیت کے رجحان میں ترقی پاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ رحمت و نفرت کی جبلتوں کے مقاصد کو نظر انداز کرتی ہیں۔

وقت کے ساتھ یہ پیچیدہ جذبہ، ایک حسن اعتدال کی پاکیزہ شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جو عظیم تر مقاصد کے لئے شخصی مقاصد کو قربان کر دیتا ہے۔ اور وہ ہر بے عزتی، ہستی

اور کلینگی کی شے کو نفرت سے دیکھتا ہے۔ اور اسی طرح وصفِ سماعت و وجود میں آتا ہے۔ ذہن کی ایک حالت میں اس کا لوازمہ پایا جاتا ہے جو ہر اس شے سے انکار کر دیتا ہے جو انسانی عظمت اور خود نمائی سے پست ہوتی ہے۔ ہر وہ شے جو آفاقی مقاصد سے ہٹ کر واقع ہوتی ہے، بہت کم تر اور کلینہ شمار کی جاتی ہے اس لئے یہ انسانی عظمت اور خود نمائی سے گمراہی ہوئی ہوتی ہے اور اسی لئے یہ وصفِ سماعت کے برعکس ہوتی ہے پست مقاصد کے لئے ایک فطری پیدائشی ناپسندیدہ گی رکھتے ہوئے ایک سماعت پسند شخص 'زندہ رہنے کی ایک فطری خواہش رکھتا ہے اور زندگی میں اعلیٰ تر مقاصد حاصل کرتا ہے۔ پست مقاصد کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس کا ذہن پست مقاصد کے حصول میں ناکامی و کامیابی کے موافق اثرات سے بالکل متاثر نہیں ہوتا۔ شاہ ولی اللہ نے وصفِ سماعت پسند شخص 'زندہ رہنے کی

وصفِ سماعت ذہن کے رحمانِ عظمت و خود نمائی میں ہوتا ہے جو کہ ہر اس شے کے مخالف ہوتا ہے جو تنگ نظری، یا سادہ لوحی کی حامل ہوتی ہے اور اس شے کے بھی مخالف ہوتا ہے جو کہ ذہن میں ہر قسم کے پست اور کم تر مقصد کے غلبہ کا رحمان پیدا کرتی ہے؛ اس سے قبل کہ وصفِ سماعت کی تشبیہ کی جائے، اور پھر اس کی برتری واضح کی جائے یہ سمجھنا مناسب ہوگا کہ ایک پست اور کم تر مقصد کے معنی کیا ہوتے ہیں۔

## پست مقاصد برخلاف اعلیٰ تر مقاصد یا انفرادی مقاصد برخلاف آفاقی مقاصد

ادوات اور خرابیوں کے لوازمہ پر بحث ہے، یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ذہن کی تنگ دامانی اور طرز عمل کی پستی ایک ساتھ چلنے میں اور آفاقیت و وسعتِ نظری کی حالت کے برعکس ہوتے ہیں لیکن وہ انفرادی اور خود غرضانہ سیرت رکھتے کی طرف رحمان رکھتے ہیں جیسا کہ یہ بات حیوانات کے معاملہ میں واضح ہو جاتی ہے اس لئے ایک کم تر قسم کی خود غرضی، ایک پست یا کم تر مقصد سے تعلق رکھتی ہے۔

انفرادی مقاصد سے ہم وہ مقاصد مراد لیتے ہیں جو آفاقی نقطہ نگاہ سے اعلیٰ تر مقاصد کے ماتحت ہوتے ہیں۔ رائے کلی کے نقطہ نگاہ سے انفرادی مقاصد بہت ہوتے ہیں۔ طبعی آرام بجائے خود ایک مقصد ہوتا ہے، دولت یا زر بجائے خود بھرت کی ایک شے ہوتا ہے، شخصی وسعت، شخصی انتقام کی آگ، یہ سب، بہت اور کم تر مقاصد میں شمار ہوتے ہیں

## وصف سماحت کی کمی والے افراد

جن اشخاص میں اس وصف کی کمی ہوتی ہے ان رجحانات کا اظہار کرتے ہیں جن کا اد پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایسے لوگ جلد ہی معمولی سی بے آرامی اور نقصان ہی سے افسردگی اور مایوسی کے شکار ہو جاتے ہیں معمولی سی ناکامی یا بے آرامی کی وجہ سے وہ تاریکی پسند راضی المرحا ہو جاتے ہیں اور وہ شخص نقصان مایوسی اور انکساری کے سوا کچھ نہیں سوچ سکتے۔ ایسے مزاج کے لوگ بالعموم غیر مطمئن نظر آتے ہیں ان کی پیشانیوں پر بے چینی کے آثار پائے جاتے ہیں جیسے وہ ریخ و غم کے مارے ہوئے ہوں۔ بہت مقاصد سے ان کی وابستگی یا ان کے لئے ضرورت سے زیادہ اہمیت ایسے افراد میں اور باسعیت سے پرکرداروں کے مزاج کو فروغ کرتی ہے۔ ایک سماحت پسند شخص کے برعکس ہوتا ہے جو نہ تو ان پست مقاصد سے دلچسپی رکھتا ہے اور نہ ہی ان کی شکین کے لئے بے چین رہتا ہے یہ بات اس کے لئے غیر مادی اور بے حقیقت ہے کہ ان مقاصد کی شکین و تکمیل ہوتی ہے یا نہیں۔

دولت پر تعصبات یا ذاتی اثر و رسوخ بڑھانے کا شدید رجحان رکھنے والے غیر سماحت پسند افراد کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ بخیل، خیس اور شیخی باز ہو جاتے ہیں دوسروں کے ساتھ اپنے ذاتی برتاؤ میں وہ اس قدر خود غرض اور کینے بن جاتے ہیں کہ انہیں دوسروں کی معمولی سی خیرات، اعترت یا عقیدت پر بھی دانت چیتے ہیں اور اس کے برعکس وہ ان لوگوں کی خوشامد کرتے ہیں جن سے انہیں ذاتی فائدے کی امید ہوتی ہے اور وہ مالدار لوگوں کے سامنے طبعی اِمامہ بن جاتے ہیں وہ اس وقت غضب ناک ہو جاتے ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے کم مالدار شخص گزر رہا تھا ہے یا ان سے اعلیٰ نشست حاصل کر لیتا ہے ایسی باتیں، ان کے جفا





اسی طرح، مشکلات و مصائب کے موقع پر ایک صاحبِ سماعت فسر و کا خوش گوار اور روشن نقطہ نظر کسی خطرہ کے احساس کی کمی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے یا سستی سکون النفس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی بے حسی کا سبب نہیں ہوتا ہے یا اس کے مزاج کی سادہ لوحی یا بے حسی یا کسی نفسیاتی پھلج کا نتیجہ نہیں ہوتا ہے۔

## وَصَفَ سَمَاحَتٍ

چار خاص اعلیٰ اوصاف میں سے ایک کی حیثیت سے  
وصفِ سماحت کی تعریف کی روشنی میں

یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وصفِ سماحت، ذہن کی اس حالت میں ہوتا ہے جو پست سے بلند ہوتی ہے۔ اور پست و انفرادی مقاصد سے بلند تر ہوتی ہے۔ جیسا کہ تمام حیوانی محرکین اور جبلتوں کی تسکین ہوتی ہے اور یہ عمل رائے کلی کے خلاف ہوتا ہے اور یہ پست و کم تر مقاصد سے تعلق رکھتا ہے۔ وصفِ سماحت کی ترقی، و اقتداء ذہن کی ایک ایسی حالت کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو تمام پست حیوانی خواہشات اور عامیادہ انفرادی مقاصد سے انکار کر دیتی ہے اور ان سے بہت آگے اپنا مقام بناتی ہے۔ اسی طرح یہ وصف بیان شدہ حالت سے زیادہ وسیع میدان رکھتا ہے اور وہ تمام اخلاقی اوصاف کا مخرج بن جاتا ہے البتہ وصفِ حکمت جو ایک خاص عقلی وصف ہے اس سے علیحدہ ہوتا ہے اسی لئے شاہ ولی اللہ نے اس وصف کو چار اعلیٰ اوصاف میں شامل کیا ہے جو حقیقی مسرت سعدہ کے لئے ضروری ہیں۔ سماحت نہ صفتِ مذکورہ بالا صفات میں ہوتی ہے بلکہ لطافتِ فنی کی مادیاتی حالت میں بھی ہوتی ہے جو کہ حیوانی محرکات سے بلند تر حالت میں سرِ فرخ پاتی ہے۔ اس سطح پر یہ وصف اس وصفِ سماحت سے مختلف ہو جاتا ہے جو سات اخلاق فاضلہ سے تعلق رکھتا ہے۔

سات اخلاقی فاضلہ کی سطح پر سماحت ایک عام وصف ہے اور اس میں ایسی لطافت

بھی نہیں ہوتی ہے باقی سات اخلاق فاضلہ کی طرح اسے بھی ان اوصاف کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جو انسانی طبع کے امتیازی نشانات ہیں جو کہ عقل و سبب کے زیر اثر اپنے حیوانی پہلو سے فسر و غلط پاتے ہیں۔ اس مرحلہ پر اوصاف کوئی مادرائی پہلو نہیں رکھتے جو کہ اعلیٰ ترین اوصاف کی خصوصیت ہے۔

## اظہار کے دو اوصاف فصاحت اور دیانت

ایک عقلی وصف اور تین اخلاقی ذاتی اوصاف کے علاوہ انسان میں دو اوصاف بھی ہیں جو اسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہیں فصاحت یا اوصاف کی یہ دو صفات انسان اپنے تصورات حیالت اور جذبات کو روانی اور تاثر کے ساتھ بیان کرنے سے ظاہر کرتا ہے۔ بلاشبہ حیوانات اپنے احساسات کا اظہار اپنی زبان کے ذریعہ مختلف اقسام کی چیخوں اور آوازوں کے ذریعہ کرتے ہیں وہ اپنے جسم کے دو سکر حصوں کے ذریعہ چمڑے کے اظہار طبعی اشکال اور انداز ظاہر کرتے ہیں یہی صلاحیتیں انسان کے حیوانی پہلو میں پیدائشی طور پر ہوتی ہیں جو انسانی فطرت کی مخصوص صفات کے زیر اثر فسر و غلط پاتی ہیں لہذا نفسیاتی حالتوں، اور شعوریت یا ذہن کی حالتوں کے اظہار کی صلاحیت خواہ زبان یا کسی اور ذریعہ سے ہو، شاہ ولی اللہ کے نزدیک اخلاق فاضلہ ہے اور یہ عظمت کا ایک نشان ہے جو انسان کو حیوانات سے ممتاز کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہ اظہار کی انسانی فصاحت کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ زبان کے ذریعہ وصف اظہار کو فصاحت اور دو سکر طریقوں کے ذریعہ وصف اظہار کو دیانت کہتے ہیں۔

## فصاحت فصاحت کا وصف یا تقریر کی روانی

اس وصف کی ابتدائی بنیاد، حیوان میں بھی موجود ہوتی ہے جو اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ اپنی زبان اور حلق کے ذریعہ آوازیں پیدا کر کے اپنے احساسات کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی صلاحیت، عقل کی جمالیاتی صفت ظرافت کے زیر اثر، صاف اور متوازن آوازیں پیدا کرتی ہے جو دوبارہ عقل کی صلاحیت کلیہ سادیا رائے کلی کی رہنمائی میں تقریر میں جاتی ہے۔ تقریر ایک وصف ہے اور یہ انسان کو حیوان سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ عقل اور تحریر کی مکمل کی صفت بشمول صفت ظرافت، فروع یا تابعہ اور یہ اپنی ترقی یافتہ شکل میں وصف فصاحت میں جاتا ہے۔

تقریر کی صلاحیت کے لازمی اجزاء اور اس کی ترقی یافتہ شکلیں فصاحت و دیانت یہ ہیں۔

الف۔ انسان کی نفسیاتی لطائف کا استحکام اور طاقت۔  
ب۔ اعنائے بدن کے صحت مند اور عام فرائض جو زبان کے کام اور متوازن و خوشگوار آوازیں، عام تقریر کی پیداوار کے لئے لازمی ہیں۔

ج۔ ذہن اور زبان کے فریضہ کے درمیان مستحکم تعلقی ایک مضبوط و مستحکم مزاج ایک ایسے ذہن کے ساتھ جو اپنی عقل پر مکمل قدرت رکھتا ہے، تقریر پیدا کرنے کے قابل ہو تب ہی ادراپنے آپ کو روانی اور صفائی کے ساتھ اظہار کرتا ہے۔ اسے شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں۔ ایک مضبوط اور عام آدمی کے معاملہ میں اس کی زبان اس کی قوت فکر اور شعوریت، دونوں ایک ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ وہ اسی تصور کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں۔

اللہ نے حیوانات کی اقسام میں، آواز کی صلاحیت اور شعوریت کی صلاحیت

درمیان ایک رشتہ پیدا کیا ہے لیکن انسان کے معاملہ میں اس نے اسے صاف و صریح تقریر سے متاثر کیا ہے اور اس میں عظیم تر توازن و تناسب بھی پیدا کیا ہے۔  
اس وصف کی شاہ ولی اللہ کی تعریف کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے۔ فصاحت یا صریح و رواں تقریر ذہن کی اس قوت میں ہوتی ہے جو نیلاآت کی صلاحیت پر سلسلہ قابو رکھتی ہے اور اسی دوران یہ زبان کے فعل کے لئے ہدایت دیتی ہے اور زبان کا فعل اسی وقت حل میں آتا ہے جب اس قوت فکر سے خیالات حاصل کرنے میں مصروف رہتی ہے۔ اسی طرح ان دو صلاحیتوں پر قابو پالنے کی کوشش کے ذریعہ جب کہ دونوں مستحکم و درست ہوں، تب ایک صاف و صریح اور بالذات اظہار کے ساتھ ایک سلسلہ زبان یا تقریر پیدا ہوتی ہے۔

ایک ایسا اظہار صرف اسی وقت خطیبانہ انداز یا موسیقی بن جاتا ہے جب یہ ایسے ذہن کا کام ہو جس میں نمایاں طور پر جمالیاتی ظرافت بھی شامل ہو۔ ایسے ذہن جو مستحکم جمالیاتی صفت، ظرافت کے حامل ہوتے ہیں۔ جیسا ریگنیز طہر پر موزوں الفاظ منتخب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، موقع و محل کے لحاظ سے مناسب طرز اظہار پسند کرتے ہیں اور ذہن کی لطافتوں و نزاکتوں کو فنکارانہ طور پر کام میں لانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

## وصف فصاحت کا جوہر

جن افراد کی لہائے میں تذکرہ بالا صفات نمایاں ہوتی ہیں اپنے ذہن میں صاف و صریح تقریر کا جوہر رکھتے ہیں جیسا کہ ہر قوم بڑی حد تک ہر دوسری قوم سے مزاج، تصور و استظہارات اور زبان میں مختلف ہوتی ہے اس لئے ہر قوم کی تقریر کے بہترین انداز کے معیار بھی دوسری قوم سے یقیناً مختلف ہوں گے ہر قوم میں ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو تذکرہ بالا قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور وہ صریح و رواں تقریر کی صلاحیت اور وصف فصاحت کے مالک ہوتے ہیں وہی باقی لوگوں کے لئے خطابت اور فصاحت کا معیار مقرر کرتے ہیں۔

جب وہ تفسیر کرتے ہیں تو وہ مناسب و موزوں الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں جو کانون کے لئے پرکشش اور ذہنوں کے لئے بھلے ہوتے ہیں ان کی تفسیر میں شکل میں عظیم اور لاپرواہی سے پاک ہوتی ہیں ان میں بناوٹ کا بھڑپن نہیں ہوتا ہے۔ اور وہ انتہائی مختصر ہوتی ہیں اور یہی ایک ایسا طریقہ بیان ہے جو لطیف اور قابل احترام ہوتا ہے یہ بات ذہن نشین رکھیں چاہیے کہ فصیح اور خطیبانہ تفسیر لازماً محض شعر و شاعری میں نہیں ہوتی جو غیر ضروری طویل ایک کے بعد دوسرے شعر کی شکل میں بیان ہوتی ہے۔ اور نہ ہی غیر ملکی الفاظ کے استعمال میں ہوتی ہے اور نہ ہی زبردہ ہم با تشبیہات کے آدھ اور مصنوعی استعمال سے ہوتی ہے جس سے کہ مقصد کا ذہن اور خیالات، ان تعنیفات متشرع ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف یہ اس وقت قابل تعریف ہو جاتی ہے کہ جب یہ سب فطری ہو اور ذہن کے مسلسل پہاڑ کی پیداوار ہو اور اس میں نمایاں طویل ہر جمالیاتی صفت ظرافت بھی شامل ہو۔

## تفسیر کی کمزوریاں خرابیاں

فصیح تفسیر کی پیداوار میں خرابیاں، ذہن کی اس حالت سے پیدا ہوتی ہیں کہ جب وہ صلاحیت فکر یا عمل زبان میں ناکام ثابت ہو۔

ذہن صلاحیت فکر پر قابو پانے میں ناکام رہتا ہے اور فصیح تفسیر پیش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں۔

(الف) دانشمندی کے وصف میں خرابی۔

اسی لئے ذہن تسلسل کے ساتھ غور و فکر کرنے میں ناکام رہتا ہے اور اگر وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہوتا ہے تو وہ ان موضوعات پر جن کے بارے میں اسے بولنے کے زیادہ گہرائی اور نمایاں طویل غور و فکر کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

(ب) وصف جرات میں خرابی۔

مثلاً تمقید یا بے عزتی کا خوف وغیرہ، ایک شخص کو علی الترتیب بولنے

سے باز رکھتا ہے اسی لئے وہ اپنی تفسیر کے دوران ہچکچاتا ہے اور لرزے لگتا ہے یا وہ مسلسل تفسیر کرنے میں ناکام رہتا ہے۔

(ج) خود نائی خود اعتمادی اور خود رائی کی کمی۔

مثلاً احساس کمتری یا شرم کا احساس یا شرم و حجاب، اسے مناسب الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے سے محروم کر دیتا ہے۔

ذہن صریح و رواں تفسیر کے لئے زبان پر اپنا غلبہ رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ اس کی حب ذیل غرایاں ہیں۔

(الف) زبان میں فعلی بد نظمیاں، مثلاً ہکھٹانا، غلط تلفظ اور تیز تیز بولنا۔

(ب) صوتی صلاحیت میں بد نظمی؛ مثلاً باریک اور تیز آواز، ہلکی آواز، روانی میں کمی اور آواز پر قابو پانے میں کمی واقع ہوتا۔

جب یہ دو صلاحیتیں، صلاحیت فکر اور صلاحیت آواز استعمال زبان مستحکم ہوتی ہیں تب ایک اور سبب ہو سکتا ہے جو کہ روانی تفسیر میں کمی یا خرابی پیدا کر سکتا ہے یہ ذہن کی عام کمزوری میں واقع ہوتی ہے جب وہ لگاتار دونوں صلاحیتوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر وہ ان دونوں پر ایک ہی وقت میں قابو پانے میں ناکام رہتا ہے تب ایک صریح و خطیبانہ تفسیر وجود میں نہیں آ سکتی۔

(مسئل)

# مسلمانوں کے ہاں علم ہیئت

محمد مسعود - ایم۔ ایس۔ سی

اس مضمون میں علم ہیئت و ریاضی پر ایک ساتھ بحث کی جائے گی۔ ایک تو اس لئے کہ ریاضی و دیگر طبیعیاتی (سائنسی) علوم کی طرح علم ہیئت کے متعلقہ مضامین سے بے اور دوسرے اس لئے کہ قرون وسطیٰ میں بے شمار ایسے سائنس دان گزرے ہیں جو علم ہیئت اور ریاضی دونوں ہی میں جہارت رکھتے تھے اور جنہوں نے دونوں ہی میں نمایاں دریافتیں کی ہیں۔

علم ہیئت جن چیزوں سے بحث کرتا ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں۔  
اجرام فلکی کا حجم۔ ستاروں کی بناوٹ اور ان کی تعداد اور حرکات ستاروں کے باہمی فاصلے وغیرہ۔ اس کے علاوہ اس علم میں ستاروں کی جدولیں مرتب کرنے اور کیلنڈر بنانے کے لئے ستاروں کی جدولیں تیار کرنے اور اسی قسم کے دوسرے امور سے بھی بحث کی جاتی ہے۔ فلکیاتی مشاہدات کا آغاز ظہور اسلام سے ہزاروں سال پہلے ہو چکا تھا۔ یونانیوں نے اور ان سے پہلے کلدانیوں نے اجرام فلکی میں گہری دلچسپی لی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند سورج اور ستاروں کا مشاہدہ کیا اور ان کو غروب ہوتا دیکھ کر خدا تعالیٰ کے وجود کے قائل ہو گئے۔ علامہ اقبال نے اس واقعہ کی طرف اپنے اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔

وہ سکوتِ شام صحرا میں غروب آفتاب

جس سے روشن تر ہوئی چشمِ جہاں بن خلیل



اہل عرب اجرام فلکی کے مشاہدے میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ یہ دلچسپی ایک تو اس لئے تھی کہ عرب کسی زمانہ میں قدیم کلدانیوں کی طرح اجرام فلکی کی پرستش کرتے تھے۔ اور دوسرا اس لئے کہ ریگستان عرب کے یہ باشندے عموماً رات کو سفر کرنے کے عادی تھے اور وہ اپنے سفر کی سمت ستاروں کی مدد سے متعین کر کے راستے کرتے تھے ریگستان میں آسان چونکہ صاف رہتا ہے اور ستارے خوب جگمگاتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے عربوں کو اجرام فلکی کا مشاہدہ کرنے کا بڑا اچھا موقع مل جاتا تھا۔ اس طرح اہل عرب کے اہل غیر محرم ستاروں سیاروں کی حرکات اور موسموں کے تغیرات کے بارے میں مقامی طور پر حاصل کیا ہوا کچھ نہ کچھ علم ضرور موجود تھا۔

قرآن کریم نے مختلف مقامات پر مختلف انداز سے چاند سورج اور ستاروں کا ذکر کیا ہے مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

هو الذي جعل الشمس ضياء والقمر نورا و قدره منازل لتعلموا عدد السنين والحساب ما خلق الله ذلك الا بالحق ط  
ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

والشمس تجرى لمستقر لها ذالك تقديرا العزيز العليم  
یہ زبردست اند جاننے والے کا انداز ہے

اور مقامات پر بھی چاند اور ستاروں کا ذکر قرآن کریم میں ملتا ہے۔

لہذا اسلام کے بعد مسلمانوں کو نماز کے اوقات معلوم کرنے میں نمازین قبلہ کی طرف مڑنے اور مساجد کی تعمیر کے لئے سمت قبلہ کے تعین کی ضرورت پیش آئی۔ اس مقصد کے لئے سورج اور ستاروں کے اوقات طلوع وغروب اور ان تمام مقامات کے طول البلد اور عرض البلد کا جاننا ضروری تھا۔ اس ضرورت نے مسلمانوں میں علم حدیث اور اس سے متعلق

علوم مثلاً طبی جغرافیہ اور ریاضی کے حصول کیلئے ایک مذہبی رحمان پیدا کر دیا۔ یہی جغرافیہ کے مطالعہ کا ایک اہم محرک مسلمانوں کے دورِ دراز کے عیسائی اور بحری سفر تھے جو ان کو تجارت، سیاحت، جہاد، حج انتظام سلطنت اور دوسرے امور کی بناء پر کرنا پڑتے تھے۔ ان سفروں میں رہنمائی کے لئے ان کو ستاروں کے نقشوں کی ضرورت پیش آتی تھی۔ مسلمان ماہرینِ مہیت کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ زمین پر ہونے والے واقعات اور انسان کے مستقبل اور اس کی قسمت پر اجرامِ فلکی کا اثر پڑتا ہے وہ علم جو اس قسم کے اثرات سے بحث کرتا ہے۔ علمِ احکامِ النجوم کہلاتا ہے۔ علمِ مہیت کی ایک شاخ کی حیثیت سے اس علم کا مطالعہ قدیم بابلویوں نے شروع کیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے چند صدیوں پہلے یونان اور روم میں بھی اس کا مطالعہ کیا گیا۔ ہندو چین اور مصر میں بھی اس کو کافی ترقی دی گئی۔

ساتویں صدی عیسوی سے سترھویں صدی عیسوی تک اس علم نے مسلمانوں کے ذریعہ فروغ پایا بعد ازاں اس کی ترقی یورپ میں ہوئی۔ چودھویں اور پندرہویں صدی میں ماہرینِ نجوم یورپی ممالک کے بادشاہوں پر گہرا اثر رکھتے تھے۔ بعض مسلمان حکمران مثلاً خلیفہ ماموں الرشید بھی اس کے قائل تھے۔ آج ہندوستان اور دینیکے بعض دوسرے ممالک میں اس علم کے بہت سے لوگ دلدادہ ہیں۔

اسلام نے اجرامِ فلکی کے مذکورہ بالا اثرات کی تردید کی ہے۔ ارشادِ نبوی ہونے میں مدد دی ہے کہ جس نے ستاروں پر یقین کیا اس نے گویا کفر کیا۔ صیح العقیدہ مسلمان ان اثرات کے کبھی قائل نہیں ہوئے۔ قرطبہ (اسپین) کے ایک مسلمان عالم ابنِ حزم فرماتے ہیں کہ اجرامِ فلکی جن کے اختیارات اتنے محدود ہیں کہ وہ ایک خاص قسم کی حرکت یعنی دہری حرکت کے علاوہ کسی اور قسم کی حرکت پر بھی قادر نہیں۔ وہ بھلا کسی دوسرے کی قیمت پر کیسے اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ امام ابنِ حزم کی رائے میں ستاروں کا اثر زیادہ سے زیادہ اس نوعیت کا ہو سکتا ہے جیسے آگ کا اثر اشیاء کے جلانے اور سورج کا اثر ان کو گرمی پہنچانے کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صرف طبعی اثرات ممکن ہیں۔ اس کے علاوہ خبر بات بھی

اس کے شاہ ہیں کہ نجومیوں کی اکثر پیش گوئیاں بالکل غلط ثابت ہوتی ہیں۔ مفسر یہ کہ علم نجوم کے نظریات کی تصدیق نہ تو شریعت سے ہوتی ہے اور نہ عقل اور تجربہ ہی سے بعض اموی حکمرانوں نے علم ہیئت و نجوم میں دلچسپی لی خالد بن یزید بن معاویہ نے طب نجوم اور کیمیا کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا۔ اس نے کسی طرح بطلمیوس کا کمرہ بھی حاصل کر لیا تھا جو بعد میں فاطمیہ مصر کے پاس پہنچا۔ یہ کمرہ تانبے کا بنا ہوا تھا۔ خلیفہ عبدالملک بن مروان کو بھی اس علم سے دلچسپی تھی۔ علم ہیئت و ریاضی کا باقاعدہ مطالعہ آٹھویں صدی کے دوسرے نصف میں دوسرے عباسی خلیفہ منصور کے زمانے میں بغداد میں شروع ہوا۔ اس کے بعد دوسرے مسلمان حکمرانوں خصوصاً ساتویں عباسی خلیفہ مامون کی سرپرستی اور فیاضی نے ہیئت و ریاضی سے متعلق ہر قسم کی تحقیقات کو فروغ دیا۔ ان علوم میں لکھی ہوئی سنسکرت فارسی اور یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا گیا اور حکمرانوں اور عوام کی طرف سے اسلامی دنیا میں مختلف مقامات پر فلکی مشاہدات کے لئے رصد گاہیں قائم کیں۔

عام مسلمانوں کی طرف سے علم ہیئت اور ریاضی کے مطالعہ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ان علوم میں مسلمان ماہرین کی تعداد حیران کن حد تک بڑھ گئی۔ اور اسلامی دنیا کے مختلف حصوں خصوصاً بغداد میں ان علوم کے ماہرین کا ایک بہت بڑا گروہ جمع ہو گیا۔ گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں ان علوم کی ترقی اندلس و اسپین میں ہوئی۔ جہاں ان پر عظیم الشان تحقیقات کی گئیں۔

مسلمانوں نے قدیم یونانی آلات کو بہتر بنایا اور نئے آلات ایجاد کئے۔ ان کی رصد گاہوں میں ہمیشہ صحیح قسم کے آلات نصب کئے جلتے تھے جو ان یونانیوں کے بنائے ہوئے آلات سے اور ان آلات سے جو پندرہویں صدی میں مشہور نورمبرگ فیکٹری میں تیار کئے جاتے تھے بدرجہا بہتر تھے۔ آلات کی صحت و پائیداری اور ان کے حصوں کی صحیح تقسیم وغیرہ پر ان کی خاص توجہ ہوتی تھی۔ اچھے آلات ہیئت تیار کرنے والے کاریگر علماء ہیئت کی نگاہ میں بڑی وقعت رکھتے تھے۔ ایک نہایت فاضل ماہر ہیئت ابن یونس نے اسطرلاب اور دیگر یونانی آلات تیار کرنے والے دو مشہور کاریگروں حامد اور سعد ابن علی کا مقابلہ

یونان کے حکماء بطلمیوس اور جالینوس سے کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان اپنے آلات کی تیاری کو کس قدر اہمیت دیتے تھے۔

صرف آفات ہی کی صحت کا نہیں بلکہ مشاہدات اور صاب کتاب کے ذریعہ نتائج اخذ کرنے میں بھی صحت کا مدد و خیال رکھا جاتا تھا۔ خواہ اس پر کتنا ہی دقت کیوں نہ صرف کرتا پڑے۔ ان کی تحقیقات کبھی کبھی پچاس پچاس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک جاری رہتی تھیں۔

مسلمانوں نے یونانی ہیئت ریاضی والے بطلمیوس کے ہیئت جداول اور اس کی پیمائشوں کو جو اس کی کتاب الجسطی میں مذکور تھیں بعینہ قبول نہیں کیا۔ انہوں نے صرف کائنات کے متعلق اس کے نظریات کو وقت و طور پر تسلیم کیا تاکہ ان کی بنیاد پر ہیئت تحقیقات شروع کی جاسکیں۔ مسلمانوں نے اپنی رصدگاہوں میں خود ہیئت مشاہدات کئے اور اجرام فلکی کی پیمائشیں امتیاز سے مطالعہ کئے کہ نہ صرف بطلمیوس کے ہیئت جداول کی تصحیح کی بلکہ خود بھی اس قسم کے بہت سے جداول تیار کئے۔ نئے مشاہدات کی بناء پر مسلمان ماہرین ہیئت کی طرف سے الجسطی پر تنقید کی گئی۔ اس سخت تنقید نے یورپ کے مشہور ہیئت دان کوپرنیکس کو شمسی نظام پیش کرنے کے لئے کافی مواد مہیا کر دیا۔ نظام کائنات کے بارے میں یونانی حکماء کے دو مختلف نظریات تھے۔ ایک نظریہ بطلمیوس کا تھا جو زمین کو کائنات کا مرکز اور باقی تمام اجسام کو اس کے گرد گھومتا ہوا مانتا تھا۔ دوسرا نظریہ فیثاغورث کا تھا وہ اس بات کا قائل تھا کہ سورج کائنات کا مرکز ہے۔ اعدادی اجرام اس کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ مسلمان ماہرین ہیئت میں زیادہ تعداد بطلمیوس نظام کو نئے والوں کی تھی۔ لیکن صدیوں کی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ بطلمیوس نظام صحیح نہیں ہے۔ انہوں نے اس نظام پر تنقید کرتے ہوئے بہت سی کتابیں لکھیں۔

ہیئت دریاہی پر تحقیقات کا یہ سلسلہ صدیوں تک جاری رہا اور گیارہویں صدی کے اختتام تک تقریباً تمام حقیقی اور تخلیقی کام مسلمانوں ہی نے کیا۔ اس عرصہ میں غیر مسلموں نے کچھ کام کیا بھی تو وہ بھی اسلامی ممالک ہی میں کیا اور اپنی کتابیں عربی زبان ہی میں لکھیں

بارہویں صدی میں عیسائیوں اور یہودیوں نے عربی سے لاطینی اور عبرانی زبانوں میں ترجمہ کا آغاز کیا اور سائنس کے ان شعبوں میں تحقیقات شہرہ رکھیں۔ لیکن تیرہویں صدی کے اختتام تک عیسائی اور یہودی کوئی ایسا کام نہ کر سکے جو مسلمانوں کی تحقیقات کے مقابلے میں پیش کیا جاسکے۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ بارہویں صدی میں جب کہ بطلمیوس کی کتاب الجملی پر مسلمانوں کی طرف سے سخت تنقید کی جا چکی۔ اس وقت یورپ میں الجملی کاملاً شہرہ رکھ گیا تھا۔

نہایتی جہادوں کے علاوہ مسلمانوں نے سادہ کیسے بھی تیار کئے جن پر ستاروں کا عمل وقوع اور راہ سفر درج ہوتے تھے۔ یہ کیسے یونان کے تھیل کی پیداوار ہیں لیکن بطلمیوس کے زمانے سے ان کا سلسل ارتقا ہوتا رہا ہے سلمان ماہرین ہیئت دریا منی نے بہت سی تحقیقات اور نئی دریافتیں کیں۔ انہوں نے نہ صرف ہیئت دریا منی کے مختلف شعبوں پر کتابیں لکھیں بلکہ ایسی کتابیں بھی مرتب کیں جو ان علوم کے تمام شعبوں کو حاوی تھیں مثلاً البیرونی کی کتاب القانون المسعودی، علوم ہیئت دریا منی کی ایک جامع کتاب ہے اور ان سیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے ان کتابوں کا عربی سے عبرانی لاطینی اور یورپ کی مقامی زبانوں میں ترجمہ ہونے وقت بے شمار نئی اصطلاحات ان زبانوں میں منتقل ہو گئیں یہ اصطلاحات عربی الفاظ و اصطلاحات کی ہلی ہوئی تشکیل تھیں اس طرح بہت سے ستاروں کے عربی نام محرف شکل میں ان زبانوں میں آ گئے۔

شعبہ ریاضی میں بھی مسلمانوں کی ترقی کچھ کم نہیں۔ مسلمانوں نے رقوم لکھنے کے لئے اعداد کو جن میں صفر بھی شامل ہے رواج دیا۔ درہ اس سے پہلے عام طور پر یا تو وہ الفاظ میں لکھی جاتی تھیں یا حروف ابجد سے ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ اعداد کی ترمیم کے بعد حساب سادہ اور سہل ہو گیا اور تجارت جہاں اعداد وراثت کی تقسیم سے متعلق روزمرہ کے مسائل حل کرنے میں آسانی ہو گئی۔ اعداد کے نظام میں صفر کو ایک بنیادی اہمیت حاصل ہے صفر کے بغیر وقت یہ ہوتی ہے کہ ہر عدد کو اس کے مقام پر رکھنے کے لئے ایک ایسے جدول کا استعمال کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جس میں اکائیوں، دہائیوں اور سیکڑوں وغیرہ

کے خاتمے بنائے گئے ہوں۔ ایسے جدول کو ایبیکس کہتے ہیں۔ اہل مغرب کو صفر کا علم اس وقت ہوا جب کہ مسلمان اس کو کئی صدیوں تک استعمال کر چکے تھے صفر کے لئے لاطینی لفظ صفر عربی زبان ہی سے لیا گیا ہے۔ عربی زبان میں صفر کے معنی خالی ہونے یا کچھ نہ ہونے کے ہیں مسلمانوں نے روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل خاص کر دہشت کی تقسیم اور تجارتی حساب پر کتابیں بھی مرتب کیں۔

اہل یورپ نے اعداد کا استعمال عربوں ہی سے سیکھا ہے۔ اس لئے وہ ان کو عربی اعداد کہتے ہیں۔ اہل عرب نے ان کو ہندی اعداد کا نام دیا ہے۔ کچھ مترجمین نے لفظ ہندی کا ترجمہ ہندوستانی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ اعداد دراصل ہندوستان سے عرب میں پہنچے لیکن لفظ ہندی کا یہ ترجمہ صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ لفظ ہندی کبھی کبھی لفظ ہندی کے بجائے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ ہندی اعداد کا مطلب ریاضی کے اعداد بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً علم ہیئت میں ایک اصطلاح ہے جس کو دائرہ ہندی کہتے ہیں۔ وہاں دائرہ ہندی سے مراد ہندی دائرہ یا ریاضی کا دائرہ ہے۔

یورپ میں عربی اعداد نے بہت آہستہ آہستہ رواج پایا۔ عیسائی ریاضی دان یا تو رومن اعداد اور ایبیکس والی جدول استعمال کرتے تھے یا عربی اعداد کو اپنے رومن اعداد یا ایبیکس کے ساتھ ملا کر استعمال کرتے تھے۔ بارہویں صدی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ مغربی علماء نے عربوں سے سیکھ کر بغیر قانون کے اور صفر سے مکمل کئے ہوئے نظام اعداد پر کچھ لکھنا شروع کیا۔ لیونارڈو آف پیزا نے مسلمانوں کے علاقوں میں سفر کر کے اور عربی نظام اعداد کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک کتاب شائع کی جو یورپ میں عربی نظام اعداد کی ترویج کا سبب بنی اعداد کے اس نظام کو یورپ میں (الگورز) کا نام دیا گیا الگورزم لاطینی زبان میں لکھنے والوں نے لفظ الخوارزمی کو بگاڑ کر بنالیا ہے۔

الخوارزمی ایک مشہور ماہر ہیئت و ریاضی اور جغرافیہ دان تھا۔ اس کا پورا نام محمد ابن موسیٰ الخوارزمی تھا۔ یہ سائنس دان خوارزم کا رہنے والا تھا۔ اس لئے خوارزمی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نام کو یورپ میں اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ وہاں

کی پست سی زبانوں میں شامل ہو گیا۔ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک علم الاعداد کو لاطینی زبان میں لکھنے والے انگوندم کہتے تھے۔ ہسپانوی زبان میں اس کو گورڈر زمو کہا جاتا تھا۔ انگریز شاعر چوسر نے صفر کو اوگرم کا نام دیا ہے۔

الجبراء کو مسلمانوں نے ایک مستقل سائنس کی حیثیت دی الجبراء کی اصطلاح الخوارزمی نے جو اس سائنس کا موجد خیال کیا جاتا ہے، بنائی۔ اس نے اپنی کتاب کا نام جو اسی مضمون پر لکھی ہے کتاب الجبر والمقابلہ رکھا۔ جبر کے معنی کسی کمی کو پورا کرنے کے ہیں۔ اصطلاحاً ایک مقدار کو کسی دوسری مقدار میں جمع کرنے یا ایک مقدار کو دوسری مقدار سے اس طرح ضرب دینے کو کہ حاصل ضرب کسی دوسری مقدار کے برابر ہو جائے جبر کہا جاتا ہے۔ لفظ مقابلہ مساوات کی دونوں اطراف کے موازنہ کے لئے استعمال ہوتا ہے مثلاً  $4 + 3 = 5$ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ جبر شرط و شروط میں انہیں دوسادہ اعمال یعنی جمع اور ضرب کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ لیکن بعد میں یہ پورے مضمون کا نام بن گیا۔

مسلمانوں نے تحلیلی ہندسے اور سادہ اور کردی علم المثلثات کی بھی بنیاد ڈالی۔ علم المثلثات تین کونوں والی اشکال سے بحث کرتا ہے۔ اگرچہ ان مثلثوں کے اصطلاح یا زاویوں کی کچھ مقداریں معلوم ہوں تو اس سے بقیہ مقداریں بھی معلوم ہو سکتی ہیں اس علم سے جہاز رانی اور علم الہیت وغیرہ میں کام لیا جاتا ہے۔ علم المثلثات اپنے ارتقاء کے ابتدائی دور میں علم الہیت کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ تیرہویں صدی میں جب کہ اس میں کافی ترقی ہو گئی تو اس کو ریاضی کے ایک مستقل شعبہ کی حیثیت دے دی گئی۔ علم الہیت اور ریاضی میں ترقی کا ایک بڑا سبب ہندوستان کی سنسکرت زبان میں لکھی ہوئی الہیت و ریاضی کی ایک کتاب بنی جس کا نام سدھانتا تھا اور جس کو عربی میں سنہ ہند کہتے ہیں۔ یہ کتاب ہندو میں کنکنا نامی ایک ہندو نے کرا یا تھا کنکا کی ملاقات ۱۶۷۷ء میں اس زمانے کے ایک بہت بڑے ماہر الہیت یعقوب بن طارق سے ہوئی۔ یعقوب نے کنکا کا تعاون دوسرے عباسی خلیفہ منصور سے کرا یا کنکا نے یہ کتاب خلیفہ کو

دکھائی۔ خلیفہ نے محمد ابن ابراہیم الغزالی کو حکم دیا کہ وہ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کیجے۔ اس نے یہ بھی حکم دیا کہ سدھانتا کو اصل قرار دے کر ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس کو عرب حوالے کے لئے استعمال کر سکیں۔ محمد ابن ابراہیم نے اس کام کی ذمہ داری لے کر ایک کتاب تیار کی جس کو ماہرین ہیئت نے سندھ ہند کبیر یعنی بڑی سدھانتا کا نام دیا۔ خلیفہ امون کے دور تک اس کتاب کا استعمال رہا۔ پھر محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے جو ہیئت و ریاضی کے عظیم ترین ماہرین میں سے تھا اور ساتھ ہی جغرافیہ داں بھی، اس کو مختصر کیا اس نے ہندوستان، ایران اور یونان کے طریقوں کو ملا کر ہیئت اور علم النشآت سے متعلق جداول بھی تیار کئے۔ ان جداول پر مسلمہ الجبریل نے دسویں صدی کے نصف آخر میں نظر ثانی کی۔ یہ جداول اتنے زیادہ مقبول ہوئے کہ چین میں بھی ان کو استعمال کیا گیا۔ بارہویں صدی میں ان جداول کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔

الخوارزمی نے ہندوستانی اور یونانی علوم حاصل کئے اور اپنی حساب کی کتاب کے ذریعہ (جس کا ترجمہ بعد میں لاطینی میں ہوا) اہل عرب اور اہل یورپ کو ہندی نظام اعداد سے متعارف کرایا۔ ریاضی پر اس کے اثرا ت قرون وسطیٰ کے کسی اور مصنف کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ اس نے ایک دائرۃ المعارف مرتب کیا جس میں حساب، ہندسہ، موسیقی اور ہیئت سے بحث کی گئی ہے۔ الخوارزمی نے ایک کتاب ایسی لکھی ہے جو ہندی اعداد کے ماخذ سے بحث کرتی ہے۔

اپنی الجبر کی کتاب میں جن کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے، الخوارزمی نے سب سے پہلے درجہ دوم کی مساوات سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد ضرب تقسیم کے طریقوں کو بیان کیا کیلئے۔ اس میں سطحی کی پیمائش سے بھی بحث کی ہے۔ کتاب کا ایک حصہ مراشت کے مسائل سے بھی بحث کرتا ہے۔ درجہ اول کی مساوات کو اعداد کی مثالوں سے بیان کیا ہے۔ الخوارزمی کی بیان کردہ مساواتوں کا اعادہ بعد کے مصنفین نے بھی کیا ہے۔ لیونارڈو آف پیا صیر دوم کی مساواتوں کی وہی چھ قسمیں الخوارزمی کی طرح کرتا ہے۔ ایک اور ماہر ہیئت یعقوب ابن طارق نے سدھانتا سے اخذ کردہ جداول پر ایک یادداشت تحریر کی



ابراہیم ابن جیب الغزالی پہلا مسلمان ہیئت وال تھا جس نے اصطلاح بنائے۔ اس نے علم نجوم پر ایک قصیدہ لکھا اور عربوں کے طریقہ پر ایک زیچہ مرتب کی۔ اس نے اصطلاحوں کے استعمال پر اور کمرے پر بھی رساں مرتب کئے۔

۳۵-۳۴ء میں ایک ایرانی ماہر ہیئت اور مہندس نوبخت نے اشار اللہ کے ساتھ مل کر وہ پیمائشیں کیں جو تعمیر بغداد کے ابتدائی مراحل میں سے تھیں۔ اشار اللہ متوفی ۱۹۹ء یا ۲۰۲ء، قدیم ترین مسلمان ماہرین ہیئت و نجوم میں سے تھا۔ اس نے خلیفہ منصور کی سرپرستی میں ترقی کی۔ نوبخت متوفی ۳۵۹ء یا ۳۶۰ء خلیفہ کا بنم تھا اس نے علم نجوم پر ایک کتاب لکھی جس کا نام کتاب الاحکام ہے۔ اس کا بیٹا الفضل جو خلیفہ یارون الرشید کا چیف لائبریریئر تھا۔ ہیئت وال تھا۔ اس نے مختلف معانی پر ہیئت سی کتابیں مرتب کیں۔

خلیفہ المامون دور حیات ۳۵۹ء سے ۳۶۸ء کے زمانے میں بطلمیوس کی کتاب الجھلی کے ترجمہ کا اہم کام مکمل ہوا۔ خلیفہ اس کتاب کی تصحیح اور ترجمہ کے لئے بہت بے چین تھا۔ اس کتاب کا کئی بار ترجمہ کیا گیا۔ اس کی بہت سی شرحیں بھی لکھی گئیں۔ اس کے بہت سے اختصارات بھی تیار کئے گئے۔ وزیر یحییٰ ابن خالد برکی پہلا شخص تھا جس نے اس کا ترجمہ کرایا۔ علماء کی ایک جماعت نے اس کے لئے اس کتاب کی ایک شرح لکھی۔ لیکن اس کو یہ شرح پسند نہیں آئی۔ اس نے ابوحن اور سلیمان کچھ حوالہ لکھتے سے منسلک تھے اس کی ایک شرح لکھنے کے لئے کہا۔

خلیفہ المامون سائنس اور فلسفہ کا بہت دلدادہ تھا۔ اس کے عہد میں ہیئت کی تحقیق و تفتیش کے لئے رصدگاہیں بنائی گئیں۔ ان رصدگاہوں میں الجھلی کی سیادت مثلاً میلان شمسی۔ شمسی سال کی لمبائی۔ استواء اعتدالین وغیرہ کی جانچ پڑتال کی گئی۔ آسانی حرکات کے متعلق بھی مشاہدات کئے گئے۔ ادارہ پیمائشیں بھی کی گئیں۔ مامون نے احمد، محمد اور جن کو جو ممتاز سائنسدان اداس کے درباری تھے حکم دیا کہ وہ دو سو ستر ماہدانوں کے ساتھ مل کر کسی وسیع میدان میں درجہ ارضی کی پیمائش کریں اور زمین کا محیط معلوم کریں۔ اس

مقعد کے لئے شجر اور تھمر کے میدانوں کا انتخاب کیا گیا۔ ماہرین ہیئت نے ایک خاص جگہ ٹھہر کر آلات کی مدد سے قطب شمالی کا ارتفاع معلوم کیا اور وہاں ایک کھوئی گاڑ دی پھر اس کھوئی سے رسی کا ایک سہا باندھ کر اس رسی کو شمال کی جانب لے کر چلے جہاں یہ رسی ختم ہو گئی وہاں ایک اور کھوئی گاڑ دی اور اس سے دوسری رسی باندھ کر اسی سمت میں آگے بڑھتے گئے انہوں نے یہ عمل جاری رکھا اور وقتاً فوقتاً قطب شمالی کا ارتفاع بھی دیکھتے رہے یہاں تک کہ ایک مقام پر انہوں نے دیکھا کہ قطب شمالی کا ارتفاع ایک درجہ بڑھ گیا ہے۔ اب جتنا فاصلہ اس مقام تک طے ہوا تھا اس کی پیمائش کی گئی۔ یہ فاصلہ ۵۶ میل نکلا۔ یہی عمل جنوب کی سمت میں بھی کیا گیا یہاں تک کہ ایک مقام پر انہوں نے دیکھا کہ ارتفاع ایک درجہ کم ہو گیا۔ اب پھر فاصلہ کی پیمائش کی گئی تو وہی نکلا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا گیا کہ درجہ کے مقابل زمین کی لمبائی ۵۶ میل ہے اس فاصلہ کو ۳۶۰ سے جو کہ درجوں کی کل تعداد ہے، ضرب دیا گیا تو زمین کا محیط ۲۰۴۰۰ میل نکلا۔ اس کے بعد قطر معلوم کیا گیا تو وہ ۶۵۰۰ میل نکلا۔

ان سب ماہرین ہیئت کا سربراہ جنہوں نے مامون کی سرپرستی میں ہیئت مشاہدات کے مسند ابن علی تھا۔ یہ ایک یہودی تھا جو بعد میں مشرف باسلام ہو گیا۔ بغداد میں معزالدولہ کے محل کے عقب میں شمسہ دروازے پر اس نے ایک رصد گاہ قائم کی تھی۔ ایک نیکی چہرہ اور علم ہیئت اور ریاضی پر کچھ تحریریں اس کی طرف منسوب ہیں۔ علی ابن یحییٰ الاصطربلائی نے جو ان پیمائشوں میں جو المامون کے حکم سے کی گئیں مسئلہ ۳۱ سے مسئلہ ۳۲ تک بغداد اور دمشق میں ہیئت مشاہدات کئے۔ وہ اصطربلائی کا بہترین متاع تھا۔ اس لئے اس کو اصطربلائی کہا جاتا ہے اس نے اصطربلائی پر ایک رسالہ بھی لکھا ہے۔

یہی ابن ابی منصور نے بھی بغداد میں کئے جانے والے ہیئت مشاہدات میں حصہ لیا اور جہاد مامون کے نام سے ہیئت جہاد مرتب کئے۔ یہی نے ہیئت کی بہت سی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔

ایک اور ماہر ہیئت الماروردی نے بھی مامون کی سرپرستی میں نام پیدا کیا

اس نے شمسی مشاہدات کے اس کے پوتے نے المیٹھ کے نام سے اصطلاح پر ایک کتاب لکھی۔

نویں صدی عیسوی میں علم ہیت نے شرق میں خوب فروغ پایا۔ بغداد۔ دمشق۔ اور دیگر مقامات پر یونانی مشاہدات کئے گئے۔ زیادہ اعلیٰ تحقیق اور اہم کام اس صدی کے نصف آخر میں ہوا۔ ان ماہرین ہیت نے علم المثلثات میں جن کو علم ہیت کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ خصوصی دلچسپی لی اور اس کو آگے بڑھایا۔ ریاضی دانوں کی تعداد نمایاں حد تک بڑھ گئی۔ ان میں سے بعض نے حساب اور بعض نے هندسہ میں خصوصی مہارت پیدا کی۔ اس زمانے میں اعداد کا استعمال عام ہو گیا۔ عام ہونے کی وجہ یہ بھی ہوئی کہ مسلمانوں کی تجارت اس وقت دنیا کے دور دراز حصوں تک پھیل گئی تھی اور کثرت کے ساتھ تجارت کے ان حصوں تک جانے کی دہر سے وہاں کے لوگ بھی ان اعداد سے روشناس ہو گئے۔



کسانی اپنے دور کے علماء میں بلند مرتبہ کے مالک ہیں۔ وہ کوفہ کے نحو کے ائمہ کے شیخ ہیں اور دنیا کے سات مشہور قراء میں سے ایک ہیں۔ اوائل دور میں عربی قواعد کی تائیس میں آپ کا بڑا حصہ ہے۔ مشہور یہ ہے کہ کسی نے کوفہ میں تربیت پائی اور وہیں علماء میں مرکزِ صدارت کو حاصل کیا۔ پھر بغداد چلے آئے جہاں اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ خلیفہ ہمدانی نے اس کے علمی مقام کو پہچانا اور اپنے بیٹے رشید کی تعلیم اور تربیت کے لئے ان کو مقرر کیا اور جب رشید تختِ خلافت پر فائز ہوئے تو انہوں نے اپنے دونوں صاحبزادوں ایتن اور ماتن کی تربیت اور تعلیم کے لئے امام کسی کو مقرر فرمایا۔

# حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سیاسی حالات

ابو سلمان شاہ چہانپوری

(۳)

اس سے پہلے مضمون میں ہم نے عہد شاہ ولی اللہ کے سیاسی حالات کی جو کہانی سنائی تھی، اس کی ترتیب میں تاریخ کے عام کتابوں، ”مذکورہ اور دیگر مضامین سے کام لیا گیا تھا۔ آج کی محبت میں ہم اس حکایت خوشگام اور اس عہد فن کے سیاسی حالات کو حضرت شاہ صاحب ہی کے الفاظ میں بیان کرنا چاہتے ہیں۔ شاہ صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے وہ کتابی مطالعہ و تحقیق کا حاصل نہیں بلکہ اسی عہد اور ان حالات کی کہانی ہے جس میں وہ خود موجود تھے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کا ذاتی مشاہدہ اور آنکھوں دیکھا حال ہے بلکہ بعض حالات و واقعات کے بیان کو ان کی آپ بیتی قرار دیا جاسکتا ہے۔

## حضرت شاہ صاحب کے قبل ہندوستان کی سیاسی تقسیم

امیر شاہ اہالی کے نام ایک خط میں حبیب حضرت شاہ صاحب نے اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تو اسے ہندوستان کی سابقہ سیاسی تقسیم اور حالات بھی تحریر فرمائے تاکہ اسے حالات کے صحیح پس منظر میں شاہ صاحب کے عہد کے حالات سمجھنے اور صحیح فیصلہ

تک پہنچنے میں آسانی ہو۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”جاننا چاہیئے کہ ملک ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ قدیم اسلامی بادشاہوں نے بڑی مدت میں بڑی جدوجہد کے بعد کئی دفعہ میں ہاکمر اس ولایت کو فتح کیا ہے۔ علاوہ دہلی کے جو صاحب اقتدار بادشاہوں کا متقرر رہی ہے۔ ہر علاقہ میں علیحدہ علیحدہ فرمانروائے مثلاً گجرات، احمد آباد کا علاقہ ایک علیحدہ حکمران سے تعلق رکھتا تھا۔ ٹمٹھ کا دوسرا بادشاہ تھا۔ بنگالہ ایک اور حاکم کے زیر حکومت تھا۔ اودھ جدا ایک شخص کے زیر اقتدار تھا، جن کو سلطان الشرق یعنی یورپ کا بادشاہ کہتے تھے۔ ملک دکن پانچ حبیبی سلطنتوں کا مجموعہ تھا۔

۱۔ برہان پور۔ ۲۔ ہزار۔ ۳۔ اورنگ آباد، لم حیدر آباد اور ۵۔ بیجا پور۔ ان پانچ سلطنتوں میں سے ہر سلطنت ایک جداگانہ مستقل بادشاہ تھا۔ مالوہ کا بھی حکمران علیحدہ تھا اور ان تمام مذکورہ علاقہ جات میں سے ہر ایک علاقہ کا بادشاہ مستقل طور پر صاحب فوج اور صاحب فرائض ہوتا تھا۔ ہر ایک بادشاہ نے اپنی اپنی ملکیت میں مسجدیں تعمیر کرائیں، مدرسے قائم کئے۔ عرب و عجم کے مسلمان اپنے اپنے وطنوں سے منتقل ہو کر ان علاقوں میں آئے۔ اور یہاں اسلام کی ترویج و اشاعت کا باعث بنے۔ اس وقت تک ان لوگوں کی اولاد اسلام کے طور طریقے پر قائم ہے۔ ایک اور ملک بھی ہے جو کبھی کسی بادشاہ اسلام کے قبضہ میں نہیں آیا اور وہ اپنے قائل غیر مسلمان طریقہ برپا کرتا رہا۔ اتنا ضرور ہوا کہ بادشاہ ان راجاؤں سے جو ان کے معد میں تھے، خراج لیا کرتے تھے۔ یہ ملک جس کا تذکرہ ہو رہا ہے، راجپوتانہ کا ملک ہے۔ اس ملک کا طول مدد ٹمٹھ سے لے کر مدد بنگالہ و بہار تک چالیس منٹریل ہے۔ (اور عرض دہلی و آگرہ سے لے کر گجرات و امین کی مد تک چس منٹریل ہے یہی وہ بادست ملک ہے جو کبھی ملوک اسلامیہ کی نشست گاہ نہیں بنا۔ قصہ مختصر بادشاہان مغلیہ نے راجپوتوں سے معاہدہ کر لیا اور اس مگر وہ کو اپنا ماتحت قرار دے کر ان کی مخالفت سے مامون و محفوظ ہو گئے۔ اور جنگ سے دست کشی اختیار کر لی۔

اس سیاسی پس منظر کے ضروری حد تک بیان کے بعد مرہٹوں اور ہانٹوں کے مظالم بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان کا امن تہ و بالا ہو گیا تھا عوام جن کی لوٹ کھسوٹ سے لبرہ براہ نام دہتے تھے اور ہندوستان کی مسلمان حکومت جن کے مظالم کے استیصال سے عاجز تھی۔ مرہٹوں کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”غیر مسلموں میں ایک قوم مرہٹہ نامی ہے کہ ..... ان کا ایک سردار ہے اس قوم نے کچھ عرصے سے اطراف و کن میں سر اٹھایا ہے اور تمام ملک ہندوستان پر اثر انداز ہے شاہان مغلیہ میں سے ہمسے کے بادشاہین نے عدم دودا اندیشی، غفلت اور اختلاف فکر کی بنا پر ملک گجرات مرہٹوں کو دے دیا۔ پھر اسی سست اندیشی اور غفلت کی وجہ سے ملک مالوہ بھی ان کے سپرد کر دیا۔ اور ان کو وہاں کا صوبہ دار بنا دیا۔ رفتہ رفتہ قوم مرہٹہ قوی تر ہو گئی اور اکثر بلاد اسلام ان کے قبضہ میں آ گئے۔ مرہٹوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں سے باج لینا شروع کر دیا اور اس کا نام چوتھ دیغنی آمدنی کا چوتھا حصہ رکھا۔

دہلی اور نواح دہلی میں مرہٹوں کا تسلط اس وجہ سے نہ ہو سکا کہ دہلی کے روسا بادشاہان قدیم کی اور یہاں کے وزراء اور امرائے امرائے قدیم کی اولاد ہیں۔ ناچار مرہٹوں نے ان لوگوں سے یک گوئہ مروت کا معاملہ رکھتے ہوئے عہد و پیمان کر لیا۔ اور رواداری کا سلسلہ جاری کر کے طرح طرح کی چال پلوس سے دہلی والوں کو اپنی طرف سے امن وامان دے کر چھوڑ دیا۔ دکن پر بھی مرہٹوں کا قبضہ اسی بنا پر

---

”بہ بقیہ حاشیہ، اس مضمون میں شاہ صاحب کے مکاتیب کے تمام اقتباسات شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات، ”مرتبہ فلیق احمد نظامی سے لئے گئے ہیں۔

نہ ہو سکا کہ نظام الملک مرحوم کی اولاد نے بڑی بڑی تدبیریں کیں۔  
 کبھی مرہٹوں کے درمیان میں پھوٹ ڈلوادی، کبھی انگریزوں کو اپنا  
 رفیق بنالیا اور برطان پور، اورنگ آباد، بیجا پور جیسے بڑے بڑے  
 شہروں پر اولاد نظام الملک قابض رہی، البتہ اطراف و نواحی کو  
 مرہٹوں کے لئے چھوڑ دیا۔ المنتصر سوائے دہلی و کن کے خالص طور  
 پر مرہٹوں کا تسلط ہے۔ قوم مرہٹہ کاشکست دینا آسان کام ہے۔  
 بشرطیکہ غازیان اسلام کرمحت باندھ لیں۔ حقیقت یہ ہے کہ  
 قوم مرہٹہ خود قلیل ہیں لیکن ایک گروہ کثیران کے ساتھ ملا ہوا ہے۔  
 اس گروہ میں سے ایک صنف کو بھی اگر درہم برہم کر دیا جائے  
 تو یہ قوم منتشر ہو جائے گی۔ اور اصل قوم اسی شکست سے ضعیف  
 ہو جائے گی، چونکہ یہ قوم قوی نہیں ہے۔ اس لئے اس کا تمام تر  
 سلیقہ ایسی کثیر فوج جمع کرنا ہے جو چیونٹیوں اور ٹڈیوں سے بھی  
 زیادہ ہو دلاوری اور سامان حرب کی بہتات ان کے یہاں نہیں  
 ہے۔ الغرض قوم مرہٹہ فتنہ ہندوستان کے اندر بہت بڑا فتنہ  
 ہے۔“ ص ۱۱

جاٹوں کے بارے میں شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”غیر مسلموں میں ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دہلی و آگرہ کے  
 درمیان ہے یہ دونوں شہر سردار تاناہوں کے لئے دو خوبیلوں کی  
 مانند رہتے ہیں۔ مغلی بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ ان کا بدو  
 اور عرب راجہ تانہ تک پہنچے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے  
 تاکہ ان کی شوکت و ہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر  
 ڈالے۔ دہلی و آگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کا شکوکا  
 کرتے تھے۔ زمانہ شاہجہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار

نہ ہوں۔ بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے لئے گڑھی نہ بنائیں۔  
 بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ ان کے حالات سے غفلت اختیار  
 کر لی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر  
 کر لئے۔ اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بیٹ ماری کا طریقہ شروع کر دیا  
 اور نگ زیب اس وقت دکن میں قلعہ بیجا پور وجید رآباد کے فتح  
 کرنے میں مشغول تھا۔ دکن ہی سے ایک فوج ہاٹوں کی تادیب کے  
 لئے اس نے رزانہ کی اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔  
 رئیسان براہوئہ نے اس شہزادے سے مخالفت کر لی۔ لشکریں  
 اختلاف واقع ہوا۔ ہاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اتفاق کے فوق  
 بادشاہی واپس ہو گئی۔

محمد فرخ سیر کے زمانہ میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی  
 قطب الملک وزیر نے زیر دست فوجیں ان کی طرف بھیجیں۔ چوہان  
 جو اس قوم کا سردار تھا بعد جنگ صلح پر راضی ہو گیا۔ اس کو بادشاہ  
 کے سامنے لائے اور تقصیرات کی معافی دلوائی۔ یہ کام بھی خلاف  
 مصلحت عمل میں آیا۔

پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے بڑھ کر گئی۔ اور  
 چوہان کا چچا زاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہو گیا  
 اور فساد کا راستہ اختیار کیا۔ چنانچہ شہر بیانہ جو کہ اسلام کا  
 قدیم شہر تھا اور جہاں علماء و دانشمندان سو سال سے اقامت پزیر  
 تھے اس شہر پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو ذلت اور  
 خواری کے ساتھ دہان سے نکال دیا۔ اس کے بعد سے سرکشی  
 براہیہ پڑتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلافات و غفلت کی  
 بناء پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر



اس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے شہرے کو پلٹ میتے ہیں۔ پسر محمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ایرانی نے غزوہ کیا اور سورج مل سے سازش کر کے پرانی دہلی پر حملہ کر دیا اور تمام باشندگان شہر کہہ کر لوٹ لیا۔ پسر محمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کر کے جنگ توپ خانہ شروع کی مگر خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی دھڑیل بیڑی چلی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے اس نے انہوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اس کے بعد سورج مل کی شوکت ترقی پانگی۔ دہلی کے دو کوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود سے فیروز آباد و شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہو گیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کرے۔

ایک سال ہوا کہ قلعہ الودھو کہ تمام میوات کی خبر گیری کے لئے ایک جائے بلند تھی، سورج مل اس کو بھی اپنے قبضہ میں لے آیا اور اس سلطنت میں سے کسی کی مجال نہ ہوتی کہ وہ اس کام سے روک دیتا۔

مضون کی پچھلی قسط میں جاٹوں کے بارے میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے کہ مغلیہ حکومت کی کمزوری نے اور صفدر جنگ کی سازش نے انہیں ہمت دلائی کہ دہلی پر حملہ کریں اور لوٹیں۔ حضرت شاہ صاحب کے خط کا جو اقتباس اوپر دیا گیا ہے، اس سے صاف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امراء کے آپس کے اختلافات اور غفلت نے جاٹوں کی قوت و شوکت میں اور بھی اضافہ کیا۔ سورج مل کا دہلی پر حملہ صفدر جنگ کی غداري اور عاقبت نائنیشی کا نتیجہ تھا اور پرانی دہلی کی لوٹ کھسوٹ کا الزام سورج مل کو دیا جائے تو اس جرم میں صفدر جنگ بھی برابر کا شریک تھا۔ جاٹوں کے ظلم و ستم کے ہاتھوں دہلی پر جو بیتی اور جس طرح لوٹ کھسوٹ کی گئی حضرت شاہ صاحب کے خط تمام بار اللہ میں جامع تذکرہ موجود ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

دہلی میں ایک حادثہ عظیم واقع ہوا۔ قوم جاٹ نے دہلی کے شہر سکونہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شہرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی۔ انہوں نے مال لوٹے، عزت و ناموس کو ہر باد کید اور مکافات کو آگ لگائی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بمعہ اہل و عیال و مال و مکانات کے ان کے دست ستم سے محفوظ رکھا۔۔۔۔

یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل رجب ۱۱۱۳ھ میں ہوا۔ اور آخر شعبان تک باقی رہا۔ ۱۵۳

امد شاہ اہالی کے نام خط میں شاہ صاحب نے صرف مرہٹوں اور جاٹوں کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک تیسرے قتنے سے غافل تھے۔ اہالی کے نام خط میں مرہٹوں اور جاٹوں کے بڑے قتنوں کے تذکرے کے بعد ضرورت نہ تھی کہ سکھوں کا بیان بھی کیا جاتا۔ لیکن ہندوستان میں جو لوگ حالات کی اطلاع کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے ان کو وہ براہ راست جانب توجہ دلاتے رہے کہ جب تک یہ تینوں قتنے مٹ نہیں جاتے امن و امان کے قیام اور حالات کی درستگی کی امید نہیں کی جاسکتی۔ نجیب الدولہ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

”ہندوستان میں تین فرقے شدت و مصیبت کی صفت سے موصوف ہیں جب تک ان تینوں کا استیصال نہ ہوگا نہ کوئی بادشاہ مطمئن ہو کر بیٹھے گا، نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیت خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔“

دینی و دنیاوی مصلحت اس میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے بعد فوراً قلعہ جات جٹ کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس ہم کو بھی برکت غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں اس کے بعد نویت سکھ ہے اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہیے اور رحمت الہی کا منتظر رہنا چاہیے۔“ (۱۱۸-۱۱۹)

حضرت شاہ صاحب نے امد شاہ اہالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی تو اس میں

ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ناز کا نقشہ کھینچ کر محض حصول ثواب کے لئے ہندوستان آنے اور مسلمانوں کو مرہٹوں اور جاٹوں کے مظالم سے نجات دلانے کی درخواست نہیں کی بلکہ اس درخواست میں انسانی نفسیات کا بھی انہوں نے خیال رکھا ہے۔ یعنی ہندوستان کی اقتصادی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور لکھا ہے کہ اگر آپ ہمت مہارک کو اس جانب متوجہ فرمائیں تو اس میں ثواب اخروی ہی نہیں بلکہ دنیا میں بھی بے شمار غنیمتیں حاصل ہوں گی۔

شاہ صاحب نے جن الفاظ میں ہندوستان کی اقتصادی حالت کا نقشہ کھینچا ہے اس سے مسلمانوں کی زبانوں میں عالم بھی آشکارا ہو جاتا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”ہندوستان کے محصولات سات آٹھ کروڑ سے کم نہیں ہیں بشرطیکہ

غلبہ و شوکت موجود ہو۔ ورنہ ایک کوڑی بھی ملتی شکل ہے جیسا کہ اس

وقت دیکھا جا رہا ہے۔ جس علاقہ پر جاٹ قابض ہیں وہ ایک کروڑ

روپیہ محصول کی جگہ ہے۔ راجپوتانہ کا علاقہ اپنی وسعت کے باعث

دو کروڑ روپیہ سے کم آمدنی کا نہیں ہے۔ بشرطیکہ ہر راجہ پر

خراج مقرر کیا جائے۔ عہد محمد شاہ میں بنگالہ سے ہر سال ایک کروڑ

کی آمدنی تھی۔ اور دہان کا صوبہ دار ہمیشہ بلا توقف بیعت رہتا تھا اس

رقم کی ادائیگی کے باوجود صوبہ دار بنگالہ ہندوستان کے امرا میں انتہائی

مالدار امیر تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی کہ بنگالہ میں بے انتظامی ہے۔ اور

دہان ایک بے وقوف نادان قاتل و لوہان یعنی ناقص قدیم کا پوتا مسلط ہے

پھر بھی وہ لوہان خزان بے شمار کا مالک ہے۔ سعادت خاں ایروانی

اور اس کے بعد اس کا داماد صفدر جنگ صوبہ اودھ پر قابض تھے۔

دو کروڑ اس صوبے سے وصول کرتے تھے، ایک کروڑ خرچ کو لے کر تھے اور

ایک کروڑ جمع کرتے تھے۔ اسی الداری نے صفدر جنگ کے اندر بادشاہ

سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ جاٹ کی شوکت کو ورنہ ہم ہر ہم کو

بھی تدبیر کے نزدیک آسان کام ہے انہوں نے جو علاقے اپنے قبضے

کرتے ہیں وہ ان کے نہیں ہیں بلکہ غصب کئے ہوئے ہیں ان کے مواضع کے مواضع کے مالک ابھی تک زندہ موجود ہیں۔ اگر کوئی صاحب شوکت و عدالت بادشاہ مہربانی کا ہاتھ ان مالکوں کے سر پر رکھے تو وہ لوگ سودج مل کے مقابلہ کئے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ یہ جو کچھ بیان کیا گیا، ہندوستان کے غیر مسلموں کا حال تھا۔ رہا مسلمانوں کا حال وہ یہ ہے کہ لو کہ ان بادشاہ جو کہ ایک لاکھ سے زائد تھے، ان میں پیادہ و سوار بھی تھے، اہل نقدی و جاگیر دار بھی تھے، بادشاہوں کی غفلت سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاگیردار اپنی جاگیروں پر عمل دخل نہیں پاتے۔ کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کا باعث بے عملی ہے۔

جب غزانہ بادشاہ نہیں رہا نقدی بھی موقوف ہو گئی۔ آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہو گئے اور کاسہ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ جب ملازمین بادشاہ کا یہ برا حال ہوا تو تمام دیگر اشخاص کے حال کو جو کہ وظیفہ خوار یا سوداگر یا اہل صنعت ہیں، انہیں پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کس حد تک غلام ہو گیا ہو گا۔ طرح طرح کے ظلم اور بے روزگاری میں یہ لوگ گرفتار ہیں۔ علاوہ اس تنگی و مفلسی کے جب سودج مل کی قوم نے اور صفدر جنگ نے مل کر دہلی کے پرانے شہر پر دھاوا بولا۔ یہ غریب سب کے سب بے خانان، پریشان اور بے مایہ ہو گئے۔ پھر متواتر آسمان سے قحط نازل ہوا۔ غرض کہ جماعت سلیمین قابل رحم ہے۔ اس وقت جو عمل و دخل سرکار بادشاہی میں باقی ہے وہ ہنود کے ہاتھ میں ہے کیونکہ متحدی و کارکن سوائے ان کے اور کوئی نہیں ہے۔ ہمہ قسم کی دولت و ثروت ان کے گھروں میں جمع ہے۔ افلاس و مصیبت کا بادل مسلمانوں پر چھا رہا ہے“ (ص ۱۰۳ - ۱۰۵)

شاہ صاحب کے اس خط سے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ نادر شاہ کے ہاتھوں دلی پر کیا جتنی اذیتیں اس کے حملے کا نتیجہ بن گئیں۔ چونکہ شاہ صاحب نے اس خط میں احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دی تھی اس لئے انہیں غوث تھا کہ حکم ان الملوک اذا دخلو قمریتہ اندھھا وجعلوا اعزۃ اھلھا اولہ وکذلک یفعلون

دہلی کا آنا نادر شاہ کا آنا ہوا چنانچہ فرماتے ہیں۔

”خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو کہ وہ مسلمانوں کو زبردست کر گیا اور مرہٹہ اور جٹ کو سالم و عالم چھوڑ کر چلتا بنا۔ نادر شاہ کے بعد سے مخالفین قوت پکڑ گئے اور لشکر اسلام کا شیرازہ بکھر گیا اور سلطنت دہلی بچوں کا کھیل بن گئی“ (صفحہ ۱۳۶)

احمد شاہ ابدالی کے نام خط سے شاہ صاحب کی دو خواہشیں معلوم ہوتی ہیں، اول یہ کہ احمد شاہ ابدالی ہندوستان آئے اور حالات کی اصلاح و درستگی میں سعی کرے دوسرے یہ کہ دلی پر نادر شاہ کی لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت گری کی سنت تازہ نہ کی جائے۔

جہاں تک شاہ صاحب کی پہلی خواہش کا تعلق ہے اس کی تعمیل کی گئی لیکن دوسری خواہش پوری نہیں ہوئی۔ اگرچہ وہ پہلے جیسا قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ نہیں ہوئی اور یہ نہ کہا جاسکتا کہ اس نے پھیل یا د بھلا دی لیکن دلی کو لوٹا گیا اور ایسا لوٹا گیا کہ الامان والحفیظ۔ سب محمد عاشق کے نام ایک خط میں شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

الحمد للہ کے اس حادثہ عامہ میں عافیت نصیب ہوئی۔ اس حملہ کو معلوم نہیں ہوا کہ مخالف کی نوح آئی تھی یا نہیں، نہ تو لوٹ ڈالنے والوں کی ٹو سے کوئی اذیت پہنچی اور نہ تاوان و جبرانہ (تعمیری ٹیکس) سے جو خلیفہ ہیں پر ڈالا گیا کوئی زہر بار ہوا۔

باقی میں عالمگیر کو جو کچھ دیا گیا تھا کہ اس فتنہ میں تم کو سلاستی حاصل رہے گی، وہ بھی ملو میں آیا۔ اکثر کی جائدادوں کی سندیں (دستاویزیں) ضبط ہو گئیں مگر میری سند کہ دستخط کر کے مجھ کو واپس کر دی گئی

ہے اس وقت احمد شاہ درانی جنگ جاٹ کی طرف متوجہ ہے جو کچھ  
 وقوع میں آئے گا بعد میں لکھا جائے گا۔ اہل شہر اپنے قتل ہونے  
 سے تو معذور ہے لیکن دولت کا مادہ فاسدہ، جن لوگوں کے دماغوں  
 میں پیدا ہو گیا تھا اس کا تنقیہ پورے طریقہ پر ہو گیا۔ چنانچہ عزت  
 کی چیسز ہے کہ جو لوگ بہاد و خست میں جس قدر زیادہ تھے قید و  
 ضرب اور سزا بھگتے ہیں وہی آگے آگے رہے۔ مگر جس کو  
 اللہ تعالیٰ نے معذور رکھا یا وہ معذور رہا۔ (۱۲۹-۱۳۰)

دہلی کی تباہی کے متعلق شاہ صاحب کے دیگر خطوط میں بھی اشارات ملتے ہیں اور اگر ان تہم بیانات  
 کو سامنے رکھا جائے تو دہلی کی تباہی و بربادی کی ایک مکمل تصویر بنائی جاسکتی ہے۔ بنیاب اللہ  
 نے مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے کمر ہمت باندھی تو شاہ صاحب نے اس کی ہمت افزائی کی۔  
 لیکن ساتھ ہی یہ امید ظاہر کی کہ دہلی کو عرب سابق ظلم سے پامال نہ ہونے دیا جائے گا۔ شاہ صاحب  
 فرماتے ہیں۔

”مرہۃ غیب میں مرہٹہ اور جٹ کا استیصال مقرر ہو گیا ہے۔

پس وقت پر موقوف ہے جو انہی کہ اللہ کے بندے کمر ہمت

باندھیں گے، ظلم باطل ٹوٹ جائیگا۔

ایک بات اور کہنی ہے وہ یہ کہ جب افواج شاہیہ کا گند دہلی میں  
 واقع ہو تو اس وقت اہتمام کی کرنا چاہیئے کہ دہلی سابق کی طرح  
 ظلم سے پامال نہ ہو جائے۔ دہلی والے کئی مرتبہ اپنے مالوں کی کوٹ  
 اور اپنی عزتوں کی توہین اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔ اس وجہ  
 سے کارہائے مطلوبہ کے حصول میں تاخیر ہو رہی ہے۔

آخر مظلوموں کی آہ کی تواتر رکھتی ہے۔ اگر اس بار آپ چاہتے ہیں کہ  
 کارہستہ جاری ہو جائے تو پوری تاکید کرنی چاہیئے کہ کوئی فوجی دہلی  
 کے مسلمانوں اور غیر مسلموں سے جو فوجی کی حیثیت رکھتے ہیں ہسرگز

تعارف نہ کرے؟ (۱۷)

نجیب الدولہ کے نام ایک اور خط میں تحریر فرماتے ہیں۔

”ایک اہم بات یہ ہے کہ مسلمانان ہندوستان نے خواہ وہ دہلی کے ہوں خواہ اس کے علاوہ کسی اور جگہ کے۔ کئی صدیات دیکھے ہیں۔ اور چند ہار لوٹ مار کا شکار ہوئے ہیں۔ چاقو ڈی تلک پہنچ گیا ہے ہم کا مقام ہے۔ خدا کا اور اس کے رسول کا واسطہ دیتا ہوں کہ کسی مسلمان کے مال کے درپے نہ ہوں۔ اگر اس بات کا خیال رکھا تو امید ہے کہ فتوحات کے دعوازے پے درپے کھلتے چلے جائیں گے اگر اس امر سے تغافل برتا گیا تو میں ڈرتا ہوں کہ آہ مفسلوں سدراہ مقصود نہ بن جائے۔“ (۱۸)

مرہٹے جاٹ اور سکھ عہد شاہ ولی اللہ کے وہ عظیم فتنے تھے جن سے ملکی آبادیاں تالان ہو گئیں جنہوں نے ملک کے امن و امان کو غارت کیا۔ جن کی لوٹ کھسوٹ سے نہ مسلمان محفوظ تھے نہ ہندو اور نہ دیگر اہل وطن۔ جن کی تلواریں میدان جنگ ہی میں بے نیام نہیں ہوئیں انہوں نے پر امن آبادیوں میں بھی عورتوں، مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا۔ جن کی خون آشامیوں کے آگے میدان جنگ کے مسلح سپاہی اور پر امن زندگی شہر میں کوئی فرق نہ تھا انہوں نے سب کو لوٹا، سب کو تباہ کیا۔ ان کے ظلم سے مسلمان ہی پیچھے نہیں اٹھے، ملک کی پوری آبادی ان کے ستم کا نشانہ بنی۔ ان کی وحشت و بربریت کے تذکرے تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں ان فتنوں کے علاوہ ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ، دلی کی تباہی احمد شاہ ابدالی کی آمد امراتے آپس کے سیاسی اختلافات، غیر مسلموں سے سازشیں اور سیاسی زندگی میں ہر ہر قدم پر مسلم حکومت اور عوام کے مفاد سے امراء اور دربار کا اعراض اور خود غرضی وغیرہ وہ عظیم واقعات ہیں جن کو تاریخ کا کوئی طالب علم مورخ، مفکر، نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ان واقعات نے ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی مقام و حیثیت پر بہت گہرا اثر ڈالا اور مغلیہ حکومت کی حیات و بقا کے ہر امکان کو ختم کر دیا۔

پیش نظر حصہ معنون میں یہ حکایت دہلی مرحوم کے ایک صوفی، عالم اور عارفی حضرت شاہ ولی اللہ کے افلاکین سننے کا اہتمام کیلئے۔ شاہ صاحب کی کتابوں سے نہ مشتر بڑے بڑے سیاسی واقعات ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ واقعات و حالات کی تفصیلات و جزئیات تک معلوم کی جاسکتی ہیں اور تاریخ کے تمام سرمایہ سے بے نیاز ہو کر صرف شاہ صاحب کی تحریروں سے ان کے عہد کی سیاسی، مذہبی اخلاقی اور ثقافتی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے چونکہ ہمارے پیش نظر تفصیلی مطالعہ نہیں ہے اس لئے تفصیلات و جزئیات میں ہانا مناسب نہیں سمجھا یہاں ہمارا مقصد اس دور کا سرسری مطالعہ اور فکر و نظر کی ایک راہ کی جانب اشارہ کرنا تھا۔ اور اس کے لئے یہ اجمال کفالت کمر تلے۔

آئندہ اقاط میں ہم انشا اللہ حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے سماجی، اخلاقی اور مذہبی حالات پر روشنی ڈالیں گے۔

## المسوی من احادیث الموطا

عربی

حضرت شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب آج سے ۲۴ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جگہ بہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شرح المصطفیٰ پر مولف الام نے جو مبسوطہ تحریر لکھا تھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ولائٹی کپڑے کی نفیس جلد کتاب کے دو حصے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپے



## علامہ ابن حزم

طغیلا احمد قریشی

سہرزمین اندلس نے ۴۸۲ھ میں ماہ رمضان کے آخری روز طلوع آفتاب سے قبل ایک ایسی شخصیت کو جنم دیا جو اپنے عہد کے علمی مقلدوں میں مختلف حیثیتوں سے متعارف ہوئی۔ کہیں اس کی حیثیت ایک مورخ کی ہے اور کہیں ایک ادیب اور شاعر کی۔ کبھی اہل علم نے انہیں ایک فقیہ اور محدث کے روپ میں دیکھا اور کبھی ممتاز سیاست دان کے بہادہ میں۔ اس شخصیت کو لوگوں نے کبھی محلات میں عیش و نشاط کی زندگی گزارنے دیکھا۔ کبھی مکتب میں بطور تیشین مدرس کے رنگ میں پایا۔ اس شخصیت کا نام ہے علی بن احمد بن سعید بن حزم بن غالب بن صالح بن سفیان ابن یزید۔ گو کثرت ابو محمد ہے لیکن تاریخ اسلام میں یہ ابن حزم کے نام سے مشہور ہیں۔

بنو امیہ جب اندلس پہنچے اور وہاں اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی تو ابن حزم کے جد اعلیٰ بھی ان کے رفیق سفر تھے۔ ان کا تعلق منت لیشم نام کی ایک بستی میں آباد ہوا۔ یہ بستی عرب الاندلس کے علاقہ الزاویہ کے ضلع اونبہ کے مضافات میں واقع ہے اور اونبہ علاقہ لبلہ کا ایک شہر ہے۔ یہ ابن حزم کے والد احمد بن سعید منصور عامری کے ذریعہ

تھے۔ ۱۹۶۲ء میں منصور کی وفات کے بعد جب اس کا بیٹا المنظر تخت نشین ہوا تو آپ نے اس سے بھی تعاون کیا لیکن ۱۹۶۵ء میں جب سیاسی اضطرابات کا آغاز ہوا تو سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔ قرطبہ کے فسادات کے زمانہ میں مغربی قرطبہ کے جدید مکانات سے نقل مکانی کر کے مشرقی علاقے میں اپنے پرانے مکان میں آ گئے جہاں ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۸۵ھ میں اپنی فسادات کے دوران آپ کا انتقال ہو گیا۔

والد کے انتقال کے وقت ابن حزم کی عمر تقریباً اٹھارہ سال تھی۔ ابن حزم کی پرورش محلات میں ہوئی۔ اس لئے آپ کے بچپن کی تربیت وزیر زادوں کی طرح ہوئی۔ اس دور کے امراء زادوں کی نگہداشت باندیوں کے سپرد ہوتی تھی۔ اور ابتدائی تعلیم بھی ان باندیوں کی نگرانی میں دی جاتی تھی۔ چنانچہ ابن حزم نے بھی تسمان انہی باندیوں سے حفظ کیا۔ کچھ بڑھنے کے ابتدائی مراحل بھی اس ذریعہ سے طے پائے۔ قصص و اخبار و واقعات بھی انہی عورتوں سے سیکھے جنہی سن شعور کو پہنچنے تو والد نے دقت کے ایک اچھے عابد عالم ابو القاسم عبدالرحمان بن یزید ازدی کی شاگردی میں دے دیا۔ ۱۹۵۸ء میں جب آپ کے والد وزارت سے علیحدہ ہوئے تو آپ کی عمر بمشکل چودہ سال تھی۔ والد کی وفات ۱۳۸۵ھ تک کا زمانہ فسادات اور سیاسی کشمکش کا دور تھا۔ ان نا سالمہ حالات سے دور رکھنے اور علمی شاعری میں مصروف رکھنے کے لئے باپ نے ابن حزم کو قرطبہ کے مشہور محدث ہمدانی کی خدمت میں سماعت حدیث کے لئے بھیجتا شروع کر دیا۔ ابن حزم لکھتے ہیں۔

”ہیں ہمدانی نے قرطبہ کی مسجد القریٰ میں ۱۳۸۵ھ میں حدیث سنائی“

والد کی وفات کے بعد ۱۳۸۵ھ میں ابن حزم نے مرہہ پہنچ کر اپنی تمام صلاحیتیں درس و مطالعہ کے لئے وقف کر دیں۔ سیاسی جمہیلوں سے کنارہ کش ہو کر وہ تحصیل علم میں ہمک ہوتے ہی تھے کہ ۱۳۸۵ھ میں مرہہ کے گورنر خیران نے آپ کو جیل بھیج دیا۔ الزام یہ لگایا کہ آپ اموی سلطنت کے دوبارہ قیام کے لئے خفیہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ ایک ماہ کی قید کے بعد جب آپ کو جلا وطن کر دیا گیا تو آپ قلعہ القصر پہنچے اور ابن المغفل کے ہاں چند مہینے آرام سے گزاریے۔ ان دنوں آل مموذ یعنی علویوں اور امویوں میں سیاسی اقتدار کے لئے

رہے کئی زودوں پر تھی۔ علوی قرطبہ کے علاقے پر قابض تھے اور امویوں کے پاس بلنسیہ کا علاقہ تھا۔ ابن حزم کا خاندان چونکہ شروع ہی سے اموی حکمرانوں کا حلیف رہا تھا۔ اس نے ابن المقل کے ہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد وہ اموی حکمران عبدالرحمن بن محمد کے پاس بلنسیہ پہنچ گئے اس نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنا وزیر بنالیا۔ جب عبدالرحمن غرناطہ فتح کرنے نکلا تو ابن حزم بھی اس کے ہمراہ تھے۔ راستہ میں جب عبدالرحمن کو قتل کر دیا گیا تو آپ کو بھی اور شکست خوردہ لوگوں کے ساتھ قید کر دیا گیا۔

۳۸۷ھ میں قید سے رہا ہو کر آپ چھ سال بعد پھر قرطبہ واپس آ گئے اور سیاست سے کنارہ کشی اختیار فرما کر حادثات اور فقہ کی تدبیریں شروع کر دی۔ اور مختلف مسائل پر جدل و مناظرہ کا آغاز کیا۔ اس عرصے میں آل حمود کی حکومت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی اور وہ وقت بھی آیا جب اہل قرطبہ علی بن حمود حسنی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اسے تخت سے معزول کر کے رمضان ۳۸۷ھ میں عبدالرحمن بن ہشام بن جہا الجبار اموی کو "المستغفر" کا لقب دے کر تخت نشین کر دیا گیا۔ اب کے بھی وزارت کا قرعہ قال ابن حزم ہی کے نام نکلا لیکن دفاع بعد ہی جب اس فراں ردا کو قتل کر دیا گیا تو مسند وزارت سے آپ کو سیدھے زندان جانا پڑا۔ کچھ عرصہ بعد جب روائی ہوئی تو پھر آپ نے علم کے دامن میں پناہ لی اور سیاسی گفتنیوں کے بجائے فقی مسائل کی موٹ گائیڈوں میں مہمک ہو گئے۔ لیکن جو بنی ہشام المعتد باللہ بر سر اقتدار آیا تو قلعہ ان وزارت آپ کے سپرد ہوا۔ یہ آخری اموی حکمران ہے ۳۸۷ھ میں آئے تخت سے معزول کر دیا گیا۔ لاروہ نامی مقام پر ۳۸۷ھ میں اندلس میں حکومت کا یہ ٹٹھانا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ اندلس میں اس آخری حکمران کی حکومت تقریباً چار سال رہی خیال ہے کہ ابن حزم نے اس وزارت کے بعد پھر دنائت کا عہدہ کبھی قبول نہیں کیا۔ اور اس کے بعد آپ مکمل طور پر سیاسی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی بقیہ زندگی علم کے لئے وقف کر دی۔ شاہلہ، مرہ، قرطبہ، بلنسیہ اور دیگر بلاد اندلس میں ابن حزم کا سفر جاری رہا۔ اور آپ اندلسی جوانوں کو اپنی شیریں بیانی سے اپنے علاقہ اثر میں لے لے گئے۔

اس طرح آپ نے اندلس کے خہر وں میں اپنے انکار و نظریات کی ترویج کی۔

## مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے

محمد ایوب قادری ایم۔ اے

مولانا محمد احسن نانوتوی بن حافظ لطف علی بن حافظ محمد حسن نانوتیہ (ضلع  
سہارنپور) کے شیوخ زادگان میں سے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی  
پھر تحصیل علم کی فرض سے دہلی پہنچے۔ مولانا ملوک اعلیٰ نانوتوی، مولوی سہان بخش  
شکار پوری، مولانا احمد علی سہارن پوری اور شاہ عبدالغنی مجددی دہلوی سے علومِ حروف  
حاصل کئے۔ دہلی کالج میں بھی پڑھا۔ بنارس کالج اور بریلی کالج میں عربی و فارسی  
کے پروفیسر رہے۔ بریلی میں ایک پریس مطبع صدیقی اور ایک مدرسہ مصباح التہذیب  
کے نام سے قائم کیا جو اب تک مصباح العلوم کے نام سے موجود ہے۔ مولانا  
محمد احسن نانوتوی کا انتقال رمضان ۱۳۱۲ھ میں دیوبند میں ہوا اور حضرت  
مولانا محمد قاسم کے برابر مشرق کی طرف دفن ہوئے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصانیف حجتہ اللہ  
الباقیہ اور ازالۃ الغلط کو سب سے پہلے مختلف نسخے فراہم کر کے شائع کیا۔

حضرت شاہ صاحب کی تصانیف عقد المجید اور رسالہ انصاف کا اردو ترجمہ کیا۔

مولانا محمد احسن کی زندگی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف سے عبارت رہی۔ مطبع صدیقی بریلی کی وجہ سے اس سلسلہ کو اور بھی وسعت ہوئی کیونکہ مطبع اپنا تھا۔ مولانا نے زیادہ تر ضخیم اور اہم کتابوں کے اردو میں ترجمے کئے ہیں۔ بریلی کے قیام میں تصنیف و تالیف کا کام زیادہ ہوا۔ جب نانوتہ میں قیام رہا تو اس وقت مطبع مجتہبی دہلی کا تصحیح و حواشی کا کام ہوا۔ اس زمانہ میں بعض ترجمے بھی ہوئے۔ مولانا محمد احسن نے جو ترجمے کئے ہیں ان کی زبان بامعاورہ، صاف اور سلیس ہے۔ مولانا بڑی حد تک قواعد زبان اور صوت عبارت کا خاص خیال رکھتے تھے۔ مولانا لفظی ترجمہ کی بجائے بامعاورہ ترجمہ کو ترجیح دیتے تھے اس وقت نشر اردو ابتدائی حالت میں تھی اس لئے نشر اردو کے ارتقاء میں مولانا محمد احسن کی تصانیف و تراجم خاص توجہ کے مستحق ہیں۔ ہم ذیل میں مولانا محمد احسن کے علمی کارنامے پیش کرتے ہیں۔

## (۱) تحفۃ المحسنین

مولانا محمد احسن کی غالباً یہ سب سے پہلی تصنیف ہے انہوں نے یہ مختصر سا رسالہ باشندگان بنارس کی درخواست پر ان عورتوں کے بیان میں لکھا ہے جن سے مرد کو نکاح کرنا حرام ہے۔ یہ رسالہ ۱۲۶۹ھ مابین عیدین لکھا گیا۔ یہ رسالہ ایک مقدمہ، نو فصلوں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔ ہر فصل کا مضمون بیان کرنے کے بعد متعلقہ مسائل بھی اسی فصل کے ساتھ درج کر دیئے ہیں، بلکہ مقدمہ اور خاتمہ کے ساتھ بھی بعض مسائل شامل ہیں۔ زبان عام فہم اور بامعاورہ ہے تمام مسائل کا جواب فقہ حنفی کے موافق لکھا گیا ہے بعض مسائل میں مختلف ائمہ فقہ کی رائیں بھی نقل کی گئی ہیں جس سے مولانا کی وسعت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ کتاب میں تین فتوے بھی مع جواب شامل ہیں اس کتاب کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے۔ ہمارے پیش نظر مطبوعہ محرم ۱۲۶۹ھ (مطبع مصطفائی کانپور) مطبعہ

رہا ہے۔

## (۲) اصول جبر ثقیل

نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۱۸۵۴ء میں بنارس میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔

## (۳) نافعہ خریداران

یہ رسالہ مولانا محمد احسنؒ نے بیع و شری کے مسائل کے بیان میں لکھا ہے جیسا کہ آغاز رسالہ میں خود تحریر فرماتے ہیں۔

”اس زمانہ میں اکثر لوگ اپنی ہاتھ کی کائی تو کم کرتے ہیں اور تجارت وغیرہ کیا کرتے ہیں لیکن معاملات بیع و شری میں مسلمانوں کے نفع کے لئے ضروری جان کر یہ رسالہ کہ اسم تاریخی اس کا ”نافعہ خریداران“ ہے لکھا گیا اور قبل بیان مسائل کسب حلال اور برائیاں کسب حرام کی درج کی گئیں اور اکثر روایتیں اس رسالہ کی ہدایہ، در مختار اور عالمگیری سے نقل ہیں“

مولوی محمد رضا مائل مراد آبادی نے قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

جسے رسالہ بہ ہو گیا پورا جو پسند آیا ایک عالم کو  
مائل خستہ نے لہی تاریخ جو باقی و شری کے نافع ہو

۱۲۷۲ھ  
۱۸۵۵ء

## (۴) قواعد اردو حصہ چہارم

ڈاکٹر کٹر آف پبلک انٹرکشن صوبہ شمالی و مغربی (یو پی) کے سبب الحکم نصاب کی غرض سے قواعد اردو کو چار حصوں میں ترتیب دیا گیا۔ اس سلسلہ کا چوتھا حصہ مولانا محمد احسن نے مرتب کیا ہے، باقی شروع کے تین حصے دوسرے حضرات نے لکھے۔

لے تاریخ داستان اردو از محمد احسن قادری صفحہ ۱۹۰ (آگرہ ۱۹۴۱ء)۔

لے نافعہ خریداران از مولانا محمد احسن۔

مولانا محمد احسن آغاز رسالہ میں لکھتے ہیں :-

”جانتا چاہیے کہ یہ رسالہ قواعد اردو بموجب ارشاد فیض بنیاد جناب مستطاب معلی القاب جناب ڈاکٹر صاحب بہادر تعلیم مالک شمالی و مغربی کے احقر العباد محمد احسن مدرس اول فارسی مدرسہ بریلی نے ۱۸۶۲ء میں تالیف کیا اور تا بہ قدر عبارت سہل اور فہم ضروری کا ہونا ملحوظ رکھا اور بعض باتیں عربی فارسی کی جن کا جاننا قواعد آموزوں کو ضروری موجب ہوشیاری کا تھا وہ بھی درج کی گئیں اور پہلے بیان مطلب سے کچھ اصطلاحیں جو قواعد میں مذکور ہوں گی، لکھی گئیں اور چونکہ اس زبان کی صرف و نحو ابھی خوب منضبط نہیں ہوئی، لہذا تا قدر وقت ملاحظہ کے خود جان لیں گے کہ کس طرح کی کاوش کر کے یہ باتیں لکھی گئیں۔ اس رسالہ میں چار باب ہیں، اول میں اصطلاحات، دوسرے میں صرف، تیسرے میں نحو اور چوتھے میں ترکیب کرنے کا طور اور کچھ قواعد ضروری لکھے گئے۔“

چونکہ یہ کتاب نصاب میں شامل رہی لہذا بیسیوں اڈیشن اس کے شائع ہوئے۔ ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ احسن القواعد مولانا محمد احسن نانوتوی کی تالیف ہے، حالانکہ احسن القواعد میں مؤلف کا نام صراحت سے محمد نجف علی خان متوطن مراد آباد لکھا ہے۔ احسن القواعد کے مؤلف محمد نجف علی خاں مولانا محمد احسن کے شاگرد تھے اسی لئے انہوں نے اپنے استاد مولانا محمد احسن کے نام پر اپنی اس کتاب کا نام ”احسن القواعد“ رکھا۔ مولانا محمد احسن صاحب کی ایک تقریظ احسن القواعد میں ضرور شامل ہے۔

## رسالہ عروض

فن عروض میں مولانا محمد احسن کا مختصر مگر جامع رسالہ ہے۔ سبب تالیف کے

سلسلے میں خود مولانا محمد احسن لکھتے ہیں :-

”یہ رسالہ عروض و قوافی میں بموجب ارشاد ہدایت بنیاد قدردان اہل علم صاحب والا نسب جناب مستطاب کیمپسن صاحب بہادر ایم اے ڈاکٹر سررشتہ تعلیم ممالک مغربی و شمالی (یوپی) کے احقر العباد محمد احسن مدرس اول فارسی مدرسہ بریلی نے ۱۲۸۵ھ میں تالیف کیا۔ اس میں قواعد ضروری عروض اور قافیہ کے اور مشہور مروج بحر کے نام اور نہایت مشہور زحافات لکھے جلتے ہیں جو بحر کہ غیر مشہور ہیں یا زحافات مرکب خواہ غیر مشہور ہیں یا بحر مروجہ حال میں نہیں آتے ان کا ذکر اس میں نہیں لکھا اور عبارت کا آسان ہونا اور اس میں سے مطلب کا بخوبی سمجھ میں آنا تمام رسالہ میں ملحوظ رکھا ہے۔ اس رسالہ میں دو باب ہیں باب اول میں عروض کا بیان ہے اور دوسرے میں قوافی کا ذکر ہے“

رسالہ میں اکثر مثالوں میں مولانا محمد احسن نے اپنے اشعار دیئے ہیں۔ یہ رسالہ بھی متعدد بار طبع ہو چکا ہے۔

## زاد المحدثات

یہ کتاب تعلیم نسواں کے بیان میں تالیف کی گئی اس لئے گورنمنٹ نے ازراہ قدردانی زاد المحدثات کی پانچ سو جلدیں خریدیں اور تین سو روپیہ انعام بھی دیا۔ کتاب ۱۲۸۸ھ میں لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے، مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوئی ہے۔ کتاب تہسید، چار ابواب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔

لے ملاحظہ ہو مقدمہ ”عروض“ از مولانا محمد احسن نانوتوی۔

لے تنبیہ المہمال از مولانا مفتی حافظ بخش بدایونی ۲۲۴۔



## مفید الطالبین

عربی کے امتدائی طلباء کے لئے نصاب کی ضرورت سے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قریب ڈیڑھ سوا مثال و مواظف کے مختصر جملے ہیں اور باب دوم میں تقریباً چالیس سبق آموز حکایات و تعلیمات شامل ہیں۔ دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم کراچی نیز دیگر مدارس عربیہ میں یہ کتاب داخل نصاب ہے۔ ادیب شہیر مولانا اعجاز علی امرہوی المتوفی ۱۲ رجب ۱۳۴۲ھ نے اس پر حاشیہ لکھا ہے۔

## (۸) مذاق العارفین

حجۃ الاسلام امام غزالی کی مشہور تصنیف احیاء العلوم کا اردو ترجمہ مولانا محمد احسن نے منشی نول کشور (مالک مطبع نول کشور لکھنؤ) کی فرائش پر (۱۲۸۱ھ تا ۱۲۸۶ھ) چار ضخیم جلدوں میں کیا۔ مذاق العارفین تاریخی نام ہے۔ ترجمہ با محاورہ اور سلیس ہے۔ مولانا محمد احسن نے تخریج عراقی سے احادیث کے مخارج کا سوال حاشیہ پر لکھ دیا ہے اور التزام رکھا ہے کہ جن احادیث کی نسبت عراقی نے کہا ہے کہ ان کی سند صحیح ہے وہاں کچھ نہیں لکھا اور جن احادیث کو عراقی نے کسی وجہ سے معلول کہا ان کے ساتھ ضعیف وغیرہ ہر جگہ حاشیہ پر لکھ دیا ہے آخر کی دو جلدوں کا ترجمہ پہلے کیا گیا اس کے بعد پہلی جلد کا اور سب سے آخر میں دوسری جلد کا ترجمہ ہوا ہے۔ ترجمہ کا کام (۱۲۸۱ھ تا ۱۲۸۶ھ) میں شروع ہوا کہ (۱۲۸۶ھ تا ۱۲۸۹ھ) میں اختتام کو پہنچا۔ قرآنی آیات کا ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ کے ترجمہ کے مطابق ہے اشعار کا ترجمہ اشعار میں کیا ہے شروع میں امام غزالی کا مختصر سا ترجمہ شامل ہے۔

قطعات تاریخ از مولانا محمد احسن

جلد سوم

ہو جبکہ آوانہ ختم ہو تو دل کو ہوئی فکر تاریخ نیکو

بلا حودت طبع احسن کو فوراً  
 کیا بہر تعمیل ایملئے امد  
 ”کہا اس نے تو ترجمہ سے ہو“ کا ریح  
 ”یہ تاریخ لکھ“ جلد ثالث بارہ

۱۲۸۱ء ۱۲۸۱ء ۱۲۸۱ء ۱۲۸۱ء  
 ۱۸۹۴ء ۱۸۹۴ء ۱۸۹۴ء ۱۸۹۴ء

### جلد چہارم

مزدہ احباب جب اس سے اٹھائیں گے تو ہوں گے  
 نہ تھا آسان کچھ کوزے میں لانا بحروت سلم کا  
 لکھا جب ترجمہ عمدہ تو احسن یہ لکھو تاریخ  
 عہد اب ہے یہ اردو ترجمہ جلد چہارم کا

۱۲۸۲ء ۱۲۸۲ء  
 ۱۸۹۵ء ۱۸۹۵ء

### جلد دوم

ہوئی ختم جب یہ کتاب نفیس  
 جو ہر اک کو مغرب مطلوب ہے  
 تو احسن سے ہاتھ لے تاریخ کو  
 کہا لکھ دے یہ ترجمہ خوب ہے

۱۲۸۹ء ۱۲۸۹ء  
 ۱۸۹۹ء ۱۸۹۹ء

نول کشور پریس لکھنؤ سے یہ کتاب متعدد بار چھپ چکی ہے ہمارے پیش نظر اپریل  
 ۱۸۸۹ء کا مطبوعہ نسخہ ہے اس کتاب کا جو ادیشن حال میں چھپا ہے اس میں امام غزالی  
 کے حالات ”الغزالی“ مولفہ مولانا شبلی نعمانی سے لے کر شامل کر دیئے گئے ہیں۔

### (۹) تہذیب الایمان

حافظ ابن قیم کی مشہور کتاب افاتہ اللہ فان کا اردو ترجمہ و خلاصہ حسب فرمائش  
 منشی جمال الدین مدار المہام بیاست بیوپال تہذیب الایمان کے نام سے کیا۔ کتاب کا مطبوعہ  
 رد بدعات ہے، ۶۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا کو صرف ایک ہی نسخہ مل سکا لہذا  
 تصحیح میں دوسری متعلقہ کتابوں سے مدد لی گئی۔ کتاب کے ترجمہ اور طباعت کا کام صرف  
 سات ماہ میں ختم ہوا۔ پیرایہ بیان صاف اور سلیس ہے۔ ترجمہ نظم کا نظم میں کیا ہے  
 یہ کتاب رجب ۱۲۸۳ء میں مطبع صدیقی بریلی میں طبع ہوئی ہے۔

۱۲۸۳ء ۱۲۸۳ء  
 ۱۸۹۹ء ۱۸۹۹ء

مولانا محمد احسن نے یہ قطعہ تاریخ لکھا ہے -

مکائدہ شیطاں کے جب چپ چپکے ہو اب ہر تاریخ دیوانہ و تلب  
ندا ہفت غیب نے دی اسے کہ لکھوئے لا تذکر لسن کان قلب

۱۲۸۳ھ  
۱۸۹۶ء

ہمیں اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا ہم اپنے مخلص دوست شہداء الحق صاحب  
ایم۔ اے کے شکر گزار ہیں کہ جن کے ذریعہ سے اس کتاب کے متعلق ضروری معلومات کتب خانہ  
دارالعلوم دیوبند سے حاصل ہوئیں۔ حال میں اس کتاب کا ایک نسخہ مسجد رحمانیہ کے  
کتب خانہ (ریجنیٹ لائن کراچی) میں نظر سے گزرا۔ اس کتاب کے رد میں ایک مختصر سارسالہ  
تبعید الشیطان بامداد جنود الحق المبین کے نام سے مولوی عبدالصمد سہوانی (تلمیذ مولانا  
عبدالقادر بدایونی) نے ۱۲۸۴ھ میں لکھا جو کہ انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں طبع ہوا ہے۔

## (۱۰) احسن المسائل

فقہ کی مشہور کتاب کنز الدقائق کا فارسی ترجمہ شاہ اہل اللہ دہلوی (برادر حضرت  
شاہ ولی اللہ دہلوی) نے کیا تھا۔ مولانا محمد احسن نے اپنے بھائی مولوی محمد منیرؒ فرمائش  
پر فارسی سے اردو میں اس کا ترجمہ کیا اور احسن المسائل نام رکھا تو ضیح و تشریح کے لئے حاشیہ  
اور حسب ضرورت متن میں اضافہ فرمایا مولانا محمد احسن صاحب نے قطعہ تاریخ یہ لکھا ہے۔

ہوئی فقہی مسائل میں کتاب کا نظیر احسن ہوئے میر جس کے دیکھنے سے نفس شائق کا  
سن ختم اس کا میں چاہا تو ہفت غیب سے بولا لکھو گنج حقائق ترجمہ کنز الدقائق ہے

۱۲۸۴ھ  
۱۸۹۶ء

اس کتاب کے جملہ حقوق مولوی الہ یار خاں تاجر کتب بریلی کے نام محفوظ تھے۔  
اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی مولانا محمد احسن ہی کی حیات میں بعد نظر ثانی مطبع مجتبیٰ  
دہلی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب مختلف مطابع میں طبع ہو چکی ہے ۱۹۱۹ء میں قیومی پریس

کانپور سے مولوی وصی علی صاحب ملیح آبادی کے اردو حاشیہ کے ساتھ طبع ہوئی مگر پریس میں آگ لگنے کی وجہ سے تمام اشاک جل گیا۔ کسی طرح کچھ نسخے نکل گئے تھے، اسی نسخہ کو حال میں لاہور کے مشہور ناشر کتب سراج الدین اینڈ سنس نے چھاپ لیا ہے اور لطف یہ ہے کہ مترجم کی حیثیت سے مولانا محمد احسن صاحب کا نام حذف کر دیا ہے اور محشی مولوی وصی علی صاحب ملیح آبادی کا نام باقی رکھا ہے کنز الدقائق کا ایک اردو ترجمہ ظہیر الحقانی کے نام سے ظہیر احمد ظہیری سہوانی (المتوفی ۱۳۷۱ھ) نے بھی کیا ہے جو ۱۳۷۱ھ میں گلزار ہند اشیم پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔

## (۱۱) غایۃ الاوطار

فقہ حنفی کی مشہور و متداول کتاب درختار کا اردو ترجمہ مشہور عالم مولانا خرم علی بلہوری نے حسب فرمائش نواب ذوالفقار الدولہ رئیس باندہ ۱۲۵۸ھ میں کتاب اشکاح سے شروع کیا۔ ۱۲۶۱ھ میں قریب اختتام تھا کہ پیغام اجل آگیا مولانا محمد احسن نے

لے مولوی وصی علی ابن حکیم شیخ محمد یوسف ملیح آباد وطن ۲۲ رذی الحجہ ۱۲۵۵ھ کو پیدا ہوئے ابتدائی مروجہ تعلیم اردو فارسی کی تحصیل ملیح آباد کی پھر مدرسہ نیازیہ غیر آباد مدرسہ رضا المسلمین لکھنؤ، مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تمام علوم متون و منقول مختلف اساتذہ حاصل کئے ۱۲۹۳ھ میں قاسم التحصیل ہو گئے اور مدرسہ جامع العلوم کانپور ہی میں مدرس ہو گئے۔ ۱۲۹۹ھ میں مدرسہ البیات کانپور میں مدرس ہو گئے۔ ۱۳۲۸ھ تک مدرسہ البیات سے تعلق رہا اس کے بعد مدرسہ صوبہ دار کانپور اور مدرسہ جامع العلوم کانپور سے پھر تعلق ہو گئے۔ ۱۳۳۵ھ میں فریضہ حج ادا کیا۔ ۱۳۴۰ھ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بحیثیت سنی ڈین تقرر ہوا اور تعلق ۱۳۵۰ھ تک رہا۔ تفسیر جلالین پر جستہ عربی حاشیہ لکھا جو قیومی پریس کانپور میں چھپ چکا ہے۔ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے طلبہ کیلئے نصاب و نیات (سنی) مرتب کیا۔ مولوی وصی علی صاحب آج کل اپنے وطن ملیح آباد میں مقیم ہیں آپ کے صاحبزادے مولوی اشرف علی مالک اشرف اینڈ سنی (سید منشن پاکستان جیک) کراچی میں ہیں۔

اس ترجمہ کو ان کے ورثہ سے اشاعت کی غرض سے خریدا اور بقیہ ترجمہ ان باب الاذنان کتاب الصلوٰۃ مکمل کیا اور جن مقامات کو مولانا خرم علی بلہوری نے چھوڑ دیا تھا ان کو مکمل اور اس ترجمہ کو ہر طرح سے صحیح و درست کر کے چند اصحاب کی شرکت میں اول جو تھی جلد مطبع صدیقی بریلی سے شائع کی۔ نام غایۃ الاوطار رکھا لیکن یہ سلسلہ قائم نہ رہ سکا۔ مولانا محمد احسن کو سخت فکر ہوئی اور ایک اشتہار اس باب میں طبع کر کے مشتہر کیا۔ نواب کلب علی خاں رئیس رامپور المتوفی ۱۳۰۴ھ نے طباعت کے جملہ مصارف برداشت کئے۔ مولانا محمد احسن نے نواب رام پور کی معارف پوری کا خاص طور سے ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کی تصحیح و تکمیل میں مولانا محمد احسن کے بڑے بھائی مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ) صدر مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور بھی شریک رہے۔ اس ضخیم اور گرانقدر کتاب کی چاروں جلدوں کی طباعت ۱۲۸۸ھ میں ہوئی جیسا کہ قطعات ذیل سے ظاہر ہے۔

### قطعات تاریخ از مولانا محمد احسن

شک گلزار چو گردید ز طبع این نسخہ سال ختمش زرہ فکر بستم بہم  
از دل غیب نداد سرکشم ناگاہ پے تاریخ بگو فقہ امام اعظم  
۱۲۸۸ھ  
۱۸۷۱ء

### دیگر

جب ہوئی یہ کتاب مطبوع ہم رنگ بہار تازہ گلشن  
پایا سرخس سے حسن طبع خرم سے ہے یادگار احسن  
۱۲۸۸ھ  
۱۸۷۱ء

### از میر ہدایت علی ہدایت بریلوی

باہتمام مولوی صاحب سے جب مسئلے آسان و مشکل چھپ گئے  
سال یہ دل سے ہدایت کے طا دین اعظم کے مسائل چھپ گئے  
۱۲۸۸ھ  
۱۸۷۱ء

یہ کتاب نول کشور پریس کھنڈ میں بھی چھپی ہے ہمارے پیش نظر مطبع صدیقی بریلی کا چھپا ہوا نسخہ رہا ہے۔

اس کتاب کی ابتدا ۱۲۵۵ھ میں ہوئی اور اختتام ۱۲۷۱ھ میں ہوا مولانا محمد احسن نے وسط کے سال ۱۲۶۵ھ کے مطابق تاریخی نام ۷ غایۃ الاوطار رکھا۔

# قرآنی آیتوں کا ربط حضرت شاہ ولی اللہ کی نظر میں

مولانا محمد ولی رحمانی

قرآن مجید کی آیتوں میں باہم ربط و تعلق ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو یہ ربط ظاہری ہے یا معنوی، جلی ہے یا خفی؟ اگر ربط نہیں ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟ آیات کی بے ربطی قرآن کی بلاغت پر اثر انداز ہوتی ہے یا نہیں؟

یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب دو اور دو چار کی طرح نہیں دیا جاسکتا۔ ہر وہ شخص جو قرآن مجید سے شغف رکھتا ہو، اس میں قرآن سمجھنے کا شعور ہو۔ اگر وہ بغور قرآن مجید کا مطالعہ کرے اور غور و فکر سے کام لے، تو یقیناً یہ سوال پیچیدہ مسئلہ بن کر اس کے سامنے آئے گا۔ قرآن مجید کی عظمت و صداقت، روانی و سلاست، فصاحت و بلاغت اسے یہ کہنے پر مجبور کرے گی کہ کلام اللہ شروع سے آخر تک مربوط ہے۔ اس کی شاندار ابتدا اور کامیاب انتہا اس سے یہ کہلائے گی کہ اس معجز کلام میں باہم مضبوط ربط و تعلق قائم ہے۔ جس کی سرحدیں ایک طرف ”الحمد للہ“ اور دوسری طرف ”والناس“ سے ملتی ہیں۔

لیکن جب وہ اس عجیب و پر تحقیقی نگاہ ڈالے گا، اس کے مضامین کو سامنے رکھے گا،

تو اس کتاب میں جگہ جگہ ایسا محسوس کرے گا کہ ان مختلف مضامین کی آیتوں میں ایک دوسرے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ پہلی دو آیتوں میں کسی خاص چیز کا ذکر ہے اور بعد کی دو آیتوں میں اس کے بالکل مخالف متضاد مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ قرآن مجید میں غور و خوض کرنے والے، خواہ وہ طالب علم ہوں یا بڑے سے بڑے مفسرین، سبھی اس گتھی کے سلجھانے میں الجھتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء و مفسرین کا اس باب میں عرصہ سے اختلاف چلا آ رہا ہے، کسی کو اس بات پر اصرار ہے کہ۔ چونکہ یہ کتاب تخلیق کائنات سے قبل لکھی جا چکی تھی، اور لوح محفوظ میں محفوظ ہو چکی تھی، اس لئے اس میں تصنیفی شان اور تالیفی ربط کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور چند حضرات مختلف مضامین کی آیتوں کی ظاہری بے ربطی کی وجہ سے اس کے قائل ہیں کہ تمام آیتوں کے درمیان ربط ضروری نہیں ہے!

حضرت سیدنا الامام الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف ”الفوز الکبیر فی اصول التفسیر“ میں اس موضوع پر چند جملوں میں بحث فرمائی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ”قرآن مجید جس دور میں نازل ہوا اس دور کی تصنیفی نکتہ سنجیوں اور تالیفی نزاکتوں کی رعایت اس میں کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ادب و متاخرین کے ادبی رجحانات اور تصنیفی قیود و شرائط کی تلاش بے سود ہے۔ کسی کتاب کے ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے ایک جملہ کا دوسرے جملہ سے ایک پیرا گراف کا دوسرے پیرا گراف سے اور ایک باب کا دوسرے باب سے ظاہری ربط اور کھلی ہوئی مناسبت کا پایا جانا عہدِ جاہلی یا قدیم عرب کے یہاں بلاغت جزا عظم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ شرطیں اور کتاب میں ادب کی یہ قدریں، ادب و متاخرین کی پیدا کردہ ہیں۔ قرآن کے مخاطب اول عرب قدیم ہیں انداز بیان میں ان کی رعایت کی گئی ہے۔ اس لئے آیات قرآنی میں ہر جگہ ظاہری ربط اور کھلی ہوئی مناسبت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے“

حضرت محدث دہلوی کی اس گفتگو سے سمجھا جاسکتا ہے کہ ربط آیات کے باب میں ان کا کیا مسلک تھا۔ وہ کس ربط کے قائل تھے اور کس ربط کو غیر ضروری قرار دیتے تھے۔

انہوں نے ادب و متاخرین کی جامع قید لگا کر حقیقی معنوں میں ربط کی ایک خاص قسم کا انکار کیا ہے جو متاخرین ادب و رکی ایسا ہے، اور ربط کی دوسری تمام قسموں کے بارے میں انہوں نے خاموشی اختیار کی ہے۔

## ربط کی قسمیں

اس حقیقت سے وہ مفسرین بھی پوری طرح واقف ہیں، جو آیتوں کے باہمی ربط پر اصرار کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو قرآن سے شغف ہے ان میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے پورے قرآن میں یا کسی بڑی سورۃ کی تمام آیتوں میں کھلی ہوئی مناسبت اور ظاہری ربط کا سراغ لگا لیا ہے۔ ظاہر یہی وجہ ہے کہ وہ مفسرین جو ربط کے مسئلہ میں غلو رکھتے ہیں ربط کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں: (۱) جلی (۲) خفی (۳) اعمیٰ۔ اور ظاہر ہے کہ اس تقسیم کے بغیر کوئی بھی ثابت نہیں کر سکتا کہ قرآن جمید کی تمام آیتیں باہم ربط ہیں۔ علامہ نے ربط کی اور بھی بہت ساری صورتیں بیان کی ہیں، مثلاً تمام و خاص، مطلق و نسبی، حسی، خیالی، اور مد تو یہ ہے کہ اس ربط کو ثابت کرنے کے لئے نظیرین اور مندرین کا سہارا لینا پڑا، اور یہ کہنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو بھی صورت اور ربط کا ثبوت ضروری ہے۔

۱۔ ربط جلی:۔ وہ ربط جس کے سمجھنے کے لئے زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہ پڑے۔

ربط خفی:۔ جس کے سمجھنے کے لئے فکر و نظر کی منزلیں طے کرنی پڑے۔

ربط اعمیٰ:۔ دو آیتوں کے درمیان اتنا خفیف ربط جس کے سمجھنے کے لئے داغ و سہی

سے کام لینا پڑے، اور ہر معمولی سے معمولی مناسبت نکال لی جائے۔

۲۔ یہ تقسیم حضرت علامہ بدرالدین محمد بن عبد اللہ الزکری نے البران فی علوم القرآن ص ۳۵

جلد نمبر ۱ میں فرمائی ہے۔

۳۔ البران فی علوم القرآن۔



## یہ کوششیں کیوں کی جاتی ہیں

سوال یہ ہے کہ علماء متاخرین، قرآن مجید کی آیتوں کے درمیان ربط ثابت کرنے کے دسپے کیوں ہیں؟ میرے خیال میں اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ۱۔ قرآن مجید کی ترتیب توقیفی ہے، اس کی ترتیب بحکم خداوندی ہے، بندہ کو اس کی ترتیب و تالیف میں کسی قسم کا دخل نہیں ہے۔ یہ کتاب بعثت نبوی سے صدیوں پہلے لوح محفوظ میں محفوظ کی جا چکی تھی۔ جب بعثت نبوی ہوئی اور قرآن کے نزول کا وقت آیا تو پہلے اسے لوح محفوظ سے آسمان پر اتارا گیا، اور پھر وہاں سے آہستہ آہستہ ضرورت کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ خدا کا یہ کلام، خدا کے حکم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا، حضرت جبرئیل کی رہنمائی کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو مرتب طور پر لکھواتے رہے۔ جب سلسلہ ختم ہوا تو سینکڑوں صحابہ کرام قرآن اسی ترتیب کے مطابق یاد کر چکے تھے جو لوح محفوظ میں تھی اور جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسے لکھوا چکے تھے۔

اب اگر قرآن مجید کو غیر مربوط کلام مانا جائے، تو اس سے قرآن کی ترتیب توقیفی متاثر ہوگی۔ اور یہ معلوم ہوگا کہ اس کی ترتیب بندوں کے ہاتھوں ہوئی ہے، جب ہی تو اس میں ربط کا اہتمام نہیں ہے، کیونکہ خداوند کریم کی کتاب اور ربط سے خالی ہو یہ سمجھ میں آنے کی بات نہیں ہے۔ ۲۔ کسی کتاب کا ربط سے خالی ہونا کتاب کی اچھائی نہیں بُرائی ہے۔ جس سے اس کی بلاغت و فصاحت اور شانِ تالیف پر حرف آتا ہے۔ بلکہ جو کتاب ربط سے خالی ہو، وہ حقیقی معنوں میں کتاب کہے جانے کی مستحق نہیں!

---

۱۔ سب سے پہلی کوشش حضرت امام ابو بکر نیشاپوریؒ نے فرمائی۔ آپ کی پیدائش مشہور مردم خط نیشاپوریں ہوئی۔ زندگی کا اکثر حصہ بغداد میں گزرا۔ ۳۲۳ھ میں وہیں وفات ہوئی (رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ)۔ امام مزنی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ شافعی المسلک اور فقہ شافعی کے امام ہیں لہٰذا اپنی فقیہانہ بصیرت، محدثانہ جہالت کی وجہ سے معاصرین میں بہت ممتاز۔

اس لئے قرآن مجید میں ربط کا ثابت کرنا ضروری ہے۔

## ان کوششوں کی ضرورت نہیں

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر کلام اللہ کو غیر مربوط بھی مان لیا جائے تو بھی اس کی جلالیت شان، اس کی توقیفی ترتیب یا اس کی فصاحت و بلاغت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ کلام اللہ زندگی کا ایک جامع دستور اور کتاب ہدایت ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص اس پر یہ اعتراض کرے کہ اس میں عام مرتبہ دستور اور ملکی قوانین کی طرح تمام قوانین مختلف اور ممتاز ابواب میں نمبر وار ملحدہ علمدہ کیوں نہیں بیان کئے گئے، یا یہ کتاب ہدایت دوسری تصانیف کی طرح مختلف ابواب۔ فصلوں اور پھر ذیلی عنوانات پر مشتمل کیوں نہیں ہے؟ تو کیا آپ اس کے جواب میں تمام سورتوں کو ابواب، تمام رکوعات کو فصل اور تمام آیتوں کو ذیلی عنوان قرار دے کر اسے کتاب ہدایت، ثابت کرنے کی کوشش کریں گے؟ اگر اس کا جواب ”جہیں“ اور یقیناً ”نہیں“ ہے تو پھر ٹھیک اسی طرح ربط کے ثابت کرنے میں غلو سے بھی کام لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن مجید کے ساتھ ربط کی شرط لگانا ایسا ہی ہے جیسے قرآن کا نام کتب ہدایت سن کر اس میں ابواب۔ اور فصلوں کے وجود کی شرط لگانا۔

جس طرح ابواب اور فصلوں کا نہ ہونا، یا تمام قوانین کا نمبر وار درج نہ ہونا قرآن مجید کی ”شان ہدای“ کو متاثر نہیں کرتا ہے۔ اور نہ اس کی جامع دستوریت پر حرف گیری کا موقع بہم پہنچاتا ہے ٹھیک اسی طرح تمام آیتوں کے درمیان ربط کا نہ ہونا قرآن مجید کی ترتیب توقیفی یا اس کی فصاحت و بلاغت کو متاثر نہیں کر سکتا!

ترتیب توقیفی کا مطلب صرف یہ ہے کہ قرآن مجید کی سورتیں اور آیتیں ہی نہیں، الفاظ اور حروف بھی اسی ترتیب کے ساتھ آج موجود ہیں جن ترتیب کے ساتھ لوح محفوظ میں تھیں۔ اور یہ ایک مستند اور صحیح حقیقت ہے، جس کا انکار باطلان جبارت کے

ملاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ !! لیکن اس میں ربط کی شرط کا دوسری صدی ہجری کے اواخر کی چیز ہے اس سے پہلے کسی کے ذہن میں شاید یہ چیز نہ آئی ہو، جس کی وجہ بہت صاف اور ظاہر ہے۔ قرآن مجید جس وقت نازل ہوا اس وقت کسی طویل کلام کے حسن وقوع کا معیار نہ تھا کہ اس کلام کے تمام اجزاء اس کے اکثر اجزاء باہم مربوط ہوں، کسی شاعر یا انشا پرداز کے کلام کی خصوصیت یہ نہ تھی اور نہ اس کے بلاغت کا معیار ہی یہ تھا کہ اس میں ظاہری ربط و تسلسل قائم ہو، بلکہ ایک بات پوری کرنے کے بعد وہ پھر کوئی نئی بات شروع کرنے کا پورا پورا اختیار رکھتا تھا، خواہ وہ بات ایک جملہ میں مکمل ہو جائے یا دس جملوں میں، ایک شعر میں ہو یا دس اشعار میں، شرعاً جاہلیت کے اشعار قصاویہ عرب کی قہوریں اس بات کی شاہد ہیں۔ حتیٰ کہ غلط دعویٰ نبوت کے بعد اگر کسی نے کبھی اپنا کلام پیش کرنے کی غلط جرأت کی بھی تو اس میں اس نے انداز قرآن کی حلیت تو کی، عام طور پر ربط و تسلسل کی رعایت نہیں کی حالانکہ اگر ربط معیار بلاغت ہوتا تو نبوت کا دعویٰ اس کی رعایت ضرور کرتا۔

قبیلان کی تعلیم بدلتی رہتی ہیں، ادبی رجحان میں انقلاب آتا رہتا ہے، اسلوب بیان اور طریق تعمیر ہر دور میں یکساں نہیں رہتا، ایک چیز کسی دور میں پسند کی جاتی ہے، مگر کچھ دہائیوں بعد وہ متروک ہو جاتی ہے، کبھی تا پسندیدہ چیزیں عہد کے بدلنے سے پسندیدہ چیزوں کی صف میں شامل ہو جاتی ہیں۔ فصاحت کے سانچے بگڑتے اور سنوڑتے رہتے ہیں، بلاغت کے پیمانے ٹوٹتے اور جلتے رہتے ہیں، اگر آپ کی

طے اشارہ مسئلہ کتاب کے طرف ہے دعویٰ نبوت کے بعد جب اس سے ”کلام“ کا مطالبہ کیا گیا تو اس نے کچھ چیزیں پیش کیں، جس کا ایک جز یہ بھی ہے ”یا ضحیٰ ضحیٰ نقی نقی لا انا رب تمہیں ولا الہ الاکملہ بین منانصف والقریش نصف الارض وکن قریشاً قوم بیتہ دین“ طبری ص ۲۵ جلد ۱۰ (تجوید) اسے تہذیب کی ٹرٹرائڈ تو پانی پینے والے کو روکتی ہے اور نہ پانی کو گندہ کرتی ہے۔ آدم کی ذمہ داری ہے اہل آدم، قریش کی مگر قریش ہادی سے کام لے رہے ہیں۔

بہش ہو کہ کسی دودھ کے اونچے سے اونچے کلام کو دوسرے دور کے اسالیب پر کہیں روہ اس پر پورا اترے، کلام قدیم کو نئے عہد کی قدروں کے زاویوں سے ناہیں اور وہ کل درست ہو، تو یہ کلام قدیم کے ساتھ ظلم ہوگا۔ جس نے علم و نظر کی جبین شکن آلودی کی۔ ہاں! ہر زبان کے ادب کی کچھ بنیادیں ہوتی ہیں جسے ہم ادب یا زبان کی روح سے تعبیر کرتے ہیں، اور جو ہر دودھ، ہر عہد، ہر زمانے کے ادب میں قدر مشترک کے طور پر باقی رہتی ہے۔ یہی قدر مشترک جانچنے، پہکنے اور تقابل کا اصل معیار ہونا چاہتا ہے۔ آپ خود غور کریں کہ اگر ڈاکٹر طحطاح حسین کے اسلوب کو معیار بنا کر قرآن مجید کو جانچا جائے تو کیا حشر ہوگا۔ ڈاکٹر طحطاح حسین کا اسلوب خواہ کتنا ہی مقبول کیوں نہ ہو، وہ کبھی معیار نہیں بن سکتا، اگر کوئی چیز معیار بن سکتی ہے تو وہ ٹھیکری و مستحکم، نظر کی گہرائیوں، زبان کی لطافت ادب کی چاشنی، اصول و قواعد کی رعایت اور اسی قسم کی دوسری چیزیں بن سکتی ہیں، جسے ہم قدر مشترک سے تعبیر کرتے ہیں۔

مقصود یہ ہے کہ کلام کا باہمی ارتباط جسے آج کے ادب میں اہم حیثیت حاصل ہے نزول قرآن کے زمانہ میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی، اس لئے اسے معیار یا مظہر بلاغت کہنا اور اس کے ذریعہ قرآن کو جانچنا درست نہیں ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، ربط کا تصور بعد میں پیدا ہوا۔ جن لوگوں نے ربط ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں، ان میں سب سے پہلا نام حضرت امام ابو بکر نیشاپوری آتا ہے۔ امام محمد الدین راہی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس سلسلہ میں بڑی محنت و مشقت برداشت کی۔ ان حضرات

---

لے مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ کا طرز نگارش آج کوئی اختیار نہیں کرتا۔ مولانا کی تحریریں سخت اور ثقیل الفاظ کا مجموعہ ہوتی ہیں، جب کہ آج دور ہے سہل نگاری کا کوئی ادیب ثقیل الفاظ کا استعمال پسند نہیں کرتا مگر پھر بھی مولانا کی تحریریں ادب اردو میں بہت بلند مرتبہ رکھتی ہیں، خواہ ادب وہ طرز نگارش اپنائیں یا نہ اپنائیں۔ (خدا نخواستہ قرآن سے مقابلہ مراد نہیں، صرف مثال کے ذریعہ سمجھانا مقصود ہے)۔

کے علاوہ بعض دوسرے مشہور مفسرین اور علماء نے بھی اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ ان تمام حضرات کے بے پناہ علم، غیر معمولی قوت فکر، قرآن کے سمجھنے اور سمجھانے کے پورے استحقاق کے اعتراف کے باوجود بے لفظوں اس حقیقت کے اظہار کی جرأت کرنی پڑتی ہے کہ یہ سارے مفسرین غیبی تھے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ربط کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب عربی ادب میں غیبی عنانہ شامل ہو چکے تھے، اس لئے علماء عجم نے اس مسئلہ کو بھی حروف مقطعات کے مسئلہ کی نزع مستقل موضوع بحث بنا دیا۔

### حضرت محدث دہلویؒ کے مسلک کی مختصر وضاحت

جہاں تک اپنے محدود اور طالب علمانہ مطالعہ کے بعد میں نے سمجھا ہے یہی وہ نقطہ نظر ہے جس کو سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے خوب سمجھا اور ربط بین الآیات کے مسئلہ میں آپ نے شدت اختیار نہیں کی جس کا لوگوں کو شکوہ ہے۔ آپ کے علاوہ بھی جن حضرات نے اس مسئلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ تاہم اپنی پیش نظر بھی یہی حقیقت تھی۔

حضرت محدث دہلویؒ کے خیال کے سیر کی اگر تمام چیزیں جمع کی جائیں جو ربط کے متعلق انہوں نے لکھی ہیں تو معلوم ہوگا کہ وہ قرآن مجید کا تمام آیتوں کے درمیان ربط کی صرف ایک قسم ربط جلی کا انکار کرتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ ربط جلی کا اور وہ بھی کلیۃً ہر جگہ نہیں کیونکہ بہت سے مقامات میں وہ ربط کے قائل ہیں۔ اور جہاں تک ربط اخفی کا تعلق ہے، صراحتاً تو کیا معنی کتا پڑ بھی اس کا ثبوت حضرت دہلویؒ بھی تحریر سے نہیں ملتا۔ حضرت محدث دہلویؒ یا ان جیسے دوسرے مفسرین نے جہاں جہاں بھی ربط کا انکار کیا ہے، اگر انصاف سے کام لیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ وہاں انکار ربط جلی یا اخفی کا ہے، اخفی کا ہرگز نہیں۔

حضرت محدث دہلویؒ کے مسلک کی مختصر تشریح کے بعد آپ خود القوز الکبیر کی وہ عبارت ملاحظہ فرمائیں، جس سے بعض علماء کو غلط فہمی ہوئی۔

مناسبہ درانتقال از مطبے مطبے چنانکہ  
قاعدہ ادبائے متاخرین است رعایت  
نکرد بلکہ آنچه الفاظ آن بعد از خود مہم  
دانست آنرا نشر فرمود۔  
(الغور الکبیر ص ۳ مطبوعہ مجتبیٰ ۱۹۲۲ء)

خدا تعالیٰ نے ایک مضمون کے بعد دوسرے مضمون  
کو بیان کرتے ہوئے اس مناسبت و ربط کی  
رعایت نہیں فرمائی جس کی متاخرین ادبا کیا کرتے  
ہیں بلکہ قرآن مجید میں ان چیزوں کو خدا نے بیان  
فرمایا جسے اس نے بندوں کے لئے ضروری سمجھا۔

قرآن مجید میں اہلبار متاخرین کے اسلوب کی رعایت نہیں ہے تو پھر قرآن کا اسلوب  
کیا ہے ؟ حضرت محدث دہلوی ہی کے الفاظ ہی میں سنئے : "علم تذکیر بآلاء اللہ، علم  
تذکیر بایام اللہ" علم تذکیر بموت کا ذکر فرمانے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں :-

و بیان این علوم بر مشائخ و ربوبہ ائمن  
واقع شدہ بردش تقریر متاخران پس در  
آیت احکام اختصار کہ قاعدہ متن نویسیں  
است و تنقیح از قیود غیر ضروریہ کہ صناعت  
اصولیاں است التزام فرمود، و در آیات  
خاصہ التزام بر مشہودات مسلمہ و  
خطابیات نافذ اختیار نمود تنقیح بر این ہوش  
منطقیان۔

ان علوم کی بحث عرب اول کے انداز پر کی گئی  
ہے کہ متاخرین کے انداز پر، اس لئے متن  
نویسوں کی طرح احکام کی آیتوں میں اختصار  
سے کام نہیں لیا گیا اور اصولیوں کی طرح  
غیر ضروری شرائط و قیود سے قواعد کی تنقیح  
کی گئی ہے، اس لئے آیات خاصہ میں کسے  
پہلے دلائل و براہین کا راستہ اختیار نہیں کیا گیا  
ہے اور نہ منطقیوں کے انداز پر دلائل کے  
نوٹ و پل کو سنوارا گیا ہے۔

(الغور الکبیر ص ۳)

اور . . . . .

در ابتدا و انتہی طریق مکاتیب رعایت  
نمودہ شدہ۔ (ایضاً ص ۳۱)

شروع سے آخر تک مکتوب یا پیغام کا اسانغذ  
اختیار کیا گیا ہے۔

اتنے ہی پر بس نہیں، خود حضرت محدث دہلوی محسوس قائم کرتے ہیں :-

اگر پسند کہ در سورت ہائے قرآن  
این مطلب را چنان نشر فرمودند رعایت

اگر یہ پوچھا جائے کہ قرآن مجید میں ان مطالب و  
مفہوم کو بیان کرتے ہوئے ربط و ترتیب کا

ترتیب نکر دند۔ (ایضاح ۳) • پورا پورا لحاظ کیوں نہیں رکھا گیا۔

اور پھر تحریر فرماتے ہیں:-

اگرچہ قدرت الہیہ شامل ہمہ ممکنات است اما حاکم دریں ابواب حکمت است و حکمت موافقت مبعوث الہیہ است در سلطان و در اسلوب بیان۔

وہ یہ کہ اسلوب بیان ادب و زبان میں ان کی رعایت کی جائے جو قرآن کے مخاطب اول ہیں۔

(ایضاح ۳)

مخاطب اول یا مبعوث الہیہ کی رعایت کی گئی ہے، بہت مناسب! مگر کیا نزول قرآن کے بعد کسی دور میں بھی اس ”رعایت“ سے قرآن کی بلاغت متاثر ہوئی یا ہو سکتی ہے؟ کیا تعلیمات قرآنی کو اس سے اچھے انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے؟ ان شکوک و شبہات کا جواب خود حضرت محدث دہلوی سے سنئے:-

عالم اسرار شریعہ می داند کہ در تہذیب نفوس کدام کدام چیز با افراد انسان می تواند الفت نمود بعد از ان در فنون خمسہ تامل می کند بیشک درمی یابد کہ این فنون در معانی خود بوجہی واقع اند کہ ازاں بہتر صورت نہ بندد۔

شریعت کے اسرار و رموز کو جاننے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ انسانوں کی تربیت میں کون کون سی چیزوں کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی فنون خمسہ پر بھی اس کی نگاہ ہو۔ تو یقیناً اسے اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن میں ان فنون خمسہ کی تعبیر کے لئے جو الفاظ منتخب کئے گئے ہیں، اور مفہوم کو ادا کرنے کے لئے جو زبان اختیار کی گئی ہے اس سے بہتر اور معیاری زبان نہیں استعمال کی جاسکتی اور ان فنون کے لئے قرآن نے جو جگہ منتخب کی ہے، اس سے عمدہ جگہ کا انتخاب بھی ناممکن ہے۔

(الغزالی ص ۳۹)

حضرت محدث دہلویؒ کے مسلک کی دوسری تشریح

اب آپ حضرات سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے مسلک کی

دوسری تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ (اقتباس ذیل طویل ہے مگر مکمل نقل کئے بغیر جاریہ نہیں)۔

کہنا یہ ہے کہ عام انسانوں کی تحریر و تقریر میں بھی بے ربطی ہمارے آپ کے نقطہ نظر سے بڑا عیب ہے یا نہیں، دیوانہ کا کلام، مجذوب کی ایک بڑا آخر آپ کے یہاں ناقابل التفات کیوں ٹھہری اسی لئے تاکہ اس کی باتوں میں کوئی جوڑ کوئی تنگ ربط و تعلق آپ کو نظر نہیں آتا، کسی مشہور اور مسلمہ منشاء پر داز، محقق، مصلح کے کلام و تحریر میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے۔ بلکہ اقاویت کے اعتبار سے جانب اور پرکشش کلام کا باہمی ارتباط اور بیان کی مختلف کرلیوں کا ایک دوسرے سے مربوط اور پیوست ہونا ہے۔

جب یہ سب کچھ ہے اور یقیناً ہے تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں جو اعجاز و بلاغت کا معیار، گہرائی اور گیرائی کا آئینہ دار ہے، اس میں ربط و تسلسل ارتباط و تعلق کا انکار کیا جائے، لیکن کسی اور نے نہیں ہمتاخرین علماء میں سے انہوں نے اختلاف کیا ہے جن کی بجماری بھر کم شخصیت کے پیش نظر نام لیتے ہوئے بھی خوف معلوم ہوتا ہے کہ خدا جانے خود اس اختلاف سے کتنی

یہ تشریح دارالعلوم دیوبند کے استاذ تفسیر جناب مولانا انظر شاہ صاحب کشمیری نے اپنے مضمون ”مرتب صحیفۃ الہی یا غیر مربوط کلام“ میں بیان فرمائی ہے، جسے ماہنامہ ”نظام“ کا چنود نے ”قرآن نمبر“ میں شائع کیا ہے۔

لے تعجب ہے مولانا انظر شاہ صاحب نے یہ کس طرح کہہ دیا کہ اختلاف متاخرین کا پیدا کردہ ہے اور وہ بھی متاخرین میں صرف حضرت محدث دہلویؒ کا۔! علامہ بدرالدین الزرکشی تو خیر اتنی ہی شکایت کرتے ہیں کہ ”ربط کا ثابت کرنا دقیق کام ہے اس لئے مفسرین نے اس سے بے اعتنائی برتی ہے“ (البرہان فی علوم القرآن ص ۳۶ جلد ۱) اھامام فزالدین رازیؒ بھی صرف اتنا ہی فرماتے ہیں کہ ”جمہور مفسرین اس دقیق فن سے کتراتے اور نگاہ بچاتے جاتے ہیں۔“ مگر الشیخ ولی الدین اللہویؒ نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ ”قد وہم من قال (باقی آئندہ صفحہ پر)



پیشانیں شکن آلود ہو جائیں گی۔ حالانکہ راقم السطور ان کی عقیدت و احترام میں رسمی معترفين سے زیادہ ہی ہو گا۔ لیجئے اب نام بھی سن لیجئے ”امام الہند الطبع دلی باللہ دہلوی“ اپنی مشہور و معروف اصول تفسیر پر محققانہ تصنیف کی ابتدا میں لکھتے ہیں:-

ولم یراع مناسبتہ فی الانتقال من  
مطلب الی مطلب کما ہو عادۃ  
حق تعالیٰ نے انشاء پر واز لوگوں کی طرح  
ایک مضمون سے دوسرے مضمون میں  
الادبار المتاخرین بل نشر کل ما  
کسی مناسبت کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ وہ  
اہم القاء علی العباد تقدم او تاخر۔ اہم مضامین کو لے آتے ہیں اور اس  
میں تقدیم و تاخیر کا بھی کوئی فرق نہیں رہتا۔  
(الفوز الکبیر ص ۶)  
بلکہ شاہ صاحب مرحوم کی نظریں ان مفسرین کی کوششیں جو قرآن حکیم کو ایک  
مسلل اور مربوط کلام دکھانے کے لئے ہیں، نہ صرف غیر مناسب بلکہ ایک حد تک  
بلاوجہ کی کاوش ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:-

لا یطلب للامی الکریۃ مناسبتہ (جو حضرات یہ کہہ رہے ہیں کہ آیات میں  
مناسبت اور ارتباط ضروری ہے وہ وہم میں مبتلا ہیں) ظاہر ہے کسی مفسر کے اختلاف کے  
بعد ہی ایسا جملہ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ نتیجہ اور تلاش کے بعد ایسے مفسرین (جو ربط کے مسئلہ  
میں غلو سے کام نہیں لیتے) کی اچھی خاصی فہرست بن سکتی ہے۔ ایک نام تو علامہ سیوطیؒ نے بھی لکھ دیا  
ہے ”قد غلط ابو العلامہ بن غانم فی قولہ لم یقع فیہ فی القرآن شیء کما فیہ من التکلف وقال ان القرون وددلی  
الاعتساب الذی ہو طریقۃ العرب من الانتقال الی غیر ملائم“ الا تعان فی علوم القرآن ص ۱۱۱ جلد ۱ اس  
کے بعد کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ صرف محدث دہلویؒ ہی نے اختلاف کیا ہے۔

۱۔ کسی بھی تحقیقی مضمون میں اصل کتاب کا حوالہ دینا چاہیئے اور قاعدہ کے مطابق مصنف کی  
اصل عبارت پیش کرنی چاہیئے نہ کہ ترجمہ! خواہ ترجمہ کتنا ہی عمدہ کیوں نہ ہو۔ الفوز الکبیر کی یہ عبارت  
ترجمہ کے لحاظ سے اگرچہ بالکل صحیح ہے مگر بہر حال ترجمہ ہے اصل نہیں ہے۔

و عامۃ المفسرین ربطون کل آیت من  
آیت الخاصۃ و آیات الاحکام بقصۃ  
و لفظون تلک القصۃ سبب  
نزلہا -  
(ایضاً ص ۷۷)

مفسرین خواہ ایک آیت کو پوری  
آیت سے جوڑنے کی فکر کرتے ہیں اور  
تو اور آیات احکام اور مناظرہ کی آیات  
میں بھی رابطہ پیدا کرنے کے لئے کچھ  
واقعات شان نزول کی حیثیت سے  
ذکر کئے جاتے ہیں -

اس کے بعد شاہ صاحب نے اپنی رائے لکھتے ہوئے ربط اور ارتباط  
کے مسئلہ کو ایک غیر ضروری بحث قرار دے کر قرآنی مباحث کی تفصیل کے  
ضمن میں ربط کی ضرورت کا انکار کیا ہے -

(ماخوذ از قرآن نمبر ماہنامہ نظام کان پور)

اصل بات یہ ہے کہ اس کے بعد حضرت محدث دہلویؒ نے گفتگو کا رخ ہی پھیر دیا ہے  
آپ بھی سن لیں - فرماتے ہیں : ”اما محقق آنست کہ قصد اصلی از نزول قرآن تہذیب  
نفوس بشر است و درہم شکستن عقائد باطلہ و اعمالی فاسدہ - (الفوز الکبیر ص ۷۷) دراصل  
ربط ثابت کرنے کی کوشش اس لئے ہے کہ مفسرین نے اس کا تعلق اعجاز و بلاغت  
قرآن سے جوڑ دیا ہے، اور ظاہر ہے اس کے بعد اس قسم کی کوشش ضرور کی جائے  
گی - حضرت محدث دہلویؒ نے مفسرین کی توجہ اس طرف مبذول کرنے کی کوشش کی  
ہے کہ قرآن کے نزول کا مقصد یہ ہے انسان کی اصلاح اعمال فاسدہ کی درستگی اور عقائد  
باطلہ کا رد - وغیرہ وغیرہ - قرآن کا موضوع اور کلام اللہ کا محور ہی ہے، قرآن سے یہی کام  
لینا چاہئے اور اسی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے - اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ربط ثابت  
کرنے کے لئے مفسرین نے جن تاویلوں سے کام لیا ہے وہ عجیب و غریب ہیں ایسی تاویلوں  
سے تاویل نہ کرنا ہی بہتر ہے -

یہ ہے حضرت محدث دہلویؒ کے خیالات کی وہ تشریح جو محترم مضمین نگار نے  
فرمائی ہے حالانکہ ”الفوز الکبیر“ کی اس عبارت سے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ حضرت

محدث دہلویؒ نے ربط کا کلیۃً انکار کیا ہے۔

## اس تشریح سے اختلاف

دیکھئے حضرت محدث دہلویؒ کے الفاظ ”چنانکہ قاعدہ ادباء متاخرین اسنت کما هو عادة الادباء المتأخرین“ کسی قدر واضح ہیں، کیا اس کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ حضرت محدث دہلویؒ نے کلیۃً ربط آیات کا انکار کیا ہے؟ وہ تو صرف اس ترتیب و ربط کا انکار کر رہے ہیں جس کی رعایت ادباء متاخرین کیا کرتے ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ربط کی ایک خاص صنف کی طرف اشارہ فرما کر اس کا انکار فرما رہے ہیں نہ کہ تمام اصناف کا۔ قرآن مجید کا طرز تعبیر اور انداز کلام متاخرین ادیبوں سے نہیں بلکہ قدیم عرب سے ملتا جلتا ہے۔

تھوڑی سی کاوش سے اس کا پتہ بھی لگ جاتا ہے کہ حضرت محدث دہلویؒ نے ادباء متاخرین اور عرب قریب کے اسلوب کے فرق کو کہاں اشارۃً یا صراحتاً بیان فرمایا ہے۔ اگر اس تشریح کو سامنے رکھ لیا جائے تو مسئلہ بہت آسانی سے حل ہو سکتا ہے۔ اس فرق کی مختصر تشریح صراحتاً تو نہیں اشارۃً ”باب ثالث در بیان اسلوب“

بن موجود ہے محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ۱۔

قرآن مابروش متون مبہوب ومفصل قرآن پاک کو متون کی روش پر الجواب اور  
ساختمہ نشدہ تاہر مطلبے زان در بابے فصلوں میں اس طرح تقسیم نہیں کیا گیا ہے  
ادر فصلے مذکور شد۔ کہ (متعلقہ مسئلہ کے) تمام مقاصد اسی باب

(الفوز الکبیر ص ۳۱)

یا اسی فصل میں مذکور ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ کی یہ تشریح حقیقی معنوں میں ”ادبائے متاخرین“ اور  
”عرب اول“ کے اسلوب کی وضاحت ہے۔

## ادبائے متاخرین اور متقدمین کا فرق

ان دونوں طبقوں کے درمیان اسلوب میں جو امتیاز ہے اس کی تفصیل یوں کی جاسکتی

جلال الدین سیوطیؒ کا جنہوں نے اختلاف کرنے والوں کے فکر کو نقل کیا ہے الشیخ ابو العلاء الملوکیؒ کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ”ان القرآن ورد علی الاقتصار الذی ہو طریقۃ العرب من الانتقال الی غیر ملائم“۔ یہاں بھی الشیخ ابو العلاء ”الذی ہو طریقۃ العرب“ کی قید سے تقریباً وہی کچھ کہنا چاہتے ہیں جسے حضرت محدث دہلویؒ نے ”چنانکہ قاعدہ ادباء متاخرین است“ کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

حضرت محدث دہلویؒ ہر ربط کا انکار نہیں فرماتے اور دوسرے حضرات مفسرین ہر ربط پر اصرار نہیں کرتے۔ حضرت محدث دہلویؒ کا انکار صرف ”ربط جلی“ سے متعلق ہے۔ حضرات مفسرین کا اصرار اس پر ہے کہ ”ربط اخفی“ ہر جگہ موجود ہے! اب بھلا بتائیے کہ ربط پر بظاہر اصرار کرنے اور نہ کرنے کے فرق کا اگر لحاظ نہ کیا جائے تو کیا ہر دو قسم کے بزرگوں میں کوئی بھی اختلاف باقی رہے گا؟ اور کیا اس اختلاف کو نزاع لفظی کے علاوہ کچھ اور بھی کہا جاسکتا ہے؟

حضرت مولانا خالد شہر زوریؒ کر دی رحمۃ اللہ علیہ نام آور عالم تھے، ان کو ہر فن میں عجیب و غریب استعداد تھی اور حدیث کی پچاس کتابوں کی سند حاصل تھی۔ ہندوستان کے علماء میں صرف حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ کی فی الجملہ تعریف کرتے تھے۔ ان کا فارسی و عربی کلام سلاست و روانی میں فرمودی و فرزدق سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ ان کے پیر طریقت حضرت شاہ غلام علی صاحب رحمہ ان کے اشعار کو مافی جابی کے ہم پلہ فرماتے تھے۔ عربی و فارسی میں جو قصیدے انہوں نے اپنے پیر طریقت کی شہلی میں ارشاد فرمائے ہیں وہ خسرو اور جامی کے ان قصیدوں سے کم نہیں جو انہوں نے اپنے پیران طریقت حضرت سلطان المشائخ رحمہ اور حضرت خواجہ احمد رحمہ کی مدح میں فرمائے ہیں۔

(تذکرہ مجدد الف ثانی)

## تنقید و تبصرہ

### کچھ شکستہ داستانیں

اشرف عطا صاحب نے تحریک خلافت و ترک موالات، تحریک احوار، تحریک کشمیر، تحریک شہید گنج اور تحریک خاکسار کی مختصر روئداد اور کچھ شکستہ داستانیں کے عنوان سے زیر نظر کتاب میں پیش کی ہے۔ چونکہ موصوف کی سیاسی زندگی کا آغاز خود تحریک خلافت میں حرکت سے ہوا ہے اس لئے یہ کتاب ایک لحاظ سے خود اُن کی آپ بیتی کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ میں حضرت سید احمد شہید اور حضرت شاہ اسماعیل شہید کی شہادت کے بعد برصغیر میں اُحمائے اسلام کی وہ جدوجہد جو حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری تجدید سے شروع ہوئی، اور آخر میں اُسے پنجاب کی سکھ حکومت سے ٹکرا کر اپڑا، ایک طرح سے ناکامی میں ختم ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء میں اسی سلسلے کی ایک اور کوشش ہوئی اور وہ بھی ناکام ہوئی۔ اس کے بعد برصغیر کے مسلمانوں کے باشعور طبقے یا تو نئی تعلیم پاکر غیر ملکی حکومت کی لوکریوں کے حصول میں لگ گئے، یا ان کی کوششیں دینی مدارس کے قیام کی طرف مبذول ہوئیں اور ان مدارس سے بکثرت علماء فارغ التحصیل ہو کر نکلتے گئے۔ غرض ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۰ء تک برصغیر کے مسلمانوں پر بالکل مَرَدَنی چھائی رہی۔ اور ”سیاست“ اُن کے ہاں عام طور پر شجر منوع سمجھی جاتی رہی۔

ہے کہ جیسے جیسے ادبی قدروں میں تبدیلی آتی گئی، مضامین کی تقسیم میں اس کا زیادہ سے زیادہ لحاظ کیا جانے لگا کہ ایک عنوان سے متعلق ساری چیزیں ایک جگہ آجائیں، پھر اس مضمون میں اگر کئی شاخیں نکل سکتی ہیں تو ایک شاخ کی چیز دوسری شاخ میں نہ آنے پائے، جس کی تعمیر کتاب، باب، فصل وغیرہ سے کی جاتی ہے اور پھر ان کتابوں، بابوں، فصلوں میں باہم ربط ایسا ہو کہ آدمی کا ذہن آسانی سے ایک کے بعد دوسرے مضمون تک پہنچ جائے، اور اسے درمیان میں قلعہ محسوس نہ ہو۔ یہی نہیں بلکہ طرز استدلال اور انداز بیان کا بھی اس میں بڑا دخل ہے، پُرچیز عبارتیں، زولیدہ انداز بیان، متقدمین کا خاصہ بن گئی ہے، اور سہل نگاری، سجا طرز تحاطب، روانی بیان متاخرین کا۔!

حتیٰ کہ متقدمین اور متاخرین کی کتابوں کے درمیان فرق کرنے کی یہ اچھی خاصی دلیل بن گئی مثال کے طور پر حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الفقہ الاکبر“ ہی کو لے لیجئے۔ محققین کی اچھی خاصی تعداد یہ کہتی ہے کہ یہ امام صاحب کی تصنیف نہیں ہے اور دلیل صرف یہ ہے کہ اس کے اسلوب اور ترتیب میں متاخرین کی سی چابکدستی ہے متقدمین کا اسلوب اتنا نکمر اور ستمرا ہوا نہ تھا۔

خیر یہ تو نسبت کم مشہور کتاب کی بات ہے، حدیث کی مشہور اور صحیح ترین کتاب ”الجامع الصحیح للبخاری“ ہی کو دیکھئے، شروع سے آج تک محدثین ابواب و تراجم اور احادیث کے باہمی تطبیق و مناسبت میں اپنی فکری صلاحیتیں صرف کرتے آئے ہیں۔ حتیٰ کہ حدیث اور ترجمۃ الباب کے درمیان مناسبت پیدا کرنا الجامع الصحیح للبخاری کے سمجھنے اور سمجھانے کا اونچا معیار سمجھا جاتا ہے۔ کچھ ہی انداز امام ترمذی نے اپنے سنن کے ابواب کی ترتیب میں بھی اختیار کیا ہے۔ انہوں نے بعض جگہ دواپسے ابواب کو ایک جگہ بیان کیا ہے جن میں بظاہر کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی متقدمین کی کتب ابواب کا یہ عام انداز ہے، ان کے یہاں بظاہر دو ابواب میں ربط کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ اس کے برخلاف آپ متاخرین کی کتابوں کا اس نقطہ نظر سے

مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ تدریجاً ربط کو اہم مقام حاصل ہوتا گیا، اور اب تالیف کا اہم ترین جز یہ ہے کہ کتاب شروع سے آخر تک موتی کے پردے ہوئے داؤں کی طرح مرتب و مربوط ہو۔ ہر فصل کا ایک مستقل مفہوم ہو، ہر فصل باب کی رعایت سے لائی گئی ہو اور ہر باب کتاب کے موضوع سے کھلا ہوا ربط رکھتا ہو۔ ادبائے متاخرین اور عرب اول کے انداز بیان کی اس وضاحت کے بعد مولانا انظر شاہ صاحب کی اس تشریح سے کس طرح اتفاق کیا جاسکتا ہے ”قرآن میں ربط کا انکار کسی اور نے نہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کیا ہے“

### قرآن میں ربط پر اصرار کرنے والوں کا محور

جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ جو مفسرین ربط پر اصرار کرتے ہیں وہ بھی تمام آیتوں کے درمیان ربط جلی (کھلا ہوا ربط) نہیں مانتے بلکہ کہیں ربط خفی اور کہیں اخفی مانتے ہیں۔ اور ربط اخفی کی حدیں کیا ہیں؟ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے، کہ اس میں خیالی ارتباط، صمدین اور نقیضین (دو چیزوں کا باہم مخالف ہونا) بھی شامل ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ علاقہ تضاد بھی تو ایک علاقہ ہے، جب ربط کی حدوں کو اتنی وسعت دی جائے گی، تو پھر یقیناً متقدمین ہوں یا متاخرین، ادباء عرب جاہلی ہوں یا چودھویں صدی کے مؤلفین سب کی کتاب میں ربط کی کوئی نہ کوئی قسم ضرور پائی جائے گی، ربط کے مفہوم کی اس وسعت کے بعد تو دنیا میں بہت کم کلام ایسے ہوں گے جن میں ربط نہ ثابت کیا جاسکے۔

### تطبیق کی آسان شکل

اس طویل گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سیدنا الامام مولانا الشاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے یا ان کی طرح جن دوسرے مفسرین نے ربط کا انکار کیا ہے، اس کا طوطہ دوسرا ہے، اور جو حضرات مفسرین ربط پر اصرار کرتے ہیں، وہ چیز دوسری ہے۔ خدا بھلا کرے علامہ

سے جہاں باہر کے مسلمانوں کو قائمہ پہنچا، اور خود ملک کے اندر کانگریس کے ہاؤس مضبوط ہوئے۔ اور اُس کا نام شہر شہر اور گاؤں گاؤں پہنچا، وہاں جیسے ہی اس تحریک کا انداز کم ہوا، مسلمانوں میں باہمی اختلافات شروع ہو گئے، اور اس تحریک کے دوران اُن میں جو اتحاد و یک جہتی پیدا ہوئی تھی، وہ سب ختم ہو گئی۔ اس کتاب کے بعد کے ابواب میں جن دوسری تحریکوں کا ذکر ہے، وہ سب اس دور کی پیداوار ہیں، جس میں مسلمان مختلف سیاسی احزاب میں بٹ گئے اور اکثر یہ احزاب ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہتی تھیں۔

تحریک خلافت و ترک موالات کے اس قدر مقبول ہونے اور شہروں کے علاوہ دور دراز دیہات تک اس کے پہنچنے میں جو چیز سب سے بڑھ کر مدد و معاون ثابت ہوئی وہ علمائے کرام اور انگریزی تعلیم یافتہ طبقوں کا اتحاد تھا۔ آخر الذکر طبقے خواہ کتنی ہی کوشش کریں اس طرح عوام میں نہیں جاسکتے، جس طرح علماء جاسکتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریک کو جہاں انگریزی اسکولوں اور کالجوں سے کارکن طالب علم بھی ملے، وہاں بے شمار عربی مدارس سے علوم دینی حاصل کرنے والے طالب علموں اور علماء کا بھی تعاون حاصل ہوا اور اس طرح یہ تحریک اتنی وسعت اور قوت پاسکی۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ علماء اور نئے تعلیم یافتہ طبقوں کا یہ تعاون دیر پا ثابت نہ ہوا، اور اس کی وجہ سے تحریک خلافت سے مسلمانوں کو کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کی قومی جدوجہد پر جس کا حاصل محکمہ پاکستان کا قیام ہے، کتنا میں لکھی جا رہی ہیں، لیکن ہمارے خیال میں یہ تاریخ ادھوری رہے گی اگر اس میں وہ دور بھی شامل نہ کیا جائے، جب پہلے پہل برصغیر کے مسلمانوں میں انگریزی اقتدار کے خلاف ایک عوامی لہر اُٹھی اور یہ تحریک خلافت تھی۔ اس لحاظ سے یہ کتاب ایک مفید مطالعہ ہے۔

کتاب کے شروع میں پروفیسر محمد سرور کا ایک مبسوط مقدمہ ہے، جس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ حصول پاکستان کی تحریک سے قبل ہماری وہ



سب تحریکیں جن کا اس کتاب میں ذکر ہے، کیوں ناکام رہیں، اور اُن سے خاطر خواہ نتائج نہ مل سکے۔ مقدمہ نگار لکھتے ہیں ”یہ کتاب اس سارے دور کا ایک مختصر سا مرقع ہے۔ اس میں خلافت تحریک سے لے کر مسجد شہید گنج اور خاکساروں کے ذبح عظیم تک کے تمام اہم واقعات جملہ آگئے ہیں۔ عطا صاحب کا اپنا ایک منہجا ہوا اسلوب تحریر ہے۔ جس میں روانی ہے اور خلوص ہے اور پھر یہ داستانیں خود ان کی ہیں جنہیں ان کے قلم نے اُن کے خون جگر سے لکھا ہے۔ امید ہے یہ کتاب بڑی دلچسپی سے پڑھی جائے گی“

ختمات ۳۱۴ صفحے - قیمت ۵ روپے

ناشر - سندھ ساگر اکاڈمی - چوک دینار - انارکلی، لاہور۔

## ہمایوں نامہ

تصنیف گلبدن بیگم بنت بابر شاہ - ترجمہ رشید اختر ندوی - ناشر سنگ میل پبلیکیشن شاہ عالم مارکیٹ، لاہور - قیمت پانچ روپے

فاضل ترجمہ نے ”حرف آواز بیکس“ لکھا ہے کہ برٹش میوزیم میں گلبدن بیگم کی اس تصنیف کا ایک نسخہ تھا جو اس کتاب کا دنیا میں واحد نسخہ ہے۔ مئز انیمیت اور ان کے شوہر نے اس کا فارسی متن پہلی بار شائع کیا، اور اس کے ساتھ اس کا انگریزی ترجمہ بھی کیا۔

جناب رشید اختر ندوی نے اس فارسی متن کو اردو میں منتقل کیا ہے۔ شروع میں ص ۱ سے ص ۱۴۸ تک ہمایوں نامہ کا اردو ترجمہ ہے۔ پھر ص ۱۵۱ سے ص ۲۶۲ تک فارسی متن ہے۔ اس کے بعد ہمایوں نامہ کے انگریزی ترجمہ کا جو دیباچہ تھا، اس کا کہیں کہیں حذف و اضافہ کے ساتھ آزاد ترجمہ دیا گیا ہے۔ کتاب کی کل ضخامت ۳۸۴ صفحے کی ہے۔

جہاں تک اصل کتاب کا تعلق ہے، اُس کی غیر معمولی افادیت و اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے جناب رشید اختر ندوی نے ”ہمایوں نامہ“ کے فارسی متن اور انگریزی دیباچہ دونوں کا بڑا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ ترجمہ صاف و درواں ہے اور اس کا اسلوب بڑا دلکش ہے۔ ہمارے خیال میں اگر کتاب کے شروع میں گلبدن کے مختصر سے حالات آجاتے، جو اس وقت کتاب کے آخر میں دوسرے مضمون سے گٹھڑ ہیں تو زیادہ اچھا رہتا، اور قاری کی دلچسپی اس کتاب سے اور بڑھ جاتی۔

۱۹۱۱ء میں ایک بارگی مسلمانوں میں ایک لہر اٹھتی ہے۔ وہ حرکت میں آتے ہیں۔ اُن کے بڑے بڑے جلسے ہونے شروع ہوتے ہیں، جس میں، تیز تقریریں کی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے بعض اخبارات نکلتے ہیں۔ جو حکومت پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ انگریزی پڑھے ہوئے عوام میں آتے ہیں۔ علماء سیاسی تقریریں کرتے ہیں اور پورے برصغیر کے مسلمانوں میں ایک اضطراب اور ایک ہرجاں برپا ہو جاتا ہے۔

یہ وہ سال ہے جب اٹلی نے طرابلس پر حملہ کر دیا تھا، اور برطانیہ نے ترکی کی فوجوں کو جس کی سلطنت کا طرابلس ایک حصہ تھا، مصر سے، جو قانونی طور پر ترکی کے تابع تھا، اور انگریزی فوج اُس پر زبردستی سے مسلط تھی۔ گزرنے سے روک دیا تھا۔ اور اسی طرح جہاں مسلمان ترکی کی حمایت میں اٹلی سے بے فروختہ تھے، وہاں وہ اسی برصغیر میں ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی دفعہ عوامی سطح پر انگریزوں کے خلاف بھی غم و غصہ کا اظہار کرنے لگے تھے۔

جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان ہوئی۔ جس میں بلقان کی عیسائی ریاستوں نے خود قسطنطنیہ پر دھاوا بول دیا تھا اس کے بعد پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا، جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک جاری رہی، جس کے دوران برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے عراق، شام اور فلسطین فتح کر لئے۔ سرزمین حجاز بالواسطہ اُن کے زیر اثر آگئی۔ ترکی خلیفہ اُن کا قیدی بن گیا۔ اور دنیا بھر اسلام جو کوئی ایک سو سال سے یورپی یلغار کا مقابلہ کر رہی تھی، اس کا آخری مورچہ سر ہو گیا، اور اس مجمع مسکوں پر کوئی ایسا مسلمان ملک نہ رہا جو بالواسطہ یا براہ راست یورپ کی کسی نہ کسی عیسائی حکومت کا غلام نہ ہو گیا ہوگا۔ ۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی اور برصغیر کے مسلمانوں نے دیئے اسلام کو اس لمحے حال میں پایا تو اُن کے دہاں انگریزی حکومت کے خلاف ایک سخت رد عمل ہوا، جس نے اس زمانے میں تحریک خلافت، تحریک ترک موالات اور آل انڈیا کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کی شکل اختیار کی۔

زیر نظر کتاب کا آغاز ہماری قلمی تاریخ کے اس دور سے ہوتا ہے اس ضمن

میں مصنف لکھتے ہیں :-

”ہندوستان میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری قرنگی محل، ڈاکٹر سیف الدین کچلر، مولانا محمود الحسن، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خاں نے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ برصغیر ہندوپاک میں مسلمانوں کی یہ پہلی عمومی اور منظم تحریک تھی، جس نے برطانوی سامراج کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔“

یہ تحریک کتنی ہمہ گیر تھی اس کا ذکر مصنف ان الفاظ میں کرتے ہیں :-

”یہ تحریک اُبھری اور دیکھتے ہی دیکھتے سیلاب کی طرح ہندوستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر بلکہ قریہ قریہ میں پھیل گئی۔ سرفروشان اسلام اور رضا کارانہ تحریک خلافت کا ایک سیلاب تھا کہ اُٹا چلا آتا تھا۔“

انگنہ یہ ہے کہ اس تحریک میں کوئی تیس ہزار مسلمان جیلوں میں گئے، اور جو اچھلنے لگے سختیاں اٹھائیں ان کا تو حساب نہیں۔ اشرف عطا صاحب نے صمیم لکھا ہے کہ اس تحریک کا ملک کے اندر اور ملک کے باہر بڑا اثر پڑا۔ وہ لکھتے ہیں :-

”حقیقت یہ ہے کہ تحریک خلافت نے بین الاقوامی سیاسیات پر گہرا اثر ڈالا اور اس سے ہندوستان میں ہی نہیں، بلکہ ایران، عراق، مصر، وغیرہ میں بھی آزادی کی تحریک کو تقویت پہنچی اور افغانستان میں امان اللہ خان نے انگریزی اثر و نفوذ کا خاتمہ کر کے افغانستان کی مکمل آزادی کا پرچم لہرایا۔“

خود ترکوں کو دوبارہ اپنی آزادی بحال کرنے میں برصغیر پاک و ہند کی اس تحریک سے جو مدد ملی وہ تو ظاہر ہے ہی۔ ہندوستان برطانوی سامراج کا سب سے بڑا اڈا تھا۔ اگر اس وقت یہاں یہ تحریک نہ چلتی تو انگریزوں کے لئے مصطفیٰ کمال سے نمٹنا چنداں مشکل نہ تھا۔

افسوس مسلمانان پاک و ہند کی اتنی عوامی، اس قدر منظم اور اس زبردست تحریک

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
اہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت  
اشاعت کا انتظام کرنا۔

سلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر  
کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے  
والے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

تربیک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دو سکاہل قلم سے  
مابین لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

ماہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا جیلڈ  
ماہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں فروغ دینے کی  
رض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا



Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

## ہمعشت (فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعشت" کا موضوع ہے۔  
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے بغیر انسانی  
تربیت و تزکیہ سے جن بلبند منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اس کا بھی بیان ہے۔  
قیمت دو روپے

## سطح (فارسی)

انسان کی نفسی تکمیل و ترقی کے لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے جو طریق سلوک متعین فرمایا ہے  
اس رسالے میں اس کی وضاحت ہے۔ ایک ترقی یافتہ دماغ سلوک کے ذریعہ جس طرح حظیرۃ القدر  
سے اتصال پیدا کرتا ہے، "سطحات" میں اسے بیان کیا گیا ہے۔ قیمت: ایک روپیہ پچاس پیسے

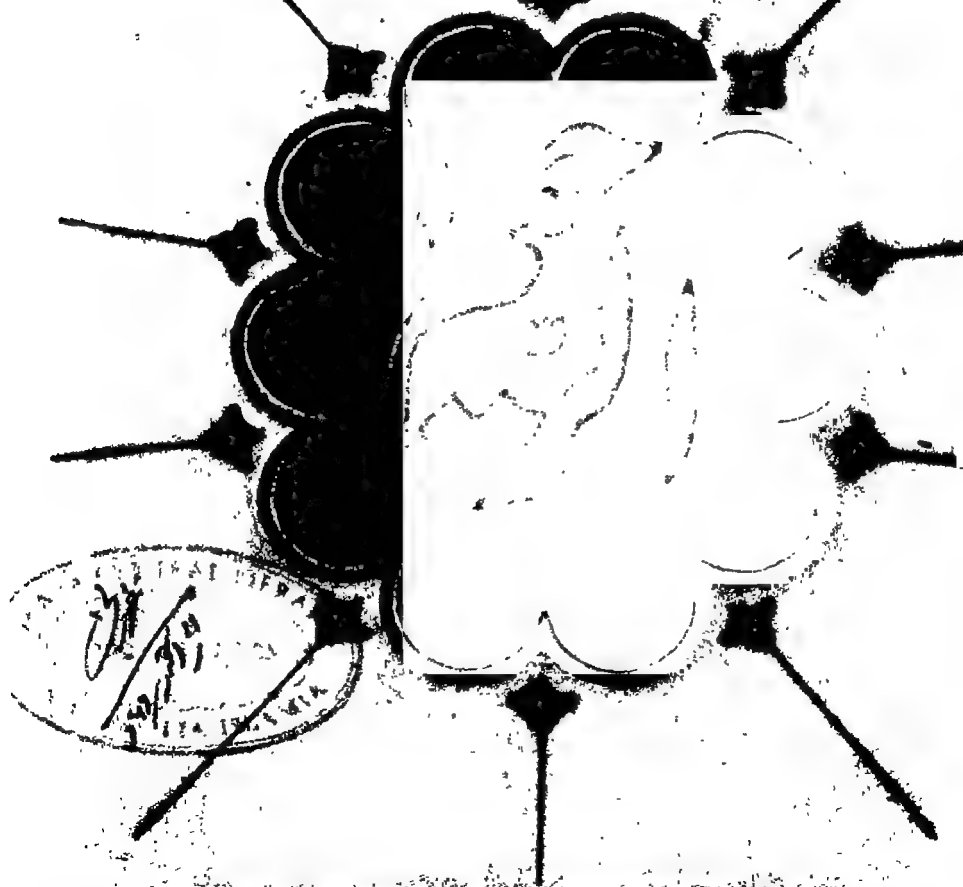
## لمحت (عربی)

شاہ ولی اللہ کے فلسفہ تصوف کی بنیادی کتاب جس سے نایاب تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی کو اس کا ایک پرانا قلمی نسخہ  
لاہور صوفیہ نے بڑی محنت سے اس کی تصحیح کی، اور شاہ صاحب کی دوسری کتابوں کی جہازات سے اس کا مکتبہ بدر کیا۔  
اور وضاحت طلب امور پر تشریحی حواشی لکھے۔ کتاب کے شروع میں مولانا کا ایک مبسوط مقدمہ ہے۔  
قیمت دو روپے

محمد سرور ہاشمی پبلشر نے سعید آرٹ ہاؤس حیدرآباد سے چھپوا کر قائم کیا۔

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

دکھائی



شیر شاہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی • مدینہ منورہ

بسم الله الرحمن الرحيم

۸۷

مجلس اذاعت

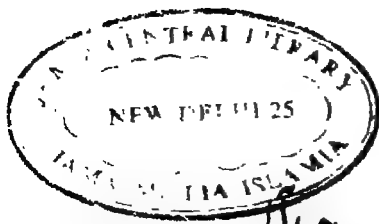
والکرم عبدالواحد علی پوتا،

مخدوم امیر احمد

مدیر

غلام مصطفی قاسمی

بسم الله الرحمن الرحيم  
الحمد لله رب العالمين  
والصلاة والسلام على سيدنا محمد وآله الطيبين الطاهرين  
السلامة والبركات  
في يوم الاثنين ١٠ ربيع الثاني ١٤٠٢ هـ  
١٩٨١ م



# الحجیم

جید آباد

نمبر ۵

ماہ اکتوبر ۱۹۶۶ء  
مطابق جمادی الثانی ۱۳۸۶ھ

جلد ۴

## فہرست مضامین

۳۲۲	مدیر	شذرات
۳۲۵	ابوشاہ خان	مولانا عبید اللہ سندھی کا سفر کابین اور اس کا مقصد
۳۳۲	محمد ایوب قادری	مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے
۳۴۱	طفیل احمد قریشی	علامہ ابن حزم
۳۵۹	عبد الہادی ناصر ایم۔ اے	امام داؤد صاحب السنن سوانح حیات
۳۷۲	محمد خالد مسعود	حکیم ترمذی کی خود نوشت سوانح عمری
۳۹۰	مصنف ڈاکٹر عبدالواحد مالی پوتہ مترجم سید محمد سعید	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ حصہ اول
۳۹۳		مبادیات، اخلاقیات
۳۹۷	ف۔ س	الحکام و آراء تنقید و تبصرو



## شذات

مصر میں حال ہی میں جماعت اخوان المسلمین کے رہنماؤں کو جو سخت سزائیں دی گئی ہیں اور ان میں سے بعض کو پھانسی بھی دی گئی ہے، اس پر کئی اور مسلمان ملکوں کی طرح پاکستان میں بھی بڑی ناراضگی کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ہمارے ہاں بعض مذہبی جماعتوں نے اس اخوس ناک واقعہ پر عوام مسلمانوں کے جذبات کو کافی مشتعل بھی کیا ہے، اخوان المسلمین کے مسلک سے خواہ کسی کو کتنا بھی اختلاف ہو، ان کے رہنماؤں کے ساتھ حکومت مصر نے جو سخت سلوک کیا ہے اس سے یقیناً ہر مسلمان بے غلہ و آثر ہوا ہے۔ اور اس کی یہ ولی خواہش تھی کہ کاش مہر کی حکومت اس معاملے میں نرمی برتتی اور اخوان المسلمین کے رہنماؤں کو اتنی سخت سزائیں نہ دیتی۔

قاہرہ کے بعد نامہ الاحرام میں اخوان المسلمین کے ان رہنماؤں کے مقدمے کی جو روداد چھپتی رہی ہے، وہ ہماری نظر سے گزری ہے۔ اس روداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ان رہنماؤں پر جن الزامات کی بنا پر مقدمہ چلایا گیا تھا، وہ تمام تریاسی نوعیت کے تھے، اور دینی عقائد و اعمال سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ ان الزامات میں غلط یا صحیح تشدد و مسلح قوت کے ذریعہ حکومت کا تختہ الٹنے کا بھی الزام تھا، اس ضمن میں ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ عدالت میں سید قطب مرحوم و مغفور کے سامنے جب ان کے وہ بیانات و سرگئے گئے جن میں انہوں نے موجودہ نظام کو متراسر جالبی قرار دیا ہے۔ اور اسے یخ و یخ سے اکھاڑ پھینکنے کو ہی اس دور میں اسلام کا صحیح منصب و مقصد بتایا ہے تو ان سے پوچھا گیا کہ انہوں نے یہ خیالات کہاں سے اخذ کئے ہیں۔ اس سلسلے میں عدالت نے مولانا مودودی کا نام لیا اور کہا کہ کیا آپ نے موصوف کی کتابوں سے یہ خیالات لئے ہیں، تو سید قطب نے کہا کہ بے شک ایک حد تک۔

عہد حاضر کے پورے پورے نظام کو سراسر جاہلی "قرودینا" اور بے جزیبہ دے کھود کر اس کی جگہ ایک اور نظام لانا جسے بزرگ خود غافل اسلام کا نام دیا جائے اور اس کے سوا باقی سب کچھ غیر اسلامی ہو۔ اور اس زمانے میں اسلام کی اصلی و حقیقی غرض و غایت صرف اسے ہی سمجھنا بڑا خطرناک تصور ہے۔ اور جب یہ ایک علی اور ذوال قہر یک کی شکل اختیار کرتا ہے تو تشدد اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، خواہ زبان سے جمہوریت اور عوام کا لفظ بھی نام لیا جائے۔

ہمارے ہاں جو گروہ اس بیخ پر سوچتے ہیں اور اسلام کے نام سے عوام کو گرویدہ بناتے اور اس طرح مسند اقتدار تک پہنچنے کے منصوبے رکھتے ہیں، ان کے لئے مصر کے ان اللہ کا اقتدار میں بڑی عبرت ہے

مسلمانان پاکستان کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بھی اپنے ہاں کے مدارس عربیہ و دینیہ کی اصلاح کا سلسلہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ابنا مہ برمان، دہلی نے لکھا ہے کہ ایک کمیٹی نے جو جدید و قدیم تعلیم کے مسلمان افاض پر مشتمل تھی، ایک ایسا نصاب تیار کیا ہے جس میں قدیم نصاب تعلیم کی روح بھی محفوظ ہے اور اس میں جدید علوم بھی آگئے ہیں۔ اس نصاب میں انگریزی زبان، تاریخ، جغرافیہ، ریاضی، اقتصادیات، فلسفہ، علم السیاتہ، اور سائنس شامل کئے گئے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم بی بی ایم کے الفاظ میں۔

"ایک طالب علم سولہ برس کی مدت میں اس نصاب کی جب تکمیل کر لیتا ہے، تو ایک طرف اس میں دونوں قسم کے علوم و فنون میں بصیرت پیدا ہو جاتی ہے اور دوسری جانب کسی ایک علم دین میں مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ یا تاریخ اسلام میں یا اس کے متبادل فلسفہ جدید یا عربی ادب میں تخصص کر لیتا ہے، جو ایم اے کے برابر ہوتا ہے۔"

اس کمیٹی کی تشکیل سنٹرل وقت کونسل نے دہلی نے کی تھی، جس کے چیرمین ایک مسلمان مرکزی دیرینہ کونسل اس نصاب کو حتمی الواسع خود بھی نافذ کرے گی اور اس نصاب کو دینی مدارس کو بھی یہ نصاب اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں اس دور کے تمام علوم پڑھائے جاتے تھے۔ اور آج کی طرح اس وقت علوم کی دو قسمیں نہ ہوتی تھیں کہ ایک تو دینی علوم ہوں، اور دوسروں کو دنیوی علوم کہا جائے۔

مہی وہ نواح ہے جس میں یوسپ کے اطراف و کثافت سے طالبان علم مسلمانوں کی درس گاہوں کا نسخہ کیسے ادا  
 دیاں سے کسب فیض کرنے کے بعد اپنے اپنے ملکوں میں بکھر گئے۔ عوام و انکار کو بھلائے تھے۔ لیکن جب نعلی آیا تو  
 بدقیصوں کے ساتھ ہم اس علمی جامعیت سے بھی محروم ہو گئے۔ اور ہماری پوری زندگی کوئی فکر و عمل کا شکار ہو گئی۔  
 قدیم علوم جو صدیوں تک ہمارے ہاں زیر تدبیر رہے۔ اب تک ہمارے دینی مدارس میں پائیز  
 پاسکے ان دونوں پر مشتمل نصاب اور اس کے مطابق تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ دین کے اسلام میں ایک عرصے سے  
 کیا جا رہا ہے۔ اور اس صدی میں ہر ملک میں تعلیم درجہ درجہ نصاب تعلیم لایع کر کے کی کوشش ہو  
 رہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں دارالعلوم دیوبند اور اہم لوکان علی گڑھ کے بعد نفع العلماء و کفو دار جامعہ اسلامیہ  
 دہلی وغیرہ کو قیام اپنی کوششوں کے نشان راہ میں مصروف ہیں۔ یہی مسند و پیش تھا امداد جامعہ ازھر کے علاوہ دارالعلوم  
 اور جدید طرز کی جامعات اسی مقصد کے حصول کے لئے وجود میں آئی تھیں۔

جامعہ ازھر صرف اسلامی دنیا کی نہیں، بلکہ پوری دنیا کی قدیم ترین جامعہ ہے، گزشتہ صدی کے اواخر میں  
 شیخ محمد عہد نے اس میں چند ضروری اصلاحات، تذکیرائے کی کوشش کی تھی، لیکن وہ اس وقت زیادہ کامیاب  
 نہ ہو سکے، لیکن بعد میں آہستہ آہستہ جامعہ ازھر تجدید و اصلاح کے اثرات پر برسرِ قول کرتی گئی۔ تقرباً  
 ۱۹۳۲ء میں اس میں الگ الگ کلیئہ اللغة العربیہ، کلیئہ اصول الدین اور کلیئہ الشریعہ کھولی گئیں، جن میں  
 میٹرک کے درجے کے بعد ازھر کا ایک طالب علم داخلہ لے سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہر طالب علم کو اولیہ  
 آخر تک ایک ہی نصاب پڑھنا پڑتا تھا۔

حال میں جامعہ ازھر میں نئے علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کے لئے چار نئی کلیات  
 (کالج) کھولی جا رہی ہیں۔ کلیئہ الزراعة، کلیئہ العلوم، کلیئہ طب الانسان اور کلیئہ بطری (دو تھری) اس کے  
 علاوہ دس نئے معاهد (انسٹی ٹیوٹ) بھی قائم ہو رہے ہیں۔ ایک معہد الزہدیت اور دوسرا معہد لغات و ترجمہ۔  
 جب عالم اسلام میں معاشرتی اور اقتصادی تغیرات ہوں گے تو ان کے ساتھ فکری، علمی و تعلیمی تبدیلیوں  
 کا آنا لا بد ہے اور وہ آئی ہیں۔

## مولانا عبید اللہ سندھی کا سفر کابل اور اس کا مقصد ابو شامہ خان

مولانا عبید اللہ سندھی مارچ ۱۸۷۲ء میں سیالکوٹ کے ایک گھاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماں باپ سمجھتے تھے لیکن ان کی قسمت میں ایران کی دولت لکھی تھی ابھی ان کی عمر چودہ سال سے زیادہ نہ تھی اور مڈل اسکول کے طالب علم تھے کہ تحفۃ الہند نامی ایک کتاب ان کے ہاتھ لگی۔ اس کتاب کے مطالعہ نے اسلام کی صداقت ان کے دل پر نقش کر دی۔ تقریباً تین سال تک وہ فقیہ طور پر اسلام کا مطالعہ کرتے رہے سنہ ۱۸۸۸ء میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ تقریباً دو سال تک وہ سندھ اور بھادویہ کے بعض مقامات پر دینی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ مسئلہ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے۔ اور اپنی ذہانت و قابلیت کی بنا پر سر جلد ہی اساتذہ کی نظروں میں محبوب ہو گئے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اس جوہر قابل کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ آپ ہی کی ہدایت کے مطابق حضرت شاہ مجاہد کے علوم و معارف اور حضرت اسماعیل شہید کے مجاہدانہ کارناموں نے ان کی انقلاب پسند طبیعت کو خاص طور پر متاثر کیا۔ حضرت شیخ الہند نے ان کو برصغیر ہندوپاکستان کی سیاست سے آگاہ کیا، اکابر سے ان کا تعارف کرایا۔ چند سال تک دیوبند اور بریلی میں اپنے قریب رکھ کر ان کی سیاسی تربیت فرمائی اور جب ہر طرح ان کے فکر و عقیدہ علم و بصیرت اور استقامت و عزیمت کو قلیل اعتماد پایا تو انہیں اپنے فقیہ مشن کا ایک ممبر بنالیا اور اوائلی سال ۱۹۱۵ء میں انہیں کابل بھیجے کا فیصلہ کیا۔

اس وقت تک مولانا عہد اللہ سندھی کو کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا اور جیسا کہ مولانا سندھی نے خود لکھا ہے کہ "میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن تعمیل حکم کے لئے جانا ضروری تھا۔" لیکن کابل پہنچ کر مولانا سندھی کو ان کے سفر کے مقصد اور اس کی اہمیت کا علم ہو گیا مولانا نے فخر کے ساتھ لکھا ہے کہ

۱۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ جس جامعہ کے نایب رہے تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میسر رہنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لئے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادم شیخ الہند کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

(کابل میں سات سال ۱۳۸۵ھ)

اس سفر کا مقصد یہ تھا کہ سلاطین میں جب جنگ عظیم چھڑ گئی تو حضرت شیخ الہند کی عبادت کے مرکز یا غنڈہاں سے جہاں مولانا سیف الرحمن اور حاجی ترنگ زئی وغیرہ حضرات موجود تھے اور عرصہ سے جماعت کی تنظیمی ضروریات انجام دے رہے تھے، ان کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا حکم پہنچا کہ اب سکون سے کام کرنے کا وقت نہیں۔ میدان میں آ جانا اور سرکف ہو کر کام شروع کر دینا لازمی ضروری ہے۔ مرکزی حضرات نے اصرار کیا کہ آپ یہاں پہنچ جائیں تو آپ کی سرپرستی میں ہم بخوبی اپنی مدد و جہد کر سکیں گے۔ مگر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہندوستان سے مالی اسباب کے فراغ سے سراسر انجام دے رہے تھے۔ اور صراحتاً یہی جگہ چھڑ جانے کی وجہ سے بہت لمبا وہ محنت و مشق ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ سرحد میں مجاہدین کے اجتماع کو دیکھ کر انگریزی فوج نے حملہ کر دیا۔

مجاہدین نے ہنایت بے جگرگی کے ساتھ ٹک کر مقابلہ کیا اور پلٹنوں کی پلٹیں انگریزوں کی صاف کر دیں، جن کو انگریزوں نے ظاہر نہیں کیا اور بے شمار فوج سرحد پر پہنچا دی۔ سرحدی مجاہدین نے پوری سرگرمی کے ساتھ مقابلہ کر کے انگریزی طاقت کو بے حد نقصان پہنچایا۔ مگر تاہم انگریز کی ٹانہ ٹانہ کی فوج بے شمار سامان و رسد بے ہنایت سالن

جنگ اوردو سری طرف یا غمستان کے مفلس اور بے یار و مددگار عوام باشندے۔ نتیجہ ہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ جب جمہوریت کے کھانے کا سامان ختم ہو جاتا تو اس کو موچہ چھوڑ کر ریسک کے لئے اپنے دور دراز گاؤں کو ٹھٹھا پڑتا تھا۔ کار توں ختم ہو جاتے تو ان کے حاصل کرنے کے لئے سورج خالی کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے وہاں سے درخواست آئی کہ جب تک کسی منظم حکومت کی پشت پناہی نہ ہو، ہماری شجاعت اور جاں بازی بے کار ہے، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ آزاد جمہورتوں کی پشت پناہی ضرور حاصل کی جائے۔

تاہم میں مولانا عبید اللہ سندھی کو کابل بھیجا گیا اور حضرت شیخ الاسلام نے خود جہاز تشریف لے جانے اور وہاں ترکی زعماء سے مل کر ان کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ (نقش حیات از مولانا حسین احمد مدنی)

اکتوبر ۱۹۷۷ء میں مولانا سندھی کابل پہنچے لیکن ان کے کابل روانہ ہونے کی اطلاع تحریک جہاد کے رہنماؤں افغانستان میں تحریک کے ہی خواہوں اور ہمدردوں کو پہلے ہی پہنچ چکی تھی، اسی لئے کابل کے پورے سفر میں ان کے لئے راہ کھلتی چلی گئی۔ مولانا نہ ہی کابل میں باہر رٹ حاصل کئے بغیر غیر قانونی طور پر داخل ہوئے تھے۔

لیکن افغان حکومت کے اپنے درجے کے لوگوں میں جو تحریک جہاد اور ہندو پاکستان کی آواز کی تحریک سے ہمہ روی رکھتے تھے ان کی بدولت مولانا کو کہیں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ اور نہ انہیں بریٹانی میں مبتلا ہونا پڑا۔ مولانا کے لئے اس سفر میں جو آسائیاں فراہم ہوتی تھیں اس پر انہیں خوشی اور تعجب ہوا لیکن ایک مدت تک انہیں اصل حقیقت کا پتہ نہیں چل سکا۔ کابل پہنچنے کے کچھ دنوں بعد رب مولانا کا اکابر حکومت اوردو بھر زعماء ملت سے تعارف ہوا تو رفتہ رفتہ انہیں معلوم ہوا کہ ان کے سفر اور مقصد سفر کو دونوں کو پہلے سے علم تھا اور ان کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں:-

”ایک عجیب بات وہاں میں یہ نظر آئی کہ ہمارے اس سفر کے متعلق خاص

طو پر ان کے پاس اطلاعات تھیں انہیں جب ابھی طرح الطیمان ہو گیا کہ میرا ہی

نام عبید اللہ ہے تو بہت مسرور ہوئے۔“

لیکن مولانا سندھی کو جس مقصد کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا تھا اور حضرت شیخ الہند کی پراساس کو کششوں کا جو ماحصل ان کے سامنے غیر منظم صورت میں موجود تھا، اس مقدمہ میں کامیابی اور حالات پر قابو پانا آسان نہ تھا۔ انگریزی دہلیویسی براہر اپنا کام کر رہی تھی اور کامیاب تھی۔ بادشاہ اور امرا کی خود غرضیوں نے ان کے کام کو ناممکن بنا دیا۔ حکومت انگریزوں کے اشاروں پر کام کرتی تھی۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کو اپنی امارت اپنی سالانہ گرانٹ میں اضافہ اور اپنے بعد بھائی کی امارت کی بجائے اپنے بیٹے کی امارت سے زیادہ دلچسپی تھی اور ملت اسلامیہ کے عمومی مفاد کی بجائے وہ اپنے ان اغراض کی خاطر انگریزوں کے ہاتھوں میں کس طرح کھیل رہے تھے، اس کا اندازہ مولانا سندھی کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستانوں، ترکوں اور جرموں کا جو مشن کابل اس خیال سے آیا تھا کہ وہ امیر افغانستان حبیب اللہ خاں کو ہندوستان پر حملہ کرنے پر آمادہ کر سکے گا۔ اس مشن کی جو گفتگو اعلیٰ حضرت سے ہوئی وہ حرف بحرف برٹش قول فعل کے ذریعے دائرے کو بھج دی جاتی۔ اس کے معاوضے میں کافی روپیہ انگریزوں نے اعلیٰ حضرت کے لئے بھیجا۔ اور ان کے سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہو گیا۔

جہاں سیاسی جوڑ توڑ سے کام نہیں چلتا تھا۔ وہاں مسلمانوں کے مذہبی جذبات اور علماء و صوفیاء سے ان کی عقیدت کو آلہ کار بنایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب معین السلطنت کو ان کے بعض خیالات سے باز رکھنا مشکل ہو گیا تو حضرت صاحب چارباغ کو جو کہ معین السلطنت کے راجہ عنایت اللہ کے مرشد تھے، انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس خدمت کے لئے بلا دیا اور معین السلطنت کو اپنے قومی اور مذہبی فیصلہ سے علیحدہ رکھنے میں کامیاب ہو گئے اور یوں خواب سننے کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں اس کام کو پورا کروں :-

ان حالات میں ان توقعات کے پورا ہونے کا جو افغانستان کی مسلمان حکومت سے وابستہ کی گئی تھیں، سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ہندو پاکستان سے مولانا سندھی ایک خفیہ مشن پر بھیجے گئے تھے لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ کوئی لازمی نہیں جن سے انہماک مقابلہ میں امداد و تعاون کی امید کی گئی تھی وہ اعتبار کے یا رمددگار تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی کو افغانستان بھیجنے کے بعد حضرت شیخ الہند نے حماد کا قصد فرمایا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر حضرت شیخ الہند نے غالب پاشا گورنر مکہ سے ملاقات کی۔ غالب پاشا کو چونکہ پہلے سے حضرت شیخ اور ان کی تحریک سے واقف کر لیا جا چکا تھا۔ اس لئے اس کے سامنے صرف مطلب زبان پر لانے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔

غالب پاشا نے بھری پاشا گورنر مدینہ منورہ کے نام ایک خط دیا اور اور پاشا اہل جمال پاشا سے حضرت شیخ الہند کی ملاقات کراہینے کی سفارش کی اور ویدھارا کیبن دولت عثمانیہ اور زعماء ملت کے نام خطوط دیئے مدینہ منورہ پہنچ کر حضرت شیخ الہند نے اور پاشا اور جمال پاشا سے ملاقات کی اور صورت حال سے انہیں آگاہ کیا۔ آئندہ پروگرام کا نقشہ انہوں نے چلایا اور ان سے امداد کے طالب ہوئے۔ اور پاشا پہلے سے اس چیز کے متنی تھے۔ انہوں نے حضرت شیخ الہند سے امداد کا وعدہ فرمایا اور چند مہینے لگھ کر حضرت کو دیئے جس میں آزاد قبائل کے باشندگان کو امداد کا اہتمام دلایا گیا تھا۔ حضرت شیخ الہند نے مولانا دہادی حسن خاں کے نام وہ وثیقے ہندوستان بھیجے اور خود اطراف بغداد سے بھری راستہ سے روانہ ہو کر مکران ہوتے ہوئے آزاد قبائل پرانے کا منصوبہ بنایا لیکن شریف حسین کی بغاوت کی وجہ سے ہمارے حالات نے یک لخت پلٹا کھایا۔ حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کو گرفتار کر کے مالٹا ترسیع دیا گیا اور اس طرح یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ چونکہ حضرت شیخ الہند کے منصوبے اس میں مولانا عبید اللہ سندھی کے کردار اور ان کے سفر کا بل کے مقصد پر رولٹ ایکٹ کمیٹی کی رپورٹ سے کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے اس کے بعض حصے یہاں پیش کئے جاتے ہیں رولٹ ایکٹ کمیٹی کے ارکان تحریر فرماتے ہیں۔

”یہ ایک عجیب و غریب جو ہندوستان میں تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمالی مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو۔ اور ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں۔ اور سلطنت برطانیہ کو تباہ و برباد کر دیا جائے۔ اس عجیب و غریب پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لئے ایک شخص مولوی عبید اللہ نے اپنے رفقاء کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمالی مغربی سرحد کو عبور کیا۔..... روادہ ہونے سے پہلے عبید اللہ نے



دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کمٹیاں معرض اشاعت میں لایا جن میں ہندوستانی مسلمانوں کو ججی اور مذہبی جویشن کی ترغیب دی گئی تھی۔ اور ان کو جہاد کے فرض اولیٰ کے ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود حسن بھی شامل ہیں، عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت زبردست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بقاوت سے اسے تقویت پہنچے۔

عید اللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنوناں مذہبی کے پاس گئے۔ اور اس کے بعد کابل پہنچے۔ وہاں وہ ترکی جرمی کے مجرموں سے ملے اور ان سے بتا دلخیا لا کیا تھوڑے عرصہ کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آ ملا۔ یہ آدمی مولانا محمود حسن کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۷۷ء میں وہ اعلان جہاد ساتھ لے کر آیا جو جہاد کے ترکی فوجی حاکم غالب پاشا نے مولانا محمود حسن کو دیا تھا۔ انشاء راہ میں محمد میاں اس تحریر (جو غالب نامہ کے نام سے مشہور ہے) کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا۔

عید اللہ اور اس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی کہ جب سلطنت کو مٹایا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے ایک شخص جو عید اللہ کو اچھی طرح جانتا ہے وہ اس کی نیت لکھتا ہے کہ عید اللہ تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب غریب اور غیر معمولی آدمی تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی سلطنت کا حکمران ہے کابل میں عارضی حکومت ہند قائم ہوئی تو اس کا ایک اہم رکن عید اللہ بھی تھا۔ حکومت عارضی نے ترکی گورنرٹ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز بھی کی اور اس مقصد کے حصول کے لئے عید اللہ نے اپنے پرانے دوست محمود حسن کو خط لکھا اور شیخ عبدالرحیم سندھی کے پاس بھیجا کہ وہ اسے کسی معتبر حاجی کے ہاتھ مولانا محمود حسن کو جو اس زمانہ میں عرب میں تھے، پہنچ دے۔

چونکہ یہ خط اور اس کے ساتھ دیگر خطوط زرد ریشی کپڑے پر لکھے ہوئے تھے، ان خطوط میں جرمین اور ترک و قود کا کابل میں آنا، ان کی مصروفیت، غالب نامہ کی اشاعت

حکومت کی تجویز، سیاسی حالات کی تفصیل اور ایک فوج کی تیاری کی تفصیلات تھیں، اس فوج کے لئے یہ تجویز تھی کہ اس کے لئے ہندوستان سے رنگرٹ بھرتی کئے جائیں۔ اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔ مولانا محمود حسن ان تمام معاملات کو حکومت عثمان تک پہنچانے پر مقرر کیا گیا تھا۔ عید اللہ کے خط میں خدائی فوج کا ایک نقشہ بھی تھا۔ اس فوج کا ہیڈ کوارٹر مدینہ اور اس کا جنرل انجینئر مولانا محمود حسن ہونے والا تھا۔ مگر یہ کوارٹر مقامی جرنیلوں کے ماتحت قسطنطنیہ، طہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے کابل میں خود عید اللہ جرنیل مقرر ہونے والا تھا۔

ادھر کی سطوح میں رولٹ ایکٹ کیٹی کی رپورٹ سے جو اقتباس پیش کیا گیا ہے اس سے مولانا عید اللہ سندھی کے سفر کابل کے مقصد ان کے عزائم اور کابل میں ان کی مصروفیت پر روشنی پڑتی ہے۔ مولانا سندھی کی ہنگامہ خیز اور انتہائی معروف سیاسی زندگی کی یہ صرف ایک جھلک تھی۔

## المسوی من احادیث الموطا

### عربی

حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۴ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جگہ بہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شرح المعنی پر مولف امام نے جو مبیوط مقدمہ لکھا تھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کروایا گیا ہے۔ ولایتی کپڑے کی نفیس جلد کتاب کے دو حصے ہیں۔ قیمت سے ۲۰ روپے

# مولانا محمد احسن نانوتوی کے علمی کارنامے

محمد ایوب قادری

**حمایت الاسلام** جب سر سید احمد خاں ۱۸۶۹ء میں لندن گئے تھے تو ان کے پیش نظر مشہور مصنف ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب لکھنا بھی مقصود تھا۔ چنانچہ انہوں نے لندن میں کافی مواد جمع کیا۔ انگلستان کے ایک معروف مصنف گاڈ فری بیگنس کی کتاب اپالوجی جو اس نے تائید و حمایت اسلام اور عیسائیوں کے اعتراضات کی تردید میں لکھی تھی سر سید احمد خاں نے بہت تلاش و جستجو کے بعد کسی جرس کتب فروش سے دس مہینے قیمت دے کر حاصل کی اور خطبات احمدیہ کی تالیف میں اس سے مدد لی۔ سر سید احمد خاں کو خیال ہوا کہ اس مکتب کا اردو ترجمہ بھی ہونا چاہیئے چنانچہ انہوں نے مولانا محمد احسن کو یہ کام سپرد کیا۔ مولانا نے اس کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیا بلکہ مولف تنبیہ الجہال کا کتب خانہ کے اس ترجمہ میں مولانا محمد احسن کے شاگرد فضل رسول (طالب علم بریلی کالج) بھی مددگار رہے چونکہ اس زمانہ میں کچھ لوگ .... اثر این عباس مولانا محمد احسن کے خلاف تھے اس لئے مولانا نے اس ترجمہ کو منشی جہاںودود کے نام سے

۱۔ حیات جاوید (حصہ دوم، دینی خدمات) از مولانا الطاف حسین حالی مطبوعہ مطبع

مفید عام آگرہ (طبع ثانی ۱۳۰۷ھ)

۲۔ تنبیہ الجہال ص ۱۲

۱۲۹۰ھ میں مطبع صدیقی بریلی سے شائع کیا منشی عبدالودود کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ وہ یوں صاحب تھے ترجمہ نہایت صاف اور سلیس ہے نمونہ درج ذیل ہے۔

• عیائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مسائل نے وہ درجہ نشہ دینی کا اپنے پیروں میں پیدا کیا کہ جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرتے فائدہ ہے جب عیسیٰ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدی کو موت کے پہنچنے میں چھوڑ کر چلے گئے برعکس اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے پیغمبر اسلام کے گرد آئے اور آپ کے بھاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔“

کتاب حمایت الاسلام سرسید احمد خاں کے مصارف سے طبع ہوئی اور اس کے جملہ حقوق محمدن ایگلواؤنٹیل کالج قدیچی کے لئے محفوظ رہے اصل کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا ہم اپنے محترم بزرگ جناب پروفیسر منیار احمد صاحب بدایونی (شعبہ فارسی سلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے شکریہ گزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے چنداقتباسات تہجد مترجم التماس معین اور صرف آخر لٹن لائبریری سلم یونیورسٹی علی گڑھ سے نقل کر کے بھیجے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مشہور رسالہ الانصاف فی بیان سبب اختلاف کشف کا اردو ترجمہ مالک مطبع مجتہبی دہلی کی درخواست پر رسالہ کشف کے نام سے ۱۸۸۹ء میں کیا اگرچہ اس رسالہ کا ترجمہ اس سے پہلے بھی بعض لوگوں نے کیا تھا۔ مگر ان میں بہت سی غلطیاں رہ گئی تھیں مولانا محمد حسن نے نہایت محنت و کاوش سے بہت صحیح و درست ترجمہ کیا۔ رسالہ میں ایک فہرست مفاین بھی لگادی قطعہ ذیل سے تاریخ نکلتی ہے۔

جس گفٹری یہ ترجمہ پورا ہوا جس کا ہر مطلب نہایت صاف ہے  
مصرع تاریخ ہاتف نے کہا ترجمہ انصاف کا کشف ہے

اس رسالہ کا ترجمہ مولانا عبدالشکور صاحب کھنوی (ف ۱۹۶۸ء) نے بھی کیا ہے۔ سال ۱۹۲۵ء میں اس کتاب کا اردو ترجمہ مولوی صدر الدین اصلاحی صاحب نے "اختلافی مسائل میں اعتدالی کی راہ" کے نام سے کیا ہے جو کہ دفتر جماعت اسلامی پھر وہور سے شائع ہوا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مشہور رسالہ عقیدہ الجہاد فی سبیل اللہ کے بارے میں مولانا محمد امجد علی صاحب نے "سلسلہ موارید" کے نام سے کیا ہے۔ ترجمہ نہایت صاف اور آسان ہے حسب ضرورت تشریح و وضاحت کی ہے اور مضامین کو آسان کرنے کے پیش کیا ہے حاشیہ پر بعض مفید حواشی بھی لکھے ہیں۔ مولانا محمد امجد علی صاحب نے اکثر کتابوں کو اپنے مفید حواشی اور ضروری حواشی و تصحیح تیس کے ساتھ مرتب کیا۔ مولوی عبدالاحد مالک مطبع جہانگیر دہلی نے اکثر کتابیں مولانا محمد امجد علی صاحب کے حواشی اور تصحیح کے ساتھ شائع و طبع کیں۔ یہیں جو کتابیں معلوم ہو سکیں وہ درج ذیل ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور و معرکتہ الآلات کتاب **حجت اللہ البالغہ** جتہ اللہ البالغہ سب سے اول ۱۲۸۶ھ میں مولانا محمد امجد علی صاحب نے مطبع مدینتی بریلی سے شائع کی مولانا محمد امجد علی صاحب نے نظر تصحیح و مقابلہ کے لئے جتہ اللہ البالغہ کے چار قلمی نسخہ ملو کہ مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولوی ارشاد حسین رام پوری، مولوی ریاض الدین ساکوری اور مولوی احمد من مراد آبادی کے رہے۔ مولانا محمد امجد علی صاحب نے مقابلہ تصحیح و تحشیہ کے فرائض بڑی خوبی سے انجام دیئے مولانا نے درج ذیل قطعہ تاریخ لکھا ہے۔

احمد اللہ قاضی الاوطار	معلی العلم معلی الافکار
داصلی علی النبی المصاوی	سید الخلق احمد المختار
بعد هذا فافهم حکم	جمعت الکرام والاخيار
رحمہ اللہ من افادها	ما سمعت بمثلہ الاخبار
واذا تم طبعها کلا	وحدتھا صاحب الا بصار
فاذا بالقت يقول ان کتب	جمعت اللہ معافہ الاسرار

دیگر

محنت اللہ الباقیہ مکملہ

۱۷۸۹  
۱۸۶۹

**ازالۃ الخفا** حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی دوسری معرکہ آلا تصنیف ازالۃ الخفا بھی سب سے اول <sup>۱۷۸۹</sup> ۱۸۶۹ء میں مطبع صدیقی بریلی سے مولانا محمد احسن نے شائع کی اس کتاب کے مولانا محمد احسن کو صرف تین نسخے تصحیح و مقابلہ کے لئے مل سکے۔ تحشیہ کا کام مولانا نے بڑی محنت سے کیا جیسا کہ خاتمہ کتاب میں خود لکھتے ہیں یہ

۱۔ ہاد جود تلاش کیشہ صرف سہ نسخہ بہم شہد بودند یکے از آہن  
جناب منشی صاحب ممدوح (منشی جمال الدین مدار الہام) از  
بھوپال فرستادند دوم جناب فیضت مآب مولوی احمد من  
صاحب مراد آبادی عنایت فرمودند و سوم المی زین جناب مولوی  
نورالحسن صاحب مسرور کاندھلوی مرحمت کردند۔ ہر چند ہر نسخہ  
مملو از اغلاط بودہ مگر بمقابلہ یک دیگر حق صریح اکثر ظاہر  
می شد و آنجا کہ ہر نسخہ در غلطی موافق بودند رجوع بکتب دیگر  
کرده می شدہ آید اگر کتب دیگر ہم نشانہ بہم رسید چیزے از  
محو اثبات بھل آوردہ می شد و اکثر جا از تصرف خود بر حاشیہ اطلاع  
کرده ام؟

کتاب کے آخر میں قطعات درج ہیں:-

از مولانا محمد احسن نالندوی

بود میسل کلکم زہرہ سجود بدرگاہ حق و ولی و قریب  
کہ از فضل خود اب رحمت کشد پہ ختم این نسخہ بن قریب

بروح معصت خدایا ز جود کئی رحم پہم بجاو حبیب  
 ز تقصیر خود حرف شک و زود نہی نسخہ وردوا حسن طیب  
 پہلے سال طبعش لم را ر بود تفکر بیدان صدر حبیب  
 ز با تلف یکایک ندائے شنود  
 دلیل خلافت بوجہ عجب

۱۷۸۶  
 ۱۸۹۹

از سید احمد شاہ بریلوی

بمعد اللہ اس نسخہ پیشال شہ طبع در ساعت باسعادت  
 بہ تصحیح تحریر احن ملقب مہات او یافت من کفایت  
 چہ از مل شکل چہ شرح غریب خوشی اودا واد و وضاحت

بقیہ حاشیہ ص ۱) سو سال کا عرصہ ہونے آیا مگر یہ اصل کتاب آج تک دوبارہ شائع نہیں  
 ہوئی ہے حالانکہ اس کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس کا حقیقی اور معنیٰ فیض شائع کیا  
 جائے شوال ۱۳۳۳ھ میں مفتی انشا اللہ نے حمید یہ ایڈم پریس لاہور سے ازالۃ الخفا  
 کا اردو ترجمہ شائع کیا جو کثیر الا غلط ہے۔ اس کتاب کے ایک حصہ کا ترجمہ مولانا عبد الشکور  
 لکھنوی نے کیا غالباً ۱۹۵۹ء میں کراچی کے ناشر محمد سعید اینڈ سنس (قرآن محل کراچی)  
 نے ازالۃ الخفا کا اردو ترجمہ دو جلدوں میں شائع کیا ہے۔ یہ مولوی انشا اللہ والا ترجمہ  
 ہے مترجمین میں مولانا عبد الشکور کا بھی نام شامل کر دیا ہے۔ کراچی کے مشہور ناشر  
 نور محمد کارخانہ تجارت کتب بھی مولانا عبد الشکور لکھنوی کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں جس  
 کی پہلی جلد منظر میں شائع ہو چکی ہے۔

مورخ شہیر مولانا محمد میاں، ناظم جمعیتہ العالمیہ ہند (دہلی) نے ازالۃ الخفا کا توفیقی  
 و تشریحی ترجمہ شائع کرنا شروع کیا ہے جس کے چار حصے شائع ہو چکے ہیں۔

بیایند بینندگان خط وافی ز کشف غوامض باقلانے غایت  
بے ذات ادب و علم و جوهر رانم سخن از کمال مطایرت  
جو تاریخ طبعش بحسب زمانہ  
بفسر مودکائی بیان خلافت .

۱۸۸۶ء  
۱۸۶۶ء

شفاء قاضی عیاض شفاء قاضی عیاض کو ۱۸۸۶ء میں مولانا محمد امین نے تصحیح  
کے بعد اپنے مطبع مدنی بریلی سے شائع کیا۔ نصف کتاب  
پر مولانا احمد بن مراد آبادی المتوفی ۱۸۸۶ء نے حاشیہ لکھا ہے اور لقیہ نصف پر مولانا  
محمد امین نے حاشیہ کی تکمیل کی ہے قطعہ تاریخ دہلی میں ہے۔

بذل المعصی جمعہ و معناه لیجوز من غیر العدی بشفاعت  
یا قارنا باللہ قتل فی حقہ یغفار رب العالمین برحمتہ  
شمت عام الطبع ارفق قائل  
بمنہ کمل الشفاء برافتہ

۱۸۸۶ء  
۱۸۸۶ء

کنوز الحقائق مولوی عبدالعزیز ناک مطبع مجتہائی دہلی کی فرمائش پر مولانا محمد امین  
نے کنز الدقائق پر نہایت جامع حاشیہ کنوز الحقائق کے نام سے عربی میں  
لکھا یہ حاشیہ نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ اس کی تکمیل مولانا حبیب الرحمن دیوبندی  
نے کی ہے مطبع مجتہائی دہلی میں چھپا ہے۔

نفحات الیمین عربی کے مشہور ادیب احمد بن محمد الشروانی الیمینی المتوفی ۱۲۵۶ھ  
ربیع الاول کی عربی ادب کی معروف کتاب نفحات الیمین فیما یزول  
بذکرہ الشہن پر مولانا محمد امین نے فارسی میں حاشیہ لکھا ہے۔ مولانا کا محشی نسخہ  
مطبع مجتہائی دہلی سے شائع ہوا ہے اصل کتاب کلکتہ سے ۱۲۲۶ھ ایک انگریز مستشرق  
ایم لیسنڈن نے شائع کی تھی۔



نصاب کی کتاب خلاصۃ الحساب پر مولانا محمد احسن نے ماشیہ لکھا ہے جو مطبع مجتہائی دہلی میں چھپا ہے۔

**قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین** حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کی مشہور کتاب مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتہائی دہلی مولانا محمد احسن نے یہ تصحیح تمام مرتب کی مسرود کی حواشی لکھے ۱۸۹۶ء میں مطبع مجتہائی دہلی میں یہ کتاب شائع ہوئی ابھی حال ہی میں یہ کتاب پشاور میں چھپی ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کے فتاویٰ مولوی عبدالاحد کی فتاویٰ عزیزی درخواست پر مولانا محمد احسن نے نہایت محنت سے تصحیح و دست کر کے مرتب کئے۔ یہ کتاب مطبع مجتہائی دہلی میں چھپی ہے۔

**جوامہ القرآن** اعمال و اذراہ کی یہ کتاب امام علی بن نجف علی کی تالیف ہے۔ چند اعمال خواجہ ضیاء الدین صاحب نے اضافہ کئے ہیں۔ یہ کتاب مولانا محمد احسن نے مولوی عبدالاحد مالک مطبع مجتہائی کی درخواست پر مرتب کی کتاب مطبع مجتہائی میں چھپی ہے۔

**رسالہ نیچرل فلاسفی** گارہاں دتاسی لکھتا ہے کہ محمد احسن نانوتوی نے نیچرل سائنس پر مسٹر ٹیلر کی نگراں میں دو مرتبہ شائع ہوا ہے۔

مولوی محمد احسن نے مختلف مشنریوں کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا ہے۔

**تبیینہ الریفق علی مغالطۃ ثبوت الحق الحقیق** شمس العلماء میلان ندیہ حسین نے ایک رسالہ ثبوت الحق الحقیق

لکھا جو مندرجہ ذیل سوال کے جواب میں تھا۔ کہ عامی اور غیر عامی پر جو درجہ اجتہاد کو نہیں پہنچا ہے تقلید ایک مذہب کی کمر نفاذ ہے یا نہیں اور میں پر تقلید واجب ہے اگر وہ

تقلید ایک مذہب معین کی دیکھنے تو اس کے پیچھے ناز بڑھنا جائز ہے یا نہیں۔ اور ساتھ اس کے کھانا پینا اور شادی کی رسم جاری رکھنا درست ہے یا نہیں۔

شمس العلماء میاں نذیر حسین نے اس کا جواب اپنے مخصوص نظریات اور معتقدات کی روشنی میں دیا تھا۔ اور ان کے کسی شاگرد نے یہ رسالہ مولانا محمد امین نانوتوی کے پاس بھیجا اور ایک قسم کا چیلنج دیا کہ

”آپ اب یا بعد دو چار مہینے کے خود یا بشورہ اپنے علماء کے اس کا جواب دیں“

مولانا محمد امین اگرچہ اپنی صاحبزادی کی بیماری کی وجہ سے پریشان تھے اور عارضی طور سے بریلی آئے ہوئے تھے مگر انہوں نے فوراً اس رسالہ کا جواب تنبیہ الرقیق علی مغالطہ ثبوت الحق الحقیق کے نام سے لکھا اور بتایا کہ مولف رسالہ ثبوت الحق الحقیق نے اپنی تحریر میں اکثر مغالطے دیئے ہیں مولانا محمد امین نے اس رسالہ میں بعض الزامی جواب بھی دیئے ہیں کہ بیان نذیر حسین نے معین الدین پسر جمیل الدین ساکن بریلی محلہ سہوانی ٹولہ کو کہ وہ کافہ اور غفطرت بھی نہیں جانتے بحیثیت مولوی محمد شکر اللہ صاحب سند حدیث عدلیت کر دی۔ یا چالیس پچاس کی عمر تک تو مولف رسالہ میاں نذیر حسین پاہنہ مذہب حنفی رہے یا اون کے استاد مولوی عہد الخاق دہلوی مفکر تقلید شخصی کو گم راہ کہتے تھے۔ یہ رسالہ کے آخر میں مولانا محمد امین نے بعنوان التماس لکھا ہے کہ

اس عاجز کا طریقہ بدشور سے مناظرہ اور مکابہہ کرنا نہیں چاہتا چنانچہ تک نہ کوئی مناظرہ تقریر کیا اور نہ کوئی رسالہ تحریر میں آیا۔ اور ارادہ تقریر و تحریر کا تھا۔ یہ سطور مجھے مجھوری لکھتا پڑی۔ عرض اس سے یہ نہیں کہ سلسلہ مکابہہ قائم رہے

۱۔ تنبیہ الرقیق علی مغالطہ ثبوت الحق الحقیق از مولانا محمد امین ص ۶

۲۔ تنبیہ الرقیق ص ۱۵

۳۔ تنبیہ الرقیق ص ۱۶

۴۔ تنبیہ الرقیق ص ۲۰

بلکہ مستفسر کو امر حق ظاہر کرنا تھا سو کر دیا۔ کوئی ماننے یا نہ ماننے  
”وما علینا الا البلاغ المبین“

اس رسالہ پر نظر ثانی و تصحیح مولوی احمد حسن بریلوی نے کی ہے اور یہ رسالہ مطبع قیصری  
بریلی میں طبع ہوا ہے۔ اس رسالہ کا ایک نسخہ ہمیں مولانا عبدالحلیم چشتی صاحب کے ذخیرہ  
علمیہ میں دیکھنے کو ملا جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

اگرچہ یہ کوئی تصنیف نہیں ہے مگر مولانا محمد احسن نانوتوی کی تحریری یادداشتیں  
قلمی بیاض کا مجموعہ ہے لہذا اس کا ذکر بھی ضروری ہے اس میں مولانا محمد احسن کے  
آمد و خرچ کے اندراج مختلف یادداشتیں، داد و ستد کے حسابات، طبی نسخے، اقلیدس کی ٹیکس  
اجاب کی فرمائشیں، فتاویٰ کے سودے نیز دیگر تحریریں مولانا محمد احسن کے ہاتھ کی بعض  
انگریزی تحریریں بھی بیاض میں موجود ہیں۔

## ہمعات

فارسی

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ ہمعات کا موضوع ہے۔ اس  
میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقا پر  
بحث فرمائی ہے۔ نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جن بلند منازل پر  
فائز ہوتا ہے اس میں اس کا بھی بیان ہے۔

قیمت - ۲ روپے

## علامہ ابن حزم

ملقبہ احمد قریشی

سرمدیہ کو آپ کے نظریات و افکار کا مرکز کہا جاسکتا ہے۔ ابن حزم کے بڑھتے ہوئے علاقہ اثر کو آپ کے مخالفین بھلا خاموش تماشائی کی طرح کب تک دیکھتے۔ چنانچہ ہر طرح مخالفت کی گئی۔ امراء و رؤسا کے ذریعہ انہیں طوع طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ مخالفین کی ان ریشہ دوانیوں کے پیش نظر آپ اپنے آبائی گاؤں "منتیشم" یعنی بلبک کے علاقے میں آباد ہو گئے۔ درس و تدریس، تصنیف و تالیف کا مشغلہ آخری دم تک جاری رکھا یہاں تک کہ آپ نے سلاطین میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

## ابن حزم کے خصوصی اوصاف

حوادث و واقعات کی روشنی میں اگر تجزیہ کیا جائے تو ابن حزم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں اور آپ کی ذات کے کئی اوصاف پر روشنی پڑتی ہے۔ ابن حزم کا بچپن وزیر زائد کی طرح گذرا اور عمر کا ایک حصہ وزارتوں میں صرف ہوا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ مالی لاپے سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ جب زمانہ وفات نہ کرتا اور حالات معاشی تنگ دستی میں مبتلا کر دیے تو عزت نفس اور صبر کو اپنائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کبھی آٹھ دن وقت میں کسی امیر کے سامنے دست سوال نہ اٹھایا بلکہ اس کے برعکس سلاطین و امراء سے ہایا قبول

کرنے والے علماء آپ کی نکتہ چینی کا شکاربختے رہے۔

والدہ کی وفات سے سبکدوشی کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب ابن حزم حوائی کی منزلوں میں قدم رکھ رہے تھے۔ عالم شباب میں قرطبہ کے فسادات اور خون ریزی کو آپ نے اپنی آنکھوں سے ملاحظہ فرمایا۔ بہت کرنا پڑی۔ حالات سازگار ہوئے تو وزارت کے عہدہ پر نظر آئے۔ حالات ناسازگار ہوئے اور مخالفوں کے ہتھے چڑھ جاتے تو زندان میں پہنچا دیتے جاتے۔ کبھی کسی سلطان کی ہمرکابی میں میدان کارزار میں نظر آتے اور کبھی دایوبی جہل منظرہ میں مخالف علماء سے برسر پیکار ملتے۔ کبھی صاحب اقتدار ہوئے اور کبھی مفلس و تلاش پورے نشین عالم۔ غرض یہ کہ ان اولیائے ہی حوادث نے ابن حزم کو مستقل مزاج بنادیا اس کے ساتھ ہی ان حالات نے آپ کے مزاج میں حدت بھی پیدا کر دی تھی۔ جہاں وہ اپنے مخالف کے سامنے ڈٹ جاتے وہاں کسی قسم کی پروا کے بغیر اپنی بات اعلانیہ کہتے۔ کسی کی مدح یا مذمت کی انہیں کوئی پروا نہ ہوتی تھی۔ علماء کے سامنے وہ اپنے بحر علمی کی بدولت ڈٹ جاتے اور علماء کی اس نے پروا نہ کرتے کہ خود وزیر ابن دؤد رہے یا پھر انہیں اپنے خاندانی وقار کے سامنے انہیں بیچ خیال کرتے شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کے معاصرین کو یہ کہنا پڑا کہ ابن حزم عالم ہیں مگر علم کی سیاست سے نا آشنا ہیں؛ ابن حزم فرطتے تھے۔

اہل زمانہ کا بغض و عناد تمہارے لئے مفید ہے مگر بعض اوقات اس سے بڑا نقصان بھی پہنچ جاتا ہے اگر خالق و مخلوق میں کسی ایک کی ناراضگی مول لینا ناگزیر ہو تو لوگوں کو ناراض کر لیجئے مگر خدا کے غضب سے احتراز کیجئے؛

یہی وجہ ہے کہ علم کی سیاست ان کے نزدیک منافقت کے مترادف بھی گئی۔ علاوہ انہیں ایسا عالم مناظرہ اور تمقید سے بھلا کب باز رہ سکتے ہیں جس کے رشحات فکر اور ادبی شہ پاروں کو اس کے سامنے جلا دیا گیا ہو؟ نفسیاتی طور پر اس کے مزاج میں حدت و تیزی کا آنا ویسے ہی فطری بات ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مخالفت انہیں خود گواہی ملتی۔ فرماتے ہیں۔

”جہلا کی تمقید سے مجھے بڑا فائدہ پہنچا اور وہ یہ ہے کہ میری خواہمیدہ صلاحیتیں جاگ اٹھیں میرا دماغ روشن ہو گیا۔ میری فکری و فطری قوتیں بیلار ہو گئیں اور میں نے نفع بخش کتابیں تصنیف

کیں۔ اگر دشمن میری باطنی صوفیتوں کو پسند نہ کرے تو میں ایسی کتابیں نہ لکھ سکتا۔  
 ابن حزم کسب معاش سے اکثر بے نیاز رہے۔ مالی باتداد انہیں درس میں ملی۔ لہذا علمی  
 دولت کی تحصیل اور تعینات ذمہ داری میں ان کی مادی اس بات کا ثبوت ہیں کہ علم کو کسب معاش کے  
 لئے نہیں اپنایا بلکہ ان کی پوری جدوجہد علمی اخلاص پر مبنی نظر آتی ہے سیاسی ہنگاموں سے خداسی  
 فرصت پر علم کی طرف آپ کا لپکنا اسی اخلاص کا مرہون منت ہے۔ اور یہ کہنا بجا ہوگا کہ یہی اخلاص  
 علمی تاریخ میں ان کے ایک اہم مقام کی تاسیس بنا، ورنہ کسے معلوم سیاسی تاریخ میں ان کا نام کس  
 نہرست میں ہوتا اور مورخ انہیں کن الفاظ میں یاد کرتا؟ آپ کا ایک مشہور قول ہے۔  
 ”مخلص وہ ہے کہ جب وہ کوئی نیک کام کرے تو اسے یہ فکر دانگیس نہ ہو کہ لوگ  
 اس کی تعریف کریں۔“

## علوم میں ابن حزم کی جامعیت

ابن حزم علم کے ہر میدان کے شہسوار ہیں۔ علوم منقولات ہوں یا معقولات ہر علم میں  
 عالم بے بدل نظر آتے ہیں۔ نثر نگاری میں اچھے نثار ہیں اور شعر گوئی میں اچھے شاعر۔ یوں محسوس  
 ہوتا ہے کہ آپ علم کے ہر چٹے سے سیراب ہوئے اور آپ نے ہر غمون کے درخت کا پھل چکھا۔  
 ابن حزم ان آپ کے شدید عفاف ہیں لیکن معترف ہیں کہ  
 ”ابو محمد ابن حزم گونا گوں علوم کے ماہر تھے مثلاً حدیث، فتنہ، جدل و نسب اور تعلقات  
 ادب۔ اس کے پہلو پہ پہلو علوم قدیمہ مثلاً منطق و فلسفہ سے بھی پوری طرح بہرہ ور تھے انہوں  
 نے ان فنون میں متعدد کتب تعینت کی ہیں۔“

ابن حزم کی وہ کتب منظر عام پر نہ آسکیں جنہیں مستفید نے ایشیلیہ میں نند آتش کر دیا  
 ان کتب کی تعداد چار صد کے لگ بھگ بتائی جاتی ہے۔ ان کتب میں کن کن علوم کا ذکر ہوگا  
 کن انکار کو سپرو قلم کیا ہوگا؟ اس کا صحیح اندازہ تو لگانا مشکل ہے البتہ جن الفاظ میں آپ نے  
 اس المیہ کو بیان فرمایا ہے وہ اس عالم بے بدل کے دلی تاثرات کی ہلکی سی تصویر کیجیے ہیں۔  
 آپ فرماتے ہیں۔

فان تحرقوا القراطاس لا تحرقوا الذی  
تضمنه القراطاس بل هو فی صدری  
فیسیر معی حیث استقلت ساکابو  
و ینزل اذ ینزل و یدفن فی قبری

اگر تم نے کاغذ کو جلا دیا ہے تو اسے تو نہیں جلا سکتے جو کاغذ میں مندرج تھا۔ بلکہ وہ تو میرے سینہ میں محفوظ ہے میں جہاں جاتا ہوں میرے ساتھ ہوتا ہے اور جہاں پڑاؤ ڈالتا ہوں وہ بھی ڈیرے ڈال لیتا ہے اور قبر میں میرے ساتھ دفن ہو جائیگا۔

آپ کی تعانیف کو اسلوب تحریر کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتے ہیں۔  
۱۔ علی طرز تحریر میں آپ کی اکثر کتب تحریر ہیں۔  
۲۔ ادبی طرز نگارش

طوق العلماء آپ کے ادبی مرتبہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مراحت کلام۔ سلاست بیانی۔ پاکیزہ الفاظ کا انتخاب۔ جن تقسیم حصہ آپ کی نثری خوبیاں ہیں۔  
آپ فی البدیہہ شعر کہتے تھے۔ آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

انا الشمس فی جو العلوم منیرۃ

و لکن عیبی ان مطلعی الغرب

میں علوم کی فضا میں ایک چمکتا سورج ہوں۔ لیکن مجھ میں عیب یہ ہے کہ میں مغرب سے نمودار ہوا ہوں۔

امن اجل وجه لاج لم ترہ غیرۃ و لم تدر کیف الجسم انت علیل

فقلت لہ اسرفت فی اللوم فاند فغندی یولوا شاعر طویل

الم ترانی ظاہری و انشی علی ما امری حق یقوم دلیل

کیا صرف چہرے کو دیکھ کر تم مرے بغیر نہ ہو گئے۔ حالانکہ باقی جسم انت علیل میں تو ہمیں کچھ معلوم ہی نہیں۔

میں نے کہنے والے سے کہا کہ ملامت گری میں تم نے نہادتی کی ہے۔ دہرا لکھے

سیرے پاس اس کا طویل جواب موجود ہے۔

کیا تمہیں معلوم نہیں میں ظاہر مسلک کا پابند ہوں اور جب تک اس کے خلاف دلیل قائم نہ ہو جائے میں اس پر قائم رہتا ہوں۔

علم کا ایک اور چشمہ جس سے آپ نے اپنی پیاس بجھائی وہ آپ کے تجربات زندگی ہیں بچپن میں آپ نے عورتوں کو اپنی نگرانی کرتے پایا۔

حالات سازگار ہوئے تو سفر کیے۔ برسرِ اقتدار رہے تو سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف رہے علمی دنیا میں آئے تو اہل علم کو مختلف انداز سے دیکھا غرض یہ کہ کادو بار حیات میں ابنِ حزم نے افراد کا مختلف حیثیتوں سے مطالعہ فرمایا۔ ان کے عادات و اطوار، اخلاق و افکار اور دیگر تجربات پر روشنی ڈالنے کے لئے آپ نے چند کتب لکیں۔ جن میں مداواة النفوس، طوق الہمات، رسالۃ الاخلاق، اخلاق النفس، وغیرہ مشہور ہیں۔ نفسیات میں رنج، غم، عشق و محبت اور عورتوں کے مکر و فریب بیان کرنے کے ساتھ ساتھ نفس کی پاکیزگی کے طرق بھی بیان فرمائے ہیں۔ اخلاقیات میں فضائل و زائل اور دیگر مباحث کو مفصل بیان فرماتے ہیں۔

چنانچہ اخلاقیات و نفسیات آپ کے وہ مضامین ہیں جن سے آپ کی عقلی اور حتمی تحریروں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بلفظ دیگر جو آپ کے استقرائی اور تجرباتی مسلک و مہج پر مبنی ہیں۔ آپ کی تحریر کا مندرجہ ذیل اقتباس اس سلسلے میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

”میں نے اس کتاب میں اختصار کا التزام کیا ہے۔ اور صرف وہی باتیں

درج کی ہیں جو بذاتِ خود دیکھیں یا قابلِ اعتماد لوگوں سے نقل ہو کر

مجھ تک پہنچیں۔“

نئی مسائل اور بعض عقائد میں ابنِ حزم کا اپنے دور کے علماء سے کافی اختلاف رہا اس کے ساتھ ہی یہودیت و نصرانیت کے وسیع مطالعہ نے آپ کو ان مذاہب کے علماء سے تبادلہ خیال کرنے پر تیار کیا۔ آپ اندلس کے سبھی پادریوں اور یہودی علماء سے تبادلہ



مختلف موضوعات پر مناظرہ فرماتے۔ اس طرح آپ کو جدل و مناظرہ میں بین قسم کے علماء کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

پہلا گروہ فقہ کا تھا۔ دوسرا علمائے متکلمین کا اور تیسرا غیر مسلم اہل علم کا۔ ان تینوں مکتب فکر اہل علم سے مناظرہ کا انداز مختلف ہوتا۔ فقہاء سے مناظرہ کے وقت قرآن و حدیث سے سرسری بحث اور دھر دھر ہونا گوارا نہ فرماتے۔ لیکن جب تک متکلمین یا غیر مسلم علماء سے گفتگو ہوتی تو عقلی براین و دلائل سے مخاطب کو آڑے ہاتھوں لیتے۔

الفصل پنجم اہل الآراء، الفخر، کتاب الصادق والمراد، کتاب التلخیص والتفصیل فی المسائل النظریہ، کتاب الامامة والسیاسة الاصلیة فیہم کتاب الخصال، کتاب کشف الالباس مابین اصحاب الظاہر واصحاب البیہاس، الاحکام فی اصول الاحکام۔ المفاضلۃ بین الصحابة۔ النسخ والمسنوع۔ المحلی وغیرہ۔ کتب مختلف موضوعات پر آپ کے افکار کی آئینہ دار ہیں۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ نے علوم میں سب سے پہلے استفادہ حدیث سے کیا۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث نبوی کی محبت آپ کے رگ و ریشہ میں سما گئی۔ اور آپ صاحب تقریحات فقیہ ہونے سے قبل حدیث کے حافظ اور ماہر بن گئے۔ مختلف علوم کی تحصیل کے لئے آپ کے والد نے ابوالحسین الفاسی کو آپ کا تعلیمی نگران مقرر کر دیا تھا جو انہیں ابوالقاسم عبدالرحمن ازدی (المتوفی ۱۱۵ھ) کی مجلس میں لے جایا کرتے تھے۔ جہاں آپ ان سے حدیث بخوار لخت پڑھتے۔ ابن حزم نے بھی میں احمد بن حنبل و المتوفی ۱۱۵ھ سے بھی حدیث سنی۔ قرطبہ کی مسجد القری میں ہمدانی سے بھی آپ نے ۱۱۵ھ میں حدیث سنی۔

## فقہ اور ابن حزم

### ۱۔ تحصیلِ فقہ

بچپن میں ابوالعین الفاس کو ابن حزم کا تعلیمی نگران مقرر کیا گیا تھا۔ لہذا فقہ کی ابتدائی تعلیم آپ نے اس عالم و زاہد بزرگ سے پائی۔ فقہ کا تفصیل مطالعہ آپ نے عبداللہ بن یحییٰ رجون فقیہ کی شاگردی میں کیا۔ آپ فرماتے ہیں کہ قرطبہ میں فتویٰ نویسی کا انحصار عبداللہ پر تھا۔ عبداللہ ازوی فقہ و حدیث، اب و تاریخ میں اندلس کے چیدہ علماء میں شمار ہوتے ہیں آپ نے ان سے بھی فقہ و حدیث کا درس لیا۔ لیکن آپ کے فقہی مہاج کی اساس فی الحقیقت استاد ابوالخیر مسعود بن سلیمان بن عفلت (التوفی ۳۸۷ھ) ہیں جو فقہ ظاہری کے عالم تھے۔

ابن عقی نے ابوالخیر کے پاس سے میں لکھا ہے۔

”ابوالخیر مسعود ظاہری فقہ کے امام تھے اور ان کا مسلک اختیار اقوال تھا۔ یہ ابن حزم کے استاد تھے۔ ابن حزم اپنی تعانیف میں ان کا ذکر کرتے ہیں۔  
فقہ کے سلسلے میں ابن حزم اپنے استفادہ کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”جن کتب سے مجھے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ قاضی محمد بن یحییٰ بن مفرج کی کتب بھی ان میں شامل ہیں۔ انہوں نے بہت سی کتب تعنیف کیں۔ سات تعانیف میں انہوں نے حضرت حسن بصری کی فقہ جمع کی ہے اور بہت سی کتابوں میں امام زہری کی فقہ کو مرتب کیا۔“

ابن حزم کے فقہی افکار و آراء میں ان کی حریمیت و ذاتی میلان کو کافی دخل ہے۔ ان کے

۱۔ ایضاً بحوالہ طوق الحمامہ ص ۱۳

۲۔ ص ۱۱۹

۳۔ حیات ابن حزم ص ۱۲۹

استاد ابو الحسین الفاسی انہیں مشہور محدث ابو القاسم عبدالرحمن ازدی (المتوفی ۵۱۸ھ) کی مجالس میں سماعت حدیث کے لئے ہایا کرتے تھے۔ بچپن میں آپ کو احمد بن حنبل (المتوفی ۲۴۱ھ) سے بھی سماعت حدیث کا اتفاق ہوا۔ علاوہ انہیں قرطبہ کی مسجد القمری میں ہمدانی سے بھی آپ نے ۱۸۸ھ میں حدیث سنی۔ چنانچہ شروع ہی سے حدیث نبوی کی محبت آپ کے رگ و ریش میں ساگئی۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ کے سلسلہ میں فقہ الحدیث کی تحصیل کی طرف آپ کا میلان زیادہ رہا۔ ان دنوں اندلس میں فقہ مالکی کا چرچا تھا۔ اور اسے سرکاری مذہب کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ مولانا امام مالک آپ نے عبداللہ بن رجوان سے پڑھی تھی۔ اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ آپ نے اپنے دور کے دیگر فقہاء سے بھی استفادہ کیا اور متقدمین میں امام شافعی کی فقہ کا بالاستعلاہ مطالعہ کیا۔ ظاہر ہے آپ نے اختلاف مالک بھی پڑھی ہوگی اور اختلاف العراقیین "الرد علی سیرالاوزعی" اور جامع العلم کا مطالعہ بھی کیا ہوگا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ آپ امام شافعی کے اس قول کو استحسان کی نظر سے دیکھنے لگے کہ۔

”أحب مالکاً ولكن محبتي للحق أكثرو من محبتي لمالك“

”میں امام مالک سے محبت کرتا ہوں مگر مالک کی نسبت مجھے حق سے زیادہ پیارا ہے۔“

چنانچہ ابن حزم شافعی فقہ سے متاثر ہوئے غالباً اس مسلک کے مطالعہ کے بعد مالکی فقہ کے مقابلہ میں انہیں اس میں نقد و جرح اور حریت فکر و فکر کی بہتر روح نظر آئی ہو۔ لیکن چونکہ آپ کی طبیعت ایک محدود مذہبی دائرے میں محصور ہونا پسند نہیں کرتی تھی اس لئے آپ کا ظاہری فقہ کی جانب میلان ہو گیا اور آپ اسی مسلک کے داعی کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔

## ظاہری مذہب اور ابن حزم

ابو سلیمان داؤد بن علی بن خلف اصحابی فقہ ظاہری کے بانی ہیں۔ یہ ۳۸۴ھ یا ۳۸۵ھ میں پیدا ہوئے اور بغداد میں سکونت پذیر رہے۔ فقہی استفادہ آپ نے تلامذہ الممشافی

سے کیا۔ طبیعت کو تقلید گو امانہ تھی اور وہ بن حریت فکر کی طرف مائل تھا۔ اس نے آپ نے فقہ شافعی کی بہت سی باتوں سے اختلاف کر کے اپنے مسلک و آراء کی ترویج شروع کر دی۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں۔

”داؤد پہلے شخص تھے جنہوں نے ظواہر نفوس سے احتیاج کیا۔ قولاً و فیہا اس کی نفی کی اور فعلاً اسے اپنانے پر مجبور ہوئے“

بقی بن محمد اندلس کے حید علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ جب وہ مشرق گئے تو امام احمد سے ملے۔ داؤد اور امام احمد کا سن ولادت تقریباً ایک ہی (۱۸۰ھ) بتایا جاتا ہے۔ لازمی بات ہے مشرق میں انہوں نے داؤد کے مسلک کا مطالعہ کیا اور قرآن سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ داؤد سے ملے بھی ہوں گے۔ جب بقی واپس اندلس آئے تو علمائے ان کے خیالات میں کافی تبدیلی محسوس کی۔ وہ لوگوں کو مالکی فقہ کے بجائے نہ صرف فقہ الحدیث کی طرف رغبت دلانے لگے بلکہ مختلف مسائل میں مالکی فقہ سے اختلاف کا اظہار بھی فرمانے لگے۔ چنانچہ کثرت حدیث و اسانید سے وہ مواد تیار ہوا جس سے اندلس میں فقہ ظاہری کا خمیر اٹھا۔

ابن وضاح (المتوفی ۳۸۶ھ) بھی اندلس سے مشرق گئے اور فقہ ظاہری سے متاثر ہو کر لوٹے اور اندلس میں اس کی ترویج کا باعث بنے۔ پھر ان دونوں کے شاگرد قاسم بن اصبغ عراق گئے۔ یہ ۳۸۶ھ میں عراق پہنچے اور واپسی پر اندلس میں فقہ ظاہری کے داعیوں میں شمار ہوئے۔

مفسر بن سعید البلوطی کا شمار اندلس کے اچھے علماء میں ہوتا ہے۔ یہ قرطبہ کے قاضی بھی تھے۔ انہوں نے ظاہری فقہ کی تائید اور فقہ مالکیہ کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی۔ علامہ مقرئ نفع الطیب میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”مفسر بن سعید متعدد علوم میں ماہر تھے۔ آپ پر داؤد بن علی کی مرتب کردہ فقہ

الموسوم بفقہ الظاہری کا غلبہ تھا۔ منذر اس فقہ کو ترجیح دیتے۔ اس کی کتابیں جمع کرتے اور اس کی تائید کے لئے اجتماع کیا کرتے تھے۔

منذر ۳۵۵ھ میں فوت ہوئے۔ ابن حزم ان کے صاحبزادے سعید بن منذر (المتوفی ۳۸۵ھ) سے مل چکے تھے۔ چنانچہ جب ابن حزم نے فقہ کی تحصیل فرمائی اس وقت ان حضرات کی بدولت اندلس میں فقہ ظاہری کے متاثرین و معاونین کی کمی نہیں تھی ابھی معاونین میں ابن حزم کے استاد مسعود بن سلیمان البوالخیر (المتوفی ۳۸۵ھ) پیش پیش ہیں۔

## ابن حزم کے فقہی اصول

ابن حزم اپنے استاد مسعود بن سلیمان سے کافی متاثر نظر آتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ حریت فکر و نظر کی وہ راہ ہے جس کی نشان دہی استاد نے تدریس کے دوران کر دی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابن حزم کا عمل ہمیشہ اپنے استاد کے اس قول پر رہا کہ لا یزال المرء علی ما دام یطلب العلم فاذا قن انہ علم فقد جہل یعنی جب تک کوئی شخص تحصیل علم کرتا رہتا ہے اس وقت تک عالم رہتا ہے لیکن جب وہ اپنے آپ کو عالم تصور کرنے لگتا ہے اس وقت وہ جاہل بن جاتا ہے۔ تحصیل علم ہی ابن حزم کے ہاں وہ امتیازی راہ ہے جس کی بدولت نہ تو وہ فقہائے اربعہ کے مقلد بنے اور نہ ہی ظاہری فقہ کو آپ نے اس اندھی تقلید سے اپنایا۔ کہ یہ کہہ جاسکے کہ ایک تقلید کو چھوڑ کر آپ نے دوسری تقلید کو اپنایا۔ گو کہ آپ کا مسلک ظاہری ہے لیکن حریت فکر میں وہ بسا اوقات خود مجتہد نظر آتے ہیں۔ اور ظاہری علماء کے برعکس ان کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ آپ منہ راتے ہیں۔

انا اتبع الحق واجتهد ولا اتقید بمذہب

”میں اجتہاد کرتا ہوں حق کا پیرو ہوں اور کسی کے مذہب کا پابند نہیں“  
ابن حزم مندرجہ ذیل اصول اربعہ کو فقہ اسلامی کے معاصر خیال فرماتے ہیں۔  
۱۔ قرآن کریم

۲۔ حدیث

۳۔ اجماع علمائے امت

۴۔ ان میں سے کوئی دلیل جس میں صفت ایک ہی اقتال پایا جاتا ہو۔  
فقہ اسلامی کا پہلا معیار یا معیار القرآن ہے۔ ابن حزم کی رائے میں قرآن  
کریم کی ہر بات بذات خود واضح ہے بتا بریں تشریح و توضیح کے اعتبار سے قرآن کی  
تین قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ آیات جو بذات خود واضح ہیں اور حدیث نبوی سے ان کی وضاحت کی ضرورت  
نہیں۔

۲۔ وہ جمل آیات جن کو قرآن ہی نے دوسرے مقام پر مفصل بیان کر دیا ہے۔

۳۔ وہ آیات قرآنیہ جن کی تشریح حدیث نبوی سے کی گئی ہے۔

وجوب اطاعت کے اعتبار سے ابن حزم کے نزدیک حدیث کو وہی اہمیت حاصل ہے  
جو قرآنی احکام کو۔ فرماتے ہیں۔

مسلمانوں کے یہاں اس بات میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد  
”اقیموا الصلوٰۃ“ اور نبی کریم کے اس فرمان میں کہ ”مقیم ظہر کی چادر رکھیں پڑھے  
اور سافر دو رکعتیں۔ وجوب اطاعت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا“۔

۱۷ بحوالہ الاحکام ج ۱ ص ۷۱

۱۸ ایضاً بحوالہ الاحکام ج ۲ ص ۲۲۷

قرآن و حدیث میں نصوص کے تعارض کے مسئلہ پر ابن حزم و دیگر علماء سے متفق نہیں ہے وہ نہ صرف نصوص کے تعارض کی نفی کرتے ہیں بلکہ ان میں کامل یگانگت و ہم آہنگی کے قائل ہیں۔ فرماتے ہیں۔

جب دو حدیثیں یا دو آیات یا آیت و حدیث کسی جاہل شخص کی نظر میں باہم متعارض ہوں تو ہر مسلمان پر فرض ہے کہ سب دلائل پر عمل کرے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی قابل ترجیح نہیں ہے نہ ایک حدیث دوسری کے مقابلہ میں واجب تر ہے اور نہ ایک آیت کی اطاعت دوسری سے زیادہ ضروری ہے۔ سب خدا کی طرف سے ہیں اور دو جو بات اطاعت کے اعتبار سے بھی مساوی ہیں یہ

ابن حزم امام شافعی کی طرح نسخ کو بیان احکام قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک نسخ سے نہ نصوص کا ازالہ ہوتا ہے اور نہ ان کا انفاء لازم آتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

”نسخ کی تعریف یہ ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ حکم کی مدت ختم ہو گئی ہے“ فقہ اسلامی کے معنی ثالث یعنی اجماع کے بارے میں ابن حزم ایسے اجماع کے قائل ہیں جس پر تبواتر تلام علمائے امت جمع ہو چکے ہوں۔ کسی مسئلہ پر بعض علماء کا جمع ہو جانا اجماع نہیں کہلائیگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اہل مدینہ کے اجماع کو یرغلافت و دیگر علماء کے اجماع تصور نہیں فرماتے اور نہ اسے حجت مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک اجماع میں تین شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔

۱۔ وہ کسی نص پر مبنی ہو۔

۲۔ اجماع نقل متواتر اور قلبی سے منقول ہوتا ہو اہد نبوت تک جا پیچے۔

۳۔ اجماع آنحضرت مسلم کی حدیث قولی، فعلی یا تقریری پر مبنی ہو۔

فقہ اسلامی کے چوتھے معیار کو دیگر علماء قیاس کہتے ہیں۔ اس کے برعکس ابن حزم

کے نزدیک مصدر رائج "دلیل" ہے۔ دیگر علماء مذہب ظاہریہ کے خلاف اس الزام کو بڑے شد و حد سے بیان کرتے ہیں کہ یہ لوگ (ظاہری، چونکہ "قیاس" کو حجت شرعی تسلیم نہیں کرتے لیکن استنباط احکام سے مجبور ہو کر بالواسطہ اسے تسلیم کر کے اس کا نام "دلیل" رکھ دیتے ہیں۔ ورنہ بات ایک ہی ہے۔

ابن حزم "قیاس" اور "دلیل" کا فرق یہ بتاتے ہیں کہ "قیاس" نص سے استقراء علت پر مبنی ہوتا ہے۔ پھر جہاں وہ علت پائی جاتی ہے، اسے نص کا حکم دے دیا جاتا ہے۔ بخلاف "دلیل" نص و اجماع سے براہ راست نکالی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ دلیل کی سات قسمیں بیان کر کے تفصیل سے ان کی وضاحت فرماتے ہیں۔

ابن حزم اجتہاد بالرای کے بالکل قائل ہیں۔ چنانچہ آپ اس کی نفی فرماتے ہوئے استسنان، مصالح مرسلہ اور ذرائع کا دروازہ بھی بند کر دیتے ہیں۔ آپ کا خیال ہے سب علماء کا استسنان ایک ہی طرز و انداز کا کس طرح ہو سکتا ہے جب کہ ان کے طبائع و عادات اور اغراض و مقاصد میں بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ ..... ہم احناف کو دیکھتے ہیں کہ ان کی نگاہ میں وہ بات پسندیدہ ہوتی ہے جسے مالکیہ قبیح سمجھتے ہیں۔ مالکیہ جس چیز کو مستحسن تصور کرتے ہیں، وہ احناف کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کے دین میں جو بات حق ہے وہ بعض کی پسندیدہ ہے اور بعض اسے ناپسند کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ باطل ہے۔

ابن حزم اپنی تصانیف "الاحکام فی اصول الاحکام" اور "المصلی" میں اپنے فقہی اصولوں کو نہایت شرح و بسط سے بیان فرماتے ہیں۔ جن کے مطالعہ سے قادیان سے نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ استدلال بالرای میں استصحاب پر گفتگو فرما کر آپ نے بہت سے سہل اسالیب استنباط کو سمویا ہے۔



## فقہ ابن حزم کے چند مسائل

فقہی مسائل میں ابن حزم کا اپنا طریق استنباط ہے۔ کچھ تو ظاہری ہونے کی وجہ سے اور کچھ اپنے خصوصی طریق استنباط کی بدولت ابن حزم کا مرد وچ فقہی مسائل سے ٹکراؤ پیدا ہو کہیں یہ ٹکراؤ فقہ ہائے اربعہ کی طرح فروغ تک محدود نظر آتا ہے اور کہیں کہیں اس سے مسئلہ کی بنیادی صورت متاثر ہوتی ہے۔ چنانچہ ظاہری فقہ یا ابن حزم کے بعض مسائل پر فقہ ہائے اربعہ یا ان میں کسی ایک سے ٹکراؤ کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً مسائل نکاح میں ذرا ان صورتوں کو ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت میں ابن حزم آزاد اور غلام میں مساوات کے قائل ہیں۔ جمہور فقہاء غلام کو آزاد کی نسبت نفع حقوق دیتے ہیں۔ ایک آزاد و مرد اگر چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے تو غلام صرف دو سے کر سکتا ہے۔ لیکن ابن حزم کے نزدیک غلام کو بھی آزاد کی طرح چار عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے۔ یہی صورت ان کے نزدیک لونڈیاں رکھنے کی ہے۔

۲۔ نان و نفقہ ادا نہ کرنے کے باعث ابن حزم تفریق زوجین کو جائز قرار نہیں دیتے۔ امام مالک، شافعی اور احمد کے مالک کے خلاف وہ یہ کہتے ہیں کہ اگر خاوند خوشحال ہے تو نان و نفقہ کی ادائیگی اس سے جبراً کر لی جائیگی ضرورت پڑنے پر خاوند کا سامان فروخت کر دیا جائیگا۔ لیکن اگر مرد واقعی تنگ دست ہے اور عورت بھی محتاج ہو تو عورت کی حد فاقہ سے مدد کی جائے گی۔ اور اگر اس کے عزیز و اقارب اسے صدقات بھی نہ دیں تو بیت المال سے اس کی مدد کی جائے گی لیکن اگر عورت صاحب جائیداد ہے یا اس کے پاس مال ہے اور مرد تنگ دست ہے تو بیوی کو مجبور کیا جائیگا کہ وہ خاوند پر خرچ کرے۔ اگر خاوند بعد میں خوشحال ہو جائے تو

بیوی اس سے یہ رستم واپس نہیں لے گئی تھی

۳۔ مریض مرض الموت کو تعریقات پہلے جاسے روکنے کے لئے فقہائے اربعہ نے اس کے اختیارات کے استعمال پر مختلف پابندیاں لگائی ہیں۔ لیکن ابن تیمیہ اس کے ہر قول و فعل کو ایک عام مجمع البدن آدمی کے تعریقات کی تصریح درست سمجھتے ہیں بشرطیکہ وہ عاقل بالغ اور مجمع الخواس ہو جائے۔ چنانچہ ائمہ ثلاثہ کے مسلک کے برعکس مریض مرض الموت کی طلاق کے سلسلہ میں آپ کا خیال ہے کہ مریض کی طلاق تندرست آدمی کی طرح ہوتی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

میراث اور وصیت کے بارے میں ذرا ابن حزم کا مسلک ملاحظہ فرمائیے۔  
۴۔ غیر وارث اقا رب کے سلسلے میں فقہ و وصیت کی فرضیت کو نہیں مانتے۔ ابن حزم کا مسلک یہ ہے کہ وصیت غیر وارث اقا رب کے لئے فرض ہے۔ وصیت کنندہ کو چاہیے کہ اتنے مال میں وصیت کرے جس سے اس کی ثابت شدہ فریضے کی تکمیل ہو جائے۔ چونکہ ان کے نزدیک وصیت واجبہ کا ترک ظلم کے مترادف ہے۔ اس لئے یہ کام حاکم یا قاضی کے سپرد ہو گا کہ وہ وصیت کے نفاذ کی نگرانی کرے۔ یا عدم وصیت کی صورت میں متاخرین کو ان کے حقوق دلانے کے لئے۔

مصری حکومت نے ابن حزم کے اس مسلک کی روشنی میں یتیم پوتے کی میراث کا قانون بنایا ہے۔ چنانچہ مصری قانون ۱۷۱ ہجری ۱۳۵۰ء کی دفعہ

۱۔ ایضاً بحوالہ المحمل ج ۱۰ ص ۹۲

۲۔ ایضاً ج ۹ ص ۳۴۸

۳۔ ایضاً ج ۱۰ ص ۲۱۸

۴۔ ایضاً بحوالہ المحمل ج ۹ ص ۳۱۶

۴۹-۴۸ ابن حزم کی کتاب النحل سے ماخوذ نظر آتی ہیں۔

ابن حزم کے اس مسلک کا مقصد غالباً یہ بھی ہے کہ دولت ترکہ کی صورت میں صرف چند ہاتھوں تک ہی نہ بٹے بلکہ متوفی کے کنبہ کے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم ہو جائے۔

۵- میت کے ترکہ میں سے جتنے حقوق واجبہ ہیں، ابن حزم ان میں حقوق اللہ مثلاً زکوٰۃ اور کفارہ وغیرہ کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خدادادی حقوق میت کی تجہیز و تکفین سے بھی مقدم ہیں۔ جب کہ اکثر حنفی فقہاء کے نزدیک حقوق اللہ کے سلسلہ میں متوفی کا وصیت کرنا ضروری ہے۔ فرماتے ہیں۔

”اگر میت نے قبیل یا کثیر مال چھوڑا ہو تو سب سے پہلے اس میں سے حقوق اللہ مثلاً زکوٰۃ و کفارہ وغیرہ ادا کئے جائیں۔“

۶- ترکہ کی تقسیم کے وقت اگر یتیم و مسکین جمع ہوں تو انہیں کچھ نہ کچھ دے دینا چاہیے۔ اکثر فقہاء کا مسلک یہی ہے۔ لیکن ابن حزم کی رائے میں یہ عطیہ اختیاری نہیں بلکہ واجب ہے۔ لہذا اگر ورثہ دینے سے انکار کریں تو حاکم ان سے جبراً دلائے۔“

ترکہ کی مالیت اور حصص کے اعتبار سے حاکم یتامی و مساکین کے حصے کا تعین کر سکتا ہے۔ ابن حزم کا یہ مسلک معاشرے میں تقسیم دولت کے لئے بہترین اصول معلوم ہوتا ہے۔

۷- قوی دولت کا انحصار نظام آرمی پر بہت زیادہ ہے۔ کسی زرعی ملک میں جب تک نظام آرمی درست نہ ہو وہاں کے عوام جو اکثر دیہاتی آبادی کے لوگ ہوتے ہیں، خوشحال نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مزدور

زمین کے مسئلہ پر اکثر فقہا کی رائے کے برعکس ابن حزم مزروعہ اراضی کو اجارہ یا ٹھیکہ پر دینا بالکل جائز نہیں سمجھتے۔ آپ اپنے مخصوص تیز و تند انداز میں اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

”زمین کو کسی حالت میں بھی اجارہ پر دینا جائز نہیں نہ کھیتی باڑی کے لئے نہ باغ لگانے کے لئے نہ تعمیر کرنے کے لئے نہ کسی اور مقصد کے لئے۔ خواہ تھوڑی مدت کے لئے یا زیادہ کے لئے۔ بلا تعین مدت یہ اجارہ داری (ٹھیکہ داری) نہ درہم و دینار کے عوض درست ہے اور نہ کسی اور چیز کے عوض۔ اگر زمین اجارہ پر دے دی جائے تو اسے فسخ کر دیا جائیگا۔“

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

زمین کو نہ درہم و دینار کے عوض کرایہ پر دے سکتے ہیں نہ سلمان طعام کے عوض اور نہ کسی اور چیز کے بدلے بیکہ

ابن حزم مزروعہ زمین میں اجارہ (ٹھیکہ) کے عدم جواز کے بعد زمین کی کاشت کی جو صورتیں بیان فرماتے ہیں انہیں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ فرماتے ہیں۔

”زمین کو کاشت کرنے کی تیز، موثر، ہو سکتی ہیں۔“

- ۱۔ اپنے آلات و اعوان اور حیوانات سے خود کاشت کرے اور بیج ڈالے۔
- ۲۔ دوسروں کو زراعت کے لئے بلا معاوضہ دے دے اگر مالک اور مزارع حیوانات، آلات و اعوان اور بیج میں شریک ہوں مگر زمین کا مالک اس کا کچھ وصول نہ کرے تو اچھا ہے۔

۳۔ اپنی زمین مزارع کو دے دے اور مزارع اپنے آلات و اعوان کی مدد سے

خود کاشت کئے اور بیج ڈالے۔ زمین کا مالک اس میں سے پیداوار کا  
مقرر حصہ مثلاً نصف حصہ یا ربع (چوتھائی) یا اس سے کم و بیش لے  
لے۔ زمین کا مالک اور کوئی شخص نہ لگائے۔ اگر زمین میں کچھ بھی پیدا  
نہ ہو تو مزارع نہ کچھ دے گا اور نہ لے گا۔

یہ تمام طریقے جائز ہیں۔ اراضی کا مالک اگر ان میں سے کسی طریقے کو پسند  
نہ کرے تو اپنی زمین واپس لے لے لے

ابن حزم کی فقہ اور ان کی فقہی آراء کا منبع کتاب و سنت کی نعوس ہیں جن سے وہ  
ادھر ادھر ہونا بالکل پسند نہیں کرتے اور بقول ان کے وہ خود مجتہد ہیں اور حق کے پیرو  
اور کسی کے مذہب کے پابند نہیں بلکہ

لے ایضاً

لے اتابع الحق واجتهد ولا اتقید بمذہب

میں اجتہاد کرتا ہوں، حق کا پیرو ہوں اور کسی کے مذہب کا پابند نہیں۔

## ملحاحات

شاہ ولی اللہ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے اس میں وجود سے کائنات  
کے ظہور تدریجی اور تعلیمات پر بحث ہے یہ کتاب عرصے سے ناپید تھی۔  
مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخہ کی قیام اور تشریحی حواشی اور  
مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت - ۲۰ روپے

# امام داؤد صاحب السنن

## سوانح حیات

عبدالبہادی ناصر۔ ایم اے

آپ کا نام سلیمان اور کنیت ابو داؤد تھی۔ اور اس زمانے کے دستور کے مطابق آپ اپنے نام سے زیادہ اپنی کنیت سے مشہور تھے۔ آپ عربوں کے مشہور قبیلہ ازد سے تعلق رکھتے تھے۔ گو آپ کے نسب نامے کے بارے میں مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے، لیکن جمہور علماء کا آپ کے جس سلسلہ نسب پر اتفاق ہے وہ یہ ہے۔

سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عسرا بن  
ازدی سبختانی یہ

ابن کثیر نے آپ کا سلسلہ نسب یوں بیان کیا ہے۔

سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن یحییٰ بن عسرا بن  
یعنی پانچویں پشت میں عمرو کے بجائے یحییٰ کا نام لکھا ہے۔ لیکن اس اختلاف  
کی کوئی وجہ بیان نہیں کی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابو داؤد کا جو سلسلہ نسب بیان کیا ہے وہ

بہت مختصر ہے اور وہ یہ ہے۔

سلیمان بن الاشعث بن شداد بن عمرو بن علمرہ  
حاضر کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں۔ ولفظ عمران۔ یعنی ان کا کہنا ہے کہ حاضر اور عمران  
ایک ہی شخص کے دو نام ہیں۔ حافظ ابن حجر نے امام ابو داؤد کے شاگردوں ابن واسعہ  
اور آجسری سے آپ کا مروی نسب نامہ بھی تحریر کر دیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے  
کہ اس ضمن میں حافظ ابن حجر نے خود کوئی فیصلہ نہیں کیا بلکہ دونوں آراء یکجا جمع کر دی ہیں  
دوسرا نسب نامہ یہ ہے۔

سلیمان بن الاشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد

اسی طرح علامہ نووی نے ابو حاتم سے امام ابو داؤد کا جو سلسلہ نسب بیان کیا ہے وہ  
ابن حجر کے بیان کردہ سلسلہ نسب سے ملتا ہے۔ یعنی سلیمان بن الاشعث بن شداد  
بن حاضر اور محمد بن عبد العزیز ہاشمی کے حوالے سے یوں بھی لکھا ہے۔ سلیمان بن بشیر  
بن شداد۔ مگر علامہ نووی نے بھی مجہور علماء کے نسب نامہ کو ہی نقل کر کے علامہ  
خطیب بغدادی کے اس حوالے سے اس کو ترجیح دی ہے کہ حافظ ابو طہر سلفی نے کہا  
کہ یہ قول زیادہ بہتر مناسب اور قابل اطمینان ہے۔  
خلاصہ کلام یہ ہے کہ صحیح اور اصل سلسلہ نسب وہی ہے جس پر مجہور نے اتفاق  
کیا ہے۔

امام ابو داؤد کے جد اعلیٰ عمران کے متعلق حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ عمران کے  
متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت علی کے ساتھ جنگ صفین میں شامل ہوئے تھے اور اس میں  
مارے گئے۔

۱۔ تہذیب التہذیب ج ۲۔ ص ۱۶۹

۲۔ تہذیب التہذیب ج ۲۔ ص ۱۶۹

۳۔ تہذیب الاسماء واللقبات ج ۲ ص ۲۲۳

۴۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۶۹

## آپ کا وطن

آپ کے سلسلہ نسب کی طرح آپ کے وطن کے بارے میں بھی مورخین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یوں تو سجستانی کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے وطن مقام بھستان ہے لیکن سجستانی کی تعیین میں بعض مورخین کو غلطی لگی ہے۔ تاہم اس بات کے فیصلے میں محققین کو کوئی شکل پیش نہیں آئی کہ صحیح مقام کون سا ہے۔

مورخین کے بیان کے مطابق بھستان خراسان کا وہ مشہور و معروف شہر ہے جسے زمانہ قدیم سے یہ فخر حاصل رہا ہے کہ اس سرزمین میں دنیا کے نامور علماء و فضلاء مشہور محدثین اور ارباب فضل و کمال نے جنم لیا۔ انہیں کی ہدایت اس مقام کو بھی شہرت دوام حاصل ہوئی۔

مشہور عالم الانساب سمعانی اس شہر بھستان کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ کہ یہاں بے شمار علماء اور محدثین پیدا ہوئے۔ صاحب معجم البلدان یا قوت موی نے بھستان کی فضیلت یوں بیان کی ہے۔ اس مقام کی جانب ائمہ راویان حدیث اور اہل دین وافر مقلد منسوب ہے۔ اور محمد بن طاہر مقدسی اپنی تالیف کتاب الانساب میں لکھتے ہیں۔ بھستان خراسان علماء اور محدثین کا مرکز تھا اور اہل بھستان کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

ان متذکرہ بالا بیانات سے جہاں بھستان کی عالمی شہرت اور تاریخی حیثیت ظاہر ہوئی ہے وہاں یہ بات بھی پابہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ امام ابو داؤد و اسی سرزمین میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فتوہ ناپاتی اور ابتدائی تعلیم و تربیت حاصل کی۔

بعض لوگوں نے بھستان کو بصرہ کے نواح میں ایک چھوٹا سا گاؤں بتلایا ہے۔ یہ گاؤں اتنا گم نام تھا کہ خود اہل بصرہ کو اس کا علم نہ تھا۔ ان لوگوں کو یہ غلطی اس لئے لگی کہ امام ابو داؤد نے مستقل سکونت بصرہ میں اختیار کر لی تھی۔ اس سے لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ



امام صاحب کی جائے پیدائش بصرہ کی لواحق بستی بختانہ ہی ہوگی۔ حالانکہ اس خیال کی تائید میں کوئی ٹھوس تاریخی شہادت نہیں ہے۔ صحیح ہی ہے کہ آپ کا وطن مالوت خراسان کا موبہ بختان ہے نہ کہ بصرہ کی گننام لواحق بستی بختان۔ چنانچہ محمد طاہر مقدسی اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

میں نے محمد بن نصر قتل ہوا اللہ خاں کو یہ کہتے سنا کہ امام ابو داؤد بختانی کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں ہے۔ جو بختان کہلاتا تھا، خراسان والا بختان نہیں ہے۔ اسی طرح بعض ہر وہمین نے ۵۳۴ھ کے قریب بیان کیا کہ میں نے محمد بن یوسف سے سنا ہے کہ ابو داؤد بختانی کا تعلق بصرہ کے ایک علاقہ بختانہ سے تھا نہ کہ بختان خراسان سے اور ابو نصر مذکور بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے بصرہ والوں سے اس کی تحقیق کی تو وہاں کے لوگ اس نام کے کسی گاؤں سے واقف نہ تھے۔ البتہ بعض لوگوں نے بتایا کہ ابواز کے قریب اس کے مشابہ نام کا ایک گاؤں تھا۔ لیکن وہ نام میری کتاب سے مٹ گیا۔ مگر ان باتوں کی کوئی اصلیت معلوم نہیں ہوتی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابو داؤد نیشاپور میں اسحاق بن یحییٰ کے ساتھ مکتب میں رہتے تھے۔ اور انہوں نے پہلی بار محمد بن اسلم طوسی کو خط لکھا۔ اس وقت ان کی عمر دس سال سے بھی کم تھی اور علماء و حفاظ میں سے کسی نے بھی یہ بیان نہیں کیا کہ ان کا وطن مشہور بختان کے علاوہ کہیں اور ہے۔

علامہ سمعانی نے اپنی تصنیف میں یہ بیان کیا ہے :- بختانی بختان کی طرف نسبت ہے جو کابل میں ایک مشہور شہر کا نام ہے اور وہاں بے شمار علماء اور محدثین پیدا ہوئے۔

اس بارے میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی فرماتے ہیں۔

ابن خلکان سے صحت انساب میں جہارت اور تاریخ دانی میں کمال کے باوجود اس نسبت میں غلطی ہو گئی ہے۔ انہوں نے کہہ ہے کہ یہ نسبت بصرہ کے ایک گاؤں بختان یا بختانہ

کی طرف ہے (ابن خلکان کا بیان ختم ہوا) شیخ تابع الدین السبکی اس عبارت کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ یہ وہم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ نسبت بلاد ہندوستان سے ملے ہوئے ایک مشہور ملک کی طرف ہے۔ (شیخ السبکی کا بیان ختم ہوا) یعنی یہ نسبت سیتان کی طرف ہے جو ایک مشہور ملک سندھ اور ہرات کے درمیان قندھار سے متصل ہے اور پشت بھی جو ہر گانِ چشت کا مسکن ہے۔ اسی ملک میں واقع ہے اور قدیم زمانے میں اس ملک کا پایہ تخت تھا۔

ابن خلکان کی جن عبارت پر یہ تبصرہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:-

سجستانی کی نسبت مشہور شہر سجستان کی طرف ہے۔ لیکن بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستاد کی طرف منسوب ہے یہ اس عبارت کو غور سے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ دراصل ابن خلکان نے بھی مشہور و معروف سجستان ہی کو جو علماء و فضلاء کا مولد مسکن تھا۔ امام ابو داؤد کا وطن قرار دیا ہے۔ دوسرا قول ابن خلکان کا اپنا نہیں، بلکہ انہوں نے بعض لوگوں کے خیال کو صرف نقل کر دیا ہے۔ "قبیلے" کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رائے ابن خلکان کی نہیں، بلکہ انہوں نے اسے بلا تبصرہ بیان کر دیا ہے۔ اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ امام ابو داؤد کے وطن کے تعین میں ابن خلکان کو غلطی لگی ہے علامہ ذہبی نے بھی تذکرہ الحفاظ میں اسی طرح اس قول کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

ابو داؤد کا وطن سجستان ہے، جو مکران اور سندھ کے اطراف کے کنارے ہے اور ہرات کے مقابل واقع ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا تعلق بصرہ کے ایک گاؤں سجستان سے تھا۔

علامہ ذہبی کے اس بیان سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ امام صاحب کا اصل وطن وہ

بمستان ہے جو خراسان میں واقع ہے اور جمہور مورخین کا اس پر اتفاق ہے۔ باقی بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ آپ اس بمستان کے رہنے والے تھے، جو بعصرہ کا ایک گاؤں ہے، صحیح نہیں۔ یہ ایک ضیعت قول ہے جس کی تائید میں کوئی تاریخ شواہد نہیں۔

ایک اور دلیل جس سے قطعی طور پر اس بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے کہ امام ابو داؤد کا وطن مالوت وہی بمستان تھا۔ جو اصحاب علم و کمال کا منشا و مولد تھا۔ یہ ہے کہ امام ابو داؤد کی دوسری نسبت السمری بھی بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ امام نووی کہتے ہیں ابو داؤد کو بمستانی اور سجری دونوں کہا جاتا ہے اور سجزا میں بمستان ہی ہے۔

اس سجزہ کے متعلق یاقوت رومی کہتے ہیں۔ سجزا طرات خراسان کے مشہور شہر بمستان کا نام ہے۔ اور اس کی طرف سجری سے نسبت کی جاتی ہے۔۔۔۔۔ اور اکثر اہل بمستان کو اس طرف بھی منسوب کیا جاتا ہے۔

اس ضمن میں حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی تحریر فرماتے ہیں :- اہل عرب کبھی کبھی اس ملک کی طرف سجری سے بھی نسبت کرتے ہیں۔

اس شخص تاریخ شواہد کی بنا پر یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ سجزا خراسان ہی امام ابو داؤد کا وطن اور جائے پیدائش تھی۔

آپ کے سن ولادت کے بارے میں تمام مورخین متفق ہیں۔ خود امام صاحب سے بھی یہی سن ولادت مروی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے بھی اپنی کتاب میں یہ روایت نقل کی ہے۔ ابو عیوب محمد بن علی بن عثمان اجری نے یہیں بتایا کہ انہوں نے ابو داؤد سے سنا کہ وہ سن ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔

اسی سن میں علم حدیث کے ایک اہل قابل فخر اور نامور محدث امام مسلم بن حجاج

نیشاپوری پیدا ہوئے۔ اور امام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری ان ہر دو سے چھ سال قبل یعنی ۱۹۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔

بے شک امام ابو داؤد ایک ایسے شہر میں پیدا ہوئے تھے، جو اس زمانے میں علمی مرکز تھا اور ہر فن کے صاحب کمال وہاں موجود تھے۔ علمائے محدثین کی بھی کثیر تعداد وہاں تھی جن نے نہ امام ابو داؤد کے استنادہ بھی کیا، لیکن اس سے آپ کی علمی تشنگی پوری طرح نہیں بجھی۔ مزید علم کا شوق آپ کو کثاں کثاں بسمستان سے بصرہ لے گیا۔ بصرہ سے آپ باریا بغداد تشریف لے گئے اور وہاں کے علماء و فضلاء سے منتفید ہوئے۔ خلیب بغدادی کہتے ہیں۔

ابو داؤد نے بصرہ میں سکونت اختیار کی اور کئی بار بغداد تشریف لائے۔ وہاں آپ نے اپنی سنن کی روایت کی اور اہل بغداد نے اسے ان سے نقل کیا۔

(تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۷)

ابن خلکان کہتے ہیں :- آپ کئی بار بغداد آئے اور پھر مستقل طور پر بصرہ میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی (وفیات الاعیان ص ۱۷۱) بصرہ میں آپ نے مستقل رہائش امیر احمد موفقی کی درخواست پر اختیار کی تھی تاکہ آپ کے چشمہ علم سے زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہو سکیں۔ خود امیر کے بیٹے بھی آپ کے حلقہ درس میں بیٹھے۔ بغداد اور بصرہ کے علاوہ آپ کو فہ بھی تشریف لے گئے وہاں بھی آپ نے شیوخ سے حدیث سنی، لیکن ان سے آگے روایت نہیں کی۔ چنانچہ امام صاحب فرماتے ہیں۔

میں اکیس برس کی عمر میں کو فہ گیا لیکن مخول بن ابراہیم المصدی سے میں نے احادیث نہ لکھیں اور عمر بن حفص بن عیث کے ساتھ ان کے گھر تک گیا، لیکن میں نے ان سے احادیث روایت نہیں کیں (تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۷)

ان سفروں کے علاوہ آپ نے اور بھی بہت سے ملکوں کا دورہ کیا۔ مثلاً آپ حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ نیشاپور، مرو اور اصفہان گئے۔ وہاں کے مشہور محدثین

کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کے زیرِ تربیت رہ کر مختلف علوم میں کمال حاصل کیا۔ حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں :- امام ابو داؤد ان ائمہ حدیث میں سے ہیں جنہوں نے طلب حدیث کے لئے ایک دنیا کا سفر کیا۔ انہوں نے احادیث کو جمع کیا۔ اور ان کی تخریج کی۔ اور شام، مصر، جزیرہ، عراق، خراسان وغیرہ شہروں اور ملکوں کے بہت سے شیوخ سے حدیث سنی (البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵-۵۶) امام نووی نے محمد بن صالح ماشی سے ایک روایت بیان کی ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آپ طرطوس میں بیس سال مقیم رہے اور تحقیق کرتے رہے (کتاب الاسرار واللغات ج ۲ ص ۲)۔

ان افسانہ کے علاوہ امام صاحب نے تحقیق و تدقیق کے لئے مختلف اصحاب سے خط و کتابت بھی کی۔ چنانچہ اپنی کتاب السنن کے متعلق اہل مکہ کو ان کے استفادہ پر ایک طویل خط لکھا (التعلیق الممجد علی سنن ابی داؤد)۔

الغرض تحصیل علم کے لئے امام ابو داؤد سے مقدور بھر کوشش کی اور کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ یہاں تک کہ علم حدیث اور فقہ میں مہارت تامہ حاصل کر لی

## اوصاف و خصائل

امام ابو داؤد کی ذات میں وہ تمام اوصاف حسنہ اور کمالات ارفع بدرجہ اتم موجود تھے جو ایک بزرگ عالم دین اور بلند پایہ محدث میں ہونے چاہئیں۔ آپ بڑے عباد گزار اور زہد تقویٰ میں نہایت بلند مقام رکھتے تھے۔ باوجود اس کے کہ آپ اپنے وقت کے امام اور مرجع خلائق تھے، آپ بڑے سادہ طبیعت تھے بہت منکر المزاج تھے۔ بڑائی اور خود پسندی، عجب اور خود ستائی سے آپ کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا آپ کی سادگی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی قمیص کی ایک آستین کھلی رکھتے تھے اور ایک تنگ۔ جب لوگوں نے آپ سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ ایک آستین تو میں اس لئے کٹا رہتا ہوں کہ

اس میں اپنی کتاب کے کچھ اجزاء رکھ سکوں اور دوسری کو کثادہ رکھنا اسراف سمجھتا ہوں۔

آپ صحیح معنوں میں عالم تھے۔ حصول علم کی غرض سے آپ نے ان تھک محنت کی۔ مختلف کٹھن مراحل طے کئے اور جب مقصود و مطلوب حاصل ہو گیا تو اس خزانہ علم کو لوگوں میں تقسیم کرنے میں بالکل بخل سے کام نہیں لیا۔ آپ فاضل علم سب کے لئے یکساں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا ملفہ درس بہت وسیع تھا اور مقامی شاگردوں کے علاوہ دیگر بلاد و اقصاء سے بھی کثیر تعداد میں طالب علم کتب علم کے لئے آپ کے ہاں آتے تھے۔

آپ کے خادم ابو بکر بن جابر نے ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ میں امام ابو داؤد کے ساتھ بغداد میں مقیم تھا۔ ایک دن جب ہم مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک خادم نے مجھ سے کہا کہ یہ امیر ابو احمد موفق ہیں جو امام صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے جا کر امام صاحب سے کہا کہ امیر بغداد آپ سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اجازت ہو، تو اندر بلا لیا جائے۔ آپ نے اجازت دے دی وہ اندر آئے تو امام صاحب نے پوچھا کہ آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیسے گوارا کی۔ امیر نے کہا مجھے آپ سے تین چیزوں کی درخواست کم فی ہے۔

ایک تو یہ کہ آپ بصرہ میں منتقل ہو جائیں اور وہاں مستقل قیام فرمائیں تاکہ مختلف ملکوں کے طالبانِ حدیث آپ سے استفادہ کر سکیں۔

دوسرے یہ کہ آپ میرے بیٹوں سے اپنی سنن روایت کریں۔ امام صاحب نے کہا کہ یہ دونوں باتیں تو مناسب ہیں۔ تیسری بیان فرمائیے۔ امیر بولے کہ آپ اپنے ملفہ درس میں میرے بیٹوں کے لئے علیحدہ مخصوص نشست کا انتظام فرمائیے کیونکہ امرار اور سلاطین کے لڑکے عوام کے لڑکوں کے ساتھ مجالس میں شریک نہیں ہو سکتے۔ اس پر امام صاحب نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ علم

کے معاملے میں شریف دویض اور اعلیٰ و ادنیٰ سب برابر ہیں۔ ان میں کوئی امتیاز نہیں  
ابن حاکم کا بیان ہے کہ اس کے بعد وہ بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر درس سنتے  
تھے۔ البتہ درمیان میں ایک پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔

آپ کے زہد و تقویٰ اور پاکیزگی و پرہیزگاری کی وجہ سے لوگ آپ سے  
بے حد عقیدت رکھتے تھے۔ لوگوں کو آپ سے دلی محبت تھی۔ ایک دفعہ سہیل بن  
عبد اللہ تستری آپ کے پاس آئے۔ امام صاحب کو اطلاع دی گئی کہ آپ سے  
ملنا چاہتے ہیں۔ آپ نے انہیں خوش آمدید کہا اور اپنے پاس بلا لیا کہنے لگے۔ مجھے آپ سے  
ایک کام ہے اگر آپ اس کے پورا کرنے کا اقرار کریں تب میں بیان کروں گا۔ امام صاحب  
نے حتی المقدور اسے پورا کرنے کا عہد کیا تو وہ کہنے لگے کہ میں آپ کی زبان مبارک کا  
جس سے آپ احادیث رسولؐ بیان فرماتے ہیں، بوسہ لینا چاہتا ہوں چنانچہ امام صاحب  
نے اپنی زبان مبارک باہر نکالی اور سہل نے اس کا بوسہ لیا۔

علم حدیث سے تو آپ کو عشق تھا ہی، علم فقہ سے بھی آپ کو بہت زیادہ شغف  
تھا۔ اور احادیث سے فقی مسائل کے استنباط میں تو آپ کو کمال حاصل تھا۔ علماء ایک  
طرف آپ کے کمال علم کی تعریف میں رطب اللسان تھے، تو ساتھ ہی اس بات کے  
بھی معترف تھے کہ آپ زہد و اتقا اور ریاضت و عبادت میں بھی یکساں تھے۔

ایہ حاتم آپ کی خصوصیت کا ذکر یوں بیان کرتے ہیں :- امام ابو داؤد فقہ و علم،  
حفظ و ضبط، عبادت، پرہیزگاری اور تقویٰ ہر لحاظ سے دنیا کے ائمہ میں سے ایک تھے۔

محمد بن یحییٰ ہروی کہتے ہیں :- آپ حدیث کے بے مثال عالم و حافظ ہو سیکے  
ساتھ عبادت و ریاضت، عفت و پاک دامنی، خیر و صلاح اور ورع و تقویٰ میں بھی منفرد  
جیہت کے مالک تھے۔

آپ کی ان خصوصیات کا ذکر شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ان الفاظ میں کیا ہے :-

در حفظ حدیث و اتقان روایت و عبادت و تقویٰ و صلاح و اعتقاد و در جہ عالی داشت۔ علامہ خلیف بغدادی نے آپ کی اس صفت کو بڑے اچھوتے انداز میں یوں بیان کیا ہے عبداللہ بن سعد ہدایت و اتقا میں حضرت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور علقمہ ان سے، علقمہ سے ابراہیم، ابراہیم سے منصور، منصور سے سفیان، سفیان سے وکیع وکیع سے امام احمد اور امام احمد سے ابو داؤد مشابہت تھے۔

امام ابو داؤد کو طلب علم کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ اس شوق کے ساتھ ساتھ قدرت نے آپ کو غیر معمولی ذہانت اور قوی حافظے سے بھی نوازا تھا۔ آپ کا ذہن ایسا تیز اور بادشاہت اتنی عمدہ تھی کہ ایک دفعہ کوئی بات سن لیتے تو وہ ذہن میں نقش ہو جاتی۔ آپ کو پانچ لاکھ احادیث یاد تھیں جن میں سے چار ہزار آٹھ سو امداد حدیث کا انتخاب کر کے آپ نے اپنی سنن مرتب کی۔

امام ابو داؤد کے غیر معمولی حافظے اور ذہانت کے اہل علم بھی معترف ہیں۔ اور اس بات کو متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ آپ غیر معمولی قوی حافظے کے مالک تھے۔

امام نووی کہتے ہیں:- علامہ کا امام ابو داؤد کی تعریف و توصیف پر اتفاق ہے۔ اور وہ سب ان کے کمال حفظ، علم وافر، ضبط و اتقان، وجہ دیانت اور حدیث میں فہم رسا کے معترف ہیں۔

محمد سلیم ہمدانی بیان کرتے ہیں:- امام ابو داؤد علمائے اسلام میں حدیث بنی صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت بڑے حفاظ میں سے تھے۔ یہ امام ابو داؤد کہتے ہیں:-  
ابو داؤد فقط اور علم اور حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں سے ایک بڑے امام تھے بلکہ

۱۔ تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۸۵

۲۔ تہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۴

۳۔ تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۷۷

۴۔ تہذیب الاسماء ج ۲ ص ۱۷۲



بن غلابان کہتے ہیں کہ امام ابو داؤد ہزاروں احادیث کا تذکرہ کیا کرتے تھے اور جب آپ نے اپنے سنن کو مدون کیا تو تمام اہل زمانہ آپ کے کمال حفظ و تقدم کے معترف تھے۔ الفرض آپ کی شہرت و دام اور غیر معمولی ترقی کا ایک باعث آپ کا خدا داد قوی حافظہ تھا۔

## فقہی مسلک

امام ابو داؤد کے فقہی مسلک کے بارے میں بھی بہت سی رائے ہیں۔ کسی نے آپ کو شافعی ٹھہرایا، تو کسی نے حنبلی قرار دیا۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے ان اقوال کا یوں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

لوگوں نے امام ابو داؤد کے مسلک کے متعلق اختلاف کیا ہے۔ بعض انہیں شافعی کہتے ہیں اور بعض حنبلی۔ واللہ اعلم۔

ابو اسحاق شیرازی نے اپنی تعییت طبقات الفقہاء میں امام ابو داؤد کو مقلدین میں شمار کیا ہے۔ اور اکثر لوگوں نے اپنی قول نقل کر دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ امام صاحب کو کسی خاص فقہی مذہب کا مفکر قرار دینا صحیح نہیں۔ آپ ایک زبردست محدث تھے۔ خدا داد فقہی بصیرت آپ کو حاصل تھی اور مسائل دینیہ میں مجتہدانہ کمال رکھتے تھے۔ اس لئے احکام و مسائل دینیہ میں اپنی آزادانہ مستقل رائے رکھتے تھے۔ جو کبھی حنبلی طرز فکر سے اور کبھی شافعی فقہی مذہب سے ہم آہنگ ہوتی۔ اسی لئے لوگوں کو آپ کے فقہی مسلک کے بارے میں فیصلہ کرنے میں اختلاف ہوا۔ بعض نے آپ کو حنبلی قرار دیا۔ اور بعض نے شافعی۔ دراصل امام ابو داؤد ایک نئے طرز فکر کے بانی تھے، جس میں تقریباً ہر مکتب فکر کا امتزاج موجود تھا۔ آپ کی سنن اسی طرز فکر کا ایک عظیم شاہ کار ہے۔ آپ اپنے زمانے کے امام تھے اور لوگ آپ کے مسلک کی پیروی کرتے تھے۔ چنانچہ محمد بن غلابان کہتے ہیں کہ جب امام ابو داؤد نے اپنی سنن کو مدون کیا اور لوگوں کے سامنے پیش کیا تو اہل حدیث میں اسے مصحف کا سامقام

حاصل ہو گیا اور لوگ اسی کی پیروی کرنے لگے۔

## وفات

خداوند باری تعالیٰ کے جباری کردہ قوانین قدرت تمام اہل عالم پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ انسان پیدا ہوتے ہیں۔ مقررہ مدت حیات کے بعد آخرت کو سدھار جاتے ہیں چنانچہ علم و فضل کی یہ شمع جس نے دینائے علم میں ہزار ہا چراغ روشن کئے بقا ہر تو سن ۱۷۷۵ء میں ہمیشہ کے لئے نکل ہو گئی، لیکن اپنے نور سے دینائے علم کو ہمیشہ کے لئے منور کر گئی۔ ابن ملککان نے امام ابوہداد کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ آپ سولہ سوال پڑھ جمہ ۱۷۷۵ء میں وفات پا گئے یہ

عباس بن عبدالواحد دمشقی نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور بصرہ میں آپ کو امام سفیان ثوری کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔

## حکیم ترمذی کی خود نوشت سوانح عمری

محمد خالد مسعود

### حالات زندگی

حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ قزلباش موقیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ متقدمین کے اس گروہ میں سے ہیں جو بیک وقت کئی علوم کے جامع ہوتے تھے۔ آپ محدث، حنفی فقیہ اور موافق تینوں حیثیتوں سے معروف ہیں۔ یوں تو آپ کی تصنیفات علوم عقلیہ و نقلیہ کی ہر صنف پر موجود ہیں۔ لیکن تصوف میں غالباً آپ ہی سب سے پہلے مصنف ہیں جنہوں نے دل کی دینک کے گہرے رموز اسرار پر قلم اٹھایا۔ بعد کے اکثر صوفیائے آپ سے استفادہ کیا ہے داتا گنج بخش علی البخاری علیہ الرحمہ (متوفی ۷۵۰ھ یا ۷۹۰ھ) آپ کے علم و معرفت کی بنا پر آپ کا ذکر بے حد احترام کے ساتھ کرتے ہیں۔ کشف المحجوب میں لکھتے ہیں۔

شیخ باختر و قانی از اصحاب بشر ابو عبد اللہ محمد بن علی الترمذی اندو قزلباش علم کامل و امام بود و از مشائخ مختصم بود۔ وی تحت نظم است بنزدیک من چنانکہ جملگی دلم شکار است بلکہ

ابو عبد اللہ محمد بن علی الترمذی یا بہت اور ابو العزم شیخ تھے جو صفات بشری سب سے بے نیاز تھے۔ علم کے تمام انواع و فنون میں کامل اور امام تھے۔ مشائخ مختصم ہیں سے تھے۔ میں ان کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ میرا دل پوری طرح ان کا شکار ہے۔

داتا گنج بخش اپنے شیخ ابو الفضل محمد بن حسن الحنفی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی نقل فرماتے ہیں کہ

”محمد بن علی درہ تیم است کہ در عالم ہوتا ندارد“

(محمد بن علی ایہ انایاب میرا ہے جن کا ساری دنیا میں جواب نہیں)

داتا گنج بخش علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب کشف المحجوب میں تیس سے زیادہ صفحات میں حکیم ترمذی کے حالات زندگی خصوصاً ان کے مہینہ نظریات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نظریات کی تفصیل ہمیں کشف المحجوب کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔

ابو عبد اللہ محمد بن علی الکیم الترمذی ماہِ رابعِ ہجری کے شہر ترمذ میں پیدا ہوئے ان کے ابتدائی حالات کے بارے میں بہت کم معلوم ہے۔ مختصر سی سوانح عمری زیر نظر مخطوطہ بدشان میں لکھے ہیں۔

میں نے آٹھ سال کی عمر میں تحصیل علم کی ابتدا کی یہ دیگر علم کے ساتھ ساتھ علم آثار اور علم ہائے پر نمودی توجہ دی۔ انہوں نے اپنے استاد کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن تذکرہ الاولیاء کے مصنف شیخ فرید الدین عطار نے اس کی تفصیل یوں دی ہے:

ابو عبد اللہ مغربی میں ہی والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ بڑے ہوئے تو اپنے دوستوں کی معیت میں تحصیل علم کے لئے سفر کا ارادہ کیا۔ اتفاق سے اپنی دونوں ان کی والدہ سخت بیمار پڑ گئیں۔ انہیں بیٹے کے ارادے کا علم ہوا تو بلا کر کہا ”میرے بیٹے تم جلتے ہو میں ضعیف و لاچار ہوں میرا اور کوئی رشتہ دار نہیں تمہارے سوا کوئی میری دیکھ بھال کیسے والا نہیں تم آخر مجھے کس کے سہارے پھونڈ کر جا رہے ہو؟“ ابو عبد اللہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے سفر کا ارادہ ترک کر دیا۔ ان کے دوستوں کو دستِ سفر پر روانہ ہو گئے۔ وقت گزرتا گیا۔ ابو عبد اللہ اپنی ضرورتیں اور بے بسی پر رویا کرتے۔ ایک مرتبہ کسی مقبرہ میں بیٹھے اسی طرح گھر یہ کٹان سننے اور کہہ رہے تھے۔ افسوس میں جاہل اور ان پر رونا رہ گیا۔ چند ہی دنوں میں میرے ساتھی علم حاصل کر کے واپس آ رہے ہوں گے۔“

اچانک وہ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک سفید ریش بزرگ جن کا چہرہ نورانی سے چمک رہا تھا سامنے کھڑے ہیں بزرگ نے پوچھا۔ کیوں رورہے ہو۔ آپ نے ساری کہانی سنائی بزرگ نے کہا کیا میں نہ تمہیں ہر روز کچھ پڑھا دیا کروں۔ اس طرح تم بہت جلد اپنے ساتھیوں سے مل گے

جاؤ گے۔ ابو عبد اللہ ذرا رخصت ہو گئے۔ اس طرح آپ نے ابتدائی تعلیم مکمل کی۔ شیخ عطار کا خیال ہے کہ یہ بزرگ خواجہ خضر علیہ السلام تھے۔

ستائیس سال کی عمر میں آپ حج بیت اللہ کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں عراق سے گذر ہوا۔ جہاں انہوں نے مختلف اساتذہ سے علم حدیث حاصل کیا۔ مکہ مکرمہ میں خانہ کعبہ میں باب ملتزم پر آپ گمبہ و زاری کرتے اور استغفار کیلئے امدعا مانگتے کہ دنیا کی محبت ان کے دل سے نکل جائے۔ مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران ہی آپ کو حفظ قرآن کا اشتیاق ہوا اور اتنا بڑھا کہ راستہ میں آپ نے بیشتر حفظ کر لیا۔ واپس آئے تو ایسے مرشد کی تلاش میں رہنے لگے، جن سے راہ ہدایت پاسکیں۔

انہی دنوں آپ کو چند صوفیا اور اہل معرفت کی محبت نصیب ہوئی اور الانطاک کی کتاب کا علم ہوا۔ جس سے آپ نے تزکیہ نفس کے طریقے اخذ کئے۔ اب آپ کا زیادہ وقت صحرائوں میں عزالت گزرتی اور مراتب میں بسر ہوتا۔ ان دنوں آپ کو بہت سے رویائے صلوٰۃ اور لطائف نورانی نظر آئے اور آپ کی طبیعت زیادہ سے زیادہ عزالت گزرتی اور صحرا اور ویرانوں میں باویہ پیاپی کی طرف مائل رہنے لگی۔ اچھی دنوں آپ نے خواب میں دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مقامی جامع مسجد میں تشریف لائے اور منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ حکیم ترمذی بھی آپ کے پیچھے پیچھے آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کے قدموں میں جا کر بیٹھ گئے۔ ایک اور خواب میں دیکھا کہ ان کو ایک جلد میں خدا کے ذوالجلال کے حضور سے بلایا گیا اور ان کو دو ماہ معفرت کی خوشخبری سنائی گئی۔ انہوں نے اس قسم کے کئی رویا دیکھے کچھ عرصے کے بعد انہیں ریاضت نفس کی استعداد نصیب ہوئی۔ نفسانی خواہشات سے نفرت پیدا ہوئی۔ اور عزالت کی طرف طبیعت مائل رہنے لگی۔ اکثر شام کو آپ کے کان اہل دل اور صاحبان معرفت کی مجلس رہتی۔ رات گئے تک اذکار و مناظرے میں مشغول رہتے۔ اور طلوع فجر تک نوافل اور دعاؤں میں مصروف رہتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ترمذی علیہ الرحمہ نے انہی دنوں میں کچھ کتابیں لکھیں جن میں آپ نے اپنے واردات کو استعارات و رموز کی صورت میں ذکر کیا۔ لیکن ترمذی کے علماء اہل علم

ہائیں ناگوار گزریں اور بڑی شد و مد کے ساتھ ان کی مخالفت شروع ہوئی حتیٰ کہ ان کو ترمذ سے ہجرت پر مجبور کیا گیا۔ ان کے اکثر سوانح نگار لکھتے ہیں کہ حکیم ترمذی نے عقائد عامہ سے ہٹ کر کچھ نظریات پیش کئے جن کی پاداش میں ان کو شہر ترمذ سے نکالا گیا۔ ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ اولیاء کو ابنیاء سے افضل قرار دیتے ہیں۔ اور اس کی دلیل میں وہ مشہور حدیث یقبطہم النیون والشہداء (ابنیا اور شہدار ان پر رشک کرتے ہیں۔ علامہ اسماعیلی لکھتے ہیں کہ لوگوں نے یہ الزام لگایا کہ حکیم ترمذی کہتے ہیں کہ لفظ عبیطہ (دشمن) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اولیاء ابنیاء سے افضل ہیں کیونکہ اگر اولیاء کی ابنیاء ہر افضلیت تسلیم نہ کی جائے تو لفظ رشک کا استعمال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ تاہم علامہ تاج الدین سبکی نے اس الزام کی شدت سے تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کوئی صاحب ایمان کسی غیر نبی انسان کو ابنیاء پر افضل قرار نہیں دے سکتا۔ وہ مزید لکھتے ہیں کہ شیخ سبکی نے لکھا ہے کہ لوگوں نے اغلباً حکیم ترمذی کی بات کو صحیح طور پر نہیں سمجھا اور غلط مطلب نکال کر ان پر الزام لگائے ہیں۔

اپنی خود نوشت سوانح عمری میں حکیم ترمذی خود اس الزام کی تردیدوں فرماتے ہیں۔  
 وصار الامر الى ان سعي بي الى والي بلغ وهدا البلا من عندا حتى  
 يبعث عن هذا الامر ورفعه اليه ان همنا من يتكلم في الحب وليفهم  
 الناس ويبتدع ويدعي النبوة، وتقولوا على ما لم يحضر بياني قط، حتى  
 صرت الى بلغ وكتب على قبالة ان لا يتكلم في الحب وكان ذلك من الله  
 تبارك اسمه سببا لتطهيري

بات یہاں تک بڑھی کہ والی بلغ سے میری شکایت کی گئی اور مزید آزمائش اس کی طرف سے یہ آئی کہ اس نے معاملے کی تفتیش کا حکم دے دیا۔ چنانچہ اسے یہ بات پہنچائی گئی کہ یہاں ایک شخص ہے جو جب "محبت کی باتیں کرتا ہے۔ لوگوں میں فساد ڈالتا ہے نئی نئی باتیں نکالتا ہے اور نبوت کا مدعی ہے، الغرض انہوں نے وہ سب کچھ کہا جس کا میرے دل پر کبھی شبہ بھی نہیں گذرا تھا۔ چنانچہ مجھے بلغ لے جایا گیا اور وہاں

مجھ سے یہ اقرار نامہ لکھوایا گیا کہ میں آئندہ محنت کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا (لیکن ہوا یہ کہ) یہ بات اللہ تبارک اسمہ کی طرف سے میری تطہیر و پاکیزگی کا باعث بن گئی۔ اکثر مورخین ہی کہتے ہیں کہ حکیم ترمذی تلخ آئے تو یہاں کے لوگوں نے بڑا پر جوش منبر مقدم کیا امدان کو پورے احترام و وقار کے ساتھ شہر میں لے جایا گیا۔ کیونکہ لوگوں نے دیکھا کہ حکیم علیہ الرحمہ کے نظریات و عقائد ان کے معتقدات کے بالکل مطابق تھے بلکہ

لیکن یہ وہ شان کے مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت یہ نہیں تھی۔ بلکہ تلخ میں اس لئے بلایا گیا کہ وہاں ان پر کڑی نظر رکھی جاسکے۔ جیسا کہ حکیم ترمذی کہتے ہیں کہ وہاں ان سے قبائلیہ لکھوایا گیا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مورخین کے ماں لفظ نقل و ہونے کافی مقابلہ پیدا کیا ہے غالباً سب سے پہلے یہ قبائلیہ لکھوانے کے معنوں میں استعمال ہوا لیکن بعد والوں نے اسے قبول کے معنوں میں لیا اور اس طرح مقابلہ بڑھتا چلا گیا اس حقیقت کو تاریخی حقائق سے ملا کر دیکھا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ تلخ اس علاقہ کا پاپا یہ تھوٹ تھا۔ اور ترمذ اس کے ماتحت تھا۔ چنانچہ یہ بات بعینہ اجماع معلوم ہوتی ہے کہ ایک ماتحت علاقے سے اسی حکومت کے حکم سے کسی ناپسندیدہ شخصیت کو نکالا جائے۔ اور یا یہ تھوٹ میں اس کا استقبال کیا جائے۔

انہی دنوں ملک میں ایک فتنہ برپا ہوا۔ حکیم ترمذی کے مخالفین کو شکست و ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ حکومت کا تختہ الٹ گیا اور حکیم کے سارے دشمن تتر بتر ہو گئے۔ شاہ حکیم ترمذی کی آزمائشوں کا دور ختم ہوا۔ سابقہ عزت و احترام عود کر آیا۔ آپ کے مدد میں آپ کے گرد جمع ہونے لگے۔ غالباً انہی دنوں آپ کی اہلیہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص ان سے کہہ رہا ہے کہ حکیم سے کہو۔ ان الامیر یا مولیٰ ان تعدل (امیر کا حکم ہے کہ تم عدل کرو۔) کچھ عرصہ بعد شہر کے معززین آپ کے گھر آئے اور معذرت کی۔ اس کے بعد وہ سب حکیم علیہ الرحمہ کو مسجد میں لے گئے جہاں سب لوگوں نے فداۃ غفور کے حضور اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کیا اور توبہ و استغفار کی۔

بہت جلد ان کے ماں شاگرد جمع ہونے لگے۔ ان کے مواعظ و خطبات لوگوں کے دلوں

میں گم کر کے اداس طرح اب انہیں اپنے نظریات و عقائد کی تشریح و تبلیغ کا موقع ملا جس سے بتدریج ان کی عسنت و شہرت کو استحکام حاصل ہوتا گیا۔

## تاریخ وفات

تاریخ ولادت کی طرح حکیم ترمذی کی صحیح تاریخ وفات بھی معلوم نہیں۔ مورخین بھی کہتے ہیں کہ آپ کی وفات اسٹی یا نئے پیرس کی عمر میں ہوئی۔ داراشکوہؒ نے ان کی تاریخ وفات ۷۵۵ھ بیان کی ہے۔ بعض تذکرہ نگاروں نے ۷۸۵ھ کہے۔ کلابازی کا جو مقابلہ متقدین میں سے ہیں خیال ہے کہ وہ تیسری صدی ہجری کے اوائل میں پیدا ہوئے تھے۔ علامہ سبکی نے لکھا ہے کہ حکیم ترمذی ۷۸۵ھ میں پشاپور میں درس حدیث دیتے تھے۔ ابن حجر نے حنیال قاہر کیا ہے کہ حکیم ترمذی یقیناً ۷۳۰ھ تک زندہ رہے ہوں گے۔ کیونکہ مشہور محدث اللباریؒ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے ۳۱۹ھ میں حکیم ترمذی کے حلقہ میں حدیث میں شرکت کی تھی۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ موثقیں کو آپ کے ہم عصر مشہور محدث امام ابو یوسف ترمذی (مشہور مجموعہ حدیث جامع الترمذی کے مؤلف) کی تاریخوں سے تشابہ ہوا ہے ان کی تاریخ وفات کے بارے میں بھی کافی اختلاف موجود ہے۔ ۷۶۰ھ، ۷۶۷ھ اور ۷۷۹ھ مختلف سنیں ہیں ان کی وفات بیان کی گئی ہے۔ حکیم ترمذی کی خود نوشت سوانح عمری میں جو اس مقالہ کا موضوع ہے، فقط ایک تاریخ درج ہے۔ آخری عشرہ ذوالقعدہ ۷۶۹ھ۔ اس غلطی میں ان واقعات کی بعض تفصیلات کا بھی ذکر ہے جن کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ موثقیں کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ کو اپنی مشہور کتاب ختم الولایہ کی دہرے سخت ابتلا کے دور سے گزرنا پڑا۔ ان تمام حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ مخطوطہ یقیناً کتاب الولایہ کے بعد لکھا گیا اور چنانچہ اس صودت میں یہ کسی طرح بھی ان کے ادائل حیات کی تفصیل نہیں ہو سکتی۔ اب ہم تاریخ وفات کے تعین کی کوشش کرتے ہوئے ایک ایک تاریخ کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ۷۵۵ھ تو صریحاً غلط ہے کیونکہ مخطوطہ میں اس کے چودہ سال بعد کی تاریخ (۷۶۹ھ) درج ہے۔



۳۱۸ھ اور ۳۶۰ھ بھی صحیح نہیں ہو سکتی، کیونکہ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حکیم ترمذی نے ۸۰ یا ۹۰ برس کی عمر میں وفات پائی تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے یہ مخطوطہ تیس چالیس برس کی عمر میں لکھا اور اگر یہ مان لیا جائے تو ان کی کتاب ختم الوالیہ اس سے بھی پہلے کی تصنیف ٹھہرتی ہے جو ان کے تذکرہ نگاروں کے بیان کے قطعاً منافی ہے کہ کتاب ان کی اواخر عمر کی تصنیف ہے۔

غرض حکیم ترمذی کی ممکنہ تاریخ وفات ۳۶۶ھ ہی ہے۔ اس لحاظ سے یہ مخطوطہ اس وقت لکھا گیا جب کہ آپ کی عمر ۶۳ سال تھی بفرضیکہ آپ نے نوے برس کی عمر میں وفات پائی ہو اور اس سال کی عمر میں وفات پائی ہو تو اس تصنیف کے وقت ان کی عمر ۵۳ سال تھی۔

## تصانیف

آپ کی تصانیف سے اہل قلم صوفیائے مد متاثر ہوئے اور اکثر ان سے استفادہ کیا۔ ماسنون کہتے ہیں حکیم ترمذی کے بعد کے تصوف پر جو گہرے اثرات ہوئے اس میں ان کے شاگردوں کے، بجائے ان کی تصنیفات کا زیادہ حصہ ہے۔ ایک جگہ مزید کہتے ہیں:-

”آپ کی تصنیفات کو بہت زیادہ نقل کیا گیا ہے۔ ابن عربی نے اپنی تصنیف ”فتوحات“ میں ترمذی کی کتاب ختم الوالیہ سے ولایت پر ۱۵۵ سوال نقل کئے ہیں۔ امام غزالی نے احیاء علوم الدین کے تیسرے حصے میں حکیم کی کتاب ”الاکیاس“ کا بیشتر حصہ نقل کر دیا ہے۔ ابن قیم نے کتاب ”الروح میں حکیم کی ”فروغی“ سے پیرے کے پیرے نقل کئے ہیں۔“

حکیم ترمذی کی بیشتر تصانیف ابھی تک مخطوطات کی صورت میں پڑی ہیں۔ ماسنون سے پہلے تک تو یہ حالت تھی کہ ان مخطوطات کا وجود بھی مختلف کتابوں میں ان کے ناموں کے تذکرے تک تھا لیکن بعد کے علماء کی چھان بین اور جدوجہد سے مخطوطے دریافت ہو چکے ہیں۔ ان کی تمام تصانیف جو ابھی تک معلوم ہو سکی ہیں ۷۷ کے لگ بھگ ہیں۔ ان میں سے بیشتر مختلف موضوعات پر رسائل ہیں۔ ان کی سند وجہ ذیل کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں۔

- ۱۔ نوادہ الاموال (فی معرفۃ اخبار الرسول) مطبوعہ: ستمبر ۱۹۶۳ء  
اس کا ایک اعلیٰ ڈیشن شرح اور ماسشیہ کے ساتھ مرقاة الوصول الی لولہ  
مول کے نام سے شائع ہوا۔
- ۲۔ کتاب السیاحۃ وادب النفس (قاہرہ ۱۹۶۷ء) تحقیق: اے۔ بی  
ربرمی اور علی عبدالقادر۔

۳۔ بیان الفرق بین الصدور والقلب والنفوس واللب

تحقیق: ڈاکٹر نقوہ سمیر (قاہرہ ۱۹۵۸ء)

۴۔ ختم الولایہ۔

یہ کتاب ختم الاولیاء کے نام سے عثمان اسمعیل بیچلی کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئی  
ہے (مطبوعہ کاثولیک، بیروت ۱۹۶۵ء) اس رسالہ میں بددشان بھی شامل ہے۔

۵۔ ختم الولایہ

یہ کتاب ختم الاولیاء کے نام سے

ریوسٹا دیگلی سنڈی (ورنیتالی) رسالہ بیزان اٹلی، جلد ۱۸- ص ۳۱۵-۲۷۰- (۱۹۶۰ء)

۶۔ حقیقۃ القدیمۃ

تحقیق عبدالحمن الحمینی۔ مطبوعہ: جملہ کلیات للآداب، اسکندریہ یونیورسٹی۔ جلد سوم

(۱۹۶۶ء) ۵۰-۸۰

## مخطوطہ

حکیم ترمذی کی خودنوشت سوانح عمری بعنوان بددشان ابنی عبداللہ کا ابھی  
تک صرف ایک ہی نسخہ معلوم ہے جو اسمعیل صائب (نمبر ۱۵۷/۹ کے ہاں محفوظ ہے۔  
یہ مخطوطہ رسالت ترمذی (اسماعیل صائب ص ۱۵۷) کا ایک حصہ ہے اس مجموعہ کی ردلوگما  
کاپی کے جو ادارہ تحقیقات اسلامی راولپنڈی کی لائبریری میں موجود ہے۔ صفحہ ۷۲ اور ۶۰  
پر کاتب کی تحریر موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا مجموعہ ۵۹۳ء میں ماہ صفر

رجب میں ابو الحسن بن محمود نے حلب میں لکھا۔<sup>۳۲</sup>

اس مخطوطہ کا کاتب غالباً فارسی سے ناواقف تھا چنانچہ مخطوطہ میں جہاں کہیں فارسی الفاظ اور جملے آئے ہیں ان کو صحیح نہیں لکھا گیا اور اکثر بہت قریب تمام بھی صحیح پڑے نہیں جاسکتے۔ یہ مخطوطہ مجموعۂ "رسائل ترمذی" اسماعیل صائب نمبر ۱۵/۱-۱۱ کا نمبر ۹ ہے۔ مجموعۂ میں حکیم ترمذی کے متعدد ذیل رسائل شامل ہیں۔

۱- کتاب السیاسة

۲- بیان العلم

۳- مسائل فی النیة

۴- جواب کتاب من السری

۵- الاکیاس والمفترون

۶- اجوبة المسائل

۷- الفقی بین الآیات والکرامات

۸- کتاب الحقوق

۹- بدو شان

۱۰- مسائل التعمیر

۱۱- منازل المقاصد

مخطوطہ نسخی رسم الخط میں ہے۔ اور ہر صفحہ انیس سطروں پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کو اس لحاظ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے کہ اس میں مصنف کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایسی معلومات ہیں جو دوسرے مؤرخین میں نہیں ملتیں۔ اس رسالہ کا خلاصہ اولاً پروفیسر عثمان بیچلی نے اپنے مقالہ "ورغے و ترمذی" (رسائل ترمذی میں پیش کیا۔

میلانشرے لونی مائینوں جلد سوم صفحات ۱۱۱-۱۱۰ ۵۰ مطبوعہ دمشق ۱۹۵۷ء اس کے بعد سٹاننفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر نقولا میر نے اپنے مقالہ "حکیم ترمذی کے بارے میں کچھ سوچیں اور کتابیاتی اشاعت" میں ان معلومات کا خلاصہ پیش کیا۔ یہ مقالہ مطبوعہ کنڈلی ۱۹۶۷ء

صفحات ۱۷۱-۱۳۴۔ (عالم اسلام) کی اس جلد میں شامل ہے جو پروفیسر کے مئی کے نام معنون ہے۔

## موضوع

اپنی ابتدائی زندگی اعلان آفات و مصائب کی طرف اشارہ کر کے جو انہیں بلخ میں پیش آئیں اور جن کا ادھر ذکر ہو چکا ہے۔ حکیم ترمذی نے اپنی قلبی واردات اور روحانی منازل کی تفصیل درج کی ہے۔ یہ تمام حصہ رویہ کی صورت میں لکھا گیا ہے جو اکثر ان کی اہلیہ نے دیکھے۔ پہلے خواب میں ایک فرشتہ ان کی اہلیہ کو کہتا ہے کہ وہ حکیم ترمذی کو نصیحت کریں کہ وہ لایینی باتوں سے پرہیز کریں۔ ایک اور خواب میں زبان کی پاکیزگی کا حکم دیا جاتا ہے۔ ایک خواب میں فرشتہ وضاحت کرتا ہے رضا اور قناعت محض موم و مملوۃ سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ طہارت قلب سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک اور خواب میں وہ ایک خشک لمبا درخت دیکھتی ہیں جس کے نچلے حصہ میں ایک پرندہ ہے جو اوپر کی طرف آہستہ آہستہ اڑ رہا ہے اور جس شاخ سے گزرتا ہے وہ سیڑج ہو جاتی ہے۔ درحقیقت یہ درخت ایمان کی رمز ہے اور پرندہ کلمہ لا الہ الا اللہ کو ظاہر کرتا ہے۔

رسالے کے آخری حصے میں ایک بہت ہی اہم خواب درج ہے۔ حکیم کی اہلیہ دیکھتی ہیں کہ ایک ترک امیر کے لشکر کے اچانک داخل ہو جائے سے ملک کے سب لوگ سخت پریشان ہیں۔ آگے بڑھ کر پوچھتی ہیں تو کہا جاتا ہے کہ جب تک چالیس آدمی جن میں حکیم ترمذی بھی شامل ہوں امیر کے حضور میں پیش نہیں ہوں گے یہ ملک محفوظ نہیں۔ پتا چھ حکیم ترمذی انتالیس آدمیوں کو ساتھ لے کر امیر سے ملتے ہیں اور عام معافی دے دی جاتی ہے۔

اس رسالے میں حکیم کے قین مریدوں کے خواب دیکھنے کا بھی ذکر ہے جن کے نام ابو داؤد خطاط۔ احمد بن جبریل بن ادریس محمد بن نجم مثالی ہیں۔

حکیم ترمذی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کچھ عرصہ زوال آفتاب مدون اور علم تربیت کے

دیگر حسابات یکٹنے میں مشغول ہے۔ خصوصاً اصطلاح کے استعمال میں کافی دسترس حاصل کر لی ہے

بعض خواب جن میں فارسی کلمات تھے اس مخطوطے میں درج نہیں کئے گئے۔ ہر کیف یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ترمذی کو منازل تصوف میں اولاد و تلمیذین ان کی اہلیہ کی مفرت موصول ہوئے تھے۔ جو خود بھی ان واعادت سے گزر رہی تھیں۔ ان کی اہلیہ پر بھی اس لئے الہی کے تمام انوار یکے بعد دیگرے منکشف ہوتے تھے۔ ان روایہ میں حکیم ترمذی کو تین صفات الہی غنمت، جلال اور بہا کا خصوصی علم عطا کیا گیا ہے۔  
آخر میں حکیم کی اہلیہ پر اسم طیف کے انوار منکشف ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ سالہ ختم ہوتا ہے

## حوالہ جات

۱۔ بعض اصحاب جرح نے حکیم ترمذی کے محدث ہونے میں کلام کیا ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی قاضی کمال الدین ابن العدیم مصنف تاریخ حلب کے حوالے دامحلہ فی المرحۃ علی ابی طلحہ سے لکھتے ہیں کہ

وهذا الحكيم الترمذي لم يكن من اهل الحديث، ولا بداية له، ولا علم له  
قطرقة وصناعة وإنما كان فيه الكلام على اسنادات الصوفية والطرائق  
ودعوى الكشف عن الامور الغامضة والحقائق حتى خرج في ذلك عن قاعدة  
الفقه واسحق الطعن عليه بذلك والازمار وطعن عليه ائمة الفقهاء  
والصوفية، واخرجوا بذلك عن السيرة المرضية، وقالوا انه ادخل في علم  
الشريعة ما فارق به الجماعة وملا كثره الفطبيعة بالاحاديث الموضوعه  
وحشاها بالاجزاء التي ليست بمروية ولا مسموعة وعلى فيها جميع الامور  
الشرعية التي لا يعقل معناها بلل ما اضعفها وما اوجها.

تاہم علامہ ابن حجر کو اس رائے سے مکمل اتفاق نہیں وہ کہتے ہیں۔ ابن العدیم نے حکیم پر

جرح میں سمانہ کیا ہے لیکن ان کی شہرت اور عظمت کے باوجود مجھے ان کی زندگی کے بارے میں اتنی بیشی معلومات نہیں مل سکیں۔

سان المیزان (جید زبایو ۱۳۳۱ھ) جلد ۵ ص ۳۰۸

۲۔ علی البحریری / کشف المحجوب، انگریزی ترجمہ آر۔ اے نکلسن (لندن ۱۹۱۱ء) ص ۱۴۱

۳۔ متن بدوشان ابی عبداللہ ورق ۲۰۹ پ

۴۔ اے، جے آر بری نے شیخ عطار کے اس بیان پر کہ حکیم ترمذی بچپن میں ہی والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے۔ گرفت کی ہے۔ وہ علامہ تاج الدین اسبکی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ حکیم ترمذی نے اپنے والد سے حدیث کی روایت کی ہے (طبقات الشافعیۃ الکبریٰ جلد دوم ص ۲۰)

حکیم ترمذی کی اپنے والد سے اپنی کتاب دیاضۃ النفس اور ارجب النفس تحقیق ڈاکٹر آر بری اور ڈاکٹر علی بن عبدالقادر۔ مطبوعہ مصطفیٰ البانی ۱۹۷۷ء میں صفحہ ۲۰، ۸۱، ۱۳۷ اور ۱۵۵ پر مروی احادیث درج ہیں۔

۵۔ تذکرۃ الاولیاء تہذیب ڈاکٹر نکلسن، جلد دوم، ص ۹۱-۹۲

۶۔ بدوشان، ورق ۲۰۹ پ

۷۔ شیخ السلی نے طبقات الصوفیہ (مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۳ء ص ۱۳۷-۱۳۵) ۸۔ دو انطکیوں کا ذکر کیا ہے۔ ابو عبداللہ احمد بن عامر الانطاکی اور عبداللہ بن یسوق الانطاکی حکیم ترمذی جن الانطاکی کا ذکر کر رہے ہیں، وہ غالباً ابو عبداللہ احمد الانطاکی ہیں۔ کیوں کہ الفرق بین الدیارات والکرامات (رد لوگمات کاپی، لائبریری ادارہ تحقیقات اسلامی برائے عربیہ کے صفحہ نمبر ۳۴۹ پر اپنی کا ذکر موجود ہے۔

عثمان اسماعیل یحییٰ ختم الاولیاء کا ٹولیکہ بیروت ۱۹۶۵ء ص ۱۵۱ نے حلیۃ الاولیاء کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہاں الانطاکی سے مراد احمد بن عامر ہے اور یہ کتاب غالباً علوم المعاملات ہے۔

چوہدری عبدالعزیز بیکر طری ٹیرٹ کمیشن کراچی کی تحقیق یہ ہے کہ حکیم ترمذی کو جو

کتاب ثلثہ دلائل کتاب المخلوۃ وانتقل فی العبادۃ ودرجات العابدین تھی جو غلط طور پر مجلس سے منسوب کی جاتی ہے۔

۵۵۔ ہمدوشان۔ ادلاق ۲۱۰-۲۱۱

۵۶۔ حکیم ترمذی نے الفرق بین الآیات والکرامات ردو گران مخطوطہ اسماعیل صائب ۱۵۴/ ورق نمبر ۱۵۷ پر اس حدیث کو سند درجہ ذیل الفاظ میں روایت کیا ہے۔

والاخبار المتواترة عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ان الله عبادا يباهي بهم ملائكته والله عباداً ليسوا بالنبياء ولا شهداء يغبطهم النبيون والشهداء بمكانهم من الله يوم القيامة ثيابهم نور وجوههم نور وعنى متابعون نور ولا يفرحون اذا فرح الناس ولا يخافون اذا خاف الناس ثم قرأ رسول الله صلى الله عليه وسلم الا ان اولياء الله لا خوف عليهم ولا هم يحزنون قيل من هم يا رسول الله؟ قال قوم من قبايل شتى لم تقبل بينهم ارحام متجاوفا في جلال الله

فمن باها الله به ملائكته ايام الدنيا ومكيب له يوم القيامة على منبر النور قائل هذا منكم له الحق

۵۷۔ وقال انه يقول ان الاولياء خاتما كما ان الانبياء خاتما وانه يفضل الولاية على النبوة واحتج بقوله عليه السلام يغبطهم النبيون والشهداء وقال لو لم يكونوا افضل منهم لم يغبطوهم۔

۵۸۔ ایضاً اعتذر اسلمی عنہ ببعدهم الفاهمین (قلت) ولعل الامر كما زعم اسلمی، والا فمنا نعلن بسلام انه يفضل بشما على الانبياء عليهم السلام۔

۵۹۔ ہمدوشان : ورق ۲۱۱ الف

۶۰۔ حکیم ترمذی کی تحریروں کے تفصیلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حکیم ترمذی پر یہ الزام کہ وہ ولایت کو نبوت سے افضل سمجھتے تھے صریحاً غلط ہے۔ سند درجہ ذیل اقتباسات ملاحظہ ہوں

۱۔ درجات عدن محل الانبیاء علیہم السلام والفرادس محل الاولیاء وحی القرب  
وحی سرت الجنة بیبال باب العرش فتوہوا ان تلك منازل الانبیاء علیہم السلام  
لا یبلغھا غیرہم فاعلم ان ذلك لیست بمنازل الانبیاء علیہم السلام وانما ہوامنازل  
الاولیاء والانبیاء فوقہم لان درجۃ النبوة اعلیٰ۔

”نوازل الاصول“ ص ۲۰۳ بحوالہ ڈاکٹر نقولا سمیر، حکیم ترمذی کے بارے میں کچھ سوچنی  
اور کتابیاتی اشارات مشمولہ دی ولذات اسلام (مطبوعہ لندن ۱۹۶۰ء) ص ۱۲۷  
(ب) اعلم ان للنبوة واربعون جزءا ولا تكون هذا الاجزاء الا للنبی ومن کان  
لہ فی ہذا الاجزاء جزءین او ثلثة علی الحقیقة یکون صاحبہ من الاولیاء  
یقوم بہ الدنیا۔

معرفة الاسرار: ورق ۱۴۷ بحوالہ ڈاکٹر نقولا سمیر محمولہ بالا

ج۔ والنبی دون الرسول بدرجة والمحدث دون النبی بدرجة وللرسول  
درجة الرسالة والنبی درجة النبوة والمحدث درجة الحديث  
ادب النفس، ص ۱۱۷ مصطفی البیاتی، ۱۹۴۷

د۔ سندرجہ ذیل سوالات الجواب المستقیم عاقل عنہ الترمذی الحکیم میں شامل ہیں۔ جسے  
کتاب الریاضۃ وادب النفس کے دیباچہ سے نقل کیا گیا ہے۔  
این مقام الانبیاء من الاولیاء

ما فضل بعض النبیین علی بعض وکذلک الاولیاء

قوله ان الله عباد الیساوا بالانبیاء یعبطهم النبیین بمقامهم وقربهم الی الله  
نظریہ ”ولایت“ کے بارے میں العفیفی نے یوں تصریح کی ہے

ابن عربی کے ہاں ”ولی“ کی اصطلاح رسول اور نبی کو بھی شامل ہے۔ ان کے نزدیک  
”ولایت“ تمام روحانی منازل و ارادت کی بنیاد ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ انبیاء میں ولایت  
نبوت سے زیادہ کامل ہوتی ہے“

ملاحظہ ہو کتاب الریاضۃ ص ۷۱ اور العفیفی ابن عربی کا مفہد تصوف انگریزی ص ۹۴-۹۵



شیخ ابوہریری نے حکیم ترمذی کے نظریہ ولایت کو کثرت المحبوب (صفحات ۱۷۷-۱۷۹) میں  
پوری تفصیل کے ساتھ درج کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

”ان کے نظریات کی بنیاد ولایت پر تھی۔ وہ ولایت کی نوعیت، خصوصیات اور ادولیک کے  
ملاوہ اور ان کے مناصب کے نظام کو تفصیل سے بیان کیا کرتے تھے چنانچہ ان کے نظریات سے  
آگاہی کے لئے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ اولیاء ہیں جنہیں اس نے  
تمام لوگوں میں سے چنا ہے اور جن کے نفوس کو آلائش و علاقہ دنیوی سے پاکیزہ کیا ہے۔ اور  
ہر ایک کا ایک درجہ مقرر کیا ہے اور ہر ایک کے لئے تصوف کے معانی کے ددانے کھولے ہیں  
محمد بن علی کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ ولایت کی اصطلاح کا اطلاق طریقت و تصوف پر  
کرتے تھے اور ان کے رموز کی وضاحت کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ خداوند تعالیٰ نے ان  
اولیاء کو دنیا میں اپنی سلطنت کے امرا کے طور پر منتخب کیا ہے اور انہیں ذریعہ اپنے تفرقات  
کا ظہور کر کے متذکیہ اور ان کو فاس طور پر مختلف قسم کی آیات و کرامات عطا کی ہیں ان  
کو فطری ملوثات سے پاک کیا ہے، نفسانی خواہشات اور غلبہ ہیبت سے ان کو منزہ کیا  
ہے حتیٰ کہ ان کے خیالات خدا کے خیالات ہیں اور ان کا خداوند تعالیٰ سے انتہائی قرب ہے جن  
میں کوئی شریک نہیں۔“

اللہ تعالیٰ نے فیضانِ نبوت کو ہمیشہ جاری رکھنے کے لئے اولیاء کو منتخب کیا ہے جن کے  
ذریعے شہادتِ نبوت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ تاکہ حقیقتِ محمدیہ کی صداقت کے آثار و آیات  
کھلی آنکھوں دکھائی دیتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اولیاء کو کائنات میں اپنے حاکم مقرر کیا ہے۔  
وہ کلیئہ اسی کے کام میں مشغول رہتے ہیں اور اپنی جملہ نفسانی خواہشات سے باز رہتے ہیں۔ ان کی  
دعاؤں اور برکتوں سے آسمان سے بارش آتی ہے اور ان کی زندگی کی پاکیزگی کی بنا پر زمین سے  
پودے اگتے ہیں اور انہی کے روحانی تفرقات اور فیوض سے مسلمان کافروں پر نفع پاتے ہیں  
ان میں چار ہزار پوشیدہ ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو بھی نہیں جانتے اور اکثر اپنی اس حالت سے  
خود بھی واقف نہیں ہوتے اور ہر حالت میں اپنے آپ سے اور جملہ بنی آدم سے مخفی رہتے ہیں  
لیکن ان میں جو اہل حل و عقد ہیں، وہ دہار خداوندی کے منصب دار ہیں۔ ان کی تعداد تین سو

ہے ان کو اختیار کتے ہیں ان میں سے پھر چالیس ہیں جن کو ابدال کہتے ہیں۔ پھر ان میں سے سات ہیں جو نقبائیں اور ان میں سے ایک قطب ہوتا ہے جسے غوث بھی کہتے ہیں؟

نظرۃ ولایت کے بانی حکیم محمد بن علی کا عقیدہ تھا کہ معجزات و کمالات بے خودی کی نیت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اللہ نے کائنات پوری طرح اپنی کے تصرف میں رکھی ہے۔ لہذا ان کے بیٹے انتہائی مستحکم اور جتنی بر عدل ہونے چاہیں اور ان کے دل انتہائی نرم ہونے چاہیں جو خدا کی جملہ مخلوقات میں کوئی تمیز نہ کریں۔ تاہم ادلیا تمام زمانوں میں اور تمام حالات میں انہیں اسے ماتحت ہونے چاہیے کیونکہ وہ انہی کے اغراض و مقاصد اور شرائط کی تکمیل کے لئے مقرر ہوتے ہیں۔ انہیں ہر طور ادلیا سے افضل ہیں کیونکہ ولایت کی انتہا نبوت کی ابتدا ہے۔ مزید بڑا انبیاء داعی اور امام ہوتے ہیں اور ادلیا ان کے پیرو ہوتے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا قطعاً ابدان حق اس ہے کہ ایک امام کا پیرو کار اپنے امام سے افضل ہو۔

۱۴۔ ملاحظہ ہو تاج الدین السبکی "لمعات الشافعیہ" محولہ بالا کی مندرجہ ذیل عبارت۔

قال ابو عبد الرحمن السیسی نقوی من ترمذ و اخرجوه متعاضداً و شہداً و اعلیہ ہانکفر۔۔۔۔۔ فجدوا لی بلغ فقتلوه فقبلوه بسبب موافقة ایماہم علی المذہب اور سان المیزان محولہ بالا کی مندرجہ ذیل عبارت

قال السیسی۔ و قبل اندھ ہجر بترمذ فی آخر عمرہ بسبب تصنیفہ کتاب ختم للولایۃ و علی الشریعۃ، قال فعل الی بلغ فاکرموه لموافقة لہم فی المذہب یعنی الملوی ۵۷۶۔ غالباً ۵۷۶ کا ذکر ہے جب کہ غتلیوں سے یعقوب بن لیث مغاری نے بلخ چھینا اور یہاں مغاریوں کی حکومت ہوئی۔

لے بدوشاں، ورق ۲۱۲ ب

لے الذہبی تذکرۃ الفقہاء، طبع ثانی (جید آباد ۱۳۳۳ھ)، جلد دوم، صفحہ ۳۱۰

لے ابن حجر عسقلانی، سان المیزان، محولہ بالا، جلد پنجم، ص ۳۱۰

لے والا شکوہ "سفینۃ الاولیاء" (نول کشور ۱۸۷۲ء)، ص ۱۲۹

لے السبکی، محولہ بالا، ص ۶۰

۲۱۔ التعرف لمذهب اهل التصوف (دار احیاء الکتب العربیہ، ۱۹۶۰ء) ص ۳۲

۲۲۔ السبکی، محولہ بالا ص ۲

۲۳۔ غالباً حکیم کی مراد محمد بن القاسم بن بشار ابو بکر الانباری متوفی ۳۲۸ھ ہیں جو مشہور راوی حدیث ہیں۔

۲۴۔ ابن حجر، محولہ بالا ص ۳۱۰

۲۵۔ الذہبی، تذکرۃ الحفاظ (مید لکبادتہ ن) جلد دوم ص ۲۹۹ میں درج ہے۔

۲۶۔ بدوشان، ورق ۲۱۷۔ الف

۲۷۔ السبکی ص ۲

۲۸۔ ابن حجر، محولہ بالا جلد ۵ ص ۳۰۸

۲۹۔ ابن حجر، محولہ بالا

۳۰۔ التعرف (ص ۳۰۸) کے مصنف نے اسی تاریخ کو تسلیم کیا ہے کہتے ہیں۔

والمرج انعمات خواتی سنۃ ۲۹۶ھ

۳۱۔ ڈاکٹر آبرو بھی اسی تاریخ کو بیع تسلیم کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو مقدمہ کتاب الیاضۃ  
30. Essai sur Les Origines du Lexique technique de La Myst-  
ique musulmane, 2nd ed. (Paris, 1954), p. 264. Quoted  
by Nicholas L. Heer, Some Biographical and Bibliogra-  
-phical Notes on al-Makim al-Tinnidhi in The World of Islam  
(London 1960), p. 127. 31. Louis Massignon. Lexique, pp. 259-  
62, and Recueil de textes inédits concernant l'histoire de La  
mystique en pays d'Islam (Paris, 1929), pp 33-6-253-4. quoted  
by Nicholas L. Heer.  
۳۲۔ ان کی تصانیف کے بارے میں معلومات مندرجہ ذیل اخذ سے لی گئی ہیں۔

۱۔ کتاب الیاضۃ وادب النفس (محولہ بالا)

۲۔ بیان الفرق بین العبد والقلب۔ تحقیق ڈاکٹر نقولامیسر

عینی البانی (۱۹۵۸ء)

۳۔ "عالم اسلام" (انگریزی) محولہ بالا، سلووع لندن ۱۹۷۰ء

۴۔ برکلمان جلد اول ۱۹۹۱ء اور ملحقہ جلد اول ۳۵۵

۵۔ رسائل ترمذی (فرانیسی)، مشمولہ دستفرقات نوئی ماسینون (فرانیسی) جلد سوم دمشق ۱۹۵۴ء

۳۳۔ عبارت مندرجہ ذیل ہے۔

(۲۰۲۲) بحمد اللہ ومنہ دعوتہ سہل اللہ المعونة علی عافیہ بفضلہ ذکرہ فی یسرہ

عافیۃ وصلى اللہ علی محمد وعلی آلہ وسلم کثیرا واما ابدا۔ وفرغ منه فی العشر الثالث

من صفر سنة ثلث وتسعين وخمسمائة الفقير الى رحمة ربه عبد المحسن بن محمود

رحمہ اللہ تعالیٰ بمحرورۃ حلب حامد اللہ وسبحانہ وصلياً علی نبیہ محمد وآلہ واصحابہ وسلم

(۲۰۴۶۵) انتہی بحمد اللہ ومنہ وصلى اللہ علی سیدنا محمد النبی الامی وآلہ وسلم تسلیما کثیرا۔

وكان الفراع من تطيرة لثلاث خلون من شهر الله الاصب رجب سنة ثلاث وتسعين وخمسمائة

۳۴۔ بدو شانی، ورق ۲۱۲ ب

۳۵۔ ایضاً ورق ۲۱۳ الف

۳۶۔ " ۲۱۳ ب

۳۷۔ " ۲۱۴ الف

۳۸۔ " ۲۱۵ ب ۲۱۶ الف ۲۱۹ ب ۲۱۷ الف

۳۹۔ " ۲۱۵ الف

۴۰۔ " ۲۱۵ ب

۴۱۔ " ۲۱۵ ب

۴۲۔ " " "

۴۳۔ " ۲۱۷

۴۴۔ " ۲۱۷ ب

۴۵۔ " ۲۱۸ الف

# شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصہ اول

## مبادیات اخلاقیات

مصنف ڈاکٹر عبدالواحد علی پورہ

مترجم، سید محمد سعید

(۵)

## باب سوم عمرانی پس منظر

تمہید۔

اخلاقیاتی کردار، طرز عمل کی شکل کی نمائندگی کرتا ہے۔ جو کہ ایک شخص کی شخصی اور معاشرتی زندگی، کے نظم و ضبط کے لئے موزوں اور فطری ہے اور اس میں اس کے حقوق و فرائض اور ذمہ داریاں بھی شامل ہوتی ہیں۔ ہر ایک صورت حال میں ایک فرد سے رانہ کا درجہ ہوتا ہے یا افراد کی اکثریت ایک قسم کے معاشرہ کا وجود ہوتا ہے، اسی سلسلہ میں علم اخلاقیات علم عمرانیات سے تعلق رکھتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کا ایک ہم عصر بھی ایسا نہیں جس نے عمرانیات کو اتنے عمدہ طریقہ سے پیش کیا ہو جیسا کہ شاہ صاحب نے پیش کیا ہے، ان کا اعلان بیان، ایسا ہی ہے جیسا کہ نفیاً یا اخلاقیات میں ہے۔ مقررہ تصورات میں سے ایک، جو کہ ہمیشہ ان کے ذہن میں ہوتا ہے، اس حقیقت میں پایا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی انسان کی اہتمام کی تلاش نہیں کرتے

البدیع حیوان میں انسان کی اجدار تلاش کرتے ہیں۔ یہاں بھی حیوانات کا طرز زندگی اپنا الجس ان کا اولین تصور ہے۔ ہمدردی ضرورت کے وقت جوائی عمل (یہ انسان کے معاملہ میں شاید ذمہ داری یا جوائی عمل کی اہلیت کا نام ہے) اور باہمی دفاع اور تعاون، تقریباً ایشیا اور دوسروں کی یہودی کا جذبہ شاہ ولی اللہ کے نزدیک، حیوانی دنیا میں عام ہیں انسان میں یہ تمام صفات ان دوسری جہلتوں کے ساتھ ہوتی ہیں جو بنیادی مثلث میں پیدا نشی طور پر ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ عقل و سبب کی صفات کا مخصوص مثلث یعنی 'رائے کلی' جمالیاتی صفت اور ترقی و کاملیت کی صفت تھریک بھی ہوتی ہے۔ یہی وہ بنیاد ہوتی ہے کہ جس پر ایک انسان، بلاشبہ کسی شے کو محسوس کرنے اور اسے عقلی طور پر جاننے کی ظاہری قوت و صلاحیت کی معاونت سے، 'نئی قدروں'، 'نئی شکلوں' اور 'نئے مقصدوں' کی تعمیر کرتا ہے۔ اس طرح سے، انسان اپنے آبا و اجداد کے مقابلہ میں ترقی مزید کرتا رہتا ہے۔ خواہ وہ حیوانات ہوں یا ابتدائی دور کے انسان ہوں۔

عمرانیات میں بھی، ارتقاء اور اضافیت ان کے اصول ہیں۔ معاشرہ ایک عضوی یا نامائیاتی فرد کی طرح ترقی پذیر ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ انسانی معاشرہ کو ان دہدوں کی کثرت تصور نہیں کرتے جو بعض مصنوعی ذرائع یا معاشرتی ردابط سے مجتمع ہوتے ہیں لیکن وہ اسے ایک حقیقی زندہ نظام الاعضا تصور کرتے ہیں۔ یہ اپنے ارتقاء کے قوانین کی پابندی کرتی ہے تقریباً افراد کے نظام الاعضا کے مشابہ خطوط پر کام کرتا ہے اور صحت و استحکام، ترقی اور فروغ، کمزوری و رجعت پسندی، بربادی و موت (بحران، جو ایک فرد کی زندگی میں ہوتے ہیں) اسی طرح معاشرہ کے ارتقاء کے دوران وجود میں آتے ہیں جن میں اس طرح کہ ایک فرد، اپنی صلاحیتوں کے مستحکم مرکز کے وصف میں زیادہ منفرد اور منظم طور پر فروغ پاتا ہے۔ اور یہ مرکز صلاحیت اس کے افکار و اعمال کو منظم و مجتمع کرتا ہے۔ اسی طرح، ایک ترقی پذیر معاشرہ فرد پاتا ہے۔ یہ اپنی حدود کے اعتبار سے پھیلتا ہے اور زیادہ سے زیادہ عضوی و نامائیاتی ہوتا ہے جو شے ایک فرد کی عادت

ہوتی ہے ایک معاشرہ کا رواج بن جاتی ہے۔ رسم و رواج کے سلسلہ میں ایک معاشرہ کی روایات کو جنم دیتی ہیں۔ جس طرح ایک فرد کی مرضی فروغ پاتی ہے ایک معاشرہ یا پورا دہی کی مرضی بھی فروغ پاتی ہے جتنی معظّم طور پر یہ فروغ پاتی ہی زیادہ وہ اپنی وحدتوں میں امتزاج پیدا کرتی ہے جو اس کے اعضا ہوتے ہر کے اعضا کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ بیان نہ صرف، ایک مخصوص انسانی معاشرہ میں صداقت پر مبنی ہے بلکہ تمام انسانی معاشروں کے معاملہ میں درست ہے۔ ہے کہ شاہ ولی اللہ نے اسے انسان الکبیر یا عظیم انسانی جشہ میں بھی بیان بے شک شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانیت، ایک عضویاتی فرد کی طرح عمل میں طرح کہ نفسیاتی پس منظر کے باب میں بعض مسائل کو زیر بحث نہیں اسی طرح یہاں بھی، ان موضوعات سے ہٹ کر بحث نہیں کی جائے گی جو شاہ کے معاشرتی و اخلاقی نظام کو سمجھنے کے لئے ضروری ہیں۔ موزوں اور فطری کہ وہ اپنی اخلاقیات میں پیش کرتے ہیں، مکمل تبصرہ اس وقت تک نہیں کیا جاسکتا کہ ایک شخص، انسانی فرد کے مزاج کے فروغ کے فطری طریقہ سے بخوبی واقف نہ کہ دو گزشتہ ابواب میں بحث کی گئی ہے، بلکہ اسے فروغ معاشرہ کے فطری کے رواج اور روایات سے واقف ہونا چاہیے۔ جو کہ عمرانیات کا ایک حصہ ہے

(سلسلہ)

## افکار و آراء

ایک خط ..... عنوان کی غلطی

الرحیم ہایت ماہ سنی دجون ۱۴۰۹ھ میں دو مقالہ جات بعنوان "صحت حدیث کی تعلیم و تربیت" جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری نظر سے گزرتے ہوئے ممکن ہے میرے فاضل دوست اس کو میری نکتہ نظری و اسوداد پر محمول کریں اگر میں یہ کہنے کی جسارت کر دوں کہ یہ مقالہ جہاں قرآن اور حدیث سے گہری بصیرت سے آجی داس ہے وہاں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے یکسر ناواقفیت کے آئینہ دار بھی ہے اور الرحیم بیٹے مقصدی رسالہ میں صاحب مقالہ معلومات کی عدم وسعت اور مطالعہ کی سطحیت ناگوار اور محل نظر ہوتی ہے۔

مجھے جناب ابوسلمان شاہجہاں پوری کا حدیث کے موضوع پر مقالہ پڑھا کہ بہت ہی الجوسی ہوئی ہے جہاں تک اس موضوع کی اہمیت کا تعلق ہے۔ اس کا اٹھا منقویہ تھا کہ صاحب مقالہ علم اٹھانے سے قبل محدثین اور فقہائے امت نیز متاخرین کی تغلیفات کو بالالاستیاب پڑھ لیتے مگر اس کے برعکس انہوں نے مولانا آزاد مرحوم و منفور کی تفسیر ترجمان القرآن سے سورت انبیاء سے متعلق تفصیلی کے متعلقہ پیرا گراف نقل کر دینے کے علاوہ کوئی تحقیق پیش نہیں کی۔ ان کا یہ رویہ اپنے موضوع سے ایک واضح بیادتی ہے۔ مولانا آزاد مرحوم و منفور حضرت امام اہل بیت علیہ السلام کے واقعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے صحت حدیث کے متعلق اپنے نظریات کلامی اہل بیت تھے۔

۱۔ بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے



بھی روایان حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔

۲- کسی روایت کے لئے بڑی سے بڑی جو بات کہی گئی ہے وہ اس کی عصمت ہے۔

عصمت نہیں ہے اور صحت سے مقصود صحت مطلقہ فن ہے نہ کہ صحت قطعی و یقینی مثل صحت قرآن - (۳) پس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی ہر میں لگ چکی ہوں لیکن ہر حال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے؟

۴- روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو۔ ہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں؟

متذکرۃ العدد تشریحات میں مولانا ایک ہی بات کو مختلف انداز میں کہہ رہے ہیں۔ مگر واضح یہ ہے کہ اس میں تحقیق کی کوئی راہ نہیں ہے جہاں سے صحت حدیث کا تصور تشکیک کی بھول بھلیوں میں دکھواتا ہو۔ حقیقت میں محدثین کرام اور فقہائے عظام نے صحت حدیث کی قطعیت کو کبھی بھی قرآن کی صحت کی قطعیت کے ہم پلہ قرار نہیں دیا سگر قطعیت کے اس معیار سے مراد روایت کے الفاظ کی صحت کی قطعیت ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں کہ واضح ہو کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شریعت اخذ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ ظاہر قول سے حاصل کرنے کا ہے اور اس کے لئے اقوال نبوی کی نقل ضروری ہے۔ خواہ یہ نقل متواتر ہو یا غیر متواتر۔ اور متواتر کی ایک قسم وہ ہے جس کے الفاظ بھی متواتر ہوتے ہیں جیسے قرآن مجید اور چند احادیث۔ ان میں سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہے کہ روز قیامت تم اپنے رب کو مان صاف دیکھو گے۔ اور متواتر کی ایک قسم وہ ہے جس کے معنی متواتر ہوتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ان مبارک احادیث کمال انسانوں کی لازوال محنت اور شبانہ روز محبت حدیث کی صحت قطعی کو برقرار رکھنے کی سعی شکوہ کی ایک سنہری تلمیح ہے۔ اگر یہ قسمتی سے حدیث کی صحت جیسا اہم ترین مقصد ان کے سامنے نہ ہوتا اور وہ بھی احادیث کے اس ذخیرے کو غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تو واقعہ یہ ہے کہ ساری امت کو سنت نبوی کو جو کہ اسلامی آئین و قانون کا تہذیب ترین ماخذ ہے، حدیث اور روایات کے ذریعہ معلوم کرنے میں جیشہ تامل ہوتا۔ ان کے نزدیک اگر کوئی روایت متن یا معنی کے اعتبار سے یا التواتر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یقینی طور پر ثابت

ہو تو اس کو قبول کرنا اس پر عمل کرنا اور اسلامی قانون و آئین کا ماخذ سمجھنا باجماع امت واجب ہوگا پناچہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی غیر معصوم راویوں کی شہادتوں کے بارے میں فرماتے ہیں کہ "لیس ہم کہتے ہیں کہ محبت اور شہرت کے لحاظ سے کتب حدیث کے چار درجات ہیں۔ اول متواتر جس کے قبول کرنے اور عمل کرنے پر امت کا اجماع ہے۔ متصل مرفوع احادیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ "لیکن صحیح بخاری اور صحیح مسلم۔ پس محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں اور یہ دونوں کتا ہیں اپنے معنی میں ایک با التواتر پہنچتی ہیں اور جو ان کی غفلت نہ کرے وہ مبتدع ہے جو مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔"

مجھے یہاں تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے مگر اتنا عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ محبت حدیث کی قطعیت کا یہ معیار کہ کہیں کسی حدیث یا روایت کا قرآن مجید سے کوئی تعارض نہ ہو خود محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی حقیقت میں لگا ہوں سے کبھی بھی او جمل نہ تھا۔ ادھب امام بخاری اور امام مسلم رحمۃ اللہ علیہما اپنی صحیح میں اسی حدیث کو جو مولانا کے اس تصور حدیث کی بنیاد ہے نقل کر رہے تھے اس وقت عصمت انبیاء اہم اور بنیادی مسئلہ ان سے کبھی بھی پوشیدہ نہ تھا اور نہ وہ اس سے ناواقف تھے جہاں تک کسی حدیث کے قرآن سے متعارض نہ ہونے کے معیار کا تعلق ہے اتنی سی گزارش ضرور کروں گا کہ احادیث اور روایات کا بیشتر حصہ ظاہری اعتبار سے متعارض نظر آتا ہے مگر خود محدثین اور فقہائے کرام نے اپنی وقت نظر اور مزاج شناسی رسول کے عمدہ مذاق سے ہمیشہ فن تعمیر سے کام لیا جس سے یہ ظاہری تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے۔ ادا امت کے لئے ہر زمانے کی مقتضیات کے مطابق عمل کی راہیں بھی کشادہ ہو جاتی ہیں مگر کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ خود حدیث یا روایت کو ہی جو مستعار معیار کے مطابق درست ہو، حرف غلط کی طرح موقوف کر دیا ہو۔ ان حقائق کے پیش نظر حضرت ابراہیم کے کذب کی حدیث کو حجت بنا کر تشکیک کی راہ پیدا کرنا کسی طرف بھی ممکن نہیں ہے حالانکہ خود مسلمان مجید میں اس کا قرینہ موجود ہے کاش لفظ کذب کی شرعی اور لغوی حیثیت بخوبی معلوم کر لی گئی ہوئی تاکہ پتہ چل جاتا کہ اسی ایک حدیث کی موجودگی سے امت پر سہولت اور یسر کی کتنی راہیں کھل گئی ہیں۔

جہاں تک خود مولانا آزاد مرحوم و مغفور رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق ہے ہم ان کی علمی جہالت کے کتے اپنے آپ کو طفل مکتب سے بھی کم خیال کرتے ہیں۔ مگر کیا کیا ہلے کہ حقائق سے صرف نظر کرتا بھی مثل ہو جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ حدیث کے قرآن سے سلی اور ظاہری تعارض کو قبول نہ کرتے ہوئے حدیث کو محض غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقذوں کا ایک فیصلہ قرار دیتے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور دوسری طرف وہ خود محض ماہرین آثار و قدیمہ کی تحقیقات اور روایات کو جو کہ سراسر قطعی اور وہی ہوتی ہیں۔ بنیادینا کہ قرآن مجید کی تفسیر اور نتائج کا استخراج کرتے ہوئے حدیثی اور روایتی تفسیر قرآن کی تاریخ کی بہت سی بواہر و بھونچ کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قطعی اور وہی تحقیقات تفسیر قرآن کا مستند ترین ماخذ ہے۔ چنانچہ قرآن کے ذوالقرنین کو وہ قطعی طور پر سائرس خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ مولانا کے اس قطعی یقین کا ماخذ کوئی خدا کا فرمودہ نہیں بلکہ وہی قطعی اور وہی تحقیقات ہیں جن میں خود ماہرین کی اپنی قومی عصیت کار فرما ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جوع ماجوع کے متعلق مولانا کا یہ کہنا کہ قرآن نے سورت انبیاء میں ان کے صحن خروج کی خبر دی ہے وہ سنگولیہ کے آثار یوں کا آخری خروج تھا قرآن مجید کی نصوص اور احادیث رسول اللہ علیہ وسلم کی خبروں کے بالکل برعکس ہے۔ مگر مولانا جن جزم و یقین سے اسی وہی اہل قطعی تحقیقات کو اپنے قطعی نتائج کو بنیاد قرار دیتے ہیں اس سے حدیث کے متعلق ان کا تذکرۃ الصدور تصور بجائے خود بواہر ہے۔

ہم آہ بھی کہتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام وہ کھل بھی کہتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا اگر میرے فاضل دوست اپنے مقلدے کا عنوان صحت حدیث کی قطعیت کے بارے میں مولانا آزاد کا تصور رکھتے تو بہت بہتر ہوتا عنوان کی یہ قطعی عمل نظر ہے۔

میرے خیال میں اسلام پر قشوں کی یلغار کے اس دور میں میں زبان و قلم کے بے محابہ استعمال کے نتائج سے بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔ آجہ قتنے فتنہ سرا تھا ہے میں ان میں حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تشکیک کا فتنہ سرفہرست ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر حدیث کے متعلق تشکیک کی راہ چڑھ گئی تو پھر ایک وقت ایسا بھی چلے آجہ کا جب کہ سنت رسول اللہ علیہ وسلم کو اسلامی آئین و قانون کا ماخذ تسلیم کرنے میں اربابِ بہت و کثرت متاثر ہو گئے ان مخالفت میں میں فاضل مقلد کا سے بھلا معارف کوں گا کہ کسی تحقیقی مقلد کے کا یہ ایک شیاوی اقتضا ہوتا ہے کہ اس کے والدہ و اعلیٰ پر ہر نظر ہونا کہ کہنے کی غرض مقامیت بوجہ احسن پسند ہو۔

## تنقید و تبصیر

### تذکرہ زندان

یہ کتاب مجموعہ ہے جناب خورشید احمد ایم اے ایل ایل بی کے ایام اسیری کے داروث و آثار کا۔ موصوف ۶ جنوری ۱۹۶۴ء کو گرفتار کئے گئے۔ اور ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو آپ سے اپنے ساتھیوں کے رہا ہوئے۔ تذکرہ زندان بقول خورشید صاحب اس نئے تجربے کی روداد ہے۔ اس زندگی کی داستان جو آہنی سلاخوں کے پیچھے گزاری گئی۔

فاضل مصنف کی اس الزام پر گرفتاری عمل میں آئی تھی کہ وہ مرکزی مجلس شورٰی جماعت اسلامی کے رکن تھے اور ان کی سرگرمیوں سے موبہ مغربی پاکستان میں تحفظ عامہ اور قیام امن میں خلل واقع ہو رہا تھا۔

اُس وقت خورشید صاحب کراچی یونیورسٹی میں استاد تھے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کے رسالے "چراغِ راہ" کو وہ ایڈٹ کرتے تھے۔ اقبال اکیڈمی کے مجلہ اقبال کے بھی وہ نائب مدیر تھے۔ راجہ کے علمی حلقوں میں ان کا اپنا ایک مقام تھا۔ یہ نو بیسے چار دن جو انہوں نے جیل میں گزاریے، اس کی ۳۶۴ صفحات پر مشتمل یہ روداد جہاں ذاتی نوعیت کی ہے، وہاں اس سے جماعت اسلامی کے ارکان کی زندہ اسیری کی نفسی کیفیات کی بھی بڑی اچھی آئینہ داری ہوتی ہے۔ تذکرہ زندان مصنف کی ذاتی ڈائری ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مصنف اور ان کے ساتھیوں نے یہ ایام جس طرح گزاریے اور اس اثنا میں ان کے کیا خیالات و کیفیات تھیں ان کا پورا مرقع اس کتاب میں ہے۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب سارے ساتھیوں کی آپ بیتی ہے۔

سیاسی مقاصد کے تحت جیل جانے والوں سے سب کو ہمدردی ہوتی ہے اور خاص کر ان سے تو لوگوں کو اور بھی زیادہ ہمدردی ہوتی ہے، جو خود رشید صاحب جیسے پڑھے لکھے اور اعلیٰ قلم ہوں اور ان کے بارے میں عام طور سے یہ خیال ہو کہ وہ بے قصور ہیں، تمہارے زنداں، پڑھ کر سب سے پہلا تاثر تو اس کے مصنف سے پر غلوں ہمدردی کا ہوتا ہے، اور کتاب کے چند صفحے پڑھنے کے بعد ہی چاہتا ہے کہ ساری کتاب پڑھی جائے، اس لئے نہیں کہ کتاب میں جیل کی زندگی کے کوئی نادرہ تجربات ہیں، بلکہ محض مصنف کی ذات سے قاری کو ایک گونہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ جانتا چاہتا ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ اور مصنف نے یہ زیادہ اسیری آخر تک کس طرح گزارا۔

جہاں تک خود رشید صاحب کے ان المناک احساسات کا تعلق ہے کہ انہیں اچانک یونین پرستی سے پکڑ کر جیل پہنچا دیا گیا اور وہ اپنے عزیزوں اور خاص طور پر اپنے پیارے چھوٹے بھائی سے ہٹ کر رہ گئے، ان کا کتاب کے ہر پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے، اور وہ راقم اسطور کی طرح مصنف کے لئے اپنے دل میں گہری ہمدردی پاتا ہے، اور انہیں اس طرح جیل بھولنے والوں سے اس کو ایک گونہ کہرت پیدا ہو جاتی ہے مصنف نے اس کتاب میں اپنے چھوٹے بھائی انیس کا ذکر جس محبت سے کیا ہے، اور اس کے نام انہوں نے جیل سے جو خط لکھا ہے، اس میں اس قدر غلوں سوزا دیا ہے کہ اسے پڑھ کر سخت سے سخت دل بھی پسیم جاتا ہے۔ مصنف نے آخر کتاب میں اپنے باپ سے یہ خط لکھا ہے:..... ایک الکشاف تو یہاں آکر یہ ہو کہ میں سخت مذہباتی واقع ہوا ہوں ہمیشہ مجھ پر عقیدت کا غلبہ رہا ہے اور میں اپنے آپ کو غیر مذہباتی سمجھتا رہا ہوں۔ باہر اس بات کا بالکل اعجازہ نہ تھا لیکن یہاں محسوس ہوا کہ بے شمار چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میرا یہ سرتا سر جذباتی ہے۔۔۔ اگر مصنف میرا نہ سمجھتا تو ہم عرض کریں گے کہ ان کا یہ حق فتن کہ..... حمد و اور تحریف دین کے ہر حق کے مقابلہ میں ہم سنت کے تحفظ اور شریعت کے اپنے اصل رنگ میں قائم کئے جانے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہم نے ارباب مفاد کے آتالوں پر کبھی جبین سائی نہیں کی اس کے بجائے ہم نے اپنی ساری قوتیں اچالے دین، ملت کو پیدا کر کے اور قوم کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک تعمیری اور دائمی انقلاب لانے کے لئے وقت کر دی ہیں۔ خدا اس کے رسول اور اس کے دین کے واسطے میں ہم کبھی مدافعت کے لئے تیار نہیں اور پوچھ

دین کے تقاضا کی حدود چھینیں سرگرم علی ہیں۔ یہی ہمارا جرم ہے کہ اکبر نام لیتے ہیں خدا کا اس زلزلے میں۔

ہو رہا ہوں بد فتنہ ناوک ظلم اصرام

صرف اتنی سی خطا پر کہ مسلمان ہوں میں

اہل دین کا یہی وہ جرم ہے، جو ارباب دولت اور اصحاب اقتدار کو ہمیشہ ہڑا گراں گزرتا ہے۔ مثلاً خورشید صاحب کا یہ دعویٰ ممکن ہے یہ دعوے سے زیادہ ان کا پر خلوص اذعان بھی ہو ہمارے نزدیک سراسر جہد باقی ہے، اور ضرورت ہے کہ وہ اسے عقلیت کی کوئی پریمی بھی کہیں۔ اس طرح کے دعویٰ اسلامی تاریخ کی گزشتہ صدیوں میں مسلمانوں کی تمام مذہبی تحریکیں کرتی رہی ہیں۔ اور ہر تحریک احیائے دین کے نام سے آگے آئی، اور اس نے اس طرح کی دینی دعوت کی اساس پر اپنی جمیعت بنائی۔ اور ان میں سے بعض جمعیں اپنی حکومتیں بنانے میں بھی کامیاب ہو گئیں۔ لیکن آج آپ ہی لوگ ان تحریکوں کو الحاد و زندقہ کا نام دیتے ہیں۔ اور ان کے تمام دعویٰ کو فریب و دجل سے تعبیر کرتے ہیں۔

خود اس صدی میں اور اسی سہولت میں اس طرح کی ایک اسلامی مذہبی تحریک انھی جس کے ماننے والوں کو جماعت اسلامی کے ارکان سے کہیں زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے ماننے والے دینی دعویٰ جیسے کہ آپ کے ہیں، کہیں زیادہ تھے، اور اس کے ارکان کی زندگی انفرادی طور پر اور اپنے عقائد کے اعتبار سے آپ حضرات سے کہیں زیادہ گہرے مذہبی احساسات و کیفیات کی حامل تھے وہ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ان کا جرم صرف یہ ہے کہ وہ اس زلزلے میں صحیح اسلام کے علم بردار ہیں، لیکن آپ کی جماعت ان سب دعویٰ کو غلط اور اس جماعت کو گمراہ دین سمجھتی ہے۔ غرض ایسے دین کا دعویٰ کرنا، اور اس کی وجہ سے اگر کچھ تکالیف کا سامنا کرنا پڑ جائے، تو اپنے آپ کو امت کے ان تمام برگزیدہ حضرات کا مثیل سمجھ لینا، جن کی مسلمانوں کے دلوں میں عزت ہے، ایک جذباتی و منطقی مغالطہ ہے۔ جذباتی اپنے حق میں، اور منطقی دوسروں کے لئے۔ اس مغالطہ کا شکار مسلمانوں کے اکثر مذہبی فرقے رہے ہیں اور یہ قسمی سے جماعت اسلامی کے بہت سے مخلص ارکان بھی اس کا شکار ہیں۔ حق و ناحق جانچنے کا یہ طریقہ غلطیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اور اس میں جذباتی قسم کے افراد اکثر ٹھوکریں کھاتے

ہیں۔ دراصل اجماعِ دین کے اس طرح نئے دعاوی کو الگ رکھ کر جماعت اسلامی کے مقاصد عزائم اور کردار کو جانچنے کی ضرورت ہے اور انہوں نے یہ ہے کہ اکثر محض اپنے غلوں سے اپنے برحق ہونے کا ثبوت دیا جاتا ہے، جو ظاہر ہے ہر حال میں صحیح نہیں ہوتا۔

”مذکرۂ زنداں“ اس لحاظ سے بڑا دلچسپ ہے کہ اس میں اشعار بڑی کثرت سے ہیں، اور ان کا انتخاب بڑا اچھا اور باموقع ہے۔ بعض دفعہ تو قاری ایک ایک شعر پر رک جاتا اور اسے بار بار پڑھ کر لذت اندوز ہوتا ہے۔ ان اشعار سے کتاب کی ادبی حیثیت اور ادنیٰ ہو گئی ہے، ادیبوں بھی خورشید صاحب کا بڑا ردال قلم ہے، امداد بڑی اچھی نظر لکھتے ہیں۔

کتاب میں بعض تاریخی واقعات صحیح نقل نہیں کئے گئے۔ ۲۲ پر امام ابن تیمیہ کا قہرہ کی جیل میں زہر کا پیالہ پی کر اپنی جان جان آئیں کے سپرد کرنے کا ذکر ہے ہمارے خیال میں امام صاحب کا احتمال دمشق کے قلعہ میں ہوا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کا بخت خان کے ہاتھوں ظلم و ستم اٹھانا بھی صحیح نہیں۔ ”کلمہ“ کا بے چینی سے انتظار کرنے والا دوسرا دوسرا قلعہ لاؤ کر زن نہ تھا وہ بہت پہلے واپس جا چکا تھا۔

کراچی جیل کے ذکور میں مصنف نے پہلی جنگ عظیم کے بعد مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی اسی جیل میں محبوس بتایا ہے۔ مولانا آزاد ان کے ساتھ نہیں تھے، ان پر اس زمانے میں کلکتہ میں مقدمہ چلا تھا۔

کتاب کی طباعت اور کتابت بڑی اچھی ہے۔ قیمت سستا ایڈیشن چھ روپے، اعلیٰ ایڈیشن دس روپے۔

ناشر مکتبہ چراغ راہ، آرام باغ روڈ، کراچی

# شاہ ولی اللہ الہی کی بیڑی

## اغراض و مقاصد

- ۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔
- ۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و دینی تعلیمی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔
- ۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دو سکرالہ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔
- ۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔
- ۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجراء۔
- ۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کے لئے ایسے موضوعات پر جی سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا۔





Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

# شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین بلیاتی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر بلیاتی ایم۔ اے۔ بعد از شجہ علی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر چیر حاصل بحیث کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

## المسکون جادیش الموطن

تالیف \_\_\_\_\_ الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب تاریخ سے ۲۲ سال پہلے مختصر مکتوب میں مولانا حمید اللہ سندھی مرحوم کے ذرا ہٹا کر لکھی تھی اس میں جگہ جگہ غلطیوں کے تشبیہی ماحیے میں شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطن کی فارسی شرح اچھی پر آپ نے ہر سطر مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی نسخہ ہے شاہ صاحب کے دستخط میں لکھا امام مالک کہنے سے ترتیب دیا ہے امام مالک کے وہ اقوال ہیں وہ باقی مہندیس سے سفر و تحفہ حضرت کر دیئے گئے ہیں الموطن کے ابواب سے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب کے اپنی طرف سے توضیحی کلمات دیے گئے ہیں۔

دو لایں کپڑے کی نقس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰۰ روپے

## ہمعشا

(فارسی)

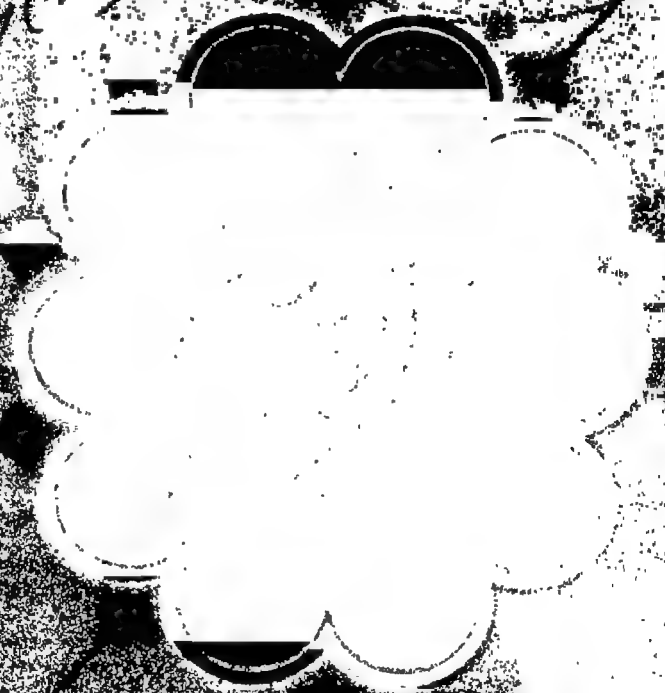
تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعشا" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفیس لسانی تربیت و تزکیہ سے جن طلبہ و مناہل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

مجلس العلماء

462



مجلس العلماء



جلالت

ڈاکٹر عبدالواحد علی پوتا،

مخدوم امیر احمد

مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

15 NOV 1960

# الحرمین

جلد	ماہ نومبر ۱۹۶۶ء مطابق رجب المرجب ۱۳۸۶ھ	نمبر ۶
-----	---	--------

## فہرست مضامین

۲۰۲	مدیر	شہادت
۲۰۵	ابو سلمان شاہجہان پوری	حضرت شاہ ولی اللہ کے عہد کے اخلاقی و مذہبی حالات
۲۲۳	معنف ڈاکٹر عبد الواحد علی پوتہ مترجم سید محمد سعید	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ حصہ اول
۲۳۴	حافظ محمد اسماعیل	سہادیات، اخلاقیات
۲۳۹	مولانا محمد عبد الحکیم ہشتی	حافظ خلیف بن سالم
۲۵۷	مولانا تقی الدین ندوی	قرون اولیٰ کا ایک جلیل القدر سندھی شاعر
۲۶۸	محمد صفیر حسن معصومی	تذکرہ محمۃ الاسلام مولانا نانوتوی
۲۷۳	ا۔ س	امام اعظم ابو حنیفہ اور علم حدیث
		بیرونی ہدی میں اسلام
		تنقید و تبصرہ

## شذرات

ہمارے ایک دینی رسل نے علماءِ اہلِ حکومت کے عنوان کے تحت لکھا ہے :-  
 ..... بجائے خود اختلافات کوئی ان ہونی بات نہیں اور نہ ہی تنقید و اعتراض کوئی  
 ناقابلِ لغو شے ہے اصل مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو ان علماء اور عائدینِ حکومت کے مابین رابطہ ہے کہ  
 وہ ایک دوسرے کی بات براہِ راست سنیں اور دوسرے دوسرے کے باعث جو ہنگامیاں اور غلط فہمیاں پیدا  
 ہو جائیں گی ہیں ان کے دور کرنے کی کوئی سہیل پیدا ہو۔ اور نہ ہی ان دونوں کے مابین کوئی ایسا وسیلہ ہے  
 جو انہما کو تفہیم کی فضا پیدا کرے،  
 رسل کے محترم مدیر نے حکومت کی بھی خواہی اور ملک و ملت کی بہبود سے ولی محبت رکھنے  
 کی بنا پر یہ اباب اختیار کی تو جہاں اس طرف مبذول کرائی ہے کہ حکومت اور علماء کے مابین جو  
 صعوت حال قابلِ رشک نہیں ہے، بلاشبہ ایک خاص طبقہ علماء سے حکمرانوں کے تعلقات بہتر ہیں  
 لیکن متعدد دوسرے تعلقات اہلِ علم کے ایسے ہیں جن سے نہ حکومت خوش ہے اور نہ وہ حکومت  
 سے راضی ہیں۔

مدیر نے اس پر غور کرتے ہوئے بحالہ پر لکھا ہے کہ نتیجہ اس صورت حال کا یہ ہے کہ  
 نہ حکومت علماء و دین کی صلاحیتوں ان کے اثر و رسوخ سے ملک و ملت کو سلگ اتحاد میں پرہنے  
 کا کام لے رہی ہے۔ اور نہ ہی علماء حکومت کے وسائل اور حکمرانوں کے اثر و رسوخ کو اسلئے  
 کے فردِ غا اور سالوں کی اصلاح و تربیت کے لئے استعمال کر سکتے ہیں؟  
 اولاً عزیز صاحب موصوف ارشاد فرماتے ہیں۔

اس ایس کن دفن میں کیا ہو؟ کوئی بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکی۔ اگر اصحاب نظر میں سے کوئی صاحب روشنی کی کوئی کرن عیا کر سکیں، تو ہم ان کے ممنون ہوں گے۔

حکومت اور علماء کے متعدد طبقوں کے درمیان اس وقت باہمی تعلقات کی کیا نوعیت ہے اس کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے لیکن اگر وہ بقول مدبر و صوف حکومت سے راضی نہیں تو بڑی افسوس ناک بات ہے۔ "الرحیم" کی پہلے دن سے یہ کوشش ہے کہ ایک مسلمان معاشرہ اور ایک مسلمان سلطنت میں علماء کرام کا جو مقام ہے وہ پاک تان میں قائم ہے۔ امدان میں اور حکومت میں کسی طرح کی مفارقت پیدا نہ ہو۔ اس وقت صوبہ ہے کہ مسلمان ملک صدیوں کے عہد کے بعد پیدا ہو رہے ہیں۔ اسی لیے جیسے وہ غیر ملکی غلامی سے آزاد ہوتے ہیں اور عمان اختیار ان کے ہاتھ میں آتی ہے، تو وہ اپنے آپ کو دوسٹر غیر مسلم ملکوں سے زندہ گی کے ہر شعبے میں بہت پیچھے پاتے ہیں۔ ان میں وہ وحدت اور جذباتی ہم آہنگی نہیں، جو اس زمانے میں ایک ملک کو داخلی لحاظ سے مربوط اور خارجی جارحیت سے محفوظ رکھنے کی سب سے مقدم شرط ہے ان میں تعلیم بہت کم ہے۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت پیچھے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اپنی معیشت میں دوسروں کے محتاج ہیں اور ان کی اقتصادی اور فنی مدد کے بغیر وہ اپنی پستی اور بد حالی کو ترقی اور خوش حالی میں نہیں بدل سکتے، اس کے ساتھ ہی مسلمان ملک یہ بھی جانتے ہیں کہ اگر وہ اپنی اس پستی اور بد حالی کو جلد سے جلد دور نہ کر سکے، تو ان کے ہاں نہ اندرونی امن رہے گا اور نہ وہ قوموں کی برادری میں کوئی باعزت جگہ لے سکیں گے۔ مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو اس سنگین صورت حال کا احساس ہے اور حکومت اپنے اپنے ملک کے حالات کے مطابق اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ اس ضمن میں وہ اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کرتیں اور امدان پر اپنے عوام سے عمل کرانے میں کوشاں ہیں چونکہ یہ ایسی دور ہے جس میں زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے میں بڑے قدم اٹھائیں اور جلد جلد قدم اٹھائیں علامہ اقبال کے الفاظ میں کا امدان ہستی اتنا تیز کام ہے کہ جو اسکے ساتھ قدم ملا کر نہ چل سکے وہ اسکی پیٹ میں آکر کچلا جاتا اور گرد لہ ہو جاتا ہے۔

قدیمی سے ہمارے بعض علماء ان حقائق کو پیش کو مجمع طرح محسوس نہیں کرتے اور موجودہ زمانے کی نوعیت اور اس کی تیز رفتاری سے پیدا ہونے والے تنازعے کے کماحقہ واقف ہونے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ اب یہ علماء زیادہ سے زیادہ اپنے مخصوص حلقوں میں رہتے ہیں جو بیشتر ان کے بنیاد پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لیکن مسلمان ملکوں کی حکومتوں کو اپنے عوام کی ضرورتیں پسند کرنا ہیں۔ ان کو داخلی اور خارجی خطرات سے محفوظ رکھنا ہے اور پھر بین الاقوامی حالات و ظروف میں اپنے اپنے ملکوں کیلئے سازگار فضا پیدا کرنا ہے۔ ہمارا اکثر علماء مسلمان حکومتوں کی ان ذمہ داریوں کو نہیں جانتے اور ان میں ہرگز وہ چاہتا ہے کہ شمال کے طور پر مسدود الوب اسکی بات سنا دے ہی کہے جو یہ گمراہ کہتا ہے کیونکہ بقول اس گمراہ کے مجمع اسلام بنی ہے۔ ہمارا نزدیک حکومت اور علماء کے اکثر گمراہوں میں جو غلط بیباہانیاں اسکا بیانیہ ہیں زیادہ دن نہیں ہوئیں جو ایک بہت بڑے عالم دین نے اپنے دینی سلسلے میں لکھا تھا کہ مسدود الوب آئین دستور کی کیا بحث چیر کر رکھی ہے اللہ تعالیٰ نے اسے عدالتی انتخاب میں کامیاب کیلئے اسے چاہیے کہ عدالتوں میں دیکھ کر مجمل کے ساتھ ساتھ ایک حنفی عالم مقرر کرے اسلامی قانون کی نئی ترتیب و تشکیل کی ضرورت ہی کیا قانون پہلے سے موجود ہے میں ہر عدالت میں ایک حنفی عالم جمع ہونا چاہیئے اس طرح ملک میں اسلامی آئین برقرار آجائے گا۔ ایک اور عالم دین نے حال ہی میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی اتنی عظیم الشان حکومتیں مال غنیمت اور فئی سے چلتی رہی ہیں۔ اب یہ ٹیکسوں وغیرہ کا رٹ کیا لگا رکھی ہے۔ ایک اور صاحب مرقوم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ شعبہ میں پاکستان کو فتح دی ہے۔ اس نے حکومت پاکستان کا ریڈیو سے ۵۰۰ سیمبر کو ایک عیسائی کو تقریر کرنے کی اجازت دینا صحیح نہیں۔ اس طرح کے روزمرہ کے ہزاروں مسائل ہیں جن کے بارے میں علماء مجمع و شام حکومت کو مشورے دیتے ہیں اور ظاہر ہے حکومت ان پر عمل کرنے سے معذور ہوتی ہے۔ اس پر حکومت کے خلاف زبان و قلم کی بارشیں کھل جاتی ہیں۔

## حضرت شاہ ولی اللہ کے اخلاقی اور مذہبی حالات

ابو سلمان شاہ بہاؤی

(۴)

اورنگ زیب عالم گیر کے بعد مسلمانوں کا جو اخلاقی اور مذہبی زوال شروع ہوا۔ اوتھوڑا  
 اٹھا کو پہنچا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ واقعہ  
 یہ ہے کہ سیاسی زوال نتیجہ تھا مسلمانوں کے اخلاقی اور مذہبی زوال کا۔ البتہ جب سیاسی زوال  
 آیا تو اخلاقی اور مذہبی زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ مغلیہ حکومت کے زوال  
 کی تاریخ نہ گیارہویں اور نہ گیارہویں کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جن حضرات نے عہد منلیہ کی تاریخ کا  
 مزہ اٹھا ہے وہ اس رے کی سطح کا اندازہ کر سکتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ جن معاصی اور  
 فتن نے عالم گیر کے جانشینوں کی عزت و شہرت کو خاک میں ملایا ملک کے امن و امان کو تباہ و بالا  
 کیا اور بالآخر میں آتش فتن نے مغلیہ حکومت کی شہرت و سطوت کو جلا کر خاک کا ڈھیر بنا دیا تھا  
 اس کی پہلی جنگاری عہد عالم گیر ہی میں سبھی مغلیہ حکومت کا زوال عالم گیر اورنگ زیب کے  
 عہد ہی میں شروع ہو چکا تھا لیکن عالم گیر کے تدبیر، بصیرت، حکمت عملی اور بروقت اقدامات نے  
 حکومت کے شیرازہ کو بچھڑنے سے بچا لیا لیکن وہ ان اسباب کا پوری طرح قلع قمع نہ کر سکا  
 یہ مسلمانوں کے دلدل میں پوری طرح گھر کر چکے تھے اور رفتہ رفتہ مسلم سیاست کو گھن کی  
 طرح کھائے جا رہے تھے یہ امر فرض و خصل جو مسلمانوں میں پیدا ہو رہے تھے اور پرورش پا رہے تھے  
 جنہوں نے مغلیہ حکومت کو سر ہٹوں کی فوجی طاقت، ہاتھوں کی وفادت، سکھوں کی سہ کوشی اور دکن  
 کی مرکز دشمن ریاستوں سے زیادہ نقصان پہنچایا، آرام طلبی، غداري، فرض ناشناسی، خود غرضی



جبکہ موت سے خوف حتیٰ کہ میدان جنگ سے فسرار، دشمن کو پیٹھ دکھانا اور میدان جنگ میں دشمن کی ضربات سے صاف ہٹ کر نکل آنے کو ایک فن سمجھنا اور اسے اپنے محبوب اور شہوتانگہ نہ سمجھنا وغیرہ تھے۔ شیخ محمد اکرام صاحب لکھتے ہیں۔

”مغل فوج میں مشہور آرام طلبی اور محنت سے بے پروائی کا مرض نہ تھا بلکہ بلکہ ان میں غذا اور نمک حرام بھی بہت تھے۔ جس کثرت سے مغل سپہ سالار مرہٹوں کے ساتھ مل جاتے تھے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی اور تو اور مغل شاہزادے اور اورنگ زیب کے بیٹے اس سے بالاتر نہ تھے۔ جینی کے محاصرے کے وقت شاہزادہ کام بخش نے جو ذوالفقار خاں کے ساتھ فوج کا سپہ سالار تھا، راجہ رام کے ساتھ اپنے باپ کے خلاف ساز باز کرنا شروع کیا اور وہ اپنی فوج کے ساتھ مرہٹوں کے ساتھ ملنے والا ہی تھا کہ ذوالفقار خاں اور اس کے باپ اسد خاں کو پتہ لگ گیا اور انہوں نے اسے گرفتار کر کے زیرِ حراست اور نگِ زیرب کے پاس بھیج دیا۔ ستارہ میں مرہٹوں نے شاہزادہ محمد اعظم کو رشتہ میں دے کر اسے طے کر لیا تھا کہ وہ ان کی رسدِ رسانی میں عمل نہ ہو گا چنانچہ وہ قلعہ جس میں محاصرے کے وقت دو ماہ کی رسد تھی، پچھ ماہ تک قلعہ نہ ہوا۔

”جو کیفیت سپہ سالاروں کی تھی، وہی حالت قلعہ داروں اور منصب داروں، محاسبوں اور معمولی سپاہیوں کی اور امیروں و دیہروں کی تھی اور جن قلعوں کی فتح میں کئی مہینے صرف ہوئے تھے، وہ ان کی نالائقیاں تک ملتی سے دونوں میں دشمن کو، بغیر کسی کشت و خون کے واپس مل جاتے۔ جب ۱۷۰۴ء میں اورنگ زیب جنوبی دکن کو چھوڑ کر واکن کھیڑہ کی طرف متوجہ ہوا۔ تو تھوڑے ہی عرصے میں اس طرح ستارہ پر نالہ اور اپاد گڑھ کے قلعہ مقلوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

دشمنوں سے ساز باز کرنے اور اپنی نالائقیاں اور غفلتِ خماری سے ان

کا ساتھ تھانے کے علاوہ مقلوں نے اب ایک نئی بات یہ بھی بھی کہ لڑنے سے ہی چراتے اور اگر انہیں کہیں خطروں کا سامنا کرنا پڑتا تو بجائے ان کا مردانہ دل مقابلہ کرنے کے راہ فرما اختیار کرتے اور لطف یہ ہے کہ اس "نن کیف" میں بادشاہ کے بھائی بند توراتی ہندو ہب ایرانیوں سے بیٹھے ہوئے تھے ایک دھماکنگ سے ایک توراتی امیر میر محمد امین نے شکایت کی کہ قوجہ کے اعلیٰ عہدے ہندو ہب اعدویہ سیرت میں لڑنے کو مل رہے ہیں تو بادشاہ نے لکھا۔

جماعت توراتیاں کہ برادران، ہمشہری، ہنگان مانندہ.....  
 پر مضمون ولا تملقوا بایید کم الی التھلکۃ یعنی میں نے خود را بدستہا ہے خود در ہلاکت و عین گیر مدار، مراجعت را میوب نمی دانند۔ اگر در آمدنی کے ایں حالت اعدو ہندو چندان معافقتہ ندارد۔ لیکن در عین کارزار سخت مشکل است اگر عیاذاً باللہ از ہمارا ہیاں معنویاں صحت واقع شود، در یک لحظہ مقدمہ تمام حکایت با ختام ہو سکتا۔

اگر دیں امر عرب و آرموہ انکارے داشتہ باشد مفصل معروض دارد و جماعت ایمانیان، خواہ ولایت را، خواہ ہندوستان را۔ کہ بچل مرکب مشہور اند بقدر مصلحت انہیں حرکت و رواندہ انصاف بدہ کہ چیل آن مردم زشت بہتر از ہزار عقل و بیاہ سرشت

اورنگ اپنے ہمراہیوں کی اخلاقی کمزوریوں سے خوب واقف تھا اور وہ بار بار اپنے رفقاء میں دیا نتدار، کاروان ملازموں کی کمی پر آنسو بہا کرتے۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔ حالایک کس برائے دیوانی جنگالہ کہ یہ علیہ راستی و کاروانی آراستہ باشد می خواہم یا قتہ

نہی شود۔ از تالیفی آدم کار آہ۔ آہ! درد کوثر ۳۳ تا ۳۴  
اس دور کے علماء و مشائخ کی حالت کیا تھی وہ کن بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ اس کا اندازہ  
شیخ محمد اکرام صادق کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

”مشائخیت روحانیت پر غالب آگئی اور تجدیدی تحریک قومیت  
کے گرداب میں گم ہو گئی۔ جب خواجہ محمد معصوم کی وفات ہوئی تو  
ان کے وارثوں میں سے ہر ایک نام نہاد قومیت کا دعویٰ کرتا تھا۔  
آپس میں لڑ رہے تھے کہ قیوم ہیں ہوں۔ اور دنیا میرے سپرد قائم  
ہے۔ حضرت خواجہ محمد معصوم نے اپنے بیٹے سیون الدین کو اور بزرگ تین  
کے پاس امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لئے بھیجا تھا لیکن جس اخطا  
سے وہ رہتے تھے اس کا بیان ایک معتقد کی زبانی سنئے۔ آپ کی  
بارگاہ عالی اطلس کی بنی ہوئی جس میں جواہرات جڑے ہوئے تھے  
اس بارگاہ میں نہ سہری کرسی جواہرات سے جڑا رکھی جاتی تھی  
آپ بیٹھتے تھے۔ اس کے گرد و نواح امراء بادشاہ اعلان نہایت  
ادب سے دست بستہ کھڑے رہتے تھے۔“

یہ تھے حالات جب دہلی کے ایک نامور عالم کے گھر آخر عمر میں  
ایک فرزند ابرجد تولد ہوا۔ جس کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ ان حالات  
کی اصلاح میں ہاتھ پاؤں مارے اور اس اخلاقی اور روحانی انحطاط  
کا سد باب کرے! (درد کوثر ص ۳۹)

یہی وہ خصائل قیدیہ تھے جو مسلمانوں کی سیاسی قوت کو گھٹن کی طرح کھا رہے تھے اور انہی میں  
مغلیہ حکومت کے زوال کا راز پنہاں ہے۔ عالم گیر نے مغلیہ حکومت کے بڑے بڑے دشمنوں  
کی قوت کا حاتمہ کر دیا۔ نظام حکومت کو اسلامی سانچے میں ڈھلنے کی کوشش کی لیکن اخلاقی  
اور مذہبی روضہ کو بیدار کرنے میں وہ قطعی ناکام رہا۔ حالات کی خسرانی اور اخلاق کی اس وجہ  
مگر اوٹ کا عالم گیر کو خود بھی احساس تھا۔

اورنگ زیب جب تک زندہ رہا وہ اپنے تدبیر، بیدار مغزئی، حکمت علی اور مضبوط نظم و ضبط سے ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا اورنگ زیب کے بعد اگرچہ مغلیہ تخت و تاج کو اس کا جانشین مل گیا لیکن سیاسی بصیرت، تدبیر، بیدار مغزئی اور حسن انتظام سلطنت میں اورنگ زیب کا کوئی جانشین پیدا نہیں ہوا۔ اورنگ زیب کے مسلمانوں کے سماجی اور اخلاقی حالات اور بھی خراب ہو گئے سید ہاشمی فرید آبادی تحریر فرماتے ہیں۔

آرام کی عادت اور تن پروری کے اسباب نے جسم کو محنت و زحمت اٹھانے کے قابل نہ رہنے دیا۔ سب سالہ پالکیوں میں بیٹھ کر فوجیں لڑانے جاتے تھے سواروں کے سادو براق دیکھ کر لشکر پر برات کا دھوکا ہوتا تھا کئی فرنگی سیاحوں نے اس زمانے کے سفر نامے لکھے ہیں۔ مقامی تاریخوں سے بھی تصدیق ہوتی ہے کہ بادشاہی اعداء ایک متحرک شہر معلوم ہوتا تھا اور اس کے بازاروں میں ہر قسم کا سامان راحت جس کی شہری اوقات میں دولت مندوں کو تلاش رہتی ہے، مہیا کیا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے وہ آج کل کے بڑے چاندوں سے جن میں مسافروں کی عیش و تفریح کے لوازم فراہم کیے جاتے ہیں، مغوی مماثلت رکھتا ہے۔ جو قوم زلزلہ جنگ و سفر میں یہ آسائش ڈھونڈتی ہو حالت امن و امان میں ان کی جس قدر خوشگرفتاری اور پابندی ہوگی، وہ ظاہر ہے ان تعیشت میں زیادہ زور ہوگا گاہ اور دسترخوان کی وسعت پر دیا جاتا تھا بہتر سے بہتر۔ باوچی اور بکاول ہنرمندی کے کمال دکھانے اور نئی نئی قسم کے کھانے پکالنے کے طرح کے مصالحوں سے ان کو بامزہ بناتے تھے۔ اطباء کی مدد سے یہ غذائیں نہایت مقوی تیار کی جاتی تھیں اور عیاضی کی لاگ سے بہت سی ادویہ اور منشیات امیوں کی خوراک کا ضروری حصہ بن گئی تھیں عالمگیری صمد کو چھوڑ کر مغلیہ درباروں میں شراب کا دور عامی طرح عام تھا۔ نذرانی خاناں کو زیادہ مشتعل کرنے کی غرض سے ارباب ایشیا کی بارہ

مدی ہجری (شاہجہاں مدی عیسوی) میں افرط پائی جاتی ہے۔ کہ  
رہنڈیوں کی پوری ایک قوم پرورش پاگئی تھی۔ بڑے شہروں میں  
ان کے محلے محلے آباد تھے اور شکل سے شمالی ہند کا کوئی قصبہ ایسا ہوگا  
جہاں ان کے اڈے نہ بن گئے ہوں۔ ان کے جلو میں سازندوں  
سفر دایوں، ڈھوؤں، ڈھالیوں کی فوج کی فوج اچی دنہ گی ظرب کرتی۔  
اور دوسروں میں گندگی پھیلاتی پھرتی تھی۔ یہ لوگ اخلاق کے حق  
میں کسی حیرتیم تھے تو عموماً آہستہ آہستہ ملت کی رگ دپے میں تیر  
جاتے تھے مدی کا وسطی ملٹ (بیچ) محمد شاہ اور احمد شاہ کا عہد  
ان بے اعتدالیوں کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔

بادشاہوں کی سپہ متیوں کے بہت سی ہم عصر کتباؤں کی  
سرخیاں اور بعض ابھی تک زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں اور پرستی  
غالباً اسی دور میں ایک مستقل بازی بخی اور ہجروں کا پیشہ اسی کی بلوکلہ  
سمجھا چلی ہے۔

ایک ایرانی نژاد منصب دار درگاہ قلی خان عین حملہ ناوری کے زمانہ میں آصف جاہ اٹھل کے زمانہ  
میں دہلی آیا تھا۔ اس نے یہاں کے چشم دید حالات لکھے تھے۔ یہ سفر نامہ دہلی بارہویں صدی ہجری میں  
کے نام سے حیدر آباد سے شائع ہو چکا ہے۔ مولف نے شہر بھر میں ارباب نشاۃ الہامہ کی  
گنجانگی دیکھی، شعراء، علماء اور مشائخ سے زیادہ گویہ، ڈوم رہنڈیاں باکمال اور صاحب  
شہر قدر مال نظر آئیں۔ اس نے حراقت اور عرسوں کا حال بھی لکھا ہے انہیں میں ایک سالانہ عرس  
شاہ عالم بہادر شاہ اول کا بڑی شان سے منایا جاتا تھا۔ مولف کوئی ناہر پاک باز نہیں مگر اس  
سیلے کے حملے دیکھ کر اس کی بھی آنکھیں پٹی ہو گئیں یہ چنٹکھاس کی زبان سے نکلے۔

”برج مانے پوششی ہر مرد و زن آسمانی پر نام انوار می فرستند و بگلہ کا  
جلی آگین نرغ وادی ایمن می کنند۔“ معاشیوں، باغبان خود در  
ہر گوشہ و کنار دست در پیش، و عیاشان در ہر کچہ و بازار بخول

مشقیات نفسانی در قفس۔ سے خون بہا، ہیشہ عجب در تلاش سبہ  
 مستی و شہوت طلباں بے واہمہ مزاحمت سرگرم شاہد ہستی جہوم المادہ  
 تو خطاں تو بہ شکن زیادہ آواز پیراں ہم مذق بنیاد صلاح و سدا و تانگہ  
 پرواز کند بائن روئے مست و تاپشتم داشو و حلقہ فتر اک گیسوئے سانا  
 فواہش بہ مشاہد کہ یک عالم فراق بہ کام دل ہی رہستہ۔ واسباب  
 خیانت بہ درجہ کہ یک جہاں بجا کہ بہ تفتح می نہاید۔ تاکہ جمال خود  
 را در سدا مردے چشک می زند و تاپشتم چراغ روشن کند زندہ پیام  
 می فرستند کو چہ و باز آواز نواب و خواہین لہر و دگوشہ و کنار  
 از امیر و فقیر شعر و انگیز۔ مطرب و قول از مگس زیادہ تر محتاج  
 و سائل از پتہ افزون تر قلعہ مختصر بہ این ترتیب وضع و شریف  
 این دیار ہوا جس نفسانی حریت و ہند و مستلزمات جسمانی فائز می  
 شود۔ و جنس ہنگامہ چشم بستن عین مصلحت و بعید بکشدون  
 محض بعیرت۔“

اس عہد میں مسلم معاشرہ ابتری اور ذوال کی جس منزل پر پہنچ چکا تھا اور مسلمان جس اخلاقی  
 پستی میں پہنچ چکے تھے اس کے مطالعہ کے بعد زیر بحث عہد کی مذہبی حالت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں  
 کہ یہ سماجی ابتری اور اخلاقی پستی مذہب سے قدری اور بے پیمانی ہی کا نتیجہ تھی۔

مسلم سوسائٹی میں موفیوں، فقیہوں اور زاہدوں وغیرہ مذہبی طبقات کا جو اثر و رسوخ  
 ہمیشہ رہا ہے اور ان طبقات کو مسلمانوں میں جو عزت و احترام حاصل رہا ہے اس کے بیان کی جگہ  
 نہیں لیکن ان کی اخلاقی حالت اس درجہ خراب ہو چکی تھی کہ ان سے سوسائٹی کو فیض پہنچنے کی بجائے  
 نقصان پہنچ رہا تھا۔ یہ طبقات جو کبھی مذہب و اخلاق کے لئے باعث انتہا سمجھے جاتے تھے  
 اب ان کا وجود مذہب و اخلاق کے دامن پر ایک بدنام داغ تھا کبھی ان کے بہ تو محبت سے

بد عملوں اور گنہگاروں کی زندگیاں نبتی اور سنو رتی تھیں اب عام مسلمانوں کو ان سے بچانے کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ایک خط میں اپنے بعض اصحاب کو نفعوت فرماتے ہیں۔

زمانے کا رنگ بالکل بدل گیا اور مذہب کا چشمہ بہت مکدر رہ گیا ہے  
اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے حقیقت میں  
اسلامی نہیں ہے۔۔۔۔۔ تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ۔  
ایک بے حیا مونی سے جو رفع تکلیف کے ذریعہ نہاد۔ اپنے  
مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔

دوسرا جھگڑا لومعقولی جو شک و ادھام کے فتنے پھیلاتا ہے اور  
خدا کا مطیع نہیں ہوتا۔

تیسرا شعلی خور فقیہ جو مردہ اولیٰ پر خوش ہوتا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے  
اپنی امت کے لئے جن باتوں کی توفیح کی ہے ان کی پیروی نہیں کرتا۔  
چوتھا۔ خشک زاہد جو دین میں اس درجہ سختی اور تشدد کرتا ہے کہ گویا  
اسے کس یا سہ میں اجازت ہی حاصل نہیں۔

پانچواں۔ سرکش مالدار جو تکلف اور بناوٹ کے ساتھ عجیبوں کی اہمیت  
اختیار کرتا اور ان کے ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کو دوست رکھتا ہے۔  
(رود کوثر ص ۳۵۱-۳۵۲)

اس خط پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں اس دور کی مذہبی اور اخلاقی حالت کے جن پس منظر میں یہ خط  
لکھا گیا ہے وہ اس سے صاف عیاں ہے سیاسی اقتدار و قوت کے پہلو بہ پہلو مذکورہ طبقات  
کو مسلمان معاشرہ میں ہمیشہ سب سے زیادہ رسوخ حاصل رہا ہے اور مسلمانوں کے ذہنوں پر مذہبی  
طبقات کی گرفت ایک مفیوٹا اور عمدہ حکومت سے زیادہ سخت رہی ہے۔ خیال کیا جاسکتا ہے کہ  
جب مسلم سوسائٹی کے سب سے اعلیٰ اور مذہبی طبقے کے حضار وہ ہوں گے جن کی بنا پر حضرت  
شاہ صاحب نے عوام کو ان سے بچنے اور دور رہنے کی نفعوت کی ہے تو ان عوام کی اخلاقی حالت  
کیا ہوگی جو علم دین کی کمی، جہالت اور معاشی بد حالی وغیرہ کی وجہ سے کبھی اعلیٰ طبقات کے

کو نہیں پہنچتے۔ اور وہ معاشرہ اخلاقی اور مذہبی لحاظ سے کس درجہ بلند ہوگا جس کا باقی لحاظ سے اس درجہ پست ہوگا۔

۱۔ بالا خط میں شاہ مہاراجہ نے صوفیوں کے بارے میں مختصر الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔ میں اس طبقے کے افعال و اخلاق سے بالکل پروردہ اٹھا دیتا ہوں فرماتے ہیں۔

ان زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دیتا چاہیے اور کبھی ان کا سر پر ہونا چاہیے۔ کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات و رسومات میں

گلاہیں شہرت، رجوع خلق مریدوں کی کثرت دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہیے اور نہ ہی ان کی کلمہ سنانے سے دیر نہ کھاتا چاہیے۔ عوام کا رجحان

رعویہ رسم و رواج کی بنا پر ہوتا ہے اور رسمی امور کبھی قابل اعتبار نہیں آج کے کمر امت پرستوں نے عام طور پر طلسمات اور شعبہ بازی

کمر امت سمجھ رکھے الاما، اللہ۔ انہیں شعبہ بازیوں کو وہ کمر امت کہہ مخلوق کے سامنے پیش کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ان لوگوں کے نزدیک

بے بڑی کمر امت یہ ہے کہ دل کا حال بتا دیا جائے اور آئندہ پیش کرنے والے واقعات معلوم ہو جائیں اور یہ امر بہت آسان ہے۔

نوع طرح کے رسوم و توہمات میں مبتلا تھے۔ حقیقی مذہبی زندگی کا قطعی خاتمہ صوفی و عرفان کے نام سے مختلف غارت گریاں اخلاق و ایمان فراتے پیدا ہو

عوام کی اخلاقی و مذہبی زندگی کو تہ و بالا کمرستے تھے۔ علم نجوم و رمل، عمل تنویم اور بے کام لے کمر عوام کو اپنی جانب متوجہ کرتے تھے اور انہیں باور کراتے تھے کہ

ما جو انہیں حاصل ہیں۔ عوام اپنی چہانت تو ہم پرستی اور دوا اعتقادی کی بنا پر ان کے ماحولتے اور نہ صرف زر و مال بلکہ دولت ایمان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔

سن گیلانی نے متعدد قشروں کا تذکرہ کیا ہے آخر میں لکھتے ہیں۔  
نفس غلط تصوف اور جھوٹے تمسخر کی راہوں سے اعتقادی و علمی



تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں مسلمان ملک کے مختلف گوشوں  
میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کے ایدان کو دھمکیاں  
دے رہا تھا۔ (تذکرہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ)

تفہیمات میں جہاں حضرت شاہ صاحب نے امت کے مختلف طبقات کو خطاب فرمایا ہے مثلاً  
کی اولاد کو بھی خطاب فرمایا ہے۔ اس خطاب کے پس منظر میں ہم اس دور کے صوفیاء و مشائخ  
کی اخلاقی اور ایمانی حالت کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ  
صوفیاء و مشائخ ایمان و اخلاق کی دولت سے ہی دامن رسوم آباء کے پرستار باپ دادا اور  
بزرگان دین کے نام کے تاجر، ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے، اپنے اصل مقصد اور نصب العین  
قطعاً غافل، خدا کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی جانب دعوت دینے  
کی بجائے اپنی پرستش کے طالب اہل اپنی پیشوائی کے مدعی، خود گم کردہ راہ اور دوسروں  
بہمٹکانے والے، اہل دین کی شکل و صورت میں حرص و ہوس کے بندے، دنیا کے پرستار  
دولت کے بھید کے تھے۔ صرف مال و دولت کے لئے لوگوں کو مرید کرنا، ایک علم شریف و تقویٰ  
کو بیچنا اور اس کے ذریعہ دنیا سینٹا ان کا شیوہ تھا۔ حتیٰ کہ شاہ صاحب نے ان کو بٹ مار  
کذاب، فتنان اور فتنہ تک کہہ دیا ہے فرماتے ہیں۔

”اہل اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بٹ مار اور

راہزن ہیں، ان کا شمار جالوں، کذابوں، فتنان اور ایدان لوگوں میں

ہے جو خود فتنہ اور زائش کا شکار ہیں“

پھر اسی خطاب میں عوام کو نصیحت فرماتے ہیں۔

”خبردار خبردار! ہرگز اس گمراہ کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور

رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو۔ اہل اپنی طرف بلاتا ہو کہ نہ

جمع و خرچ صوفیہ کلام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں نہ کیا

جائے کیونکہ مقصد تو (تصوف) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان کا

مقام حاصل ہو جاوے۔“

عالیوں، زاہدوں اور واعظوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت بھی نام نہاد موفیاء و مشائخ سے قطعاً  
مختلف نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے امت مسلمہ کے ان طبقات سے بھی خطاب فرمایا ہے اور  
اسی خطاب اور ہدایت دینے کے پس منظر میں ان طبقات کے اخلاق و خصائص اور عادات و اطوار  
کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

علماء فلسفہ یونانی میں ڈوبے ہوئے تھے، صرف و نحو اور منطق و کلام کو علم دین سمجھ رکھا  
تھا۔ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تدریس سے شغف نہ تھا  
علوم یونانی میں درک علم کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ حضور کی روشنی کی پیروی اور آپ کی  
سنت پر عمل سے یکسر عاری اور سیرت طیبہ اور قرآن کے وہ احکام زندگی میں جن کی واقعی  
ضرورت تھی، جن سے زندگی سنور گئی ہے، اخلاق درست ہوتے ہیں اور انکار کو جلا ملتی ہے ان  
سے قطعاً غافل تھے۔ اس خطاب کے آخر میں فرماتے ہیں۔

”جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع آلات کی ہے تو ان کی حیثیت آلہ  
اور فریضہ ہی کی رہنے دو نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم  
کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سمجھ کر مسلمانوں کی بتیاریں  
میں اسلامی شعائر کو رد و باج دو، لیکن تم نے دینی شعائر اور اس کے  
احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو نادمہ از ضرورت باتوں کا مشورہ  
دے رہے ہو۔ تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ یاد  
کرادیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے“

واعظوں نے طب دیا پس کو دین کے نام پر پھیلایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے  
نام پر جھوٹ بولتے، حدیثیں گنہتے اور لوگوں کو سنلتے عابدوں اور زاہدوں نے عوام  
پر دین کے نام پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ دین کی بخشی ہوئی آسائیوں سے ہاتھ کچھنے لیا تھا،  
وساوس کا نام انکار دینی اور اہل مات اور زندگی کے حقیقی مسائل سے فرار کا نام نہ بدودیر  
رکھا تھا۔ سیرت طیبہ معلم کے مطالعہ اور اس کے مطابق عمل کی بجائے مغلوب الحلال اور

تباہیوں کا سیلاب مختلف شکلوں میں مسلمان ملک کے مختلف گوشوں  
میں مسلمانوں کی خالص اسلامی و دینی زندگی کے ایوان کو دھمکیاں  
دے رہا تھا۔ (تذکرہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ)

نقیبات میں چہاں حضرت شاہ صاحب نے امت کے مختلف طبقات کو خطاب  
کی اولاد کو بھی خطاب فرمایا ہے۔ اس خطاب کے پس منظر میں ہم اس دور کے  
کی اخلاقی اور ایمانی حالت کو اچھٹے طرح دیکھ سکتے ہیں اس کے مطالعے سے معلوم  
ہو گیا۔ وراثت ایمان و اخلاق کی دولت سے ہی دامن رسوم آباء کے پرستار ہوا۔  
بزرگان دین کے نام کے تاجر، محرمیوں میں بٹے ہوئے، اپنے اصل مقصد اور  
قطعاً غالی، خدا کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی جانب  
کی بجائے اپنی پرستش کے طالب اور اپنی پیشوائی کے مدئی، خود غم کمرہ راہ اور  
بھٹکانے والے، اہل دین کی شکل و صورت میں حرص و ہوس کے بندے، دین  
دولت کے بھیکے تھے۔ صرف مال و دولت کے لئے لوگوں کو مرید کرتا، ایک علم  
کو پہچانا اور اس کے ذریعہ دنیا سیکھنا ان کا شیوہ تھا۔ حتیٰ کہ شاہ صاحب نے ان  
کذاب، فتنان اور فتنہ تک کہہ دیا ہے فرماتے ہیں۔

و اور اپنی مرضی کی پابندی کا لوگوں کو حکم دیتے ہیں۔ یہ لوگ بٹ مارا  
راہزن ہیں، ان کا شمار دجالوں، کذابوں، فتنان اور ان لوگوں میں  
ہے جو خود فتنہ انداز دانش کا شکار ہیں؟  
پھر اسی خطاب میں عوام کو نصیحت فرماتے ہیں۔

”خبردار خبردار! ہرگز اس گمراہ کی پیروی نہ کرنا جو اللہ کی کتاب اور  
رسول کی سنت کی طرف دعوت نہ دیتا ہو اور اپنی طرف بلاتا ہو کہ  
جمع و غریج صوفیہ کلام کے اشاروں کے متعلق عام مجلسوں میں ذکر  
جائے کیونکہ مقصد تو (تقویٰ) سے صرف یہ ہے کہ آدمی کو احسان  
مقام حاصل ہو جائے“

عالموں، نامہ وں اور دواعقلوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت بھی نام نہاد مونیاء و شائخ سے قطعاً مختلف نہ تھی۔ حضرت شاہ صاحب نے امت مسلمہ کے ان طبقات سے بھی خطاب فرمایا ہے اور اسی خطاب اور ہدایت و نصیحت کے پس منظر میں ان طبقات کے اخلاق و خصائص اور عادات و اطوار کی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔

علماء فلسفہ یونان میں ڈوبے ہوئے تھے، صرف دنیا اور منطق و کلام کو علم دین سمجھ رکھا تھا۔ قرآن مجید اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تدریس سے شفقت نہ تھا علوم یونانیوں میں درک علم کی معرّج سمجھا جاتا تھا۔ حضور کی روشنی کی پیروی اور آپ کی سنت پر عمل سے یکسر عاری اور سیرت طیبہ اور قرآن کے احکام زندگی میں جن کی واقعی ضرورت تھی، جن سے زندگی سنورتی ہے، اخلاق و درست ہوتے ہیں اور انکار کو جلا ملتی ہے ان سے قطعاً غافل تھے۔ اس خطاب کے آخر میں فرماتے ہیں۔

”جن علوم کی حیثیت صرف ذرائع آلات کی ہے تو ان کی حیثیت آلہ اور ذریعہ ای کی رہنے دو نہ کہ خود ان ہی کو مستقل علم بنا بیٹھو، علم کا پڑھنا تو اس لئے واجب ہے کہ اس کو سیکھ کر مسلمانوں کی بستیوں میں اسلامی شعائر کو رد و باج دو، لیکن تم نے دینی شعائر اور اس کے احکام کو تو پھیلایا نہیں اور لوگوں کو نادم از ضرورت باتوں کا مشورہ دے رہے ہو۔ تم نے اپنے حالات سے عام مسلمانوں کو یہ یاد کرادیا ہے کہ علماء کی بڑی کثرت ہو چکی ہے“

واعقلوں نے رطب و یابس کو دین کے نام پر پھیلایا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جھوٹ بولتے، حدیثیں گزرتے اور لوگوں کو سناتے عابدوں اور نڈاہدوں نے عوام پر دین کے نام پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ دین کی بخشی ہوئی آسائشوں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا، دساکس کا نام انکار دینی اور اہامات اور زندگی کے حقیقی مسائل سے قرار کا نام نہ بدو درجہ رکھا تھا۔ سیرت طیبہ صلح کے مظالہ اور اس کے مطابق عمل کی بجائے مغلوب الحلال اور

صاحبانِ شہد و کلمات کے تذکرے ان کی مرغوب غذا تھے۔ ترک دنیا اور رہبانیت کو معیارِ تقویٰ اور اسلامی زندگی سمجھ رکھا تھا۔

یہ حالت تو مذہبی طبقوں کی تھی۔ سوسائٹی کے دوسرے طبقات مثلاً سلاطین، امراء و ارکانِ دولت، ملازمت پر مشتمل اہلِ صنعت و حرفت اور سب سے آخر میں مسلم عوام کی اخلاقی و مذہبی حالت اس سے مختلف نہ تھی۔ اس عہد کی تاریخوں میں ایسے مواد کی کمی نہیں جس سے سوسائٹی کے مختلف طبقات کی اخلاقی و مذہبی اور اس دور کے معاشرہ کی صحیح تصویر کھینچی جاسکے لیکن ہم حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے مواعظ و نفاذ کے پس منظر میں اس عہد کی سوسائٹی کے مختلف طبقات کے اخلاق اور اس عہد کے سماجی حالات کا نقشہ کھینچنا چاہتے ہیں۔ مناسب خیال کرتے ہیں۔ سلاطین، امراء اور ارکانِ دولت سے شاہ صاحب کے خطاب و نفاذ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاد کی اہمیت سے نا آشنا اس کی ضرورت کے احساس سے غافل، نظم و ضبط کی صلاحیتوں سے عاری جہان بینی اور کشور کشائی اور سلطنت کے انتظام کے حقیقی تقاضوں سے یکسر نادان یا غافل تھے۔ اخلاقی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ شراب، عیال پر پانی پاتی تھی اور اس کو برا بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ زنا کاری کے لئے اڈے قائم تھے جو عام تھا۔ شریعت اسلامیہ کا کسی کو لحاظ نہ تھا۔ یہ حالت تھی لیکن ان خرابیوں کا کسی کو احساس نہ تھا۔ خدا کا نام لیا جاتا تھا لیکن زندگی سے خدا کے دین کا کچھ تعلق نہ تھا۔ تمام ذہنی صلاحیتیں اور عملی قوتیں دنیا اور دنیائے کے لذائذ کے حصول میں صرف ہو رہی تھیں۔

حضرت شاہ صاحب کے خطاب کا مندرجہ ذیل حکمران سلاطین و امراء اور ارکانِ دولت کی اخلاقی و مذہبی حالت کی تصویر کشی کے لئے کفالت کرتا ہے۔

”اے امیر و اکیانمِ خدا سے نہیں ڈرتے؟ دنیا کی فانی لذتوں میں ڈوبے رہا ہے، ہوا و رجن لوگوں کی نگرانی تھا اے سپرد ہوئے ہے ان کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ ان میں سے بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں کیا تم علاوہ شرابیں نہیں پیتے؟ اور پھر اپنے اس فعل کو

تم برا بھی نہیں سمجھتے۔ کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو کہ بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے عمل اس لئے کھڑے کیے ہیں کہ ان میں زنا کاری کی جلے اور شرابیں ڈھائی جائیں۔ جو اکیلا جلے لیکن تم اس میں دخل نہیں دیتے اور اس مال کو انہیں بدلتے۔۔۔۔۔ تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو۔ اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑے اور اچھے مکانات کے سوا تمہاری توجہ اور کسی طرف منتقل نہیں ہوتی۔ کیا تم نے اپنے سر کبھی اللہ کے سامنے جو کائے۔ خدا کا نام تمہارے پاس فقط ان لئے پھاگیل ہے کہ اپنے تذکروں اور قصے کہا یوں ہیں اس نام کو استعمال کرو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے لفظ سے تمہاری مرو زمانہ کا انقلاب ہے کیونکہ تم اکثر بولتے ہو کہ خدا قادر ہے کہ ایسا کر دے یعنی زمانہ کے انقلاب کی یہ نصیب ہے ۴

شاہ صاحب نے ایک خط میں بھی بادشاہ امراء اور اسکان دولت کو کچھ نصیحتیں کی ہیں۔ اس سے یہ بات مندرجہ ہوتی ہے کہ آزمائش کے وقت امراء منصب دار اور شکری بادشاہ سے نیک حراری اور ملت بیضا کے مفاد سے غداری کرنے سے اسلامی غیرت و محبت ان میں نام کو دھمکی، شکریوں کو وقت پر تنخواہیں نہ ملتی تھیں اور اس وجہ سے وہ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے۔ اس سے طرح طرح کے مفاسد پھیلتے تھے۔ رشوت عام تھی حتیٰ کہ قاضی و محتسب تک لیتے تھے۔ مذہب کے خدمت گزار کس پیرسی کی حالت میں تھے بادشاہ اور امراء عیش و عشرت کی زندگی گزار رہے تھے اور اسلامی حکومت کے استحکام اور ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد کے کاموں سے یکسر غافل تھے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

جو لوگ اس فتنہ میں غنیم کے ساتھی ہوئے ہیں صرف یہ ہے کہ ان کو جائز و منصف اور خدمت سے بے دخل کر دیں تاکہ ان کے لئے یہ چیز منزل کے

قائم مقام ہو جائے اور دوسرے لوگ اس قسم کے مواقع پر حق ملک کی ادائیگی کے راستے سے نہ بھٹکیں۔ انواجہ بادشاہی کی ترتیب عموماً طریقہ پر کرنی چاہیے اور یہ ترتیب تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔

۱۔ نجیب ہوں، بہادر ہوں اور اپنے ساتھیوں پر شفیق ہوں اور ملو سے بادشاہ کے خیر خواہ ہوں۔

۲۔ جن لوگوں سے اس فتنہ میں بے غیرتی اور نمک حرامی سرزد ہوئی ہے ان کو معزول کیے کے دوسروں کو داخل رسالہ کیا جائے۔

۳۔ ملازموں کی تنخواہیں بغیر تاخیر کے ان کو ملنی چاہئیں اس لئے کہ تاخیر کی صورت میں وہ لوگ سودی قرض لینے پر مجبور ہوتے ہیں اور ان کا اکثر مال ضائع ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ قاضی اور محتسب ایسے لوگوں کو بتایا جائے جن پر رشوت ستانی کی تہمت نہ لگائی گئی ہو۔۔۔۔۔ ائمہ ساجد کو اچھے طریقے پر تنخواہ دی جائے۔ ناز باجماعت کی حاضر کی تاکید اور ماہ رمضان کی بے حرمی کی مخالفت دوسرے طور پر کی جائے۔

بادشاہ اسلام اور امرا، عظام، نایابانہ عیش و عشرت میں مشغول نہ ہوں۔  
عزیز شہ گننا ہوں سے پتے دل سے تو بہ کریں۔ اور آئندہ گننا ہوں سے بچتے رہیں۔ (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص ۹۴)

یہ بیان کسی صوفی کا نہیں بلکہ ایک حکیم اور مدیر کی جانب سے بادشاہ، امرا اور ارکان سلطنت کے نام نفعیت نامہ ہے جس میں نہ صرف ان کے زبردستوں کی بلکہ خود ان کی اخلاقی کمزوریوں کی بھی نشان دہی اور ان کے ترک کی نفعیت کی گئی ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت ایک صوفی کے بیان سے بڑھ جاتی ہے۔

ہیں اس بیان کی صداقت معلوم کرنے کے لئے کسی اور کوئی کی ضرورت نہیں بلکہ اس دور کی اخلاقی و مذہبی اور سماجی تاریخ کی یہ خود کوئی اور تاریخ کی صحت کا معیار ہے۔

امراء اور راجاں دولت کی جو اخلاقی و مذہبی حالت تھی، اس سے ان کے زیر دستوں کی حالت بجا  
اعادہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے ان کی کمزوریوں اور اخلاقی پستیوں کی بھی  
نشان دہی کر دی ہے فوجیوں سے خطاب میں شاہ صاحب نے انہیں جن معائبہ کے ترک کی نفعیت  
کی ہے ان میں جہاد سے غفلت، مانوس بنے ہوئے، میدان جنگ و مقابلے سے فرار، عوام پر ظلم  
ان کا مال غصب کر لینا، دولت و دنیا کا عشق، عیاشانہ زندگی کی طلب، بھنگ اور شراب نوشی  
وغیرہ عادات خبیثہ شامل ہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

”اے فوجیو اور عسکریو! تمہیں خدا نے جہاد کے لئے پیدا فرمایا تھا مقصد  
یہ تھا کہ اللہ کی بات اور حق کی ہوگی اور خدا کا کلمہ بلند ہوگا اور شرک اور  
اس کی جڑوں کو تمہارے نکال پھینکو گے لیکن جس کام کے لئے تم پیدا  
کئے گئے تھے اسے تم چھوڑ بیٹھے اب جو تم گھوٹے پالتے ہو ہتھیار  
جمع کرتے ہو اس کا مقصد صرف یہ رہ گیا ہے کہ اپنی دولت میں اس  
سے اضافہ کرو۔ اس سلسلہ میں جہاد کی نیت سے تم بالکل غالی اور  
بہتے ہو، تم شہر میں پیتے ہو، بھنگ کے پیلے پڑھاتے ہو۔ عام  
لوگوں پر زیادتیوں اور ظلم کرتے ہو۔ حالانکہ جو کچھ ان کا لے کر کھاتے  
ہو اس کی قیمت ان تک نہیں پہنچتی۔“

کسی قوم اور ملک کے لئے تاجر اور صنعت کار ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اگر کسی قوم  
کے تاجر اور صنعت کار دین داری اور عمدہ اخلاق کی صفات سے محروم ہو جائیں تو ملک کا  
اقتصادی توازن بگڑ جاتا ہے اور اخلاقی لحاظ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب  
کے عہد میں اس طبقہ کی اخلاقی اور مذہبی حالت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امانت  
دیانت کی صفات سے یہ طبقہ محروم اور توہمات میں گرفتار تھا اور ان میں ایک ایسا طبقہ پیدا  
ہو گیا تھا جس نے کسی جائز پیشے کو اختیار کرنے کی بجائے عورتوں کی حرام کمائی کو اپنا ذریعہ  
معاش بنالیا تھا۔ اس طبقہ کی مذہبی اور اخلاقی حالت کے اظہار کے لئے حضرت شاہ صاحب



کا یہ خطاب کفایت کرتا ہے۔

اسے اسباب پیشہ ! دیکھو! امانت کا جذبہ تم سے مفقود ہو گیا ہے تم اپنے رب کی عبادت سے غالی الذہن ہو چکے ہو اور تم اپنے فرضی بنائے ہوئے معبودوں پر قربانیاں چڑھاتے ہو تم سارا دار و رسالہ کا ج کیرتے ہو۔ تم میں سے بعض لوگوں نے قال بازی اور ٹوٹکا اور گنڈے وغیرہ کا پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ یہی ان کی دولت ہے اور یہی ان کا مذہب یہ لوگ خاص قسم کا لباس اختیار کرتے ہیں۔ خاص طرح کے کھانے کھاتے ہیں ان میں جن کی آمدنی کم ہوتی ہے وہ اپنی عورتوں اور بچوں کے حقوق کی پروا نہیں کرتے۔ تم میں سے بعض صرف شراب خوردی کو پیشہ بنائے ہوئے ہیں اور تم ہی میں سے کچھ لوگ عورتوں کو کرایہ پر چلا کر ہریٹ پالتے ہیں۔ یہ کیا بد بخت آدمی ہے اپنی دنیا اور آخرت دونوں کو ہرباد کر رہا ہے۔

حالانکہ حق تعالیٰ نے تمہارے لئے مختلف قسم کے پیسے اور کمائے کھانے کے دوازے کھول رکھے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن تم خدا کی ناشکری اور غلط راہ حصول رزق کی اختیار کی ؟

اوپر کی سطروں میں معاشرہ کے مختلف طبقات کی مذہبی و اخلاقی حالت کا جائزہ لیلے کسی معاشرہ کے یہ معامہ طبقات ہیں جن کے اخلاق اور مذہبی حالت کے آئینہ میں عوام بلکہ پوری قوم کے اخلاق اور مذہبی حالت کو واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ بعد اقل الناس علی دین ملوکہم، لوگوں کی اخلاقی حالت معاشرہ کے اعلیٰ طبقات کے بر خلاف نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم عوام کی مذہبی و اخلاقی حالت معاشرہ کے اعلیٰ طبقات کے بر خلاف نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم عوام کی مذہبی و اخلاقی حالت کو واضح طور پر بیان کر دینا چاہتے ہیں۔ اعلان حالات کی عکاسی کے لئے ہم حضرت شاہ صاحب کے خطاب ہی کا خلاصہ یہاں پیش کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں

اب میں عام مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ آدم کے بچہ واسکھو تھاکہ  
اخلاق سہجے ہیں۔ تم پہلے باہر و آواز کا ہوکا سوار ہو گیا ہے۔ تم پر  
شیطان نے قابو پالیا ہے۔ عدد میں مردوں کے سر پر چڑھ گئی ہیں اور مرد  
عورتوں کے حق برباد کر رہے ہیں۔ حرام کو تم نے اپنے لئے خوش گمار  
بنا لیا ہے اور حلال تمہارے لئے بدمزہ ہو چکا ہے.....

چاہیے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعہ پوری کرو۔۔۔  
اپنے شکم کی خواہشوں کی تکمیل چاہیے کہ کھانوں سے کرو اور اتنا کمانے  
کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہوں۔ دوسروں  
کے سینے کا بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو۔ کہ ان سے مانگ کر کھایا کرو  
تم ان سے مانگو اور وہ نہ دیں، اسی طرح بے چارے بادشاہوں اور حکام  
کے اوپر بھی بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود  
کما کر کھایا کرو۔ کوئی نہ کوئی کمائی کی راہ آدمی ضرور اختیار کرے اور اسی  
کے ساتھ قناعت کو اپنا دستور زندگی بنالے اور رہتے رہتے میں اعتدال  
کا جاہ اختیار کرے۔

اے آدم کے بچہ! تم نے ایسے بھڑے ہوئے رسوم اختیار کر لئے ہیں  
جن سے دین کی اصلی صورت بگڑ گئی ہے..... بری بری رسمیں تم میں  
جاری ہیں، جنہوں نے تمہاری زندگی تم ہمہ تنگ کر دی ہے.....  
ان رسموں میں تم اپنی دولت ضائع کرتے ہو وقت برباد کرتے ہو اور جو  
صحت بخش بخش دوشیں تھی اسے چھوڑ بیٹھے ہو..... تم نے اپنی ناریں  
بر باد کر رکھی ہیں تم میں سے کچھ لوگ ہیں جو دنیا کمانے میں اور اپنے  
دھندوں میں اتنے بھنس گئے ہیں کہ نار کا انہیں وقت ہی نہیں ملتا  
کچھ لوگ ہیں جو قصہ کہانی سننے میں وقت گناتے ہیں.....



# شاه ولی اللہ کا فلسفہ

حصہ اول

## مبادیات اخلاقیات

مصنف: مولانا محمد امجد علی دہلوی

مترجم: سید محمد سعید

معاشرتی ارتقاء کے چار مرحلے

ارتقاء اول

ارتقاء دوم

ارتقاء سوم

ارتقاء چہارم

ہمیشہ کہ ایک فرد کی زندگی کو سب سے پہلے چار مرحلوں مثلاً بچپن، لڑکپن، جوانی اور مسرہ بچگی میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اسی لئے شاہ ولی اللہ سببیت کی خاطر معاشرتی ارتقاء کو چار مرحلوں میں تقسیم کرتے ہیں جن کو وہ ارتقاءات کہتے ہیں اور یہ چاروں مرحلے ایک دوسرے سے قطعاً مربوط ہیں کہ ان کے درمیان شکل ہی سے قطعاً تقسیم ڈالا جاسکتا ہے۔ ہر ایک مرحلہ اس کی انہی صفات اور لواظروں کی بنیاد پر تقسیم کیا گیا ہے اور شاہ صاحب نے ہر مرحلہ کے وسیع خطوط پیش کیے ہیں۔

ضروریات (حاجات) کی تسکین وہ عام سطح ہے جس پر کہ ایک معاشرہ کے بندھن، خدائی طور پر قائم ہوتے ہیں۔ ابتدائی ضروریات، خوراک، سردی گرمی اور موسم کی شدت کے خلاف سہ اقسام حیوانات کا ہم محبت ہونا اور تولید نسل کرنا اور دوسری جسمانی و حیاتیاتی ضروریات کی تسکین ابتدائی دوسرے انسانی معاشرہ کی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے، جو کہ اپنے آغاز میں حیوانات

کے مقابلے میں، مشکل ہی سے بہتر ہوگی لیکن ارتقار کے دوران، مخصوص خصوصیات نے فرد غاپایا جنہوں نے اس کے طرز عمل کو گروہوں اور حیوانوں کے طرز عمل سے ممتاز کیا اور اسے انسانی معاشرہ کے مخصوص نشانات عطا کئے۔

## ارتفاق اول

د انسانی معاشرہ، معاشرتی ارتقار کے اولین مرحلہ میں

انسانی معاشرہ اپنے فرد کے اولین مرحلہ میں اس وقت ہوتا ہے کہ جب وہ اپنی ابتدائی حالت میں، ہی ہوتا ہے، ذیل کے خطوط کے مطابق انسانی معاشرہ ترقی پاتا ہے۔

پہلی بات گویہ ہے کہ جی نوع انسان، حیوانات سے بلند تر، فرد غاپائے ہیں اور جو شے ان کو اپنی ہی نوع سے قریب تر رابطہ پیدا کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے وہ قوت گویائی ہے دوسری بات یہ ہے کہ جو شے افراد کے ملے گروہوں کی تشکیل میں مدد دیتی ہے، وہ خانہ بدوشوں کے گروہ ہوں میں سے زرعی گروہ ہوں کا مستقل قیام ہے۔ یہ دونوں باتیں ہر انسان کے درمیان تعاون، محنت کی تقسیم گروہوں کے ارکان میں ایک دوسرے پر انحصار، کھیتوں کو جوتنے، ہموار کرنے اور آبپاشی کا سامان پیدا کرنے کے لئے اجتماعی کوشش کی مزید ضرورت پیدا کرتی ہے یہ نہ صرف انسان کو باہمی تعاون کے لئے مجبور کرتی ہے بلکہ حیوانات کی پرورش بھی ضروری بنا دیتی ہے۔ انسانی ضروریات کی ترقی اور ان کی بندر بچہ و پیچیدگی جو نئی شکلوں میں ترقی پذیر ہوتی رہتی ہے، جیسے سائے فراہم کرنا ایک قسم کے کپڑے بنانا اور پکا ہوا کھانا کھانا، زیادہ سے زیادہ باہمی امداد تعاون کی ضرورت پیدا کرتی ہے۔

پرورش حیوانات بھی خاندانی نظام زندگی کو قائم کرتی ہے جو ایک گروہ میں ایک مستقل ادارہ ہوتی ہے۔

دوسری ضرورت دفاع ہے اکثر ہوتا ہے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر حملہ کر دیتا ہے نہ صرف یہ کہ اکثر اندرونی طور پر گڑبڑ ہو جاتی ہے اور ایک ہی گروہ کے ارکان آپس میں لڑتے ہیں اکثر ان میں لیے تنازعات پیدا ہوجاتے ہیں جو تمام گروہ کی بچہ کئی کے لئے کافی ہوتے ہیں اسی وجہ

سے ہفتہ روزہ اور ہدایات و مجموعیں آتی ہیں جن کی سطحی سے حفاظت کی جاتی ہے، ایک رہنما کی خصوصیت محسوس کی جاتی ہے اور اس کے بیرونگ کے دونوں اس کا حکم لاتے ہیں اور اپنے تنازعات طے کرتے ہیں۔ ایسی بنیادی خصوصیات بھی ہیں جن کو ابتدائی دور کے انسانی ماحول نے ظاہر کیا ہے۔

یہاں تک کہ دور و دشت کے معاشرہ میں یہ پیچیدہ سرگرمی، حقیقتاً ایک ایسے کردار کو فروغ دیتی ہے جو ان کے حالات و طبعی اور نفسیاتی ضروریات کے لئے موزوں اور فطری ہوتی ہے جسے ایک اخلاقی کردار کہا جاسکتا ہے۔ جو بعض مخصوص اوصاف کی ترقی میں رہنما کی کرشمے جیسے جرات، اے غرضی، فرد کے مقابلہ میں جماعت کے لئے سوچنا، عقل و ذکاوت کی تیزی اور ان اوصاف کی اہمیت، جو ابتدائی دور کے معاشرہ میں کبھی گئی اتنی بلند اور لطیف نہیں ہوتی جیسا کہ ترقی یافتہ معاشرہ میں ہوتی ہے۔ وہاں رقابت اور مقابلہ کا جذبہ بھی ہے جس کے نتیجہ میں ایک فرد جو کسی خاص معاملہ میں ہمارے بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے طاقتور ترین افراد اور ترین شخص جو کسی دنیوی میں قیادت کر سکے، گروہ کا رہنما بن جاتا ہے۔ جمالیاتی مذاق بھی ابتدائی دور کے معاشرہ میں قلعی ناپید نہیں ہوتے۔ من کو برا نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی نامعلوم مشرک کے لئے کوئی سرت ہوتی ہے لہذا وہ تمام بنیادی اصول جو آگے چل کر ایک معاشرہ کی ترقی کے اعلیٰ تر مرحلوں میں زیادہ سے زیادہ اہمیت اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اس مرحلے میں منتشر طور پر پائے جاتے ہیں۔

## ارتفاق دوم

(انسانی معاشرہ معاشرتی ارتقا کے دو سکر مرحلوں میں)

منظم و قوت، جو شاہ ہے اور علم سے حاصل ہوتی ہے اور پہلے مرحلے میں حاصل کی گئی۔ مزید ترقی کی راہ ہوا کرتی ہے۔ ترقی و توسیع کی راہ میں کوئی بھی رکاوٹ وہی اثر پیدا کرتی ہے جو کہ ایک فرد کے معاملے میں پیدائش مزاج کے حجاب آمیز محرکات پیدا کرتے ہیں اور ان کے نتیجہ میں جلیجیاتی اور رنج پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ نتیجہ کے طور پر ایک ارتقا کی طرف

قابل ذکریات یہ ہے کہ پہلے مرحلہ پر بھی ضروریات کی طرح ان کی تسکین و تکمیل کے طور پر  
بھی فروغ پانا ضرورت کر دیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں۔ یہ اسی  
کار کا نتیجہ ہے کہ آگے چل کر، معاشرتی ارتقاء کا دوسرا مرحلہ وجود میں آیا۔  
**زندگی کے پانچ شعبے**

شاہ ولی اللہؒ دوسرے مرحلے کی پیچیدہ زندگی کو پانچ شعبوں میں تقسیم کرتے ہیں جسکے  
شعبہ میں کردار کے موزوں طریقے بروئے عمل ہیں جو معاشرہ کے اخلاقی کردار کے کثیر التعداد  
مناہیوں کو متشکل کرتے اور ترقی دیتے ہیں۔ یہ شعبہ حسب ذیل ہیں۔

### فرد کی زندگی یا شخصی زندگی کا شعبہ

جو اصول شخصی زندگی کے موزوں کردار پر حکمرانی کرتے ہیں انہیں شاہ ولی اللہؒ حکم  
المعاشیہ (طرز زندگی کی حکمت) قرار دیتے ہیں اور یہ ایک فرد کی ضروریات کی تسکین  
موزوں شکلوں سے وابستہ ہوتے ہیں مثلاً خوراک مشروبات، لباس مقام رہائش طر  
نشت و برخواست۔ طرز زندگی اور سفر حضر میں جو ترقی یافتہ معاشروں کی طرح ہر دور  
میں انسانی ضرورت ہے۔

### گھریلو زندگی کا شعبہ

عائداتی زندگی بھی اس مرحلہ پر زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے، ازدواجی تعلقات نہ صرف  
بچوں کے لئے ذمہ داریاں پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسرے رشتہ داروں، غائبانہ کے دوستوں خاندان  
اور دوسروں کے لئے احساس ذمہ داری پیدا کرتے ہیں۔

اسی طرح سے نئے سماجی لوازم و زیادات وجود میں آتے ہیں بعض حالات میں مشترکہ خاندان  
بھی ایک مظہر بن جاتا ہے جو اصول گھریلو زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں انہیں شاہ ولی اللہؒ  
حکمت تدبیر المنزل کہتے ہیں یعنی گھریلو ذمہ داریوں کے کردار کی حکمت کا علم۔

## پیشہ ورانہ زندگی کا شعبہ

یہ زندگی کے ایک اعلیٰ معیار کے لئے ہم سے تعلق رکھتی ہے جو مزید تقسیم محنت اور ذرائع پیداوار اور حصول روزی کی تخصیص کا راہ و ترقی سے تعلق رکھتی ہے شاہ ولی اللہ اس شعبہ کو حکمت اکتسابیہ، (یعنی روزی حاصل کرنے کی حکمت) کہتے ہیں۔

## تجارتی معاہدوں کے تعلقات اور دوسروں سے سامان تجارت کے مبادلہ کا شعبہ

یہ شعبہ اس علم پر قائم رہتا ہے جسے شاہ ولی اللہ نے حکمت التعملیہ، یعنی باہمی لین دین کا علم قرار دیا ہے۔ یہ علم ایسے معاملات سے تعلق رکھتا ہے جیسے فروخت، بیع، کرایہ نامے قرضہ، زیربائی، رهن دینے وغیرہ۔

## تعاون کا شعبہ دیا امداد باہمی کا شعبہ

شاہ ولی اللہ کے نزدیک یہ شعبہ، حکمت التعاونیہ، یعنی امداد باہمی کے علم سے تعلق رکھتا ہے مثلاً یقین دہانی (ضمانت) سے تعلق رکھنا، مشترکہ ملکیت کا کاروبار، شراکت، لکھنوی اور اسی قسم کے دوسرے معاہدے وغیرہ۔

آخر کے تین شعبے ایک معاشرہ کی معاشی زندگی کے کردار کے ترقی و فروغ کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتے ہیں اسی لئے ان تینوں شعبوں کو مشترکہ طور پر ایک شعبہ ہی تصور کیا جاسکتا ہے اور اسے معاشی زندگی کے کردار کا شعبہ کہا جاسکتا ہے۔

زندگی کے تمام متذکرہ بالا شعبے، ایک معاشرہ کی لازمی خصوصیات ہیں جو کہ اپنے ابتدائی مرحلے سے ترقی پا گئے ہیں ہر ایک شعبہ ترقی یافتہ معاشرہ کی تشکیل میں اپنا لازمی حصہ ادا کرتا ہے ترقی یافتہ معاشرہ میں، شعبہ دوسرے شعبوں سے مربوط ہوتا ہے ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہوئے یہ پانچوں شعبے معاشرہ کے تمام ارکان کو بحیثیت مجموعی متحد



کرتے ہیں اور معاشرہ کو بڑے پیمانہ پر ایک ہی خاندان کی شکل دیتے ہیں۔

## مملکت، مدینہ

اپنے ارتقاء کے دو سرمرحلہ سے گزرنے کے دوران، معاشرہ ایک وسیع تر اتحاد کی شکل میں فروغ پاتا ہے جو کہ مملکت کی تشکیل کرتا ہے۔

شاہ ولی اللہ کے الفاظ میں ایک حقیقی مملکت، ایک مستحکم ملنے بلند ہوا علامات اور تجارتی مرکز کا نام نہیں بلکہ یہ انسانوں کے مختلف گروہوں کے درمیان اتحاد کی ایک شکل ہے جو ان اصولوں پر زندگی کے مختلف شعبوں کے لازمی نتیجے کے طور پر وجود میں آتی ہے جو معاشرہ کے مختلف گروہوں کے درمیان مختلف رسل و مسائل یا تجارتی اشیاء اور تعاون کے ذریعہ تعلق پیدا کرتی ہے اور ان کو داخلی اتحاد اور فرد واحد کی سالمیت عطا کرتی ہے۔

مملکت اور اس کے اتحاد کے تحفظ کے لئے معاشرہ مہنت کی ایک حکومت قائم کرتا ہے اور پھر اسے ترقی دیتی ہے۔ مملکتی حکومت کا فروغ معاشرہ کی علامت ہے جس نے معاشرتی ارتقاء کے تیسرے مرحلے تک ترقی کی ہے اور اسے شاہ ولی اللہ اتفاق سوم سرا دیتے ہیں۔

## ارتفاق سوم

(انسانی معاشرہ، معاشرتی ارتقاء کے تیسرے مرحلہ میں)

معاشرتی ارتقاء کا تیسرا مرحلہ سابقہ مرحلہ کا فطری نتیجہ ہے جس میں معاشرہ واقعاً ایک متحدہ نظام الاعضاء کی طرح ہو جاتا ہے اور یہی مملکت کی بنیاد ہے اتحاد اور عضویت۔ دونوں مزید معاشرتی ارتقاء کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یہ ایک ہم رنگ مملکتی حکومت کی تخلیق و ترقی کی طرف واقع ہوتا ہے اسی مقصد کے حاصل کرنے کے شعولیوں میں نہ صرف معاشرہ کا تحفظ و حفاظت اس کا اتحاد اس کی مملکت اور حکومت شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ اس مکمل فائدے سے تعلق رکھتے ہیں جو اتحاد، مملکت اور حکومت اپنے معاشرہ کے ارباب کو پہنچا سکتے ہیں۔

اس قسم کی مملکت کی حکومت اور حکومتی مشینوں کی ترقی کو شاہ ولی اللہ اتفاق سوم قرار دیتے ہیں۔ اور یہ معاشرہ کے وہ نشانات ہیں جو معاشرتی ارتقاء کے تیسرے مرحلے میں نمودار ہوتے ہیں۔ اس سے قبل کہ مملکت کی ضروریات اور ان کی تکمیل کے لئے حکومت کے طریقوں کا تجربہ کیا جائے۔ یہ اور زیادہ دلچسپ ہوگا کہ اتحاد مملکت اور مملکت کی حکومت اور ان کے باہمی تعلق کے بارے میں شاہ ولی اللہ کے تصورات کی وضاحت کے لئے البدور میں سے ایک عبارت نقل کی جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ کے الفاظ یہ ہیں۔

” بلاشبہ جب انسان ایک دوسرے سے باہمی لین دین کرتے (اور مختلف لوگ مختلف پیشوں میں ماہر ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کی ضروریات پیکر کرتے ہیں اور فراہم کرتے ہیں۔ اور نتیجے طور پر سامان تجارت کے مبادلہ کی مختلف شکلیں، مثلاً نقد وغیرہ وجود میں آتی ہیں یہ لازمی طور پر اس اہمیت کو واضح کرتی ہیں کہ لوگوں کے درمیان، مثلاً کاشتکاروں تاجروں اور ہولاءوں وغیرہ کے درمیان ایک قسم کا رشتہ یعنی اتحاد موجود ہے۔“

یہ لوگوں کے وہ گمراہ ہیں جو باہمی رشتے کے جوڑنے سے فی الحقیقت مملکت کا نظام ترتیب دیتے ہیں۔ حقیقی مملکت یہ پارہیولوی، قلعا اور تجارتی مرکز کا نام نہیں۔ اگر ایک دوسرے کے قرب و جوار ہیں بہت سے شہر واقع ہیں اور ان میں بسنے والے لوگ باہمی لین دین کرتے ہیں تب یہ ایک مملکت کہلائے گی۔

اس نقطہ نگاہ سے کہ ایک مملکت کو اتحاد کے رشتے سے متحد کیا جائے وہ فرد واحد یا ایک نظام الاعضا کی طرح ہوجاتی ہے جس میں لوگوں کا گمراہ اور ہر فرد کی حیثیت ملتی ہوئی ہے جو اس شخص کے جسم میں ایک دھڑ یا چھوٹے سے عضوی ہوتی ہے۔

ایک ملک میں اتحاد لازمی شے ہے۔ سب سے پہلے اس اتحاد کے تحفظ کی ضرورت ہے تب اس کے تمام فائدے اٹھانے کے لئے اسے ترقی و فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ حکومت کا نظام (تدبیر) جس کے فدیہ کہ ایک مقصد حاصل ہوتا ہے وہی حقیقی رہنما (امام) یا ملک کا فرمانروا ہوتا ہے شاہ ولی اللہ کے نزدیک حکومت کا فرمان روا نہ صرف کلیتہً ایک انسانی فرد کا خاکہ ہوتا ہے ماسواہ بلاشبہ جب ایک مستحکم اور طاقتور شخصیت کا حامل شخص، جو کہ قطعی طور پر اس کام کے لئے موزوں ہو، ملک کے امور سنبھال لے، وہی ملک کا سربراہ ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ محض خارجی اور ظاہری طور پر سربراہ ہوتا ہے۔“

ملکت کی حکومت کا نظام، ذیل کی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے جو کہ ملک کے تحفظ اور ترقی کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔

### ملکت کی ضروریات

۱۔ عدلیہ ملک کے اتحاد کے لئے اس وقت بڑا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے جب ملک کے مختلف شعبوں کے لوگوں کے درمیان باہمی تنازعے اور رقابتیں شروع ہو جاتی ہیں اگر ان تنازعات کا تعفیہ نہ کیا جائے تو وہ بڑھتے چلتے ہیں اور وہ ملک کے لوگوں کے درمیان بے چینی اور تعالوم پیدا کرتے ہیں جو ملک کو لازمی تباہی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اسی لئے ملک، ایک ایسے ادارے کے ڈھانچے کی شدید ضرورت محسوس کرتی ہے جسے اس کے نظام حکومت میں شامل کر لیا جائے۔ جو موثر طور پر اسی کے تنازعات کا تعفیہ کرے۔ ملک کی یہ ضرورت، عدلیہ کے ذریعہ تکمیل پاتی ہے جو مادی اور متفقہ طور پر تنازعات کے تعفیہ کا نظام ہوتا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ عدلیہ منصف و مستحکم ہو اور اس کے فیصلے قابل عمل بھی ہوں ورنہ ملک کی جو ضروریات، اس سے وابستہ ہوتی ہیں پوری نہیں ہوتیں۔

(انتظامیہ) (حاملہ)

کمزور اور بد طبع لوگوں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے جو مملکت میں خرابی پیدا کر سکتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ایسے افراد کے خلاف تعزیری اور افتدائی اقدامات کرنے کے لئے ایک مستحکم نظام ہونا چاہیئے۔ اور ان افراد سے بچنے کے لئے یکساں اور جذب طریقے و سنت العادہ کو اختیار کرنا چاہیئے۔

### فوج یا قوت و دفاع

کوئی انسانی معاشرہ و گمراہ طبائع کے افراد سے خالی نہیں ہو سکتا جو جان بوجھ کر فتنہ و فساد اور تصادم پیدا کرتے ہیں ان میں سے بہت سے ہولناک سرگرمیاں اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً قتل و غارتگری، مملکت کے خلاف بغاوت کرنا، اور ذاتی مفادات کی خاطر جان بوجھ کر نظم و ضبط میں خلل ڈالتے ہیں۔

یہ ذاتی مفادات، املاک کا حصول، یا کسی ذاتی انتقام یا دشمنی کی تسکین و تکمیل یا مذہبی تعصب ہوتے ہیں۔

ایسی ہولناک صورت حال پر قابو پانے اور ان کے خطرہ سے مملکت کو بچانے کے لئے بہادر لوگوں کی ایک فوج کی شکل میں دفاعی قوت کا جمع کرنا لازمی ہے۔ ایک فوج کی نقل و حرکت ایک طے شدہ دستور کے تحت ہوگی جس کو لوگ پسند کرتے ہیں یا خطرہ کے وقت، فوج کی نقل و حرکت ہونی چاہیئے یا اس کی نقل و حرکت اسباب حل و عقد کی مرضی پر ہوگی جو فن جنگ سے بخوبی واقف ہوں اور لوگوں کی رہنمائی فرماں برداری کی کمان کر سکیں۔ شاہ ولی اللہ نے اس ادارہ کو جہاد کے نام سے موسوم کیا ہے۔

### عوامی فلاح اور تعمیرات عامہ

ایک متمدن اور ترقی یافتہ مملکت، ایک ایسے ادارے کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ جو اس کے لوگوں کی فلاح و بہبود کی نگرانی کرے۔ وہ ان امور کی انجام دہی کے وسائل و فنکارانہ پیدا کرتی ہے جنہیں لوگ خود انجام نہیں دے سکتے۔ وہ سکر الفاظ میں یہ ادارہ پبلک عمارتیں اور

تعمیرات عائد کے اصول بنام دہلیہ حکومت کا یہ ادارہ نقابہ ہوتا ہے اور ادارہ کا سربراہ نقیب یا مالی کہلاتا ہے۔

### مملکت کے لوگوں کی تقسیم

مملکت کی ضروریات کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے لوگ بہتر طور پر ہدایت یافتہ ہوں، روزی حاصل کرنے کے شعبوں میں تاکہ وہ معاشرتی ارتقاء کے دو سابقہ مرحلوں کی معاشرتی ترقی کے پیش نظر بلند معیار زندگی حاصل کر سکیں۔

### مملکت کی حکومت کا فریضہ

ایک مکمل مملکت مدیتہ الناس، وہ ہے جو متذکرہ بالا ہر ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک موثر طریقہ سنت کی شکل میں ایک معیار رکھتی ہے۔ جیسا کہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جب بہت سے ناموافق طبائع اور متضاد مقاصد کے لوگ آپس میں ملتے ہیں تب ایک مسلمہ معیار اور مروجہ تعلیمات کے مطابق کردار حکومت کی طرز کی تشریح و ترمیمی میں اختلاف آرا یقینی ہے۔ لہذا یہ بہتر ہوگا کہ یکسانیت و اتحاد کے کسی بھی خطرہ کو دور کرنے کے لئے ہر شعبہ کے فرائض اور امور کسی ایک شخص یا افسر کے سپرد کر دیئے جائیں جو اس شخص کے ماتحت ہونا چاہیئے جو متعدد شعبوں کی کارکردگی کا ذمہ دار ہوتا ہے اور تمام مملکت کا لازمی سربراہ ہوتا ہے۔

### ارتفاق چہارم

(انسانی معاشرہ، معاشرتی ارتقاء کے چوتھے مرحلے میں)

### بین الاقوامی مملکت

ارتقاء کے دوران، معاشرتی ارتقاء کے دو ترقی یافتہ مرحلوں میں جو مملکت وجود میں آتی ہے وہ خود کو ایک وحدت میں تبدیل کر لیتی ہے جو حقیقتاً اس قسم کی بہت سی وحدتوں کے وسیلے اس وقت ایک وحدت ہوتی ہے جب کسی قوم کی آبادی اور تمام انسانیت کو زیر طور لایا جاتا ہے۔ مملکت کے انفرادی ارکان کی طرح ہر مملکت ایک طرح، ایک بڑی مملکت کی رکن ہوتی ہے۔ جو کثیر الشعبہ انسانیت سے قائم ہوتی ہے اور یہ تمام دینکے تعلق رکھتی ہے اور ان

میں سے بعض جزوی ملکیتیں دوسری ملکیتوں سے متصادم ہو جاتی ہیں اور اپنی مخالف ملکیتوں سے داخلی امن اور اتحاد کو خطرہ میں ڈال دیتی ہیں۔

واقعات کی یہ نوعیت ایک نیا طاقتور نظام کی ضرورت پیدا کرتی ہے جو تمام دیگر ملکیتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ پر امن رہنے کے لئے قابو میں رکھتی ہے اور انسانی نیت، انسان الکبیر، میں مداخلت ذکر کریں۔ اس ضرورت کی تکمیل ایک اعلیٰ خلافت کی شکل یا ایک بین الاقوامی حکومت سے پوری ہو جاتی ہے جسے اقوام اس وقت نافذ کر لیتی ہیں کہ جب وہ اپنے ارتقاء کے دوران معاشرتی ارتقاء کے چوتھے مرحلے کی طرف پیش قدمی کرتی ہیں اس مرحلہ کو شاہ ولی اللہ ارتقاء چہارم کہتے ہیں۔ جس کے بغیر اقوام کے درمیان حقیقی امن و سکون اور انفرادی ملکیتوں کی حفاظت ممکن نہیں اور وہ خلافت کے بغیر، ہمیشہ نازک حالات سے دوچار رہیں۔

### مختلف سطوح

اگرچہ یہ چار مرحلے ہیں، جن سے ایک معاشرہ ترقی پذیر ہو سکے تاہم یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر معاشرہ ان میں سے ہر مرحلے سے گزرا ہو۔ بعض معاشرے دوسروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں اور اعلیٰ تر ارتقاء کو پہنچتے ہیں اور بعض اپنی ترقی کے بعد زوال پذیر ہو جاتے ہیں اس لئے ہر معاشرہ کو اس کی موجودہ سطح سے جانچنا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ارتقاء کی پہلی، دوسری اور تیسری غرض کسی منزل میں ہے یا وہ جزوی طور پر دوسری منزل میں ہے۔

(سلسلہ)

## حافظ خلف بن سالم تہذیب اولیٰ کا ایک جلیل القدر سندھی محدث حافظ محمد اسماعیل

تہذیب اولیٰ کے سندھی محدثین اور علمائین سے کئی نمایاں اور اپنی شخصیتیں ہیں جن سے آج سندھ کا کوئی شخص واقف نہیں۔ سندھی علماء کے تذکرہ دہ میں ان کے حالات تو کچھ ان کے نام ہی نظر نہیں آتے۔ آئیے آج تیسری صدی کے ایک نامور محدث خلف بن سالم کی سوانح و آثار کا اجالی تذکرہ رجال و اسانید کے دفتر سے معلوم کریں۔

آپ کی کنیت ابو محمد اور نام خلف بن سالم تھا آل المہلب کے ساتھ، لاہ کا تعلق تھا۔ اس لئے آپ کو مولیٰ آل المہلب اور مہلبی بھی کہا جاتا تھا۔

مولیٰ کا لفظ یہاں کہ علامہ نووی نے تہذیب الاسماء واللغات کے مقدمہ میں تصریح کی ہے اگرچہ نیا حدیث طریقت اور مولیٰ المولاۃ ہی کے معنی میں مستعمل ہے تاہم چونکہ مولیٰ آزاد کردہ غلام کو بھی کہتے ہیں اس لئے لفظی مشارکت کی بنا پر بعض وقت وہ کہہ ہو جاتا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے بھی بعض لوگوں کو یہی مقابلہ ہوا ہے کہ وہ مولیٰ کے معنی غلام کے سمجھ بیٹھ لیکن خود امام اعظم کی تصریح اس کے برخلاف موجود ہے۔ یہاں کہ امام حمادی کی کتاب شکل الامام کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

ابو عبد الرحمن المقرئ نے کہا کہ میں امام ابو حنیفہ کے پاس آیا تو وہ مجھ سے دریافت کرنے لگے تم کون ہو؟ میں نے عرض کیا ایک ایسا شخص کہ جس پر اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ

اصلی فرمایا ہے (یعنی تو سلم) امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے موالات کرو پھر سہارا بھی انصاف انہیں کی طرف ہونے لگے گا کیونکہ خود میں بھی ایسا ہی تھا۔  
خلف بن سالم کو موتی آل المہلب بھی قاتل اسی نسبت سے کہا جاتا ہے۔

آپ بہت بڑے حفاظ حدیث میں سے تھے چنانچہ امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں آپ کے تذکرہ میں لکھا ہے۔

انما تظا کبیر یعنی بڑے حافظ آپ سندھی محی لیکن تذکرہوں سے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ آیا ان کے والد مسلمان ہوئے تھے یا نہ۔

آپ کے سوانحہ میں بڑے نامور محدثین شامل ہیں جیسے یحییٰ بن سعید القطان و المتوفی ۱۹۸ھ، عبد الرحمن بن ہدی (المتوفی ۱۹۵ھ)، اسماعیل بن ابراہیم ابن علیہ (المتوفی ۲۹۶ھ)، عبد الرزاق بن امام (المتوفی ۲۱۰ھ)، عثیم بن بشیر (المتوفی ۲۱۵ھ)، ابن ادیس جلالہ بن ادیس الکوفی (المتوفی ۲۵۲ھ)، معن بن عیسیٰ القسزادہ (المتوفی ۲۱۹ھ)، ابو بکر بن عباس (المتوفی ۲۱۵ھ)، محمد بن جعفر غندر المتوفی ۲۱۳ھ، ابو یحییٰ الغضن بن دین (المتوفی ۲۱۵ھ)، یزید بن زید (المتوفی ۲۱۵ھ)، وھب بن جریر البصری (المتوفی ۲۱۵ھ)، محمد بن عبد اللہ ابن نمیر (المتوفی ۲۱۵ھ)، ابو احمد الزہیری محمد بن عبد اللہ الاسدی الکوفی (المتوفی ۲۱۵ھ)، سعد بن ابیہیم بن سعد (المتوفی ۲۱۵ھ)، یعقوب بن ابراہیم بن سعد الزہری (المتوفی ۲۱۵ھ)، ادیان کے علاوہ سب سے زیادہ سوانحہ تھے۔

آپ کے شاگردوں میں سندھ خلیل محدثین قابل ذکر ہیں۔

احمد بن ابی خثیمہ (المتوفی ۲۱۹ھ)، ابو امام الرازی محمد بن ادیس الحنظلی المتوفی ۲۱۵ھ (دیر بخاری کے استاد ہیں)، ابو زمرہ محمد بن عمر والد شقی (المتوفی ۲۱۵ھ)، دحمت شام، یعقوب بن شبہ (المتوفی ۲۱۵ھ)، یحییٰ بن عبد اللہ القزوینی المتوفی ۲۱۵ھ، عثمان بن سعد الداری المتوفی ۲۱۵ھ، یعقوب بن یوسف الطوسی المتوفی ۲۱۵ھ، عباس بن محمد الدعدی المتوفی ۲۱۵ھ، اسمعیل بن ابی الحارث اسد بن شامی المتوفی ۲۱۵ھ۔ عالم بن الیث المتوفی ۲۱۵ھ، جعفر بن محمد



الطیاسی المتوفی ۳۷۵ھ الحسن بن علی العمری المتوفی ۳۹۵ھ، ابو القاسم عبد اللہ بن محمد البغوی المتوفی ۳۸۱ھ احمد بن علی الابرار المتوفی ۳۷۹ھ، ابو بکر احمد بن علی بن سعد المروزی المتوفی ۳۹۲ھ احمد بن الحسن المروزی المتوفی ۳۸۵ھ،

امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی (صاحب السنن) فرماتے ہیں کہ میں نے خلف بن سالم سے پانچ احادیث سنی جہنیں ہیں احمد بن حنبل سے سن چکا تھا۔  
امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعث السجستانی (صاحب السنن) فرماتے ہیں کہ میں نے خلف بن سالم سے پانچ احادیث سنی جہنیں ہیں احمد بن حنبل سے سن چکا تھا۔  
امام شافعی آپ سے ایک شخص کے واسطے سے بعایت کرتے ہیں۔  
علی بن سہل البزار فرماتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے سنا وہ فرماتے تھے کہ خلف بن سالم بلاشبہ سچے ہیں۔

المزوری فرماتے ہیں کہ احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ خلف بن سالم پران (محبوب نقائص صحابہ ہیں) احادیث کے جمع کرنے کی وجہ سے تنقید کرتے ہیں لیکن مجھے جہاں تک علم ہے وہ چھوٹے نہیں ہیں۔

ہردمانے میں بعض لوگ بڑے محدثین پر جھوٹے الزام لگایا کرتے ہیں تاکہ ان کو کس طرح کمزور کر دیا جائے۔ خلف بن سالم پر بھی اس قسم کے الزامات لگائے گئے لیکن امام الجرح والتعديل یحییٰ بن معین نے ان الزامات کو بالکل بے بنیاد قرار دیا ہے۔ جیسے کہ مندرجہ ذیل روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

ابو بکر الخلیف البغدادی نے تاریخ بغداد میں ائمہ اربعہ اور ائمہ اربعہ میں نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے کہ عبد الخاق بن منصور فرماتے ہیں میں نے یحییٰ بن معین سے پوچھا کہ خلف بن سالم الخمری کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے انہوں نے فرمایا صدوق (یعنی سچے ہیں) تو میں نے کہا کہ اے ابو زکریا (یعنی یحییٰ بن معین کی کنیت ہے) وہ اصحاب رسولؐ کے محبوب و نقائص کے بارے میں احادیث بیان کرتا ہے تو یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ وہ ان احادیث کو جمع

تو کرتا تھا لیکن بیان نہیں کرتا۔

آپ غالباً ان احادیث سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے جمع کرتے ہوں گے جیسے کہ حفاظ حدیث کو لاکھوں موضوع احادیث یاد تھیں۔ اب ان کے بارے میں کہا جائے چونکہ وہ بھوٹی احادیث جمع کرتے اور یاد کرتے تھے اس لئے وہ ضیعت اور ناقابل اعتبار تھے تو یہ کس طریقہ صحیح ہو گا؟

امام احمد مزید فرماتے ہیں کہ میں خلف بن سالم کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ نہایت ہی ایمان دار اور صاحب عفت ہیں۔

امام نسائی اور ابو حاتم الرازی فرماتے ہیں خلف بن سالم قابل اعتماد ہیں۔  
عمرۃ الکفا فی اصحاب جان نے انہیں شریف اور سمجھدار محدثین میں سے شمار کیا ہے۔  
آپ کے شاگرد مشہور محدث یعقوب بن شبیبہ فرماتے ہیں۔ آپ قابل اعتماد اور معتبر تھے نیز انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ محدث حمیدی (استاذ البخاری اور مسودوں سے زیادہ قابل اعتماد تھے مافظ وہی، ابن شیبہ، امام بخاری، ابن سعد، اور خطیب بغدادی متفق ہیں کہ آپ کی وفات بغداد میں ۲۳۱ھ میں ہوئی تھی، انوار کادون تھا اور رمضان المبارک کی ۲۳ تاریخ تھی، اور آپ کی عمر ۶۹ سال تھی۔

ابو غالب علی بن احمد بن النضر کہتے ہیں کہ آپ کی وفات ۲۳۲ھ میں ہوئی اور ابوحسان الزیادی کہتے ہیں کہ اس وقت آپ کی عمر ۷۷ سال تھی لیکن آپ کی وفات اور عمر کے بارے میں پہلا قول راجح ہے جس پر اکثر مؤرخین کا اتفاق ہے۔

ابن سعد، الطبقات الکبیر، میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے ایک مسند تصنیف کیا تھا جس میں احادیث رسول جمع کی تھیں۔

لیکن حال اس کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔  
(حوالہ کے لئے دیکھئے)

لے میزان الاعتدال للامام الذہبی ج ۱ ص ۳۱۰

- (۱) تذکرۃ الحفاظ للامام الذہبی ج ۲ ص ۶۵  
 (۲) تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ص ۲۶۸-۳۳۰ ج ۸  
 (۳) تهذیب التہذیب لابن حجر ج ۳ ص ۱۵۲  
 (۴) الطبقات الکبیر لابن سعد ج ۷ قسم ۲ ص ۹۲ طبع لیدن  
 (۵) کتاب الجرح والتقدیل لابن ابی ماتم ج ۱ قسم ۲ ص ۳۷۱  
 (۶) تاریخ الکبیر للامام البخاری ج ۲ قسم ۱ ص ۱۷۹

# ہمعات

فارسی

تصوف کی حقیقت اور فلسفہ ہمعات کا موضوع ہے  
 اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف  
 کے ارتقا پر بحث فرمائی ہے۔ نفس انسانی تربیت و تزکیہ  
 سے جن بلند منازل پر فائز ہوتا ہے اس میں اس کا  
 بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

## تذکرہ حجت الاسلام مولانا نانوتویؒ

مولانا محمد عبدالمجید چشتی

حجت الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات میں فطرت کی طرف سے جو اوصاف و کمالات و دیوت کئے گئے تھے انہوں نے خلق خدا کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا جو بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا اپنے مافیہ کے مطابق اپنے حوصلہ و ظرف کے بقدر نادمہ اٹھاتا تھا اور ان کی ذات قدسی صفات کا دالہ و شیدہ ہو جاتا تھا۔ ایسے ہی مستفیدین میں ایک بزرگ محمد حسین بن محمد مسعود مراد آبادی تھے۔ یہ سید مانت علی حسینی چشتی التوفی سنہ ۱۳۳۰ھ کے مخلص مرید تھے۔

انہیں بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی اور ان کے حالات کی بڑی جستجو تھی جب کہیں حضرت نانوتویؒ کا مراد آباد یا بہرہلی میں ورود مسعود ہوتا یہ خدمت میں مدد و مددگار ہوتا اور حضرت نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و معارف سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

انہوں نے سنہ ۱۳۰۰ھ میں بزرگان دین کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں لکھا شروع کیا تھا جو کم بیش چار سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا تھا اس کا نام انوار العارفین ہے یہ سنہ ۱۳۰۹ھ میں مبعوث لول کشور لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اب جن میں ملتا ہے۔۔۔ یہ تذکرہ مختصر جامع اور مفید ہے۔ اس میں موصوف نے چار مشہور قوالوں کے بزرگوں کا حال حکایت کیا ہے اور ان بزرگوں کا حال بھی لکھا ہے جن کو انہوں نے دیکھا تھا۔ اس کتاب میں چشتیہ صابریہ سلسلہ کے بزرگوں کے تذکرے میں حضرت نانوتویؒ سے بعض بڑی اہم اور نہایت مفید معلومات

نقل کی ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالرحیم چشتی افغانی سہارنپوری شہید رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ سید  
رقمہ رازیں۔

بیعت جہاد یا بہاب سید احمد صاحب	شاہ عبدالرحیم نے حضرت سید صاحب
کردند حضرت حاجی مولوی محمد قاسم	کے دست حق پرست پر بیعت جہاد
صاحب درمچلے بار اقم نقل ہی فرموا	کی حضرت حاجی مولوی محمد قاسم
کہ چہل ہر دو ذات بابرکات بعد	صاحب راقم سے ایک مجلس میں
فرما کر مرقبہ یا ہم ہی نشستند اثر	بیان فرمایا کہ مرقبہ سے فارغ ہونے
ہمت قویہ ایشان بر جناب سید احمد	کے بعد جب دونوں حضرات بیٹھے تو
صاحب خندہ ہائے قہقہہ کہ خاص	ان کی بہت قویہ کے اثر سے حضرت
اثر ثبت چشتیہ است ظاہری شد	سید احمد صاحب پر قہقہہ کی صورت
داثر توجہ جناب سید برایشان غلبہ	میں ثبت چشتیہ ظاہر ہوئی یا وہ
سکھردی داد رمتہ اللہ علیہ سلم	حضرت سید صاحب کی توجہ کے اثر
دہم مولوی صاحب موصوف بار اقم	سے ان پر غلبہ سکھ نہایاں ہوا تھا
و یادو سہ از اہل علم نقل ہی فرموند	رحمۃ اللہ علیہم نیز مولوی صاحب
کہ عبداللہ خاں رئیس پنجلا سا مرید	موصوف نے راقم اودھ تین اہل علم
عقیدت کیش شاہ رحم علی قدس سرہ	سے بیان فرمایا تھا کہ عبداللہ خاں
برائے مدونہ قند سیماہ دم کی کثرت	رئیس پنجلا سہ جو شاہ رحم علی قدس سرہ
دقل از تولد مولود کہ پسر خواہد آمد	کے عقیدت کیش مرید تھے درونہ
بادختر فہری دادند چون کیفیت آن	کے سلسلہ میں گرد دم کہ کے دیا کر

لے مولانا سید عبدالحی حنی لکھنوی نے شاہ عبدالرحیم رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ نیز انوار طہ رحمۃ اللہ علیہ میں  
انوار العارین کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا ہے۔

غیر از دوسے ہی پر سید محمدی گفتند کہ  
کہ مرشد من مرا موصوت دختر و پسرخانہ  
می کنانند را قسم دے را دیدہ بودم و  
بزرگ و خوش اوقات بودند از تیر تا تھر  
ارواح بزرگان در عالم مثال ثابت  
می شد کہ صورت مثالیہ را معائنہ می  
کنانند یہ

تھے اود ولادت سے پہلے ہی بتلا  
دیا کرتے تھے کہ لڑکا پیدا ہو گا یا لڑکی؟  
ان سے جب اس پیشی اطلاع دینے  
کی کیفیت دریافت کی جاتی تو فرماتے  
کہ میرے مرشد لڑکے یا لڑکی کی صورت  
میرے سامنے کر دیتے ہیں راقم نے  
بھی موصوف کی زیارت کی ہے وہ ایک  
خوش اوقات مرد بزرگ تھے اس سے  
اعداوح بزرگان کا تصرف بھی ثابت  
ہو تلبے کہ یہ حضرات عالم مثال میں  
مثالی صورتیں دکھاسکتے ہیں۔

اور اسی طرح حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مکی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرے میں حضرت  
نانوتوی سے نقل ہیں۔

حاجی مولوی محمد قاسم صاحب با راقسم  
نقل فرمودند کہ شفعے گفت کہ جبہ آں  
حضرت علی باللہ علیہ وسلم کہ دیہاری  
و جلال آباد است حاجی امداد اللہ صاحب  
را پوچشیدہ بخواب دیدم تعبیل آں  
پرنظر اوست کہ ایشان بلباس شریعت  
و آداب طریقت آراستہ و پیراستہ

حاجی مولوی محمد قاسم صاحب ایک شخص  
کامیان راقم سے نقل فرماتے ہیں کہ انہوں  
نے حاجی امداد اللہ صاحب کو خواب  
میں نقل حضرت علی اللہ علیہ وسلم کا وہ  
جیسے پہنے ہوئے دیکھا جو دیہاری اور  
جلال آباد میں موجود ہے جس کی تعبیر  
ظاہر ہے کہ موصوف لباس شریعت

امد دلایاں لایا تہا سنت و  
علوم شریعت و آداب طریقت  
تعلیم تلقین می فرماید و خدمت  
خود از عالم سید رعا ندادند و  
از کسر نفسی خود تعلیم ظاہری  
از مریدان نہ پسندند و بتعظیم  
باطن امر فرماید۔

ادب آداب طریقت سے آگاہ استہ  
پیراستہ ہیں اور سالکین کو سنت اور  
علوم شریعت اور آداب طریقت  
کے اتباع کی تعلیم و تلقین فرماتے ہیں  
اور کسی عالم یا سید سے اپنی خدمت  
لینا پسند نہیں فرماتے اور اپنی کسر  
نفسی کی وجہ سے مریدوں کو یا قاعدہ  
ظاہری تعلیم دینا بھی پسند نہیں فرماتے  
بلکہ انہیں بالذاتی تنظیم کا حکم فرماتے ہیں

محمد حسین مراد آبادیؒ نے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے بزرگوں میں حضرت نانوتویؒ کا بھی تذکرہ  
کیا ہے یہ تذکرہ اگرچہ ہنایت مختصر ہے لیکن اس میں تذکرہ نگار نے حجۃ الاسلام کی سیرت  
کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور موصوف کے عادات و اطوار گفتار و کردار علم و فضل  
کلمات ظاہری و باطنی سب ہی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس مختصر تذکرہ سے حضرت ممدوحؒ کی زندگی کے بعض ایسے معنی گوشے بھی سامنے آتے  
ہیں جن کے ذکر سے حضرت نانوتویؒ کی ضمیمہ سوانح عمریاں بھی یکسر خالی ہیں اور اس اعتبار سے  
ان کی سیرت پر یہ ایک ہنایت جامع بڑا بصیرت افروز اور بہت ہی حقیقت پسندانہ نمبرہ  
ہے اور یہ اس امر کا شاہد عدل ہے کہ جب حضرت نانوتویؒ کا کاروان عمر چونتیسویں ہنری  
طے کر رہا تھا حضرت موصوف کا شمار کبار علماء ہی میں نہیں بلکہ اس دور کے کبار اولیاء اللہ  
کے زمرہ میں بھی ہونے لگا تھا۔ اس تذکرہ میں حضرت نانوتویؒ کی سیرت کے جن پہلوؤں پر

لے محمد حسین مرحومؒ نے چشتیہ صابریہ سلسلہ کے سب ہی بزرگوں کا انوار العارفین میں تذکرہ  
کیا ہے لیکن تعجب ہے کہ حضرت گنگوہیؒ کا تذکرہ ان سے رہ گیا۔

محمد بن مراد آبادی نے روشنی ڈالی ہے وہ ایک غیر جاہل و نادان بیان ہونے کی وجہ سے عمومی توجہ کا مستحق ہے اس سے تذکرہ نگار کی فراست و بصیرت اور حق پسندی اور راست گفتاری پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

یہ تذکرہ اس لحاظ سے کہ حضرت نالوتویؒ کی حیات ہی میں چمپا تھا، خصوصاً اہمیت کا حامل ہے حضرت نالوتویؒ پر کام کا سلسلہ جاری ہے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

ہمارے اس مضمون سے اب حضرت نالوتویؒ کی سوانح و سیرت کے ماخذوں میں دو اور قدیم تر ماخذوں کا اضافہ ہوا تاکہ ادیبوں و بیادوں کی تعداد و کس جب کہ سوانح نگاری کے مقدمہ میں حضرت قاری طیب صاحب زید مجدہم نے بیان کیا ہے، کے بجائے بارہ تک پہنچ جاتی ہے جن میں ادلیت کا شرف اسی مختصر سے تذکرہ کو حاصل ہے۔

افسوس ہے کہ آجک تذکرہ نگاروں کی نگاہ اس نادر تذکرہ کی طرف نہیں گئی۔ اب پہلی مرتبہ اس تذکرہ سے حضرت نالوتویؒ کے حالات نقل کر کے پیش کرتے جا رہے ہیں، امید ہے کہ محمد حسین مراد آبادی نے حضرت نالوتویؒ پر جو کچھ لکھا ہے اس کو دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ موصوف کہتے ہیں

ذکر حضرت مولوی محمد قاسم صاحب

دے حضرت حامی خانہ خدا و نیاز روضہ	حضرت موصوف صاحب بیت اللہ
رسول اللہ اندو از دہائے شیوخ صدیقی	اور لائے روضہ رسول اللہ ہیں اور
قصبہ نالوتہ ہر تند عالم اند تلی و ربانی و	قصبہ نالوتہ کے صدیقی رسلے
حقانی و واقف اسرار شریعت و طریقت	شیوخ میں سے ہیں عالم تلی ربانی
اند قول و فعل وے بے ریا و بے	و عقلی ہیں اور واقف اسرار
تفع است و معرض از دنیا و دلرباب	شریعت و طریقت ہیں ان کا
آن با وجود اہل و عیال آزادانہ و مجرورانہ	قول و عمل نائش و تفع سے پاک
گنیز طریقی کنند و بقدر حاجت ضروری	ہو تہے وہ دنیا و دہا اہل تہا



دینی کار پر خود مقرر نہایت  
ولباس مولویانہ و شائخانہ نجی  
دارتدو بالکلف آشنا مقلد  
مذہب حنفیہ اندونیز مشرب  
چشتیہ بہشتیہ و اجازت تعلیم علم  
باطن پر چہرہ طرق از حضرت  
عالی امداد اللہ سلمہ اللہ وسند  
حدیث از شاہ عبدالغنی مجددی  
می دارند و مانند معتقدان و عارفان  
در میان سخن حقائق و معارف  
دور اثبات و جدوی کلام می گویند  
و بر شہود توحید شہودی انکار  
ندارند و در اکثر اوقات در  
شغل تنزیہ و تشبیہ خود را  
مشغولی می دارند و سماع غلبہ  
مزا میراگر بطریق امور اتفاقیہ  
پیش می آید انکار ندارند و از ایشان  
پرسیدم کہ در طریقہ حضرات جتہ  
غلبہ چشتیت است فرمود نہ  
کہ آن از حضرت شاہ عبدالباری  
رسیدہ است و تھے مراد آباد  
تکلیف عقل صاحب شیر علی

سے کنار کش رہتے ہیں عیب الدار  
ہونے کے باوجود آزادانہ اور مجرمانہ  
زندگی گزارتے ہیں اور ضرورت کے  
مطابق ہی دنیا کے کام کرتے ہیں۔  
اور مولویانہ اور شائخانہ لباس استعمال  
نہیں کرتے بلکہ سادہ اور بے تکلف  
رہتے ہیں حنفی مذہب کی تقلید  
کرتے ہیں اور چشتیہ بہشتیہ  
مشرب رکھتے ہیں اور چار دی سلسلوں  
کی اجازت حاجی امداد اللہ سلمہ اللہ  
اور سند حدیث حضرت شاہ  
عبدالغنی مجددی سے رکھتے ہیں اور  
محقق عارفین کی طرح حقائق و معارف  
بیان کرتے ہیں اور توحید و جدوی کے  
اثبات میں کلام کرتے ہیں اور توحید  
شہودی کے مشاہد سے بھی منکر نہیں  
ہیں اور اکثر تنزیہ و تشبیہ کے  
شغل میں خود کو مشغول رکھتے ہیں  
اداکیں بلا مزامیر سماع کی اتفاقیہ  
نویت پیش آجائے تو انکار نہیں  
فرماتے میں نے موصوف سے ایک  
مرحبہ دریافت کیا کہ آپ حضرات

تشریف آوردند و نیز بر مکان  
خانصاحب موصوف فروکش شدند  
روزے خانصاحب بار اقم نقل  
کردند کہ قوال بے مزامیر غنری  
گفت شنیدند و گرم شدند چون نظر  
ایشان بر بعضے ناواقفان از حال  
واسرار عارفان و بے خبران  
دید عاشقان کہ در اینجا حاضر بودند  
فرمودند کہ تاثیر ہر کس اشیء دار  
دمن اہل آن نیست، انتہی آ رہے  
انخوان زبان و مکان دران شرط  
است و باقی شروط آن در کتب  
قوم مرقوم است۔

سلمہ اللہ تعالیٰ

(صفحہ ۵۲۲)

میں چشتیت کا غلبہ رہتا ہے؟  
فرمایا ہاں یہ حضرت شاہ  
عبدالباری کا اثر ہے۔  
ایک دفعہ شیر علی خانصاحب کی  
عیادت کے سلسلہ میں مراد آباد  
تشریف لے جاتا ہوا۔ ایک روز  
کا واقعہ خانصاحب راقم سے  
نقل فرماتے تھے کہ ایک قوال نے  
بغیر مزامیر کے غنری چھیڑ دی مگر  
جوش میں آئے لیکن جب بعض  
ایسے لوگوں پر نظر پڑی جو اہل  
معرفت کے حال سے ناواقف  
اور عشاق کے درد سے بے خبر  
دہان موجود تھے تو فرماتے تھے ہر  
شخص کی تاثیر میں ایک اثر ہوتا  
ہے لیکن میں اس کا اہل نہیں ہوں  
انخوان زبان و مکان کا ہونا سماع  
میں شرط ہے اور باقی شروط  
سماع موفیاء کی کتابوں میں  
لکھی ہوئی ہیں۔

سلمہ اللہ تعالیٰ

(صفحہ ۵۲۲)

اسی طرح حضرت نالوتویؑ کے نیاز مندوں میں سے ایک بزرگ حافظ عبدالرحمن  
جھنجھازی بھی تھے انہوں نے ۱۸۸۰ھ میں جو حضرت نالوتویؑ کا سال وفات ہے ایک کُ  
فارسی میں سفینہ رحانی لکھی تھی جو ۱۸۸۸ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔  
نہیں ملتی ہے اس کے سفینہ دومی میں درویشانِ سعادت پیروہ کا تذکرہ ہے اس باب  
میں مرگ یاراں کے زیر عنوان سب سے پہلے حجت الاسلام مولانا محمد قاسم نالوتویؑ کا تذکرہ  
کیا ہے جس میں ان کا اہم قلم رکنے ہی کو نہیں کہتا، تذکرہ کیا ہے۔ لیکن نشرِ مسیر  
مرثیہ لکھا ہے۔ اور خوب لکھا ہے پڑھیے اور لطف لیجیے۔ فرماتے ہیں۔

پانچویں اپریل ۱۸۸۸ء چھ روز	۱۵ اپریل ۱۸۸۸ء کا دن بھی کس
قیامت و حشت بار امت کہ	تقد و حشت بار قیامت کا دن نکلا اور
رو نمود چہ ہنگامہ عشر سینہ فکد	کیا سینہ فکد ہنگامہ عشر بپا ہوا یعنی
است کہ پیش آمد اعی محب	دلنوا دوست اور سرایہ اعزاز و
دلنوا سرایہ اعزاز و امتیاز	افتخار امام الاتقیاء سرتاج فضلائے
امام الاتقیاء سراج العلماء	زمانہ تاج دین و ایمان کا گوہر و نشان
سرتاج فضلائے زمان و نشان	مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور
گوہر اکلیل دین و ایمان مولوی	اس سرایگاہ دینا سے جنت المادوی
محمد قاسم صاحب مرحوم و مغفور	کی طرف روانہ ہو گئے اور ہمارے
ازین سرایگاہ بجنّت المادوی	دلوں کو نشترِ غم سے زخمی کر گئے آپ
شستا نقد دل مارا از نشترِ اند	کی زندگی کے نورانی چہرہ کا نقاب
بشاقت و نقاب خفا آمدن	میں چھپ جانا حقیقت یہ ہے کہ
دیدن چہرہ نورانی حیات	زادہ دل عابدوں عالموں اور حکیموں
شان در حقیقت نور دیدنی صفت	کی صفوں کا پلٹ جانا ہے آپ کا
ناچان و عابدان و علماء	اس غم آگین و سوسہ گاہ سے گزر جانا

و حکم راست و گذشتن از مشا  
ادریں و سوس گاه و حرن آگین رفتن  
قافله سعادت منان و ریامت

در اصل سعادت و مرقاض روشن  
منیر، اور آفتاب سیمابز رنگوں  
کے قافلہ کا گذر جاتا ہے۔

گزایان تابان دل خورشید سیماست  
بحان اللہ چہ عالم باعلی ستودہ منش  
گزیدہ طبع عظیم الشان ممدوح عالم  
و عالمیان بود کہ در علوم ظاہر و شگ  
قدما و سلف و تازہ بہار گلستان  
تقدس و ہر گونہ معلومات خلف بود  
دل در پہلو پہچو آفتاب روشن و  
درخشاں داشتند کہ انوار اسطر  
الہیہ و راز مخفیہ بر آن تابان بود۔

بحان اللہ کیسے عالم باعلی پاکیزہ  
طینت، برگزیدہ طبیعت بلند  
رتبہ سارے جہان کا ممدوح  
علوم ظاہریہ میں متقدّمین سلف  
کے لئے باعث رشک و گلستان  
تقدس کی تازہ بہار اور خلف  
کی ہر طرح کی معلومات کا حاصل  
تھے پہلو میں دل آفتاب کی طرح  
روشن اور درخشاں رکھتے تھے

درموز ہنایا بہ بلاغت و فصاحت  
سبازہ می فرمودند کہ عوام ہم بہ اندک  
تقریر چاشنی از فہمیدگی می چیدند  
و بہرہ یاب از عوام معنی کہند و راز  
و حقیقہ می شدند، آئینہ دلش نمونہ  
قد رت و تواضعی کبریلے بود کہ  
مورد ہمسہ اسرار باطنی نور راز علوی  
دین جلوہ افرازے شہود بود۔ و  
گنجینہ سینہ پاکش خزینہ جواہر  
زداہر نہائے ایزدی و حقیقہ لاہوتی

کہ اسرار الہیہ کے انوار اور مخفی  
راز آپ پر ہویا تھے۔ اور  
راز ہائے ہنایا فصاحت و بلاغت  
کے ساتھ اس طرح بیان  
فرماتے تھے کہ عوام بھی تعوی  
سی تقریر کی روشنی سے سمجھ  
کی روشنی کا مزہ پالیتے تھے۔  
ادب پرانی گہری باتوں اور دقیق  
نازدوں سے بہرہ یاب ہو جاتے  
تھے آپ کا آئینہ دل اللہ کی قدرت

جلے بہا منیائے عطیہ آسمانی  
بود۔ ذات ملکی معاشش  
سراپا نور اسلام کہ در پردہ

صورت انسانی روشنی  
یافتہ، حیات تقدس ساقش  
شعشہ دین دایمان بود کہ خوشی

آسا بر سر جہاں و جہا نیاں  
تا فتنہ تابش فیض از زمین  
تا فلک الافلاک درخشید

بارش مکر منش گلزار درج  
و انقار امطروریان گردانید  
از جوش دریائے علوم گونا

گونش دشت ہر خار و جہل  
نادانی بسدل بہ چمنستان  
سعادت و تقویٰ گردید و از

خروشش عمان علم بود قلمرو نش  
دادی پانگہ سور خلق و جنش  
باطنی از مغیرہ ہمتی ناپدید گشت

گلستان شاداب ہمیشہ بہار  
ہندیب و شائستگی و زندہ  
روانی شدہ۔

از دوا پسین یوم آہنا حال دل

و توانائی کا ایک نمود تھا کہ سارے  
اسرار باطنی اور راز علوی جس میں  
جلوہ گر رہتے ہیں۔

اور آپ کا سینہ پاک کا گنجینہ  
اللہ کی نعمتوں کے قیمتی جواہر کا خزانہ  
اور بیش قیمت موتیوں اور آسمانی

روشن عطیہ کا دفیۃ تھائی الحقیقت  
آپ کی فرشتہ خصلت اور سراپا  
نور اسلام ذات انسانی صورت

میں جلوہ گر ہوئی تھی ان کی تقدس  
آب زندگی دین دایمان کے لئے  
ایک شعاع تھی، جو سورج کی طرح

دینا اور اہل دنیا پر روشن ہوئی تھی  
اور ان کے فیض کی تابانی سے زمین  
سے بیکر فلک الافلاک چمک اٹھے

اور ان کی بزرگی کی بارش کے زہد  
تقویٰ کے باغ کو سیراب کر دیں  
آپ کے غوناگوں علوم کے دریائوں

روانی سے جہالت و نادانی کا دشت  
پر خار، سعادت و تقویٰ کے چمنستان  
میں تبدیل ہو گیلے اور ان کے

ہو قلموں دریائے علم کے جوش سے

تا چہ گویم کہ نتوانم گفت مدادہ ہائے  
الم سینہ خراش را دہ سلک گفت  
کئے، چہ نتوانم گفت، مگر وہ چہ  
تقویٰ و صبر و ریاضت و انوارات  
کیشان را سبغ الاعتقاد، مایہ نشین  
حلقہ مطاوعت ادب و مگر وہ سعادت  
کوئی دالمی و لہارات دینی و دنیوی  
و تنزیہ و تنزیہ خلی و ملی اند عطا  
جاں نثار و مریدان خوش انقیاد بساط  
یوس، یزیم عقیدت ادب و اندیہ و مد  
پاکش گلشن ایمان لغات و سیرانی  
می یافت و از نور عین بخش میلے  
آفتاب اسلامی تافت ہر کہ او اید  
بدل و جان احکام اسلام و زبہ و کتب  
تقویٰ و طیلسان صداقت پوشیدہ  
یکے از مریدان ارادت پناہ و عقیدت  
منان صداقت و سنگاہ اعمال  
صالحہ دیکہار پندیدہ است کہ برا  
حصول شرف دارین و اقتباس انوار  
طیبات کو عین بیعت صادقہ است  
پاکش کر وہ پیوستہ پا بوس  
ملازمست می ماند و حضور دایمی را

بد خلق اور خدمت باطنی کی ہر غار  
دادی صلوٰۃ اہتی سے نیرت و  
نالود ہو کر تہذیب و شائستگی کا  
سدا بہار شاداب بہار بن گئی ہے  
ان کی وفات کے وقت سے حال  
دل کیا کہولی کیا ہے: کچھ کہا نہیں  
جاتا اور سینہ غلاش طم کے دالوں  
کو کسی شے سے بھی گفتگو کی گئی  
ہیں پرو یا تہیں جاسکتا نہ بد متقی  
پر ہیز بگایا اور مراض بزرگ نے  
بھی المعتقدوں اور نچتہ اعتقاد  
دالوں کی طرح ان کے حلقہ اطاعت  
میں کفارہ نشین بہتے تھے وہیں  
دنیا کی سعادت سے بہرہ  
مند ظاہری و باطنی لہاست سے  
آراستہ ترکید و تنزیہ سے  
بہرہ مند جماعت جاں نثار خام  
اور طاعت شعار مریدوں کی  
طرح ان کی جرم عقیدت کے  
زین بوس رہتی تھی ان کے دیکے  
پاک کے دیدار سے گلشن ایمان  
تروتازہ ہوتا اور سیرانی حاصل کرتا

اعزاز و مہمانت خود ہی پیداشت  
پیدا است کہ از پدر و دیگران  
ہستی مولوی اقلیم علم و عمل و کشور  
زہد و تقویٰ بے فرمان فرما دیران  
شد و ہر یک از آہنا فاحمہ رخصت  
خواندہ را ہی لامکان شد

یار ب چہ ملائکاں و ساکنان  
ملا را علی را ضرورت تعلیم ایمان  
و اسلام بود کہ بر لائے رہنمائی و ہدایت  
ایشان این بحر معرفت را خواندند  
یار ب چہ منبر و عطف و فردوسیماں  
از تاج بر بندہ گو فرزند  
زبان غالی بود کہ این کار را  
لا بر آن نشانند یار ب چہ بالا  
لشیں و فرشتگان چہ آواز

شیندن القریہ پذیرند  
عالم پاک گوہر را از فرسب  
جد کہ رہ با عرشیاں را بنیاد جہان  
بخشیدند یار ب چہ ملائکا و علیہ  
عشق تحقیق خواص عرفان بخوش  
آمدہ بود کہ پاس خاطر آہنا این  
مہر بہ فضل و کمال را از ہرم دینا

تھا اور ان کے روشن جہیں کے سے  
آفتاب اسلام کی منید روشن ہو  
جاتی تھی جس نے ان کو دیکھ لیا اس  
نے دل و جان سے اسلامی احکام  
قبول کر لئے اور لباس تقویٰ اور  
مداقت پہن لیا جو شرف دیرین  
کے حصول اور دونوں جہان کے  
الوار طیسے مند ہونے کے  
آپ کے دست پاک پر سچی  
بیدت کر کے ہمیشہ پالوس ملازمت  
رہتا ہے اور دعوائی حق کو اپنے  
لئے اعزاز و افتخار سمجھتا ہے۔ وہ  
مخلص مریدوں اور صائق غایت  
منوں میں سے اعمال صالحہ اور  
پسندیدہ کردار کا حامل ہوتا تھا۔  
ظاہر ہے کہ مولوی صاحب موصوفات  
کے صفت ہستی سے اٹھ جانے کی  
وجہ سے علم و عمل کی ولایت اور  
زہد و تقویٰ کی عظمت و برتری  
گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک  
فاحمہ رخصت پڑھ کر کہی لا مکان  
ہو گیا۔

برداشتہ در حلقہ روپیاں رسائی تہ

آہ ! ہزار آہ ! ز دنیا حوائیست ہر

از طعام ہائے نگارنگ امانہ ہر آلود

و خوشیست شیریں و خوش نشہ شیرین

مرگ حسرت آلودیافتے است

ششما و پیرفتا، لیکن از یاد کوم

قد پڑ مرده و باغیت روح پرور

فرا ت افراسنگر از طہ نراں افسرد

یارب ! کیا فرشتوں اور خدا

باشند وں کو ایمان و اسلام کی تعلیم

کی ضرورت تھی کہ جن کی رہنمائی اور ہدایت

کے لئے اس بحر معرفت کو دیاں

بلا گیا؟ یارب کیا فرشتوں کا ممبر

و غذا، صاف گو واضح بیان خیر و شر

نا ممکن سے عالی ہو گیا تھا کہ علم و بشر

آر اس کان کو اس پر لپکا کہ بٹھلایا گیا

سہ ؟ یارب کیا بالائینوں اور آسانی

فرشتوں کو تقریر و پند پرستی آرز

تھی کہ اس پاک گوہر عالم کو فرشتوں سے

الگ کر کے ہمیشہ کے لئے عرشوں

سے وابستہ کر دیا ہے؟ یارب

کیا فرشتوں کی معرفت کی یاری کیوں

کی تحقیق کا دریائے عشق جو شش ہی

آگیا تھا کہ ان کی خاطر اس آسان

نفل و کمال کے آفتاب کو دنیا کی بیم

سے اٹھا کر فرشتوں کے حلقہ میں

پہنچا دیا۔ آہ ! ہزار آہ ! دنیا ایک

دستر خوان ہے جو رنگارنگ مگنہ ہر

آلود کھانوں سے بھرا ہوا ہے

ایک شیریں ادھر پر نشہ خواب ہے



جس کی تعبیر حسرت آموز موت ہے، اے  
ایک خوش ناما افسرے فنا باطن ہے مگر فنا  
کی لہجے پر مردہ ہونے والا۔ اور روح  
پروردگار و فرحت افزا میں ہے جو خزانہ  
اشمسے مرجھا گیا ہے۔

## نغم

نہ مردہ است قاسم جہاں مردہ شد  
گل تازہ از باغ افسردہ شد  
بیک شمع گل شد جہاں شد سیاہ  
یہ ابر فنا رفت خشنودہ ماہ  
فنا ہست ہر چیز موجود را  
بقا ہست بس رب معبود را  
خدا را بقا دہمہ را فنا  
بجز او کے را نہ باشد بقا  
ہر آن کس کہ جاں زندہ داد بہ تن  
گل خوش ناما ہست آن دہن

صفت قاسم نہیں مرا بلکہ سالہ جہاں مر گیا ہے۔ باطن کا ایک تازہ پھول مرجھا گیا ہے۔ ایک شمع  
کیا گل ہوئی کہ جہاں ہی سیاہ ہو گیا ہے۔ فنا کے یادوں میں روشن چاند چو پ گیا ہے۔ ہر  
موجود چیز کے لئے قتب۔ بس رب مہو کے لئے صرف بقا ہے خدا باقی ہے۔ باقی سب فنا ہے  
اس کے سوا کون کے لئے بقا نہیں ہے۔ جو شخص زندہ جان بدن میں رکھتا ہے وہ چین کا ایک خوش پھول ہے

اس جگر سوز غم، اور سیدہ عود حادہ نے  
ہمارے دلوں پر ایسا پردہ رنگا رکھا ہے

ایں غم جگر سوز و حادہ سیدہ عود  
پردہ رنگا رکھا ہے ہمارے دلوں پر

کشیہ کہ دران گذراندیشہ نیست و  
 این تیرالم جل نگارند پیلو ہم مردوں  
 سو گزشتہ کہ از دوا و جب دلم  
 کے راجہ سکرت۔ افوس برا فوس  
 ست کہ شمع جہاں افروز در تاریکی  
 از بزم دین و اسلام بہ طرقتہ العین  
 بمرور قسم بیہودی علم و فضل از  
 جریدہ کائنات یہ کز لک فتا بہ چشم  
 زون برد، اریں آتش اند و مہر زو  
 شک کہ داشتیم ہم را بیو ختم و از  
 خدنگ آہ و دناک سینہ ہفت  
 وری فلک را دو ختم، دنا فہ ہائے  
 دنگ مٹام افروز ہر تمنا د آرزو  
 را در مجرایاس ماکتر کہ دم و بیاط  
 خودی و خودداری از الوان اندنہ  
 خود در نور دیدم، و بحدہ نیلگون بہر  
 چہرہ عروس ہتی فرو انداختم،  
 دلواسے ماتی در میدان زندگی بلند  
 افرا ختم۔ حدیغ برورینے است  
 کہ بزم یاران بر قاست و مینسے  
 غری و ساغر بیاط ہر سنگ جفا  
 شکست و رعدہ نگار لال، نہ خود

رکھا ہے جس میں کسی اندیشہ کا  
 گذر نہیں ہے اداس و دلگرا رنج  
 کا تیر پہلو کے پار ہو گیا ہے جس  
 کی ٹپس کی خبر میرے دل کے سوا کسی  
 نہیں ہے۔ افوس! افوس!  
 کہ تاریکی میں جہاں کو روشن کرنے  
 والی شمع دین و اسلام کی بزم سے  
 پل بھر میں بجھ گئی اور علم و فضل  
 کی بہترین تحریر قلم کے قلم سے  
 پلک جھپکنے میں مغلہ کائنات سے  
 محو کر دی گئی ہے غم کی اس آگ  
 نے جو خشک و تر میرے پاس  
 تقاسیم پھونک دیا آو و درو  
 ناک کی سوزش سے ساتوں سہا  
 کے سینہ کو میں نے سی دیا ہے  
 خودی اور ہر تمنا اور آرزو کے  
 دماغ کو معطر کرنے والی شک  
 کی تھیلیوں کو یاس و ناامیدی  
 کی بھیڑ میں جلا کر لاکھ کر چکا ہوں  
 اور خودداری کی بیاط دروں  
 پیٹ کر رکھ دی ہے۔ وجود  
 کی دہن کے رخا سے نیلگونی

لبستہ از بازار کون و فساد  
برقت و مال تہلے یار و ہوا  
دریں دشت پر خار کہ ناش  
زندگی ست بگناشت و نہال  
خوش شمر عزم خود را در چمن  
فر دوس بگناشت۔

یار ب بر باد برگزشتگان کہ از  
پیش مادر گزشتند رحم کن  
و غم معیت را نہ برقی چہا  
سوز آہ نیم شبی شیکو بیوز و چشم  
را آن سیلاب پر جوش وہ کہ  
ہمہ خس و فاشاک بزہ و عیا  
را فراموش و گمزدامت و فجائت  
را از چہر سیاہ مابشود۔

بیامر ز یارب مرا میں بندہ را  
تو آمرزگار است من زشت کلام

پیرہہ اتار زندگی کے میدان میں  
ماچی جھنڈا بلند کئے ہوئے ہوں  
افسوس! صد افسوس! کہ بزم یاران  
بر غارت ہو گئی اور مسرت کی مینا  
اور خوشی کا ساغر قلم کے پتھر سے  
چلتا چور ہو گیا اور جماعت عکساراں  
اپنا سامان اٹھا کر اس دنیا سے رخصت  
ہوا۔ اور میں اس دشت پر قاریا  
جس کا نام زندگی ہے ہے یار و مددگار  
چھوڑ گیا ہے اور اپنے ارادے کے  
اپنے پہلدار و رفعت کو چن فر دوس  
میں جا کر پوہا ہے۔

یار ب ہم پر اور ہمارے اسلاف  
پر رحم فرما۔ اور آہ نیم شبی کی برقی  
جہاں سوتے سخن معیت کو  
پوری طرح بھونک دے۔ اور  
آنکھ کے چشمے میں وہ جوش سیلاب  
عطا فرما کہ گناہ و معیشت کے سارے  
خس و فاشاک کو بہلے جانے اور  
ندامت و شرمندگی کی گہر کو بہار  
سیاہ چہرے سے دھو دے۔  
ندامت مدہ این سرا فگندہ را

حکیم عبدالرحمن حشر نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سفیدہ سومی جس کا عنوان ہے۔  
حکایات مختلف فوائد خیر مدت آمیز میں بھی حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا ہے۔  
لکھتے ہیں۔

شیر بیشہ فضل و کمال بوسے دلاؤ  
گلزار عشق ایزد و الجلال۔  
شمع شبستان طریقت و شریعت  
مہر سپہر حقیقت و معرفت عالم  
کامل دور وجود سمار شک حاتم  
بناب مولوی محمد قاسم صاحب نوریت  
مرفدہ از گزیرہ علماء و سنجیدہ  
فضلا و قصبہ نانوتہ پودہ است  
و منازل علوم گوناگون و نشیب و  
فراز روز فنون پو قلموں، بقدم  
ہمت و نیروے شریک خداداد  
نیکی و مودہ بود۔ اور اکان علوم  
و مخزن فنون باید گفت انچہ در  
توصیف و دانش اندیشہ بر نگارو  
بجا است و مرقد کہ تعریفش مرید  
آید زیبا است بر اسرار تصوف  
و صفائے باطنی از فیض و رہنمائی  
حاجی امداد اللہ صاحب عبود وافر  
داشت و در میدان درج و تقویٰ

فضل و کمال کے شیر عشق باہی کے  
گلزار کی بوسے دلاؤ طریقت  
شریعت کی رات کے شمع  
حقیقت و معرفت کا آفتاب عالم  
کامل بخش و سخاوت میں رشک  
حاتم جناب مولوی محمد قاسم صاحب  
نور اللہ مرقدہ۔ قصبہ نانوتہ کے  
برگزیدہ علماء و ادیبانہ فضلاء میں  
سے ہوئے ہیں گوناگوں علوم کے  
منازل اور ہر قلموں فنون کے  
نشیب و فراز کے روز انکی ہمت  
اور خلاد و طاقت کی بدولت ملے  
ہوئے تھے۔ ان کو معدن علوم  
اور خزائن فنون کہنا چاہیئے ان کی  
توصیف کا تب فکر جو کچھ لکھ سکے  
بجائے اور عینی بھی ان کی تعریف  
کی جگہ سے درست ہے۔  
حاجی امداد اللہ صاحب کے فیض  
و رہنمائی سے وہ تصوف اور

لوئے انا لا عیسری فی الفراشت  
تایش زمین و کاش درخشاں تر  
از برق خافت بود و تقیر بر پلن شیا  
ہر گونہ مشکلات علمی و حکمی را کاشت  
انچہ در ہمہ سمدیدہ و شفیوہ بود ہمہ  
محفوظ خاطر بود سینہ اورا نمود لوح  
محفوظ باید گفت دلائل آہل ارادہ اند  
و فیقتش را در رشتہ جاں باید  
سفت، از بس شیریں کلام و عذب  
البیان بودہ و گویے سبقت از  
ہمہ علمائے موجودہ زمان را بودہ  
بتاریخ پنج جلدی الاول ۱۳۴۷ھ  
یکہزار و دودصد و ہفت و نہ ہجری  
ازیں کار گاہ و کن فیکون رشت  
ہتی برداشتہ را ہی ملک جاوید  
شد نا گاہ نانوتہ و آرام گاہ و آپس  
قبہ دیوینداست۔

معار باطن کے اسرار پر کامل عبور  
رکتے تھے۔ میدان مدح و تقویٰ میں  
وہ بے مثال فرد تھے۔ ان کی ذکاوت  
و ذہانت کی روشنی بجلی سے بھی زیادہ  
درخشاں اور ان کی تقریر و لپیڈ علم و  
حکمت کی ہر قسم کی مشکلات حل کر کے  
رکھ دیتی تھی۔ ساری عمر جو کچھ دیکھا  
سناسب ان کو محفوظ تھا ان کے  
سینہ کو لوح محفوظ کا نمونہ کہنا چاہیے  
ان کے عقد و نیعت کے آہل ربوتوں  
کو رشتہ جانی میں ہر دنا چاہیے۔ وہ  
انہائی شیریں کلام اور خوش بیان تھے  
اپنے زمانہ کے تمام محضر علمائے گوسے  
سبقت لے گئے تھے۔ ۵ جلدی الاول ۱۳۹۶ھ  
کو وہ اس دنیا سے رخت سفر باندھ کر راسی  
ملک بقا ہوئے۔ ان کا پیدائشی وطن نانوتہ  
اور دائمی خواب گاہ دیوبند ہے۔

# امام عظیم ابو حنیفہ اور علم حدیث

(مولانا تقی الدین ماس ندوی، مظاہری)

## نام و نسب

نعمان نام، کنیت ابو حنیفہ، امام اعظم لقب، شجرہ نسب یہ ہے۔ نعمان بن ثابت بن زوطی عام طود پر امام صاحب کا عجمی القبل ہونا مسلم ہے۔ خطیب بغدادی اور مورخ ابن خلکان نے امام صاحب کے پوتے اسمعیل کی زبانی یہ روایت بیان کی ہے کہ ہم پر کبھی غلامی کا دور نہیں آیا ہم لوگ فارسی قتل کے ہیں۔ ہمارے دادا امام ابو حنیفہ رحمہ میں پیدا ہوئے۔ ثابت بچپن میں حضرت علیؑ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ انہوں نے ان کے امدان کے خاندان کے لئے دعا کی تھی۔ ہم کو امید ہے کہ وہ دعا بے اثر نہیں ہوئی بلکہ سن پیدائش رحمہ بھی بتایا گیا ہے بلکہ سکونت

کو کہ امام صاحب کا مولد و مسکن ہے جو اسلام کی وسعت و تمدن کا دیرپا پھر تھا۔ علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علم نبوت کے تین مراکز تھے، مکہ، مدینہ، اور کوفہ، مکہ معظمہ کے صدر معلم حضرت عبداللہ بن عباسؓ تھے اور مدینہ منورہ کے حضرت

عبداللہ بن عمرؓ اور کوفہ کے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ تھے۔ یہ حضرت علیؓ نے اس کو دار الخلافہ بنایا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کان اغلب قضا یا کا بالکوفۃ علیؓ کے بیشتر فیصلے کوفہ سے صادر ہوئے تھے۔ کوفہ آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہی میں قرآن و سنت کا دارالعلوم بن چکا تھا۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

ولما ذهب (علیؓ) الى الكوفة كان اهل الكوفة قبل ان ياتيهم قد الدين عن سعد بن ابى وقاص وابن مسعود وحذيفة وعمار روابي وغيرهم من اوسنة عمر الى الكوفة۔

جب حضرت علیؓ کوفہ تشریف لے گئے ہیں تو آپ کے وہاں آنے سے پیشتر سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت عمار، حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہم) سے (جن کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کوفہ روانہ کیا تھا) کو کہہ دیا کہ علم دین آچکے تھے۔

صحابہ کرام میں سے ایک ہزار پچاس حضرات جن میں چوبیس وہ بزرگ بھی ہیں جو غزوہ بدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے تھے، وہاں گئے اور سکونت اختیار کی۔

امام ابوالحسن احمد بن عبداللہ علی المرتضیٰؒ نے اس سے زیادہ تعداد بتائی ہے، ہیں کہ کوفہ میں ڈیڑھ ہزار صحابہ آکر اسیے شیعہ علامہ نوویؒ نے کوفہ کو دار الفضل والفضل قرار دیا ہے۔

تحقیق علم

امام صاحب میں سال کی عمر میں تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے ادب

۱۔ اعلام الموقنین

۲۔ مجتہد اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۳۷

۳۔ نہج السیاحۃ ص ۱۵۷

۴۔ فتح المغنی ص ۱۵۷

۵۔ فتح القدیر ج ۱ ص ۱۵۷

۶۔ شرح مسلم باب القسۃ فی الظہر

اداس کے بعد علم کلام حاصل کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد نقیبہ وقت امام حماد کے حلقہ درس میں شریک ہونے لگے۔ حضرت حماد جو مشہور امام اوقات دو وقت تھے بڑے بڑے تابعین سے استفادہ کر چکے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے استفادہ کیا۔ فقہ کا چلا آ رہا تھا اس کا مدار انہیں پر رہ گیا تھا۔ حضرت حماد کا انتقال سال ۱۸۰ھ میں ہوا۔

امام صاحب نے اگرچہ مختلف اساتذہ سے فقہ و حدیث کی تحصیل کی ہے۔ لیکن خصوصیت سے حضرت حماد کے تربیت یافتہ ہیں۔ کیونکہ ان کی محدث باقی نہ تھا جس کے سلسلے امام صاحب نے زانوئے شاگردی چبھ لیا ہو۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے امام صاحب کے شیوخ کی تعداد چار ہزار بتائی ہے بلکہ علامہ سیوطی نے تیش الصیفہ میں اور کردوسی نے مناقب ابی صیفہ میں امام صاحب کے شیوخ و اساتذہ کے نام گنائے ہیں۔ اور مولانا عبدالحق نے بھی التعلیق الحمد میں بہت سے شیوخ کا تعارف کرایا ہے۔

امام صاحب کے شیوخ کی ایک خصوصیت علامہ شعرانی کے اس بیان سے معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے جس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے اس کو خیارتا بعین سے حاصل کیا ہے، جس کی سند میں کوئی بھی راوی جہم یا کذب نہیں ہے۔ اگر امام صاحب کے مسلک کے دلائل میں کوئی ضعف بیان کیا گیا ہے تو وہ بالبعد کے رعاۃ کے لحاظ سے ہے۔ امام صاحب کے شیوخ فقہ و حدیث دونوں کے جامع تھے۔

### حرمین و غیرہ کا سفر

اس زمانہ میں حج علمی استفادہ اور افادہ کا بڑا ذریعہ تھا۔ تمام مالک اسلام کے گوشے گوشے سے اہل کمال و سمجھ میں وہاں آ کر جمع ہو جاتے تھے اور درس و اخلا کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ امام ابوالحسن مرغینانی نے بسند نقل کیا ہے کہ امام صاحب نے پچیس حج کئے تھے۔ لہذا

لے السنۃ و مکانہا فی التشریع الاسلامی از مصطفیٰ سباغی

۳ شرح سفر السعاده

۴ مسند امام از خواری

۵ مناقب الامام از موتقی ج ۱ ص ۲۵۳



حرمین کے شیوخ میں سے عطابن ابی رباح سے مکہ معظمہ میں اور سالم بن عبداللہ اور سلیمان سے مدینہ طیبہ میں خصوصیت سے حدیثیں روایت کی ہیں۔ امام محمد بن علی باقرؑ کی خدمت میں ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے حاضر رہے۔ علاوہ انہیں ۳۰۰ سے لے کر منقول عباسی کے زیادہ خلافت تک جو چھ سال کا عرصہ ہو تلے آپ کا مستقل طور پر قیام مکہ معظمہ ہی میں رہا۔ یہیں مرتبہ سے زیادہ بصرہ کا سفر کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام صاحب نے مکہ مدینہ، کوفہ، بصرہ، غرض کہ عراق و حجاز دونوں جگہوں کی روایت کو حاصل کیا۔

تلامذہ

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام صاحب کے تلامذہ کا احصاء دشوار ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ چنانکہ بعض ائمہ نے کہلے ائمہ اسلام میں اتنے شاگرد و تلامذہ کسی اور امام کے نہیں ہوئے علامہ کردری نے آٹھ سو فقہاء اور محدثین کو آپ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ ابن حجر کی کہتے ہیں کہ جس طرح فقہاء میں امام ابو یوسف و امام محمد و امام زفر و امام حسن بن زیاد وغیرہ ہیں۔ اسی طرح محدثین میں عبداللہ بن مبارک، لیث بن سعد، امام مالک اور سعید بن کلام اور صفیاء میں فضیل بن عیاض اور عاصم طائی جیسے ائمہ کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہے امام صاحب نے اپنے اصحاب و تلامذہ کی ایک مجلس مرتب کی تھی جس میں مختلف مسائل پیش کئے جاتے تھے۔ غور و فکر کے بعد جب کسی نتیجہ پر سب لوگ متفق ہو جاتے تو اس کو قلم بند کیا جاتا۔ یہ مجلس چالیس ارکان پر مشتمل تھی۔

زہد و تقویٰ

عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ میں نے کوفہ پہنچ کر دریافت کیا کہ یہاں پر سب سے زیادہ پارسا کون ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ ابو ضیف۔ خود انہیں کا بیان ہے کہ میں نے امام ابو ضیف سے

۱۔ عقود الجمان . ۲۔ مناقب الامام ج ۲۔ ص ۲۷۷

۳۔ مقدمہ اویس ص ۶۸

۴۔ حسن التفاضل از علامہ زاہد کوثری ص ۷۷

بڑھ کر کسی کو پارسا نہیں دیکھا۔ حالانکہ مال و دولت سے ان کی آزمائش کی گئی تھی۔ زور بخسری  
امام صاحب کے حالات بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ  
کے افعال و اقوال اور اخلاق اختیار کرنے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ  
کرام میں افضل اور علم و فقہ اور پرہیزگاری اور سخاوت میں سب سے آگے تھے۔ اسی طرح  
امام صاحب تابعین کی جماعت میں ہیں بلکہ

امام صاحب کی ایک اہم فضیلت

بخاری و مسلم اور ابونعیم نے حضرت ابو ہریرہؓ سے طبرانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ  
سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا۔ لو کان العلم  
بالشریقا لتناولہ اناس من ابناء فارس بلکہ اگر علم شریا کے پاس ہو تو فارس کے کچھ  
لوگ اس کو حاصل کر لیں گے۔ آپ کی اس پیشین گوئی کے اولین مصداق علامہ سیوطی، ابن حجر  
مکی اور عام طور پر علمائے امام ابو حنیفہ کو قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اپنے ایک مکتوب  
میں لکھتے ہیں: فقیر گفت امام ابو حنیفہ دریں حکم داخل است۔ فقیر یعنی شاہ صاحب نے فرمایا  
کہ امام ابو حنیفہ اس حکم میں داخل ہیں۔

ذکاوت و ذہانت

امام صاحب کی ذکاوت و طباعی مشہور ہے۔ علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں۔ کان فی الذکیاء  
بنی آدم یعنی امام ابو حنیفہ کا شمار دنیا کے منتخب الذکیاء میں ہے۔ امام صاحب کی ذہانت  
و فرست کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ محمد انصاری کہتے تھے کہ امام ابو حنیفہ کی ایک ایک حرکت  
حتیٰ کہ مات چیت میں دانشمندی کا اثر پایا جاتا تھا۔ علی بن عاصم کا قول ہے کہ اگر آدمی دنیا  
کی عقل ایک پلے میں اور دوسرے پلے میں حضرت امام ابو حنیفہ کی عقل رکھی جائے تو امام صاحب  
کا پلہ بھاری ہو گا۔

## امام صاحب کا علمی مرتبہ

امام دیکھ فرماتے ہیں کہ میں کسی عالم سے نہیں ملا جو امام ابو حنیفہ سے زیادہ نقیب ہو اور ان سے بہتر نماز پڑھتا ہو۔

نصر بن شہیل کہتے ہیں کہ فقہ سے لوگ غافل تھے تو امام صاحب نے بیدار کیا۔ اس کو مرتب ملخص کیا۔ سفیان ثوری نے ایک شخص سے فرمایا جو امام صاحب کی مجلس سے واپس آیا تھا، کہ رو زمین کے سب سے بڑے نقیبہ کے پاس سے واپس آرہے ہو، خارجہ بن سہیب اور عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ علم و عقل میں امام ابو حنیفہ کی نظیر نہیں (علم سے مراد اس دور میں علم حدیث و روایت ہوتا تھا۔ سفیان بن عیینہ کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ اپنے زمانہ کے عالم تھے اور اس کے بعد امام شافعیؒ اپنے زمانہ کے عالم ہوئے اور اس کے بعد امام ابو حنیفہؒ۔ یعنی یہ تینوں اپنے اپنے دور میں بے مثال تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے کہ امام ابو حنیفہ کی نظیر میری آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ امام شافعی فرماتے تھے کہ جس کو فقہ کی معرفت منظور ہو وہ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا واسن پکڑے۔

## امام صاحب کی تابعیت

امام صاحب کے آغاز شباب تک چند صحابہ زندہ تھے ایسے حضرت انسؓ بن مالک جو حضورؐ کے خادم خاص تھے، سلفہؒ میں وفات پائی، ابو طفیل عامر بن وائلؒ نے سلفہؒ میں عہدہ بن بسر المازنی نے سلفہؒ میں وفات پائی۔ بہر حال جمہور محدثین و محققین کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ امام صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جمال پیغمبری دیکھنے والوں کے دیدار سے عقیدت کی آنکھیں روشن کی تھیں۔ بعض حضرات نے امام صاحب کی تابعیت کا انکار کیا ہے لیکن جمہور محدثین و محققین کا اس پر اتفاق ہے، علامہ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت انسؓ بن مالک کو بار بار دیکھا، شیخ الاسلام حافظ بن حجرؒ کہتے ہیں کہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانے میں کوفہ میں کئی صحابہ کرام جمع تھے۔ لہذا امام صاحب کا طبقہ تابعین میں ہونا ثابت شدہ حقیقت ہے۔

یہ فیضیت دیگر ائمہ میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ جیسے امام مالک و امام ادزاعی وغیرہ صاحب اکمال بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب نے ۲۶ صحابہ کرام کو دیکھا ہے۔ اس نے تمام محدثین کبار مثلاً حافظ بن حجر، علامہ ذہبی، علامہ نووی زین الدین عراقی ابن جوزی، دارقطنی وغیرہ نے امام صاحب کی تابعیت کو تسلیم کیا ہے۔

البتہ بحث کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آیا امام صاحب کا کسی صحابی ثبوت روایت کرنا ثابت ہے یا نہیں؟ بعض علماء نے صحابہ ثبوت سے امام صاحب کی روایات کا انکار کیا ہے، امام دارقطنی ۳۸۵ھ نے کہ ہے۔ لم یلق ابو حنیفہ احداً من الصحابة انه ملای انساناً بعینہ ولم یسمع منہ سے ابو حنیفہ نے کسی صحابی سے ملاقات نہیں کی مگر سیرت الشریفہ کو دیکھا ہے لیکن ان سے سماع حاصل نہیں ہے۔ خطیب بغدادی نے بھی دارقطنی سے پورا اتفاق کیا ہے، لکھتے ہیں لا یصح لابی حنیفہ سماع من انس بن مالک سے اس نے ان کے بعد عام طور پر علماء نے انہیں کی تقلید کی ہے۔ تعجب ہے حافظ ابن حجر جیسے محقق نے بھی ان دونوں سے افطالت نہیں کیا، حالانکہ سان المیزان میں ترجمہ عائشہ بنت عمرو کے تحت یحییٰ بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "ان ابا حنیفہ صا الی سماع عائشہ بنت عمرو تقول سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اکثر جند الشام لجلود لا آکلہ ولا احرمہ"۔ بیئک ابو حنیفہ (صاحب البرائی) نے حضرت عائشہ بنت عمرو کو فرماتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ مدائین

۱۔ تہذیب التہذیب

۲۔ مقدمہ ادب السنہ

۳۔ تبیین الصغیر

۴۔ تاریخ بغداد ۹ ص ۱۱۱

۵۔ سان المیزان ترجمہ عائشہ بنت عمرو ..... عنہ سان المیزان میں عبارت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یختم ہو گئی ہے حدیث کا متن ہم نے کنز العمال سے نقل کیا

ہر اللہ کا بہت بڑا شکر نڈیاں ہیں جس کو نہ میں کھاتا ہوں اور نہ میں حرام کہتا ہوں۔ یہاں امام صاحب کا حضرت عائشہ بنت جحش سے سماح واضح طور پر ثابت ہے ان کے علاوہ متعدد صحابہ سے امام صاحب نے حدیثیں سنیں بنظر اہل انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ امام مسلم کے نزدیک ایک معاصر اگر اپنے معاصر سے بطریقہ عنعنہ روایت کرے تو وہ روایت متصل بھی جاتی ہے اور امام بخاری کے نزدیک ایک مرتبہ ملاقات کا ہونا بھی اتصال کے لئے کافی ہے اس لئے دونوں کی شرطوں پر امام صاحب کا صحابہ سے روایت کرنا اتصال پر معمول ہوگا۔ اس لئے عبدالقادر قریشی، ملا علی قاری، حافظ بدرالدین عینی وغیرہ نے اس کو تسلیم کیا۔ امام صاحب اور امام مالک

خطیب بغدادی نے امام مالک کے اقوال جرح امام صاحب کے متعلق اپنی تاریخ میں نقل کئے ہیں، مگر شارح موطا ابوالولید یحییٰ مالکی فرماتے ہیں کہ ان کا انتساب امام مالک کی طرف صحیح نہیں بلکہ سعدی، صمیری، موثق اور خوارزمی نے بیان کیلئے کہ امام مالک امام صاحب کی کتابوں یعنی ان کے تلامذہ کی کتابوں سے استفادہ کرتے تھے۔

بعض علماء نے امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے تلامذہ میں شمار کیا ہے علامہ ذہبی نے اشہب کا قول نقل کیا ہے۔

دأیت ابا حنیفۃ بین حیدر مالک کا نصیبی بین حیدر ابیہ میں نے امام ابو حنیفہ کو امام مالک کے سنیے اس طرح دیکھا جس طرح بچہ باپ کے سامنے ہوتا ہے۔ اگرچہ امام صاحب کے لئے یہ بات کوئی عار کی نہیں ہے بلکہ یہ تو غایت کسر و انگار کی دلیل ہے، مگر علامہ کوثری نے اقوام المساک میں اس واقعہ کی تردید کی ہے۔ خما یرو بہ الذہبی فی ترجمۃ مالک فی طبقات الحفاظ عن اشہب لا یصح الا اذا کان فی حق حماد بن ابی حنیفۃ دون ابیہ لان میلاد اشہب سہلہ کہا یقول ابن یونس الخ "۱" علامہ ذہبی نے طبقات الحفاظ میں امام مالک کے ترجمہ میں اشہب

کی جو روایت نقل کی ہے وہ صحیح نہیں ہو سکتی ہے، ممکن ہے کہ امام صاحب کے ماحیزوں کے حملہ کے سلسلے میں ان کا یہ بیان ہو۔ اس لئے کہ اشہب کی پیدائش ۳۲۵ھ میں ہے اور امام صاحب کا سن وفات ۳۵۸ھ ہے۔ گویا امام ابو حنیفہؒ کی وفات کے وقت اشہب کی عمر ۳۳ھ سال سے زیادہ کی نہ تھی۔ پھر امام صاحب کے بارہ میں ان کا اس طرح کا کوئی بیان کیونکر جمع ہو سکتا ہے۔ علاوہ انہیں اشہب کی پیدائش مصر میں ہوئی تھی تو اس عمر کے بچے کے لئے مصر کے سفر کر کے مدینہ جانا اور امام مالک کی مجلس میں امام صاحب کو دیکھنا ناقابل فہم ہے۔ بلکہ امام صاحب کا امام مالک سے حدیث کی روایت کرنا بھی خود محتاج ثبوت ہے۔ حتیٰ کہ حافظ ابن حجر نے النکت علی مقدمۃ ابن الصلاح میں لکھا ہے، ان ابا حنیفۃ لم تثبت روایتہ، عن مالک ما ننہا ودرہ الدارقطنی ثم الخلیف فی السواۃ عنہ لروایتین وقتا لہما ہما سنادین فیہما مقال وہما لم یلتزما فی کتابیہما الصلحۃ۔ امام صاحب کا امام مالک سے روایت کرنا ثابت نہیں ہے۔ دارقطنی اور ان کے بعد خلیفہ نے امام مالک کے رواق میں صرف دو روایتوں کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ کو شمار کیا ہے اور دونوں کی صحت میں کلام ہے اور خود دارقطنی اور خلیفہ نے اپنی کتابوں میں صحت کا التزام نہیں کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علامہ کوثری کا رسالہ اقوالہ مالک فی بحث روایتہ مالک عن ابی حنیفۃ وروایتہ ابی حنیفۃ عن مالک۔۔

ماخذ علم

خلیفہ بغدادی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ امیر المومنین ابو جعفر نے امام صاحب سے دریافت کیا کہ آپ نے کن صحابہ کا علم حاصل کیا ہے تو امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں سے علم حاصل کیا ہے

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مذہب حنفی کی بنیاد عبداللہ بن مسعود کے فتاویٰ حضرت علیؓ کے قضایا و فتاویٰ اور قاضی شریح وغیرہ قضاۃ کوفہ کے فتاویٰ پر ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے ان حضرات کے آثار کو سامنے رکھ کر استنباط و استخراج سائل کیا۔ نیز امام ابو حنیفہؒ ابراہیم نخعی اور ان کے تلامذہ کے مذہب سے بہت کم انحراف کیا کرتے تھے، ابراہیم نخعی کے مذہب پر تخریج مسائل میں امام صاحب کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ شرعی مسائل کے دیوہ تشبیہ میں بہت ہی دقیقہ نظر واقع ہوئے تھے۔

شیخ ولی اللہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔

اگر ہم ہمارے قول کی حقیقت پر تکیہ نہ کرتے تو ابراہیم نخعی کے اقوال کتاب الاما لمحمد اور جامع عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ سے نکال لو اور ملا کر دیکھو تو شاہدی کسی جگہ اختلاف پاو گے، اور اگر کسی جگہ اختلاف ہے تو فقہائے کوفہ کے خلاف نہ پاو گے یہ

امام صاحب نے فقہ اسلامی کی ترتیب و تدوین میں جو عظیم الشان مجددانہ خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج بیان نہیں ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ امام صاحب نے جس قدر مسائل مدون کئے ہیں ان کی تعدد بارہ لاکھ ستر ہزار سے زائد ہے یہ

امام صاحبؒ کی وفات

حاکمان نبوت میں واقعہ کربلا کے بعد متعدد افراد نے انقلاب حکومت کی کوشش کی، محمد ذوالنفس الزکیہ نے مدینہ طیبہ میں اور ان کے مشورے سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کوفہ میں منصور کے خلاف طم بغاوت بلند کیا۔ امام صاحب نے بر ملا ان کی حمایت کی، مشہور ہے کہ منصور نے امام صاحب کے سامنے منصب قضا کی پیشکش

لے الاضافۃ فی جلب الاختلاف

لے الاضافۃ فی جلب الاختلاف

نویسٹر

۷۷

الرحیم جہاد آباد

کی تھی، مگر امام صاحب نے انکار کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں منصور نے ۱۲۱۷ھ میں قید کر دیا۔ مورخین کا خیال ہے کہ منصور نے ان کے فلاح جو سخت کارروائی کی اس کی وجہ عہدہ قضا سے انکار دینا تھا بلکہ محمد داہلہ بیہم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا بہ حال پہلے خبری میں منصور نے آپ کو زہر دلوادیا۔ جب اس کا اثر اہم صاحب نے محسوس کیا تو بچہ میں چلے گئے اور اسی حالت میں رجب ۱۲۱۷ھ میں وفات پائی۔

انا لله وانا اليه راجعون

اولاد میں سفیر ایک صاحبزادہ سے حماد تھے۔

## ملحات

شاہ ولی اللہ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے اس میں وجود سے کائنات کے ظہور تمدلی اور تجلیات پر بحث ہے یہ کتاب مرصعے ناپید تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخہ کی تصحیح اور تشوکی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت ۲ روپے



## بیسویں صدی میں اسلام

محمد صغیر حسن معصومی

بیسویں صدی کے ذہنی ارتقاء اور سائنسی ایجادات سے متاثر ہو کر ہر جدید فلسفہ کا عالم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ضروریات زندگی کے ساتھ ساتھ اعتقادی نظریوں اور مذہبی یا الہامی کتابوں کی تعلیمات کو بیسویں صدی کے محاورات اور اصطلاحات کے مطابق بیان کیا جائے۔ بظاہر یہ ادعا نہایت معقول اور مستحسن ہے مگر قابل غور امر یہ ہے کہ ہماری الفاظ و محاورات میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اس کا تعلق اصول و مفاد سے کہاں تک ہے؟ تبدیلی بعضی اضافہ تو قابل قبول اور واضح ہے مگر مفاد و افعال کی تبدیلی کسی طرح قابل قبول نہیں لغوی معانی کا استعمال مترادفات و ہم معنی الفاظ میں اختلاف کو ظاہر کرتا ہے مگر بالکل اختلاف یا اس قدر اختلاف سمجھنا کہ معنی بدل جائیں بالکل نیا معنی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انفرادی طور پر ہر فرد اپنے عقیدے کا اظہار کرتا ہے۔ اور اپنے طور پر اپنی بساط بھر تعلیمات اسلامی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جس کو جفا علم ہوتا ہے اسی قدر وہ مذہبی تعلیمات کو سمجھنے پر قادر ہوتا ہے اس مذہبی تدبیر و فہم کے لئے تربیت بے حد ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ تربیت کو ناگزیر سمجھا جاتا ہے تعلیم سے جو سوئی چٹے نشوونما پاتے اور بھرتے ہیں تربیت ان کی آبیاری کرتی ہے اور وہ واضح تر ہوتے جاتے ہیں تربیت کے فقدان سے تعلیم کے

اثرات صرف زائل ہی نہیں ہوتے بلکہ شر و فساد کے موجب بنتے ہیں جن کو ضلال و گمراہی سے تعمیر کیا جاتا ہے۔

ابتداءً آفرینش سے انسان ترقی کا شیلہ رہے اور ہمیشہ ترقی سے ہلکارا ہوتا آیا ہے۔ علمی فنی اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہبی عقائد میں بھی ترقی کے شاہراہ پر ہمیشہ گامزن رہا۔ غرض ارتقاء و ترقی نیز ترقی پسندی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ مگر اس ترقی کا مفہوم کمال تک پہنچانے ہر دور میں انسانیت کا وجود لابدی ہے اور ضروری ترقی کا مطلب دائرہ انسانیت سے خوردہ کس طرح سبھا نہیں جاتا انسان ہزار ترقی کر جائے فرشتہ نہیں کہلا سکتا، البتہ انسان کامل بن سکتا ہے کہ یہی لقب اس کو زیب دیتا ہے۔

آج سے تقریباً چودہ سو برس پیشتر اسلام نے اولین بار ایوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کمال تک پہنچایا تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دیں اناریں اور تمہارے لئے اسلام کو بطور دین پسند کیا۔ کا اعلان کیا۔ ہر زمانے اور ہر قوم میں اللہ تعالیٰ نے رہنا اور پیغمبر پیدا کیا وہی نبی بھی اور لوگوں کی ہدایت کو رسول بھیجے۔ پیغمبروں کا یہ سلسلہ لامتناہی نہیں ہو سکتا تھا اس زوال پذیر دنیا میں رشد و ہدایت کے سلسلہ کو بھی کسی حد پر اختتام کو پہنچنا تھا۔ وہی و رسالت کی تکمیل پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ کی گئی، آپ کو خاتم النبیین کہا گیا اور خداوندی تعلیمات کو قرآن پاک کے ذریعہ میں عالمگیر تعلیمات بنایا گیا۔ ان تعلیمات کے عمل ہونے کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک میں بہم پہنچا گیا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے قرآن پاک کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کو اپنے کردار و گفتار میں محفوظ کر لیا۔ اس طرح آج کوئی معقول طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ صلوة کی صورتیں واضح نہیں لہارت کا بیان مکمل نہیں زکوٰۃ کا مفہوم مبہم ہے، روزہ کی صورت ناممکن العمل ہے حج کے طریقے غیر واضح ہیں۔ قرآنی احکام، امار و نواہی تو شیخ طلب میں کسی کی یہ بات معقول بھی ہو سکتی ہے کہ اس صنعت و حرفت کے دور میں زمانہ کے پانچ اوقات ناممکن العمل ہیں اور نماز کے خصوصی صنعتیں فرسودہ ہیں۔

روزے کی فرضیت کی ضرورت نہیں زکوٰۃ کے مدین، نصاب میں نیز اس کی ادائیگی میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ اس طرح عورتوں کے بیشتر عورت کی حاجت نہیں، مردوں کا لباس کافی ہے۔ نکاح وراثت حدود قصاص محض مذہبی فرسودہ الفاظ ہیں۔ کیونکہ ایسے اجماعی فیصلوں کے صادر کرنے سے پہلے لفظ اسلام کو خیر باد کہنا واجب و فرض عین ہو گا۔ ترقی پسند مفکرین کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ آج قدیم بدل گئی ہیں نئی ایجادات نے یہ حشر برپا کر دیا ہے کہ تخلیق عالم کے لئے کسی خالق کی ضرورت نہیں اور نہ خیر و شر کی حقیقت کچھ باقی رہی ہے۔ کیونکہ ساری چیزیں یا خود رو ہیں یا انسان کے مساعی کے نتیجہ۔ خود رو اشیاء قدرتی طور پر عناصر کی زیادتی کی اور مختلف امتزاج و اختلاط سے وجود میں آتی ہیں اور پھر نیا روپ دھار لیتی ہیں۔

اس طرح کئی نئے حوادث و انکار میں انسان کی تسخیری قوتیں محدود نہیں البتہ اتفاقی حادثات ان کے تسخیری منصوبوں پر ضرور پانی پھر دیتے ہیں اور ان کو ان حادثات کو اتفاق کہہ کر سکون کے سوا کوئی چارہ نہیں ملتا۔ اس طرح قدروں کی تبدیلی کا دعویٰ بھی مضحکہ خیز ہے کذب کی مذمت آج بھی کی جاتی ہے، صداقت کو آج بھی سراہا جاتا ہے یہ تبدیلی ضرور واقع ہوئی ہے کہ بیسویں صدی کا مفکر کذب کو مصلحت اور چالوسی نیز چالاک کی جیسے الفاظ سے تعبیر کرنا چاہتا ہے مگر یہ تعبیر تاہم عنکبوت سے بھی زیادہ بے حقیقت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ افلاطون و ارسطو کے افکار اب دقیانوسی ہو کر رہ گئے ہیں، تحقیقات اپنا قدم آگے بڑھائے جا رہی ہے مگر اصول موضوعہ وہی ہیں جو پہلے تھے۔ بنیادی کالبد اور انسانی افکار کے ڈھانچے اب بھی وہی ہیں۔ جو پہلے تھے البتہ رنگ و روغن اور گوشت و پوست کی فردانی سے ڈیل ڈول میں نمایاں فرق ظاہر ہے، مگر یہ فرق طبعی فرق نہیں اور نہ وضعی فرق ہے یہ صرف عارضی اور انفرادی فرق ہے جس کا انکار جہل و عبث ہے۔

غرض مخلوق کی عبارت و تفکیر میں ہر آن تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور ارتقاء لمحہ بہ لمحہ نمایاں ہے، لیکن الہامی اور ربانی عبارت و الفاظ کی عالمگیریت کا تقاضا ہے کہ وہ ہر زمانے اور ہر قوم پر یکساں صادق آئے۔ اس اطلاق یا صل و صدق میں افراد و اقوام نیز زبان و مکان

کی ہم آہنگی ممکن ہے لیکن نفس الہامی عبارت اور ربانی نفس کے معنی و مفہوم میں فرق نہیں ہو سکتا کہ ایسا فرق الہامیت وحی اور ربانیت کے منافی ہے۔ باب اجتہاد کے کہلا ہونے کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہے کہ متن کی عبارت دلالت اقتضاء و اشارے کے مفہوم میں تغیر و تبدل کیا جائے، الفاظ و عبارت کے نئے معنی بتائے جائیں جن کا استعمال لذت سے ثابت نہ ہو، جن کا وجود اصطلاح میں نہ ہو کسی زبان میں نیز کسی زمانے میں کوئی لفظ غیر اصطلاحی معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا، اگر استعمال کیا جائے تو اہل زبان اس استعمال کو مردود قرار دیتے ہیں۔ ہاں! جس مفہوم کے لئے کوئی لفظ موجود نہ ہو تو اس کی ادائیگی کے لئے نئے الفاظ کے استعمال کرنے کی گنجائش ہے اور اس طرح کی ادائیگی کو اجتہاد کا نتیجہ کہتے ہیں۔ اس قسم کا اجتہاد ہر زمانے میں ہر قوم میں رائج اور پسندیدہ رہا ہے آج مشرقین موجودہ حالات کے پیش نظر جب کہ ہماری ترقی ہماری زیرت، ہماری بقا اور ہماری غوراک، نیز ہماری تعلیم غیروں کی امداد کے دست نگر ہے ہماری عقیدے اور دین کو دین کو بھی غیروں کا دست نگر بنانا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اس زبوں مالی میں جس کی وجہ سے ان کی تعداد کی کثرت کے انداز پھر تعلیمات اسلام سے بیگانگی ہے اسلام کو ہف ظامت قرار دیتے ہیں اور مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی زوال کا باعث اسلام اور اسلام کی تعلیمات کو بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مسلمان چونکہ تیرہ سو برس کی پرانی تعلیمات کو اپنے سے چمٹائے رہے اس لئے ان کا زوال ہوا، آج ان کا مذہب ان کے لئے باعث و بطل ہے مشرقین کی یہ بات ان کے تجربے اور ان کے اپنے حالات کے تحت ایک حد تک صحیح سمجھی جاسکتی ہے، کیونکہ سارا یورپ اور اس فسرع باشندگان امریکہ جب تک اپنے دینیانسی اور یورپ کے مذہبی عقائد کے پابند رہے تا موران اسلام کے آگے ذلیل و خوار ہے جو جو مسلمانوں کے افکار و تعلیمات سے روشناس ہوئے عیسوی اور یہودی تعلیمات اور کلیسا کی آمریت کے خلاف آواز بلند کرتے رہے، اور اسلامی مساوات و اخوت کو اشتراکیت سے موسوم کیا۔ اجتماعی تعاون اور امانت و دیانت کو اپنا کر یورپ میں علم و عمل کا غفلہ اعداد اسلام نے بلند کیا۔ اور جب اپنے اشتراک عمل تعاون و بہر دی سے سارے عالم پر چھا

گئے تو خود اپنے استادوں کو یہ دینے لگے کہ عیسائی تعلیمات کو چھوڑ کر ہم ترقی کے نام پر پیچھے، نیز دین عیسوی کے نعروں اور انجیل کی عبارتوں کی توجیہ ترقی پسندی کی روشنی میں کرنے کی وجہ سے ہم فخر عالم بنے، مسلمانو! آؤ تم بھی اپنے دین کی حق تعبیر کرو، تشرآن کو بیسویں صدی کے رنگ و روپ میں سمجھنے کی کوشش کرو تاکہ ترقی سے ہم کنار بنو! اس کے برعکس مسلمانوں کی تاریخ یہ واضح کر دیتی ہے کہ جب تک مسلمان تعلیمات اسلام پر عمل پیرا رہے دنیا کے مابینا بنے رہے اور جب سے ان تعلیمات سے بیگانہ بنے ہر طرح کی گندگی میں مبتلا ہوئے، قومیت اور محبت کے گرفتار ہوئے، سنی اور شیعہ اور طرح طرح کے فرقوں میں بٹ گئے عالم اسلام کی افرا تفری دیکھ کر اقبال مرحوم کو کہنا پڑا۔

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو

اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی

تو اے شرمندہ سافل اچھل کر بیکراں ہو جا

عبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیسرے

تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پر نشان ہو جا

بیسویں صدی جہاں علمی ترقی سائنس ایجادات کے لئے شہتہ رکھتی ہے۔ رہتی دنیا تک نقالی کو فنکاری بنانے کے لئے بھی مشہور رہے گی جب حکماء و عقلا حقیقت کی دریافت اور اصل عناصر کے ادھاک پر نازاں ہوتے ہیں تو بیسویں صدی کے ترقی پسند نقالی کو اپنا طرہ امتیاز اور عیاری و عریہ سازی کو فن کا کمال سمجھتے ہیں غرض ریا ان کا حاصل زندگی ہے اور خود آرائی اصل مقصد۔

(مسل)

## تَقْدِیْرٌ وَبَیْرٌ

### ارمغان سلیمان

مجموعہ کلام حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام غزالیؒ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ کلام، فلسفہ، منطق اور جملہ علوم و فنون میں کمال حاصل کرنے کے باوجود انہیں آخر میں طمانیت قلب تصوف ہی میں ملی تھی۔ وہ اس زمانے کی سب سے بڑی اور مرکزی درس گاہ نظامیہ بغداد میں مدرس تھے اور اہل علم کا ان کی طرف رجوع عام تھا۔ بحیثیت ایک عالم کے ان کی یہ شان تھی کہ وزراء اور امراء تک ان کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتے تھے، ان کے درس میں علماء کے علاوہ امراء و مدسا، حاضر ہوتے تھے۔ لیکن ایک وقت آیا کہ ان کی طبیعت اس شاندار علمی زندگی سے اچاٹ ہو گئی اور وہ تلاش حق میں نظامیہ کی مدرسے وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر بغداد سے نکل کھڑے ہوئے۔ امام صاحب کہتے ہیں کہ میں نے مشکائین باطنیہ اور فلاسفہ کے ہاں حق ڈھونڈا، لیکن ان کی کتابیں مجھے یقین نہ بخش سکیں۔ سب سے آخر میں میں نے تصوف کی طرف توجہ کی اور اس فن کی کتابیں پڑھیں، لیکن چونکہ یہ فن دراصل علیٰ فن ہے اس لئے صرف علم سے کوئی نتیجہ نہیں حاصل ہو سکتا تھا۔ اور علی کے لئے ضروری تھا کہ زہد و ریاضت اختیار کی جائے۔ امام صاحب نے بغداد کو الوداع کہا۔ اور شام کی راہ لی۔ پھر وہ مختلف

ملکوں میں گھومتے رہے اس دوران میں ان کی زندگی سرتاپا ریاضت کی تھی۔  
 زیر نظر کتاب ارمغان سلیمان پڑھ کر سبے اختیار امام غزالی اور ان کا د  
 تدریس سے قطع تعلق کر کے تصوف کے دامن سے وابستہ ہونا یاد آجائے  
 ایک زمانے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ برصغیر پاک و ہند میں اتنا ہی مشہور  
 جتنا کہ امام غزالی کے زمانے میں مدرسہ نظامیہ بغداد ہوگا۔ سید سلیمان صا  
 دارالمصنفین کے دماخ اور روح رواں تھے۔ اور علمی و تعلیمی مطلقوں کے علم  
 سیاسی اور حکومتی اداروں میں بھی ان کی عزت تھی۔ سلاطین، سلاطین ہی سے  
 کہ دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا۔ پوسے ملک میں اس کے نام کا غفلت  
 ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی سید سلیمان صاحب کی شہرت پھیل گئی تھی۔ انہیں  
 وفد خلافت کارکن چنا گیا، جو مولانا محمد علی کی قیادت میں ۱۹۲۰ء میں یورپ گیا تھا  
 ایک اور وفد کے قائد بن کر حجاز بھی گئے تھے ان کو جمعیت العلماء ہند کا صدر منتخب کی  
 بڑے بڑے سیاسی لیڈران سے تعلق رکھنے میں اپنا فخر سمجھتے تھے پھر ریاستوں کے حاکم  
 ان کے نیاز مند تھے اداان کی بات احترام سے سنتے تھے۔ غرض ایک عالم دین  
 دینی معنیت اور ایک اسلامی ادارہ کے سربراہ کو جو بھی بڑے سے بڑے دنیاوی  
 مل سکتا تھا سید صاحب ان سے پہلے پہرہ دے لیتے لیکن اس کے باوجود ایک وقت آ  
 وہ ان سب چیزوں سے بیزار ہو گئے، اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی  
 ہاتھ پر بیعت کر کے امام غزالی کی طرح انہوں نے تصوف میں پناہ لی، اور اس  
 ان کو الہیان قلب نصیب ہوا۔

تھانوی میں حضرت تھانوی کی بیعت کرنے کے بعد انہوں نے جو غزل  
 اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پاکر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں

مہر سودو زبان دوسرا بھول گیا ہو

جس دن سے سرے دل میں تری یاد ہی ہے  
 ہر ایک کو میں تیرے سوا بھول گیا ہوں  
 آتا ہے خدا بھی تیرے وقت میں مجھے یاد  
 گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں  
 عالم کے تاشے نہیں اب ہاؤب دل میں  
 ہر لذت مہتی کا مزا بھول گیا ہوں  
 اب سلسلہ صمت و کثرت کو میں سمجھا  
 پا کر تجھے سب تیرے سوا بھول گیا ہوں  
 منظور تری چشم رضا جب سے ہوئی ہے  
 امید جزا و خوف سزا بھول گیا ہوں  
 اے رہبر توفیق مجھے راہ بتا دے

نقش قدم راہ نا بھول گیا ہوں  
 اتنا ہے ورق آج سے افسانہ نو کا  
 افسانہ پارینہ دلا بھول گیا ہوں

یہ اشعار ۱۲ اپریل ۱۳۴۲ء کے ہیں۔ اس کے بعد بھی اپنے مرشد سے جو انہیں روحانی فیضان ملتا رہا اس کا ذکر وہ اشعار میں کرتے رہے ہیں۔ چند اشعار اور سنئے۔

سازگار اب گردش ایام ہے  
 دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

ہشتاد سالہ جام سے مراد اسی برس کے بوڑھے مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکات ہے۔ مرتب۔

لذت خلوت یہاں کیا کیجئے

ایک میں ہوں اور ان کا نام ہے



علم و دولت جاہ و عزت پہنچ سہیں  
مگر مجھے حاصل تر انعام ہے  
جب مرا مطلوب ہے تیری رضا  
تب مجھے اعدوں سے لب کیا کام ہے  
تھی جو آزادی تو ہر سودوڑ تھی  
قید میں آرام ہی آرام ہے  
اور اس غزل کا آخری شعر ہے۔

فیض ہے یہ کس دلی وقت کا  
اب مرا جو شعر ہے الہام ہے  
اس غزل میں ایک شعر ہے۔

اس کی دندیدہ زنگاری کے نثار  
آج ہی آغ ز کا انجام ہے

مرتب اس شعر کی تشریح یوں کرتے ہیں  
مرشد تھانویؒ کی نظر میں عادتاً جیسی ہی رہتی تھیں مگر کبھی کبھار کن انکیوں  
سے کسی سمت دیکھ لیتے تو گویا بجلی گراتے تھے۔

مرتب نے سید صاحب کے کلام کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ ہے  
موصوف نے غزل الفزلات کا نام دیا ہے۔ سید صاحب کے آخری دور کا کلام  
نہے اور اس کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب انہوں نے حضرت تھانویؒ کے  
دست مبارک پر بیعت کی اور علم کی اقلیم سے نکل کر آسمان معرفت کی سیر شروع  
فرمائی۔ دوسرا حصہ سید صاحب کے دراولی کا کلام ہے۔ جس میں بعض سیاسی  
نظریں ہیں، غزلیات ہیں اور مولانا شبلی کا مرثیہ نوحہ استاد ہے اس حصہ میں  
بعض تاریخی نظریں بھی ہیں، جن سے اس دور کی جب وہ نظریں کی گئی تھیں، سیاست

کالقبہ سامنے آجاتا ہے۔ ایک نظم مسٹر محمد علی جینا کے عنوان سے ہے اس کے یہ شعر ہیں۔

اک زمانہ تھا کہ اسرارِ دروں ستور تھے

کوہِ شملہ جن دنوں ہم پایہ سینا رہا

جب کہ واروئے وقارِ درو کا درساں رہی

جب کہ مرزا داں عطائی بو علی سینا رہا

مسلمانوں کے اس دور سیاست کی طرف اشارہ ہے، جب انگریزوں کی وفاداری اس کا قبلہ مقصود تھا۔ اور شملے کے پیار کو جہاں انگریزوں کے سر اُٹھتا تھا۔

لہذا سینا کا ہم پایہ سمجھا جاتا تھا،

جب ہمارے پارہ فرما نہر کہتے تھے اسے

جس پر اب بوقوت ساری قوم کا بیندما

یعنی سیاست۔ اس دور میں مسلمانوں کے ہاں سیاست شجرِ کمزور سمجھی جاتی تھی

بادۂ حب و وطن کچھ کیفت پیدا کر کے

دور میں یوہنی اگر یہ ساغر و مینا رہا

ظلتِ دیرینہ سے گواہی قویٰ بیکار ہیں

مخوش سنو ہے وہ ہم میں دیدہ بینا رہا

پرمیر یعنی قوم کی جینے کی ہے کچھ کچھ امید

ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا

یہ نظم لکھتوں میں ۱۹۱۶ء میں کہی گئی جہاں اس وقت مسٹر محمد علی جونا جونا  
آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت فرما رہے تھے۔  
ایک شعر ۱۹۳۵ء کا ہے، جس کا عنوان ہے، 'در آخر خطبہ ریڈیو پر  
حیدر آباد دکن' شعر یہ ہے۔

سلیماں را بملک شام اگر آصف و نہرے شد  
یہ ہیں اہل جاہست آصف را سلیماں کمتریں کا کر  
دو جگر مصرے میں آصف سے مراد نظام حیدر آباد دکن ہیں۔ جن کے ان  
سید صاحب کا ایک زمانے میں بڑا احترام تھا۔  
حصہ غزل الغزلات کے ایک شعر میں اپنے روحانی انقلاب کی کتنی اچھی تصویر  
کھینچی ہے۔ فرماتے ہیں۔

مدرسہ چھوڑ غزبات میں آگئی شام  
دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں  
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مدرسہ کی قیل و قال سے تنگ آ گئے تھے اور طواغیت  
کی تعین سرگرمیاں ان کے قلب و روح کو اطمینان بخشنے میں ناکام رہی تھیں، انہیں  
ایک سایہ دلجواری کی تلاش تھی، اور وہی ان کو تھانہ جموں میں پہنچ لایا۔ چنانچہ مدت  
شیخ میں فرماتے ہیں۔

قیل و قال مدرسہ کو چھوڑ کر  
شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا  
ابھی پایا مزہ ایساں کا  
جیسے قرآن آتھ ہی نازل ہوا  
ایسے کچھ انداز سے تفسیر کی  
پھر نہ پیدا شبہ باطل ہوا

بزم میں دیکھا کئے اس ناز سے  
جس طرف دیکھا نشانہ دل ہوا  
گھول کر کیا جانے کیا دے دیا  
علق سے اترا کہ شیدا دل ہوا  
دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا  
جو نگاہ ناز کے قابل ہوا

قید پاپے حلقہ پر مغنا  
پھر نہ اٹھا جو ہر ہاں اغل ہوا

یہ اشعار اگر مجمع معنوں میں سید صاحب مرحوم کی باطنی کیفیات کی عکاسی کرتے ہیں اور یقیناً وہ کرتے ہیں تو ان سے پتہ چلتا ہے کہ سید صاحب کو حضرت تھانویؒ کی بیعت کرنے سے پہلے وہ روحانی سکون حاصل نہیں ہو سکا تھا، جو ایک مذہبی زندگی کی اصلی محتاج ہوتی ہے۔ چنانچہ ان کی علمی زندگی سر تا سر قیل و قال مدرسہ تھی۔ ہمارے نزدیک بہت حد تک یہ واقعہ ہے سید صاحب کے دارالمصنفین میں تاریخ نگاری تھی، سوانح نگاری تھی، لیکن یہ سب چیزیں خارجی ہوتی ہیں اور ان کی حیثیت اس وقت تک خول کی جتنی ہے، جب تک کہ ان کے پیچھے کوئی فکری و فلسفیانہ معنویت نہ ہو، اور بد قسمتی سے سید صاحب کے دور سربراہی میں دارالمصنفین اس سے خالی رہا اور اس کی کلی تلافی وہ اکثر مغربیت، اور تقریباً 'کویرا بھلا کہہ کر پوری کہتے رہے یہ ایک روحانی غلام تھا، جس کا بھرنا تھا نہ بھون سے مقدر تھا چنانچہ سید صاحب مرحوم کو آستانہ تھانوی پر جہ ساقی کرنی پڑی۔

ایک اور منزل ملاحظہ ہو، جس کے اشعار ہمارے اس خیال کی مزید تائید کرتے ہیں

زبان میری بنادے یا الہی ترجمان دل      زبان ہو وہی اہلکار کچھ ہو بیان دل  
زبان تیرے میں شامل دل کی یاد سے غافل      بول نہ کر حق جاری ہو گشت زبان دل

زباں تہلیل میں ترہے خیالوں میں پھندا دل ہے  
زباں تاثیر کی طاقت دل تاثیر سے خالی  
نہ کھل جائیں کہیں یا رب یا سرار نہان دل  
زباں میں ہے نہ دل شامل دل میں ہے زبان دل  
خدا جانے کہاں دل ہے کہاں پلڑے کی مشعل ہے  
ہیں ملتا سراغ دل، ہیں ملتا نشان دل  
کوئی چوٹ ایسی لگ جائے الہی سیر سینے میں  
کد فوارہ سا بن جائے یہ زخم خون چکان دل  
اگر ساقی تری چشم منوں گر کام کر جائے  
بدل جائے نظام دل بدل جائے جہان دل  
کشا کھلے زنگارنگ سے چھوٹوں قرار آئے  
مقیم اس گھر میں ہو جائے اگر یہ میہان دل  
دلہے سے خرد کے جبے آیا ہوں وہ دل پر  
یقین کی شکل بنتا جا رہا ہے ہر گمان دل

تری ساقی کرامت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی  
زبان میری لگی اک گھونٹ میں کرنے بیان دل

۱۳ اپریل ۱۹۴۲ء

بے شک اس مجموعہ میں شاعری کی بلنبیاں آپ کو کم ملیں گی، لیکن اس دھمکے  
مبتے بڑے مدرسہ کی..... ناکامی کی یہ ایک منہ بولتی تصویر ہے اور۔۔۔۔۔۔  
اسی نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

پڑا سائز، ضخامت ۱۱۲ صفحے، غیر مجلد قیمت ۳ روپے

علی کا پتہ سیدی الدین احمد عالمگیر روڈ مشرف آباد کراچی

(۱- س)

# شاہ ولی اللہ کی بیڑی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

تحریک ولی اللہی نے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دو سکرابل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا جریڈ  
شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں فروغ دینے کی  
غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا



Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

# شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام مصطفیٰ بلیانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر بلیانی ایم۔ اے۔ صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل کی ہیں قیمت ۷۵۰ روپے ہے۔

## المسود اجاد الموطا

تالیف ————— الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب سچ سے ۴۲ سال پہلے تحریر ہوئی اور انامیہ لکھی جس میں وہم کے بغیر لکھی گئی ہے۔ اس میں جو کچھ مذکور ہے اس کے شرعی حاشیہ میں حضرت شاہ صاحب کے ساتھ ذیل کے ائمہ اہل کمال کا نام لکھا ہے جن کی کتاب سے اس نے استفادہ کیا ہے۔ اس کا مولف ہے شاہ صاحب مفسر مسطورہ امام غزالی کی کتاب کو جس سے ترقیب دیا ہے۔ امام غزالی کے اقوال بھی اس میں لکھے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے جو کچھ لکھے ہیں ان کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے تفسیر اور تفسیر دیگر ائمہ کے تفسیر میں بھی کلمات بھی شامل کر دیئے ہیں۔

## مجموعہ

(مجموعہ)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "مجموعہ" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت مرثا و ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے اہم گوشہ فرمائی ہے نفس انسانی تربیت و تزکیہ سے جتنی ٹیپٹ و منازل پر گزرنا ہے اس میں اس کا کمال بیان ہے۔

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ تجاوی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

479

41

ماہنامہ



شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدر آباد



مجلسِ اذاعت

ڈاکٹر عبد الواحد علی پوتا،

مخدوم امیر احمد

مکیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

# الترکیم

ماہ دسمبر ۱۹۶۶ء و جنوری ۱۹۶۷ء	نمبر ۸۶
مطابق شعبان و رمضان ۱۳۸۶ھ	

## فہرست مضامین

۴۸۲	مدیر	تیم کے فقہی مطالع
۴۸۵	طفیل احمد قریشی	کا فلسفہ اخلاق
۴۹۸	فضل حمید	نظام شرعی
۵۱۱	ابوسلمان شاہجہانپوری	ابو عبد الرحیم فاروقی (مکتوبات)
۵۲۱	مولانا نسیم احمد فریدی اردو پڑھ	صوف کی ایک نایاب تصنیف
۵۳۲	مولانا ابوالفتح صاحب	پاکستان کے صوفیائے کرام
۵۴۲	دفاع راشدی	بزرگوں کا سیاست میں حصہ
۵۴۹	رحمت فرخ آبادی	حصہ
۵۵۸	(- س)	

## معذرت

نامہ الرحیم کے کاتب صاحب کی دفتر سے بلا اطلاع غلطی کی وجہ سے  
برکات مستقل پرچہ شائع نہ ہو سکا جس کا ہمیں بید افسوس ہے انشاء اللہ آئندہ  
اشاعت میں صفحات بڑھا کر اس کی تلافی کر دی جائے گی۔

## شذرات

برطانیہ کی مشہور علمی انجمن "رائل انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل آفسیڈرز لندن" میں ۱۸ نومبر کو صدر مملکت نے تقریر کرتے ہوئے اور بہت سی اہم باتوں کے ساتھ یہ کہا: "معاشی اور معاشرتی دائروں میں ہماری کوششوں کا آخری مقصد یہ ہے کہ ہم پاکستان میں اسلامی سوشلزم کے حصول کی طرف پوری مہمت سے قدم بڑھائیں۔" اسلامی سوشلزم کی اصطلاح قریب قریب "فلاحی مملکت" کے مرادف ہے۔ فلاح و بہبود کے جانے بوجھے مقاصد کے علاوہ اسلامی سوشلزم اس امر کا بھی مقصدنی ہے کہ ملک کا ثقافتی و مذہبی ورثہ بھی محفوظ رکھا جائے اور معاشی ترقی کی طلب میں اسے ضائع نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ اسلامی سوشلزم کا تصور "فلاحی مملکت" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور وہ جامع ہے۔ انفرادی و قومی زندگی کے ان تمام پہلوؤں پر جو چند مخصوص روحانی اور اخلاقی قدروں کا تقاضا کرتے ہیں۔

اسلام کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو قائم و دائم رکھتے ہوئے معاشی اور معاشرتی زندگی میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا، صدر مملکت کے الفاظ میں یہ ہے آج پاکستان کا قصہ درخشاں کے حصول کی تہیں جدوجہد کرنا ہے۔ بظاہر تو یہ بات آسان نظر آتی ہے، لیکن اسے عمل میں لانا بڑا مشکل ہے۔ کیونکہ ایک تو پچھلے دو سو سال سے مغرب بہت ترقی کر گیا ہے اور اس ترقی کے دوران اس کا کم و بیش تمام اسلامی ملکوں پر غلبہ رہا۔ اور اس کی وجہ سے ہمارے وہ طبقے جن کا آٹن ہمارے ہاں بڑا اثر ہے بہت حد تک اس کے رنگ میں رنگے گئے۔ دوسرے ہم ملوی اور ملکی لحاظ سے مغرب سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں، اور بہت سے امور میں ہم اس کے محتاج ہیں، لیکن سیاسی آزادی کے بعد اور اس وقت پورے مشرق میں بیداری کی لہر اٹھ رہی ہے اس کے نتیجے میں ہمارے ذہن جو مغرب سے مرعوب تھے، وہ مرعوبیت اب ختم ہو رہی ہے اور ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھیں، اپنی قوتوں کا جائزہ لیں اور گرد و پیش کو سمجھیں اور اپنی راہ خود تلاش کریں۔ جہاں تک معاشی ترقی کا سوال ہے وہ ہمارے لئے بے حد ضروری ہے، بلکہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ اگر ہم زراعت کو ترقی نہیں دیتے تو ہمارے لئے اپنی بڑستی ہوئی آبادی کے مطابق اناج پیدا کرنا ناممکن ہوگا۔ اسی طرح صنعتوں کی ترویج کے بغیر ہماری غریبی و محتاجی

بھی کبھی دور نہیں ہوگی۔ اب ان چیزوں کے لئے لاعلمی عام تعلیم اور خاص کر ٹیکنیکل اور سائنسی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ رائج کرنا ہوگا اور جب یہ رائج ہوگی تو اس کے اثرات لازماً ہمارے معاشرے پر پڑیں گے۔ لوگوں کے سوچنے کے انداز بدلیں گے، ان کے رہن سہن کے طریقے بدلیں گے، ان کی ضرورتیں ادا ہوں گی، اور وہ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے انہیں تنگ و دو کرنا پڑے گی۔ پھر تو اگلے پہلے معاشرے کو بدلے گی۔ اور لوگوں کو اپنے آپ کو نئے معاشرے کے قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔ اس کے سوا جہیں سفر نہیں۔ ہر معاشرہ کو ان مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

دنیائی ترقی و ترقی کے لئے معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے مذہبی و ثقافتی ورثے کو بھی باقی رکھنا ہے اور اُسے اس قابل بنانا ہے کہ وہ ہمیں روحانی اور اخلاقی قدریں دے، جو نہ صرف ہمارے باطن کو منور کریں بلکہ انہیں شمعِ ہدایت بنا کر زندگی کی راہوں پر آگے قدم بڑھا سکیں۔ روحانی اور اخلاقی قدریں مشینوں اور سائنس اور ٹیکنیکل تعلیم کی طرح باہر سے درآمد نہیں ہو سکتیں۔ اس کے سرچشمے قوم کے بطن سے، اس کی تاریخ سے اور اس کے مذہبی و ثقافتی ورثے سے چھوٹتے ہیں۔ اور خدا کے فضل سے ہمارے ہاں اس ورثے کی کمی نہیں۔ بلکہ وہ اتنا فطری ہے کہ دنیا کی کسی قوم اور ملت میں اس قدر فراوان نہ ہوگا۔ ضرورت اسے صحیح طرح بکاؤڈ بنانے کی ہے اور اسے آج کی زبان، آج کے اندازِ فکر اور آج کے طریقوں کے مطابق پیش کرنے کی ہے تاکہ وہ ہمارے عوام کی زندگی میں رچ بسکے اور خواص اسے اپنا کر اس میں نئی چلا پیدا کریں۔

یوں تو ہماری پوری تاریخ ایسے ائمہ مجددین، مجتہدین، علماء، صوفیاء اور اہل فکر سے بھری پٹی ہے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں قرآن و سنت اور اسلام کے پیغام کو اُس دور کے حالات و مقتضیات کے مطابق ادا اپنے ملک اور مخاطبین کی عملی ضرورتوں اور ذہنی استعدادوں کا خیال رکھ کر پیش کیا، اور لوگوں نے اسے سنا، مانا اور اس پر عمل کیا، اور اس طرح ان تیرہ صدیوں میں ملت کا کارواں آگے بڑھتا رہا، یہ سب بزرگ اور ان کے کارنامے ہمارا مذہبی و ثقافتی ورثہ ہیں اور ان کے سرمایہ علم و معرفت سے ہم ہمیشہ استفادہ کرتے رہیں گے، لیکن جہاں تک اس بے غیر پاک و ہند کے مسلمانوں کا تعلق ہے۔ ان کے لئے آج سے دو سو سال قبل ایک بزرگ ایسا مذہبی و ثقافتی برادر معلن کر کے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہم اسے اپنا فکری اساس بنائیں اور بعد میں اس اساس سے جس طرح مختلف بزرگوں نے مختلف حالات میں

استفادہ کر کے اس مذہبی و ثقافتی ورثے سے کام لیا، اسے بھی پیش نظر رکھیں تو معاشی ترقی اور معاشرتی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی اور روحانی قدروں کی ہمیں آج ضرورت ہے، ان کی تشکیل و ترتیب میں ہمیں اس بزرگ کی تصنیفوں اور افکار و تعلیمات سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ یہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ تھے، جن کے علمی وارث اگر ایک حد تک مل جائے دیوبندی ہیں، تو اتنے ہی علمائے اہل حدیث بھی ہیں۔ پھر ان سے سرسید، شبلی، ابوالکلام اور اقبال تک نے بھی فیض حاصل کیا، اور اس طرح فکر ولی اللہی کا سلسلہ اب تک جاری ہے یقیناً ہمارے ہاں معاشی ترقی کی ذہنی مسیاری سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم ہے اور آخر اللہ کے بغیر معاشی ترقی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس طرح ہمارے خیال میں اگر مذہبی و ثقافتی ورثے کو اس سر زمین میں ایک قابل لحاظ اور مرجع فکر و عمل بنانا ہے تو اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ہم تعلیمات و علوم ولی اللہی کو اپنا اساس بنائیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے بہت حد تک اگلوں اور پچھلوں کے علوم اپنی تصنیفات میں جمع کر دیئے ہیں، اور وہ اگر ایک لحاظ سے قدامت کے جامع ہیں، تو دوسرے لحاظ سے ایک نئی علمی و فکری زندگی کا نقطہ آغاز بھی ہیں۔

یہ نامہ انکھیں بند کر کے پہلوں کی ہر بات اور ان کی ہر تعبیر کو ماننے کا نہیں۔ ہمیں شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم و افکار کا تنقیدی مطالعہ کرنا ہوگا، اور ان میں اگر ایسی چیزیں ہیں جنہیں اس زمانے میں عمل عقل اور مشاہدہ و تجربہ صحیح ماننے کو تیار نہیں، تو اس سے لامحالہ درگزر کرنا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب نے بہت سی باتیں اپنے زمانے کے ضروریات کے مطابق فرمائیں، جن کے ظاہر ہے وہ معنی نہیں لئے جاسکتے، جو شاہ صاحب نے اُس وقت لئے تھے۔ لیکن قرآن مجید کی تفسیر، سنت و حدیث کی اہمیت، فقہ کے اوقاف اور تصوف و کلام کے بارے میں شاہ صاحب کے افکار میں ہمارے لئے اتنا کچھ ہے کہ ہم اسے حقیقی طور پر اپنا فکری، ثقافتی اور مذہبی ورثہ بنا سکتے ہیں۔ یہ ورثہ محض بے جان اور بے روح روایات کا پلندا نہیں، اس میں فکر کو متحرک کرنے کی بڑی صلاحیتیں ہیں، اور ہمیں ان سے کام لینا چاہئے۔

# علامہ ابن قیمؒ کے فقہی مطالع

ملنیل احمد قریشی

ساتویں صدی ہجری کا زمانہ مسلمانوں پر مختلف مصائب کے نزول کا دور تھا۔ بغداد جو کسی زمانے میں علوم و فنون کا مرکز تھا، تباہیوں کے حملے سے ۶۵۶ھ میں کنڈر بن گیا۔ بغداد کے بعد مصر میں حوئے نام عباسی خلافت قائم ہوئی، وہاں اصلی حکمران سلطان اور امراء تھے، جو ہمیشہ ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتے تھے۔ (دعوتِ صلیبی جنگیں تھیں جن کا آغاز ۴۹۰ھ میں ہوا اور ۶۹۹ھ تک یہ تقریباً دو سو سال تک ان کا سلسلہ جاری رہا۔ سیاسی انحطاط کے اس زمانے میں وہ علمی سرگرمیاں کہیں نظر نہیں آتیں جن کا چرچا دوسری اور تیسری صدی ہجری میں اسلامی شہروں میں تھا۔ تاریخِ فقہ میں یہ چھٹا دور کہلاتا ہے۔ جسے ”تقلیدِ محض“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تقلیدِ محض کے اس دور میں چند علماء کے علاوہ مذہبی حلقے صرف تقلید پر تکیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ ابن الحاجب۔ ابن دقیق العید۔ ابن الرقہ۔ ابن تیمیہ۔ سبکی۔ بلقیٹی۔ کمال بن الہمام۔ جلال الدین المحلی۔ جلال الدین سیوطی۔ ابن قیم وغیرہم کے علاوہ علماء کی اکثریت کسی نہ کسی فقہی مسلک سے منسلک نظر آتی ہے۔ فقہ کے مختلف ادوار کا

بائزہ لیتے ہوئے خضریٰ نے اس دور کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

ثم نرجع البصر الى ما بعد ذلك فلا نسمع باسم عالم كبير او فقيه عظيم او مؤلف مجيد بل نجد قوما غلبت عليهم القناعة في الفقه - فقلما نجد من يشغل بغير مذهب - واذا اشتغل بمذهبه قصر على تلك الكتب التي اشتد بها الاختصار حتى كأنها ما ألغت لتفهم كان السقوط السياسي سقط بالعلم ولا سيما الديني منه الى هوة بعيدة الغاية -

”جب ہم اپنی نظر اس کے بعد کے دور پر ڈالتے ہیں تو کسی بڑے عالم، بڑے فقیہ اور عمدہ مصنف کا نام نہیں سنتے بلکہ ایک ایسی قوم ملتی ہے جس پر فقہیں قناعت کر لینے کا غلبہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ (اس دور میں) آپ کو بہت کم ایسے لوگ ملیں گے جو اپنے فقہی مذہب کے علاوہ کسی اور مسلک سے بھی استفادہ کرتے ہوں۔ اور جب اپنے مذہب میں مشغول ہوتے (استفادہ کرتے ہیں) تو صرف ان کتب پر اکتفا کرتے ہیں جن میں اختصار اس قدر ہے گویا وہ سمجھنے کے لئے نہیں لکھی گئیں۔ غالباً سیاسی زوال نے (اس دور میں) علم بالخصوص مذہبی علم کو ایک گہرے غار میں گرا دیا۔“

یہ ہے فقہ کی تاریخ کا چھٹا دور جس میں محمد بن ابی بکر بن ایوب بن سعد بن حسیر الزہری دمشقی ابو عبد اللہ شمس الدین، صفر ۶۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳ رجب ۴۵۸ھ میں راہی ملک بقا ہوئے۔ آپ کے والد چونکہ دمشق کے مشہور مدرسہ الجوزیہ کے قیّم تھے اس لئے وہ ابن قیّم کے نام سے مشہور ہوئے۔ اسی نام (ابن قیّم) کے ایک اور عالم الفخر الفارسی (المتوفی ۷۱۸ھ) بھی ہیں، جن کا شمار مصری محدثین میں ہوتا ہے۔ اس لئے نام کے اس میں اشتباہ سے بچنے کے لئے آپ کو ابن القیّم الجوزیہ بھی کہا جاتا ہے۔

ابن قیّم نے جب اپنے دور کا گہرا مطالعہ کیا تو انہیں مذہبی امور میں کوئی ایک کوزہ نہیں

بلکہ مختلف راہیں اصطلاح طلب نظر آئیں۔ مختلف کلامی مذاہب اور صوفیاء کے مختلف معتقدات نے ان عقائد کو جنم دیا تھا، جو امت میں برسوں سے باعث اختلاف بنے ہوئے تھے۔ ایک کلامی مذہب دوسرے کی کلم کھلا تکفیر کرتا تھا اور ہر ایک مُصر تھا کہ اسی کے عقائد عین اسلام ہیں۔ جہاں تک فقہی مسالک کا تعلق تھا ابن قیم کی رائے میں اُن کا بن جانا اتنا خطرناک نہ تھا، جتنا ان مسالک کے جامد پیروکاروں کا یہ رجحان کہ صرف ان ہی کا مخصوص مسلک درست ہے۔ اس سے سرِ مٹو ادھر ادھر ہٹنا درست نہیں۔ اس رجحان نے امت میں نہ صرف جمود کی کیفیت طاری کر دی بلکہ فکری آزادی بھی بالکل ختم ہو گئی تھی۔

قوانین کی تطبیق ایجابی بھی ہو سکتی ہے اور سلبی بھی۔ لیکن جب افراد کا رجحان قانون کی سلبی تطبیق کی طرف ہو۔ اور اس کے پیش نظر افراد سلبی پہلو ہی کو اختیار کر لیں تو گو قانونی نقطہ نگاہ سے اس پر گرفت نہیں کی جا سکتی لیکن اسے قانون کی صحیح تطبیق نہیں کہا جا سکتا۔ قوانین شریعت میں اس قسم کی راہ ”حیلہ“ کہلاتی ہے۔ امت میں ان حیلوں کے رواج پا جانے یا علماء کے درسوں میں ان کی طرف رغبت کی صورت حال سے ابن قیم مطمئن نہ تھے۔

شرعی قوانین کے نفاذ کا معاملہ ہوا ان کے طریق استنباط کا۔ مختلف فقہی مسالک میں کسی ایک کی تقلید کا مسئلہ ہوا یہ سبھی مسالک سے احکام کے اخذ کرنے کا سوال۔ ابن قیم کی نگاہ میں ان سب صورتوں اور حالات میں روح شریعت کی تفہیم ضروری ہے جو اُن کے خیال میں ان کے دور میں کم ہوتی جا رہی تھی۔ غرض علامہ ابن قیم کی پوری دعوت کو ہم چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں :

(۱) عقائد میں اسلاف کے مذہب کی تلقین۔

(۲) فکر و نظر کی آزادی کی طرف راہنمائی۔

(۳) قوانین شریعیہ سے ملقب کے خلاف جنگ۔

(۴) روح شریعت کی تفہیم پر زور۔

عقائد کے بارے میں علامہ ابن قیم نے جو کچھ لکھا وہ اس وقت ہمارے زیر بحث



نہیں ہم یہاں صرف باقی تین موضوعات پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

(۱) فکر و نظر کی آزادی فقہی مسائل میں کورانہ تقلید کے علامہ ابن قیم سنت مخالف تھے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ سب سے

سے فقہی مسلک ہی کے مخالف تھے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے ابن قیم حنبلی ہیں اور جابل یا معمولی پٹھے لکھے آدمی کے لئے وہ مسائل کی تعلیم کسی فقہی مسلک ہی کے ذریعے دینے کے قائل ہیں۔ لیکن ایک ایسا عالم جس کی قرآن و سنت، اقوال و عمل امت اور مختلف فقہی مذاہب پر طمانہ نظر ہو، اس کا کسی خاص فقہی مسلک سے غیر متجاوز حد تک چپک رہنا اُن کے نزدیک اس عالم کی کورانہ تقلید اور تعصب کی نشانی ہے۔ اس قسم کی تقلید یا تعصب پر گفتگو کرتے ہوئے شیخ محمد انصاری نے اس دور کے ایک عالم ابو الحسن عبداللہ کلرخی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

كل ائمة تخالف ما عليه اصحابنا فہی مؤولة أو منسوخة وكل  
حدیث كذا لك فهو مؤول أو منسوخ

”یعنی ہر آیت جو ہمارے اصحاب کے (فقہی مسلک) کے خلاف ہے وہ یا تو مؤول ہے یا منسوخ۔ اسی طرح حدیث بھی (جو ہمارے ائمہ کے مسلک کے خلاف ہے) وہ یا مؤول ہے یا منسوخ“

علامہ ابن قیم کی رائے میں علماء کا اس حد تک بڑھ جانا یا تو ان کے مذہبی تعصب کی نشانی ہے یا ”تقلید محض“ پر قانع ہو جانے کی دلالت۔ تقلید کے اس حد تک غلبہ کے رجحان کو ختم کرنے کے لئے وہ تین طریقے تجویز کرتے ہیں۔

۱۔ علماء کو ائمہ سلف کے اقوال یا دلائل ”تقلید محض“ کے دائرے سے باہر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔

۲۔ تقلید اور اتباع کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔

۳۔ عصری مسائل اور عقلی دلائل کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اجتہاد کی ضرورت پر بھی زور دیتے ہیں۔

علامہ ابن قیم فرماتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو جب کوئی مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفسار کرتے یا آپؐ کے بعد آپؐ کے قریبی لوگوں سے کسی مسئلہ سے متعلق آپؐ کا فعل یا حکم معلوم کرتے تھے۔ جب تابعین کا دور آیا تو صحابہؓ سے سنت رسولؐ کے سلسلے میں معلومات حاصل کرتے تھے۔ اور جب ائمہ کا دور آیا تو انہوں نے بھی اسی طریقہ کو برقرار رکھا۔ لیکن جب فقہ مختلف مذاہب میں بٹ گئی اور جزئیات میں علما نے اختلاف کیا۔ یا طریق استنباط میں اپنی خاص رائے دی تو بعد میں آنے والوں نے ان آثار کو اصل مسائل سمجھ کر من و عن اسی طرح برقرار رکھنے پر اصرار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے مخالف اگر کسی دلیل کی بنا پر کوئی صحیح بات بھی کہتے تو اسے تسلیم نہ کیا جاتا۔ اور بات عبد اللہ الکفری کے اس قول پر آکر ختم ہو جاتی، جس کا ذکر ابھی کیا چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ابن قیم ائمہ سلف کے اقوال خاص طور پر نقل کرتے ہیں تاکہ اس بارے میں جمود کی شدت کم ہو سکے۔ مثلاً ایک جگہ وہ امام شافعی کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

اذا رویت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وحده شيئاً ولم  
أخذ به فاعلموا ان عقلی قد ذهب۔

”یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بیان کی جائے اور میں اسے نہ لوں تو سمجھ لو کہ میری عقل ماری گئی ہے“

اسی طرح وہ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسف کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

لا یجمل لاحد ان یقول بقولنا حتی یعلم من این قلنا۔

”کسی شخص کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہمارے قول کے

بارے میں کچھ کہے یہاں تک کہ اسے یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ہم نے وہ بات کہاں سے

لی ہے“

اور امام مالک کا یہ قول کہ :-

انا بشر أخطئ وأصيب فانظروا في رأيي - فما وافق الكتاب والسنة فخذوا به وما لم يوافق فاجتنبوا<sup>لہ</sup>۔

”یعنی میں ایک انسان ہوں جس سے غلطی اور معمول ہو سکتی ہے تو تم میری رائے دیکھو اگر وہ کتاب و سنت کے مطابق ہو تو اپنالو اور اس کے مطابق نہ ہو تو اسے ترک کر دو“

تقلید اور اتباع کے فرق کو واضح کرتے ہوئے علامہ ابن قیم تقلید کو ممنوع اور اتباع کو جائز و احسن خیال کرتے ہیں۔ مثلاً تقلید کی تعریف ابو عبد اللہ بن غراز منداد البصری المالکی الفاظ میں یوں کی گئی ہے ۔

التقليد معناه في الشرع الرجوع الى قول لاحجة لقائله عليه۔

”شریت میں تقلید کے معنی ایسی بات کو اپنانے کے ہیں جس کے قائل

کے پاس اس کی دلیل نہ ہو“

اور اتباع کے بارے میں یہ کہا گیا ہے ”فهو العمل بقول ثبتت عليه الحجة“

اتباع نام ہے عمل کا جو ایسے قول پر ہو جس پر دلیل ثابت ہو جائے ۔

چنانچہ ائمہ سلف کی مختلف فقہی آراء جو ان سے منقول ہیں، ان (ائمہ) کے نزدیک محقق ہیں ہی لیکن ایک ایسا شخص جو عالم بھی ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ فلاں مختلف فیہ مسئلہ : فلاں امام کی رائے زیادہ قرین قیاس اور قابل قبول ہے، پھر بھی وہ اس پر ٹھہر رہے کہ چونکہ میرا ہمارے مسلک کے امام کی ہے اس سے ادھر ادھر نہیں ہوا جا سکتا تو یہ کورا نہ تقلید ہے۔ لیکن ایسی فقہی رائے جو ائمہ سلف میں بھی کسی نے بیان کی اور ایک عالم جب دلائل کی روش میں اس کا بنظر قارئ مطالعہ کر کے یہ اچھی طرح سمجھ لیتا ہے کہ یہی رائے قابل قبول ہونی چاہئے (جب تک کہ کوئی مزید دلیل کسی اور امام کے قول کے لئے علم میں نہ آئے) تو اسے تقلید

میں اتباع کہا جائے گا۔

فقہی آراء میں علامہ ابن قیم کسی عالم کے لئے اتباع کو برا نہیں کہتے۔ وہ ”تقلید“ اور جس ”تقلید محض“ کے خلاف ہیں۔ ان کی رائے میں تقلید محض سے علماء میں آزادی فکر ختم ہو تی ہے اور وہ عصری مسائل کے استنباط یا ان کے حل کرنے کی اہلیت کو بیٹھتے ہیں۔ ایک وہ کورانہ تقلید کے ضمن میں علماء کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”آپ یہ کہہ کر نہیں بچ سکتے کہ ہم نہیں جانتے اور اگر یہ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں تو پھر یہ بات خود آپ ہی کے لئے مصیبت ہو سکتی ہے کہ تعجب ہے جانتے ہو جتنے بھی آپ ایک ایسی بات کو اپنائے ہوئے ہیں، جسے آپ نہیں جانتے۔ فرماتے ہیں:۔

فان كنت لا تدري فتلك مصيبة وان كنت تدري فالمصيبة اعظم  
”یعنی اگر آپ نہ جانتے ہوتے یہ ایک مصیبت تھی اور اگر آپ جانتے تو پھر یہ سب سے بڑی مصیبت ہے“

## (۲) قوانین شرعیہ سے تعلق کے خلاف جنگ

شرعی قوانین کے نفاذ کا مقصد ایک ایسے معاشرہ کا قیام تھا، جس میں اسلامی اصولوں کی روح جاری و ساری ہو۔ لیکن جب قانون کا نفاذ برائے قانون ہو تو نہ صرف روح قانون مفقود ہو جاتی ہے بلکہ ایسی قانونی موشگافیاں بھی ہونے لگتی ہیں جو بالواسطہ قانون شکنی کی ترغیب دیتی ہیں۔ ان موشگافیوں سے معاشرے کے وہی افراد فائدہ اٹھاتے ہیں جن کا مقصد اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے قانونی راہیں ڈھونڈنا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس شرعی قوانین کو نافذ کیا گیا ان کے نفاذ کے ہر پہلو میں قانون کی روح کی عملی عکاسی نمایاں نظر آتی ہے۔ یہی صورت صحابہؓ اور تابعینؓ کے ادوار میں بھی برقرار رہی۔ لیکن جو نبی فقہ اسلامی مختلف مکاتب میں بنی اور فقہی مناظروں کا دور شروع ہوا تو فقہی مباحث اور قانونی موشگافیوں میں مختلف ایوان کا اضافہ ہوا۔ ان میں ایک ”باب الحیل“ بھی تھا۔ جس کا مقصد ان قانونی حیلوں کی نشاندہی کرنا تھا جن کی بدولت ایک فرد قانون میں رہتے

ہوئے قانون شکنی کر سکتا تھا۔ گو بظاہر اسے قانون شکنی قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس قسم کی قانونی مویشگافیوں اور حیلوں کو بڑی دلچسپی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بڑے شوق سے ان کا مطالعہ شروع ہو گیا۔ اس قسم کے حیلوں کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

ایک عورت اپنے شوہر سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ اور شوہر خلع، طلاق پر راضی نہیں ہوتا تو عورت اپنے مُرتد (خارج از اسلام) ہونے کا اعلان کر کے اس کی زوجیت سے الگ ہو سکتی ہے۔ شوہر سے چھٹکارا پالنے کے بعد وہ پھر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر کے اپنی مرضی سے کسی دوسرے شخص سے نکاح کر سکتی ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ سے بچنے کے لئے مال زکوٰۃ کسی ہانڈی میں ڈال کر اور اس پر کوئی جنس ڈال کر کسی مستحق کی ملک کر دیا جائے اور پھر وہی اس سے خرید لیا جائے تو اس حیلہ سے زکوٰۃ بھی ادا ہو گئی اور مال زکوٰۃ بھی واپس آ گیا۔ یہی صورت وراثت میں سے صرف ایک کو ترجیح دے کر باقیوں کو محروم کرنے کے لئے ”اقرار قرضہ“ کے حیلے کی ہے۔

جب اس قسم کے حیلوں کی عام اشاعت ہونے لگی تو علماء نے اس کی کافی مخالفت کی۔ حماد بن زید، مالک بن انس، سفیان بن عیینہ، فضیل بن عیاض، عبداللہ بن مبارک، اور امام احمد بن حنبل وغیرہ ان علماء سے ہیں جنہوں نے اپنے دور میں اس قسم کی بالواسطہ قانون شکنی کے خلاف بہت کچھ کہا اور لکھا۔ امام احمد بن حنبل سے ایک قول منسوب ہے کہ ”من کان کتاب الحیل ببیتہ یفتی بہ فہو کافر بما انزل اللہ علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم“ (جس کے گھر میں ”کتاب الحیل“ ہے وہ اس کے مطابق فتویٰ بھی دیتا ہے تو گویا اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی (شریعت) کا انکار کیا)۔ امام ابن تیمیہ آئے تو انہوں نے بھی اپنی تصنیف اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل میں حیلوں کی پرزور تردید کی۔ اس کتاب میں حیلہ کی تعریف ہی وہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

۱۔ ابن قیم جوزیہ ص ۱۳ بحوالہ اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل ص ۶۳۔

۲۔ ایضاً، بحوالہ نفس المراجع ص ۶۴۔

”الحیلة قصد سقوط الواجب او حل الحرام الخ“  
(حیلہ کے معنی واجب کو ساقط کرنے یا حرام کو حلال کرنے کے

ارادے ہیں) -

امام ابن تیمیہ کے بعد ابن قیم نے اس پر کڑی نکتہ چینی کی اور ابطال حیلہ پر بہت کچھ لکھا۔ اعلام الموقعین اور نفس المرجع وغیرہ آپ کی ایسی کتب ہیں جن میں ابطال حیلہ پر آپ نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ احکام شرعیہ میں اس قسم کی حیلہ جوئی سے جو صورت پیدا ہو سکتی ہے اس کے چند پہلو یہ بھی ہیں مثلاً یہ کہ

۱۔ اس طرح نہ محض شرعی وجوب ترک ہوتے ہیں بلکہ فعل حرام کا استلزام ہوتا ہے۔  
۲۔ حیلہ جوئی کا رجحان افراد کو غصب، جھوٹ اور دھوکہ دہی کے قانونی سہارے تلاش کرنے پر اکساتا ہے۔

۳۔ ایسی باتوں کی ترغیب ملتی ہے جو شریعت کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہیں۔  
۴۔ حیلوں کا مرتکب نہ تو توبہ کرتا ہے اور نہ انہیں باعث گناہ خیال کرتا ہے۔  
۵۔ بظاہر تو حیلہ جو مخلوق کو دھوکا دیتا ہے لیکن فی الحقیقت حیلہ جوئی کر کے وہ خدا کو دھوکا دیتا ہے۔

۶۔ جب اسلامی احکام کی حیلوں کے ہاتھوں بیخ کنی ہونے لگے تو نہ صرف اسلامی قانون کی روح ختم ہو جاتی ہے بلکہ یہ صورت حال غیر اسلامی عناصر کی آمد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اس مسئلے پر گفتگو فرماتے ہوئے ایک جگہ علامہ ابن قیم لکھتے ہیں :-

فالزکوٰۃ والحج شرعا بمصلحة فاذا تحویل علی استطاعتها  
زالت المصلحة والمحدود شرعت زجر للتفوس فاتحایل

۱۷ ایضاً ص ۱۲ بحوالہ اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل ص ۱۱ -

۱۸ ابن قیم الجوزیہ ص ۱۵ بحوالہ اعلام الموقعین ج ۲ ص ۱۵۶

## علی اسقاطہا یذیل المقصود منها یہ

”زکوٰۃ اور حج (خدائی) مصالح ہیں۔ حیلہ کرنے سے مصالح ختم ہو جاتی ہیں اور مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حدود لوگوں کو کسی بات سے باز رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں حیلہ انہیں ختم کر کے ان کا مقصد فوت کر دیتا ہے“

(۳) رُوحِ شریعت کی تفہیم احکام شرعیہ کو ان کی اصلی صورت میں جاری رکھنے کے لئے رُوحِ شریعت کی تفہیم نہایت ضروری ہے۔ اس سے آزادی فکر کی راہیں بھی کھلتی ہیں اور جیل جیسے مذموم رجحانات کا سد باب بھی ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم نے اپنے آپ کو رُوحِ شریعت کی تفہیم کی تحقیق کے وقف کر دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ان کی رائے میں ضروری یہ ہے کہ الفاظ پر رہنے کے بجائے نفس مسئلہ کی روح کا مطالعہ کیا جائے۔ چنانچہ ابن قیم مسائل کے میں اس اصول کو خصوصی طور پر مد نظر رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے فقہ کے قوانین کے بارے میں اپنی منفرد رائے کا اظہار کیا ہے ان کی تعداد تو بہت ہے لیکن چند مسائل کا تذکرہ تشبیہاً درج ذیل ہے۔

(۱) قانون شہادت

(۲) نیت کا معاہدات پر اثر

(۳) آزادی معاہدات کا لزوم

(۴) عمل فضولی کا اعتبار

گواہی کے متعلق فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کم از کم دو صلح اور صادق مرد یا ایک اور دو عورتوں کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن ابن قیم سنن ابو داؤد کی اس حدیث ”اذا علم الہ صدق الشاهد الواحد یجوز لہ ان یحکم بہ“ (جب حاکم کو ایک ہی سچے شخص کی گواہی مل جائے تو اسی سے فیصلہ کر دینا جائز ہے) سے یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ جب حقیقت

ناکشف یا عیاں ہو تو ایک ہی گواہ کافی ہے۔ اسی طرح نسائی کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خزیمہ کی شہادت کو دو آدمیوں کی شہادت کے برابر فرمانا علامہ ابن قیم کے نزدیک محض فضیلت خزیمہ کا اظہار نہیں بلکہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ایک قابل اعتبار شخص کی گواہی بھی کافی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ان امارت کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں :-

وهذا يدل على ان البينة تطلق على الشاهد الواحد

”اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ’گواہی‘ کا اطلاق ایک گواہ پر بھی

ہو سکتا ہے“

قانون شہادت میں علامہ ابن قیم کی یہ رائے درحقیقت روح شریعت کی تفہیم ہی حصہ ہے، جسے قانون شہادت میں تبدیلی نہیں کہا جاسکتا۔ بلکہ موقع اور پیش آمد حالات کے مطابق فیصلے میں سہولت کی ایک راہ ضرور قرار دیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح معاہدات میں نیت کے اثر کو بھی ابن قیم نظر انداز نہیں کرتے اور حدیث ”انما الاعمال بالنیات“ (اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے) اور ارشاد نبوی ”من تزوج امرأة بصداق لا يؤديه اليها فهو زان“ (جس نے کسی عورت سے اس نیت سے شادی کی کہ وہ اسے اس کا مہر ادا نہیں کرے گا گویا وہ زنا کرتا ہے) سے وہ اعمال میں نیت کے نفوذ و اثر کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی آیت ”ولا تمسکوهن ضرارا لمتعدوا“ وغیرہ سے ابن قیم بھی استدلال کرتے ہیں کہ اعمال کے انعقاد پر نیت کے اثر کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فرماتے ہیں

”فالنية روح العمل وليه وقوامه وهو تابع لها يصح

بصحتها ويفسد بفسادها“

(پس نیت عمل کی روح، اس کا جوہر اور اس کا قوام ہے۔ عمل نیت



کے تابع ہے۔ اگر نیت صحیح ہے تو عمل صحیح اور اگر نیت خراب تو عمل بھی خراب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم کے نزدیک ایسی خرید و فروخت جائز نہیں جس نیت ربا کی ہو۔ اور ایسا نکاح درست نہیں جس کا مقصد صرف کسی عورت کو اپنے لئے کرنا ہو۔ اور انگور کا ایسا مشروب تیار کرنا درست نہیں جس کا مقصد خمر کو نم البدل کے استعمال کرنا ہو۔ مراد یہ ہے کہ مقصد ہی پر حکم کا اطلاق ہونا چاہئے۔

مصلحت وقت کے پیش نظر کسی دوسرے شخص کی ملکیت میں تصرف کے بعد فقہاء کی مختلف آراء ہیں۔ علامہ ابن قیم اس مسئلے میں ”مصلحت وقت“ کو ترجیح دیتے ہیں۔ مال میں بلا اجازت تصرف کی اجازت دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مقصد کے حق استیفاء کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مال غیر میں تصرف کی چند مثالیں حسب ذیل: کسی شخص نے دیکھا کہ بکری (کسی وجہ سے) مرنے والی ہے اور وہ اسے ذبح دیتا ہے تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائے تو اس کا یہ بلا اجازت فعل ناجائز مقصور نہیں ہوگا کسی کے گھر میں سیلاب کا پانی آگیا ہے یا آگ لگ گئی ہے اور مالک موجود تو سامان کے تحفظ کے لئے بلا اجازت دیوار بچاؤ اور سامان نکالنا ناجائز نہیں سمجھا جائے گا۔

کسی کی کھیتی پک گئی ہے لیکن مالک غائب ہو گیا ہے یا کسی ایسی جگہ قید جہاں اجازت نہیں لی جاسکتی تو بلا اجازت فصل کی کٹائی ناجائز مقصور نہیں ہوگی۔ بحری سفر میں جہاز کو حادثہ پیش آگیا۔ لوگ کشتیوں میں جان بچا کر بھاگے ہیں ایسی صورت میں مال غیر کو بچانے کے لئے کسی شخص کا مال اپنی کشتی میں رکھنا ناجائز نہیں ہوگا۔

ایسے ہی دوسرے حالات میں مصلحت وقت کی ترجیح کا مانع علامہ ابن قیم

نزدیک وہ احادیث اور آیات کریمہ ہیں، جن میں مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب، محافظ اور مصلح بتایا گیا ہے۔ علامہ ابن قیم کا خیال ہے کہ اس قسم کے مصلح کا تعلق فسرد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ بالفاظ دیگر ایسے اعمال ہو کہ رائے کلی کے دائرے میں آتے ہیں، اس لئے اسے مال غیر میں بلا امتیاز تصرف کی بجائے احسان سے تعبیر کرنا چاہیے۔

علامہ ابن قیم کے فقہی مطامع گو ان کے اپنے دور میں کڑی تنقید کا نشانہ بنے لیکن ان مطامع سے ان کے تلامذہ اور بعد میں آنے والوں نے جو استفادہ کیا وہ استفادہ فی الحقیقت ثمر فکری اور روح شریعت کی تفہیم کے لئے سنگ میل بن گیا۔

بعض صحیح حدیثیں ان علماء تابعین تک جنہیں فتوے کا کام سپرد تھا، نہیں پہنچی تھیں اور اس وجہ سے انہوں نے اجتہاد اور رائے سے کام لیا تھا اور صرف عام الفاظ کی انہوں نے اتباع کی تھی یا یہ کہ گزشتہ صحابہ کی اقتدا کرتے ہوئے اسی کے مطابق فتویٰ دے دیا تھا۔ تیسرے طبقہ میں جا کر ان احادیث کی شہرت بھی ہوئی لیکن یہ خیال کر کے کہ یہ احادیث ان کے مشہر کے علماء کے مستفاد طریقہ کے خلاف ہیں، ان احادیث پر عمل نہیں کیا۔ علماء کا یہ طریقہ حدیث کے لئے موجب قہر و قباحت بن گیا تھا یا حدیث کے ساقط ہو جانے کی علت اور سبب بن گیا تھا یا پھر یہ کہ تیسرے طبقہ میں بھی ان احادیث کی شہرت نہیں ہوئی تھی بلکہ ان کی شہرت اس کے بعد ہوئی جب کہ علماء حدیث نے ان احادیث کے طریقوں پر نہایت غرور و غمن سے نگاہ ڈالی (شاہ ولی اللہ)

# اسلام کا فلسفہ اخلاق

فضل حمید

تعمیرِ اخلاق کی ضرورت بدیہی ہے۔ منطق کا یہ مسئلہ اصول ہے کہ بدیہیات کا اثبات محتاج استدلال نہیں ہوتا، یعنی یہ ”آفتاب آمد دلیلِ آفتاب“ کا مصداق ہوتا ہے اس کے باوجود عرفی کا یہ قول بھی اپنی جگہ درست ہے:

ہر کس نہ شناسد راز است و مسکن  
 ایں ہمہ راز است کہ معلوم عوام است !

یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ یہ عالم مجموعہٴ اعتداد ہے۔ کفر کے بغیر ایمان، زشت کے بغیر خوب، بد صورتی کے بغیر خوبصورتی، شر کے بغیر خیر کا وجود نہیں ہو سکتا۔ اس مسئلہ کو فلسفہ میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اشیاء اپنے اعتداد سے پہچانی جاتی ہیں اور حق تو یہ ہے کہ اس گونا گونی اور بوقلمونی کے بغیر عالم کا جمال و کمال متصور بلکہ ممکن نہیں۔

گلابائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس جہاں کو ہے زیبِ اختلاف سے

اس تمہید کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ زہدِ خشک اور تقشف کو اصرار ہے کہ

تمام عالم کا رنگ روپ اور خط و فعال یکساں ہو جائیں۔ یہ بات حکمت تکوینی اور سنت الہی کے منافی ہے اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتٰی اور کُلٌّ لَّا يَعْمَلُ عَلٰی شَاكِلَتِهٖ کی نصوص قرآنی اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ

آنچه فلک نہ خواست است هیچ کس از فلک نہ خواست  
طرف فقیہے نہ جست بادہ ماگزک نہ خواست

بائیں ہمہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خیر و شر اور زشت و خوب کی ایسی قدریں بھی ہیں جو وجدانی طور پر اقوام عالم یعنی جملہ بنی نوع انسان میں مشترک ہیں۔ انہیں قرآنی اصطلاح میں ”المعروف“ اسے موسوم اور ان کی ضد کو ”مُنکر“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اخلاق کا اطلاق عمومی لحاظ سے معروف پر ہوتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلق کو قرآن نے اسی معنی میں عظیم کہا ہے۔ خلق معصیت کی ضد نہیں ہے۔ مصوم تو صرف انبیاء ہوتے ہیں بمعصیت منطاری ہو تو بقول حافظ مستحقِ کرامت ہے۔ اس قسم کی معصیت کے بارے میں خواجہ حافظ نے کہا ہے کہ

گناہ گرچہ نہ بود اختیارِ محافظ

تو در طریقِ ادب کوش گو گناہ من است

اور اُن کے اس اعتذار کی شوخی ملاحظہ ہو

سہو و خطائے بندہ چو گیسند اعتبار

معنے معذورِ حمت پروردگار چیست ؟

حدیث شریف میں وارد ہے کہ اگر تم گناہ نہ کرتے اور توبہ نہ کرتے تو خدا تمہاری بجائے کسی ایسی قوم کو پیدا کر دیتا جو گناہ کرتی اور توبہ کرتی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخلاق قرآن کے حروفِ مقطعات کی طرح باطنی و معنوی کیفیتیں ہیں جو انسان کے ضمیر و ضمیر میں محرکاتِ مالیہ کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ فضائلِ نفس ہیں جو ذائلِ نفس کے مقابل و متخالف ہیں۔ امام اعظم نعمان بن ثابتؒ کا یہ قول کتنا بلیغ اور مبہنی بر حقیقت ہے کہ اعمالِ صالحہ جزو صورتِ ایمان ہیں، جزو حقیقتِ ایمان نہیں۔ اُن کے نزدیک اَلْاٰیْمَانُ

لَا يَزِيدُ وَلَا يَنْقُصُ کا تعلق مقولہ کیف سے ہے کمیت یعنی مقدار سے نہیں۔ مانا اظہار کی صورتوں میں ارتکاب معاصی سے اجتناب شامل ہے لیکن حقیقت اخلاق کا مفہوم اندر ایک وسعت و جامعیت رکھتا ہے جس کا تصور اہل باطن یعنی اصحاب دل ہی کر سکتے ہیں اہل الظہور اور اصحاب قشر کا اور اک اس حقیقت تک مشکل سے ہی پہنچ سکتا ہے، نہ در عبادت اپنی معنویت کے اعتبار سے مکارم اخلاق کے اصول کا ذریعہ تو ہو سکتی ہے لیکن حقیقت اخلاق پر اس کا کلی اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ضرورت اخلاق کے موضوع پر جب اظہار خیال کیا جائے تو حسن اخلاق کو اس کے وسیع معنی سے تعبیر کرنا چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کبائر سے مجتنب ہو۔ صوم و سلوۃ کا پابند ہو مگر حقوق العباد سے غافل ہو، خلق خدا کی دل آزاری کرتا ہو، یا رذائل نفس سے عادتاً مغلوب ہو تو اسے اخلاقِ عالیہ سے متصف قرار نہیں دیا جاسکتا۔ علاوہ بریں یہ بھی مشاہدہ ہے کہ فطرت کے مزاج یعنی طبیعتِ کلیہ میں میزانِ عدل و تعدیل کے ساتھ ساتھ ذوقِ جمال و کمال بھی کار فرما ہے۔ جمال و کمال کے یہ تکیے تیور فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک کائنات کے ذرہ ذرہ میں جلوہ نمایاں۔ بحر و بر، کوہ و دشت اور باغ و راغ۔ الغرض چمنستانِ وجود کے جملہ برگ و بار اور گل و خار مظاہرِ حسن و جمال سے معمور ہیں۔ البتہ بر حسبِ قابلیت و استعداد ممکنات بہ الفاظ دیگر ذاتِ بہت کے مظاہر صورتیہ میں تفاوتِ مراتب و مدارج ہے۔

ہر مرتبہ از وجود نکمے دارو

گر فرق مراتب نہ کنی زندہ یقی

اسی بنا پر اس عالم کو عالم اعتبارات و امناعات کہتے ہیں، نہ اس بنا پر کہ اس کا ہیولی یا مادہ اولیٰ مہیوم محض ہے۔

ہست این میکده و دعوت عام است این جا

قسمت بادہ بانداۃ جام است این جا

تعمینات ماہی مغارت کے لحاظ سے نیک و بد کے اضافی اعتبارات قبول کرتے ہیں حقیقت وجود ہمارے عقیدہ کے غیر و شر اور زشت و خوب کے تصورات سے ماوراء

مارفح واعلیٰ ہے۔

سُبْحَانَكَ، وَتَعَالَى عَمَّا يُصِفُونَ ۝

یہ ممکنات و مقیدات کی کوتاہ و امانیوں کی حکایت ہے۔ مہدائے فیاض کی املہ اور رو بہیت مطلقہ کا اس میں کچھ قصور نہیں۔ سہی نے کیا خوب فرمایا ہے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست

در بارخ لاله روید و در شورہ لوم خس،

اس مضمون کو شہیدی نے زیادہ درد مندانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس کے الطاف تو ہیں عام شہیدی لیکن

تجد سے کیا ضد تھی جو تو بھی کسی متابل ہوتا

غالب نکتہ داں کے ہاں اس کی تعبیر مابعد الطبیعیاتی رنگ اختیار کر گئی ہے۔

بر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے

یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

ممكنات کی قابلیت و استعداد کا مسئلہ حضرت حافظ نے اپنے خاص رنگ میں

ایسے۔

ہرچہ ہست از قامت ناسازی اندام ماست

ورنہ تشریف تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

ہماری عقل کی نارسائیاں اور غلط اندیشیاں محتاج تشریح نہیں۔ ہمارے مشاہدات

میری لہزشیں قدم قدم پر ہمارے خیال و تصور کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوتی ہیں۔

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمارا نفس ناطقہ ہمارے ماحول کی ناسازگاریوں، توارث کی

متوں اور نفسانی خواہشوں کی چیرہ دستیوں سے مجروح و مغلوب ہو جاتا ہے۔ بقول بیدل

ز دار انجمن مجاز اور بے تمیزی ہائے عالم اعتبارات میں مبتلا ہیں۔ اس لئے ہدایت ہستی

کے علاوہ کسی مافوق الشعور ہدایت کے بھی ہم محتاج ہیں۔ آئن سٹائن نے ابعاد غلاشہ

بب بعد یعنی زبان کا احاطہ کیا۔ اقبال نے نکلنے اور وائٹ ہیڈ کے نظریوں سے متاثر

ہو کر ایک اور امتداد یعنی الہام و وحی کا مزید اضافہ کر کے ہدایت نبوت کو عقلی طور پر قبول کر کے راستہ ہموار کر دیا۔ اس اعتبار سے وجدان صحیح، عقل مجرد یا مشاہدہ ماوراء الحسیات کہ ہدایت وحی و فیضان نبوت کی اصطلاحوں سے موسوم و معنون کیا گیا ہے۔ عقل سلیم یہ ماننے سے صوفاً انکار کرتی ہے کہ جس ربوبیت مطلقہ نے اس عالم آب و گل اور رنگ و بو میں ہمارے حیات انفرادی و اجتماعی کی تقویم اور نسلی بقا کے لئے برگ و ساز فراہم کیا ہے اور نظام فطرت میں تعلیلی حکمتوں کا ایک وسیع کارخانہ قائم کر رکھا ہے، اس نے ہماری اخلاق ترقی و تعالیٰ اور نور و فلاح کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اور کاروبار فطرت کی ہم آہنگی یعنی نظام کائنات کے قواعد ظاہری اور نفس انسانی کے قواعد باطنی کی سازگاری کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کا مواد بھی بر حسب قابلیت ہر فرد کائنات کے لئے موجود اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم مبداء قیاس، ہواد مطلق، ربوبیت مطلقہ، حکمت کاملہ اور معادلتہ بالغہ کے تصورات کی تصدیق کیونکر کر سکتے تھے؟ فیضان الہی میں جو تفاوت عالم آب و گل میں پایا جاتا ہے، وہ ممکنات (جنہیں اعیان اور صور علمیہ سے موسوم کیا جاتا ہے) کے طرف استعداد کے درجہ بہ درجہ تفاوت کو ظاہر کرتا ہے کیونکہ تخلیق عبارت ہے ظہور سے ۷

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش

کہ ہر چہ ساقی مارینت عین الطاف است

یہ ظاہر ہے کہ طلب جمال و کمال اور اصلاح بواطن احوال کے داعیات و محرکات ہر فرد بشر میں وجدانی طور پر موجود ہیں اور مکارم اخلاق کے بغیر آدمی انسان نہیں بن سکتا حضرت حافظ نے اس نکتہ کو بہت لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے ۷

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند

گل آدم بر شتند و بہ پیمانہ زدند

یہ بھی پایہ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ربوبیت اور رحمت مطلقہ کا یہ لا بدی تقاضا ہے کہ انسان کے اخلاق کی اصلاح و تعالیٰ کا اہتمام نظام کائنات میں ظاہری و باطنی

سے موجود ہو۔ ظاہری اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شے کی فطرت نشوونما اور ان کا تقاضا کرتی ہے۔ جمادات، نباتات اور حیوانات سب میں یہ تقاضا ودیعت ہے۔ کہیں جمادات میں برحمین و تعدیل صوری کے انداز میں ظاہر ہوتا نباتات میں قوتِ نامیہ کے فیضان سے اس میں نشوونما کی قابلیت کا اضافہ حیوانات میں حرکتِ جبلی، حسِ اعلیٰ اور بقائے نسل کی تحریکوں کے مزید اضافے و تباہی ہے اور حضرت انسان میں ان جملہ تقاضوں کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوقِ طہ کے افاضہ سے جمال و کمال کی طلب پیدا ہوتی ہے اور ترقی و تعالیٰ کا جذبہ رہتا ہے۔ شوہن باور تمام کائنات ہست و بود کو ارادہ اور خیال کی قوتِ فعال نگاہ تصور کرتا ہے۔ گویا یہ تمام عالم مشیت کی تخلیق ہے۔ اس مشیت کی حکمرانی رت کے اعتبار سے ”اختیار“ اور معنی کے اعتبار سے ”جبر و دلالت“ کرتی ہے۔ نباتات آزاد نہیں۔ وہ اسے ارادہ فطری، جس یا جبلیت باطنی قرار دیتا ہے جو ان کی ماہیت میں مندرج عملِ تخلیق و تکوین میں سرگرم رہتی ہے۔ اسلامی یہ وجدانی قوت ابتدائے ظہور و شہود میں عبارت ہے ”کلہ کن“، یعنی مشیتِ رب بعد از ظہور یعنی یہ ہنگام شعور عبارت ہے ”الہام“ یا ”ولی“ سے اور جب رت تکمیل کو پہنچتی ہے تو ”ولی نبوت“ سے تعبیر کی جاتی ہے۔ ہدایتِ ولی کا منت محمدیہ ہے۔ جملہ موجودات خارجی، عناصر فلکی اور حقائق باطنی (جنہیں اصطلاح علوی اور اہماتِ سفلی سے موسوم کیا جاتا ہے) کی مثالی صورت یہی حقیقت ہے نباتات میں جتنے حقائق ممکنات مرقوم ہیں، یعنی نظامِ فطرت میں جتنے مکونات القوتہ موجود ہیں، اور جتنے حقائق حصر کی قوانین قدرت اور لوازمِ فطرت میں کار فرما ہیں وہ حقیقتِ محمدیہ کے برزخِ کبریٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقتِ محمدیہ برزخ ہے عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے درمیان۔ بالفاظِ رب آبا ئے علوی یعنی فلکیات اور اہماتِ سفلی یعنی ذراتِ ارضی کے درمیان۔ اس طرح بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ حقیقتِ محمدیہ ایک تخلیقی شعوری قوت ہے



جو نظم کائنات کے لئے قوتِ عاملہ اور قوتِ منفعلہ میں ربط و اتحاد اور تعامل و تفاعل کا باعث ہوتی ہے۔ مابعد الطبیعات کی رو سے یہ شاہ ولی اللہ کی قوتِ مثالیہ ہے جس میں صور و معانی اور بطون و ظہور کا اتحاد و مندرج و مندرج ہے۔ ہدایت وحی اور فیضانِ ربوبیت کے مظہرِ اتم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ طبیعتِ کلیہ لوج محفوظ ہے۔ حقائق کائنات کی مثالیں، صورتیں کتابِ مبین (جسے اُم الکتاب بھی کہا گیا ہے) میں مندرج ہیں۔

صحیفہ کائنات میں جو معنوی حقائق مرئی و محسوس و مشہور ہیں، وہ محسوس و ظلال اُن صورِ مثالیہ کے ہیں، جو نور محمدی یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ مبارک میں منطبق ہیں۔ اسی معنی میں مولانا جامی فرماتے ہیں:-

سلام علیک نبیِ مکرم      مکرم تراز آدم و نسلِ آدم  
سلام علیک ز اسماءِ حسنی      جمالِ تو آئینہ اسمِ اعظم

اور ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-

نسخہ کونین را دیباچہ اوست      جملہ عالم بندگان و خواجہ اوست  
غالب نے بھی کہا ہے:-

آئینہ دار پر تو مہر است ماہتاب  
شان حق آشکار ز شانِ محمد است

اس لئے تعمیرِ اخلاق میں آنحضرتؐ کا اتباع واجب ہے۔ قرآن کہتا ہے کَعْدُ کَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اور خود آنحضرتؐ ختمی المرتبت کا ارشاد ہے کہ میں مکرم اخلاق کی تکمیل کے لئے مبعوث ہوا ہوں۔

یہ تو بالکل عیاں ہے کہ قومیں اپنے اخلاق یعنی سیرت و کردار کی بلندی و برتری سے عزت و بزرگی کا مقام حاصل کرتی ہیں۔ بقائے نفس یا تشخصِ انفرادی کے مسئلے کو حل کرنے کی مختلف صورتیں علمائے مابعد الطبیعات نے پیش کی ہیں۔

بعض اسلامی حکماء کا یہ خیال ہے کہ اخلاق اور اعمال سے انسان کا ایک مثالی جسم اس کی مجبورہ زندگی کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا اور نشو و نما پاتا رہتا ہے۔ اور اس کے

مزاج و اخلاق کی آئینہ داری کرتا ہے۔ اور یہی وہ صحت مثالی ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ ایک قسم کا شامی و چوہہ جس میں کسی فرد کے تشخص کے لطائف و کثافات منعکس اور مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابن عربی کے نزدیک جنتی جنت میں اس مثالی جسم کو اختیار کر کے داخل ہوں گے جو ان کے اخلاق و اعمال و افکار نے تیار کیا ہے۔

روزِ شریک جس قبر میں آدمی رہتا ہے، وہ اس کے مثالی جسم کا مثالی عالم ہے۔ اس مثالی جسم کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ نے نسو سے موسوم کیا ہے۔ بہر کیف انسان کی موجودہ اور آئندہ زندگی میں اس کے اخلاق کا جس میں اُس کے افکار و اعمال بھی شامل ہیں، بڑا عمل دخل ہے اور اس زندگی میں تو نفسِ مطمئنہ کا حصول مکارم اخلاق کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن کسی چیز کی ظاہری صورت کا انحصار خواہ اس کا تعلق اخلاق سے ہو یا اعمال سے اس کی باطنی یا معنوی حقیقت پر ہوا کرتا ہے۔ لہذا افرادِ انسانی کے اخلاقِ حسنہ کا مبداء و منشا اُن کے باطنی اخلاق کے منابع میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ جملہ فضائل اور اخلاقِ حسنہ کا سرچشمہ وحیِ نبوت ہے اور وحیِ نبوت کا انصاب جمالِ اپنی حدِ کمال کو اس وقت پہنچا جب آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی۔ اِسْمًا بُعِثْتُ لِأَتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ بالفاظِ دیگر اسلام نام ہے اخلاقِ عالیہ اور انسانیتِ کبریٰ کی تکمیل کا۔

اس بیان سے یہ واضح ہو گیا کہ ہمارے ضابطہ اخلاق اور تصوراتِ اخلاقیات اور جمالیاتِ اقدار کا سرچشمہ و نصب العین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مستجمع الصفات ہے۔ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ  
يَرْجُوا اللَّهَ

اہلِ الظواہر اور اہلِ بواطن یعنی اصحابِ صُور اور اربابِ معنی میں اور امر و نواہی شریعت کے ہمارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ دونوں گروہ شریعتِ مطہرہ کا احترام کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ صوفیائے کرام اخلاصِ نیت۔ تزکیہ نفس اور اصلاحِ باطن پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اہلِ الظواہر محض عبادت اور ظواہرِ شریعت کی پابندی کو کافی و ودانی

سمجھتے ہیں۔ کوتاہ بینوں نے صوفیاء کے اقوال پر جرح اسی قلعہ فہمی کی بنا پہ کی ہے۔

صوفیاء یا شعراء متصوفین نے جو ترکی بہ ترکی جواب دیا کار نامہ ہوں اور دنیا پر سد مابدوں یا علمائے سور کو دیا ہے، اُس کا سبب شریعت سے روگردانی نہیں ہے بلکہ خشک کی تنگ نظری۔ دیا کاری یا حد سے بڑھی ہوئی ظواہر پرستی ہے۔ بقول غالب :-

سخن کوتاہ مرادل ہم بہ تقوئے مائل است آما  
زننگ زابد اُقدام بہ کافر ماجرائے ما

اگر حضرت الوہیت کا تو بسبب بطونِ عام میں جو حضرت ابن عربی کے نزدیک مطلق پر بھی محیط ہے، پوشیدہ رہتا اور وقت سے فعل میں منتقل نہ ہوتا تو نہ صرف تکلیف شرمیہ بلکہ لازم جسمانیہ سے ہم آزاد رہتے اور تعمیر اخلاق کی سعی کے بھی منت کش ہوتے، لیکن کیا کیا جائے۔

دہر جُزء جلوة یکمائی معشوق نہیں  
ہم کہاں ہوتے جو حُسن نہ ہوتا خود ہیں

رہ و رسم منزل حضورِ سرورِ دو عالم کا ارشاد ہے کہ تخلقوا باخلافا  
اللہ کے اخلاق اپنے میں پیدا کرو۔ مولانا روم فرماتے ہیں  
تو در و گم شو وصالِ این است و بس  
تو مہاشِ اصلا کمالِ این است و بس

صفاتِ الہی سے متصف ہونا شرک نہیں۔ شرک سے مراد شرک فی الذات کیونکہ شرک فی الذات محال ہے اس لئے اصنام پرستی کے موہوم اعتبارات سے مفاوض حاصل ہو کر آدمی تعددِ الہ کے گمانِ باطل میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ سبحانہ و تعالیٰ کی صفاتِ جمال و کمال میں مشارکتِ جزئی یا موافقت شرک نہیں ایمان ہے۔ اگرچہ یہ تشریک ظنی و مجازی ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے ذاتِ مین اور صفاتِ مین ذات ہیں۔

حرم جوایاں درے راحی پرستند فقیہاں دفترے راحی پرستند

براہنگن پر وہ نامعلوم گرد و کہ یاراں دیگرے راجی پرستند  
انسان کو خلافت و نیابت الہی عطا ہوئی ہے اور خلیفہ وہی ہوتا ہے جو مختلف کی  
صفات کا حامل ہو۔ غالب مروج نے اس نازک مسئلے کو کیا خوب حل کیا ہے۔  
بحسب نشہ پیما صفات  
عارف ہمیشہ مست لئے ذات چاہئے

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ تعمیر اخلاق اور اصلاح باطن کے لئے اخلاق  
الہی سے بحسب ظرف و استعداد متصف ہونا چاہئے۔ اس دعوے یا مقدمہ کو تسلیم کرنے  
کے بعد یہ دیکھنا چاہئے کہ اخلاق الہیہ کیا ہیں۔ سورہ فاتحہ جو اُم الکتاب ہے اس بارے  
میں مکمل رہبری کر رہی ہے۔ حق سبحانہ تعالیٰ کی صفت کاملہ و جامعہ ربوبیت ہے۔ یعنی  
ہر فرد کی اُس کی استعداد و قابلیت کے لحاظ سے پرورش کرنا اور اس کی خفہ صلاحیتوں  
کو بیدار کرنا۔ ربوبیت کی دوسری صفت یہ ہے کہ کاروبار ربوبیت میں حق سبحانہ تعالیٰ  
خوبی و بیوندی مذہب و ملت اور رنگ و نسب کے تمام اضافی علاقے سے پاک ہے۔  
قُلْ هُوَ اللَّهُ أَحَدٌ ۝ اللَّهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَهٗ  
كُفُوًا أَحَدٌ ۝

ربوبیت کی تیسری صفت تحسین تخلیقات ہے۔ یعنی جملہ اشیاء میں حسن اعتدال  
اور تناسب سے موزونیت اور دل کشی پیدا ہو جاتی ہے نظام جسمانی اور بدن کے اعضاء  
و جوارح اور خدو خال بھی اس فیضان کا یہ نتیجہ علی قدر مدارج پایا جاتا ہے۔  
ربوبیت کی چوتھی صفت قوانین و نوا میں فطرت میں توافقی و ہم آہنگی پیدا کرنا ہے  
تاکہ انسان کی اجتماعی و انفرادی زندگی حسین و جمیل اور مستقیم و متکم ہو سکے۔ ربوبیت کی  
پانچویں صفت صمدیت ہے جسے ہم انسانی حدود و قیود کے اعتبار سے اشار  
سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جملہ تکلیفات شریعہ ہمارے نفس کی اصلاح اور ہماری معیشتی و  
معاشرتی بہتری کے لئے نہیں۔ نماز اس لئے ہے کہ وہ ہماری جسمانی و روحانی تطہیر کا  
بامثل ہے۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اے محمد! کہہ دو کہ میرا اتباع کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔" یہ تسلیم کرنے کے بعد یہ غور کرنا چاہئے کہ تعمیرِ اخلاق کا کونسا راستہ قرآن کریم اور شریعتِ مصطفویٰ نے متعین کیا ہے۔ سب سے پہلے اس ہدایت کو لیجئے جسے قبول کرنے کی استعداد ہر قلبِ انسانی میں ودیعت کی گئی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ۖ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۚ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ۚ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا ۚ

اس آیتِ کریمہ سے یہ ثابت ہو گیا کہ صلاحیت کم یا بیش ہر نفسِ انسانی میں بالطبع موجود ہے لیکن تزکیہ نفس بھی ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہونے کہ تعلیم و تربیت دونوں ضروری ہیں۔ قرآن کریم نے اس طریق کار کی بھی وضاحت فرمادی ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ

مراد یہ ہے کہ پہلے صرف آیاتِ الہیہ کو گوشِ نصیحت نیوش تک پہنچا دیا جائے کیونکہ کفر آشنا طبائع میں اس سے زیادہ استعداد موجود نہیں ہوتی۔

أَذْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ

یہاں یہ نکتہ بھی حل ہو گیا کہ قرآن کریم میں مننوی برکات و فیوضات سے علاوہ صوتی فیضان بھی ہے یعنی مجرد قرآن کریم کا سننا باطن میں ایک خاص قسم کا مزاج پیدا کرتا ہے۔ اس کے بعد نفس یا طبیعت تزکیہ کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ تزکیہ سے مراد طہارت پاکیزگی، صدق و اخلاص، محسن خیال و تحسینِ عمل، رقتِ قلب، ہمدردی، بنی نوع انسان - الغرض جملہ محاسن و مکارم اخلاق میں اس تزکیہ کے بعد انسان کے نفسِ ناطقہ میں آیاتِ محکمات و بینات یعنی ایسی آیات جن کا تعلق احکامات سے ہے سمجھنے اور قبول کر لینے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد قرآن کے بصائر و حکم معارف و حقائق، احکامِ الہیہ کی اصل غرض و غایت اور دین کی مننوی حقیقت معلوم کر لینے کا

میج ذوق و وجدان پیدا ہو جاتا ہے۔ گویا وہ شرح صدر ہو جاتی ہے جسے قرآن ”الحکمۃ“ سے تعبیر کرتا ہے اور غیر کثیر کا مترادف قرار دیتا ہے۔

وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

آیاتِ مشابہات میں چونکہ حقائق کو زیادہ تر تشبیہات و تمثیلات، اشارات و استعارات کے ذریعے بیان کیا گیا ہے جو عقول متوسطہ اور اذہان غیر بالغہ کے احاطہ سے ماوراء ہیں، اس لئے قرآن کریم نے یہ تنبیہ کر دی ہے کہ

وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ

آیاتِ مشابہات کی تاویل و تشریح وہی لوگ کر سکتے ہیں جو راسخ العلم ہیں۔ قرآن نے یہ ہدایت بھی کر دی ہے

فَاسْئَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

اگر تم ان کے معنی نہیں جانتے تو اہل ذکر سے پوچھ لیا کرو۔ یہاں اہل ذکر سے مراد ذاکرین یا عباد و زہاد نہیں۔ بلکہ صاحب بصیرت ذی علم لوگ ہیں، بلکہ اکثر اوقات یہ علم فیضانِ صحبت سے حاصل ہوتا ہے اور شرح صدر اور علم لدنی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تزکیہ نفس و تصفیہ باطن کے لئے ضبط نفس لازمی ہے۔ ضبط نفس تقویٰ یعنی خوفِ خدا کا دومر نام ہے ضبط نفس سے مراد تہذیب نفس اور ترک دنیا نہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے اسلام میں رہبائیت نہیں۔ حضرت ابن عربی کا قول ہے لا تتعب نفسك فانها غایۃ ما ذوقها غایۃ (اپنے نفس کو بے جا تکلیف میں نہ ڈالو۔ کیونکہ یہ نفس) وہ نایت تخلیق ہے جس کے اوپر اور کوئی غلبت نہیں)۔

تزکیہ نفس کے جو طریقے مخصوص ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) ضبط و تربیت نفس۔ اس کے لئے تطہیرِ بدن اور صلواتِ پنجگانہ مقرر ہیں، یہ

جسمانی و روحانی زندگی کا ایک انضباط ہے۔

(۲) تطہیرِ مال یعنی زکوٰۃ۔ اس میں معاشرہ کی بہبود اور ایک حد تک دولت کی تقسیم

میں مساوات کا اہتمام ہے۔ صدقات و خیرات اس کے علاوہ ہیں۔

(۳) تفکر و تدبیر۔ اس سے مراد نظام عالم کے کاروبار اور کلمات اللہ یعنی قوانین فطرت پر غور کرنا ہے۔ اس میں اپنی نفسیاتی اور ذہنی کیفیات اور تشریح الایمان اور وظائف اعضاء کی حکمت و مصلحت پر غور کرنا بھی شامل ہے۔ یہ باب معرفت الہی کا ہے جیسا کہ حدیث نبوی میں مذکور ہے من عرف نفسه فقد عرف ربه۔ اسی بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے ذَرِكُوا أَنْفُسَكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ اور غالباً ہی وہ تفکر ہے جس کے بارے میں یہ حدیث نبوی ہے تفکر ساعة خير من عبادة سنة (ایک گھڑی کا غور و فکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے)۔

شریعت کے ظاہر اور حقیقت کے باطن کی ہم آہنگی یعنی حقائق باطنی اور موجودات خارجی کی تعمیر و نو کو ایک ہی آئینہ حقیقت میں ہم رنگ دیکھنا طریقت کہلاتا ہے۔ اس لحاظ سے غیر عالم صوفی اور غیر صوفی عالم میں جو فرق ہے وہ تو ظاہر ہے، لیکن عالم صوفی اور صوفی عالم میں چنداں تفاوت نہیں۔ ایک چراغ است کہ از پرتو آں جلوه دیر و حرم ساختہ اند

عالم بے باہم متضاد عناصر مادی کے اجزائے لامتناہی پر مشتمل تصور کرتے ہوئے مجبوراً اضداد کہا جاتا تھا، اب اسی عالم کو منفی و مثبت و لامتناہی و لامتناہی برق پاروں کا مجموعہ قرار دیا جاتا ہے جس میں قابل تقسیم مادی ایٹم اور قوت ایسی وحدتوں بلکہ وحدت کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں، جو باہم متبادل ہیں۔ یعنی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

عالم حقیقت الخاق یعنی حضرت الوہیت کا اظہار مافی الضمیر کیفیت و کمیت کو چاہتا ہے یعنی الفاظ کے لباس میں نشوونما پاتے ہیں۔ باطنی حقائق ظاہری تمثیلوں کے روپ میں جلوه آرا ہوتے ہیں، اسی لئے غالب نے کہا ہے

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری و ہم کردیا کافران اصنام خیالی نے مجھے اگرچہ برقی نور زجاجی پیرہنوں سے مستغنی ہے، لیکن منصفہ شہود پر جلوه افروزی قمقوں کی استفادی قابلیت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ پس قید ہستی کی اندھیری کوٹھڑیوں میں روشنی بغیر صورتوں کے کیونکر ہو سکتی تھی۔ یعنی ہمارے دماغی ظلیات اور ذہنی و حیاتیاتی جراثیموں میں رنگ و بو کے شخصی اختیارات کس طرح شرائط ظہور سے بے نیاز رہ سکتے تھے۔

## زکوٰۃ کا نظام شرعی

ابو سلمان شاہ جہا پوری

جماعتی زندگی اور اس کے خصائص اسلام نے جماعتی زندگی کے قیام پر جس درجہ زور دیا ہے کسی چیز پر اتنا زور نہیں دیا۔ اسلامی تعلیمات میں جس درجہ اجتماعیت نمایاں ہے، کوئی چیز نمایاں نہیں۔ اجتماعیت اسلامی زندگی کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ دنیا کا کوئی دین اور مذہب سیاسی اسس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسلام نے فرد کی صلاح و فلاح کو نظر انداز نہیں کیا لیکن اس کی صلاح و فلاح کو اجتماعی زندگی سے وابستہ کر دیا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر صنف اور ہر حکم میں جماعتی زندگی کے خصائص تلاش کئے جاسکتے ہیں لیکن ان سب میں جو اہمیت قیام صلوٰۃ اور اولئے زکوٰۃ کو حاصل ہے وہ اسلام کے کسی حکم کو حاصل نہیں جیٹی کہ یہ دونوں احکام اسلامی جماعتی زندگی کی شناخت قرار پائے۔ اقرار توحید و رسالت کے بعد صرف ان دو احکام کی تعمیل کسی شخص یا جماعت کو اسلامی برادری یا اسلامی جماعتی زندگی کا رکن بنا دیتی ہے۔ چنانچہ سورہ توبہ میں فرمایا: - **وَلَا تَقْبَلُوا دَانَ قَوْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَاِخْوَانُكُمْ**



بنی الدین۔ ”یعنی اگر یہ سرکش و باغی قبائل قبائلی قویش اپنی گزشتہ شرارتوں سے باز آجائیں اور نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں تو پھر ان کے خلاف تمہارا ہاتھ نہیں اٹھنا چاہیے۔ اس یہ تمہارے دینی بھائی ہو گئے۔“

اسی طرح ان دونوں بلکہ ایک عمل کا ترک و فقدان بھی اسلامی جماعتی زندگی کی خصوصیت مٹا دیتا ہے اور حتیٰ انوث چھین لیتا ہے۔ احادیث اس باب میں بے شمار ہیں۔ کفر سے اسلام اور غیر اسلامی زندگی سے اسلامی زندگی کو نماز ہی ممتاز کرتی ہے۔ نماز کا ترک فقدان غیر اسلامی زندگی کا ثبوت ہے اور جہاں تک اس کے مضر اثرات کا تعلق ہے ترمذی کی اس حدیث میں نتائج کا ذکر صراحتہ موجود ہے ”لا یسرون کفرًا الا ترک الصلوٰۃ“ یعنی بنیادی عقائد کے باوجود ترک نماز مخرج عن الملت ہے۔

اسلامی جماعتی زندگی میں زکوٰۃ کی جواہریت ہے، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں جب ایک جماعت نے ادائے زکوٰۃ سے انکار کیا تو امیرِ شریعت اور احکام اسلامی کے سب سے بڑے رمز شناس و واقف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے اسی طرح قتال کیا جس طرح دشمنانِ اسلام و ملت سے کیا گیا تھا۔ احادیث اس باب میں واضح و قطعی ہیں۔ نماز و زکوٰۃ کے ترک و فقدان کے مخرج عن الملت ہونے میں دو رتبے نہیں ہو سکتیں۔ بالفرض لسانِ نبوت و ترجمانِ وحی علیہ الصلوٰۃ والسلام اس باب میں بالکل خاموش ہوتی اور اس باب میں مسلمانوں کا کل سرمایہ فکر قرآن کی آیت کا یہ ٹکڑا ہوتا وان تلبوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاحوا نکھ فی الدین تو اس باب میں تمام احکام و مسائل کے استنباط کے لئے کافی تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر سرکشی سے توبہ اور قیامِ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا عہدِ مستحکم ان کو اسلامی برادری کا رکن بنا سکتا ہے اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں رکھا کہ ان دو احکام پر عمل اور ان کے قیام کے بعد ان پر ہاتھ اٹھایا جائے تو صرف ادائے زکوٰۃ و قیامِ صلوٰۃ کا انکار ان کو اسلامی جماعتی زندگی سے خارج بھی کر سکتا ہے اور ان سے اسلامی حتیٰ انوث بھی چھین لے سکتا ہے، اس لئے کہ حقیقتہً نماز یا زکوٰۃ کے قیام و ایثار سے ان کا یہ انکار نہیں بلکہ اسلامی برادری سے خروج اور ارتداد الی اظلم

علان ہے۔ اس کے بعد ان کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اسلامی جماعتی زندگی کے لئے حصہ پائیں۔

کی میں زکوٰۃ کی اہمیت اسلام نے جماعتی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس میں نماز اور زکوٰۃ کی جو حیثیت، اور ہر کی سطروں میں صرف اشارہ کیا گیا ہے۔ آئندہ سطروں میں ہم حکم زکوٰۃ، اور زکوٰۃ کے شرعی نظام کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ مصالح زکوٰۃ کی نسبت مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:۔

! میں کوئی دین نہیں جس نے محتاجوں کی اعانت اور ابناء جنس کی خدمت کی تلقین سے عبادت یا عبادت کا لازمی جز قرار دے دیا ہو لیکن یہ خصوصیت صرف وہ صرف اتنے ہی پر قانع نہیں ہوا بلکہ ہر مستطیع مسلمان پر ایک خاص میکس سے اپنی آمدنی کا حساب کر کے سال بسال ادا کرنا چاہئے اور پھر اسے اس درجہ اعمال میں نماز کے بعد اسی کا درجہ ہوا اور قرآن نے ہر جگہ دونوں عملوں کا ایک یہ بات واضح کر دی کہ کسی جماعت کی اسلامی زندگی کی سب سے پہلی شناخت، نماز اور زکوٰۃ۔ اگر کوئی جماعت بحیثیت جماعت کے انہیں یک قلم ترک کر دے مار مسلمانوں میں نہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام نے مانعین زکوٰۃ سے حضرت ابوبکر نے کہا واللہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔

س باب میں اس کی دوسری خصوصیت بھی ہے یعنی وہ علت جو نہ صرف زکوٰۃ ہم صدقات و خیرات کے لئے قرار دی گئی اور جس کی وجہ سے اس معاملہ نے ہری ہی نوعیت اختیار کر لی۔

سُون دُونۃ تاکہ ایسا نہ ہو، مال و دولت صرف دولت مندوں

، میں مولانا آزاد کی تجاویز کے تمام حوالے ترجمان القرآن جلد دوم سے منقول ہیں۔

بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ وَبَيْنَكَ ط کے گروہ ہی میں محصور ہو کر رہ جائے۔

یعنی زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ دولت سب میں پھیلے، سب میں بٹے، کسی ایک گروہ ہی کی ٹھیکہ داری نہ ہو جائے۔

اور حدیث بعث معاذ الی الیمن میں زکوٰۃ کا مقصد یہ فرمایا کہ

تَوَخَّذْ مِنْ اَغْنِيَا تَهُمْ ان کے دولت مندوں سے وصول کی جائے اور

فَتَرُدَّ فِي فَقْرَا تَهُمْ پھر ان کے محتاج افراد میں لوٹائی جائے۔

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ قرآن کی روح احکام و اختصاص کے خلاف ہے یعنی وہ نہیں چاہتا کہ دولت کسی ایک گروہ کی ٹھیکہ داری میں آجائے یا سوسائٹی میں کوئی ایسا طبقہ پیدا ہو جائے جو دولت کو خزانہ بنا بنا کر جمع کرے۔ بلکہ وہ چاہتا ہے کہ دولت ہمیشہ سیر و گردش میں رہے اور زیادہ سے زیادہ تمام افراد قوم میں پھیلے اور منقسم ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ورثہ کے لئے تقسیم و اسہام کا قانون نافذ کر دیا۔

”اور پھر یہی وجہ ہے کہ اس نے سود کا لین دین حرام کر دیا اور قاعدہ یہ ٹھہرایا کہ

يَسْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيهِ الصَّدَقَاتُ یعنی اللہ سود کا جذبہ کھٹانا چاہتا ہے اور خیرات کا جذبہ بڑھانا چاہتا ہے یعنی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے مقابل ہوں گی۔ جس قوم میں سود کا جذبہ ابھرے گا اس کے غالب افراد شقاوت و عروجی میں مبتلا رہیں گے۔ جس قوم میں خیرات کا جذبہ ابھرے گا اس کا کوئی فرد محتاج و غفلت نہیں رہے گا۔ اور اسی لئے اس نے سود کے معاملہ کو اتنی اہمیت دی کہ فرمایا:۔ جو لوگ اس پر مصر رہیں گے وہ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کریں گے فاذا نوا بحرب من الله ورسوله“

مصارف زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ کے باب میں سورہ توبہ کی یہ آیت اصل و قطعی ہے۔

لِمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ وَالْعَمِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ صدقہ کا مال (یعنی مال زکوٰۃ) کو کسی کے لئے نہیں ہے، صرف فقیروں کے لئے ہے اور ان کے لئے جو اس کی پوری کے کام پر مقرر کئے جائیں مادہ کہ ان کے دلوں میں (کلمہ

قُلُوبُهُمْ وَ فِي  
السَّرَّابِ وَالْعَارِمِينَ  
و فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ ابْنِ  
السَّبِيلِ قَرِيبَةً مِّنَ  
اللَّهِ وَ اللَّهُ عَلِيمٌ  
حَكِيمٌ ۝

حق کی) الفت پیدا کرنی ہے، اور وہ جن کی گردنیں (غلامی  
کی زنجیروں میں) جکڑی ہیں (اور انہیں آزاد کرانا ہے) نیز  
قرضداروں کے لئے (جو قرض کے پوچھ سے دب گئے  
ہوں اور ادا کرنے کی طاقت نہ رکھیں) اور اللہ کی راہ میں  
(یعنی جہاد کے لئے اور ان تمام کاموں کے لئے جو شل  
جہاد کے اعلاء کلمۃ حق کے لئے ہوں) اور مسافروں  
کے لئے (جو اپنے گھر نہ پہنچ سکتے ہوں اور مفلسی کی  
حالت میں پڑ گئے ہوں۔ یہ اللہ کی طرف سے ٹھہرائی  
ہوئی بات ہے اور اللہ (سب کچھ) جانتے والا (اور اپنے تمام  
حکموں میں) حکمت رکھنے والا ہے۔

اس آیت کے تفسیری نوٹ میں مولانا آزاد فرماتے ہیں :-

”یہ آٹھ مصارف جس ترتیب سے بیان کئے ہیں اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ  
محلہ کی قدرتی ترتیب یہی ہے۔ سب سے پہلے ان دو گروہوں کا ذکر کیا جو استحقاق میں سب  
سے مقدم ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا اولین مقصود انہی کی اعانت ہے، یعنی فقراء اور مساکین۔ پھر اس  
گروہ کا ذکر کیا جس کی موجودگی کے بغیر زکوٰۃ کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور اس اعتبار سے  
اس کا تقدم ظاہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا استحقاق بالذات نہیں تھا اس لئے اولین جگہ نہیں دی  
جاسکتی۔ پس دوسری جگہ پائی العالمین علیہا۔ پھر مؤلف قلوبہم کا درجہ ہوا کہ ان کا دل ہاتھیں  
لینا ایمان کی تقویت اور حق کی اشاعت کے لئے ضروری تھا۔ پھر غلاموں کو آزاد کرانے،  
اور قرضداروں کو بار قرض سے سبکدوش کرانے کے مقاصد نمایاں ہوئے، جو نسبتاً موقت اور  
محدود تھے۔ پھر فی سبیل اللہ کا مقصد رکھا گیا کہ مستحقین کی پچھلی جماعتیں کسی وقت مفقود  
ہو گئی ہوں، یا کم ہو گئی ہوں یا مقتضیات وقت نے ان کی اہمیت کم کر دی ہو یا مالی زکوٰۃ  
کی مقدار بہت زیادہ ہو گئی ہو تو ایک جامع اور عادی مقصد کا دروازہ کھول دیا جائے  
جس میں دین و امت کے مصلح کی ساری باتیں آجائیں۔ سب کے آخر میں ”ابن السبیل“

کی جگہ ہوتی کہ تقدم میں یہ سب سے کم اور مقدار کے لحاظ سے بہت ہی محدود صورت میں پیش آنے والا معرف تھا۔

**فقرار اور مساکین** آیت زکوٰۃ کے ترجمہ میں مولانا آزاد نے فقر اور مساکین کے لئے دوسرے الفاظ اختیار نہیں کئے کیونکہ عربی میں فقر اور مسکنت سے مقصود احتیاج کی دو مختلف حالتیں ہیں اور ضروری تھا کہ ان کی لغوی نوعیت بہ نسبت قائم رکھی جائے۔ فقیر اور مسکین کے فرق کو مولانا مرحوم ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں۔

”فقیر اور مسکین دونوں سے مقصود ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں، لیکن ”فقر“ مایہ سے اور ”مسکنت“ کی حالت خاص ہے۔ فقیر اُسے کہیں گے جس کے پاس ضروریات زندگی کے لئے کچھ بھی نہیں۔ لیکن مسکین وہ ہے جس کی احتیاج ابھی اس آخری درجہ تک تو پہنچ رہی ہے مگر پہنچ جانے کی اگر خبر گیری نہ کی جائے۔“

”فقیر اور مسکین میں اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فقیر کو سوال کرنے میں عار نہیں ہوتا لیکن مسکین کو اس کی خود داری اور عزت نفس طلب والحاہ کی اجازت نہیں دیتی صحیحین کی ایک حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکین کی یہ تعریف کی ہے کہ الذی لا یجده غنی یغنیہ ولا یفطن فیتصدق علیہ، ولا یقوم فی سال الناس جسے ایسے وسائل میسر نہیں کہ تو فکر کر دیں، جس کا فقر ظاہر نہیں کہ لوگ خیرات دیں جو خود سوال کے لئے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور پھر اسی حدیث میں سورہ بقرہ کی آیت کی طرف اشارہ فرمایا کہ ”یحسبہم الجاہل اغنیاء من التعفف تعرفہم بسیلہم لا یسئلون الناس الخافاً“ ان کی خود داری کا یہ حال ہے کہ ناواقف خیال کہہ کر یہ تو تو فکر ہیں، تم انہیں ان کے چہروں سے پہچان لے سکتے ہو مگر وہ لوگوں کے نیچے پرکر کبھی سوال نہیں کرتے۔“

”بلاشبہ ایسے علماء دین جو سورہ بقرہ کی آیت متذکرہ صدر کے مصداق ہوں کہ ”الذین احصوا فی سبیل اللہ لا یستطیعون ضرباً فی الارض“ یعنی دین کی تعلیم و دعوت کے لئے وقف ہو گئے ہوں اور فکرِ معیشت کے لئے وقت نہ نکال سکیں ”مساکین“ میں

نہیں بلکہ انہوں نے تعلیم دین کو حوصلہ نہ بنالیا ہو، مایحتاج سے زیادہ  
 بچے ہوں اور کسی حال میں خود سائل و ساعی نہ ہوتے ہوں۔ نیز وہ تمام افراد جو ان کی طرح  
 سب دین و امت کے لئے وقف ہو جائیں اور معیشت کا کوئی سامان نہ رکھتے ہوں۔  
 ”قوم کے تمام ایسے افراد جن پر وسائل معیشت کی تنگی کی وجہ سے معیشت کے دروازے  
 ہو رہے ہیں اور اگرچہ وہ خود پوری طرح ساعی ہیں لیکن نہ تو نوکری ہی ملتی ہے نہ کوئی اور  
 معیشت نکلتی ہے یقیناً مساکین میں داخل ہیں“

”ایسے افراد بھی جو خوشحال تھے، لیکن کاروبار کی خرابی کی وجہ سے یا کسی اور ناگہانی  
 بیت کی وجہ سے مفلس ہو گئے ہیں اگرچہ اپنی پچھلی معیشت کی بنا پر محرز سمجھے جاتے ہوں  
 مساکین“ میں داخل ہیں“

زکوٰۃ کا ایک مصرف ”سبیل اللہ“ اور اس کی شرح  
 واضح ہیں، امتیاز تشکیق  
 ہیں۔ البتہ ساتواں مصرف یعنی ”سبیل اللہ“ بوجہ اہمیت رکھتا ہے اور ضروری ہے کہ اس  
 بشریح کر دی جائے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں :-

”قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہ راست دین و ملت کی حفاظت اور  
 دین کے لئے ہوں، سبیل اللہ کے کام ہیں اور چونکہ حفظ و صیانت امت کا سب سے  
 زیادہ ضروری کام دفاع ہے اس لئے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا۔ پس اگر دفاع و پیش ہے  
 رانام وقت اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ تہ زکوٰۃ سے مدد ملی جائے تو اس میں خرچ  
 اچھے گا۔ ورنہ دین و امت کے عام مصالح میں مثلاً قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت  
 مدارس کے اجراء و قیام میں، دعا و مبلغین کے قیام و ترسیل میں، ہدایت و ارشاد  
 امت کے تمام مفید وسائل میں“

”فقہاء و مفسرین کا ایک گروہ اسی طرف گیا ہے اور بعضوں نے تو اسے اس درجہ  
 کم کر دیا کہ مسجد، کنواں، پل اور تمام اس طرح کی تعمیرات خیرہ بھی اس میں داخل ہیں۔ وقیل  
 ناللفظ عام فلا یجوز قصرة علی نوع خاص ویدخل فیہ جمیع وجوہ الخیر

من تكفين الموتى وبناء الجسور والمحصون وعمارة المساجد ذلك (نیل الاوطار فقہاء حنفیہ میں سے صاحب قنایہ ظہیر کہتے ہیں المراد طلبۃ العلم اور صاحب ہدایہ کے نزدیک وہ تمام کام جو نیکی اور خیرات کے لئے ہوں اس میں داخل ہیں)۔

**زکوٰۃ کی تقسیم** اس سلسلے میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی ہر رقم ان تمام مصارف میں دہونا تقسیم کی جائے یا یہ کہ جس مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہو اس میں خرچ کی جائے؟ اس سوال کے جواب میں مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں :-

”اس بارے میں فقہاء نے اختلاف کیا لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ تمام مصارف میں بیک وقت تقسیم کرنا ضروری نہیں۔ جس وقت جیسی حالت اور جیسی ضرورت ہو اسی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے اور یہی مذہب قرآن و سنت کی تصریحات اور روح کے مطابق ہے۔ ائمہ اربعہ میں صرف امام شافعی اس کے خلاف گئے ہیں“

**فریضہ عظیمہ دفاع اور زکوٰۃ** مصارف زکوٰۃ میں ایک مصرف ”سبیل اللہ“ ہے اور معلوم ہو چکا کہ وہ تمام کام جو دین و ملت کی حفاظت و صیانت اور تقویت کے ہوں۔ سبیل اللہ کے کام ہیں۔ مثلاً ملک و ملت کے دفاع کا مسئلہ سامنے آگیا ہے یا ایک قوی دشمن سے مقابلہ کی تیاری مقصود ہے، اگرچہ فوری طور پر حملہ کا کوئی خطرہ نہیں البتہ احتیاط اور پیش بندی کا تقاضا ہے کہ اس کے مقابلے کے لئے تمام ضروری اور ہمہ قسم کے جدید ترین جنگی ساز و سامان سے تیار رہا جائے تو فقہاء جمہور اور ائمہ اربعہ اتفاقاً امام شافعی کا مسلک یہی ہے کہ زکوٰۃ کی ساری رقم بھی اس مذہبی خرچ کی جاسکتی ہے۔ اگرچہ حکومت وقت نے جنگی اور دفاعی اخراجات کے لئے کتنے ہی ٹیکس لگائے ہوں اور رضا کارانہ طور پر بھی لوگوں نے اس مصرف میں فراخ دلانہ حصہ لیا ہو۔ یہاں سوال صرف جواز کا ہے کسی خاص صورت میں فتویٰ کا نہیں۔

بلاشبہ حکومت اپنے کاموں کو چلانے اور ملک و قوم کی ترقی کے لئے مختلف قسم کے ٹیکس لگاتی ہے۔ اس میں ملک و ملت کی حفاظت و دفاع بھی شامل ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ چونکہ حکومت دفاع اور جنگی تیاریوں کے لئے ٹیکس وصول کرتی ہے

اس لئے قرآن نے زکوٰۃ کے باب میں ”سبیل اللہ“ کے جامع لفظ سے مصرف زکوٰۃ کا جو دروازہ کھولا ہے (جس میں حفظ وصیات امت اور دفاع ملک کی جملہ ضروریات اور تیاریاں نہ صرف شامل ہیں بلکہ انہیں تقدم حاصل ہے) اس میں بر زکوٰۃ سے کوئی رقم خرچ نہ کی جائے۔ اگر کوئی ایسا خیال کرتا ہے تو یہ اس کے فہم کا بہت بڑا قصور ہے۔ اور یہ کہا جائے گا کہ اس نے حفظ و دفاع ملت کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں۔

اس قسم کے مواقع قوم کی زندگی میں کبھی کبھی آتے ہیں، ایسے اہم اور نازک مواقع پر اس قسم کی نکتہ آفرینیاں کہ چونکہ فلاں فلاں مصارف کے لئے حکومت ٹیکس لیتی ہے، اس لئے زکوٰۃ کی رقم اس میں خرچ نہیں کی جاسکتی، ملت اسلامیہ کے لئے مہلک اور خطرناک ہے۔ اگر قومی اور اجتماعی زندگی کے ایسے نازک لمحات میں قصور فہم کی بنا پر کوتاہی عمل ہو تو ممکن ہے کہ فقرار و مساکین کی امداد، مسافروں کی اعانت، قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت، مدارس دینیہ کے اجراء و قیام، دعاۃ و مبلغین کے قیام و ترسیل اور ہدایت و ارشاد امت کے وسائل کے اہتمام کی کبھی ضرورت ہی نہ پیش آسکے اور ہماری غفلت اور کوتاہی عمل وہ حالات پیدا کر دے جس کے بعد مسلمانوں اور اسلامی زندگی کا وجود و نشان ہی باقی نہ رہے۔

ہاں! حکومت کے ان مصارف پر ضرور نظر رکھنی چاہیئے، جہاں حکومت زکوٰۃ کی یہ رقم خرچ کرتی ہے اور دیکھنا چاہیئے کہ حکومت کے پیش مصارف کا مسلمانوں کی اجتماعی زندگی، ملک کے دفاع، ملت کی حفاظت اور قوم کے عمومی مفاد سے کیا تعلق ہے؟ اگر تعلق نہیں ہے تو یقیناً یہ زکوٰۃ کا صحیح مصرف نہیں ہے۔ حکومت اس کے لئے عند اللہ مسئول ہوگی اور اگر علماء کرام اس موقع پر فریضہ تبلیغ حق ادا کرنے سے قاصر ہیں تو وہ اللہ کے نزدیک جرم ہوں گے۔ لیکن اگر کوئی ایسا کام ہے جو دین و ملت کی حفاظت و تقویت کے لئے ہو تو وہ ”سبیل اللہ“ میں داخل ہے اور اسلامی حکومت زکوٰۃ کی رقم کا کل یا جز اس کام میں صرف کر سکتی ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں:-

”چونکہ حفظ وصیات امت کا سب سے زیادہ ضروری کام دفاع ہے اس لئے



(سبیل اللہ کا) زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا۔ پس اگر دفاع درپیش ہے اور امام وقت اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مد زکوٰۃ سے لی جائے تو اس میں خرچ کیا جائے گا ورنہ دین و امت کے عام مصالح میں۔“

مذکورہ تمام کام تو وہ ہیں، جو قرآن کے بتائے ہوئے زکوٰۃ کے ایک بڑے مصرف ”سبیل اللہ“ میں آتے ہیں۔ اگرچہ حکومت ان کاموں کے لئے میکس بھی وصول کرتی ہو لیکن اسے اختیار ہو گا کہ وہ مد زکوٰۃ کی کل رقم یا اس کے کسی جز کو ہنگامی حالات میں جنگی اور دفاعی مصارف میں استعمال کر لے۔ بلکہ ملک و قوم کی حفاظت و دفاع کا فریضہ اتنا اہم ہے کہ اگر حکومت ضرورت محسوس کرے تو وہ قومی آمدنی اور بچت کا کوئی حصہ اور کسی شرح سے بھی بشمول زکوٰۃ وصول کر سکتی ہے۔

معلوم کرنا چاہئے کہ زکوٰۃ کے بارے میں جن اہم اور عمدہ مصلحتوں کی سب سے زیادہ رعایت کی گئی ہے وہ دو ہیں۔ ان میں سے ایک کا تعلق تہذیب نفس سے ہے۔ اور وہ ہے کہ نفوس انسانی کے اندر عموماً بخل کی خصلت موجود ہوا کرتی ہے۔ اور ظاہر کہ بخل ایک بدترین وصف اور بدترین آفت ہے۔ جو معاد و آخرت میں انسان کے لئے سخت مضرت رساں ہے۔ بخیل کا قلب موت کے وقت بھی مال و دولت کی محبت میں اُبھا رہتا ہے۔ اور اسی اُبھاؤ کی وجہ سے عذاب دیا جاتا ہے۔ جو شخص زکوٰۃ کا عادی بن جاتا ہے بخل کی خصلت اور عادت کو دور کر دیتا ہے اور زکوٰۃ کے ذریعہ اس کا ازالہ کر دیتا ہے۔ اس کے حق میں یہ چیز ایک بہترین نفع بخش چیز بن جاتی ہے۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

# حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

## مکتوبات

مولانا نسیم احمد فریدی امر دہلوی

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے مکتوبات کا مختصر مجموعہ ہے جس کو حضرت شاہ اہل اللہؒ نے مرتب کیا ہے اور جو مطبع احمدی (متعلق مدرسہ غفری دہلوی) اور مطبع مجتبیٰ دہلی میں طبع ہو چکا ہے۔ ان مطبوعہ نسخوں میں کثرت سے اخلاط کتابت پائی جاتی ہیں۔ ایک قلمی نسخہ بھی اس مجموعے کا نظر سے گزرا اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ مطبوعہ نسخے میں بہت گڑبڑ کر دی گئی ہے۔ کہیں ایک مکتوب کا کچھ حصہ دوسرے مکتوب میں شامل کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے دونوں مکتوب ناقابل فہم بن گئے، کہیں نفی کی جگہ اثبات اور اثبات کی جگہ نفی ہے جس سے مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ بعض جگہ لفظ دوسرا لکھ دیا گیا ہے جس کی بنا پر مطلب خبط ہو گیا ہے۔ طول تحریر کا خوف ہے ورنہ میں ہر قسم کے اخلاط کے چند نمونے اس موقع پر پیش کرتا۔

مکتوبات کے شروع میں حضرت شاہ اہل اللہؒ کا ویسا چہرہ ہے جس میں یہ بات ظاہر کی گئی ہے کہ ”میں نے یہ مکتوبات، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں جمع کر لئے تھے ایک دن میرے ہاتھ میں یہ مجموعہ دیکھ کر حضرت والاؒ نے ارشاد فرمایا کہ اے اہل اللہ! تم ان خطوط کو ترتیب دے دو تاکہ ان سے پورا پورا فائدہ حاصل ہو۔ میں نے حکم مالی کی بجا آوری کی

اور اس مجموعہ مکتوبات کا ”انفاس رحیمیہ“ نام رکھا۔ اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے اور اسی پر میرا بھروسہ ہے۔“

اس مجموعہ مکتوبات میں سب سے پہلے ایک تحریر ہے جو غالباً کسی کے نام مکتوب ہے شروع میں مکتوب الیہ کا نام درج نہیں۔ یہ تحریر اچھا خاصہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں بہت سے اہم مضامین آگئے ہیں۔

اس کی ابتداء اس مشہور حدیث سے کی گئی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرحم اللہ من لا یرحم الناس۔  
فواتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔  
اس کے بعد دوسری حدیث لکھی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
التراحمون یرحمهم الرحمن  
ارحموا من فی الارض یرحمکم  
من فی السماء۔  
رحمن جل شانہ ان لوگوں پر رحمت فرماتا ہے  
جو اس کی مخلوق پر رحم و شفقت کرتے ہیں  
تم زمین پر رہنے والے تمام انسانوں پر رحم  
کرو آسمان والا تم پر رحمت کرے گا۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ارقام فرماتے ہیں:-

اس حدیث میں تمام انسانوں پر رحم کرنے کو فرمایا گیا ہے چاہے نیک ہوں یا بد۔  
بدوں پر رحم کرنا یہ ہے کہ ان کو بدی سے باز رکھا جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جو بھی قابل  
رحم ہو اس پر رحم کرو۔ کوئی بھی ہو۔

من فی السماء میں آسمان کی تخصیص اللہ تعالیٰ کے کمال وسعت اور علو و ارتفاع کی  
بنا پر ہے یا ”من فی السماء“ سے ملائکہ مراد ہیں کہ وہ رحم کرنے والوں کے لئے اللہ تعالیٰ  
سے رحمت کی درخواست کرتے ہیں۔ یا یہ مراد ہے کہ ملائکہ، رحم کرنے والوں کی شیاطین جن  
و انس سے حفاظت کرتے ہیں (یہ حفاظت کرنا گویا کہ رحم کرنا ہے)۔

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔ اے طالب قرب مولیٰ اور اے قاصد سعادت  
دنیا و عقبی، اللہ کے بندوں پر شفقت اور رحم کرنا خاصہ حضرت خداوندی ہے اور انبیاء۔

اولیاء کی صفات کاملہ میں سے ایک صفت ہے۔ پس تو اس امر کی کوشش کر کہ سورج  
ان طرح ہر نیک و بد پر چمکے۔ مخلوق کی بد اخلاق کو برداشت کر اور ان سے رحمت و  
شفقت کو موقوف نہ کر۔

حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے خَيْرُ النَّاسِ مَنْ  
يُشْفَعُ النَّاسَ لَوْ كُنَ فِي سَبَبٍ مِنْهُمْ سَبَبٌ يَنْفَعُ بَعْضَهُمْ نَافِعًا يَنْفَعُ بَعْضَهُمْ نَافِعًا  
صلى الله عليه وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جو بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا اور اس کی ضرورت  
پوری کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس بندے کی نصرت و حاجت روائی فرماتا ہے۔

اس کے بعد ان دو عورتوں کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق حدیث میں مذکور ہے کہ  
ان میں ایک عورت نیک اندھا پارسا تھی ایک بتی کے ساتھ بے رحمانہ سلوک کرنے کی وجہ  
سے عذاب ہوا۔ اور دوسری عورت جو نیک چلن نہیں تھی ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے  
کی وجہ سے اجر یاب ہوئی اور بخشی گئی۔

پھر کچھ عبارت کے بعد فرماتے ہیں۔ ”آخر اس دایرہ کو چھوڑنا ہے اور دایرہ جزا و  
بقا میں پہنچنا ہے لہذا نفسانیت اور تکبر کو اپنے اندر سے نکال کر پھینک دے اور اعمال  
پر بروسہ نہ کر فضل و کرم غفار پر نظر رکھ۔ جہاں تک ہو سکے لوگوں کے دلوں کو راحت  
پہنچا اور مخلوق سے ترحم و شفقت کا معاملہ کر۔ اور اپنے آپ کو بُری صفات سے علیحدہ رکھ۔  
اسے طالبِ موتی غور کر کہ ایک حیوان کو راحت پہنچانے کی وجہ سے ایک جہنمی کو جنتی  
کر دیا گیا۔ اگر انسان کو راحت پہنچانے سے حضرت رحمن تجھ کو اپنا مقرب بنالیں تو کیا بعید  
ہے۔ اور ایک حیوان کو تکلیف پہنچانے سے ایک انسان دوزخ میں پہنچا تو اگر کسی بندہ  
کے دل کو جو کہ حرمِ انوارِ حق اور محلِ اسرارِ خدا ہے۔ کوئی شخص تکلیف پہنچائے اور اس  
کے نتیجے میں اسفل سافلین میں گر جائے تو کیا تعجب ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
بیکس بڑھیوں کا کام اپنے ہاتھ سے انجام دیتے تھے۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے  
ارشاد فرمایا کہ حق سبحانہ و تعالیٰ نے رحمت کے سوحصوں میں سے ایک حصہ تمام حیوانات  
اور مخلوقات کو تقسیم فرما دیا ہے جس کی بنا پر مائیں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی اور ان کی

پرورش کرتی ہیں اور تم والا جانور اپنی ٹاپوں اور تم سے اپنے بچے کو محفوظ رکھتا ہے اور اس کو ایذا سے بچاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے باقی تناؤ سے ستم اپنے پاس محفوظ رکھے ہیں۔

معیت خداوندی پر ایک محققانہ بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔  
 وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنْتُمْ۔ وَلَقَدْ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ۔  
 ان آیتوں کے پیش نظر، معیت کو سمجھنا چاہیے۔ آیت کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ خداوند کریم تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو۔ اور وہ انسان کی رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ پس جانا چاہیے کہ ایک چیز کے دوسری چیز کے ساتھ ہونے کو معیت کہتے ہیں۔ یہ معیت یا تو مجازی مافی ہائے گی یا حقیقی۔ علمائے ظاہر کا قول یہ ہے کہ یہ معیت مجازی ہے حقیقی نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم تمام ذرات کے ساتھ ہے مگر اذروئے علم نہ کہ اذروئے ذات۔ یہی بات حضرات متکملین فرماتے ہیں لیکن صوفیائے کرام ظاہری معنی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ حقیقت کو طلب کرتے ہیں ان کا قول ہے کہ معیت حق تعالیٰ تمام ذرات کائنات کے ساتھ حقیقی معنی میں ہے یعنی حق تعالیٰ بذات خود جمیع اشیائے کائنات کے ساتھ ہے۔

اس کی معیت وہ نہیں ہے جس کو متکملین اور علماء ظاہر بیان فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معیت نہ تو معیت عرض یا جسم کی طرح ہے۔ نہ معیت جسم یا جسم کی مانند ہے، نہ معیت عرض یا عرض کے طور پر ہے نہ معیت عرض یا جوہر کے طریق پر ہے۔ بلکہ وہ ایسی معیت ہے جو ان چاروں قسم کی معیتوں سے علیحدہ ہے۔ آیت مَا يَلْفُكُونَ مِنْ غَجْوٰی الْاَیۡۃِ کو غور سے پڑھو اس میں اس حقیقت کو واضح فرمایا گیا ہے کہ نہیں ہوتے مشورہ کرنے والے تین شخص مگر کہ خدا ان میں جو تھا ہوتا ہے اور وہ ان کے اعمال و اقوال آشکارا و پنہاں کا جاننے والا ہے اور ان کے تمام صفات و محطرات اور کیفیات ظاہری و باطنی سے خبردار ہے اور پانچ آدمی راز کی بات آپس میں نہیں کرتے مگر چٹان میں خدا ہوتا ہے۔ اسی طرح جتنے بھی اشخاص ہوں، کم ہوں یا زیادہ مگر خدا ان کے ساتھ ہے جہاں بھی ہوں ساتوں آسمانوں

میں ہوں یا ساتوں زمینوں میں ہوں۔ وَلَئِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ اس آیت کو بھی غور سے پڑھو اس سے بھی حقیقی قرب و معیت کا پتہ چل رہا ہے۔  
 زین معیت دم مزن بنشین غموشش ایں معیت در نیا بد عقل و ہوش  
 (اس معیت پر زیادہ گفتگو نہ کر بس خاموش ہو جا۔ اس معیت کو عقل و ہوش پوری طرح نہیں پاسکتے)۔

اے بھائی تمام موجودات کے ساتھ قرب و معیت حق کو سمجھانے کے لئے سب سے نیا وہ قریب الغم شال۔ قرب روح باجساد کی ہے کہ روح، عالم امر سے ہے نہ بدن کی حقیقت میں داخل ہے نہ اس سے خارج ہے، نہ بدن سے متصل ہے نہ منفصل۔ وہ صفات جسم سے جڑا اور ملا بہت کے نقص سے معزا ہے اس کے باوجود وہ جمیع اجزائے بدن میں متصرف ہے۔ اگر ہزار سال بھی یہ روح بدن سے تعلق رکھے اس کی طہارت و صرافت میں کوئی خلل و نقصان نہیں آئے گا جس طرح یہ روح بدن کے تعلق سے پہلے تھی اسی طرح اب بھی رہے گی کوئی کثافت اس میں نہیں آئے گی اسی طرح قرب حق کو مخلوق کے ساتھ سمجھو کہ عالم امکان کی پستی و ذلت اس قرب و معیت کی وجہ سے ذرہ برابر بھی واجب الوجود کی منزلہ و مقدس ذات پر اثر انداز نہیں ہے۔ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ۔ جب تم نے حقیقت معیت روح جسم کے ساتھ سمجھ لی تو مشہور قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ (جس نے اپنے کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا) کو بھی سمجھ لو گے۔  
 شیخ محمد پہلوی کو تحریر فرماتے ہیں۔

دوام شہود و حضوری کو اپنا نصب العین بنا لو پھر کسی بھی (جائز) شغل میں مشغول رہو تو وہ عین وصال ہے اور بے شہود و حضوری صلوٰۃ و تلاوت میں بھی مشغول ہو تو وہ عین و ہلاک ہے۔

سررشتہ دولت اے برادر کف آر ایں عمر گرامی بخسارت م گزار  
 دائم ہمہ جا با ہمہ کس در ہمہ کار میدار نہفتہ چشم دل جانب یار  
 (اے برادر دولت سرمدی کو ہاتھ میں لاؤ اور اس عمر گرامی کو خسارے کے ساتھ مت ضائع کرو۔)

ہر جگہ ہر کسی سے ہر ضروری کام میں مشغول رہ سکتے ہو مگر چشم دل کو ہمیشہ جانب یاری رکھنا۔ میاں محمد معظم (پہلی) کو واضح رہے کہ غفلت اگرچہ ایک ہی ساعت ہو (طہارت میں) کفر ہے مسلمان بن کر زندگی گزارنا چاہیے۔ بے یاد خدا جینا، موت کی مانند ہے بلکہ موت سے بھی بدتر ہے۔ میاں دلدار بیگ کو کیا لکھوں وہ خود دانا اور فہیم ہیں وہ بھی احسن و اہم کام میں مشغول رہیں۔

تم نے (شیخ محمد پہلیؒ نے) لکھا تھا کہ میں کوئی کتاب لکھوں۔ خدا و ما! چونکہ فرصت کم ہے لکھنا بستر نہیں ہوتا۔ پھر بھی جو کچھ تم دیا فت کر دو گے اس کا جواب مفصل و مشروح لکھا جائے گا، بے سوال کئے کچھ لکھا نہیں جاتا۔ امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ (بہ طور تہذیب نعمت کہتا ہوں) علمائے وقت کا علم میرے علم کے برابر نہیں ہے مگر میرا علم صوفیائے کرام کے صرف ایک قول کے برابر نہیں ہے (اور وہ قول یہ ہے) اَلْوَقْتُ سَيِّئٌ قَاطِعٌ لِّكَفَايَا النَّوْثِ (وقت کاٹنے والی تلوار کی مانند ہے تمہارے اور وقت کی حفاظت لازم ہے)۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں — برادر شیخ محمد و شیخ معظم اور دلدار بیگ کو اس درویش دلریش کی جانب سے بعد سلام مسنون و واضح ہو کہ اَلْوَقْتُ سَيِّئٌ قَاطِعٌ — تم کو آگاہی دوام کے حصول کی سب سے تمام کرنا چاہئے۔ عبادت میں سعادت ہے اور فراغت (بے فکری) میں شقاوت... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر مند اور غلین رہتے تھے۔ جو چیز تمہیں یا وحی سے باز رکھے تم اس سے باز رہو۔

چھیت دنیا از خدا غافل شدن نے قماش و نقرہ و منہ زرند وزن  
(دنیا کیسے؟ خدا سے غافل ہونا) — یہ کپڑا، چاندی اور فرزند وزن دنیا نہیں ہیں۔

شیخ محمد پہلیؒ کو ایک مکتوب کے آخر میں تحریر فرماتے ہیں۔

تمہ و صیت آنکہ یا دوست یا یا دوست و ہرچہ جزاوست نہ نکوست نہ نکوست ۱۔  
یعنی یا تو دوست ہو یا یا دوست ہو اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہو ٹھیک نہیں ٹھیک نہیں۔  
ایک مکتوب میں شیخ محمد اور دلدار بیگ کو ارقام فرماتے ہیں ۱۔

درویش و ریش عبد الرحیم کی جانب سے برادر م شیخ محمد اور دلدار بیگ بعد از سلام مسنون مطالعہ کریں۔ اللہ اللہ کرو اور ماسوی سے منہ موڑو، دوام آگاہی میں سعی یلغ ہو، زندگانی پر بھروسہ نہ کیا جائے۔ حدیث خَیْرُ النَّاسِ مَنْ يَنْفَعُ النَّاسَ (لوگوں میں سب سے بہتر وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے) پر عمل کرتے ہوئے مخلوق کو خدا تک پہنچانا چاہیے۔ آگاہ باش، آگاہ باش، آگاہ باش۔

زوجہ شیخ محمد اُمّ عبید اللہ پہلی یعنی اپنی خوشدامن کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:-

حامداً ومصلّیاً ومُسَبِّحاً۔ اصابعد سائلہ طریقت، طالبہ حقیقت اُمّ عبید اللہ۔ اللہ ان کو ذاکرات، واصلات، قانات اور عارقات میں سے کر دے۔ اور مقام قنار و بیت سے کیفیت عطا فرمائے بعد سلام خیر انجام مطالعہ کریں۔ اشغال ظاہرہ میں اتنی مشغول نہ ہوں کہ احوال باطنہ کی بلندی سے باز رہیں۔۔۔۔۔ دل بیدار حاصل کرو (بالفرض) اگر تعلقات کو نین بھی تم پر آگریں تو ذرا سا حجاب تمہارے قلب پر نہ ہونا چاہیے۔۔۔۔۔ راہِ خدا میں موش و مذکر ہونے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ جو عورتیں عشقِ خدا رکھتی ہیں وہ درحقیقت (ہمت کے اندر) مرد ہیں جو مرد عشقِ خدا سے بے تعلقی ہیں وہ عورتوں سے بدتر ہیں۔

اپنے برادر نسبی شیخ عبید اللہ پہلی (والد ماجد شیخ محمد عاشق) کو تحریر فرماتے ہیں:-  
برادر دینی، محب یقینی یعنی صلاح اتنا رہیاں شیخ عبید اللہ جیو، ہمیشہ یادِ خدا سے غفلت اور حفظِ خدا کے اندر محفوظ رہ کر ذکر و شاکر رہیں۔ بعد سلام مسنون تحریر آنکھ۔۔۔ دل فقیر کو اس کی فکر ہے کہ تم کس طرح ہو اور تمہارے حالات کیا ہیں، اپنے ظاہری باطنی محتاج و معارفِ مفصل لکھ کر بھیجو۔ اور لکھو کہ اب سیر و سلوک کی کس منزل میں ہو۔ اس کی فکر کرو کہ تم سوائے خدا کے کسی کے بندے نہ بننے پاؤ اور ایسا کام کرو کہ کل کو شرمندگی نہ ہو۔ حیاتِ دنیا کی کوئی حیثیت نہیں۔ حق تعالیٰ سے غافل رہنا جہلِ مطلق ہے۔ دنیا فانی ہے، حق کے ساتھ مشغول رہنا سادتِ دو جہانی ہے۔ ذرّہ یاد و آگاہی ہزار بادشاہی سے بہتر ہے۔ طلبِ مولیٰ از ہمہ مولیٰ۔ طلبِ دوست میں اہل معرفت



کا غور و فکر کرنا خلاصی و نجات کا ذریعہ ہے۔ خلاف نفس کام کرنا فرض میں ہے۔۔۔ اہل یاد (ذکر لوگ) ہمیشہ شاد رہتے ہیں۔ (بظاہر اسباب) اگرچہ معاش میں امیر و سلطان کی رضامندی درکار ہوتی ہے۔ لیکن معاد (آخرت) کے معاملے میں رضائے رحمن ضروری ہے رضامندی حق ہی درکار ہے، تدبیر دنیا اور اہل دنیا کا کیا اعتبار۔ دنیا چند روز کی ہے آخر کار واسطہ خداوند کریم سے ہی پڑے گا۔ دینی خدمات کی طرف مائل رہو اور اپنے نفس پر غالب۔۔۔۔۔ اگر درخشاں کس است یک حرف بس است۔

ایک مرید کو تحریر فرماتے ہیں:-

سید الاستاذ فیض حق ناگاہ پہنچتا ہے، مگر کہاں پہنچتا ہے ؟ دل آگاہ پر۔ دل آگاہ کی علامت کیا ہے ؟ ذکر خدا سے دل میں نور و سرور کا داخل ہونا اور دارالغور (دین) سے دور رہنا۔ بیشک، لذت یاد حق تمام لذتوں سے اونچی ہے جس نے یہ ذائقہ چکھا اس نے چکھا۔ اور جس نے بات کو سمجھا اس نے سمجھا۔ اور جس نے نہیں چکھا اس نے نہیں جانا۔۔۔۔۔

شیخ محسّم الدین سہارنپوریؒ کو اجازت نامہ تحریر فرماتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:-  
الحمد لله رب العالمين والصلاة على رسوله محمد وآله واصحابه اجمعين۔  
فقیر عبد الرحیم کی طرف سے مجمع کمالات ظاہری و باطنی، منہج حسنات صوری و معنوی (شیخ محسّم الدین) کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد عرض ہے کہ اشتیاق ملاقات متوہیان سے باہر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض طالبین اور اخوان الصدق والصفا، خدمت عالی میں اخذ طریق کے سلسلے میں رجوع کرتے ہیں لیکن آپ خود داری کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ اس زمانے کے طالبین میں بے استعدادی ہے اظہار طریقہ علیہ اور اجرائے غیر کثیر کی جانب توجہ نہیں فرماتے (ان لوگوں کو بیعت نہیں کرتے) بیشک یہ بات صحیح ہے۔ طالبین

۱۔ مطبع احمدی دہلی دئے نسخہ میں یہ اجازت نامہ ۱۹۷۵ء پر درج ہے۔ مگر وہیں مکتوب الیہ کا نام مذکور نہیں قلمی نسخے سے پتہ چلا کہ یہ شیخ محسّم الدین سہارنپوریؒ کے نام ہے۔

کی کوتاہی نظر اور بے استعدادی پر نظر کی جائے تو امر اربعی میں سے ایک بات بھی ان سے کہنا مناسب نہیں۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ اہل طلب کے سامنے قواعد طریقتہ بیان کر دیئے جائیں ان میں جو جس استعداد کا ہو گا بہرہ ور ہو جائے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کو سرسبز و شاداب کرے جس نے مجھ سے جو کچھ سنا وہ دوسروں تک پہنچایا کیونکہ بعض لوگ جن تک دین کی بات پہنچتی ہے ان لوگوں سے زیادہ محفوظ رکھنے والے ہوتے ہیں جنہوں نے براہ راست دین کی بات سنی ہے۔ اور بزرگوں کا طریقہ بھی جو اس وقت تک چل رہا ہے یہی ہے۔ چاہیے کہ آپ اس حدیث کو پیش نظر رکھیں اور جو بھی طالب صادق آئے اس پر اظہار طریق کریں جس کے نصیب میں جتنا ہوگا پالے گا۔ اور اگر عدم اظہار طریقہ کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو کہیں سے اجازت نہیں ہے کہ وہ شرط اظہار طریقہ ہے تو اس فقیر کی جانب سے اجازت سمجھیں۔ اس فقیر کو... ظاہر میں عارف ریتانی ماہر امرارہ سبحانی حضرت حافظ سید عبداللہ اکبر آبادی قدس سرہ سے، ان کو حضرت شیخ آدم بنوریؒ سے، ان کو حضرت محمد دلف ثانی قدس سرہ سے اجازت ہے۔ نیز اس فقیر کو قدہ العارفین خواجہ ابوالقاسمؒ سے بھی۔ جو کہ خلیفہ کے لقب سے مشہور تھے۔ اجازت حاصل ہے ان کو اعظم علماء، عرف عرفا ملا ولی محمد قدس سرہ سے اور ان کو صاحب طریقہ مجذوب و سلوک میر ابو العلی اکبر آبادی قدس سرہ سے ان کو خواجہ عبداللہ سے ان کو اپنے ماموں خواجہ محمد یحییٰ سے ان کو مولانا خواجہ عبدالحقؒ سے ان کو اپنے ماموں پیشوائے ابراہم خواجہ عبید اللہ اعمار قدس سرہ سے اجازت ہے۔ طریقہ قادریہ و چشتیہ کے مشائخ طریقت کے نام جو حضرت مجدد دلف ثانیؒ سے اوپر ہیں پھر لکھ کر بھیجے جائیں گے۔

اپنے ایک مرید فیض اللہ کو تحریر فرماتے ہیں۔ بعد الحمد والصلوٰۃ۔ براء دم فیض اللہ ہمیشہ منتظر فیض اللہ رہیں۔ اے برادر، فیض اللہ! چانک اور ناگاہ پہنچتا ہے۔ لیکن دل آگاہ پہنچتا ہے۔ جانتے ہو دل آگاہ کیسا ہوتا ہے؟ وہ دل جو آداب کا پابند ہو۔ ادب تین قسم کا ہے ادب خدا، ادب رسول خدا اور ادب خلق خدا۔ جس نے ادب کی محافظت و رعایت کر لی وہ مروان راو خدا کے مقام پر پہنچ گیا۔ امام ملک مدینہ کی مجلسوں میں کبھی سوار نہ ہوئے

اس خیال سے کہ محبوب رب العالمین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم یہاں پیدل چلے ہوں گے امام موصوفؒ جب کسی قدیم عمارت کو دیکھتے تھے ادب کے ساتھ اس کو بوسہ دیتے تھے اس خیال سے کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دست مبارک اس کو لگا ہوگا۔ جب فیض پہنچے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ تماشاے فیض ربانی تم اپنی آنکھوں سے دیکھو گے اور اسرارِ فیض تک پہنچو گے۔ اتنا افاضہ و فیض دیکھو گے کہ افاضہ و فیض کا اثر تمہاری نگاہ بصیرت سے چھپ جائے گا اور بجز فیاض کے اور کوئی نظر نہ آئے گا۔

شیخ محمد پہلستیؒ کو ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں ۱۔

..... جس کے دو دن مساوی حالت میں گزرے (اور کوئی ترقی نہ کی) وہ خسارے میں ہے۔ پس چاہیئے کہ کوئی سانس غفلت کے ساتھ نہ آئے اور کمیت و کیفیت نسبت کی زیادتی و افراط کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ اگر عمرِ نوحؑ اس میں صرف ہو جائے تب بھی اس کا حق ادا نہ ہوگا۔ متفرق اشغال اور اوراد سے دست برداری ہونی چاہئے اور پوری عزمیت اور قوت کے ساتھ ہمیشہ نسبت کی جانب متوجہ رہا جائے۔ ماضی و حال کا موازنہ کرنا واجباتِ طریق سے ہے۔ اصول پنجگانہ جو اس فقیر کو القاء ہوئے ہیں ان کی ادائیگی میں "صرف ہمت" کرنا چاہیئے (وہ اصول پنجگانہ یہ ہیں)۔ (۱) دوام ذکر (۲) ہر عمل میں تقویٰ (۳) عام مخلوق خدا کو بغیر تفریق ملک و ملت نفع پہنچانا (۴) اپنے نفس کو کسی پر فضیلت و ترجیح نہ دینا۔ (۵) امر اللہ اور خلق اللہ سے تواضع کا معاملہ۔

شیخ محمد پہلستیؒ کو ایک دوسرے مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں ۱۔

درگاہِ الہی سے قریب کرنے والی کوئی چیز شغلِ آگاہی سے بہتر نہیں ہے۔ آگاہ کون ہے؟ وہ جو خود کو آگاہ نہیں سمجھتا..... امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ علمائے وقت کا علم میرے علم کو نہیں پہنچتا اور صوفیاء کرام کے ایک جملے کو میرا علم نہیں پہنچتا وہ جملہ یہ ہے الوقت سَیْفٌ قَاطِعٌ۔ جس کام میں نفع نہ ہو اس کو پسند نہ کرو۔ چاہیئے کہ درس بھی اس طرح ہو کہ آگاہی باقی رہے اور اعتدال کے ساتھ ہو اور وہ دوست جو موافق شریعت ہوں ان کی طرف التفات کریں۔ مراقبہ، مجاہدہ وغیرہ سے ایک لمحہ خالی نہ رہیں۔

ایک خاتون صالحہ کو تصور فرماتے ہیں :-

بعد سلام واضح ہو کہ اپنے اوقات عزیز کو غفلت و بیکاری میں ضائع نہ کریں اور اپنے انقباض نفیس کو بجز ذکر حق تعالیٰ کے نہ گزاریں۔

بریکسٹنفس کہ میرود از عمر گوہر لیت کا نرا خراج ملک دو عالم بود ہوا  
مہند کایں خزانہ وہی رائیگاں بباد وانگہ روی بہ خاک تہی دست و بے نوا

(مگر کا جو سانس بھی گزر رہا ہے وہ اتنا قیمتی ہے کہ ملک دو عالم کا خراج اس کی قیمت ہے اس بات کو پسند نہ کر کہ اس خزانے کو یوں ہی رائیگاں اور برباد کر دے اور خالی ہاتھ مفلس ہو کر قبر میں جائے)۔ مخلوق سے توجہ ہٹا کر خالق کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اپنے اوقات کو ”تلاوت قرآن“ ”ذکر دوام“ اور آگاہی بتوجہ تمام“ میں مشغول رکھو۔۔۔ جو شغل میں نے تلقین کیا ہے اس کو اپنا نصب العین بنالو اور ایک سانس بھی غفلت سے نہ نکالو۔ اوپر نظر کرو تو اللہ ہے نیچے نظر کرو تو اللہ ہے۔ دائیں طرف دیکھو تو اللہ ہے بائیں طرف نگاہ کرو تو اللہ ہے۔ اگر خود اپنی ذات کے اندر نظر کرو تو اللہ موجود ہے۔ تمام حرکات و ارادات مغناب اللہ ہیں بس اسی نسبت میں کوشش کرو اور خود کو اپنی نظر سے پوشیدہ کر لو۔۔۔۔۔ قُلِ اللّٰهُ کَمٌ ذَرَحُمُ اللّٰہِ بس باقی ہو س۔۔۔۔۔ ولیدہ درود، اشراق و چاشت اور تہجد۔ نسبت باطنی حاصل کرنے کے پیچھے فوت نہ ہونے پائیں اس لئے کہ ان میں بے شمار کمالات ہیں۔

دل گفت مرا علم لدنی ہو س است تعلیم کن اگر ترا دسترس است  
گفتم کہ الف گفت و گر، گفتم بیج درخانہ اگر کس است یک حرف بس است  
(دل نے مجھ سے کہا کہ تجھے علم لدنی کی آرزو ہے اگر تم کو یہ علم آتا ہو تو مجھے تلقین کر دو۔  
میں نے اُفت بتا دیا اس نے کہا اور کچھ؟ میں نے کہا بس اور کچھ نہیں اگر کوئی لائق آدمی ہے تو اس کو ایک ہی حرف کافی ہے)۔

## ینابیع

علوم تصوف پر علامہ حاجی ابوالحسن دہلوی نقشبندی کی جامع اور نایاب تصنیف کا ایک نظر

اس کتاب کا پورا نام ینابیع الحیوة الابدیة فی الطلاب النقشبندیة ہے، جو کہ سندھ کے ایک روشن ضمیر، اہل دل، صاحب علم ابوالحسن دہلوی نقشبندی کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور بہت ہی ضخیم ہے۔ یہ تصوف سے متعلق ایک انسائیکلو پیڈیا ہے، جس میں تصوف پر علمی اور عملی حیثیت سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ چنانچہ معلومات کا ایک بے بہا خزانہ ہے اور تصوف سے متعلق کوئی ایسی چیز نہیں رہ جاتی ہے جس سے مصنف نے بحث نہ کی ہو۔ اس کی اہمیت ان موضوعات سے ہوتی ہے جو درج ذیل ہیں۔

اس کتاب کا ایک نسخہ علم دوست بزرگ جناب جی۔ ایم سید صاحب کے پاس ہے، اور دوسرا نسخہ مولانا محمد یاشم جان صاحب مجددی سرہندی کے پاس ہے۔ سندھی ادبی بورڈ کے زیرِ اہتمام اسی نسخہ سے ایک نسخہ نقل کیا گیا ہے۔ راقم الحروف اس کتاب کو ایڈٹ کر رہا ہے۔ ابھی حال میں ان مذکورہ نسخوں کے علاوہ اور نسخوں کا بھی سراغ ملا ہے۔ خاکسار کی رسائی ابھی وہاں تک نہیں ہو سکی ہے۔

اس کتاب میں نو ابواب ہیں۔ خاتمہ پھر اس کے بعد تہذیب ہے، پھر ہر باب متعدد

فصلوں پر مشتمل ہے، چنانچہ پہلے باب میں ۲۶ فصلیں ہیں۔ دوسرے باب میں ۱۳ تیسرے باب میں گیارہ چوتھے باب میں ۹ پانچویں باب میں ۱۳ چھٹے میں بیس ساتویں میں تین آٹھویں میں پانچ اور نویں میں سات فصلیں ہیں۔ اس طرح ۱۰۸ فصلوں پر مشتمل ہے۔

جی۔ ایم سید صاحب کے نسخہ کا سائز  $\frac{1}{4} \times 11$  انچ ہے اور دو ضخیم جلدوں میں منقسم ہے۔ جلد اول میں ۲۲۲ صفحات ہیں اور دوسری جلد ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح مولانا محمد ہاشم جان صاحب کے نسخہ کا سائز  $\frac{1}{4} \times 9$  انچ ہے اور جلد اول ۵۱ صفحات پر اور جلد دوم تقریباً اتنے ہی صفحات پر مشتمل ہے۔ جن موضوعات سے اس کتاب میں تعرض کیا گیا ہے، ان کی تفصیل باب وار حسب ذیل ہے۔

## باب اول

اس باب میں صوفی، سالک، متنبہ، ولی اور عارف کی تعریف بیان کی گئی ہے پھر ان کے اقسام مثلاً کامل، مکمل، متصوف، ملامتی، قلندر، مرید، عابد، زاہد، فقیر، خادم وغیرہ کی تشریح کی ہے۔ ایسی ہی حضرات کا بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے ہدایت ہار تیلے سے بحث کی ہے۔ پھر عالم مثال کا بیان ہے بعد ازاں رویا کا حکم اور سیدۃ الرغائب کی ممانعت نقل کی ہے۔ مثل اور مثال کے فرق کو واضح کیا ہے۔ صوفیوں کے ان بارہ مذاہب کا تذکرہ کیا ہے جن میں دس اہل سنت والجماعت سے اور دو اہل بدعت سے ہیں۔ پھر ان مبشور صوفیوں کا ذکر کیا ہے جن کو صاحب کشف المحجوب نے ذکر نہیں کیا ہے۔ ۷۲ قلموں کا ناری ہونا اور ایک طقت یعنی اہل سنت والجماعت کا ناجی ہونا بیان کیا ہے۔ ”الصوفی لا مذهب لہ“ کی تاویل پھر اہل قبلہ کی تکفیر اور موجبات کفر کے سرزد ہونے کے باوجود ان پر لعنت کرنے کا مسئلہ مذکور ہے۔ سالکوں کی اصطلاح میں چار پیر اور چار خاندانوں کا بیان ہے۔ لفظ صوفی کا ماخذ اشتقاق اور وجہ تسمیہ اور صوفیوں کے لباس سے بحث کی ہے۔ اصحاب اہل مفسدہ کے حالات اور ان کی تعداد ذکر کی ہے۔ ارادت و طلب، ارادت کے مراتب بیان کر کے مرید اور مراد کافر کو بیان کیا ہے۔ پھر وہ پانچ باتیں بیان کی ہیں جن پر مرید اور متعلم کی اہلیت کا مدار

ہے۔ دلی اور ولایت عامہ و خاصہ کی تعریف کرتے ہوئے آٹھ قسم کے خوارقِ عادات یعنی معجزہ کرامت، ارباب، موت، امانت، استدراج، مسبب، تاثیر النفس کی تحقیق کی ہے۔ معجزہ اور کرامت کا فرق، عصمتِ انبیاء اور حفظِ اولیاء، عصمت اور حفظ کا فرق اور شیعوں کے چودہ ائمہ معصومین کی تحقیق کی ہے۔ پھر اس سے بحث کی ہے کہ نبی کی ولایت افضل ہے یا نبوت؟ علم شریعت افضل ہے یا علم حقیقت؟ نیز یہ ثابت کیا ہے کہ انبیاء و اولیاء کے درجات مختلف ہیں اور صحابہ تمام لوگوں سے افضل ہیں۔ پھر اولیاء اللہ کے اقسام اقطاب، اوتاد اور ابدال وغیرہ کا حال بیان کیا ہے۔ معرفتِ الہی اور اس کے مراتب۔ ایمان تقلیدی و تحقیقی، ایمان مجمل و مفصل، علم و معرفت کا فرق، قبض و بسط، حال و مقام، وقت و تلویح و تمکین کے متعلقہ امور۔ مسئلہ وعدۃ الہود، ناسوت و ملکوت، آیات و احادیث متشابہات اور طبعیات مشائخ کی تاویل سالکوں کی اصطلاح کے مطابق شیخ کی تعریف۔ پیر کو مولیٰ، مرشد اور بادی کہنا جائز ہے یا نہیں؟ شیخ کے تین اقسام، شیخ متقلین الذکر، شیخ المعجزة شیخ خرقہ کی تحقیق اور ان بدعاتِ قبیحہ سے بحث کی ہے جو ہندوستان میں رائج ہیں۔ سالک و مجذوب، مشکور اور معذور کا فرق۔ ابرار و اخیار کا طریقہ اور فلاسفہ، جوگیوں اور سنیاسیوں کی تزکیہ نفس میں غلطی واضح کی ہے۔ پھر بعض متقابل الفاظ مثلاً صوم و سکر، حضور و غیبت، علم و حال، فنا و بقا کی تشریح کی ہے اور اس سے بحث کی ہے کہ صوفی افضل ہے یا سکر؟ علم افضل ہے یا حال؟ حضور افضل ہے یا غیبت؟ اور آخر میں صفاتِ ذمیر کی تفصیل بیان کی ہے۔

## باب دوم

یہ باب تیرہ فصلوں پر مشتمل ہے، دین اسلام کے علم اور اس کے علماء کا تفصیلی ذکر ہے۔ پہلے تو علمائے دین کے چار طبقے یعنی فقہاء، محدثین، صوفیہ، متکلمین اور ان علوم کا بیان ہے جو صوفیوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ پھر بتایا ہے کہ علم کلام کس قدر فرض، کس قدر مباح اور کس قدر ممنوع ہے۔ بعد ازاں تفسیر احمدیث اور فقہ کے علوم سے بحث کی ہے جو کہ دین اسلام کے مقاصد علوم ہیں۔ بے عمل علماء کی مذمت اور ادب کے چودہ

علوم کا تفصیلی بیان ہے پھر علوم ممنوعہ سے بحث کرتے ہوئے فلاسفہ کے طبقات اور حکمائے ہند کا اور یاطینوں کے گروہ اور ان کی تفسیروں اور کتابوں اور ان کے جھوٹے ائمہ کا ذکر ہے۔ علم تصوف کی تعریف کرتے ہوئے احسان و اخلاص کی تشریح کی ہے اور ان دونوں کا فرق بیان کیا ہے۔ حدیث ”اَللّٰہُ یُحِبُّ الْعِلْمَ“ کی تشریح، بے عمل علماء کی مذمت، علم شریعت، علم طریقت، علم حقیقت اور علم لدنی کی تشریح کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ بعض علوم بعض صحابہؓ کے ساتھ مخصوص تھے۔ علم تصوف بنی آدم میں انبیاء و اولیاء سے جاری و ساری ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ ملائکہ عشق نہیں رکھتے بلکہ محبت رکھتے ہیں۔ آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے انیس کے مردود ہونے اور حق تعالیٰ سے بندے کے قرب و بعد سے بحث کی ہے۔ پھر سلسلہ عالیہ نقشبندیہ اور اس کا وجہ تسمیہ مذکور ہے۔ بعد ازاں شریعت طریقت اور حقیقت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے فرق کو واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ طریقت جزو شریعت ہے اس سے خارج نہیں ہے۔ پھر وحی، دعوت، ایمان، اُمت، دعوت، اُمتِ اجابت، اسلام، دین، علم شریعت، علم فقہ، علم کلام اور علم تصوف اور حقیقت اور ہیئت کا فرق بیان کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہر چیز کی حقیقت صورت و معنی کا مجموعہ ہے۔ نماز میں خشوع و خضوع اور طہارت کا بیان ہے۔ پھر اس سے بحث کی ہے کہ انسانی لغات کا وضع کرنے والا کون ہے و طریقت اور حقیقت کی شناخت میں غلطی کرنے والوں کی مذمت کے بعد بہتر فرقوں کا حال مذکور ہے اور ہندوستان کے زندیقوں کی حالت بھی بیان کی ہے۔ نیز یہ ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے بغیر آخرت میں کوئی چیز مفید نہیں اور یہ کہ اہل بدعت کی طاعات اور نیکیاں مقبول نہیں ہیں۔ بدعت کے اقسام بیان کئے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کے مطابق قرب حق حاصل ہوتا ہے اور بتایا ہے کہ اذکار کے ان طریقوں کو بدعت نہیں کہنا چاہئے جو کہ مشائخ سے منقول ہیں اور احادیث میں وارد نہیں ہیں۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ ملوک کے لئے علم دین شرط ہے اور بغیر علم کے کوئی عمل صحیح نہیں ہے۔ علم شریعت حاصل کرنے کے مراتب، عبادت اور عابد پر علم اور عالم کی فضیلت اور ”العلم حجاب اللہ“ کی تشریح کر کے بتایا ہے کہ علم اسی سے مراد فلسفہ کا علم اور علم کلام میں مویشگافی ہے۔



## باب سوم

یہ باب گیارہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس باب میں انسان کی ظاہری و باطنی قوتوں سے بحث کی گئی ہے۔ پہلے تو انسان کی تعریف کی ہے اور اس مسئلہ کو متعین کیا ہے کہ انسان سے مراد صرف روح یا صرف بدن ہے یا دونوں؟ اور ثابت کیا ہے کہ انسان ظاہری اعتبار سے عالم مغربہ لیکن باطنی اعتبار سے عالم اکبر ہے۔ پھر نفس کی تعریف اور اس کے اقسام اور اس کی خدمت گزار قوتوں کا حال بیان کیا ہے نیز یہ کہ خواب کب تک بیداری ہے۔ پھر انسان کے لئے دو نفس کا ہونا ثابت کیا ہے جن میں ایک خواب کی حالت میں باہر آجاتا ہے اور دوسرا موت کے وقت جدا ہو جاتا ہے بعد ازاں نفس کے صفات اور اعضاء کے شہوات بیان کر کے طاعت و قربت اور عبادت کے فرق کو واضح کیا ہے۔ اور شہوات کی قسموں، جنت کی تخلیق کا حال اور جنت کا مکروہات سے چھپایا جانا قانونی شریعت کے مطابق ترکیہ نفس، تقابل اربعہ، تضایف، تضاد وغیرہ اور عصمت انبیاء سے بحث کی ہے۔

پھر شیطان کی حقیقت اور اس کے اقسام سے بحث کرتے ہوئے شیطان اور جن کا فرق بیان کیا ہے اور اس شیطان کی تحقیق بیان کی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اسلام لے آیا تھا نیز جنوں اور ان کے مویشیوں کی خوراک اور بعض شیاطین کے نام ذکر کئے ہیں۔ نیز یہ ثابت کیا ہے کہ نفس و شیطان حقیقت کے اعتبار سے تو متحد ہیں لیکن ظاہر اور تعین کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ نیز یہ کہ شیطان معاصی کو حسین بنا کر پیش کرتا ہے اور فرشتے طاعت کو حسین بنا کر پیش کرتے ہیں اور حضور کے وقت بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن غفلت کے وقت شیطان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر عقل اور اس کے اقسام بیان کر کے عقل کے محل اور نور اور قوت عاقلہ کے اقسام سے بحث کی ہے اور معنوی دل یعنی نفس ناطقہ، دل کے حواس خمسہ، ان کی مختلف شکلوں اور نیکیوں کے انوار بیان کئے ہیں۔ بعد ازاں روح کا بیان ہے جس میں آیت **قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي** کی تشریح کی ہے۔ روح کا حدوث ثابت کیلئے اور روح کی حقیقت کے متعلق متعدد

مذہب کا حلال بیان کیا ہے۔

آخر میں ستر، خفی، اخفی، طبیعت، جسم، مجزؤ، کشیف، لطیف، نورِ صوری و معنوی کی تشبیہ کی ہے۔ اور مراتبِ لطافت بیان کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ انسان دس اجزاء سے مرکب ہے۔

## باب چہارم

اس باب میں تفصیلیں ہیں۔ جن میں رویا، واقعہ، خاطرہ، مکاشفہ، الہام، مشاہدہ، تخیلی، رویت، معاینہ، کشفِ صوری و معنوی کا بیان ہے۔ رویا کی حقیقت۔ اس کے مختلف مذاہب اور رویا کے اقسام، اس کے احکام اور اس کی تعبیر کا بیان کی ہیں۔ واقعات کا بیان ہے۔ اور اس امر سے بحث کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خواب میں بھی اور انورِ نواہی دیئے گئے۔ سیدۃ الرقاب کی نماز کا حکم اور علم لدنی کی قسمیں اور خواب میں نظر آنے والے حیوان کی تعبیر کی گئی ہے۔

نواطر مثلاً حدیثِ انفس وغیرہ سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ان سے دلوں کو پاک کرنا چاہئے۔ مکاشفات اور اہامات اور اس کے متعلقہ امور اور مشاہدات الہیہ و کیانیہ اور تجلیات اور اس کے متعلقہ امور بیان کر کے انوارِ صوریہ مثلاً برق، لامع، لواج وغیرہ سے بحث کی ہے اور تجلیات ربانیہ اور روحانیہ میں فرق بتا کر ذاتی و صفاتی جلال و جمال کی وضاحت کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ شیطان کی بھی تجلی ہوتی ہے۔ پھر حدیث ”اِنَّ لِلّٰہِ تَعَالٰی سَبْعِیْنِ اَلْفَ حِجَابٍ بَیْنَہٗ وَ تَوْبَہٗ“ کی تشریح بیان کی ہے۔ بعد ازاں سالکین کے چار منازل ناسوت، ملکوت، جبروت اور لاہوت کا بیان ہے۔ اور جو ذہنی و خارجی اور جبر و اختیار کی بحث ہے۔

## باب پنجم

یہ باب چودہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ جن میں جذبہ، مراقبہ، قلب پر توجہ اور شیخ

سے رابطہ کا بیان ہے اور پیر کی قسمیں بیان کی ہیں پھر محبت اور اس کا حکم بیان کرتے ہوئے محبت اور عشق کے انواع بیان کئے ہیں۔ بعد ازاں اس سے بحث کی ہے کہ عاشق و معشوق اور محب و محبوب کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر جائز ہے یا نہیں؟ شطیحات مشائخ پر زبان کھولنے کا حکم بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ بندہ جب تک عقل رکھتا ہے تکلیفات شرعیہ اور آداب کا مکلف ہے نیز اہل بدعت کا حکم وضع کیا ہے اور اس سے بحث کی ہے کہ مرتد ہونے سے اعمال صالحہ ضائع ہو جاتے ہیں۔ پھر ذکر جلی اور ذکر خفی کا بیان ہے اور ذکر کی تعریف کرتے ہوئے اس امر کو زیر بحث لائے ہیں کہ اذکارِ خفیہ نامہ اعمال میں لکھے جائیں گے یا نہیں؟ بعض اذکار کی فضیلت کا ذکر ہے۔ آیت و اذکار تَرَبُّعًا اِذَا اَنَسَّیْتَ کی تفسیر کی ہے نیز تصفیہٴ دل، تجرید و تفرید کا فرق بیان کیا ہے۔ تزکیہٴ نفس، تجلیہٴ روح، صفات نفس، زہد و فقر کی تعریف، دُنیا اور ترک دُنیا کی تفسیر کی ہے پھر سفارِ اربعہ، نسا و بت، خرابات، قرب فرض، قرب نقلی، وصول، وصال، کمل، اتحاد، جمع و تفرقہ اور اس کے متعلقہ امور سے بحث کی ہے۔

## باب ششم

یہ باب بیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا پہلا باب سب سے طویل ہے جو کہ ۲۶ فصلوں پر مشتمل ہے۔ باب ششم طوالت کے لحاظ سے دوسرے درجہ پر ہے۔ لیکن یہ باب تمام الاباب سے اہم ہے اس لئے کہ مصنف نے اس باب میں جن امور سے بحث کی ہے وہ بے حد اہم ہیں۔ طریقت کے شرائط اور مقامات بیان کئے ہیں۔ اس سلسلہ میں جو امور زیر بحث لائے ہیں ان کے عنوانات درج ذیل کئے جاتے ہیں جن سے اس کی اہمیت خود بخود ظاہر ہو جائے گی۔

شریعتِ مطہرہ کا علم حاصل کرنا۔ سلوک کا مقصد مکاشفات اور الہامات نہیں ہیں بلکہ جہنم سے نجات حاصل کرنا ہے۔ پیر کی طلب اور اس کی اہلیت کی تحقیق۔ مکار پیروں کا بیان۔ بغیر محافظ کے اس راہ میں چلنا جائز نہیں۔ پیر کے صحبت کے آداب

چھوٹوں بڑوں کی خیر خواہی۔ اشرا المعروف وہی عن المنکر۔ بڑوں کی عزت اور چھوٹوں پر شفقت  
خدا کی رضا کیلئے محبت اور دشمنی۔ نعمۃ حلال کا طلب کرنا اور اس کے فوائد۔ مشتبہ نعمہ  
کی مضرتیں۔ کسب حلال کے منافع۔ حرام پریم شد پڑھنا کفر ہے۔ عوام الناس کی توبہ۔ توبہ  
کے ارکان و شرائط اور اس کے آداب۔ توبہ شکن کی قیادتیں۔ ایمان یاس اور توبہ یاس  
کا بیان۔ بعض علامات قیامت۔ معاصی بغیر توبہ کے بخشے جاتے ہیں یا نہیں؟ استغفار کے  
فائدے اور قبول توبہ کی علامات۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد سے توبہ۔ تفضلانے فرائض و  
واجبات و سنی، اس گناہ سے توبہ جس پر حد لازم آتی ہے۔ ادائے قرض کی دہائیں۔ توبہ  
کرنے والے کے قبضہ میں سود یا رشوت کا مال ہو تو کیا کرے؟ حقوق عباد غیر مالیہ مثلاً قصاص  
غیبت چغلی وغیرہ کا بیان۔ ظلم کی حقیقت اور اس سے دل کا سیاہ ہو جانا۔ گناہوں کے تقاسم۔  
برن اور غنیمت کی تشریح۔ خواہش اور حرص الخواص کی توبہ۔ توبہ۔ ادب اور انابت کا ذریعہ۔  
کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ کی اقتدار طریقت کا ایک بڑا رکن ہے۔ عمل میں  
حسن اخلاص کا بیان۔ ریا کی مذمت۔ عبادت کی صحت شرائط و ارکان کے وجود پر موقوف  
ہے۔ شکر، جلی و خفی کا بیان۔ مصورین کے متعلق وعید۔ حرص و طمع کی مضرتیں۔ قناعت  
و مبرا اور رضا کا بیان۔ کاہن، منجم اور مال کا حکم۔ عیب جوئی طعنہ اور لعن و تکفیر کے مفاسد  
وہ آم ذکر ارکان طریقت میں سے اہم رکن ہے۔ حدیث صاحب الوہد ملعون و تارک الوہد۔  
ملعون کی تاویل۔ اور آدھ سنن روایت کی قضا۔ ہمیشہ با وضو رہنے کی فضیلت اور پانی  
نہ ملنے کی صورت میں تیمم کا بیان۔ تحیۃ الوضو اور تحیۃ المسجد کا حکم۔ پانچوں نمازیں جماعت کے  
ساتھ ادا کرنا ارکان طریقت میں سے ایک عظیم ترین رکن ہے۔ مساجد کی فضیلت۔ دیگر نفل  
نمازوں مثلاً نماز اشراق، صبحی، نماز تسبیح اور نماز استخارہ کا بیان۔ روزہ اور بھوک کے  
فوائد و منافع۔ صوم وصال کی بحث۔ فضول گفتگو کی مذمت۔ محبت ناچینس کی برائی۔ محبت  
نفصل ہے یا تنہائی اور گوشہ نشینی؟ اگر سالک کو جمعیت حاصل نہ ہو اور تفرقہ زائل نہ  
ہو تو اس کے لئے تنہائی کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ خلوت اور اس کے شرائط کا بیان۔  
ارکان سلوک کی ترتیب اور ان کی بارہ کلمات قدسیہ کی تشریح جو کہ سلسلہ عالیہ

## باب ہفتم

یہ باب مختصر ترین ہے اور اس میں صرف تین فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں اللہ تعالیٰ - اسم ذاتی کی تعلقین اس کے صفات و شرائط سے بحث کی ہے۔ پھر لطائف خمس کے مقالم بیان کئے ہیں اور بدن انسانی کا ذکر کیا ہے نیز فنا فی الہیہ کا طریقہ مذکور ہے۔ دوسری فصل میں نفی و اشیات یعنی کلمہ طیبہ کا بیان ہے اور مقالات سبعہ کا ذکر ہے جو کہ اہتبات صفہ میں سے ہیں اور ان سبہوں کے شرائط و لوازم کا بیان ہے اور تیسری فصل میں کسب و اور اس کے شرائط و لوازم کا بیان ہے۔ اسرار الہی کے غرائب و خواص کا ذکر ہے۔ اور مصنف علیہ الرحمۃ کے مرشد رح کے کمال کا مختصر تذکرہ اور تاریخ وفات کا بیان ہے۔

## باب ششم

یہ باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ اس میں مشائخ کے مناقبات و اختلافا کا ذکر ہے۔ پہلی فصل میں نیند کے افضل ہونے اور نیند کے اقسام اور با وضو سونے کی فضیلت کا بیان ہے۔ دوسری فصل میں دعا کی فضیلت اور اس کے شرائط مذکور ہیں۔ اور کے معنی اور صلہ و رحمت کا فرق بیان کیا ہے۔

تیسری فصل میں اس امر سے بحث کی ہے کہ تزویج افضل ہے یا تجرید و والدین - فوائد بیان کئے ہیں اور فرزند صالح کی دعا نقل کی ہے۔

چوتھی فصل میں انواع صحبت کا بیان ہے اور اس سے بحث کی ہے کہ صحبت افضل ہے یا تنہائی؟ اور یہ ثابت کیا ہے کہ بیٹھنے کی حالت میں ذکر الہی یا تلاوت قرآن - مکروہ نہیں ہے۔

پانچویں فصل میں بیان کیا ہے کہ مردے زندوں کی خبر رکھتے ہیں یا نہیں؟ شہداء اور اولیاء کی رجوں سے مدد طلب کرنا جائز ہے یا نہیں؟ نیز حیات انبیاء اور حیات اولیاء

و شہداء کی کیفیت بیان کی ہے۔

## باب نہم

اس باب میں سرود و سماع سے بحث کی ہے یہ سات فصلوں پر مشتمل ہے۔ جن میں مندرجہ ذیل امور بیان کئے ہیں۔

سرود کی تعریف، غنائے عرب اور غنائے عجم کا فرق، اہل فسق کی غناء کے اقسام، غناء کی حرمت کی بحث، معارف و مزامیر کے استعمال کی ممانعت، غناء اور معارف کی حرمت و کراہت سے کونسی صورتیں مستثنیٰ ہیں؟ نغمہ اور لہجہ کا فرق، موسیقی پر دوں اور لہجہ کا بیان، بعض صوفیہ کے نزدیک معارف و مزامیر کسی کے لئے حرام ہیں تو کسی کیلئے مکروہ اور کسی کیلئے جائز ہیں۔

حشویہ، حلویہ، حالیہ، حوریہ اور شمرانیہ کے مذاہب کا ابطال، شعر اور اس کا حکم، شعر اور نظم کا فرق، شعر کے اقسام اور انہیں بحر و کافیاں اور شعرائے صحابہ کا ذکر، مسجد میں شعر خوانی اور دنیوی کلام کا بیان۔

## خاتمہ

اس میں اصول حدیث اور اس کے متعلقات کا بیان ہے۔ اور حدیث کے ۳۲ اقسام بیان کئے ہیں۔

## تذنیب

اس میں ربیع مسکون کی تشریح کی ہے اور ان چند چیزوں کا بیان ہے جو انسان کی صورت رکھتے ہیں لیکن انسان نہیں ہیں۔

## مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام حضرت پیر شاہ دولہ اور ان کی اولاد

وفا راشدی ایم اے

تاریخ اور تذکرہ سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مشرقی پاکستان میں عربوں کی آمد سے لے کر تاحال ہر دور میں صوفیائے کرام، ادیبائے عظام، سلاطین طریقت و شریعت اور ماہرین علم و عرفان کارواں درکارواں آتے رہے اور اپنی اپنی فکر و نگاہ، ریاضات و کرمات کے مطابق دینی و دنیاوی علوم و فنون، تعلیمات اسلامی و بیانات الہی سے اہل مشرق کے ذہنوں کو بیدار اور قلوب کو منور کرتے رہے۔ انہیں بزرگان دین و اکابر اسلام میں حضرت پیر شاہ دولہ رحمۃ اللہ علیہ کا نام نامی و اسم گرامی تاریخ تصوف میں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کا اصل نام مولانا شاہ معظم و فاضل اور لقب پیر شاہ دولہ رح تھا۔ آپ تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں ۱۹۱۹ء میں بغداد سے شہنشاہ ہند حبیب اللہ الدین محمد اکبر کے زیرِ عہد میں مشرقی پاکستان تشریف لائے۔ اس وقت سلطان نصیر الدین نصرت شاہ غازیؒ کا دور حکومت تھا (۱۹۱۸ء تا ۱۹۵۸ء) نصرت سید علاء الدین حسن شاہ کا بیٹا تھا۔ حسن شاہ بنگال کا نامور فرماں روا گزر رہا۔ وہ ایک جلیل القدر علم و دست اور صاحبِ فضل و کمال عالم

تھا۔ اس کے دور حکومت میں علم و ادب نے بہت ترقی کی۔ بنگال کی سرزمین حضرت پیر شاہ دہلوی کے لئے اتنی دامن گیر واقع ہوئی کہ آپ نے ضلع راجشاہی کے ایک پُر فضا و پر سکون گاؤں باگھ میں سکونت اختیار کی اور وہاں آخری دم تک رشد و ہدایت کی شمع روشن رکھی۔ باگھ غلام پور سے دو میل اور راجشاہی سے ۲۵ میل کے فاصلے پر جنوب مغرب کی طرف واقع ہے۔ باگھ سے صرف دو میل دور دریائے پدما موجزن ہے۔ یہ مقام عمدہ اور لذیذ آم کیلئے مشہور ہے اس کا ذکر سیر التاخرین اور عبداللطیف کے روزنامے میں بھی ملتا ہے عبداللطیف ۱۲۹۹ھ میں حاکم بنگال خواجہ ابوالحسن عرف آصف خان (والد ممتاز محل) کے طلب کرنے پر بنگال آئے تھے اور انہوں نے یہاں کے بیشتر مقامات و چشم دید واقعات کی روداد اپنے روزنامے میں بالتفصیل قلمبند کی تھی۔

حضرت مولانا شاہ معظم و نیشنل عرف پیر شاہ دولہ نے ۱۲۳۵ھ مطابق سن ۱۸۱۹ء میں باگھ میں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کرائی جس میں آپ شب و روز ذکر محمدؐ اور فکرِ شفا میں مصروف رہتے۔ مسجد کی پوری لمبائی چالیس محرابوں پر محیط ہے۔ مسجد کے اندر چار پتھر والے ستون ہیں۔ یہ تمام محرابیں ستون اور دیواروں پر قائم ہیں۔ مسجد کی مغربی دیوار میں امام کی جگہ قیمتی پتھروں اور جواہرات سے آراستہ ہے۔ دیوار میں سات فٹ چوڑی ہیں۔ چاروں طرف دیواروں پر جو نقش و نگار ہیں وہ فنی خطاطی کا اعلیٰ نمونہ اور شاہکار ہیں جب حضرت شاہ دولہ کی شہرت حاکم وقت نصرت شاہ کے کانوں تک پہنچی۔ ۱۲۴۳ھ میں سراپا اشتیاق بن کر آپ کی زیارت کو حاضر ہوا اور آپ کے روحانی کمال اور مسجد کی عظمت کا دل سے اعتراف کیا۔ چنانچہ نصرت شاہ کی بعض تحریروں میں جہاں حضرت شاہ دولہ کا ذکر خیر ملتا ہے وہاں مسجد کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔

مسجد کے شمالی حصے میں تین گنبد ہیں یہ دراصل ان داروغہ تعمیرات کے مقبرے ہیں جنہوں نے اس مسجد کی تعمیر میں اپنے فن کے جوہر دکھائے تھے۔ مسجد کے آس پاس نین حضرات کی ابدی آرام گاہیں ہیں جو باگھ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک خط مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۶۷ء میں اس وقت کا انگریز ریزیڈنٹ قمبراز ہے کہ:



چونکہ جائداد کا وارث نابالغ ہے اس لئے جاگیر کا انتظام عدالتِ دیوان کے ہاتھ میں ہے۔ ۱۸۹۶ء کے زلزلے نے اس خوبصورت مسجد کی عمارت کو سخت نقصان پہنچایا۔ مسجد کی دائیں جانب دیوار میں اب تک مسیح سلامت کھڑی ہیں سامنے کی دیوار اور چھت منہدم ہو گئی ہے :

بعض انگریز مورخین کا خیال ہے کہ باگھ کی مسجد گور کی تانٹی پاڑہ والی مسجد کے نمونہ پر بنائی گئی ہے، باگھ کی مسجد آٹھارہ قدیم میں شامل کر لی گئی ہے اور اس کی نگہداشت سرکاری طور پر کی جاتی ہے۔ جس تالاب کے کنارے یہ مسجد ہے اس کی لمبائی ایک میل ہے اور چوڑائی چھ سو فٹ ہے۔ اس تالاب کی کھدائی غالباً مسجد کی تعمیر ہی کے وقت ہوئی تھی۔ ۱۶۱۵ء کے ایک فرمان کی رو سے مولانا عبدالوحید کے کتبہ کے لئے ۴۲ گاؤں ملے۔ جن کی سالانہ آمدنی ۸ ہزار روپے تھی یہ ۲۲ گاؤں رفیقی ریاست کے نام سے مشہور تھے۔ مولانا رفیق (عبدالوحید کے بیٹے اور عبدالحمید دشمن کے پوتے) اس گاؤں کے بانی تھے۔ مولانا رفیق کا مزار مسجد کے شمال میں واقع ہے، قریب ہی چھوٹا سا قبرستان ہے جس میں بخداد کے دو بزرگ مدفون ہیں۔ ۱۸۵۹ء میں گورنر جنرل کی جاری کردہ سند سے اس ریاست کے حقوق و مراعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ ۱۸۳۲ء میں راجشاہی کے کلکٹر نے اس ریاست کی آمدنی کا تخمینہ تیس ہزار روپے لگایا تھا۔

باگھ سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے جو مخدوم پور کے نام سے مشہور ہے اس علاقے میں ضلع راجشاہی کے سب سے بڑے پرگنہ لشکر پور کے جاگیردار اللہ بخش برنخوردار رہتے تھے ان کی جاگیر کی سالانہ آمدنی تین لاکھ ساٹھ ہزار روپے بیان کی گئی ہے یہ جاگیر انہیں بنگال کے معروف حکمران سید علاؤ الدین حسن شاہ نے خدمات کے صلے میں عطا کی تھی۔ اللہ بخش برنخوردار لشکر کی جاگیردار ہونے کے باوجود ایک زاہد و متقی آدمی تھے، انہیں حضرت پیر شاہ دولہ سے غیر معمولی عقیدت ہو گئی تھی وہ برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے اور ان کی عبادت و ریاضت کے دل ہی دل میں قائل ہوتے، آپ کی صاف باطنی، نیک طبعی، بے نفسی اور زہد و تقویٰ سے اس قدر

متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنی دختر نیک اختر زیب النساء کی شادی کا پیغام آپ کی خدمت میں بھیجا جسے آپ نے قبول فرمایا۔ حضرت شاہ دولہ کے روحانی فیضان اور کرامتوں کے تذکرے بنگلہ زبان کی تاریخ تصوف میں ملتے ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں صرف ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جس سے حضرت شاہ دولہ کی شان درویشی اور عظمت فقر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب شاہجہاں و بیچہ تھا اور اس نے اپنے باپ جہانگیر کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ شاہجہاں آگرہ، دہلی، بلوچ پور، مالوہ، دکن، گجرات اور تلنگانہ سے ہوتا ہوا ۱۶۲۳ء میں بنگال پہنچا۔ پہلے شاہجہاں کو شہزادہ پرویز اور مہابت خان نے شکست دی لیکن اس نے جدوجہد جاری رکھی اور دھاکہ کی طرف بڑھا۔ راستے میں اس نے باگھ میں قیام کیا۔ دوران قیام شاہجہاں نے اپنے چند عادموں کو بھیجا کہ قریب کے کسی گھر سے آگ لے آئیں، جب وہ عادم جنگلوں میں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہاں ایک سو سالہ سفید ریش بزرگ مصلیٰ بچائے یاد الہی میں منہمک ہیں آپ کے آستانہ کے چاروں طرف آگ جل رہی ہے اور اس پاس سے شیر کے گرجنے کی دہشت انگیز آواز آرہی ہے، ہو کا عالم، بھیانک جنگل، ہر سوسٹاٹا، ہیبت ناک سماں۔ وہ لوگ مارے خوف و ہراس کے آگ تو کیا لیتے اُٹے پاؤں اپنے خیمے میں جاگ آئے۔ اور شاہجہاں سے سارا احوال کہہ سنایا شاہجہاں فقیر موصوف کی خدمت میں کوائش بجالایا اور بنگال میں آنے کی غرض و غایت بیان کرنے کے بعد ہدایت کا طالب ہوا کہ اُسے (شاہجہاں کو) اپنے باپ (جہانگیر) کے خلاف ہم میں شریک ہونے کیلئے دھاکہ جانا چاہئے یا توقف کرنا چاہئے۔ ”بندہ خدا“ نے فرمایا کہ ایک دن ٹھہرنا مناسب ہوگا۔ وہ درویش کی ہدایت پر ایک دن باگھ میں ٹھہر گیا۔ کرشمہ دیکھئے کہ جب شاہجہاں اپنے خیمے میں لوٹا تو اسے یہ خوشخبری ملتی ہے کہ لڑائی ختم ہو چکی اور شاہجہاں کی فوج غالب آئی، شاہجہاں حاکم بنگالہ ابراہیم خاں کی

سرکوبی کیلئے بنگال آیا تھا اس جنگ میں ابراہیم خاں مارا گیا۔

اس واقعہ سے شاہجہاں اتنا خوش ہوا کہ اس نے حضرت شاہ دولہ کی خدمت میں جاگیر بطور نذرانہ پیش کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

”بابا! فقیروں کو دھن دولت سے کیا واسطہ؟“ اور آپ نے ہدایت کی کہ اپنے باپ کے پاس لوٹ جائے شاہجہاں خاموشی سے واپس چلا گیا اور جہاں سے اس کی صلح ہو گئی۔ شاہجہاں ۱۶۳۵ء میں تخت نشین ہوا اس لئے جو جاگیر حضرت شاہ دولہ کی خدمت میں پیش کرنا چاہی تھی اسے ۱۶۳۹ء میں آپ کے صاحبزادہ حضرت مولانا عبد الحمید دانشمند (جو اس وقت کم سن تھے) کے نام سے منسوب کر دیا۔ اس جاگیر سے آٹھ ہزار روپے کی آمدنی تھی۔

حضرت پیر شاہ دولہ نے سو سال سے زیادہ کی عمر پائی۔ آپ نے تین عظیم مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا آفتابِ حکومت طلوع و غروب ہوتے ہوئے آپ کا مزار مقدس باگھ میں زیارت گاہ خاص و عام ہے ہر سال عید الفطر کے دوسرے روز یہاں شاندار میلہ لگتا ہے جس میں دو دو سو سے لوگ آتے ہیں اور درگاہ مبارک کی زیارت سے روحانی مستی حاصل کرتے ہیں۔

آپ کی درگاہ شریف کے آس پاس ان فرزندانِ توحید کے مقبرے ہیں جو آپ کی اولاد میں سے ہیں اور جن کے فیضان نے کفر کی تاریکی کو ایمان کی روشنی سے بدل دیا۔ حضرت پیر شاہ دولہ کی اولاد میں کئی مشائخ اسلام اور موفیائے کرام پیدا ہوئے ان میں آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا عبد الحمید دانشمند ایک بلند بزرگ گروہ ہیں حضرت عبد الحمید دانشمند دینی و دنیاوی علوم سے بہرہ ور تھے آپ نے اپنے علم و عرفان کے ذریعہ اسلام کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ آپ نے باگھ میں ایک ایسا مدرسہ قائم کیا جو علم و معرفت کا گہوارہ بن گیا علوم اسلامیہ کیلئے یہ درس گاہ پختہ متحدہ بنگال میں مشہور تھی خصوصاً قرآن و فقہ کی تعلیم کیلئے مستند سمجھی جاتی تھی۔

سینا قاری تربیت پاتے تھے۔ چنانچہ بنگال کے گوشے گوشے سے شیدائیانِ دینی، علم اسی مدرسہ دینیہ سے مستفیض و فیضیاب ہوتے۔ حکومت کی نظر میں بھی اس کی اہمیت تھی کہ حکومت کی ہدایت پر اس وقت کے ریزیدینٹ نے ۱۸۳۳ء میں ہانگہ مدرسے کی تعلیمی رپورٹ مرتب کی جس کی بنیاد پر اس حکومت کی سرپرستی بھی حاصل رہی۔

واللہ اعلم اپنے روزنامہ میں لکھتا ہے :

م لوگوں نے دو ماہ علی پور میں قیام کیا یہاں سے چند گام کے فاصلہ ہانگہ ملک نام کے ڈوگاؤں ہیں۔ ہانگہ میں تقریباً سو سال کی عمر کے ایک بزرگ اودو میاں رہتے ہیں، اس گاؤں کے قلب میں پانی سے بھرا ہوا ایک تالاب بھی ہے۔ تالاب کے چاروں طرف اسی بزرگ ہستی کے لڑکے اور لڑکیوں کے مکانات ہیں۔ ہوا و میاں کے مکان میں مدرسہ علوم قائم ہے مدرسہ کی دیواریں مٹی کی ہیں اوپر گھاس پوس کی چھت ہے اس سے میں سب کی بھاری تعداد اکتسابِ علم میں مشغول رہتی ہے۔ تالاب کے کنارے آسم اور کھنسل کے درخت ہیں، یہ درخت پھلدار بھی ہیں اور

علی پور دریائے پدما کے کنارے واقع ہے اور اسے بھی پرگنہ شکرپور میں شامل ہے۔ چونکہ شکرپور کے پٹھان جاگیرداروں نے بغاوت کی تھی اس لئے اس گنہ نے یہ پرگنہ پتھیا کے زمیندار پتھیر کو دیدیا تھا۔ ۱۶۵ مربع میل کا یہ علاقہ راجشاہی کا سب سے بڑا پرگنہ ہے۔ علی پور سترھویں صدی میں قائم تھا۔ پٹھان سرداروں کے ساتھ جب ہم جاری تھی تو اس وقت اسلام علی پور کو اپنی قیام گاہ بنالیا تھا۔ بہارستان ضلعی اور دہلی کے کتابوں سے ہے کہ ہاربا فوجی اور جنگی ضروریات کیلئے سپاہیوں نے علی پور کو اپنی مرکز بنالیا تھا۔ ۳

سایہ دار بھی - گاؤں کے چاروں طرف پر فضا سبزہ زار ہے - یہی علاقہ ہوادامیاں کو پیش کیا گیا تھا - یہ علاقہ شور و شغب اور زندگی کے ہنگاموں سے دور ہے اور کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو ان علاقوں میں پُر سکون زندگی بسر کرتے ہیں وہ سب سے محبت کرتے ہیں اور دوسرے بھی ان سے بہت مانوس ہیں -

ان کا اصل نام عبدالحمید دانشمند تھا لیکن وہ ہوادامیاں کے نام سے مشہور تھے - اس بارے میں اختلاف ہے کہ عبداللطیف کی ملاقات عبدالحمید دانشمند سے سے ہوئی تھی یا ان کے صاحبزادے عبدالوحید سے ہوئی تھی - عبدالوحید کے بیٹے شاہ محمد رفیق (یعنی عبدالحمید دانشمند کے ہوتے) نے آدھی ہاگیر وقت کر دی تھی - وقف کے جہتم کو رئیس کہتے تھے - مسجد مدرسہ اور مسافر خانہ کی نگرانی اور انتظام رئیس کے فرائض میں داخل تھا -

شاہ محمد رفیق کے بیٹے معین الاسلام، شمس الاسلام، شریف الاسلام، شریف الاسلام کے بھائی فصیح الاسلام، فصیح الاسلام کے بیٹے فیض الاسلام ہوئے - فیض الاسلام کے کوئی بیٹا نہ تھا اس لئے ان کے داماد نور عالم چھٹے رئیس مقرر ہوئے - ساتویں رئیس نور عالم کے لڑکے خوندکار عبدالرشید ہوئے -

۱۸۰۵ء میں شاہ محمد رفیق رئیس اقل کے پڑپوتے مشعر الاسلام نے کلکتہ کی دیوانی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا اور فیصلہ کے مطابق خوندکار عبداللہ کو مشعر الاسلام رئیس بنائے گئے - پھر مشعر کے دو بیٹے مظفر الاسلام اور رئیس الاسلام کے بعد دیگر رئیس بنے - عزیز الاسلام کے بعد ان کے بیٹے تیغ الاسلام جانشین ہوئے - شیخ الاسلام کے بیٹے رئیس الاسلام بارہویں رئیس تھے - باگھ کے رئیسوں کی بڑی عزت و وقعت تھی -

باگھ کے رئیس فاندان کے افراد زیادہ تر شہر میں آباد ہیں -

# سندھی بزرگوں کا سیاست میں حصہ

جناب مولائی ششیدائی

مترجم رحمت فخر آبادی ایم، اے

دفعہ ذیل مقالہ سہ ماہی سندھی رسالہ ”مہمان“ کے شمارہ ۲۲  
اور ۲۳ ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا تھا، اس میں ان بزرگانِ دین کے حالات  
ہیں، جنہوں نے سندھ کی سیاست میں سرگرمی سے حصہ لیا، اگر ہم صرف  
ان ہی چند بزرگوں کے جامع اور مکمل کوائف بیان کرنے پر تکیہ کریں تو کئی  
 ضخیم جلدیں لکھی جاسکتی ہیں اور ان کے حالات اور افکار ہماریسے لئے  
درسِ عبرت اور مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں۔

سندھ میں جگہ جگہ ہمیں خانقاہیں ملتی ہیں جو ان بزرگوں کی یادگار ہیں، جنہوں  
نے گوشہ نشین ہوتے ہوئے بھی اس دور میں حکومتیں قائم کیں جب کہ حاکمِ وقت  
نوجی طاقت کے بل بوتے پر حکومت کرتے تھے۔ دورِ جدید میں ان بزرگوں کی یادگار  
صرف اس طور پر منائی جاتی ہے کہ ان کے گدی نشین صرف سالانہ عرس کے موقع  
پر شعر و شاعری، سماع اور سرود، ذکر و فکر اور ادبی محافل منعقد کراتے ہیں۔

دور جدید میں ان میں سے کئی بزرگوں کے گدی نشین حضرات کے مریدوں اور معتقدوں کی تعداد کافی سے زائد ہے اور اسی بنا پر وہ رسمی طور پر ملکی سیاست میں حصہ لینے اور اسمبلی کی ممبری کو ایک بلند سیاسی معیار تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل اس کا یہ تصور نہ تھا۔

اپنے تابناک ماضی میں حکومت سندھ کا نظام شخصی غیر محدود تھا، جب عالم وقت میں نظام حکومت کو صحیح طور پر اصولوں کے مطابق چلانے کی صلاحیت ہوتی تو عوام اپنی زندگی فارغ البالی اور امن و امان سے بسر کرتے لیکن جب عالم وقت نااہل اور عمال راشی و ظالم ہوتے تو عوام حکومت سے بیزار ہو جاتے۔ ایسے وقت میں یہ گوشہ نشین بزرگ جو توحید اسلامی کی تبلیغ کے علاوہ فیض روحانی بھی رکھتے تھے عوام کو کرب و بلا سے نجات دلانے کے لئے حکومت وقت سے کوئی تعلق نہ رکھنے کے باوجود سیاست میں کود پڑتے تھے اور طاغوتی اور جبروتی قوتوں کا مقابلہ کرتے۔ ذیل میں ہم ایسے ہی چند تاریخی بزرگوں کے حالات درج کرنے کی جسارت کرتے ہیں۔

(۱) سید علی ملی نہ کسی دوشیزہ کو اپنے نفس کی بھیشت پڑھاتا۔ مشرع بیرون کے بیان کے مطابق اس نے اس سلسلہ میں اپنی سگی بھانجی اور بھتیجی تک کو نہ چھوڑا۔ چنانچہ عوام اس کے ظلم و ستم سے سخت نالاں اور درباری امراء و رؤساء اس کی نفسانی ستم ظریفیوں سے سخت پریشان تھے۔ جب اس کے ظلم و ستم کی آواز دیبا رہنماد تک پہنچی تو سادات کرام میں سے سید علی ملی الہاشمی جہاد فی سبیل اللہ کے ارادے سے سندھیوں کی مدد کے لئے آئے اور راجہ دلورائے کے تحت و تاج کے ساتھ اس کے مقابلہ کا حاتمہ کیا۔ اس بزرگ ہستی کا یہ کارنامہ تاریخ سندھ میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔

(۲) شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانیؒ شیخ الشیوخ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے آباؤ اجداد غازی محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے اور منصورہ کے قریب ایک گاؤں بانیہ میں قیام کیا،

شیخ صاحب بہاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے ۱۸۰۷ء سے ۱۸۱۷ء تک منصورہ پر حکومت کی۔ جب ۱۸۲۵ء میں محمود غزنوی نے منصورہ پر قبضہ کیا تو بہاری خاندان سکرم میں اقامت پذیر تھا۔ شیخ بہار الدین زکریا، شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ تھے۔ آپ کے دور میں ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ التمش کے خلاف تھے، اور تخت دہلی حاصل کرنے کے لئے سازشیں کر رہے تھے، چنانچہ قباچہ کی اس روش سے قاضی شہر جناب شرف الدین اصفہانی اور شیخ بہار الدین زکریا نے خطوط کے ذریعہ التمش کو اطلاع دی، اتفاق سے یہ دونوں خط قباچہ کے ہاتھ لگ گئے اور اس نے مشتعل ہو کر دونوں کو دربار عام میں بلایا اور خطوط پڑھنے کا حکم دیا، قاضی شہر تو کانپنے لگے، چنانچہ سلطان کے اشارہ سے جلا نے چشم زدن میں فوراً قاضی شہر کا مرتب سے جدا کر دیا، لیکن حضرت شیخ بہار الدین زکریا نے نہایت بے باکی سے سلطان کو مخاطب کر کے کہا:-

”میں نے جو کچھ خط میں لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ یہ سب میں نے خدا کے حکم سے اور عوام الناس کی بھلائی کی خاطر کیا ہے، کیونکہ تو سازشی ہے اور رعیت کو تاریکی کی طرف لے جا رہا ہے، اس طرح التمش کو اطلاع کر تیرا فرض اولین ہے۔“

یہ جواب سن کر ناصر الدین قباچہ پر اتنا خوف طاری ہوا کہ اس نے اس خدا رسیدہ بزرگ کو نہایت عزت و احترام کے ساتھ واپس کر دیا۔

۱۸۶۷ء میں سلطان فیروز شاہ تغلق انہی ہزار فوجیوں کا ایک (۳) مخدوم جہانیاں لشکر جبار اور ہاتھیوں کا جم غفیر ساتھ لے کر سندھ پر حملہ کی غرض سے آیا، یہ دیکھ کر ایک طرف تو جام بابینہ نے سندھ کے تمام زمینداروں کو فصلیں تباہ کرنے کا حکم دیا تاکہ سندھ میں قحط کے آثار پیدا ہو سکیں اور دوسری طرف حضرت سید جلال الدین جہانیاں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے صلح کرانے کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ کے حکم سے سلطان فیروز شاہ تغلق نے جام بابینہ نے صلح کر لی



اور سندھ، دہلی کے پنجے استبداد سے بچ گیا۔ سلطان فیروز شاہ تغلق نے سیوہن کا علاقہ آپ کو بطور جاگیر دینے کا ارادہ کیا لیکن آپ نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔

(۴) سید ابوالغیث بکھریؒ جام فتح خاں بن اسکندر (سمہ سلاطین) کے دور میں میرزا پیر محمد نے ملتان اور اراج کے قلعوں پر قبضہ کرنے کے بعد بکھر قاصد روانہ کیا تاکہ یہاں کے عوام اطاعت قبول کر لیں۔ چنانچہ عوام کو اس خوف و ہراس سے نجات دلانے کے لئے حضرت ابوالغیث بکھریؒ نے ملتان جا کر مرزا پیر محمد سے ملاقات کی اور بکھر کے عوام کے لئے سلامتی کی سفارش کی۔ مؤرخ کہتے ہیں کہ سید ابوالغیث کے حاضر ہونے سے پہلے مرزا پیر محمد نے ایک رات رسول اکرمؐ کا خواب میں دیدار کیا۔ حضورؐ نے اسے ہدایت کی کہ یہ ہمارا فرزند ہے اور تجھے ہر طرح سے اس کی پاسداری کرنا ہے۔ ان کی اس طرح نگہداشت کر جس طرح تو اپنے بچوں کی کرتا ہے، اس خواب کے گیارہ دن بعد سید ابوالغیثؒ مرزا کے سامنے سر دربار حاضر ہوئے۔ سید صاحبؒ کو دیکھ کر مرزا تخت سے اتر کر استقبال کے لئے آگے بڑھا، سید صاحبؒ کو تخت پر اپنے پہلو میں جگہ دی، اور کافی عزت و تکریم کی۔ جب ابوالغیثؒ بکھر واپس آئے تو پیر محمد نے آپ کو ایک نہایت عمدہ گھوڑا اور دیگر بیش قیمت اشیاء بطور نذرانہ دیں۔ علاوہ ازیں اور کا علاقہ بطور جاگیر بخشا۔

۵۔ مخدوم بلاول ستور مخدوم بلاول کا مزار موضع باغیاں ضلع دادو میں ہے اور وہاں ہر ماہ کی پہلی جمعرات کو میلہ لگتا ہے۔ مخدوم بلاولؒ ایک اعلیٰ پائے کے بزرگ تھے۔ ان کے زمانہ میں سومرہ سلاطین کے بعد اہل سمہ سندھ کے حکمران تھے۔ یہ ابتدا میں تخت دہلی کے زیر اثر تھے، آخری سمہ حاکم کے دور میں جب سندھ اندرونی آزادی حاصل کر چکا تھا۔ اس آخری حاکم کا نام جام نظام الدین تھا۔ اس کے ایک وزیر دریا خاں نے تحریک آزادی سندھ کی ابتدا کی۔ اس قومی تحریک میں مخدوم بلاولؒ اپنے دو خلفاء سید حیدر سنائی اور مخدوم ساہر کے ساتھ شریک تھے۔ دریا خاں کے بیٹوں عمود اور مٹھن خاں نے شاہ بیگ ارفون سے نجات حاصل کرنے

کے لئے ٹلٹی کے قریب فوج جمع کی۔ مرزا شاہ بیگ ارغون نے کئی عالم دریا خاں کے بیٹوں کو سمجھانے کے لئے روانہ کئے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ ان حالات کے تحت، مرزا شاہ بیگ ارغون کی فوجی طاقت کو دیکھتے ہوئے، مخدوم بلاولؒ کی ہدایت کے مطابق جام سارنگ، رانارنل، سوڈھ اور اس کے بھائی جودھاسنگھ سوڈھ نے ٹلٹی کے قلعہ میں اپنی فوجی طاقت میں مزید اضافہ کیا۔ اس جنگ میں میر فاضل کو کلتاش نے شاہ بیگ ارغون کا کافی لشکر تہ تیغ کیا تھا لیکن پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری، ٹلٹی پر حملہ آور ہوا۔ اس جنگ میں جودھاسنگھ مارا گیا، دریا خاں کے دونوں بیٹے بھی کام آئے، مخدوم بلاولؒ پر شاہ بیگ ارغون نے پہلے تو بھاری جرمانہ عائد کیا لیکن بعد میں شہید کرادیا۔

(۶) قاضی قاضنؒ قاضی قاضن سیولانی، امین قاضی ابوسعید ابن قاضی زین العابدین ابن قاضی قاضن حافظ قرآن، قاری، محدث و مفسر اور اصول فقہ و تصوف کے جید عالم تھے۔ آپ کئی چیزوں کے بانی تھے۔ ۱۵۲۰ء میں شاہ بیگ ارغون نے دریا خاں کو شکست دینے کے بعد لنگاتار فودن ٹھٹہ کو جو اس زمانہ میں پایہ تخت تھا لوٹنے کا حکم دیا۔ اس لوٹ مار میں جو آدمی قید ہوئے ان میں قاضی قاضن کے اہل و عیال بھی تھے جن کو آپ ٹھٹہ کے قرب و جوار میں تلاش کر رہے تھے۔ ان حالات کے تحت آپ نے عوام کی درد انگیز تباہی و بربادی کی داستان پر مشتمل ایک خط حافظ محمد شریف کے ہاتھ شاہ بیگ ارغون کے پاس بھجوا دیا، جسے پڑھ کر اس پر اتنا اثر ہوا کہ اس نے عام معافی کا حکم دیا نہ صرف یہ بلکہ اب اس واقعہ کے بعد قاضی قاضن مقامی معاملات آپ ہی کے مشورہ سے طے کرنے لگا۔

مخدوم محمد بھٹیؒ، حضرت مخدوم محمد اسحق بھٹی ہالائی کے فرزند اور ظاہری اور باطنی علوم کے ایک جید عالم تھے، ان کے حاکم وقت سے ہمیشہ اچھے مراسم رہے۔ ایک دفعہ مخدوم صاحب مظلوم کی دادرسی کے لئے ٹھٹہ کے حاکم جام نندا کے پاس گئے۔ جام نے کہا کہ مجھے تمہارے بھائی مخدوم محمد

کی نیابت کا اذہد شوق ہے۔ آپ نے فرمایا کہ وہ کب میری پرواہ کرتے ہیں اور نہ ہی میری ان سے کوئی حاجت ہے۔ ابھی وہ یہ گفتگو کر رہے تھے کہ مخدوم احمد آگئے جام نے نہایت عقیدت و مسرت سے مخدوم احمد کی دست بوسی کی اور جس کام کے لئے مخدوم محمد گئے تھے کر دیا۔

(۸) مخدوم نوح ہالائیؒ حضرت مخدوم نوح غوث الحق ہمیشہ حالت استغراق میں رہتے لیکن حاکم وقت کے ساتھ بہت دیری سے پیش آتے۔ سیوہن میں جب ہمایوں نے مرزا شاہ حسن کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد روپڑی جانے کا ارادہ کیا تو مرزا شاہ حسن نے اپنی تمام رعایا کو حکم دیا کہ کوئی بھی ہمایوں کو اپنی کشتی نہ دے۔ اس پر مخدوم نوح نے کہا کہ معزول شہنشاہ سندھیوں کا جہان ہے اس لئے ہمارا یہ فرض ہے کہ اس کی اس مصیبت پر مدد کریں۔ شاہ حسن ارغون نے جب مخدوم نوح کا یہ حکم سنا تو بیچ و تاب کھانے لگا لیکن اتنی جرأت نہ ہوئی کہ اپنے وقت کے غوث سے اس سلسلہ میں کچھ معلوم کر سکے۔

مرزا عبدالباقی اتنا ظالم تھا کہ ٹھٹھہ کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنی عبادت گاہوں میں اس کے مظالم سے نجات پانے کے لئے دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں۔ ایک دفعہ جب مخدوم نوح ٹھٹھہ میں میر علی شیرازی کے یہاں جہان تھے، تو مرزا عبدالباقی نے آپ سے درخواست کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ حکومت کے استحکام کے لئے تین چیزیں ضروری ہیں۔

۱۔ مٹی کا قلعہ یعنی رعایا۔ جب رعایا کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کیا جائے گا تو وہ خوش رہے گی۔

۲۔ دوسرا لوہے کا قلعہ یعنی فوج، جس کے استحکام کے لئے دولت درکار ہے، یعنی جب رعایا خوشحال اور فارغ البال ہوگی تو حکومت کے پاس دولت کی فراوانی ہوگی اور

۳۔ تیسرا فولادی قلعہ یعنی اہل اللہ، علماء کرام اور ادباء۔ جب انہیں حکومت کی طرف سے کافی مراعات حاصل ہوں گی تو ملک میں تعلیم عام ہوگی، کیونکہ ان افراد

کے لئے فکرِ معاش سے آزاد ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس طرح وہ تندی سے کام کریں گے۔ ان کی دعائیں اور خدمات حکومتِ وقت کے لئے فولادی قلعہ کا کام دیں گی۔

(۹) شیخ بہار الدین گودریو (دلچپوش) آپ اپنے وقت کے عارفِ کامل، عالمِ ماعمل اور فقیہ بے بدل تھے۔ ایک شخص ملا محمد حسن نامی آپ کا دلی دوست تھا، وہ ایک دفعہ علاقہ کچھ کی سیر کرتے ہوئے راجکمار پر عاشق ہو گیا۔ جب راجہ کو یہ معلوم ہوا تو اس نے محمد حسن کو قید کر دیا۔ شیخ صاحب اس خبر کے سنتے ہی مازم کچھ ہوئے، ان دنوں کچھ میں سخت قحط تھا اور عوام بارش کے لئے ترس رہے تھے۔ راجہ نے شیخ صاحب سے کہا کہ اگر آج رات اتنی بارش ہو جائے جو ساری آبادی کے لئے کافی ہو تو وہ ملک کی خوشحالی کی خاطر اپنی بیٹی کی قربانی سے دریغ نہ کرے گا اور ملا کو آزاد کر دے گا۔ اس واقعہ کے کچھ دیر بعد ہی اتنی بارش ہوئی کہ عوام پناہ مانگ گئے۔ چنانچہ اس طور پر ملا محمد حسن آزاد ہوئے۔

ان ہی دنوں نواب شریف خاں، جہانگیر کی طرف سے ٹھٹھہ کا گورنر مقرر ہوا۔ ان میں شہزادہ خرم یعنی شاہجہان نے اپنے باپ سے ناراض ہو کر سندھ کا رخ کیا تو شریف خاں حاکم ٹھٹھہ نے رکاوٹ پیدا کی۔ شہزادہ اس پر شیخ صاحب کی خدمت میں دعا طلبی کے لئے حاضر ہوا۔ اس پر شریف خاں نے انہیں بھی جیل میں بند کر دیا اور ان کے قیمتی کتب خانہ کو تباہ و برباد کر دیا۔ ان حالات میں جب آپ کے دوستوں نے آپ سے کسی کرامت کے اظہار کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا کہ کرامت سے شہرت ہوتی ہے جو مردانِ خدا کے لئے آفت ہے۔

۱۸۶۷ء میں رنجیت سنگھ کے زمانہ میں پنجاب میں مسجدوں کو گھوڑوں کا اصطبل بنایا گیا تھا، اس سلسلہ میں مسلمانوں کو حکم تھا کہ خالصہ مہکار کی حدود میں اذان نہ دی جائے۔ پنجاب

کی مسلمان قوموں یعنی ٹوانہ، اعوان، سیال اور اہل قصور کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ وہ سکھوں کا مقابلہ کر سکیں۔ پنجاب میں سکھوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کئے ان کے استیصال کے لئے شاہ عبدالعزیزؒ کے دو مریدوں سید احمد بریلویؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کیا۔ سید احمد بریلویؒ جہاد فی سبیل اللہ کے موقع پر سندھ آئے۔ حضرت سید صبیحۃ اللہ شاہ راشدی یعنی پیر صاحب پاگاڑو شریف نے آپ کو حروں کا ایک دستہ بطور امداد دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالحیؒ نے اپنے فتوؤں سے ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا۔ ان مجاہدوں کا یہ پروگرام تھا کہ خیبر سے ہنگلی تک بطرز خلافت راشدہ اسلامی جمہوریت قائم کی جائے۔ سندھی علماء میں حضرت پیر صبیحۃ اللہ شاہؒ نے اس جہاد میں عملی حصہ لیا، مجاہدوں نے ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو پشاور پر قبضہ کیا۔ انگریزی سامراج کے نمک خوار بازیگروں نے صوبہ سرحد میں وہ ہنگامہ برپا کیا کہ حضرت سید احمد بریلویؒ اور سید اسماعیل شہیدؒ سکھوں سے لڑتے ہوئے ۱۸۵۷ء میں شہید ہو گئے۔

(۱۱) سید فتح محمد شاہ لکیاریؒ ۲۳ جنوری ۱۸۵۷ء کو بلوچ قبائل نے حیدرآباد میں میجر اوٹرم کی ریزیدنسی پر حملہ کیا۔ چنانچہ سرچارلس نیپئر نے پیر ابوبکر، وٹھان، شہدادانی اور مانکانی کے علاقوں کے ٹاپپوروں کو حکم دیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں ورنہ قلعہ حیدرآباد کو تباہ کر دیا جائے گا۔ چارلس نیپئر جیسے بدذماغ کی اس بے جا لٹکار پر سید فتح محمد شاہ لکیاریؒ نے اہل سندھ کو انگریزوں کے خلاف دعوت جہاد دی، اور اپنے مریدوں کے ہمراہ میانہ کے میدان میں بلوچی لشکر کے ساتھ شامل ہو گئے۔ آپ کی دعوت پر سندھ کے کئی سادات گھرانوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ جنگ کے دوران انگریزوں کی گولہ باری کی وجہ سے تین گھنٹوں کے بعد لغاری اور ٹھور خانہ دانوں نے راہ فرار اختیار کی، پھر بھرگڑی دستوں میں افراتفری پھیلی لیکن اہل سادات آخر دم تک لڑتے رہے۔ میانہ کی جنگ ہندوستان کی جنگوں میں خوریز اور فیصلہ کن شمار کی جاتی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے (۱۲) حضرت پیر صبیحۃ اللہ شاہ ثانیؒ آپ پر کئی الزامات عائد کئے اور ان کو تکلیفیں

دیں۔ چنانچہ آپ کے عقیدتمندوں نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا۔ مٹروں کو انگریزوں نے بری طرح تباہ و برباد کیا۔ آپ نے اسی جہاد میں جامِ شہادت نوش کر کے اہلِ سندھ کے لئے ایک لافانی مثال قائم کی۔

(۱۳) مولانا تاج محمود امریؒ سندھ کے آخری دور میں جو ہا کمال اصحابِ گزریے ہیں ان میں مولانا مرحوم ایک اعلیٰ پائے کے بزرگ تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر پیر جو گوٹھ جا کر فارسی علم و ادب کی تحصیل کی، اور عربی علوم و فہم کی تعلیم عالمِ شباب میں مولانا عبدالقادر پھنواری سے حاصل کی۔ پھر تعلقہ میرپور ماٹھیلو میں اپنے والد کی وصیت کے مطابق حافظہ عمداً صدیقی کے چشمہ فیض و عرفان سے فیضیاب ہوئے۔

امروٹ شریف وہ جگہ ہے جہاں مشہور لیڈر اور عالمِ دین مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے ابتدائی علوم کی تحصیل کی۔ آپ نے شدھی و شنگھٹن تحریک کے دوران تبلیغِ اسلام شروع کی۔ اس کام کے علاوہ آپ کی زندگی کا دوسرا روشن پہلو جہاد ہے، ۱۹۱۹ء میں خلافت تحریک کے دوران آپ کا یہی موضوع تھا۔ ۱۹۲۲ء میں آپ جمعیتہ العلماء ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ میں صدر مقرر ہوئے۔

آپ کے ادبی کارناموں میں مثنوی یوسف و زلیخا کا سندھی منظوم ترجمہ اور قرآن کریم کا سندھی ترجمہ قابلِ ذکر ہے۔ آپ کا انتقال ۵ نومبر ۱۹۲۹ء کو ہوا۔

ہرگز نمیر و آں کہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدہ عالم دوام

# تنقید و تبصرہ

## خلافت و ملکیت

مصنفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی

زیر نظر کتاب کے بعض ابواب اس کتاب کے شائع ہونے سے کافی پہلے مولانا مودودی صاحب کے رسالے ”ترجمان القرآن“ میں شائع ہوئے، جس پر علمائے کرام کے ایک بڑے حصے نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اور مولانا موصوف نے تاریخ اسلامی کے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور کو جس طرح پیش کیا ہے، اس کے خلاف دینی رسالوں میں بہت کچھ لکھا گیا اور یہ مسئلہ دینی علمی حلقوں میں بڑی گرم بحث کا موضوع بنا رہا۔ یہ کتاب مکمل شکل میں چھپ گئی ہے، اور امید ہے اس کے بارے میں اب اور بھی شدت سے بحث ہوگی۔ کیونکہ اس کتاب میں مولانا مودودی نے جو سوالات اٹھائے ہیں۔ ان پر گزشتہ بارہ تیرہ سو سال سے اُمت بحث کرتی چلی آئی ہے۔ اور ہر فریق کو اپنے نقطہ نظر کی تائید میں روایات کا اتنا مواد مل جاتا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ قاری اور طالب حق کن روایات کو مان لے اور کن کا انکار کرے۔

مولانا کے نزدیک ”کتاب کا موضوع بحث یہ ہے کہ اسلام میں خلافت کا حقیقی تصور کیا ہے۔ کن اصولوں پر وہ صدر اول میں قائم ہوتی تھی۔ کن اسباب سے وہ

ملکیت میں تبدیلی ہوئی کیا نتائج اس تبدیلی سے رونما ہوئے اور جب وہ رونما ہوئے تو ان پر اُمت کا ردِ عمل کیا تھا؟ کتاب کے پہلے دو باب ”قرآن کی سیاسی تعلیمات“ اور ”اسلام کے اصولِ حکمرانی“ ہیں ”حاکمیتِ الہیہ“ اور ”اللہ کی قانونی حاکمیت“ کے بارے میں مولانا کے جو مخصوص نظریات ہیں۔ ان دو ابواب میں آیاتِ قرآنی کو اُن کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔

مولانا نے اپنے خیال سے قرآن کے ۱۶ نکات سے اسلامی ریاست کی جو خصوصیات متعین کی ہیں، ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے:-

”وہ جمہوریت کے اس اصول میں ڈیموکریسی سے متفق ہیں کہ حکومت کا بننا اور بدلتا اور چلایا جانا بالکل عوام کی رائے سے ہونا چاہیئے، لیکن اس میں عوام مطلق العنان نہیں ہوتے کہ ریاست کا قانون، اس کے اصولِ حیات اس کی داخلی و خارجی سیاست اور اس کے وسائل و ذرائع، سب ان کی خواہشات کے تابع ہوں اور جہدِ جہد وہ مائل ہوں، یہ ساری چیزیں بھی اسی طرف مڑ جائیں، بلکہ اس میں خدا اور رسول کا بالاتر قانون اپنے اصول و حدود اور اختلافی احکام و ہدایات سے عوام کی خواہشات پر مضبوط قائم رکھتا ہے اور ریاست ایک ایسے متعین راستے پر چلتی ہے، جسے بدل دینے کے اختیارات نہ اس کی منتظمہ کو حاصل ہوتے ہیں نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو، نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو، لہٰذا یہ کہ قوم خود اپنے عہد کو توڑ دینے کا فیصلہ کر کے دائرۂ ایمان سے نکل جائے“

ایک طرف حکومت کو بنانے، بدلنے اور چلانے کا اختیار بالکل عوام کی رائے کو دیا گیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہے کہ عوام مطلق العنان نہیں ہوتے۔ پھر یہ کہ ریاست کے متعین راستے کو بدل دینے کے اختیارات نہ منتظمہ کو حاصل ہیں، نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو، نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو۔ یہاں جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر ریاست کے لئے یہ راستہ متعین کون کرے گا؟۔ قرآن اور سنت میں تو اس راستے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ عمومی اصول ہیں۔ اب اگر مثال کے طور پر مولانا مودودی صاحب اسلامی ریاست کا ایک راستہ متعین فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی اسلامی ریاست کا متعین راستہ ہے، جسے بدلنے کا نہ منتظمہ کو حق ہے نہ عدلیہ کو، نہ مقننہ کو اور نہ مجموعی طور پر پوری قوم کو۔ تو پھر عوام



کی رائے کا معترف کیا ہو گا؟ مولانا نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی۔ اگر راستے کے تعین میں عوام صاحب اختیار نہیں، تو پھر دوسرا کون ہے؟

مولانا نے قرآن کے ۱۶ نکات سے اسلامی ریاست کی جو تصویر مرتب کی ہے اولاً: ان قرآنی آیات سے یہ نکات اخذ کرنا مولانا کا خالص ”اجتہاد“ ہے۔ پھر اس ”اجتہاد“ کا اتنا استحکام کر اُسے نہ پوری قوم بدل سکے، نہ اس کی منتظمہ، نہ عدلیہ اور نہ مقننہ۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ یہ اسلامی ریاست ڈیموکریسی بھی ہے، سمجھ سے بالاتر ہے۔ جمہوریت اور ڈیموکریسی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اختیار کا آخری مرجع عوام ہیں۔

صفحہ ۱۷ میں ”ریاست کا مقصد وجود“ کے تحت ارشاد ہوتا ہے :-

”اس ریاست میں حکمران اور اس کی حکومت کا اولین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظام زندگی کو کسی رد و بدل کے بغیر جو کاتوں قائم کرے۔۔۔“

یہاں ایک تو اسلامی نظام زندگی کی قدرے وضاحت کی ضرورت تھی کہ آیا وہ ایک حاد نظام ہے جو کسی رد و بدل کے بغیر جو کاتوں قائم ہو سکتا ہے یا اس نظام کے چند ابدی اصول ہیں، جو ہر دور میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق مختلف قالبوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ مولانا نے یہ مسئلہ بھی بالکل مبہم رکھا ہے۔

ایک سیاسی نظام میں سب سے بنیادی اور اہم نکتہ حاکم، صاحب اقتدار یا ہیئت حاکمہ کو وجود میں لانے کا ہوتا ہے۔ اور قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا طریقہ معین کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، چنانچہ اسے جمہور کی رائے پر چھوڑ دیا گیا۔ اس لئے حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب جس طرح ہوا، اُسی طرح حضرت عمرؓ منتخب نہیں ہوئے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے جانشین کو منتخب کرنے کا طریقہ اور تجویز کیا اور حضرت علیؓ کا انتخاب اور طریقے سے ہوا۔ اس کے بعد جب ”سابقین اولین“ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تو حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اس زمانے کے عام دستور کے مطابق خاندانی بادشاہت کے نظام کو اپنائیں، اور یہ نظام ان کے ہاں اب تک جاری رہا۔ اب مولانا نے قرآن کی آیات سے سیاسی تعلیمات جمع کیں۔ اور ان تعلیمات کو معیار بنایا کہ اسلامی تاریخ کے اس دور کا جائز

لیا ہے آپ کا طریقہ اخذ یہ ہے ص ۳۵ پر ایک عنوان ہے ”اجتماعی خلافت“۔ ارشاد ہوتا ہے: ”اس جائز اور صحیح نوعیت کی خلافت کا حامل کوئی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ نہیں ہوتا، بلکہ وہ جماعت (Community) اپنی مجموعی حیثیت میں ہوتی ہے۔۔۔۔۔ سورہ نور کی آیت ۵۵ کے الفاظ لُحْمٌ مَّقْتُلٌ لِّفَتْنٍ مَّحْرَفٍ فِي الْأَرْضِ اس معاملہ میں صریح ہیں: لیکن ص ۳۳ پر قرآن کی یہ آیت ہے: ”يَا دَاوُدَ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ“ اسے داؤد ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے۔۔۔۔۔ کیا اس آیت سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ خلافت شخصی بھی ہو سکتی ہے۔

مولانا نے خلافت راشدہ کو ملکیت میں تبدیل کرنے کی ذمہ داری حضرت عثمان پر ڈالی ہے اور ان کے عہد خلافت کی کوتاہیوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اس ضمن میں مولانا نے زیادہ تر روایات سے کام لیا ہے، اور ان کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ سے غلطیاں ہوئیں اور غلط کام بہر حال غلط ہے۔ خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرنا عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے“

حضرت عثمانؓ کے خلاف جو شورش اٹھی، ہو سکتا ہے اُس میں سب سے بڑا دخل اس بات کو ہو کہ لوگ اُن کی اقربا و ازی سے ناخوش ہوں، لیکن فاضل معصوف جیسے محقق عالم سے یہ توقع تھی کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے عہد میں فتوحات کے بعد مسلمانوں کے ہاں دولت کی جو کثرت ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ مرکز شرب عرب قبائل جنگیں لڑنے کے بعد اقتدار میں جس طرح شریک ہو گئے تھے، اُس کے پس منظر میں اس شورش کا تجزیہ فرماتے اور سارا الزام حضرت عثمانؓ کی چند تقریروں پر نہ رکھتے۔ لیکن انہوں نے اس مسئلہ میں وہی مناظرانہ روش اختیار کی ہے، جو ہمارے اکثر اہل قلم کا عام معمول ہے۔ مولانا نے حضرت عثمانؓ کی غلطیوں کو ثابت کرنے کے لئے جو روایات نقل کی ہیں اس کی تردید میں بھی اسی قسم کی روایات پیش کی جا سکتی ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ صدیوں سے اسی طرح چل رہا ہے۔

مثال کے طور پر مولانا نے بڑی تفصیل سے عجاج بن یوسف کے مظالم کو بیان کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اگر وہ اہل عراق کی شورش پسندی اور ہر حکومت کے خلاف خواہ وہ حضرت علیؓ کی ہو یا امیر معاویہ کی ان کی سرکشی کا بھی ذکر کر دیتے، تو عجاج اور یزید امیر کی مظالم کی سنگینی کچھ کم ہو جاتی، لیکن مولانا نے اس کتب میں صرف ایک طرف تصویر دی ہے، جو ظاہر ہے صحیح نہیں۔

ایک باب ہے ”خلافت اور ملوکیت کا فرق“۔ اس کے تحت وہ لکھتے ہیں۔  
 ”شاہی حرس (Body Guard) اُن (بادشاہ قسم کے خلفاء) کے محلوں کی حفاظت کرنے اور اُن کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب و دربان اُن کے اور عوام کے درمیان حائل ہو گئے۔ رعیت کا براہ راست ان تک پہنچنا اور اُن کا خود رعیت کے درمیان رہنا سہنا اور چلنا پھرنا بند ہو گیا۔ اپنی رعیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے۔۔۔۔۔“

ذرا اندازہ لگائیے کہ جب اسلامی ریاست صرف جزیرہ عرب تک محدود تھی اور مدینہ کا ہر شخص جانا پہچانا تھا، اُس وقت خلیفہ جس طرح آزادی سے چل پھر سکتا تھا، بعد میں جب اسلامی ریاست کی حدیں وسیع ہو گئی تھیں، اور مدینہ میں اور اقوام و اجناس کے لوگ آباد ہو گئے تھے، خلفاء کا پہلے کی طرح چلنا پھرنا خطرے سے کیسے خالی ہو سکتا تھا حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور بعد میں کوفہ میں حضرت علیؓ کا شہید کیا جانا اس بات کا متقاضی نہ تھا کہ خلیفہ کی حفاظت ہو۔ اور ہر شخص کا اس تک براہ راست پہنچنا پہلے کی طرح نہ روا رکھا جاتا۔ چنانچہ یہی ہوا۔ کیونکہ حضرت علیؓ جیسا ہر ولایت خلیفہ بھی ایک جنونی کے ہاتھ سے شہید ہو سکتا ہے۔ باقی یہ الزام کہ بعد کے خلفاء اپنی رعیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے۔ تو کیا اتنی وسیع مملکت کے حالات معلوم کرنا خود خلیفہ کے بس میں تھا۔ جب سلطنت کی حدیں سندھ سے لے کر اسپین تک تمتد ہو جائیں تو خود خلیفہ کا حضرت عمرؓ کی طرح گھروں کا چکر لگانا کیسے ممکن ہے۔

مولانا نے اس بات پر بھی بڑے افسوس کا اظہار کیا ہے کہ خلافت کی جگہ جب

ملوکیت آئی تو مسلمانوں کی قیادت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک دینی قیادت اور دوسری سیاسی قیادت۔ موصوف فرماتے ہیں:-

”اسلام کا منشا قیادت کی اس تقسیم سے پورا نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ اسلام کا ٹھیک ٹھیک منشا تو اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جب کہ اس امت کو ایک ایسی قیادت میسر ہو جو خلافت راشدہ کی طرح بیک وقت دینی قیادت بھی ہو اور سیاسی قیادت بھی، جس کا سیاسی اقتدار اپنے تمام ذرائع و وسائل نہ صرف دین کے مقاصد کی تکمیل میں صرف کرے، بلکہ اس اقتدار کا اصل مقصد دین ہی کے مقاصد کی تکمیل ہو۔۔۔“

خلافت راشدہ میں خلیفہ نمازیں پڑھاتا تھا، جمعہ کا خطبہ دیتا تھا، قانون کی تعبیر و تعیین کا آخری مرجع وہی تھا۔ ہر معاملے میں اسی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ یہ وہ دور ہے جب مدینہ ایک مختصر سا گاؤں تھا، لیکن جب اسلامی سلطنت دور دور تک پھیل گئی۔ اور حکومت کا نظم و نسق متنوع اور پیچیدہ ہو گیا، تو اس وقت اسلامی سلطنت کے سربراہ سے یہ توقع کرنا کہ وہ حضرت عمرؓ کی طرح اپنی ذات میں دین و دنیا کے تمام کام جن کر لے، کہاں تک معقول ہے۔ وہ نماز پڑھائے، مسجد کو ایوان حکومت سمجھے، راتوں کو شہر میں گشت کرے، وہ ہر شخص کو جانتا ہو۔ آج اس قسم کی قیادت کی آرزو رکھنا کہ وہ بیک وقت اسی طرح کی دینی بھی ہو اور سیاسی بھی۔ جماعت اسلامی کے اہل کے لئے تو ممکن ہے۔ کیونکہ وہ اس طرح دینی قیادت کو زندہ بنا کر سیاسی قیادت تک پہنچنے کے خواب دیکھ رہے ہیں، لیکن عملی دنیا میں ایسی باتیں کہنے والا محض ایک نظریہ پرست سمجھا جائے گا۔

مولانا نے امام ابوحنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے کاموں پر بھی لکھا ہے۔ انہوں نے ان دونوں بزرگوں کو تاریخ میں جو ”رول“ دیا ہے وہ معروضی کم اور موضوعی زیادہ ہے یعنی ان کے ذکر میں تاریخی واقعات کو ایک ایسے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس سے جماعت اسلامی کے مسلک کی تائید ہو۔

مثلاً مولانا مودودی کے نزدیک حضرت امام ابوحنیفہؒ ہر اس تحریک کے ہم نوا ہو جاتے

تھے جو قائم شدہ حکومت کے خلاف اٹھتی تھی۔ وہ حکومت غلامی ہو یا عباسی ۔ مولانا کے نزدیک جب زید بن علی نے اصولوں کے خلاف خروج کیا تو ”اسی خروج میں امام ابوحنیفہ کی پوری ہمدردی ان کے ساتھ تھی۔ انہوں نے زید کو مالی مدد بھی دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی۔ انہوں نے ان کے خروج کو جنگ بدر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خروج سے تشبیہ دی“ اس سے کچھ آگے مولانا لکھتے ہیں :-  
 ”انہیں تمام ظاہری آثار کو دیکھتے ہوئے یہ توقع تھی کہ زید کے خروج سے کوئی کامیاب انقلاب رونما ہو سکے گا“ لیکن اس کے باوجود بقول مولانا انہوں نے زید کو مالی مدد دی اور لوگوں کو ان کا ساتھ دینے کی تلقین بھی کی ۔

جب منصور عباسی کے خلاف نفس زکیہ اور ابراہیم اٹھے، تو مولانا کے نزدیک انہوں نے ”بڑے زور شور سے کلمہ کھلا اس تحریک کی حمایت کی۔ یہاں تک کہ ان کے شاگردوں کو خطرہ پیدا ہو گیا کہ ہم سب باندھ لئے جائیں گے۔ وہ لوگوں کو ابراہیم کا ساتھ دینے اور ان سے بیعت کرنے کی تلقین کرتے تھے، وہ ان کے ساتھ خروج کو نفلی ج سے ۵۰ یا ۶۰ گنا زیادہ ثواب کا کام قرار دیتے تھے۔ ایک شخص ابو اسحق الزہری سے انہوں نے یہاں تک کہا کہ تیرا بھائی جو ابراہیم کا ساتھ دے رہا ہے، اس کا یہ فعل تیرے اس فعل سے کہ تو کفار کے خلاف بہاد کرتا ہے، زیادہ افضل ہے“

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں :- ”ان اقوال کے صاف معنی یہ ہیں کہ امام (ابوحنیفہ) کے نزدیک مسلم معاشرے کے اندرونی نظام کو بگڑی ہوئی قیادت کے تسلط سے نکلنے کی کوشش باہر کے کفار سے لڑنے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتی ہے“

ایک اور مقام پر ارشاد ہوا ہے :- ”یہ طرز عمل بھی ٹھیک ٹھیک امام کے اس نظریے کے مطابق تھا کہ ایک کامیاب اور صالح انقلاب کے امکانات ہوں تو ظالم حکومت کے خلاف خروج جائز ہی نہیں، واجب ہے۔“

اب اس کا فیصلہ کرنا کہ ظالم حکومت کون سی ہے اور بگڑی ہوئی قیادت کس کو کہیں، ظاہر ہے خود خروج کرنے والے ہی کا ہوگا۔

مولانا کو حضرت عثمان سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ انہوں نے بڑے بڑے صحابہ کو چھوڑ کر اپنے قرابت مندوں کو مہرے دیے، اس سلسلے میں مولانا نے کئی ایک امویوں کے نام لئے ہیں۔ ان میں سے ایک عبداللہ بن سعد بن ابی سرح ہیں، ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراض تھے، لیکن بعد میں ان کی غلطی معاف کر دی گئی۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں: ”اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن سعد ایک مخلص مسلمان ثابت ہوئے اور ان سے پھر کوئی بات قابل اعتراض ظاہر نہیں ہوئی، اس لئے حضرت عمرؓ نے ان کو پہلے عربوں غاص کے ماتحت ایک فوجی افسر مقرر کیا، اور بعد میں مصر کے ایک علاقے (صفیہ) کا عامل بھی بنایا، مگر جب حضرت عثمانؓ کے زمانے میں وہ مصر سمیت پورے شمالی افریقہ کے حاکم عام اور سپریم کمانڈر بنائے گئے تو یہ بات غلاف فطرت نہیں تھی کہ ان کے ماضی کو دیکھتے ہوئے اتنے بلند منصب پر ان کا تقرر لوگوں کو ناگوار ہو گیا۔“

اب ایک شخص جو مخلص مسلمان ثابت ہو چکا ہے اُس کو حضرت عمرؓ فوجی افسر اور عامل مقرر کرتے ہیں، تو کیا وہ ترقی کر کے مصر کا والی نہیں بن سکتا۔ مولانا نے خواہ مخواہ یہاں ”مصر سمیت شمالی افریقہ“ کا ذکر کر دیا ہے۔ شمالی افریقہ حضرت معاویہؓ کے زمانے میں فتح ہوا، اور وہ بھی اُس کا ایک حصہ۔ بات دراصل یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے آخری چند سالوں میں وہ نسل ختم ہو رہی تھی یا وہ بوڑھی ہو گئی تھی، جس کی کار داری پر خلافت ابو بکرؓ و عمرؓ کا نظم و نسق قائم تھا۔ اب ایک نئی نسل آگے آرہی تھی، حضرت عثمانؓ نے یہ کیا کہ اس نسل میں سے اُن لوگوں کو کلیدی اسامیوں پر متعین کرنے میں تہنیت دی، جو اموی تھے۔ اس سے بیشک شکایتیں پیدا ہوئیں۔ مولانا نے حضرت عثمان کی غلطیوں کو زیادہ اجاگر کرنے کے لئے مروان بن حکم کو اُن کا ”چیف سیکریٹری“ بنا دیا ہے۔ اور اس بات کی پُختہ ضرورت دیدی ہے کہ اس زمانے میں موجودہ زمانے کے تصور کے مطابق نہ کوئی دفتر خلافت تھا، نہ اس کا کوئی عملہ تھا، نہ اس کا کوئی سیکریٹری یا چیف سیکریٹری تھا۔۔۔“ مولانا کا یہ دعویٰ محض اس لئے ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ کو مطعون کر سکیں، ورنہ تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں کے ہاں سکرٹریٹ قسم کی چیز مہذبہ ماضی میں آئی۔ مروان کی حیثیت زیادہ سے زیادہ ایک مشیر کی تھی اور بس۔

زیر نظر کتاب کے ابواب پر جو پہلے ”ترجمان القرآن“ میں چھپے تھے، علماء کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تصور کا صحیح تصور نہیں۔ اور یہ کہ ”کیوں نہ ہم جرأت کے ساتھ اپنی تاریخ کے ان واقعات کا سامنا کریں؟ اور کیوں نہ بے لاگ طریقے سے ان کا جائزے کر ٹھیک ٹھیک یہ متین کریں کہ خلافت اصل میں کیا چیز ہے۔۔۔۔۔ جب تک ہم ان سوالات کا صاف اور مدلل و مرتب جواب نہ دیں گے، ذہنوں کی الجھنیں دور نہ ہوں گی۔“ جہاں تک قدیم اور روایتی مسلک والوں کا تعلق ہے، مولانا کی اس کتاب سے تاریخ اسلام کے اس دور کے بارے میں جس کا اس میں ذکر ہے، اُن کی الجھنیں دور ہونے کے بجائے اور زیادہ ہوئی ہیں۔ باقی رہے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم جو مغربی مصنفین کی کتابوں سے گمراہ ہو رہے ہیں، بڑے ہی سعادت مند ہوں گے اگر وہ مولانا کی اس دلیل سے امیر معاویہؓ کو ”فترۃ باغیہ“ مان لیں کہ حضرت عمار بن یاسرؓ کے حق میں حضورؐ سے ثابت ہے کہ تقتلک الفتنۃ الباغیۃ (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا)۔۔۔“

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودی نے جواب اس حد تک ”جمہوریت پرست“ ہو گئے ہیں کہ وہ جدھر جمہور کا رجحان دیکھتے ہیں وہ اُدھر کو چل دیتے ہیں، یہ کتاب کیوں لکھی جس سے علمائے کرام کی ایک کثیر جماعت ناماخذ ہو گئی ہے اور انہوں نے عوام میں مولانا مودودی کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ کیا اس کتاب سے مقصود اسلامی تاریخ کی الجھنوں کو دور کرنا ہے جو ظاہر ہے اس طرح دور نہیں ہو سکتیں یا اس سے کوئی دوسری غرض ہے۔

راقم السطور کے نزدیک ”خلافت و بلوکیت“ کے مسئلے پر مولانا نے جس طرح بحث کی ہے، اس سے اُن کا اصل مقصد قرآن، حدیث، تاریخ اور حضرت امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف کے حوالوں سے اپنا اور اپنی جماعت اسلامی کا موقف مبنی برحق ثابت کرنا ہے۔ ”قرآن کی سیاسی تعلیمات“ اور ”اسلام کے اصول حکمرانی“ کی بنیاد جن آیات قرآنی کو بنایا گیا ہے وہ محض مولانا کی ذہانت ہے، اور ان آیات سے اس طرح کے اصول ثابت

- اس کے بعد ملوکیت کے مقابلے میں خلافت کی ناکامی کی داستان بیان اور اس کا سارا الزام حضرت عثمانؓ پر ڈالا گیا ہے اس سے کم از کم جماعت جو وہ ناکامی کی تاریخیں لحاظ سے اٹک شوقی ہو جاتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ہاتھ لکھ گئے ہیں کہ ان کے نزدیک ایک مسلمان بادشاہ کے خلاف لڑنا باہر لڑنے کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

لانا نے بڑی تفصیل سے ”ظالم حکومت کے خلاف خروج“ کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ اس نے اس کے مسئلے میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کا امام ظالم آیا اس کے خلاف خروج (Revolutions) کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس کا اہل سنت کے درمیان اختلاف ہے۔ اہل الحدیث کا بڑا گروہ اس بات پر کہ صرف زبان سے اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور اس کے حق کہا جائے، لیکن خروج نہ کیا جائے۔ اگرچہ وہ ناحق خوں ریزی کرے۔ حقوق پر بے جا دست درازیاں کرے اور کھلم کھلا فسق کا مرتکب ہو، لیکن نہ اس کا مسلک یہ تھا کہ ظالم کی امامت نہ صرف یہ کہ باطل ہے، بلکہ اس کے حج بھی کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہیے بشرطیکہ ایک کامیاب اور مفید ہو۔ ظالم و فاسق کی جگہ عادل و صالح کو لایا جاسکتا ہو، اور خروج کا نتیجہ اور قوتوں کا ضیاع نہ ہو۔

لانا کے استنتاج کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اموی خلیفہ کے خلاف زید خروج ایسا ہی تھا، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ بدر میں خروج، عباسی کے خلاف ابراہیم کے ساتھ مل کر لڑنا کفار کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ

ب اگر منصورؒ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر، خلیفہ بنا تھا، تو اس کے پوتے شیعہ پر امت کا کب اجتماع ہوا تھا۔ پھر اگر منصور ظالم تھا اور اس نے یہ اور ابراہیم کے خروج کو سختی سے کچلا، تو کیا ہارون الرشید کا آل علی کے



زیر نظر کتاب کے ابواب پر جو پہلے ”ترجمان القرآن“ میں چھپے تھے، علماء کے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کے دماغ میں اسلامی تصور کا صحیح تصور نہیں۔ اور یہ کہ ”کیوں نہ ہم جرأت کے ساتھ اپنی تاریخ کے ان واقعات کو سامنا کریں؟ اور کیوں نہ بے لاگ طریقے سے ان کا جائزے کر ٹھیک ٹھیک یہ متین کر دیں کہ خلافت اصل میں کیا چیز ہے۔۔۔۔۔ جب تک ہم ان سوالات کا صاف اور مدلل و مرتب جواب نہ دیں گے، ذہنوں کی الجھنیں دور نہ ہوں گی۔“ جہاں تک قدیم اور روایتی مسلک والوں کا تعلق ہے، مولانا کی اس کتاب سے تاریخ اسلام کے اس دور کے بارے میں جس کا اس میں ذکر ہے، اُن کی الجھنیں دور ہونے کے بجائے اور زیادہ ہوئی ہیں۔ باقی رہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طالب علم جو مغربی مصنفین کی کتابوں سے گمراہ ہو رہے ہیں، بڑے ہی سعادت مند ہوں گے اگر وہ مولانا کی اس دلیل سے امیر معاویہؓ کو ”فتۃ باغیہ“ مان لیں کہ حضرت عمار بن یاسرؓ کے حق میں حضورؐ سے ثابت ہے کہ تقتلک الباغیۃ (تم کو ایک باغی گروہ قتل کرے گا)۔۔۔“

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودی نے جواب اس حد تک ”جمہوریت پرست“ ہو گئے ہیں کہ وہ جدھر جمہور کا رجحان دیکھتے ہیں وہ اُدھر کو چل دیتے ہیں، یہ کتاب کیوں لکھی جس سے علماء کرام کی ایک کثیر جماعت ناراض ہو گئی ہے اور انہوں نے حوام میں مولانا مودودی کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا ہے۔ کیا اس کتاب سے مقصود اسلامی تاریخ کی الجھنوں کو دور کرنا ہے جو ظاہر ہے اس طرح دور نہیں ہو سکتیں یا اس سے کوئی دوسری غرض ہے۔

راقم السطور کے نزدیک ”خلافت و بلوکیت“ کے مسئلے پر مولانا نے جس طرح بحث کی ہے، اس سے اُن کا اصل مقصد قرآن، حدیث، تاریخ اور حضرت امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف کے حوالوں سے اپنا اور اپنی جماعت اسلامی کا موقف مبنی برحق ثابت کرنا ہے۔ ”قرآن کی سیاسی تعلیمات“ اور ”اسلام کے اصول حکمرانی“ کی بنیاد جن آیات قرآنی کو بنایا گیا ہے وہ محض مولانا کی ذہانت ہے، اور ان آیات سے اس طرح کے اصول ثابت

نہیں ہوتے۔ اس کے بعد ملوکیت کے مقابلے میں خلافت کی ناکامی کی داستان بیان کی گئی ہے اور اس کا سارا الزام حضرت عثمانؓ پر ڈالا گیا ہے اس سے کم از کم جماعت اسلامی کی موجودہ ناکامی کی تاریخی لحاظ سے انھک شوقی ہو جاتی ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ذکر میں یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ان کے نزدیک ایک مسلمان بادشاہ کے خلاف لڑنا باہر کے کفار سے لڑنے کی برنسبت بدرجہا زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

مولانا نے بڑی تفصیل سے ”ظالم حکومت کے خلاف خروج“ کے مسئلے پر بحث کی ہے، لکھتے ہیں: ”اُس زمانے میں ایک اہم مسئلہ یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کا امام ظالم و فاسق ہو تو آیا اس کے خلاف خروج (Revolom) کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس مسئلے میں خود اہل سنت کے درمیان اختلاف ہے۔ اہل الحدیث کا بڑا گروہ اس بات کا قائل رہا ہے کہ صرف زبان سے اس کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی جائے اور اُس کے سامنے کلمہ حق کہا جائے، لیکن خروج نہ کیا جائے۔ اگرچہ وہ ناحق خون ریزی کرے۔ لوگوں کے حقوق پر بے جا دست درازیاں کرے اور کھلم کھلا فسق کا مرتکب ہو، لیکن امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ تھا کہ ظالم کی امامت نہ صرف یہ کہ باطل ہے، بلکہ اس کے خلاف خروج بھی کیا جاسکتا ہے اور کیا جانا چاہئے بشرطیکہ ایک کامیاب اور مفید انقلاب ممکن ہو۔ ظالم و فاسق کی جگہ عادل و صالح کو لایا جاسکتا ہو، اور خروج کا نتیجہ محض جانوں اور قوتوں کا ضیاع نہ ہو“

مولانا کے استنتاج کے مطابق امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اموی خلیفہ کے خلاف زید بن علی کا خروج ایسا ہی تھا، جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ بدر میں خروج، اور منصور عباسی کے خلاف ابراہیم کے ساتھ مل کر لڑنا کفار کے خلاف جہاد کرنے سے زیادہ افضل تھا۔

اب اگر منصورؒ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر، خلیفہ بنا تھا، تو اس کے پوتے ہارون الرشید پر امت کا کب اجتماع ہوا تھا۔ پھر اگر منصور ظالم تھا اور اُس نے نفس زکیہ اور ابراہیم کے خروج کو سختی سے کھلا، تو کیا ہارون الرشید کا آل علی کے

ساتھ رو تہ کچھ کم سخت تھا۔ اور جہاں تک علم دینی پر عبور رکھنے کا تعلق ہے منصور ہارون الرشید سے کہیں بڑا عالم تھا اور اگر وہ خلیفہ نہ بنتا تو اپنے زمانے کا مجتہد ہوتا۔

اب اگر منصور کے خلاف خروج، کفار سے لڑنے کے مقابلے میں افضل تھا اور امام ابو حنیفہؒ کی ہی رائے تھی، تو بھی ان کے شاگرد رشید امام ابو یوسفؒ ہارون الرشید کا قاضی القضاۃ بنا اس قدر قابل تعریف کیوں ہو سکتا ہے کہ زیر نظر کتاب میں اس پر ایک مستقل باب ہو۔ اس کا مطلب سوائے اس کے اور کیا ہے کہ مولانا ایک ”ظالم“ حکومت سے اپنے لئے تعاون کی راہ کشادہ رکھتا چاہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک مولانا مودودی نے یہ کتاب لکھ کر اسلامی تاریخ کے مابہ النزالہ دور کی گتھیوں کو حل نہیں کیا، البتہ جماعت اسلامی کے پروپیگنڈائی ادب میں ایک کتاب کا اضافہ کر دیا ہے۔

(۱۔ س)

## المُسَوِّیُّ مِنْ أَحَادِيثِ الْمُوطَا

### عربی

حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۴ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جگہ بہ جگہ مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شرح پر مولف امام نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے ولایتی کپڑے کی نفیس جلد۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

قیمت : بیس روپے

# شاہ ولی اللہ الہیڈی

## اغراض و مقاصد

شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب نگاروں سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا ترجمہ کرنا۔  
شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں فروغ دینے کے لئے غرض سے ایسے موضوعات پر جو شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا۔



Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

# شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام حسین جلیانی سندھ یونیورسٹی

پروفیسر جلیانی (۱) نے سندھ شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر پیر حاصل بحثیں کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

## المسکون اجارہ لوطی

تالیف \_\_\_\_\_ الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب آج سے ۲۲ سال پہلے کو مکتومیں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیرِ اہتمام لکھی گئی تھی اس میں جگہ جگہ ناچوڑے لے تشریحی مانتیہ میں غرض میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور لوطی کی فارسی شرح مصنفی پر آپ نے جو مسودہ مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ شاہ صاحب نے المستوی میں لوطی امام کاتب کشتہ سے سے ترتیب دیا ہے امام کاتب کا کلام و اقوال میں دو باتیں جہتیں سے صرف و تحہ حضرت کر دینے گئے ہیں لوطی کے بابت متعلق قرآنی مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات میں شامل کر دیے۔  
دو لائن کتب کی ضخیم جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰۰ روپے

## ہمعات

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے بغیر انسانی تربیت و تزکیہ سے جن ملبس و منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور پرنٹر پبلشر نر سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شایع کیا۔

بیادگار الحاج سید عبدالحکیم شاہ سجاوولی

شاہ ولی اللہ اکبرؒ کی طریقی کا علمی مجملہ

ماہنامہ

الترغیہ

شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکبرؒ کی طریقی صدر حیدر آباد

مجلس ادارت

ڈاکٹر عبد الواحد علی پوتا،

مخدوم امیر شہزاد احمد

مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

# الرکیم

جلد ۴	ماہ فروری ۱۹۶۷ء مطابق شوال ۱۳۸۶ھ	نمبر ۹
-------	----------------------------------	--------

## فہرست مضامین

۵۷۰	مدیر	شذلات
۵۷۳	ڈاکٹر البیوتا	شاہ ولی اللہ کا فلسفہ
۵۸۳	حافظ عباد اللہ فاروقی	علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی
۵۹۲	ابوالسنذیر	اسلامی دور کے قدیم کتب خانے
۵۹۷	مولانا نسیم احمد فریدی امر دہوی	حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلوی
۶۰۵	عبد اللطیف ارشد	ابراہیم نظام
	سناوت مرزا	سندھی علماء کی قلمی کتابیں
	حکیم محمود احمد برکاتی	شاہ ولی اللہ کے حالات
	سعید احمد	کسانی
	مولانا دین محمد ادیب فیروز شاہی	نظمات۔ ادبہ تاریخ
	(نتیجہ فکر)	



## شذرات

اس دفعہ عید انظر کے چاند کے بارے میں ہمارے حواں جو غفلتاً رہا ہوا ہے کون پاکستان ہو گا جسے اس کا دلی دکھ نہ ہوا ہو اور اس دفعہ یہ دکھاؤ بھی زیادہ ہو اکیس تک یہ پہلی بار نہیں کہ اس طرح عید انظر کے چاند پر ہمارے ہاں اختلاف رہا ہو۔ پچھلے سال بھی اس موقع پر ایسا ہی ہوا تھا۔ ریڈیو پاکستان سے چاند دیکھے جانے کا اعلان ہوا جس کے مطابق سرکاری طور پر عید انظر منائی گئی۔ لیکن علماء کرام کی ایک جماعت نے اس سے اختلاف کیا اور جو ذریعہ بھی ان کے پاس تھا اس سے کام لیکر لوگوں کو انہیں نے اس پتلاؤہ کیا کہ وہ اس دن روزہ نہ کریں اور عید نہ کریں، اس سال بھی یہی ہو رہا۔ اس سے قدامت پرستوں نے ملک میں ہڑتالیں کیں اور یہاں تک کہ یہ قوم کیلئے بومرنگ کا باعث بنی۔ اسی کیلئے بھی جنہوں نے ایک دن پہلے عید کی اور ان کے لئے بھی جنہوں نے ایک دن بعد عید کی۔

یہ دیکھ کر اور بھی مرعج ہوتا ہے کہ مسلمان ملکوں میں پاکستان واحد ملک ہے جہاں گذشتہ دو سال سے عید انظر کے موقع پر ایسا ہو رہا ہے کہ ریڈیو کی طرف سے عید کا چاند دیکھے جانے کا اعلان ہونے کے بعد علماء کرام کے بعض طبقے اس امر کی کوشش کرتے ہیں کہ لوگ اس فیصلے کو نہ مانیں اور اس دن روزہ لیں۔ اپنی یہ بات منوانے کیلئے حضرات علماء کوئی کسر اٹھاتے دیکھتے۔ اور اپنا سارا اثر و سحر اس پر لگاتے ہیں۔

تمام مسلمان ملکوں میں عید انظر اور عید الاضحیٰ کی حیثیت قومی و ملی تقویٰ کی ہے لہذا اس میں چونکہ حکومتوں کے سربراہوں اور ان کے نمائندوں کو شرکت کرنی پڑتی ہے اس لئے ظاہر ہے اس امر کا فیصلہ کرنا ان حکومتوں کی ذمہ داری سمجھا جاتا ہے کہ عید کس دن ہوگی چنانچہ ہر مسلمان ملک میں اس کے ریڈیو سے عید کا اعلان ہو جاتا ہے اور سب لوگ اس کے مطابق عید کرتے ہیں وہاں کوئی یہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ اس طرح ریڈیو پر عید کے اعلان ہو جانے کے بعد عوام کو اس فیصلے کے خلاف جھگڑا کرنا ہے اس میں ہر ایک ملک گیر ہم چلا کر چاند دیکھے جانے کے مسئلے کو سیاسی رنگ دے دیا جائے۔

اس بات سے قطع نظر کہ عید کا چاند ہر جگہ کو دکھایا گیا یا نہ دکھایا۔ ہم اس مسئلے میں اپنے بزرگ علماء کی خدمت میں کچھ موضوعات کریں گے ہمیں امید ہے کہ ہماری یہ موضوعات کسی غلط فہمی کا باعث نہیں بنیں گی اور جس طرح اس اور حسن نیت کے ماتحت ہم یہ کلمہ کہہ رہے ہیں اس کے مطابق نہیں پڑھا جائے گا۔

مب یہ ہوا کہ ۱۱ جنوری کو ریڈیو پاکستان سے حیدر کا چاند دیکھے جانے کا اعلان ہوا اور حکومت کی طرف سے یہ بتایا گیا کہ ۱۲ جنوری کو عید ہوگی۔ اس کے جواب میں علماء کی بعض جماعتوں نے یہ طے کیا کہ وہ اس فیصلے کو نہیں مانیں گے، اور یہ کہ ۱۲ جنوری کو روزہ ہوگا۔ اس پکے ان کی ہر جماعت نے ملک کے طول و عرض میں اپنے ایک ایک اور ہمسایہ کو فون کیے۔ اور اس طرح حکومت کے فیصلے کے خلاف عوام کو متظم اور متحد کرنے کی ہر ممکن تدبیر کی۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہر شخص جانتا ہے۔ بعض لوگوں نے حکومت کے اعلان کے مطابق ۱۲ جنوری کو عید کی اور بعض لوگوں نے علماء کی ان جماعتوں کے فیصلے کو مانا اور ۱۳ جنوری کو روزہ لکھا اور ۱۳ جنوری کو عید کی۔

حکومت کا فیصلہ صحیح تھا یا ان علماء کا؟ ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے۔ لیکن عام طور سے یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ دیکھا فتح تو آخر ہماری ہوئی۔ عوام نے ہماری بات سنی نہ کہ حکومت کی حکومت سے اس طرح طاقت آزمائی کا کوئی موقع بھی ہمارے یہ علماء کرام ہاتھ سے نہیں جانے دیتے بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں وہ اس کی تلاش رہتے ہیں کہ کوئی ایسا موقع ملے جس میں وہ حکومت کو تباہ کیوں کر ہمارے ساتھ ہیں حکومت کے ساتھ نہیں یعنی ہمارے یہ محرم علماء حکومت کے کشیدہ اور ناحق ہونے کے بجائے کہ وہ اس کی غلطیوں کی دل سہزی اور خلوص سے اصلاح کریں وہ حکومت کے تہ مقابل ایک سیاسی طاقت بن کر آتے ہیں۔ اور اس پر یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عوام ہماری بات سنتے ہیں تمہاری نہیں۔ حکومت کے اندر ایک اور حکومت، آج یہ ہے موقف ہمارے علمائے کرام کا۔

ہم اس صورت حال کے ہمارے میں اپنے ان بزرگوں سے عرض کریں گے کہ ان کا یہ موقف طرح طرح کے خطرات اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور وہ گویا اس پر ہمارے اس با اثر طبقے کو اور طاقت دے رہے ہیں جو اس راہ پر چلنا چاہتا ہے جسے سب سے پہلے ترکی نے اختیار کیا اور اب بہت سے اور اسلامی ملک اسے اختیار کر رہے ہیں۔ کیا ہمارے یہ بزرگ اور دیگر دینی دنیا پر نظر نہیں ڈالتے اور نہیں دیکھتے کہ کیا کسی ملک میں ایسے موقعوں پر کسی جماعت کو خواہ وہ علماء ہی کی کیوں نہ ہو اس طرح قوم میں افزائش پیدا کی اجازت ہوتی ہے اگر ایسا نہیں تو یہاں پاکستان میں آخر اسے کب تک سدہ اشت کیا جاسکتا ہے اس کا رد عمل ہوگا اور بڑا شدید ہوگا۔

اسلام تو خود اجتماعیت کا دین ہے اس میں اجماع ایک دینی حق ہے اور اجماع کے فیصلوں

کو اتنا دینی لوازمات میں سے ہے اب اس نطفے میں سیاسی، معاشی، دفاعی اور کئی دوسرے اعتبار سے عملو ہر مسئلہ ملک کی حکومت ہی اجتماعیت کی حامل ہے اور اگر کسی سبب سے وہ بنی کی و نبر ایک وقت بھی اس کی حامل نہیں تو جیسے جیسے وہاں معیشت ترقی کرے گی اس کا قطع مضبوط ہوگا۔ اور وہ سیاسی لحاظ سے طاقت ور ہوگی تو حکومت کو اس اجتماعیت کا حامل اور ترجیح بننا ہوگا۔ اور اس کے بغیر اس کیلئے کوئی چارہ نہیں ہے یہ اس دور کا تقاضا ہے اور کوئی حکومت اس کو نظر انداز کر کے پاسدار نہیں ہو سکتی۔

پاکستان کی حکومت بڑی سرعت سے اس منزل کی طرف جا رہا ہے وہ مجبور ہے کہ مملکت پاکستانی کو مضبوط بنائے۔ اس کی معیشت کو زیادہ سے زیادہ صنعتی ترقی دے اور اسے ذہنی، جذباتی اور عملی سالمیت عطا کرے۔ گویا حکومت اجتماعیت قومی کی واحد نمائندہ ہو اور اس کے فیصلے پوری قوم کے فیصلے سمجھے جائیں اب اگر بعض علماء مسلمہ ہی شعار بنالیا ہے کہ وہ اس اجتماعیت کو دیہی کے نام سے بروئے کار نہیں ہونے دیں گے اور اپنے اور گرد و حوا میں جمع کو کے ہر مسئلے میں حکومت سے فکریں گے تو اس کا انجام جو ہوگا اس کی مثالیں دوسرے مسلمان ملکوں میں آج بکثرت ملتی ہیں۔

اس سے ہماری ہرگز یہ مراد نہیں کہ علماء کرام حکومت کے سرواہل کو نصیحت نہ کریں اور انہیں ان کی غلطیاں نہ سمجھائیں۔ ایسا کرنا تو ان کا بنیادی منصب ہے لیکن افسوس ایسا نہیں ہو رہا۔ ہمارے اکثر علماء کرام دین کے بجائے سیاست کے ذرائع سے حکومت کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ عوام کو مشتعل کر کے حکومت سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوں گے وہی ان بزرگوں کی بھلی ہے اور اگر انہوں نے الَّذِينَ آمَنُوا کی جگہ اخوان المسلمین کی طرح الَّذِينَ آمَنُوا سمجھا، اور اس پر عمل کیا۔ تو مسجد برداشت کا پلاد بھی نہ کہیں تو بھر کر رہے گا۔

”الرسم“ پہلے دن سے یہ معروضات کر رہا ہے کہ حکومت اور علماء کرام میں زیادہ سے زیادہ تعاون ہونا چاہیئے اور اگر حکومت کے کسی شعبے سے کوئی غلطی ہو، تو اس کا ضرور دلاؤ اکیلا جانے لیکن اس کی راہ سیاسی ایجنڈیشن نہیں، بلکہ اہل حکومت کو نصیحت کرنا ہے اور یہ نصیحت مختلف طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ اس کے لئے ضروری نہیں کہ صرف سیاسی پلیٹ فارم ہی سے کام لیا جائے۔

# شاہ ولی اللہ کا فلسفہ

حصہ اول

مصنف ڈاکٹر عبد الواحد البیہوتہ

مترجم سید محمد حمید

## باب ہفتم گھریلو زندگی کے کردار کے اصول

معیار

گھریلو زندگی کی اخلاقیات کے سلسلہ میں شاہ ولی اللہ نے یہ معیار پیش کیا ہے کہ موزوں گھریلو کردار، ایک ترقی یافتہ معاشرہ میں ایک خاندان کے افراد کے درمیان، لازمی طور پر، ایک رشتہ اور اتحاد کو پیدا کرتا ہے اس کی حفاظت کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے۔ اس کا حصول دوستی اور خیر سگالی کے احساسات پیدا کرنے سے ہوتا ہے جو باہمی مقاصد کی تکمیل کے لئے، ایک دوسرے کی خدمت کرنے اور باہمی تعاون کے نتیجہ میں ضروریات کی تسکین سے پیدا ہوتے ہیں۔ انسانی نسل کی افزائش اور تحفظ معاشرہ کے علاوہ گھریلو کردار کے دوسرے مقاصد ہوتے ہیں مثلاً بعض نفسیاتی اور معاشرتی ضروریات کی تسکین، جو ہر فرد کے لئے عام رہتی ہیں یا ایسی ہی دوسری ضروریات کی تسکین، جو مختلف خاندانوں میں مخصوص ہوتی ہیں۔

اخلاقی گھریلو کردار

پس، موزوں گھریلو کردار یہ ہے کہ اس میں نسل انسانی کی افزائش، مختلف صلاحیتوں کا تحفظ، جنسی خصوصیات، خاندان کے ہر فرد کی صلاحیتوں کی ترقی و فروغ اور

دوستی اور غیر سگالی کے پائیدار وابدی تعلقات شامل ہوتے ہیں جو بڑے پیمانہ پر ایک بہترین و منظم معاشرہ کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس بیان کے دوسرے حصے کی حمایت میں کتاب 'البدود' میں سے یہ بیان پیش کیا جاسکتا ہے: "زندگی کے گھڑلو کردار اصول (حکمت)، رائے کلی اور عام واقفیت و مشاہدہ کے مطابق سات اخلاقی فاضلہ کی خصوصیات کی روشنی میں، تم اپنے خاندان کے افراد اور احباب کے معاملات میں، اور کو کس طرح کتنی اہمیت دیتے ہو کہ ان کے ساتھ تمہارے کردار اور اشتراکِ عمل سے شائستگی کی اعلیٰ ترین شکل اور اتحاد و برشتہ کی نہایت باعزت شکل برقرار رہے۔"

تہذیب و ارتفاع

ان خصوصیات میں یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ گھڑلو کردار کا ایک دوسرا نشان، یا اردو حاجی رشتہ کا کردار، حیوانات کی جنسی اور تولیدی خواہشات کے مقابلہ میں ارفع و اعلیٰ ہوتا ہے اور یہ اعلیٰ تر اور بلند نفسیاتی مقاصد کے حصول اور فروغ کے کام آتا ہے۔ گھڑلو کردار کے نمونے یا رسوم اس طرح بنائی جاتی ہیں کہ ان جنسی تحریکوں اور ان کے براہِ راست مقاصدوں کی ضروری تسکین کرتے ہوئے، معاشرتی اور انسانی مقاصد کو ان سے بلند تر اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں، یہاں تک کہ ان بہت مقاصد کو کبھی بھی بلند سطح پر نہیں آنے دیا جاتا کہ وہ متذکرہ بالا، اعلیٰ تر و ارفع مقاصد کے مقابلہ میں زیادہ اظہارِ پاسکیں اور زیادہ نمایاں حیثیت حاصل کر لیں۔

معاشرتی مقاصد ایسے بھی ہیں جو کہ گھڑلو کردار کے بعض بنیادی اور عنصری نمونوں کے ذریعہ شناخت کئے جاتے ہیں، دوسرے خاندانوں سے دوستانہ اور ہم سائیگی کے تعلقات برقرار رکھتے ہیں۔ اور یہ معاشرتی مقاصد، ان کے درمیان ایک دوسرے سے معاہدوں کے مواقع پیدا کرتے ہیں، نیز بچے پیدا کرتے ہیں اور ان کی مناسب پرورش ہوتی ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ کی قوت اور اُس کی اہمیت کے عناصر میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ معاشرتی مقاصد انسانیت و دوستی کے مقاصد میں توسیع پاتے ہیں مثلاً انسانی نسلوں کی وسیع پیمانہ پر بقا، ارتباط اور بہبودی ان ہی مقاصد کو اس نقطہ نگاہ سے تسلیم کرنا کہ ان سے اعلیٰ تر اہمیاتی

مد کی تکمیل ہونے لگے۔ بظاہر یہ انسانیت پسندی کے مقاصد سے بھی آگے نکل جاتے اور ذہن انسانی کے رجحان کو کلیت و افاقیت UNIVERSALITY کی اعلیٰ ترین عطا کرتے ہیں۔

گھریلو کردار کے متعلق، شاہ ولی اللہ کی بحث کو سہولت کی خاطر چار اہم حصوں (ن) زن و شو کے تعلقات (ب) بچوں سے تعلقات (ج) نوکرانوں سے تعلقات اور معاشرتی اداروں سے تعلقات، میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ زن و شو کے تعلقات

شاہ ولی اللہ نے ان رسوم و روایات کے لئے کافی لکھا ہے جو میاں بیوی کے بیان شادی کے وقت اور شادی کے بعد، پائیدار اور ہمیشہ کے تعلقات پیدا کرنے، تعلق رکھتی ہیں۔ اور یہ رسوم، شادی کا مقصد، خاندان کی تعمیر اور دوسرے خاندانوں یا شہ کے دوسرے افراد سے ان کے مستقبل کے معاشرتی تعلقات بھی استوار کرنے سے قی رکھتی ہیں۔

ایسی رسوم جو مذکورہ بالا اشیاء و اعمال سے تعلق رکھتی ہیں وہ ایسی رسوم ہیں جو (ن) شریک زندگی کے انتخاب (ب) بعض مخصوص رشتہ داروں (خواتین) سے نکاح مانعت اور (ج) ملگنی یا سگائی (خا) کی رسوم، جہر، نکاح اور شادی کی تقریب "ولیمہ" سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان ہی گھریلو مقاصد کے لئے، یہ شادی کے بعد، گھریلو اداروں کے کردار پنے زیر اثر رکھتی ہیں جو زن و شو کے ایک دوسرے کے لئے غلوں، وقادری اور خیر گالی برائے ان کے خاندان کی بہبودی اور دوسرے امور میں باہمی معاونت و تعاون کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور ان تعلقات میں زن و شو کے فرائض کے درمیان فطری امتیاز بھی یا جلتا ہے۔

عورتوں پر، مردوں کی موجودہ اعلیٰ تر حیثیت، ان حقائق پر قائم ہے جو ان کی عظیم تر ہی قوت، عورتوں کی تابعداری اور عاشقی کمالیت میں مرد کی دست گیری (جیسا کہ یہ رسم بچکی ہے کہ عورتیں اپنا تمام وقت گھریلو فرائض کی انجام دہی میں صرف کرتی ہیں)، مگرے

باہر گھومنے پھرنے کی بدولت، مردوں کے وسیع تر دائرہ سے حاصل شدہ وسیع تر مشاہدہ، ان کے خارجی معاملات اور بیرونی محلوں سے دفاع کے معاشرہ کے لئے ان کی عظیم تر صلاحیت اور موزونیت وغیرہ۔

### بچوں سے تعلقات

اسی طرح، بچوں کی نگہداشت کے لئے، شاہ ولی اللہ نے والدین کے درمیان تعاون پر زور دیا ہے اور انہوں نے معاشرتی اسباب کی بنا پر، ولادت کی تقریب، عقیدے کی رسم کی صلیت کی ہے نیز ایسے بچوں کے لئے والدین کی نگرانی و ذمہ داری کو مستحکم کرنے کا نفسیاتی سبب قرار دیا ہے۔ والدین کی توجہ و ذمہ داری، بچے کی طبعی بہبودی تک محدود نہیں ہوتی بلکہ یہ اُس کی ذہنی ترقی اور تعلیم کے لئے گنجائش پیدا کرتی ہے تاکہ اس سے بچہ ترقی یافتہ معاشرہ میں اپنا صحیح مقام حاصل کر سکے۔

اسی طرح سب بچوں اور اُن کے والدین کے درمیان تعلقات اپنی فطری بنیادیں تلاش کر لیتے ہیں جس کے نتیجے میں والدین اپنے بچوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں اور بچے اپنے والدین کی عزت، احسان مندی اور فرماں برداری کرتے ہیں۔

### نکاح کا خاتمہ

جب گھریلو زندگی کے مقاصد ناکام ہو جاتے ہیں۔ اور شادی اس طرح ناکام ہو جائے کہ زن و شو کے درمیان حسب معمول ازدواجی تعلقات اور دوستی کو بحال کرنے کی کوئی امید باقی نہ رہے تب نکاح کا خاتمہ (طلاق) یا طلع، درست ہوتا ہے تاکہ زن و شو کو مزید ناخوش گواری اور معاشرہ کو ناگواری و عدم مطابقت، تنزلی انتشار سے بچایا جاسکے۔

گھریلو زندگی کو مسلسل اور شدید اختلافات سے بچانے کے لئے طلاق کے سلسلے میں شرائط اور حدیں مقرر کر دی گئی ہیں اور زن و شو کی علمی دینی کی رسمی شکلیں مثلاً ظہار اور ایلاہ وغیرہ رکھی گئی ہیں۔ جو یہ یقین دلاتی ہیں کہ زن و شو کے درمیان کوئی معقول اور حقیقی سبب کے بغیر طلاق یا طلع واقع نہیں ہو سکتا۔

شوہر کی موت یا طلاق کے بعد، انتظار کی مقرر مدت رعیت بھی بعض نفسیاتی اور

معاشرتی اسباب پر مقرر کی گئی ہے۔

### لوگوں سے تعلق

بعض لوگوں کے دوسروں کے خادم یا نوکر ہو جانے کی خاص وجہ، شاہ ولی اللہ کے نزدیک انسانی طبائع کے تنوع میں ملتی ہے جن میں بعض ایسی ہوتی ہیں جو اپنی کامل شخصیت اور خود اعتمادی کی صفات کی حامل ہوتی ہیں اور ”جو لوگ فطرتاً آقا واقع ہوئے ہیں حالانکہ بعض دوسری طبائع، ایسی خصوصیات میں فقدان کی بدولت، ان افراد کی صفات بھی رکھتی ہیں جو فطرتاً ماتحت واقع ہوئے ہیں“ ان بالکادہ ذہن رکھنے والے افراد کی حاکمہ صفات کی بدولت دوسرے، ان کے غلام و تابع رہتے ہیں معاشی ضروریات، ایسے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر دیتی ہیں اور زیادہ تر حالات میں وہ آجرا اور اجیر کے تعلقات قائم کر لیتے ہیں اور اس باہمی ضروریات کی تسکین و تکمیل کرتے ہوئے وہ گھریلو امور اور معاشرہ کی بہبودی کے لئے کام کرتے ہیں۔

اس مقصد کے حصول کے لئے آقا و خادم کے درمیان پائدار تعلقات لازمی ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے درمیان جذبہ خیر سگالی کے بغیر ممکن نہیں ہوتے البتہ آقا اپنے خادموں کے لئے خلوص بخشش و مہربانی کے جذبات رکھتا ہے اور خادم، اپنے آقا کی فرماں برداری، حکم برداری، ایمانداری اور خیر سگالی کے جذبات رکھتے ہیں۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے شاہ ولی اللہ نے ہدایت کی ہے کہ آقا کو چاہیے کہ اپنے خادموں کی خوراک و لباس میں محتہ لے اور ان کے ساتھ جہاں تک ہو سکے مسادات کی سطح پر تعلق رکھے۔

جہری محنت کسی شخص سے اس کی مرضی کے خلاف زبردستی کام لینا، یا ان افراد کی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو کچلنا جو اپنی مرضی سے ایک آزاد زندگی بسر کرنے کے خواہشمند ہوں، شاہ ولی اللہ کے نزدیک ان باتوں سے نہ صرف گھریلو بہبودی کا مقصد تاراج ہوتا ہے بلکہ بحیثیت مجموعی یہ معاشرہ کی بہبودی کے خطرناک حد تک مضر ثابت ہوتا ہے۔

### معاشرتی تعلقات

اتحاد و یکگانیت پیدا کرنے کے لئے، مختلف خاندانوں کے افراد کے درمیان



معاشرتی رابطے لازمی ہوتے ہیں۔ ایسے رابطوں کی بنیادیں جو بیت سے خاندانوں کے ارکان کو ایک معاشرہ کی وسیع تر برادری میں متحد کر دیتے ہیں، شاہ ولی اللہ جیسے نزدیک ان کی نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی ضروریات میں ہوتی ہیں جو ان میں باہمی دوستی اور خیر محلی پیدا کرتے ہیں۔

ایسے معاشرتی رابطے ان کی زندگی اجتماعی جیلٹوں، مذنیات الطبع، کی تسکین کرتے ہیں اور اسی دوران وہ خطرہ اور آفت کے نازک لمحات میں اپنی وقتی ضروریات کی تسکین کے ذرائع بھی متعین کرتی ہیں۔ نیزہ باہمی معاونت اور تعاون سے اپنی بعض معاشی ضروریات کی تسکین و تکمیل کر لیتے ہیں۔ یہ بات ان کے رشتہ داروں سے محدود تر معاشرتی رابطوں اور رشتوں میں خاص طور پر عمل میں آتی ہے اور اسی میں وراثت اور وصیت کے قوانین و رسوم کی بنیادیں ملتی ہیں۔

پس موزوں معاشرتی کردار وہ ہے جو باہمی دوستی کی حفاظت کرتا ہے اور اسے فروغ دیتا ہے اور اسے اچھے معاشرتی تعلقات استوار کرنے کے کام میں لاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک موزوں معاشرتی کردار سے، ایک دوسرے کے یہاں ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، تحفے کا تبادلہ ہوتا ہے، دوسرے کی صورت میں خط و کتابت ہوتی ہے، باہمی امداد و معاونت (مالی یا کسی اور قسم کی)، باہمی خیر سگالی اور ہمدردی کا مظاہرہ ہوتا ہے، ایک دوسرے کے عیبوں کو نظر انداز اور لغزشوں پر مددگار کی جاتی ہے۔ معمولی نوعیت کے معاملات جو لازمی طور پر ناگواریت اور تنازعہ کی شکل اختیار کر سکتے ہیں پر گہری توجہ دی جاتی ہے اور معاشرہ کو ایک عضویاتی شکل میں منظم ہونے کے مقصد کو ناکام بنایا جاتا ہے۔

## باب ہشتم معاشی اور سیاسی کردار کے اصول

### ۱۔ معاشی کردار

ایک اعلیٰ معیار زندگی اور زندگی بسر کرنے کی سہولتوں کا مجموعہ، ایک ترقی پذیر معاشرہ

کی ضرورت ہوتے ہیں ان میں سے اتنے ہی اہم ہوتے ہیں جتنے کہ متذکرہ بالا نفسیاتی معاشرتی اور دوسرے مقاصد اہم ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں عوزوں یا اخلاقی کردار کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ معیار زندگی فراہم کرے جو معاشرہ اور فرد کی ضروریات کی مختلف اقسام کی تسکین سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اسی نقطہ نگاہ سے معاشرہ کی معاشی زندگی کا موزوں یا اخلاقی کردار، اخلاقیات کا ایک جزو ہوتا ہے۔ یہاں ایک ایسے معاشی کردار کی بنیاد کے مختصر خطوط بیان کئے جاتے ہیں جو اعلیٰ معیار زندگی اور معاشرہ کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں مزید تفصیل کے لئے، معاشی ضروریات کی نوعیت و اہمیت کے ساتھ مباحث کے حوالے دیکھے جاسکتے ہیں جو سوم، چہارم، پنجم اور ششم باب میں دیئے گئے ہیں۔

### اعلیٰ معیار زندگی

ایک اعلیٰ معیار زندگی حاصل کرنا، ایک اخلاقی کردار کے لئے بہت ضروری ہے، ترقی یافتہ سطحوں کے معاشروں میں، لوگوں کو نہ صرف تمام اشیائے صرف COMMODITIES پیدا کرنی پڑتی ہیں بلکہ انہیں، سامان تجارت کی پیدائش میں مقدار و نوعیت کے لحاظ سے جالیاتی مذاق، آرام و تسکین کے ذرائع کے مطابق، اپنی کارکردگی میں اضافہ کرنا پڑتا ہے۔

### صنعت و حرفت

متذکرہ بالا مقصد، مختلف قسم کی صنعتوں کو قائم کرنے سے حاصل ہوتا ہے اور ان میں وہ صنعتیں نمایاں ہو جاتی ہیں جو ضروریات زندگی فراہم کرتی ہیں جیسے زراعت، کھنکھ تعمیرات مکان، پارے بانی، کوزہ گری، لوہاری، ماہی گیری اور زمین و سمندر کے دوسرے وسائل کو کارآمد بنانا۔

خاص صنعتوں کے علاوہ ترقی یافتہ معاشروں میں لوگ ان صنعتوں میں کام کرتے ہیں جو سامانِ تعمیرات اور حکمرانہ اشیاء کی پیداوار کرتی ہیں۔ فوج اور حکومت کی دہری کاریزمتیں وغیرہ معنی کمانے کے دوسرے وسائل و ذرائع بھی فراہم کرتی ہیں۔

### پیشے اور تجارت

مختلف صنعتوں میں تقسیم محنت، مختلف اقسام کے پیشوں اور تجارت کو فروغ

دیتی ہے جس میں اشیاء کا مبادلہ وغیرہ شامل ہوتا ہے اور اس کے لئے زرہ کے ایک میسری نظام کی موجودگی اہم ہے۔

ایک شخص کے لئے موزوں کام یہ ہے جو اس کی طبعی و ذہنی صلاحیتوں اور مذاق کے مطابق ہو اور وہ اسی دوران، اس سے کافی روزی بھی فراہم کرے۔

### معاشی بہبودی

معاشرہ کی معاشی بہبودی کے لئے یہ لازمی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے کوئی بیکار نہ رہے اور وہ معاشرہ کی فلاح و بہبود کے لئے کوئی کام نہ کرے، سرکاری خزانہ لوگوں کی املاک و جائداد پر ایسے لوگوں کا بار نہ صرف ملک کی مالیات کے لئے معصرت رہاں ہے بلکہ معاشرہ کی بہبودی بھی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور یہ نہ صرف غیر معاشی بلکہ غیر اخلاقی کردار بھی ہوتا ہے۔

اسی کے نتیجہ میں املاک و جائداد کے سلسلہ میں جرائم واقع ہوتے ہیں مثلاً دھوکہ دہی، چوری، ڈکیتی وغیرہ جوئے اور سود خوری (USURY) کی اخلاق سوز ملامت و رسوم وجود میں آتی ہیں۔

اُن نظاموں کے اصول، جو تبادلہ اشیاء اور دوسرے معاشی تعلقات کے معاملات میں زیر عمل آتے ہیں، معاشرہ میں اعلیٰ معیار زندگی اور تصویب بہبودی پر قائم ہوتے ہیں نیز اپنے ارکان کے درمیان دوستی و غیر سنگالی کے تعلقات کا تحفظ کرتے ہیں اور بخلی، خود غرضی، فریب و بکاری، جان بوجھ کر لیت و صل کرنے کی برائیوں کے خلاف، اخلاقی فاضلہ کے رجحانات کا تحفظ کرتے ہیں۔

### ۲۔ سیاسی کردار

معاشرہ میں ایک سیاسی ملکیت کے موزوں کردار کا مقصد، معاشرہ میں تحفظ اتحاد ہوتا ہے اور اندرونی و بیرونی خطروں کے برخلاف معاشی اور عام فلاح و بہبودی کا فروغ ہے۔

معاشرہ کے لئے خطرے۔ معاشرہ کے اتحاد اور اس کی بہبودی کے لئے خطروں کو

شاہ ولی اللہؒ نے حسب ذیل انداز میں پیش کیا ہے۔

(۱) جان و مال کے سلسلہ میں ہولناک اور مجرمانہ سرگرمیاں۔ (۲) ایسے مہجانات جو عالمی مستحکم طبائع کی فطری صلاحیتوں کو خراب کرتے ہیں اور عام طبائع میں گمراہی و بگاڑ کا سبب بنتے ہیں (مثلاً بد اخلاق کی رسوم و رواجیات، جنسی اور دوسری برائیاں)۔ (۳) ایسی سرگرمیاں جو ایک گمراہ نظام کے ارکان میں نا اتفاقی پیدا کرتی ہیں (مثلاً حرام کاری، دوستی ختم کرنے کی کوشش وغیرہ)۔ (۴) منحصر معاشی نظام، جو دھوکہ دہی پر قائم ہوتے ہیں، سود کی اعلیٰ شرح، اجارہ داری، ذخیرہ اندوزی وغیرہ۔ (۵) کام سے بنے اقتصادی برتنا اور دوزی کے لئے عام روحانات، جو غیر ترقی یافتہ اور وحشیانہ زندگی کے علم بردار ہوتے ہیں۔ (۶) آبادی کا ترک وطن اور ہجرت اس حد تک کرنا کہ اس سے معاشرہ اور مملکت کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ (۷) نقلِ محنت اور محنت کی نا ہموار تقسیم، جو خاص صنعتوں کو نظر انداز کرنے سے وجود میں آتی ہے اور سامانِ معیش اور غیر پیداواری محنت میں کثرت سے مصروف ہو جانا۔ (۸) لوگوں کی زندگی اور مملکت کے لئے طبعی خطرے یا متعدی امراض کا پھیلنا، (مثلاً بیماریوں اور سیلاب وغیرہ)۔ (۹) محنت کش عوام پر بھاری ٹیکس لگانا جس سے وہ برباد ہو جائیں اور وہ یا تو بناوٹ کرنے پر مجبور ہو جائیں یا معاشی اور روحانی دو طرفہ اعتبار سے برباد ہو جائیں۔

### مملکت کے فرائض

ایک مملکت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ ان تمام معاملات پر خاص نگرانی رکھے، جن کی بد انتظامی سے معاشرہ کی بہبودی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

مملکت کے دوسرے فرائض یہ ہیں۔

- ۱۔ تعمیراتِ عامہ کی شکل میں قومی بہبود کے کام کرنا۔ کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کرنا تاکہ کوئی قطعہ اراضی بلا کاشت نہ رہ جائے۔ صنعتی کارکنوں کی سرپرستی کرنا تاکہ ان کا پیدا کردہ مال تجارت اپنی نوعیت و مقدار میں زیادہ سے زیادہ ہو۔ یہ مملکت کا ایک عظیم فریضہ ہونا چاہیے کہ وہ غریب اور ضرورت مند افراد میں دقتا پر، کی بہبود کے کام انجام دے۔

ملکت کو آرٹ، انجینئرنگ، مطالعہ تاریخ، طبی علوم اور سائنسنگ صیافتور کے لئے لازمی علم کی مختلف اقسام کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔

یہ بھی لازمی ہے کہ ملک کے شعبے، ایماندار اور باصلاحیت افراد کی نگرانی میں کام کریں، جو مستحکم طبائخ کے ملک ہوں، سات اخلاق فاضلہ کی صفات نمایاں طور پر رکھتے ہوں اور وہ محنت مند مذاق اور عام رجحانات کے حامل بھی ہوں۔

یہاں پر سیاسی کردار کے بنیادی مقاصد کے محض چند خطوط بیان کئے گئے ہیں جو اعلیٰ سطح کے معاشروں میں اخلاقی اور موزوں کردار کے لئے انتہائی اہم ہیں، انسانی معاشرہ کے سیاسی پہلوؤں کی نوعیت اور اہمیت کے سلسلہ کی مزید تفصیلات کے لئے باب سوم بعنوان "عمرانی پس منظر" ملاحظہ فرمائیے جس میں معاشرتی ارتقاء کے تیسرے مرحلے میں معاشرہ کے فروغ کے درمیان، اُس کے سیاسی اداروں کی ترقی پر کافی تفصیل سے بحث کی جا چکی ہے۔

شہر کی سیاست ایسی حکمت ہے جو باشندگان شہر کے باہمی ربط اور اتحاد کے تحفظ اور اس کی کیفیت سے بحث کرتی ہے شہر سے میری مراد وہ جماعتیں ہیں جو مل جل کر رہتی ہیں۔ اور ان میں باہمی معاملات ہوتے ہیں، اور وہ مختلف متفرق گھروں میں بود و باش رکھتی ہیں۔

اور سیاست خدوٹ کے بارے میں اصل یہ ہے کہ اہل شہر کے باہمی روابط کے لحاظ سے گویا پورا شہر ایک وحدت ہوتی ہے جو چند اجزائے اجتماعیہ سے مرکب ہے۔ اور ہر مرکب اپنے یہ ممکن ہے کہ اس کے مادہ یا صورت میں کسی قسم کا خلل پیدا ہو جائے یا اسے کسی قسم مرض لاحق ہو جائے اور مرض سے میری مراد یہ ہے کہ اس مرکب کیلئے کوئی ایسی حالت رونما جائے جو باعتبار نوع کے اس کیلئے مناسب و موزوں نہیں بلکہ دوسری حالت مزوں تھی۔ جب طرح یہ ممکن ہے کہ مرکب کے مادہ یا صورت میں نقص پیدا ہو جائے یہ بھی ممکن ہے کہ وحدت حالت میں باقی رہے یعنی وہ مرکب اپنی اصلی خوبی و کمال کے ساتھ مکمل حالت میں باقی رہے۔

## علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی

حافظ عباد اللہ فاروقی

علامہ عبدالحکیم عبد اکبری میں سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ صاحب روضۃ الادب کے بیان کے مطابق آپ کے والد بزرگوار کا نام شیخ شمس الدین تھا۔ آپ کا سال پیدائش ۱۹۶۸ء ہے۔ جبکہ اکبر کو ہندوستان میں سرریہ آرائے سلطنت ہوئے ابھی چھ برس گزرے تھے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ (۱۵۶۲ء لغایت ۱۵۷۲ء) پیدا ہوئے آپ سے چار سال چھوٹے تھے۔ نواب سعد اللہ خان جو شاہجہان کے عہد میں وزیر اعظم کے ممتاز عہدہ پر فائز رہے علامہ کے ہم جماعتوں میں سے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد دین فوق قحطاریہؒ کہ ”سیالکوٹ اور سیالکوٹ کی مسجد میاں وارث کو جو کشمیری عہد میں ابھی

تک موجود ہے۔ یہ شرف رہا ہے کہ وہاں نہ صرف مولوی عبدالحکیم صاحب جیسے علامہ روزگار ہی پڑھتے رہے ہیں۔ بلکہ نواب سعد اللہ خان وزیر اعظم شاہجہان اور حضرت شیخ احمد مرہندی مجدد الف ثانیؒ بھی پڑھتے رہے ہیں۔“  
 آثارِ خمیر میں لکھا ہے ”علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی جن کا ہندوستان کے مشہور علماء و فضلاء میں شمار ہوتا ہے۔ علامہ سعد اللہ خاں کے ساتھ ملا کمال کشمیری سیالکوٹی سے پڑھے تھے۔

اور سعد اللہ خلی سبق میں ان سے پیچھے تھے، مگر قسمت کے معاملہ میں ان سے زیادہ پیچھے قدم رکھے۔ اور مولوی کے خطاب سے موصوف ہو کر بڑھتے بڑھتے شاہجہان کے وزیر اعظم بن گئے، صاحب سالکین السالکین و آثارِ بغیر و صاحب تاریخ سیالکوٹ مدنی و صاحب روزنامہ قیومیہ اور صاحب زبدۃ المقامات نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو علامہ عبدالحکیمؒ ہم مکتب اور مولانا کمال کشمیری کا شاگرد بتایا ہے۔

علامہ عبدالحکیمؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے باہمی مراسم کا کچھ حال صاحب زبدۃ المقامات اور صاحب روزنامہ قیومیہ نے تحریر کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ ایک مرتبہ علامہ عبدالحکیمؒ نے حضرت مجدد الف ثانیؒ کو خواب میں دیکھا کہ وہ مولوی صاحب سے قرآنِ مکیم کی یہ آیت فرما رہے ہیں قُلِ اللّٰهُ شَمَّ ذَرَّهْمُ رِنِ نَحْوُ ضَمِّهٖ یَكْعَبُونَ۔ مولوی صاحب جب خواب سے بیدار ہوئے تو دیکھا کہ سینہ کے اندر ایک لُورس رہا ہے۔ دل سے کہ خود بخود ذکر کر رہا ہے۔ اور حالت یہ کہ سارے بدن پر اس کا اثر محسوس ہو رہا ہے۔ دُعا اور توبہ کے لئے حضرت کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا:

خواجہ ہاشم مصنف زبدۃ المقامات لکھتے ہیں۔ ایک روز قیوم اقل (حضرت مجددؒ) کی مجلس میں تمام مرید حاضر تھے۔ اثناء گفتگو میں کسی نے کہا کہ آنجناب کی تجدید الف اور قیومیت ہم لوگوں پر تو اظہر من الشمس ہے لیکن اگر کوئی عالم جو طلعت عصر میں بلند مرتبہ رکھتا ہو اور جس کی سند کو سب تسلیم کر لیں، اس امر کی تائید کرے تو بہت اچھا ہے۔ خواجہ ہاشم جو مولانا محمد الہاشم کشمی کے نام سے بھی مشہور ہیں کہتے ہیں میں نے خود یہ الفاظ اپنی زبان سے حضرت قیوم اقل کی خدمت میں عرض کئے۔ فرمایا مولوی عبدالحکیم سیالکوٹی کو جانتے ہو۔ آج اہل علم میں ان کا کیسا مرتبہ ہے؟ سب نے بالاتفاق عرض کیا۔ آج معقول و مقبول میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے وہ یکتا زمانہ ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ مولانا نے میری طرف ایک خط لکھا ہے اسے دیکھو یہ کہہ کر خط آگے رکھ دیا۔ اس خط میں بہت سے مدحیہ فقرے حضرت قیوم اقل کے بارے میں تھے۔ اس خط میں مولانا نے اپنے خواب کا واقعہ لکھا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سب سے پہلا خط ہے جو مولوی عبدالحکیم مرحوم نے

حضرت مجدد الف ثانیؒ کو لکھا۔ روضۃ الادب اور روضۃ القیومیہ میں بھی اس خط کی تائید کی گئی ہے۔

علامہ عبدالحکیم نے بالآخر حضرت مجدد الف ثانیؒ کی بیعت کی اور تجدید الف کے اثبات میں ایک رسالہ بھی ”دلائل التجرید“ کے نام سے لکھا۔ روضۃ قیومیہ میں اس رسالہ کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں مولانا نے نہایت قوی دلائل و براہین بیان فرمائے ہیں۔ مولانا جب سرہند سے واپس آئے تو اُن کے نام کے ساتھ دربار قیومیت سے ”آفتاب پنجاب کے خطاب والفاظ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ یعنی وہ وجود جو صرف علوم ظاہری کا آفتاب تھا اب باطنی و روحانی فیوضات میں بھی شمسِ باز نہ ہو کر نکلا۔

حیرت ہے کہ آپ کا نام ”اکبرنامہ، آئین اکبری“ اور مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب دربار اکبری میں موجود نہیں۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی ہو سکتی ہے کہ چونکہ اکبرِ علماء کا قدردان نہ تھا اس لئے اس کے ہم عصر مؤرخین نے علماء کا تذکرہ عہدِ اد کیا ہو۔ اکبر کی وفات کے وقت (۱۵۵۶ء) میں آپ کی عمر ۴۵ برس کے قریب تھی۔ اس وقت اکبر کے عالیشان مدرسہ لاہور میں آپ مدرس تھے۔ لیکن آپ کی رسائی اکبر کے دربار تک نہ ہو سکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بعض کتابوں میں آپ کا ذکر نہیں ملتا۔ آپ کافی مدت لاہور رہے۔ یہاں تک کہ فاضل لاہوریؒ کے نام سے مشہور ہو گئے۔

محمد اللہ شائع مسلم آپ کے قول کو ”قال الفاضل اللہ پوری“ لکھ کر بیان کرتا ہے۔ روضۃ الادب میں بھی آپ کے قیام لاہور کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ مسائل منطق میں علمائے یورپ اور اگرہ سے آپ کے اکثر بحث مباحثہ رہتے تھے۔

اکبر کی وفات کے بعد مسئلہ میں جب جہانگیر تخت پر بیٹھا ہے تو اس نے علماء کو جاگیریں عطا کیں۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو بھی ایک معقول جاگیر دی گئی۔ جہانگیر کی آپ پر خاص توجہ تھی۔ شاہی عنایت کی وجہ سے آپ اپنی شہمت ہو گئے تھے۔ علمائے ہند مسائلِ دینیہ میں آپ سے فتاویٰ طلب کرتے اور اس زمانہ میں چونکہ تعلیم بالکل مفت تھی اس لئے طلباء آپ کے درس میں دُور دراز سے آتے اور صاحبِ علم و فضل ہو کر جاتے۔



آٹا پتھر میں عہدِ جہانگیری کے جن ستولہ عالموں کا ذکر ہے ان میں ایک نام مولانا عبدالحکیم کا بھی ہے۔ آپ عہدِ جہانگیر تک لاہور ہی میں قیام فرما رہے۔ آپ نے حضرت میاں میر سے ملاقات کی، جس کا مفصل حال شاہزادہ دارا شکوہ نے اپنی کتاب سکینۃ العلماء میں لکھا ہے۔

شاہ جہاں کے عہد میں علامہ موصوف کو اکبر آباد (آگرہ) کے سرکاری مدرسہ میں پروفیسر اکبر آباد کیا ہوا تھا مدرسہ اعلیٰ بنا کر بھیجے گئے۔ حاجی محمد قدسی مشہدی جو اس زمانہ کے مشہور شاعر تھے وہ اور علامہ عبدالحکیم اس مدرسہ میں ایک ہی وقت میں استاد رہے۔ شاہجہان کے زمانہ میں مولانا کو دربار تک رسائی بھی ہو گئی۔ چنانچہ اس عہد کی اکثر کتابوں میں آپ کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ شاہجہان کے دربار میں ایران و تہران و عرب و شام تک کے علماء اور اہل کمال موجود تھے مگر ان سب میں بلواظ قابلیت علامہ عبدالحکیم کا پایہ بلند تھا۔ علامہ حمید لاہور شاہجہان نامہ میں لکھتے ہیں کہ جن طلباء کو سال جلوس اول یا مابعد کے سالہائے جلوس میں انعام و اکرام ملتے رہے۔ ان میں ایک علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی بھی تھے۔ صاحب اثر الکرام دفتر اول میں علامہ عبدالحکیم کے متعلق لکھتے ہیں:-

”ہوں نوبت درائے بندوستان بہ صاحبِ بزان شاہجہان نازاں  
برہنہ رسید و فائزہ علم و شرف از ریشہ ہے و گارید آمد۔ علامہ عبدالحکیم دیں  
عہدِ یارِ خود را بہ درگاہِ خلافت رسانید۔ ہر گاہ وارد حضور میگردد دید بہر طیت  
نقدہ ناعد و خصوصِ نگشت۔ و دوبارہ بنجیدہ شد۔ و چند قریہ بہ رسم  
سیور خال انعام شد۔“

شاہجہان عہد میں جو نامور علمی علماء درجہ احرار میں داخل تھے، اور جن میں بعض مثلاً نواب سعد اللہ خاں ملکی خدمات پر بھی نامور تھے صاحبِ آٹا پتھر نے ان کی تعداد یا سیکس تک بیان کی ہے جن میں بدخشان بھی ہیں۔ بخاری اور سندھی بھی۔ اسی طرح لاہوری، دہلوی اور گجراتی بھی ہیں۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا نام بھی جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔ یہ علماء و فضلاء علمی کام بھی کرتے تھے۔ غیر مالک کے بادشاہوں اور ماتحت

والیان ملک کو حفظِ مباح کے ساتھ حکومت کی طرف سے مراسلے لکھتے تھے۔ شریعتِ اسلامیہ اور علمِ دین کی حفاظت و اشاعت کرتے تھے۔ ان کے فیضانِ صحبت کا یہ اثر تھا کہ شاہجہان نے بادشاہِ بکر کو کئی غیر شرعی امور مثلاً سجدہ کورنش وغیرہ ترک کرا دیئے۔ شاہجہان نے دو مرتبہ علامہ عبدالحکیم کا رستلاوا کیا۔ مائثر آمار اور دیگر کتابوں میں لکھا ہے کہ مولانا کو دو مرتبہ چھ ہزار نفد ملا جو ان کے وزن کے برابر تھا۔ حدائقِ المغنیہ میں مولانا عبدالحکیم کے حالات میں لکھا ہے کہ شاہجہان کے عہد میں ان کے پاس ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر تھی جو آپ کی اولاد کے پاس چند پشتوں تک قائم رہی۔ علامہ عبدالحکیم علومِ معقول و منقول، منطق و فلسفہ اور دینیات کے محج البحرین تھے کہ جن کے چشمہ فیض سے سینکڑوں اور ہزاروں تشنگانِ علم نے پیاس بجھائی۔ لیکن آج جب مولانا کے فیض یا فکھان اور تلامذہ کے نام تلاش کئے جاتے ہیں تو سوائے مائثر اکرام جلد اول کے کہیں اور کسی شاگرد کا نام نہیں ملتا۔ مائثر اکرام میں چونکہ زیادہ تر بلگرام (لکھنؤ) کے علماء و فضلاء کا ذکر ہے۔ اس لئے اس میں علامہ عبدالحکیم کے جن دو شاگردوں کا نام ملا ہے وہ بلگرام اور اسی نواح کے بزرگ ہیں۔ یعنی (۱) عبدالحسین جو مراد آباد کے قاضی بھی ہوئے تھے (۲) سید اسماعیل بلگرامی۔ ممکن ہے ان بزرگوں نے علامہ عبدالحکیم سے اس زمانہ میں تعلیم پائی ہو جب شاہجہان کے ابتدائی دور میں وہ لاہور سے اکبر آباد (آگرہ) کے سرکاری مدرسہ میں بھیجے گئے۔ مولانا نے لاہور اور سیالکوٹ میں بھی سرکاری اور نجی طور پر سلسلہ تدریس جاری رکھا۔ تعجب ہے پنجاب میں ان کے کسی شاگرد کا نام کسی تاریخ میں موجود نہیں۔

**تصنیفات** علامہ کا تصانیف کی صحیح اور مکمل تعداد کسی تاریخ سے معلوم نہیں ہو سکی۔ انہوں نے زیادہ تر منطق و فلسفہ کی اوق ترین کتابوں کے

حواشی اودان کی شرحیں لکھی ہیں۔ صرف ایک کتاب غنیۃ الطالبین ایسی بتائی جاتی ہے جس کو آپ نے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا، باقی کی تمام تصانیف منشیہ اور شرحیں عربی زبان میں ہیں۔ استاذی حضرت مولانا سید میرک شاہ صاحب اندرابی شیخ الحدیث

کا خیال ہے کہ علامہ عبد الحکیم نے شرحیں اور حاشیے لکھ کر علم کی بڑا نقد خدمات سرانجام دی ہیں۔ آثار الکرام میں آپ کی تصانیف کے متعلق لکھا ہے۔

”تصانیف اُو دور بلادِ عرب و عجم سائر و دائر است“

صاحبِ روضۃ الادب لکھتے ہیں ”تصانیف آپ کی بہت مفید ہیں اور اہل علم ان کو بہت پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ نے خیالی کا جو حاشیہ لکھا ہے اس کے متعلق کسی کا یہ شعر ہے۔“

خیالاتِ خیالی بس عظیم است برائے حل اُو عبد الحکیم است

علاوہ ازیں تفسیر بیضاوی اور مطول پر حاشیہ اور عبد الغفور کا مکملہ آپ نے نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ مختلف کتابوں کی ورق گردانی سے آپ کی تصانیف کی جو تعداد معلوم ہو سکی ہے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) حاشیہ تفسیر بیضاوی (۲) حاشیہ مطول (۳) حاشیہ عبد الغفور (۴) حاشیہ شرح مواقف۔ (۵) حاشیہ مقدمات تلویح۔ (۶) حاشیہ شرح عقائد فقہائِ زانی (۷) حاشیہ خیالی (۸) حاشیہ شرح شمسِ قطبی میر۔ (۹) مکملہ عبد الحکیم شرح جامی۔ (۱۰) حاشیہ شرح عقائد ملا جلال الدین دوانی۔ (۱۱) درۃ ثمنیہ درسیات واجب الوجود۔ (۱۲) حواشی درکنار شرح حکمت العین۔ (۱۳) حواشی درکنار شرح ہدایہ حکمت۔ (۱۴) حواشی درکنار مہر الارواح۔ (۱۵) ترجمہ غنیۃ الطالبین۔ (۱۶) شرح تہذیب خشعی۔ (۱۷) القول المحیط یہ رسالہ علم منطق میں ہے۔ (۱۸) کتاب مشہود۔ (۱۹) دلائل التعمید (حضرت محمد الف ثانی کے دعویٰ کی تائید میں)۔ (۲۰) حاشیہ شریطیہ۔

علامہ عبد الحکیم نے جو شرحیں لکھیں اور جو حواشی مختلف ادق کتابوں کے تحریر کئے انہوں نے آپ کی شہرت و عظمت کو علمائے عصر میں ممتاز جگہ دی۔ مگر اس زمانہ میں ایسے علماء بھی موجود تھے جو آپ کی آزاد خیالی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ مثلاً ملا عبد الہاق کشمیری نے جنہیں شاہ جہاں نے مدرسہ کابل کا مدرس بنا کر افغانستان بھیج دیا تھا۔ آپ کے اکثر حواشی کا رد لکھا ہے۔

علامہ عبدالحکیم کے سال پیدائش کا معیار صرف تاریخی قیاسات پر کیا گیا ہے۔ لیکن آپ کے سال وفات ۱۹۶۵ء پر سب مورخوں کا اتفاق ہے۔ اسی طرح وفات کے وقت آپ کی عمر سو سال تھی۔ تاریخ سیالکوٹ صمدی میں مولانا عبدالحکیم کی وفات کے دو تاریخی قطعات بھی ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

بجکم الہی چوں بہ جنت رسید	شہ معدن علم عبدالحکیم
ندا شد ز دل سال تر حیل او	دل محزون علم عبدالحکیم
۶۸	۱۰

چو با حکم خدا داخل جناں شد	حکیم آں عالم ویں با مروت
بخواں عارف بہشتی ارتحالش	دو بار متقی اعمال جنت
۶۸	۱۰

مولانا کی وفات سیالکوٹ میں ہوئی اور اپنے عالیشان بلخ میں دفن کئے گئے۔ آپ کے مزار کی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا اصل نمونہ تھی۔ سنگ مرمر اور دیگر اقسام کے بیش قیمت پتھر فرشوں، دیواروں، محرابوں اور قبر کے تعویذ پر لگائے گئے تھے۔ تاریخ سیالکوٹ صمدی میں لکھا ہے ”اس طرز و شان کی عمارات سیالکوٹ میں بہت کم تھیں“ علامہ کے مقبرہ کی چار دیواری پختہ ہے مگر خستہ حالت میں ہے۔ قبر کا چوترا چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کے بعد آتا ہے۔ چوترا پر سفید پتھر کی چھوٹی چھوٹی تختیاں ہیں جن کی دلیں سنگ سیاہ کے خطوط سے نہایت خوش نما معلوم ہوتی ہیں۔ مولانا عبدالحکیم کے پہلو میں ان کے فرزند مولانا عبداللہ کی قبر ہے۔ سکتوں کے عہد میں شاہجہانی عہد کی دیگر عمارات کی طرح یہ مقبرہ بھی سنگ مرمر کے لالچ میں تاراج کر دیا گیا۔

علامہ عبدالحکیم کی تعمیر کردہ عمارتیں علامہ عبدالحکیم نے شہر سیالکوٹ میں پیشمار عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جن میں ایک عالیشان ذاتی حویلی کے علاوہ کچھ عمارتیں ایسی بھی تھیں جو رفاہ عام کے لئے وقف تھیں۔

مسجد و مدرسہ مولوی عبدالحکیم مسجد میں مولانا کاشمیر مدرسہ بھی تھا جس کی شہرت تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس مدرسہ سے صدہا طالب علم دستارِ فضیلت لے کر اور فراغِ تحصیل ہو کر نکلتے تھے۔

مسجد کا سالِ تعمیر ۱۰۵۲ھ ہے۔ چونکہ مسجد کے ساتھ ہی مدرسہ کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی سن میں آپ نے سیالکوٹ میں اپنا درس بھی جاری کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے لاہور اور آگرہ کی سرکاری ملازمت ۱۰۵۲ھ سے پہلے ہی ترک کر دی تھی۔ اس لئے کہ ۱۰۵۲ھ میں جب آپ نے درس جاری کیا تو پھر سیالکوٹ سے بہت کم باہر نکلے۔ یہ مسجد محلہ میان پورہ میں واقع ہے۔ اس محلہ میں مولانا عبدالحکیم کے رہائشی مکانات بھی تھے جو تاراج ہو چکے ہیں۔

حمام و مسافر خانہ علامہ عبدالحکیم نے ایک تالاب بھی بنوایا تھا جس کے متصل ہی انہوں نے ایک حمام اور مسافر خانہ بھی تعمیر کرایا تھا۔ یہ شاندار عمارتیں جو شہر سیالکوٹ کی عظمت و شہرت کا باعث تھیں انگریزی عہد میں مسمار ہو گئیں۔ باغ۔ تالاب سے مغرب کی جانب مولوی عبدالحکیم نے ایک وسیع اور دلکش باغ لگوایا تھا جس کے چاروں طرف ایک بلند فصیل بنائی گئی۔ باغ میں ہر قسم کے اشجار و درخت موجود تھے۔ یہاں چوتھرے اور بارہ دیاں بھی تھیں جن میں سنگ مرمر، سنگ سیاہ، سنگ زرد سنگ ابری اپنی اپنی بہار دکھاتے تھے۔ افسوس اب نہ باغ ہے نہ فصیل نہ کوئی بارہ دری نہ عمارت۔

عید گاہ۔ آپ نے ایک عید گاہ بھی تعمیر کرائی تھی جس کے چاروں طرف بلند اور چوڑی کی عمارت تھی۔ عید گاہ کا دروازہ اور اس کی پیشانی اس قسم کے نقش و نگار اور خوبصورت بیل بوٹوں سے آراستہ تھی، جن سے لاہور کی مسجد وزیر خان، گلشنِ باغ اور پوربھی کے دروازوں کی پیشانیاں متعش ہیں۔ عید گاہ کے چاروں دروازوں پر بلند مینار تھے، عید گاہ کا صحن اس قدر

دیں تھا کہ اس میں ہزار آدمی ہآسانی نماز پڑھ سکتے تھے۔

**تالاب**۔ علامہ عبدالحکیم نے لاکھوں روپے کی لاگت سے یہ تالاب بنوایا تھا۔ اس میں دریائے چناب سے ایک نہر آتی تھی جس کے بٹے ہوئے نشانات اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ سکھوں کے عہد میں تالاب کی ملحقہ عمارتیں برجیلیں اور پل مسار کر دیئے گئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد سرکارِ انگریزی نے اہل سیالکوٹ پر ساٹھ ہزار روپیہ جرمانہ کیا جو بعد میں معاف کر دیا گیا، لیکن یہ روپیہ لوگوں نے وصول نہ کیا بلکہ برباد و رغبت مولانا کے تالاب کی کھدائی اور مرمت پر خرچ کر دیا۔ تالاب کے درمیان ایک کنواں تھا اور وہاں تک ایک پختہ پل بنا ہوا تھا مگر مرمت کے وقت وہ پل کال کر کنواں بند کر دیا گیا۔

علامہ اقبال اور علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی مولانا محمدین فوق مرحوم نے سوانح علامہ عبدالحکیم کے صفحہ اول پر علامہ اقبال کا مندرجہ ذیل بیان شائع کیا ہے: ”مولوی عبدالحکیم علیہ الرحمۃ سیالکوٹ کی سرزمین میں پیدا ہوئے جو شاہانِ مغلیہ کے زمانہ میں اسلامی علوم کی ایک مشہور درسگاہ تھی۔ ان کی عالمگیر شہرت آخر شاہجہاں تک پہنچی جس نے ان کی قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دربارِ دہلی میں بادشاہ کے اشارہ سے بڑے بڑے معرکۃ الآرا مذہبی و فلسفیانہ مباحث ہوا کرتے تھے جن میں سیالکوٹی فلسفی کی نمائندگیاں اور موٹگافیاں وسط ایشیا اور ایران کے حکماء کو جو حیرت کیا کرتی تھیں۔

ان کی فلسفیانہ تصانیف میں سیلکوٹی علی القصیرات ایک مشہور رسالہ ہے جو کچھ مدت ہوئی مصر میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ان کی اور بھی کتابیں ہیں جو اسلامی ممالک میں بہت مقبول اور ہر دلعزیز ہیں۔ توحید باری تعالیٰ پر بھی ان کا ایک رسالہ ہے جو شاہجہان کی فرمائش پر لکھا گیا تھا، مگر غالباً آج تک شائع نہیں ہوا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصہ تقویمِ باریتہ ہے، لیکن اسلامی فلسفہ کا مورخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ سیالکوٹ میں ان کی مسجد اور تالاب اب تک ان کی یادگار ہیں، مگر افسوس کہ ان کا مزار جو تالاب کے قریب ہی واقع ہے نہایت کس پرسی کی حالت میں قوم کی بے حسی اور مردہ دلی کا شکار ہے“ (اقبال)

# اسلامی دور کے قدیم کتب خانے

(بیت الحکمت سے دار الحکمت تک)

ڈاکٹر عبدالحلیم

ترجمہ ۱۔ ابوالسنذیر

مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اسلامی دور کے کتب خانے، عصر حاضر کے جامعات اور علمی اداروں کے کتب خانوں کی طرح تھے۔ طباعت سے پہلے، کتابیں قلمی اور گراں بہا ہوتی تھیں، انبیاء کے سوا کوئی دوسرا ان کو جمع نہیں کر سکتا تھا۔ علم اور اسلامی ثقافت کی یہ خوش نصیبی تھی کہ علم کے شائقین میں سے انبیاء کی اچھی تعداد کتب خانے برپا کرنے کی طرف مائل ہو گئی اور جمہور علم دوست حضرات کے لئے ان کتب خانوں سے استفادہ کی سہولتیں میسر کر دیں، اس لئے کئی مخصوص کتب خانوں کے نام تاریخ میں نظر آتے ہیں۔

خزانۃ الحکمت۔ اس کو علی بن یحییٰ منجم نے بغداد کے قریب اپنی جاگیر میں قائم کیا تھا۔ یا قوت کی روایت ہے کہ اس سے استفادہ کے لئے ہر شہر اور ملک سے لوگ آتے تھے اور یہاں آکر مختلف علوم و فنون حاصل کرتے تھے۔ کتابیں لن کے لئے کھلی رہتی تھیں، اور ان کی حفاظت بھی انہیں کے سپرد تھی۔ علی بن یحییٰ کی طرف سے جملہ علماء اور طلباء کی مالی کفالت ہوتی تھی۔

**دارالعلم**۔ اس کو ابو القاسم جعفر بن محمد بن حمدان موصلی نے موصل میں قائم کیا تھا۔ اس میں کتابوں کی ایک بہت بڑی تعداد تھی جن کو طالب علموں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جب کوئی باہر سے مسافر محتاج آتا تھا تو اس کو بدنی اور روحانی دونوں فزائیں مل جاتی تھیں۔

بصرہ میں ابن سوار کا کتب خانہ تھا، اور "خالد بن یزید" کا اسلام میں بروایت "کر دعلی" پہلا کتب خانہ ہے۔ اس نے قدما کی کتابوں کو گوشہ نگہنامی سے نکلنے کا قصد کیا اور یونان کے فلاسفہ کی ایک جماعت کو جمع کر کے ان کو نعت عربیہ میں کتابوں کے نقل کرنے کا حکم دیا۔ ان مخصوص کتب خانوں میں یہ کتب خانے ہیں۔ مکتبہ "الناصر لدین اللہ"، مکتبہ "المعتصم باللہ"، مکتبہ "الفتح بن خاقان"، مکتبہ "حنین بن اسحاق"، مکتبہ "القفطی"، مکتبہ "ابن الخشاب"، مکتبہ "الاصفہانی"، مکتبہ "ابن العمید" وغیرہ۔

**کتب خانہ اسکندریہ** عام کتب خانوں میں سب سے زیادہ مشہور اسکندریہ کا وہ کتب خانہ ہے جو کہ اسکندریہ کی قدیم جامعہ کے ساتھ ملحق تھا اور جس کو "بطالمہ" نے تیسری صدی قبل مسیح بنایا تھا اور یہ قیصر کے دور میں جل گیا تھا، کہتے ہیں کہ اُس وقت اس کتب خانے میں پانچ لاکھ مجلد کتابیں تھیں۔ ایشیا کو چمک کے "برعالمون" کتب خانے کی جو کتابیں تھیں ان کو بھی "انطونیو" یہاں اٹھا لائے تھے۔ تاریخی روایت ہے کہ "انطونیو" نے تقریباً دو لاکھ کتابیں قلو پطرہ کو ہدیہ پیش کی تھیں کہ مکتبہ اسکندریہ کو آگ لگ جانے کی وجہ سے جو خسارہ لاحق ہوا تھا، اس کی وہ تلافی کرے۔

وہاں دو کتب خانے ایسے تھے جن پر اسلامی دور بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، ان میں سے ایک بیت الحکمت تاجی کتب خانہ بغداد میں تھا اور دار الحکمرہ قاہرہ میں۔

**بیت الحکمت** مکتبہ بیت الحکمت کی بنیاد ہارون الرشید نے رکھی تھی اور یہ "نامون" کے دور میں بام عروج کو پہنچ گیا تھا۔ یہاں ایک مخصوص شعبہ اس لئے قائم ہوا تھا کہ یونانی، فارسی، ہندی، قبطی اور آرامی زبانوں سے علمی کتابیں عربی میں



ترجمہ کی جائیں۔ ہارون الرشید نے انقرہ، عموریہ اور روم کے ان ملکوں میں سے جہاں ملان لڑے تھے جہاں بھی کتابیں دیکھیں ان کو بیت الحکمت میں لے آئے اور ”یوحنا بن ماسویہ“ کو قدیم کتابوں کے ترجمہ کا کام سپرد کیا، جس طرح مامون نے ”اسہل بن ہارون“ کو اس کتب خانہ کا نگران مقرر کیا تھا، اور وہاں وہ سب یونانی کتابیں تھیں جو کہ مامون کو جزیرہ قبرص کے مالک سے ہدیہ کے طور پر پہنچی تھیں اور دوسری وہ کتابیں تھیں جو قسطنطنیہ سے آئی تھیں۔ مامون نے ان کو روم کے بادشاہ سے طلب کیا تھا۔ موضوعات کے موافق کتابوں کی تصنیف ہوئی اور اس کے لئے ایسے ہوشیار مترجم چنے گئے جن کو ان موضوعات میں خصوصی جہارت تھی اور مزید یہ کہ عربی اور یونانی دونوں زبانیں اچھے طور پر جانتے تھے۔

رشید کے دور کے مشہور مترجم یہ ہیں، ابو اسہل الفضل، یوحنا بن ماسویہ، ابن البطریق، حسنین بن اسحق، عمر بن القروان، ثابت بن قرۃ وغیرہ۔ کتب خانہ میں ناقل بھی کافی رہتے تھے جو کتابیں نقل کرتے تھے تاکہ ایک کتاب کے مختلف نسخے ہو جائیں اور وہ دن رات میں بدلتے رہتے تھے۔

مکتبہ بیت الحکمت مامون کے دور میں اپنے اوج کو پہنچ چکا تھا اور وہ بڑا علمی مرکز کا درجہ رکھتا تھا جس میں علم طب، فلسفہ اور حکمت کی کتابیں تھیں۔ مامون دنیا کا مثالی خلیفہ تھا جو علم کی نگرانی کرتا، علماء کی طرف مائل اور ان سے اپنے مجالس کو منہ نہ رکھتا تھا۔ کہا گیا ہے کہ کبھی تو ترجمہ کے بدلے میں اس کے وزن کے موافق سونا دیتے تھے۔ مامون پہلا شخص ہے جس نے یہ اعلان کیا کہ بیت الحکمت کی ترقی صرف خلفاء اور امراء کی سخا پر موقوف نہ ہوگی، اس لئے اس نے علماء کے لئے مستقل اوقاف مقرر کئے۔

بیت الحکمت عالم اسلام کا پہلا عالی شان عام کتب خانہ شمار کیا جاتا ہے جس پر عباسی حکومت نے دل کھول کر خرچ کیا تھا، وہاں ہر وقت علماء کا درس اور بحث کے لئے ایک بڑا مجمع رہتا تھا، اور طلبہ پڑھنے کے لئے کھینچ کر آتے تھے۔ افسوس ہے کہ معتصم نے اس عظیم کتب خانہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی مگر پھر بھی یہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے اس کو بالکل اجاڑ دیا اور اس طرح کتب خانہ بھی تباہ ہو گیا۔

دارالحکمت، دارالحکمت کی بنیاد الحاکم بامر اللہ نے ۳۹۵ھ میں قاہرہ میں رکھی مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس کتب خانے میں مملکت کے کتب خانوں کی کتابیں اور حاکم کے مکتبوں کی ایسی کتابیں لاکر رکھی گئیں جن جیسی کتابیں کسی ایک بادشاہ یا خلیفہ کے لئے نہیں دیکھی گئی تھیں۔ دارالحکمت میں جتنے بھی علماء، فقہاء اور اطباء رہتے تھے، ان سب کے مصارف اور نان و نفقہ الحاکم بامر اللہ نے جاری کر رکھا تھا اور لوگوں کو عام اجازت تھی کہ وہاں آکر پڑھیں، لکھیں، نقل کریں اور تعلیم و ترجمہ کا کام کریں۔ اسی طرح وہاں علمی اجتماعات اور مجالس کی بھی عام اجازت تھی۔ علماء علمی مسائل میں مناظرہ کے لئے حاضر ہوتے تھے اور حاکم خود بھی ان اجتماعات میں حاضر ہونے کا بڑا شوقین تھا، علماء کو خلعتیں عطا کرتا تھا اور اس نے بیت الحکمت پر ایک بڑا وقف جاری کیا تھا اور تاکید کرتے تھے کہ یہ ہمیشہ رہے، اس کو زمانہ کے گزرنے سے کوئی نقصان نہ پہنچے، مگر زمانہ کے مصائب سے یہ مکتبہ بھی محفوظ نہ رہ سکا اور ہجری چھٹی صدی میں اجڑ گیا۔

مؤرخ بلنتون اور عام عربی کتب خانے | مؤرخ بلنتون "بکثرت مسلمانوں کا کتب خانوں کی عمارتوں کی کوششوں کے متعلق لکھتا

رہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ بنائیں پتھر کی ہوتی تھیں اور بڑے بڑے کمرے بنائے جاتے تھے لکڑی کے تختے دیوار سے لگے رہتے تھے تاکہ ان پر کتابیں رکھی جائیں۔ بعض خیمے اطلاع کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ اسی طرح کچھ جگہیں کتابت اور نقل کے لئے مخصوص تھیں اور کچھ حلقہ درس اور مناظرہ کی تھیں۔ دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ بعض کمرے موسیقی کے لئے مخصوص ہوتے تھے جہاں مطالعہ والے دل بہلانے اور آرام کے لئے آتے تھے۔ ان تمام کمروں میں عمدہ قسم کا فرنیچر ہوتا تھا، زمین پر فرش بچایا جاتا تھا، کھڑکیوں پر عمدہ پردے لٹکے ہوتے تھے اور جاڑے میں سرد ہوا کو روکنے کے لئے موٹے پردے ہوتے تھے۔

مقربزی اور دارالحکمت | مقربزی بھی اسی طرح روایت کرتا ہے کہ قاہرہ کے دارالحکمت کے دروازے حوام کے لئے تب تک بند رہے جب تک فرش

نہ بنایا گیا اور اس کو سنوارا گیا۔ جملہ دروازوں اور گزرگاہوں پر پردے لٹکا دیئے گئے اور اس پر

دیکھ بھال کرنے والے اور خدام مقرر کئے گئے۔ وہ کہتا ہے کہ عارت نہایت بڑی تھی کیوں کہ جملہ علوم میں چالیس کتب خانے تھے، ایک ایک میں اٹھارہ ہزار کتابیں آسکتی تھیں اور تختیاں کھلی رہتی تھیں، کتابیں سب کے پاس ہوتی تھیں، پڑھنے والا اپنی مرضی کے موافق کتاب خود اٹھا لیتا تھا، اگر وہ نہیں پاتا تھا تو دوسروں سے مدد حاصل کرتا تھا۔

منظم قہار رس۔ ان کتب خانوں کی منظم فہرستیں ہوتی تھیں۔ ابن سینا، حسن بن سہل، بیہقی، ابن جوئی وغیرہ نے ان فہرستوں کی دقت اور خوبی کا ذکر کیا ہے، وہاں سے عارت پر کتاب لینا مباح تھی جس کے لئے کچھ معمولی شرائط ہوتی تھیں اور کبھی مستعیر سے کچھ ضمانت بھی طلب کی جاتی تھی لیکن علماء و فضلاء اس ضمانت سے مستثنیٰ تھے۔

ان کتب خانوں کی حفاظت کا کام سہل بن ہارون جیسے ممتاز علماء کے سپرد تھا، سہل بیت الحکمت کے امین اور لائبریرین تھے اور ”علی بن محمد شائبستی“ دارالحکمت کے امین تھے۔

اگر یہ دونوں کتب خانے وطن عربی میں علم کی اشاعت کا فریضہ اب بھی ادا کرتے رہتے تو آج کیا حالت ہوتی۔ ان دونوں مکتبوں نے مشرق اور مغرب عربی میں نہضت علمیہ کی روح کو بڑھکے زہن جا دو جیسا کام کیا۔ یہ وہ دور تھا جس میں یورپ جہالت اور تاریکی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ علمی، اسلامی ثقافت کا یہ روشن دور تھا جس کے آسمان کے افق پر ایسے علماء، روشن ستاروں کی طرح چمکے جن پر ہر دور میں بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے یونان کے علوم کو نقل کیا اور تدوین کی، اس پر اپنی تحقیقیں بڑھائیں۔ علم طب، فلک، کیمیا، جبر، فلسفہ، نبات، حیوان، معادن اور دوسرے کئی علوم میں اپنی طرف سے نئی کتابیں لکھیں، علوم دنیویہ اور لغت کی خدمت ان کے علاوہ تھی۔ یورپ کے علماء نے انہوں سے نقل کیا بلکہ قرون وسطیٰ تک اُس دور کی بعض کتابیں یورپ کے کئی یونیورسٹیوں میں اہل صنعت کے ہاں عمدہ کتابیں شمار ہوتی تھیں اور کچھ کتابیں تو سترھویں صدی تک ان یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔

آج مغرب نے جس علمی نہضت کو لے کر غلبہ حاصل کیا ہے اگر بیت الحکمت کا بغداد میں در دار الحکمت کا قاہرہ میں جلیلا ہوا شمع تاتار، ترک اور مغربی استعمار کی وجہ سے ٹل نہ ہوتا تو ملن عربی اس علمی نہضت اور ترقی کا قائد ہوتا!

## حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقی دہلویؒ

مولانا نسیم احمد فریدی اموی

حکمتِ عملی اور آدابِ معاشرہ کی تعلیم | حضرت محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں کہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اس فقیر کو اپنی مجلس مبارک

میں، حکمتِ عملی اور آدابِ معاشرت کی بھی بہت کچھ تعلیم دیتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ کی چند باتیں جو میرے حافظے میں باقی رہ گئی ہیں یہ ہیں۔“

(۱) فرمایا۔ کہ اپنی مجلس میں کسی قوم کی (یا کسی علاقے کے لوگوں کی) ہرگز برائی نہ کرنا کہ یورپ والے ایسے ہوتے ہیں اور پنجاب والے ویسے ہوتے ہیں۔ افتخاروں میں یہ عیب ہے اور مغلوں میں یہ خرابی ہے۔ ممکن ہے کہ تمہاری مجلس میں اُس قوم یا علاقے کا یا اُن کا حمایت کنندہ کوئی موجود ہو۔ اس کو یہ بات ناگوار گزرے گی اور مجلس مکدر ہو جائے گی۔

(۲) فرمایا کرتے تھے کہ (خواہ مخواہ اور بلا ضرورت) ہرگز کوئی ایسی بات مجلس عام میں زبان پر نہ لانا جو ”مخالفِ جمہور“ ہو، اگرچہ وہ فی نفسہ صحیح ہو، کیونکہ لوگ (ایک دم) اس بات کا انکار کر دیں گے اور مکدر پیدا ہو جائے گا۔

(۳) فرماتے تھے۔ کہ مجلس عام میں کسی خاص شخص کا نام لے کر اعتراض اور ردِ میراج نہ کیا جائے (عام بات بغیر نام کے ہو)۔

(۴) فرمایا کرتے تھے کہ انسان کا لباس اس کے امتیاز و کمال پر اطلاع دینے والا ہونا چاہیئے۔ اگر وہ عالم ہے تو علماء کا سا لباس پہنے اور ان کی سی زندگی بسر کرے اور درویش ہے

تو لباس دہلشی زیب تن کرے اور درویشوں کی طرح زندگی گزارے۔

(۵) فرماتے تھے کہ عیادت و بیمار پرسی کا مقصد اعظم یہ ہے کہ مریض کو (تمہارے اس طرز عمل سے) خوشی حاصل ہو۔ مقصد یہ نہیں ہے کہ فقط اس کے مزاج کی کیفیت مبرا ہو جائے۔ لہذا جب کوئی کسی مریض کی عیادت کا قصد کرے تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ مریض کو تو اطلاع نہ ہو اور وہ بالاسی بالاکسی سے کیفیت مزاج معلوم کر کے واپس ہو جائے ایسا کرنے سے مقصد فوت ہوتا ہے۔ یہی حال تعزیت کا ہے اور یہی حیثیت سفارش ہے۔ ان دونوں میں بھی ایسا ہونا چاہیے کہ جس کو تسلی دینا ہے اس کو تعزیت نامہ یا آمد کے ذریعے (اپنے جذبہ ہمدردی سے مطلع کرو۔ اور جس کی سفارش کی ہے اس کو بھی مطلع کر دیا جائے کہ تمہاری سفارشش کر دی گئی ہے۔ فرماتے تھے کہ جن جن امور میں اقامت مصلوہ و موافقت کو اور آپس میں انسانوں کے دل جوڑنے اور محبت پیدا ہونے کو مد نظر اور ملحوظ رکھا ہے۔ ان سب معاملات میں ایسا ہی ہونا چاہیے کہ صاحب معاملہ کو اپنے کام سے مطلع کر دیا جائے۔

(۶) فرماتے تھے کہ اگر وہ لوگ جو (بظاہر) مرتبے میں تم سے کم ہیں اور (محض محبت دینی کی بنا پر) تم کو سلام کرنے میں ابتدا کرتے ہیں، تم اس بات کو اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت سمجھو اور اللہ کا شکر ادا کرنا۔ ایسے لوگوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا۔ اور ان کے حال اور مزاج کو دریافت کرنا۔ بسا اوقات تمہارا ادنیٰ التفات جس کی تمہارے نزدیک کوئی حیثیت نہیں عوام کی نظروں میں بڑی چیز بن جاتا ہے اور وہ اس التفات کو بڑی حیثیت دیتے ہیں۔ اگر وہ اپنی طرف تمہارا ادنیٰ التفات بھی نہ دیکھیں گے تو بہت رنجیدہ ہوں گے۔

صد ملک دل بہ نیم نگہ میتوان خرید،

خواب دریں معاملہ تقصیر می کنند

یعنی سینکڑوں ملک دل ایک ادنیٰ التفات کے عوض خریدے جاسکتے ہیں۔ اس معاملہ

میں خوابانہ زمانہ بہت کوتاہی کر رہے ہیں (کہ ادنیٰ التفات کی رحمت بھی گوارا نہیں کرتے اور اتنا بڑا نفع نظر انداز کر رہے ہیں)۔

(۷) فرماتے تھے کہ یہ بات احمقانہ ہے کہ لباس و طعام و غیرہ میں کسی مخصوص چیز کی

مادت ڈال لی جائے (جب تک وہ مخصوص متعین شے دلے اُس وقت تک چین نہ آئے)۔

(۸) فرمایا۔ بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی محبت ذاتی ہوتی ہے کہ جب تک میسر آتا ہے تمہاری محبت اُن کے دل میں جاگزیں ہو جائے گی پھر کسی حال میں وہ محبت ان کے دل سے باہر نہ ہوگی، نہ مفلسی میں نہ خوشحالی میں۔ ایسے دوست کو غنیمت شمار کرنا اور اپنے فرزند سے بھی بہتر سمجھنا۔ بعض دوست ایسے ہوتے ہیں کہ تمہاری کسی فضیلت کے ظہور کی وجہ سے یا کسی غرض سے محبت رکھتے ہیں ان کو اُن کے مقام پر رکھنا چاہیے۔ غرض کہ سب کو ایک درجے میں نہ رکھا جائے اور کسی شخص پر اس کے مرتبے سے زیادہ اعتماد نہ کیا جائے۔

(۹) فرماتے تھے کہ ”کارِ عاقلان و حکیمان“ یہ ہے کہ کسی چیز سے فقط لذت حاصل کر لینا مقصود نہ ہو بلکہ اس لذت کے ضمن میں دفع ضرورت یا اقامت فضیلت ملحوظ ہو یا ادائے سنت کی نیت ہو۔

(۱۰) فرماتے تھے کہ بات کرنے میں، چلنے پھرنے میں اور اٹھنے بیٹھنے میں قوی لوگوں کا انداز اختیار کرنا چاہیے۔ اگرچہ تم (قدس) ضعیف ہی کیوں نہ ہو، اگر کوئی معیوب بات یا بزدلی یا بُنجل آغاثا تم سے صادر ہو جائے تو اس کے پھیلنے میں حتی الامکان کوشش کرنا اور اس سے شرمندہ رہنا اور یہ تکلف اس کے مقابل کی اچھی صفت کا مظاہرہ کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ نفس کو کوتاہی و تقصیر کی عادت وغیرہ پڑ جائے۔

دو رباعیاں۔ حضرت شاہ صاحب ارقام فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت والد ماجدؒ متصل نماز ظہر میری طرف متوجہ ہوئے اور فی البدیہہ یہ رباعی فرمائی۔

گر تو راہِ حق بخواہی اے پسر غافل کس را مر نخاں المحذر

در طریقت رکن اعظم رحمت است ایں چنین فرمود آں خیر البشر

(اے بیٹے اگر تو راہِ حق اختیار کرنا چاہتا ہے تو کسی کے دل کو ہرگز مت ستانا۔ رحمدلی طریقت میں رکن اعظم ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رحمدلی کی بہت کچھ تعلیم و تلقین فرمائی ہے)۔

اس رباعی کے متعلق فرمایا کہ دوات و قلم لاؤ اور اس کو لکھ لو۔ اللہ تعالیٰ نے اس

مضمون کا میرے دل میں القاء فرمایا ہے تاکہ اس کی تم کو نصیحت کروں۔ پھر فرمایا کہ نصیحت آمیز رباعی اللہ کی بڑی نعمت ہے اس کا بھی شکر لازم ہے۔

حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے انفاس نفیسہ میں یہ رباعی بھی ہے۔

اے کہ نعمتہائے تواضع و فروزوں شکرِ نعمتہائے تواضع و فروزوں

بخرا از شکرتو باشد شکرِ ما گر بود فضلِ تو مارا رہنمون

(اے وہ ذات کہ تیری نعمتیں جس طرح حد سے زیادہ ہیں۔ تیری نعمتوں کا شکر یہ بھی

حد امکان سے باہر ہے۔ لہذا تیرے شکر سے عاجز ہونے کا اقرار کر لینا ہی تیرا شکر ہے

مگر یہ اقرار بخیر بھی اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ تیرا فضل و کرم ہماری رہنمائی کرے اور ہمارے شامل حال ہو)۔

مسلم فقہی۔ حضرت محدث دہلویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت ایشانؒ اکثر و بیشتر امور میں تو موافق مذہب حنفی عمل کرتے تھے البتہ بعض باتوں میں حسبِ حدیث یا حسبِ وجدان کسی دوسرے مسلک فقہ کو ترجیح دیتے تھے۔

نسبتہائے طرق۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ایشانؒ کی زبان سے بارِ باخلوت میں یہ سنا ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے جو نسبت ہم نے پائی ہے وہ صاف تراور باریک تر ہے۔ اور حضرت خواجہ نقشبندؒ سے جو نسبت ہمیں ملی ہے وہ غالب تر اور مؤثر تر ہے۔ اور وہ نسبت جو کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ سے ہم نے حاصل کی ہے وہ عشق سے نزدیک تر اور تاثیرِ اسما اور صفائیِ قلب سے قریب تر ہے۔

بے ہمہ و یا ہمہ۔ ایک مخلص نے حضرت ایشانؒ سے دریافت کیا کہ عام لوگوں کے درمیان کس طرح زندگی بسر کرنا چاہیے۔ فرمایا اس طرح رہو کہ جیسے تم بھی ان میں سے ایک ہو، اپنے کو ان سے بڑا اور ممتاز نہ سمجھو۔ پھر اس نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت پڑھی رَحَالًا لَا تُلْهِمِيهِمْ تِجَارَةً وَلَا بَيْعًا عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ (یہ سورہ نور کی ایک آیت ہے جس میں دیندار تاجروں کی حضرت حق جل مجدہ نے تعریف فرمائی ہے اور جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ

تجارتی کاروبار اور جائز اشتغال میں مشغول رہ کر بھی انسان وصول الی اللہ کی دولت و نعمت حاصل کر سکتا ہے ترک دنیا کی چنداں ضرورت نہیں)۔

**ایک لطیفہ۔** حضرت ایشاں ایک مرتبہ کئی رفقا مکے ہمارا سفر کر رہے تھے۔ پہلی ایک تھی اور سب اس پہلی پر نوبت پر نوبت سوار ہوتے تھے۔ ایک رفیق شاندار راہ میں اپنی باری سے زیادہ سوار ہوا۔ حضرت ایشاں نے (جو غالباً پیدل چل رہے تھے) ایک شخص سے فرمایا کہ پہلی کے سواروں سے دریافت کرو کہ (اعلٰی کُتُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی) (انصاف کرو۔ انصاف تقویٰ اور پرہیزگاری سے بہت قریب ہے) یہ آیت کس پارے میں ہے؟ شیخ بدرالحق پہلی ”مقصد کلام“ سمجھ گئے اور رجستہ وبلے ساتھ عرض کیا کہ سیپارو یستندرون اسی آیت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ (سیپارو یستندرون کا ذکر کرنے سے جواب میں ایک علمی لطافت پیدا ہو گئی اور عمدہ طریقے پر مدد خواہی بھی ہو گئی)۔

**حضرت شیخ اکبرؒ کی تعظیم و تکریم** | حضرت شاہ عبدالرحیم فاروقیؒ حضرت شیخ محمد الدین ابن عربیؒ کی بہت تعظیم کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ ”میں اگر چاہوں تو فصوص الحکم کی ہر ہر منبر تقریر کروں اور اس کے تمام مسائل کو آیات و احادیث کے موافق ثابت کروں اور اس طرح بیان کروں کہ کسی کو کوئی شبہ نہ رہے۔“ بہت وحدت وجود کی تصریحات سے پرہیز فرماتے تھے، کیونکہ اکثر اہل زمانہ اس مسئلہ کو پوری رنج نہ سمجھ سکیں گے اور درطہ الحاد و زندقہ میں پڑ جائیں گے۔

**چند ملفوظات** | شیخ محمد بدرالحق پہلی نے حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے ملفوظات جمع کئے ہیں جو انفاس رحیمیہ کے آخر میں درج ہیں ان میں

سے چند یہاں پیش کرتا ہوں۔  
فرمایا۔ سالک کو چاہیے کہ رات دن ذکر کا ہتھام رکھے۔ طالب حق کو چاہیے کہ از فجر سے لے کر اشراق تک مراقبہ میں بیٹھے اور مراقبہ کے بعد اس وقت تک کسی سے شکوہ نہ کرے جب تک نماز اشراق نہ پڑھ لے۔ اور جب آدمی رات ہو جائے نماز تہجد اکرے اور فجر تک مراقبہ میں رہے۔ جب نیند غلبہ کرے پانی اپنے منہ پر چھڑک لے



تاکہ نیندر دور ہو جائے، اس مہامک وقت میں فتوحاتِ فیسی کا بہت کچھ ظہور ہوتا۔ اور بہت کچھ کشادگی محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً شبِ جمعہ کہ بہت ہی فضیلت رکھتی۔ فرمایا۔ جب کسی مدویش کی صحبت میں جائے اور اس سے متاثر ہو تو اس تازہ کو اپنے پیرو مرشد کا فیض سمجھے کہ یہ قابلیت ان کی نظر سے پیدا ہوئی ہے۔

فرمایا۔ اگر کسی طالب پر کسی مدویش کامل نے ایک بار بھی توجہ کر دی ہے اور قریب ہستی سے آزاد کر دیا ہے تو یہی ایک اس کو عمر بھر کے لئے کافی ہوگی بشرطیکہ مشغولِ بخت رہے۔ یہ (خوش قسمت) طالب اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک اس کا کام پور نہ ہو جائے گا۔

فرمایا۔ طالب حق اگر بیگانوں کی صحبت میں کبھی چلا جائے تو تھوڑی دیر سے زیادہ نہ بیٹھے۔

فرمایا۔ عاشق صادق کو اس بات کی کوشش کرنا چاہیے کہ قبر میں جانے تک اپنی عمر کو یاد مولیٰ میں صرف کرے۔ (اور اس کام میں لگا رہے) یہ بات دل میں نہ لائے کہ اس کام سے جلد فارغ ہو جاؤں، جلد بازی کرے گا تو یہ راستہ اس پر کچھ بھی نہ کھلے گا۔ بلکہ نظر کو حصولِ اور عدمِ حصول سے بھی ہٹائے۔ کمالِ حصول اسی کو جانے کہ حق تعالیٰ نے اپنی یاد کی توفیق عنایت فرمادی ہے۔ حصولِ کار اسی بات پر موقوف ہے۔ جب ہمت و توجہ درست ہو گئی تو پھر کام بھی مقصود سے وابستہ ہو جائے گا۔ اگر کیفیتِ قبض (قلب میں) پیدا ہو تو ناامید نہ ہو بلکہ بدستور جہد و جہد میں رہے اور شکرت کرتا رہے، اگر سالہا سال بھی قبض کی کیفیت ہے تب بھی ناامید نہ ہو۔ کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ (اس استقامت کی برکت سے) ایک مرتبہ ہی ایسا بے عنایت فرمادے کہ جو دولت و نعمت سالہا سال میں حاصل نہ ہوتی وہ ایک لمحے میں حاصل ہو جائے۔ غرض کہ اپنے کام کو اچھے طریقے سے انجام دے کر اس دنیا سے جائے۔

فرمایا۔ طالب کو چاہیے کہ ہر حال میں انتظارِ جمالِ محبوبِ حقیقی کرے اور کسی لمحہ فکر سے غافل نہ ہو یہاں تک کہ یک ایک اس کا باطن، مثلاً چرخ روشن ہو جائے اور

ہستی باقی نہ رہے۔ ہر وقت اپنے آپ کو مبتدی سمجھ۔ اور اشغال میں اس طرح جدوجہد کرے گویا کہ اسی وقت مرشد نے ارشاد فرمائے ہیں۔ یا حتیٰ میں اپنے جگر کو کباب کر دے اور جس جگہ قیام ہو اپنی عمر کا خاتمہ اسی جگہ جانے اور اس جگہ سے کسی دوسری جگہ (مستقل طور پر) منتقل ہونے کا خیال منقطع کر دے۔ موت کو حاضر جانے تاکہ "مرنے سے پہلے مر جاؤ" والا خاص مقام حاصل ہو۔ پرانی قبروں کا دھیان کرے اور عبرت حاصل کرے کہ ایک دن میرا حال بھی ایسا ہی ہو جائے گا۔ میں بھی قبر میں پہنچ جاؤں گا۔ اور سمجھ کہ میری عمر (فرض کرو) پچاس سال باقی رہ گئی ہے تو وہ بھی ہوا کی طرح گزر جائے گی۔

اگر کوئی تجھ پر غصہ کرے تو اپنے حال پر غور کر، اگر اپنے اندر ترک دنیا اور ترک جاہ و عزت پاتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، سمجھ لے کہ ایسی حالت میں کوئی چیز ضرر نہیں پہنچائے گی اور کسی کا غصہ تیرا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔ اور اگر اپنے اندر دنیا کی طرف میلان محسوس کرے تو جان لے کہ ہر چیز ضرر پہنچا سکتی ہے۔ بلکہ دنیا کی طرف میلان ہونا ہی ایک مستقل ضرر ہے دل کا دنیا میں پھنسنا اور اہل دنیا سے محبت کرنا اس سے زیادہ کوئی ضرر نہیں۔

اگر مخلوق (خواہ خواہ) اظہارِ نفرت کرے تو خوش ہونا چاہیے کہ مردودِ خلق، مقبولِ حق ہو جاتا ہے۔ اور یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لے کہ اگر لوگ بنظر حقارت دیکھتے ہیں تو یہ حقارت کا معاملہ چند روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔ اس جہان کی عزت کے لئے اُس جہان کا کام جس سے ہمیشہ واسطہ پڑتا ہے۔ برباد نہیں کرنا چاہیے۔

اس بات پر بھی یقین رکھ کہ ہدایت و ضلالت، از جہانِ خدا ہے۔ حق تعالیٰ کے سوا کسی کی خواہش و آرزو سے یہ دونوں امر نہیں ہوتے۔ آخر اس جہان سے گزنا ہے اور اس جہان کو چھوڑنا ہے۔ جس چیز کو اضطراب و مجبوری کے ساتھ کل چھوڑے گا۔ بہتر یہی ہے کہ اس کو آج اپنے اختیار سے چھوڑ دے۔

تو اگر کسی کی طرف سے کوئی تکلیف اٹھائے تو اس کے حق میں دُمائے بدنہ کہ بلکہ صرف اپنی جمعیت و مافیت کو اللہ سے طلب کر اب آگے کو خواہ حق تعالیٰ اس موزی کو مبتلائے مصیبت کر دے یا توفیق نیک بخش دے بس اللہ تعالیٰ کے اوپر چھوڑ دے۔ جو لوگ دل کے

اندھے اور طریق اہل اللہ کے منکر ہیں ان کی صحبت میں نہ بیٹھنا۔ ان کی صحبت سے پرہیز کرنا۔ (طالب حق کو چاہیئے کہ کسی مسلمان کو اپنے سے کم درجہ نہ سمجھے شاید حق تعالیٰ اس کو آخر میں توفیق نیک دے دے بلکہ کافر شخص کو بھی (انجام پر نظر کرتے ہوئے) بڑا سمجھے اس لئے کہ اس کا احتمال و امکان ہے کہ وہ دنیا سے مسلمان ہو کر انتقال کرے اور خاتمہ بخیر ہو جائے۔

بزرگان سلف کے کمالات صرف پیشِ عوام بیان کرنے میں مشغول نہ رہے بلکہ اپنے اندر بھی ایک حال پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ مطالعہ احوالِ بزرگان میں یہی منفعت ہے کہ خود بھی جدوجہد کرنے لگے تاکہ بزرگوں والی کیفیت اللہ تعالیٰ اس کو بھی عنایت فرما دے۔ فقط یہ نہ ہو کہ اپنی مغالطت کے لئے ان بزرگوں کا افسانہ بیان کیا جائے۔ صرف افسانہ گوئی سے کام نہیں چلے گا۔

اگر کوئی نماز اتفاق سے قضا ہوگئی تو جب تک اس کو ادا نہ کرے کسی کام میں مشغول نہ ہو۔ کیونکہ نماز ادا کیے بغیر کسی کام میں مشغول ہونا خواست کی بات ہے۔

دلی سالک پر جو کچھ عالم ملکوت سے ظاہر ہو وہ کسی پر ظاہر نہ کرے۔ اپنے ابنائے جنس کے علاوہ کوئی شخص اپنے کو دوست ظاہر کرے تو اس پر کلیۃً مائل و مفتون نہ ہو جائے اس لئے کہ اہل دنیا متکار ہوتے ہیں۔ جب تک کسی کو صادق نہ پائے اور کفش بردار اہل اللہ نیز فرمانبردار اہل اللہ نہ دیکھ لے اس وقت تک کسی سے اپنا راز ظاہر نہ کرے۔

اصل کار یہ ہے کہ اپنا اختیار درمیان سے اٹھا کر اپنے آپ کو اہل اللہ کے سپرد کر دے کہ مقصود حاصل ہو جائے ورنہ مقصود ہرگز حاصل نہ ہوگا۔ اپنے آپ کو بس ایک کارکر دے در دو جگہ سے نیت استقامت نہ رکھے ورنہ کسی جگہ سے بھی فیض نہ پہنچے گا۔

## ابراہیم نظام

عبدالمطیف ارشد

ابو اسحق ابراہیم بن سیار بن ہانی، ہمیری معتزلہ کے امام تھے، اس کا شمار علمِ کلام کے بڑے علماء اور اچھے شاعروں میں ہوتا ہے۔ علومِ فلسفہ میں تبحر حاصل کیا۔ علماءِ طبیعیین اور التیمیین نے جو کتابیں لکھی ہیں ان پر مطلع ہوا، لیکن وہ متقدمین حکماء کا مقلد نہ تھا، بلکہ مخصوص آراء، مالک اور ایک خاص مذہب کا صاحب تھا۔ معتزلین میں جو اس کے پیروکار ہیں ان کو اس کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے نظامیہ کہا جاتا ہے۔

نظام نہایت پاکمال انسان، تیز ذہن، صاف طبیعت، مستقل فکر، وسعتِ اطلاع کے مالک تھے۔ ہر ایک معانی تک پہنچ جاتے اور پھر ان کو عمدہ لفظ اور اچھے بیان کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔

اعتزال میں عقائد کے شاگرد بنے، بعد میں اس سے الگ ہوئے اور ایک مخصوص مذہب کی بنیاد ڈالی۔ کچھ زمانہ بغداد میں زندگی بسر کی اور عالمِ شباب میں چھتیس برس عمر میں وفات پائی۔ وہ جاحظ کے استاد تھے۔

نظام کی دو ظاہر خصوصیتیں تھیں: ادبی اور کلامی۔ ادبی لحاظ سے وہ رقیق اور

باریک معانی میں غوطہ لگانے اور ان کو عجیب و غریب قالب میں ڈھلنے میں معروف تھے۔

**نظام اور خلیل بن احمد** | روایت ہے کہ نظام صغریٰ میں خلیل بن احمد کے پاس آیا۔ خلیل کے ہاتھ میں کاغذ کا پیالہ تھا، خلیل نے

نظام سے کہا کہ اس کی وصف بیان کر! نظام نے پوچھا کہ ”ابجد ح ام ب ذم“، یعنی پیالے کی تعریف بیان کروں یا برائی بیان کروں؟ خلیل نے کہا تعریف کر! نظام نے کہا ”تربیک القذی، ولا تقبل الاذی، ولا تستر ما ولاءھا“، یہ پیالہ تجھے پانی میں تنکا دکھاتا ہے تجھے ایذا نہیں دیتا اور اپنے سے باہر کی چیز کو نہیں چھپاتا۔ خلیل نے کہا اب اس کی برائی بیان کر! نظام کہنے لگا: ”یسرع الیھا الکسر، ولا تقبل الجبر“۔ یہ جلدی ٹوٹ جاتا ہے اور جوڑ کو قبول نہیں کرتا۔ خلیل نے پھر اسے اپنے گھر میں کھڑے ہوئے درخت کھجور کے لئے کہا کہ اس کی وصف بیان کر! نظام نے پھر وہی طرح اور دم کا سوال کیا، خلیل نے دم کے متعلق کہا۔ نظام نے کہا: اس کا پھل میٹھا ہے اس کی منتہا طویل ہے اس کا اوپر کا حصہ عمدہ ہے۔ خلیل نے کہا اچھا اس کی برائی بیان کر! نظام نے کہا: اس پر چڑھنا دشوار ہے، اس کا پھل دھڑ ہے، ایذا دینے والے (کانٹوں) سے لپٹا ہوا ہے۔ یہ سن کر خلیل نے کہا کہ اے بیٹے ہم تو تجھ سے پڑھنے کی طرف زیادہ محتاج ہیں۔

**نظام کی نثر کا ایک عجیب نمونہ** | نظام سے ایک لطیف نثر نقل کی جاتی ہے جس کے جملے چھوٹے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کے سامنے

عبدالوہاب ثقفی کا ذکر چھڑا تو اس کی مدح میں کہنے لگا: ”وہ خوف کے بعد امن، بیماری کے بعد صحت، قحط کے بعد فراوانی، فقر کے بعد آسودگی، محبوب کی طاعت، ہمگین کی کشائش اور وصال اور تروتازہ شباب (ان سب) سے زیادہ شیریں ہے“

**نظام کا کلام** | ایک مرتبہ گرج اور ہوا کی آواز سنی تو یہ دعا کرنے لگے۔ اللھم ان کان عذابا فاصرفه، وان کان صلاحا فزدفیدہ، وہب

لنا الصبر عند البلاء، والشکر عند الرخاء۔ اللھم ان کانت مصلحتہ فمّن علینا بالصمت، وان کان عقابا فمّن علینا بالغفرۃ۔ خداوند! اگر یہ عذاب ہے تو اس کو

پھیر دے اور اگر مفید ہے تو اس کو بڑھا اور ہم کو مصیبت کے وقت صبر اور فراخی کے وقت شکر عطا کر! خداوند! اگر عطا ہے تو ہم پر عصمت کے ساتھ احسان کر! اور اگر عذاب ہے تو مغفرت کے ساتھ ہم پر احسان کر!

سنا اور خود کے متعلق نظام کی رائے

نظام مال و دولت خرچ کرنے میں بڑا ہی جواد تھا۔ بادشاہ کی طرف سے اس کو بہت سی دولت پہنچتی رہتی تھی، اور یہ اس میں سے اپنے لئے صرف کفایت کے طور پر کچھ مال رکھتا تھا باقی سب نیکی میں خرچ کر دیتا تھا۔ اور اس سلسلے میں جب اسے لوگوں کی طرف سے عتاب کیا جاتا تھا تو وہ یہ کہتے تھے ”میرے اوپر مال کا یہ حق ہے کہ میں اس کو اس کے معدن سے طلب کروں اور پھر زائد کو اس کے اہل پر خرچ کروں اور میرا مل پر یہ حق ہے کہ مجھ کو برائی سے بچائے اور میری عزت اس کے خرچ کرنے سے محفوظ ہو جائے۔ یہ تب ہو سکتا ہے جب میں اس کے خرچ کرنے میں غفل نہ کروں۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ مالدار آدمی کو راحت کم اور تکلیف زیادہ پہنچتی ہے۔ اس کا حظ معمولی اور نقصان زیادہ ہوتا ہے، پھر وہ اس حالت میں رہتا ہے کہ بادشاہ اس کو نظر میں رکھے، اہل حقوق اس کو برا بھلا کہتے رہیں اور اقربا رقت کرتے رہیں اور اولاد اس کے فراق کی تاڑ میں ہو“ اسی طرح یہ طویل عبارت چلی جاتی ہے۔

ایک تعزیت کی مجلس میں علاف کے ساتھ

حکایت ہے کہ صالح بن عبدالقدوس کا بیٹا مر گیا۔ ابو الہذیل علاف اور نظام اس کے پاس تعزیت کے لئے گئے۔ لڑکا چھوٹی عمر کا تھا، صالح کو اسس کی جدائی پر بڑا غم تھا۔ ابو الہذیل نے اسے کہا ”مجھے تیری بے صبری کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی“ صالح نے کہا کہ میں اس لئے رورہا ہوں کہ لڑکے نے کتاب الشکوہ کو نہیں پڑھا تھا۔ ابو الہذیل نے پوچھا کہ کتاب الشکوہ کیا ہے؟ صالح نے کہا کہ وہ ایک کتاب ہے جس کو میں نے لکھا ہے، اگر کوئی اس کو پڑھے گا تو ماضی کی چیزوں میں شک کرے گا یہاں تک کہ وہ یہ وہم کرے گا کہ وہ چیز نہ تھی، اور اگر غیر موجود میں شک کرے گا تو اس کو موجود گمان کرے گا۔ یہ سن کر نظام نے کہا فشک انت فی موت ابنک واعمل علی اندہ لہ ریمت

وان مات ، وشك ايضا في انه قد قرأ هذا الكتاب وان لم يكن قراءه - یعنی مجھ کو اپنے بیٹے کی موت میں شک کرنا چاہیے اور یہ فرض کر کہ وہ نہیں مرا ، اگرچہ فی الواقع مر چکا ہے اور یہ بھی خیال کر کہ اس نے کتاب الشکوک پڑھی تھی ، اگرچہ فی الواقع نہیں پڑھی تھی ۔ صلح یہ سن کر چران سارہ گیا ۔

نظام سے یہ کلام بھی مقبول ہے کہ وہ اپنے بعض شاگردوں سے فرما رہے تھے ” اذ كان في جوارك جنازة وليس في بيتك دقيق ، فلا تحضر الجنازة ، فان المصيبة عندك اكثر منها عند القوم وبيتك اولى بالماتم “ یعنی اگر تیرے پڑوس میں جنازہ ہے اور تیرے گھر میں آٹا نہیں ہے تو جنازہ میں مت حاضر ہو ، کیوں کہ قوم کے ہاں تیری مصیبت اس سے بڑھ کر ہے ، اور تیرا گھر ماتم کرنے کے لئے زیادہ سزاوار ہے ۔

نظام لقب سے کیوں مشہور ہوا ؟ | ابراہیم کی ”نظام“ لقب سے مشہور ہونے کے متعلق اس کے اتباع قویہ وجہ بیان

کرتے ہیں کہ وہ کلام کو عمدہ نظم کرنے کی وجہ سے نظام کہلائے گئے اور نظام کے دشمن یہ کہتے ہیں کہ وہ بعرو کے بازار میں مہرے اور کوڑیاں پرتا تھا ، اس لئے اس کو نظام کہا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دقیق معانی کو عمدہ الفاظ میں ڈھالنے والے اور مخصوص طرز کے شاعر تھے ، اس کے اقوال اور اشعار کو دیکھ کر راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لقب نظام کی اصلی وجہ یہ نظم کلام کی وجہ سے ہوئی ہے ، چاہے وہ نثر ہو یا شعر ، اور اگر وہ بعرو کے بازار میں کوڑیوں کو پرونے کا کام بھی کرتا ہو تو یہ کوئی اس کے لئے عیب کی چیز نہیں ہے ۔

### نظام کے کچھ اشعار

یا تارکی جسدا بغیر قواد اسرفت فی المہجران والابعاد  
ان کان یمنعک الزیارة اعین فادخل الی بعلہ العواد  
ان العیون علی القلوب اذا جئت کانت بلیتھا علی الاجساد  
(ترجمہ) اے مجھے جسم بنیر دل کے چھوڑنے والے ، تم جدائی اور دور رہنے میں مدد سے

بڑھ گئے۔ اگر ہا سوں تجھے ملاقات سے روکتے ہیں، تو طبع پر سی کے بہانے ہی میرے پاس آجا۔ تحقیق جب آنکھیں دلوں پر جنایت کرتی ہیں تو اس کی آفت اجسام پر آتی ہے۔ ایک دوسرا شعر ہے۔

هو البدر الان فيه رقائقا      من الحسن ليست في هلال ولا بدر  
وينظر في الوجه القبيح بحسنه      فيكسوه حسنا باقيا آخر الدهر  
ترجمہ:۔ وہ چودہ تاریخ کا چاند ہے مگر اس میں حسن کی دھاریاں ہیں جو کہ ہلال اور بدر میں نہیں ہیں اپنے حسن سے قبیح چہرے کو دیکھتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے حسین رہتا ہے۔

اسی طرح وہ اپنے شعرا و نثر میں فلسفہ پیش کرتا ہے، اس لئے اس کے معانی لطیف اور الفاظ جید ہوتے ہیں۔ نظام کو ابو نواس شاعر پسند آتا تھا، کیونکہ اس کے شعر میں بھی معنوی لطف پایا جاتا ہے اور کبھی کبھی فلسفہ بھی ہوتا ہے۔ ملاحظہ کہتا ہے کہ میں نے نظام سے اس مالت میں کہتے ہوئے سنا جب اس کے پاس ابو نواس کا شعر پڑھا گیا ”اس جوان کے پاس کلام جمع ہوا آپس اس نے احسن کلام کو اختیار کیا“ اس سے وہ ابو نواس کا ارادہ کرتے تھے۔

**نظام وسیع ثقافت کے صاحب تھے** | نظام ادیب، دقیق طبع، باریک معانی والے تھے، اچھی گفتار اس کو پسند

آتی تھی۔ شعرا و نثر دونوں عمدہ کہتے تھے، وسیع ثقافت کے مالک تھے، ادبی ثقافت کے لحاظ سے بہت سے اشعار اور اخبار یاد رکھتے تھے۔ اس کی دینی ثقافت کا یہ عالم تھا کہ مرتضیٰ نے روایت کی کہ ”نظام قرآن، توریت، انجیل اور ان کے تفاسیر پڑھتے تھے۔ احکام اور فتاویٰ میں اس کو وسیع فقہی معرفت تھی۔ ثقافت فلسفہ میں اس نے ارسطو کی کچھ کتابیں پڑھی تھیں اور ان پر رد بھی لکھا تھا۔ جعفر بن یحییٰ برکی نے ارسطو کا ذکر کیا تو نظام نے کہا کہ میں نے اس کی کتاب پر رد لکھا ہے۔ جعفر نے کہا یہ کیسے ہو گا حالانکہ تو اس کو اچھی طرح پڑھ بھی نہیں سکتا۔ نظام اسی وقت اس کتاب کی کچھ چیزیں بیان کرتے گئے اور



ان کو توڑتے بھی گئے۔ اس سے جعفر متعجب ہوا۔

**نظام کی عقلیت اور خلق** | ماحظ نے نظام کی عقلیت کی اچھی تصویر کھینچی ہے۔ وہ دوسرے لوگوں سے اس کو زیادہ جانتا تھا اور اکثر اختلاف رکھتا تھا۔ کتاب الجیوان میں نظام کی صداقت کی اس طرح وصف بیان کرتا ہے:-

”كان ابراهيم مامون اللسان قليل الزلل والزيغ في باب الصدق“ ابراہیم (نظام) محفوظ زبان والے تھے، سچ بولنے میں لغزش اور کج روی نہیں کرتے تھے۔“ اس کے بعد اس کا ایک عقلی دقیق عیب پیش کیا ہے کہ وہ عمدہ قیاس والے اور اچھے استنباط والے تھے۔ لیکن مقیس علیہ میں زیادہ نہیں سوچتے تھے، وہ ایک نلن باندھ کر پھر اس پر قیاس کرتے تھے، اسی طرح ماحظ اس کا یہ عیب نکالتا ہے کہ وہ مسائل میں تلاش و تحقیق سے پہلے جزم کر لیتے تھے اور اس کی صداقت کی وصف کرنے کے ساتھ اس کے حق میں یہ بھی لکھتا ہے ”كان اضيق الناس صدرا بحمل سوء، وكان شرما يكون اذا يؤكدا عليه صاحب السر“ یعنی نظام رازداری کے لحاظ سے تنگ طرف تھا (راز کو فاش کر دیتا تھا) اور اس وقت خاص طور پر افشا کرتا تھا جب راز کرنے والا اس کو چھپانے کی تاکید کرتا تھا۔

**شک اور تجربہ نظام کی نظر میں** | نظام کی عقلیت قوی تھی، جس کے وہ دو بنیادی رکن تھے جن کے باعث یورپ میں موجودہ ترقی ہوئی اور وہ دو رکن ہیں۔ شک اور تجربہ۔ نظام شک کو بحث کی بنیاد قرار دیتا ہے اور کہتا ہے ”الشك اقرب اليك من المجاهد ولہ یکن یقین قط حتی صار قیہ شك ولم ینتقل احد من اعتقاد الی اعتقاد غیرہ حتی یكون بینہما حال شك“

ترجمہ:- شک کرنے والا تیری طرف انکار کرنے والے سے زیادہ قریب ہے، اور تب تک یقین حاصل نہیں ہوتا جب تک اس میں شک نہ ہو، اور کوئی شخص ایک اعتقاد سے دوسرے کے اعتقاد کی طرف نہیں جاسکتا جب تک ان دونوں کے درمیان شک حائل نہ ہو۔

باقی تجربہ کی تو اس نے اس طرح خدمت کی جس طرح آج طبیعی یا کیمیائی اس سے کام لیتا ہے۔ اس کے تجربہ کی ایک عجیب بات یہ ذکر کی جاتی ہے کہ عباسی امراء میں سے محمد بن علی بن سلیمان سے نظام مل گیا اور جانوروں پر شراب کا کیا اثر ہوتا ہے؟ اس تجربے میں اس کے ساتھ شریک ہو گیا۔ انہوں نے بڑے بڑے جانوروں مثلاً اونٹ، سانڈ، گائے، گھوڑے، ہرن اور بکریوں پر بھی یہ تجربہ کیا اور ان کو چھوڑ کر گدھ، کتے، نیو، اور سانپوں پر یہ تجربہ کیا، اس میں جو مالی مصارف ہوتے تھے وہ امیر کی طرف سے ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے شیر پر بھی یہ تجربہ کیا۔

نظام نے زہر مرخ کو آگ اور گرم پتھر کھلانے کا بھی تجربہ کیا۔ اس کے علاوہ وہ عوام کے اہل علم کا بڑا مخالف تھا اور ان پر دلائل سے رد کرتا

بدفالی، خواب، جن وغیرہ کے متعلق نظام کی رائے۔

تھا۔ بدفالی اور خوابوں پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا۔ عرب کے اشعار میں جو جن اور غول کا ذکر آیا ہے اس کا نفیس تجربہ کرتا تھا۔ اس کی تفصیل کے لئے کتاب الحیوان کی طرف رجوع کیا جائے۔

نظام جب کتابوں کے متعلق بات کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ درس کے ایک عجیب منہج اور نصاب پیش کر رہے ہوں۔ اگر کوئی تدبیر کے بغیر بے سود

طالب علم کو رات کے لکڑ ہارے کی طرح نہیں ہونا چاہیے

معلومات ذہن میں جمع کرتا تھا تو اس پر تنقید کرتے تھے، ان کی رائے میں طالب علم کیلئے ضروری ہے کہ وہ حاضر لیل (رات کا لکڑ ہارا) نہ بنے بلکہ اسے مفید معلومات حاصل کرنی چاہیے اور وہ یہ بھی کہتے تھے کہ کتابیں مردوں کو زندہ نہیں کرتیں اور نہ وہ احمق کو عقلمند بناتی ہیں، اور نہ بلید کو ذکی بناتی ہیں، لیکن جب طبیعت میں معمولی بھی صلاحیت ہوتی ہے تو کتابیں اس کو ابھارتی اور تیز کرتی ہیں۔ اگر کوئی ہر چیز کے جاننے کا ارادہ رکھتا ہے تو اس کے اقارب کو چاہئے کہ اس کا علاج کرے۔ اگر کوئی ذکی اور حافظہ رکھتا ہو تو اس کو دو یا تین چیزوں کا قصد کرنا چاہئے اور اپنے حواس کو ہمہ دانی سے دور رکھیں اور بعض علوم کے اندر تخصیص حاصل کرے اور لوگوں کی ضروریات سے غافل بھی نہ رہے۔

نظام کی رائے میں عالم کیلئے دو علم ضروری ہیں، ایک عام یعنی ہر چیز کی کہ اور دوسرا خاص یعنی بعض چیزوں میں خصوصی تجربہ اور مہارت حاصل کر کے اور اس پر مملکت مہاسی کے دور اول میں عقائد میں بڑی بڑی باتیں اور اس مسئلے کی اتنی صورتیں پیدا ہوئیں جو

### نظام اور علم کلام

پہلے علیہ السلام یا صحابہ اولین کے دور میں نہ تھیں۔ اس دور میں ابن بحر سے ایک نئے علم کی بنیاد پڑی جو دوسرے علوم کے ساتھ چلتا رہا اور یہ ہے علم کلام۔ مسلمانوں نے اس علم میں بڑا خوش براہتمام کیا، کیوں کہ اس کا تعلق جہل لمحدوں، فلسفیوں اور زندیقوں سے تھا۔ معتزلہ ان سب فرقوں میں اہم تھا جس نے علم کلام میں بحث، مباحثہ کر کے مسائل کو پیدا کیا اور شرح کا بسط کیا اور اصول معتزلوں کے پانچ متفقہ اصول ہیں جن کے ماننے پر سب کا اتفاق رہا ہے۔ اور ان کے بعض قائلین کے کچھ مخصوص اصول بھی ہیں۔

عام اصول ہیں کے بیان پر قریباً سب مؤرخین متفق ہیں وہ پانچ ہیں :

(۱) توحید (۲) عدل کا قائل ہونا (۳) وعدہ وعید کا قائل ہونا (۴) ایمان اور کفر کے درمیان ایک درمیانی مرتبہ (فستی) کو ماننا (۵) نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا۔

تیسری صدی ہجری میں معتزلین کا ایک قائد غیاث نامی کہتا ہے کہ ان میں سے کوئی اعتراض کے نام کا مستحق نہیں ہو سکتا جب تک ان مذکورہ پانچ اصولوں کا قائل نہ ہو، جب کسی میں یہ سب باتیں پائی جائیں گی تو وہ معتزلی ہے۔

علم کلام، علم جہل اور مناظرہ کی بنیاد رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اور وہ ایک ایسے پہلے دروازے اور منفذ کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے مسلمان فلاسفہ یونانی فلسفہ کی طرف داخل ہوئے کیونکہ معتزلہ نے سب سے پہلے یونانی فلسفہ سے مدد حاصل کی نظام، الہانیدل اور جاحظ وغیرہ کے بہت سے اقوال ایسے ہیں جن میں کچھ تو براہ راست

فلاسفہ یونان کے اقوال سے منقول ہیں اور بعض ایسے ہیں کہ جن میں ان کی طرف سے کچھ اعتدال پیدا ہوا ہے۔

## نظام کا دہریوں پر رد

نظام نے اسلام کی طرف سے دفاع کا بڑا اہتمام کیا اور متعدد کی تردید کرتا تھا اپنی عمر کا ایک حصہ متعددوں اور دہریوں کی تردید کیلئے مخصوص کیا تھا۔ نظام کے زمانے میں یہ ایک فرقہ جو کہ عراق وغیرہ میں پھیلا ہوا تھا ان کا کسی بھی دین پر ایمان نہیں تھا۔ اور نہ اللہ کا اقرار کرتے تھے۔ یہ فرقہ صرف محسوس پر ایمان رکھتا تھا، اس عالم مادی کے علاوہ کسی دوسرے عالم کو نہیں مانتے تھے۔ ان کی نظر میں قیامت، ثواب اور عقاب کوئی چیز نہ تھی ان کو دہر کی طرف نسبت کرتے ہوئے دہریہ کہا جاتا ہے اور یہ نام قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ تھا: وَقَالُوا آتِیْنَا بِالْحَیَاثِ الدُّنْیَا نَمُوتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْیِلُکُمْ اِلَّا اَللّٰهُ

یہ فرقہ عالم کے قدم اور ابدیت کا قائل تھا اور ان کی نظر میں جہان کے اندر جو چیز بھی پیدا ہوتی ہے وہ طبعی قوانین کے ماتحت ہوتی ہے۔ آج کے دور میں جن کو مادی یا طبعی کہا جاتا ہے قدیم دہری ان کے زیادہ مشابہ اور قریب تھے۔ یونانی فلاسفہ سے لے کر قدین وسطیٰ کے فلسفیوں تک اس فرقے کی مسلسل تردید کی جاتی ہے۔ اور معتزلہ بھی اسی طرح دہریوں پر رد لکھتے تھے۔ معتزلہ کا سرد گروہ نظام تھا اور بنے دور میں اس کی ابتدا جمال الدین افغانی سے ہوئی جس نے دہریوں کی تردید میں ایک رسالہ لکھا۔



# سندھی علماء کی قلمی کتابیں

## کتابخانہ آصفیہ سینٹرل لائبریری حیدرآباد دکن

### سناوت مرزا

محمد ہاشم سندھی التتوی - (۱۱۰۴ھ) مدفن مکی، (سندھ) تلمیذ محمد دم  
ضیاء الدین، عالم متبحر - ترویج و تبلیغ کی خاطر نادر شاہ اور احمد شاہ کو خطوط لکھے تھے  
آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۵۰ ہے۔ (ملاحظہ ہو تحفہ مقالات اشعار ص ۵۲، حاشیہ طبعیہ)  
۱۲۴ تا ۱۳۸ (۵۱ صفحات) عربی،  
۱۔ رفع الغطار: محمد ہاشم سندھی التتوی  
فن..... قلمی حسن تصنیف ۱۱۴۶ھ

تالیف: سنۃ الف ومارۃ دست واربعمین من الهجرة النبویة -  
"انعام الرداء علی العمامة فی الصلوة سنۃ" والی القاء علی الکفین فیہا مکرود یعنی  
بوقت نماز عمامہ پہننا چاہیے اور کندھوں پر مکرود ہے۔  
ماخذ: احادیث و اقوال فقہاء کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم  
حدیث النور بن سمان رحمہ، جوامع سیوطی وغیرہ۔

۲۔ عقائد السنیہ و فضائل الصحابہ رحمہ  
مصنفہ محمد ہاشم بن عبد الغفور سندھی  
التتوی (قلمی)

### ۳۔ رسالہ کشف الغطاء (عربی) | تقطیع متوسط، صفحات ۱۵۲ تا ۲۱۸ | تالیف ۱۴۲۲ھ

موضوع : کیا اسلام میں نوحہ و بکا (اتم) جائز ہے ؟ اتم کی رسم کب شروع ہوئی۔ اس کی پوری تاریخ ہی مع ادوار لکھ دی ہے۔  
تالیف : سنۃ الف و مائۃ و اثنین و اربعین من الهجرة (۱۴۲۲ھ) سمیتھا کشف الغطاء مما یحیل و یخرج من النوح و البکا۔

اسی کتاب کے صفحہ ۲۰۵ پر ایک عنوان "تنبیہ حسن" فی ذکر مبداء آفاز الافئذہ یوم عاشوراء مائتا و مناعاً مما یشیقن ان یسلم انه قد ذکر السلاۃ الیافعی فی تاریخ المسلمین برأۃ الجنان ان فی سنۃ اثنین و خمین و ثلث مائۃ (۱۳۵۲ھ) فی یوم عاشوراء الزم معز الدولۃ اهل یفساد النوح و الماتم۔ و امر بغلق الابواب و علی فیہا المسح و عمل اللباغین من عمل الاطمرت۔

(غرض : نوحہ و ماتم گناہ کبیرہ ہے۔)

مأخذ : ابن تیمیہ، منہاج السنۃ۔ مشارق شرح مشکوٰۃ۔ زواجر ابن برکلی۔ ابن ہاجر، اقوال امام احمد رح۔

۲۔ مخطوطہ | تقدیر کا لیں از داج مطہرات : محمد ہاشم بن عبد الغفور بن عبد الرحمن ہندی توتوی (از داج مطہرات کے مہر کی تعداد کیا تھی ؟)

اصفحات، فارسی، تصنیف ۱۴۱۰ھ۔

آغاز : الحمد للہ و مدۃ و الصلوٰۃ والسلام علی من لا نبی بعدہ۔ اما بعد می گوید ندۃ ضعیف محتاج محمد ہاشم بن عبد الغفور بن عبد الرحمن ہندی توتوی کہ این رسالہ ست در بیان کابین ہائے از داج مطہرات حضرت پیغمبر خدا ﷺ۔

شروع نمودہ شد و در سہ بتاریخ ششم از شہر وجب الحرام از سنۃ الف و مائۃ و ای و سبعین از ہجرت۔ و نام نہادہ شد از :

اب کا صبح نام :- تحفۃ المسلمین فی تقدیر مہم امور اہل المؤمنین (رضی اللہ عنہم)

گیارہ ازواج مع اسمائے افواج شریف - ہرقہ - فائدہ سے شروع ہوتا ہے  
بطریق سوال و جواب -

خاتمہ : در بیان تقدیر کابین بی بی فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا۔  
ماخذ : خزائن الروایات ، سیرت شامیہ ، ریاض علام زرقاتی وغیرہ  
اکثر اہل بلاد سنہ عادت گرفتہ اند کہ عقد و نکاح ہائے خود بمقابلہ کابین چہار صد  
مقال فقہی بندند تا موافق شدن کابین بی بی زہراء بلا خلاف دیہ کابین بی بی  
خدیجہ کبری - بموجب یک روایت - و ہوسجائز

مصنفہ محمد ہاشم تنویری قلمی  
حدیث عربی - ۹۶۹ - (آصفیہ)

## ۵۔ الاحادیث الاربعین علی طریق حروف التہجی

۶۔ حصر الشارح  
مصنفہ محمد عابد بن احمد علی السندی - حدیث عربی ، قلمی  
۹۷۳ (کتبخانہ آصفیہ) خط نسخ ملا ۵۳۱ و بخط معمولی تا  
صفحہ ۱۳۰ ، سطر ۱ - سطر ۱۳ -

موضوع : اسانید حدیث -

تمہید : فیقول انقر عباد اللہ - محمد عابد بن احمد علی السندی تاب اللہ علیہ  
بعض طلبۃ الحدیث سألونی ان اخص لهم شیئاً من اسانید ، فی المکتب المعبرۃ و  
كنت لم اجد عن مسألتهم مہرباً - فاستخرت اللہ فی حصر بعض ما عمل بہ منہ و استعنت  
بہ ہونیر مستعان و علیہ السلام - ولما کان کتاب اللہ تعالیٰ مقدماً لم یعنی الا ان  
اذکر الاسانید فی بعض القراءات ، ثم رتب الباقی علی حروف البعجم لیسہل مراجعۃ  
للباحث و لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم -

بن کتابت و نام کتاب : ..... ہذا الکتاب فی شہر صفر المنظر فی السبلہ  
اورنگ آباد (وکن) فی عہد النواب ناصر الدولۃ خلد اللہ ملکہ علی ید احقر العباد حسن  
بن السید جمال الدین و کتبۃ الولدین اطال اللہ عمرہما ، السید ظہور الدین احمد  
السید فخر الدین احمد - بقاہما اللہ تعالیٰ آمین یا رب العالمین - ۱۳۷۱ ھ - یوم الاثنين آخر

مصر فی نظامت النواب قاسم یار جنگ بہادر۔

بعض اقوال : قال شیخنا قرأت بہا جمیع القرآن العظیم من فاتحہ الی خاتمہ علی شیخنا الامام الہمام مقتدی الانام شیخ محمد ہاشم بن عبد الخور بن عبد الرحمن السندی الہتوی قال شیخنا قرأت بہا علی والدنا وشیخنا الحافظ الامام المحقق ولی اللہ العارف شیخ محمد ربوبی محمد یعقوب بن محمود الانصاری السندی۔

۷۔ وسیلۃ الوصول الی جناب الرسول | محمد محسن بن قاضی محمد اکرم سندی تصنیف ۱۱۷۷ صفحہ ۵۱۶۔ (۳۸۷ تا ۳۸۹)

معرفی : ناقص الاول غالباً ایک ورق غائب ہے ، بڑی جامع کتاب ہے۔

موضوع : مسئلہ شفاعت نبوی ﷺ

تہنید : نام مصنف ، قاضی کثیر المعاصی راہی الی شفاعت نبی ۔ محمد محسن بن قاضی محمد اکرم ربابہ محسن توفیقہ ۔ مرشدی محمد الہاشم سلمہ اللہ تعالیٰ ۔  
ترتیب : این نسخہ و تالیف این صحیفہ اعداد وسیلہ شفاعت سید المرسلین است ، نہ توقع تحسین از ناظرین ۔ بیت ۷

اَنْتَ شَافِعِنِّیْ وَ مَسْکُوْفِی الْیَتِیْمَ اَلْفَ صَلَواتِیْ وَسَلَواتِیْ عَلَیْکَ

باب فی فضائل الصلوٰۃ ۔ (پانچ فصل) ۷

مرویات فاروق ربہ پانصد و ستر و نہ حدیث است ۔ (۲۸۷ ص ۲۸۸)

خاتمہ | قال الفقیر الضعیف محمد محسن بن قاضی محمد اکرم بن المرحوم قاضی سلیمان غفر اللہ لہ و لوالدیہ بکرمہ و فضلہ ان ہذہ الوسیلہ قد تم بعون اللہ و من توفیقہ یوم النخیس تاسع عشر من شوال سنۃ سبعین و مائۃ و الف ۔ الحمد للہ علی التوفیق للاتمام ۔ و ہذہ النسخۃ الّتی صنفہ و سمیہا "وسیلۃ الوصول الی جناب حضرت الرسول صلی اللہ علیہ وسلم"۔

نوٹ :- مصنف کا قلمی نسخہ معلوم ہوتا ہے۔



عربی - (قلی) ، جامع آصفیہ  
تالیف قبل ۱۱۸۸ م بخط نسخ

## ۸- مجموعه سبعه رسائل ابی الحسن سندى المدنى

تقطیع ۹ x ۹ (مهر، فخر الاسلام خان ۱۱۸۸ م) صفحات ۱۲ - سطر ۲۱ - کاغذ بادامی ،  
سیاهی روشن -

موضوع : آنحضرت ﷺ پر وحی کا نزول کب ہوا ؟ -

ماخذ : بخاری ، مسلم ، ابی داؤد ، ترمذی ، نسائی ، ابن ماجہ ، دارمی ، مالک ، رحمہ  
خاتمہ : فتل رسول اللہ ﷺ پر الطہور مارا ، والحل میتہ - ناقص الآخر -  
رسالہ ۲ - الذشاة الرضیة واثماکل الرضیة - ۱۱ صفحات - سطر ۲۳ نسخ - (مهر، فخر  
الاسلام خان)

ابتداء : الحمد للہ الذی اطلع ہد النبیة والرسالة وكشف یہ ظلمات ابی وکجالة -  
خاتمہ : بجاہ حبیبک علیہ الصلوۃ -

۳ - رسالۃ فی المغازی - ابی الحسن سندى المدنى ، عربی - تالیف قبل ۱۱۸۵ م - ۱۱ صفحہ  
بخط نسخ - موضوع : غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم -

آغاز : الحمد للہ خالق القدر والقوی المنعم - غزوة ودان تا غزوة تبوک -  
خاتمہ : قد قد جہا للچ الوداع من مکة بعد اتمام الناسک متوجہا الی طیبہ -  
سن کتابت : حرر فی احشرین من رمضان ۸۸۰ھ -

۴ - رسالۃ فی فضل الايمان - ۹ صفحات - سطر ۲۳ (موضوع : فضیلت ایمان) -  
آغاز : الحمد للہ الذی من علیتنا بنعمۃ الاسلام الخ -

خاتمہ : تفاصيل هذه الاحکام الشریفة مبسوطۃ فی المطولات الخ

۵ - رسالہ حلم وغیرہ - ۵ صفحات ناقص الآخر -

آغاز : الحمد للہ الذی ارسل الینا رسولاً مجیداً الخ

فیقول العبد حافظ الموسی بن محبت بن احمد السندی الحاکم لپدی الملتانی ثم المدنی -

۶ - فی الخلق والکسب - ابی الحسن سندى - ۱۷ صفحات - (موضوع : قضاء و قدر)

آغاز : الحمد للہ الذی خلق کل شیء قدرہ تقدیرا ۔ باب اول : قول الجبریتہ الجبریتہ ۔ سرخی : نسخہ بخط مؤلف دام مجیدہ و فضلہ ۔

ماخذ : ابن حجر الشیخی شرح الاربعین للامام محمد وغیرہ ۔

رسالہ ۷۷ - انباء الانبیاء (۶۶ صفحات) (۴۷ تا ۵۹ اوراق)

موضوع : حیات انبیاء و اولیاء و شہداء رحمہ ۔

آغاز : سبحان من عارت العقول فی بعض مخلوقاته ۔ ابو الحسن نقشبندی ،

سندی مدنی ۔ فی مسئلہ حیات الانبیاء و الشہداء ۔ من تحقیقات الاکابر سمیتہ " انباء الانبیاء فی حیات الانبیاء "

خاتمہ : ولذ لک نص الامام اشعرائی علی ان لا یراد حقیقتہ الامن انکشف عن قلبہ

الف مجاہد ۔ سن کتابت موجود نہیں ۔ ( مہر ۱۱۸۸ھ )

۸ - کلمۃ التوحید ۔ ۱۴ صفحات ۔ لا اِلٰه الا اللہ ما اعظم شانہ ۔ ابو الحسن سندی ۔

انی قد عثرت علی کلام تعلق بکلمۃ التوحید ۔ کتابت ۱۱۸۵ھ ۔ دو مہری بنام دفرالدین

خان بہادر و فخر الاسلام خاں ۔

۱۰ - رسالہ بسملہ و رسائل متعددہ ۔ مصنفہ ابو الحسن بلکری ۔ ( قلمی ) ۸۸۰ مجامع ۔

کتب خانہ آصفیہ ، حیدر آباد دکن ۔

۵۴۲ صفحات ۔

۹ - تلخیص الکلام .... نوع الصیام

مؤلف ہایت اللہ بن محمد اکرم معروف بہ محمود

سندی التقتوی ۔

نوٹ : ترتیب : خاں مؤلف قاضی محمد اسماعیل متوفی ۱۲۸۶ھ کہ واعظ کامل و فاضل

ن بود ، بعد وفات ۱۳۰۰ھ جمع نمود ۔

ماخذ : ایک سوچہ تفاسیر عربی و فارسی سے مدولی قراب مراد علی خاں والی سندھ

تفسیر پر غایت فرمائی تھی ۔

نوٹ :- کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں اس کے تین نسخے نمبر ۵۴۲ ، ۵۴۳ ، ۵۴۴ موجود ہیں ۔

تحریر قلمی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔  
 ۱۰۔ مخطوطہ حزب البحر | کتب خانہ خاص انجمن ترقی امد و پاکستان میں کتب خانہ دومحمد عمر

ایانہ حیدر آباد کے کتب خانہ میں مشہور و معروف کتاب حزب البحر کا ایک قلمی نسخہ ہے جس میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی قلمی تحریر اور اجازت نامہ بھی ہے جو اپنے کسی شاگرد و مرید کو دیا تھا۔ ہم یہاں بعض اقتباسات درج ذیل کرتے ہیں :

ابتداء : سرخ روشنائی احزاب کی تفصیل ہے مگر درمیانی عبارتیں کرم خوردہ ہیں۔

این احزاب مصنف است کہ شرح ..... ضبط کردہ ۔

حزب اول ..... حزب دوم ..... حزب پنجم ..... حزب ششم ....

حزب ہفتم .... حزب ہشتم ..... حزب نہم .....

ایک حوالہ : شفاء قاضی عیاض ..... فارغیط ۔

حاشیہ پر سیاہی ہے : ان اسی فی القرآن محمد ..... انجیل احمد و فی التوراة احمد

انوار جلد ۵

..... اسائیت آمدہ ۔

صد فرمودہ حضرت شاہ حبیب اللہ کہ بزرگے از مردم شاہبہرمان آباد بود ، بغرض حصول مطالب و آرب و برآمدن مقاصد ہدما و دیدن صلاح حال خود در ( روایت مسکوت رسیدہ است ) : پرخیز و تبعوذ گریز شیطانی در کیف حضرت رحمن گریز و ۔ وبعد وضوئے کامل چہار رکعت نفل گزارہ و در ہر رکعت سورۃ فاتحہ یک مرتبہ ، و سورۃ اذا جاء نصر اللہ الخ پنج مرتبہ و بعد سلام صد مرتبہ یا من لا یحتاج الی البیان والتفسیر بخضوع باطن بر زبان انکسار آرد بعد رکعت استخارہ و در ہر رکعت بعد فاتحہ آیۃ الکرسی یک مرتبہ و سورۃ کافرون چہار مرتبہ و تسبیح مرتبہ قطب ہو اللہ و قطب الجواد بخواند و بعد سلام پنج حرف کہ گفت و گئے دنیا بر زبان نراند ۔ و صد بار بحد و صد بار استغفار و کلمہ تحمید و کلمہ تہلیل صد صد بار خواندہ حاجت و درخواست ، و بظاہر و باطن بحافظہ حقیقی بتائید او تعالیٰ حاجتش بر آرد و مخفزش نگاہ دارد ۔ و ہر چہ در خواب بیند از نخل تعبیر آن شرطاطلاع نال کار بیند اما صلاح از حضرت امام عظیم بہشت رطل است ، و نزدائتہ ثلاثہ و امام الہی



# شاہ ولی اللہ کے حالات

شاہ عبد العزیز کی زبانی

حکیم محمود حسد بکاتی

شاہ ولی اللہ دہلوی کی ایک جامع و مبسوط سوانح حیات محققانہ اور جدید اسلوب پر ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔ "حیات ولی" کے اولین مآخذ تو خود شاہ صاحب ہی کی تحریریں ہوں گی۔ "انفاس العارفین"، "فیوض الحوین"، "الذرائع الثمین" اور "الانتباه فی سلاسل اولیاء اللہ" و "اسانید وارثی رسول اللہ" میں بہت سا مواد مل جائے گا۔ "الجزء اللطیف فی توجہ العبد الضعیف" کے نام سے تو ایک رسالہ ہی شاہ صاحب نے اپنے احوال و سوانح کے طور پر تحریر فرمایا تھا۔ اس کے بعد سب سے زیادہ اہمیت "القول الحبلی فی مناقب الولی" کی ہے جو شاہ صاحب کی حیات ہی میں ان کے نسبتی بھائی، دوست ہم درس، شاگرد اور خلیفہ شاہ محمد عاشق پھلتی نے تحریر فرمایا تھا۔ خود شاہ صاحب نے "الجزء اللطیف" میں اس کا ذکر فرمایا ہے۔ (مطبع احمدی، دہلی، ص ۱۹۴) یہ رسالہ انیسویں صدی کے اواخر تک تو دستیاب تھا، نواب صدیق حسن خان اور مولوی رحمان علی نے اپنی کتابوں میں اس سے اقتباس و استفادہ کیا تھا۔ مگر اب عرصے سے نایاب ہے۔ "حیات ولی" کے مؤلف مولوی جیم بخش دہلوی کو بھی نہیں ملا تھا۔ (حیات ولی، طبع

لاہور۔ ص ۳۹۳) یہ رسالہ اگر کہیں سے دریافت کر لیا جائے تو ایک معتبر و معتد اور نسبتاً بسیط تذکرہ ہوگا۔ شاہ محمد عاشق ہی کی ایک تحریر "مغنیہ الخشیہ" (مطبوع ڈابھیل) کے آغاز میں ہے وہ بھی مفید و بکار آمد ہے۔

اس کے بعد میرے خیال میں بڑی اہمیت شاہ عبدالعزیز کے ان اقوال و بیانات کی ہے جو ان کے ملفوظات میں پائے جاتے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز کے آخری چند سالوں کے ملفوظات ان کے ایک حاضر باش مسترشد نے ۱۳۳۳ھ میں مرتب کیے تھے اور ایک ارادت کیش قاضی بشیر الدین میرٹھی نے ۱۳۵۲ھ میں پہلی بار مطبع مجتبیٰ (میرٹھ) سے شائع کیے تھے۔

جامع کا نام معلوم نہ ہونے کے باوجود ہماری رائے میں ان ملفوظات کی نسبت شاہ صاحب کی طرف بالعموم صحیح ہے کیونکہ اولاً تو مطبوعہ نسخے کے علاوہ ایک قریب العہد مخطوطہ بھی پیش نظر ہے اور ہم نے دونوں کا زیادہ تر مقامات سے مقابلہ کر لیا ہے۔ ثانیاً ملفوظات کے اکثر مشتملات کی دوسرے مآخذ سے بھی تصدیق و تصویب ہوتی ہے جیسا کہ ہم نے حواشی میں حسب ضرورت اس کی صراحت کر دی ہے، مؤلف کی دیانت کا ایک ثبوت یہ ہے کہ جب بھی کسی ملفوظ کو بروقت قلم بند نہیں کر سکے ہیں انہوں نے اس کا اظہار کر دیا ہے۔ مثلاً ایک مقام پر نصف ملفوظ نقل کر کے بقیہ نصف نقل کرنے سے پہلے لکھتے ہیں :

لفظ افسوس ہے کہ مسترشد کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ ناشر کا بیان ہے کہ نسخے کی بوسیدگی اور کرم خوردگی کی وجہ سے جامع ملفوظات کا نام پڑھانہ جاسکا۔ مگر ہمارے سامنے ملفوظات کا ایک اور مخطوطہ بھی ہے اس میں بھی نہ جامع کا نام ہے نہ کتاب کا۔ البتہ سن کتابت ۱۲۵۵ھ درج ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ نسخہ شاہ عبدالعزیز کے وصال (۱۲۳۹ھ) کے صرف گیارہ سال بعد کا مکتوبہ ہے۔ یہ نسخہ مولانا سید نذر علی درد کا کوروی (مقیم کراچی) کی ملک ہے۔

ازین جا این قصبہ بعد سہ ماہہ بموجب یہاں سے اس قصبہ کو تین ماہ کے  
یا خود کہ با اعتماد آن سفیدی گذاشتہ بعد لکھتا ہوں اپنے حافظہ کے پھر وہ  
یوم، نوشتہ ام - (ص ۱۰۸) پر - میں نے یہاں جگہ چھوڑ دی تھی۔  
اس سے معلوم ہوا کہ وہ ہر ملفوظ کو بروقت لکھ لیا کرتے تھے۔

ایک مقام پر شاہ صاحب کی ایک تاریخی تحقیق کا صرف علامہ نقل کیا ہے :  
این وقت بسبب ضیق فرصت تعلم اس وقت فرصت نہ ہونے کی وجہ  
نمی آید مگر یاد است - انشاء اللہ العزیز سے پوری گفتگو نہیں لکھ رہا ہوں مگر  
بشرط فرصت و یاد خواہم نگاشت - گفتگو یاد ہے - اللہ نے چاہا تو بشرط  
(ص ۹۷) فرصت و یاد لکھ دوں گا لے

اس سے بھی اس قیاس کو تقویت ہوتی ہے کہ جامع دن کے دن ہر بات لکھ  
لینے کا اہتمام کرتے تھے۔

یہ ضرور ہے کہ ملفوظات کے انداز بیان سے جامع کے صاحب علم ہونے کا  
ظہار نہیں ہوتا - انداز بیان علمی و ادبی نہیں ہے - زبان (فارسی) مقامی اور غیر معیاری  
تو ہے ہی مگر غلط سے بھی خالی نہیں ہے۔

علمی ذوق کے فقدان ہی کے نتیجہ میں زیادہ تر اشعار، لطیفے اور قصص و حکایات  
نقل کیے ہیں - علمی موضوعات پر جن تعابیر کو نگاہیں ڈھونڈتی ہیں وہ نہیں ملتیں تھیں  
حالانکہ شاہ صاحب کی مجلس میں زیادہ دینی و علمی موضوعات معرض کلام میں آتے ہوں گے۔  
اور شاہ صاحب ان پر دائرہ تحقیق دیتے ہوں گے - جامع کو اگر علمی ذوق ہوتا تو وہ ان  
تقریروں کو محفوظ کر لیتے اور آج ہمارے لئے یہ سرمایہ منفعت بخش ہوتا۔

بعض ملفوظات کی صحت نسبت کو تسلیم کرنے کی اجازت ہماری عقیدت کسی طرح

لے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یاد نہیں رہا یا فرصت نہیں ملی کیونکہ بعد  
میں بھی یہ اصل ملفوظ کتاب میں نہیں ملتا۔

نہیں دیتی۔ مثلاً صفحہ ۶۲ کا مکالمہ اور صفحہ ۶۶ کا شعر اور صفحہ ۵۵ کی حکایت۔ شاہ صاحب کے وقار و ثقاہت اور ان کی بزم کے تقدس و شائستگی سے اس قسم کے فحش لطائف اور عامیانه اشعار کا کوئی میل نہیں ملتا۔

بہر حال شاہ ولی اللہ کی سوانح کیلئے یہ کتاب ایک اہم ماخذ ہے۔ کتاب میں جہاں جہاں شاہ ولی اللہ کا ذکر ہے ہم نے اسے ایک ترتیب سے جمع کر لیا ہے۔

تاریخ ولادت و وفات : تاریخ تولد شاہ صاحب کی تاریخ ولادت چہار

شاہ ولی اللہ چہارم شوال و چہار شنبہ شنبہ ۱۱۱۱ھ ہے اور تاریخ

۱۱۱۱ھ بود۔ تاریخ وفات " او بود امام اعظم دین " وفات " او بے ولی روزگار رفت " سے

دین " دیگر " ہائے ولی روزگار رفت " بست نہم محرم وقت ظہر۔ (ص ۴۰)

شاہ صاحب کا حافظہ : مثل والد

ماجد حافظہ ندیدہ ام (ص ۱۱)

شاہ صاحب راجپوتانے میں ہنگامہ

سفر مکہ معظمہ حضرت والد ماجد را در سفر مکہ معظمہ حضرت والد ماجد را در

ملک راجپوتانہ ثبوت پیوست کہ یک ملک راجپوتانہ ثبوت پیوست کہ یک

کھٹل مثل کچھوہ خورد بود از جہت زہر کھٹل مثل کچھوہ خورد بود از جہت زہر

رنگ سبز نظر می آید ہر کہ نیش می زد رنگ سبز نظر می آید ہر کہ نیش می زد

می مرد۔ (ص ۳۳)

سیدنا حسن کا قلم : چون والد

ماجد بکہ معظمہ رسید حضرت امام حسن را

بخواب دید کہ چادرے بر سر انداختند و

نے (شاہ صاحب کے) سر پر ایک چادر

حافظہ ہو " الجزء اللطیف " مطبع احمدی ، دہلی ، ص ۱۹۳ ۔



قلم عنایت کر دند و فرمودند یہی قلم  
حبہ من است۔ بعد ازان فرمودند  
باش کہ امام حسین ہم بیاید۔ چون آمدند  
قلم تراشیدہ بدست والد ماجد  
داوند۔ در آن وقت حال نسبت  
و سلم و تقریر دیگر گون شد۔ چنانچہ  
مستفیضان سابق ہرگز احساس  
نسبت سابق نمی کردند  
(ص ۸۲، ۸۳)

ڈالی اور ایک قلم عنایت کیا اور فرمایا  
یہ میرے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قلم  
ہے۔ اس کے بعد فرمایا ٹھہرو! امام  
حسین رضہ تشریف لارہے ہیں۔ جب  
وہ تشریف لائے تو انہوں نے قلم کو  
تراش کر والد ماجد کے ہاتھ میں دیا،  
اُسی وقت سے نسبت باطن، علم اور تقریر  
کارنگ آنا بدل گیا کہ جن لوگوں نے پہلے  
استفادہ کیا تھا وہ سابقہ نسبت کا احساس  
نک نہیں کرتے تھے۔

جو پڑھا لکھا تھا ..... میرے والد صاحب نے مدینہ منورہ  
پدر من وقت رخصت از مدینہ از استاد سے رخصت ہوتے وقت اپنے استاد

لے قیوم الخیرین مطبع احمدی، دہلی، ص ۲۱ :

”میں نے۔ امیر المومنین کی رات میں خواب دیکھا کہ گویا حسن و حسین رضی  
اللہ عنہما میرے گھر تشریف لائے ہیں اور حضرت امام حسن کے ہاتھ میں ایک قلم  
ہے جس کی نوک ٹوٹ گئی ہے، آپ نے مجھے بخشنے کیلئے ہاتھ بڑھایا اور فرمایا یہ  
ہمارے نانا رسول اللہ ﷺ کا قلم ہے۔ پھر فرمایا ٹھہرو تاکہ حسین رضہ اسے ٹھیک  
کریں، یہ قلم دلیسا نہیں ہے جیسا حسین نے اسے بنایا تھا پھر حسین رضہ نے لیا اور  
بنادیا اور مجھے عنایت فرمایا جس سے میں خوش ہوا۔ اور ایک چادر جس پر ایک سفید  
دھاری تھی اور ایک سبز ان دونوں کے سلنے لاکر رکھی گئی حضرت حسین رضہ نے  
وہ چادر اٹھائی اور فرمایا یہ میرے نانا ﷺ کی چادر ہے اور مجھے اڑھا دی۔ میں نے اسے سر  
پر رکھ لیا اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اور پھر میں خواب سے بیدار ہو گیا“ (ترجمہ)

خود عرض کرد و ادخوش شد کہ ہرچہ  
خواندہ بودم فراموش کردم الا علم دین  
یعنی حدیث سے (ص ۹۳)  
سند حدیث : چارہ نہ  
ماہ در حرمین بودہ و سند کردہ - بعض جا  
استادی فرمود معنی دین حدیث تو  
بفرما و در سند اہانت نوشتہ ، سند  
از من کرد اگرچہ بہ از من ہست -  
(ص ۹۳)  
سے عرض کیا جس سے وہ خوش ہوئے  
کہ میں نے جو کچھ پڑھا لکھا تھا ، علم دین  
یعنی حدیث کے علاوہ سب بھلا دیا۔  
والد ماجد چودہ مہینے حرمین میں  
رہے اور سند حاصل کی۔ بعض مقام پر  
استاد فرماتے تھے اس حدیث کے معنی  
تم بیان کرو اور سند میں لکھا کہ انہوں  
نے عہد سے سند حاصل کی ہے اگرچہ یہ  
مجھ سے بہتر ہیں۔

۱۔ "انسان المعین فی مشائخ الحرمین" مطبع احمدی دہلی ، ص ۱۹۲ :  
ابن قیوم برائے وداع نزدیک شیخ ابوطاہر رفت اپنی میت پر خواندہ  
تسبیح کلّ طریقی گفت الحمد للہ  
(ترجمہ : میں اب تک جتنے بھی راستوں سے واقف تھا انہیں سب لچکا بھول کر  
وہ راستہ یاد ہے جو تمہارے تک مجھے پہنچاتا ہے۔)  
بجو شنیدن آن بکار شیخ غالب آمد و بغایت متأثر شد :  
شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم بن حسن گروی مدنی (۱۰۸۱ - ۱۱۴۵ھ) شاہ صاحب نے  
مدینہ منورہ میں زیادہ تر استفادہ اور استفادہ انہی سے کیا تھا۔ "انسان المعین" میں  
شاہ صاحب نے ان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔  
۲۔ شاہ صاحب ۸ ربیع الثانی ۱۱۴۵ھ کو دہلی سے روانہ ہوئے تھے رسید احمد  
ولی اللہ تادیق الاحادیث (ص ۸۷) ۹ رجب ۱۱۴۵ھ کو واپس دہلی پہنچے (الجزء اللطیف  
ص ۱۹۳) اس طرح کل اٹھائیس مہینے سفر میں گزرے۔ ان میں سے تقریباً سات  
سات مہینے آمد و رفت میں گزرے اور چودہ مہینے حرمین میں حاضری رہی۔

**تقسیم کار :** حضرت والد ماجد انہر  
ایک فن شخصے تیار کردہ بودند۔ طالب  
ہر فن باوے می سپروند و خود مشغول معارف  
نویسی و گوئی می بودند و حدیث می خوانند  
بعد مراقبہ ہرچہ بکشف می رسید می  
نگاشتند۔ مریض ہم کم می شدند۔  
عمر شریف شصت و یک سال و چہا  
ماہ شد۔

حضرت والد ماجد نے ہر فن کیلئے ایک  
شخص (شاگرد) تیار کر دیا تھا اور ہر فن کے  
طالب علم کو اس کے فاضل کے سپرد کر  
دیتے تھے اور حقائق و معارف بیان کرنے  
اور تحریر کرنے میں مشغول رہتے تھے حدیث  
پڑھتے تھے اور مراقبہ کے بعد جو کچھ کشف  
کے ذریعہ معلوم ہوتا تھا لکھ لیتے تھے۔ بیمار  
بھی کم ہوتے تھے۔ آپ کی عمر اسیٹھ سال  
چار ماہ ہوئی۔

(ص ۴۰)

**ضبط اوقات :** مثل والد ماجد  
شخصے کم نظر آمد سوائے علوم و کمالات  
دیگر در ضبط اوقات۔ چنانچہ بعد اذہن  
کہ می نشست تا دوپہر زانو بدل نمی کرد  
و عارش نمی نمود و آب و ہن نمی اندخت (ص ۴۱)  
شاہ عبدالعزیز کی ولادت : بندہ  
را عورات "میتا" لے می گفتند و حبش  
آن کہ در شب بست و پنجم رمضان  
وقت سحر تولد شدہ بودم۔ چون والدین  
را کو دکھ بسیار مرده بودند مگر برائے من  
آرزوئے کمال بود۔ در آن ہنگام بزرگان

دیگر علوم و کمالات کے علاوہ ضبط  
اوقات میں بھی والد ماجد کی طرح کم  
ہی کوئی آدمی نظر آیا۔ اشراق کے بعد  
جو بیٹھتے تھے تو پہلو بھی نہیں بدلتے  
تھے۔ نہ کھاتے تھے نہ تھوکتے تھے۔

بندہ (شاہ عبدالعزیز) کو عورتیں "میتا"  
کہتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ۱۵  
رمضان کی شب میں پچھلے بہر پیدا ہوا  
ہوں۔ چونکہ والدین کے بچے بچتے نہیں  
تھے اس لئے میری بڑی آرزو تھی (میری  
ولادت کے وقت) بہت سے بزرگ

لے میتا یعنی مسجد والا۔ مسجد کا عوامی تلفظ مسیت ہے۔ اسی کی نسبت میتا ہے۔  
لے یہ شاہ ولی اللہ کی زوجہ اولی کی اولاد کا ذکر ہے۔ شاہ صاحب کا عقد ثانی ۱۱۵۵ھ  
میں ہوا اور دو سال بعد ۱۱۵۷ھ میں شاہ عبدالعزیز توکد ہوئے۔

بسیار وادلیا رہیاریا از یاران والد ماجد  
مثل شاہ محمد عاشق و مولوی نور محمد لہ  
وغیرہ مقتف مسجد ہذا می بودند۔ پس  
مارا غسل دادہ در محراب لہ انداختند  
گویا نذر خدہ اگر دند۔ پس بزرگان ما  
را قبول کردہ از خدہ انعام کردند۔  
(ص ۱۰۹)

شفقت پدری : والد ماجد بے  
بندہ طعام نمی خوردند۔ (ص ۳)  
چشتیت : در ابتدا والد ماجد  
ہم ہون (نسبت چشتیت) غالب بود۔  
بعد ازاں انقلاب شد (ص ۸۲)  
گمان شیعہ :

شخصی از والد ماجد مسئلہ تکفیر  
شیعی پر سید۔ آن حضرت اختلاف  
حنفیہ و رینی باب کہ ہست بیان  
کردند۔ چوں مکرر پرسید ہماں شنید  
شنیدم کہ می گفت کہ این شیعی

اور خدا رسیدہ حضرات مثلاً شاہ محمد عاشق  
اور مولوی نور محمد وغیرہ اسی مسجد میں  
مقتف تھے۔ (ولادت کے بعد) مجھے غسل  
دے کر مسجد کے محراب میں ڈال دیا گیا  
گویا خدا کی نذر کر دیا گیا۔ پھر اُن  
بزرگوں نے مجھے قبول کر کے خدا کی طرف  
سے انعام (پس واپس) عطا کیا۔

والد ماجد میرے بغیر کھانا نہیں  
کھاتے تھے۔

ابتدا میں (حجۃ المجد کی طرح) والد  
ماجد پر بھی نسبت چشتیت غالب تھی۔  
بعد میں انقلاب ہوا۔

ایک شخص دستغیب رہیلہ نے  
والد ماجد سے شیعی کے کفر کے متعلق سوال  
کیا۔ آپ نے (اس کی مرضی کے خلاف)  
اس باب میں اعتنا کا اختلاف بیان  
کیا یعنی اس فرقے کے کفر پر اتفاق آما  
نہیں ہے، اس نے دوبارہ دریافت کیا

لہ غالباً یہ نام نور محمد نہیں نور اللہ ہے۔ مولوی نور اللہ بڑھانوی شاہ ولی اللہ  
کے شاگرد اور شاہ عبدالعزیز کے خسر تھے۔ ۱۸۵۷ء میں وصال فرمایا۔  
لہ اولاد کے شوق اور محبت میں کیسے کیسے بزرگ بھی کمزوریوں کا شکار ہو جاتے  
ہیں۔ اولاد کو قرآن کے فتنہ جو کہا ہے۔ !

اور یہی جواب پایا تو میں نے سنا کہ کہنے لگا کہ یہ (نور) شیعی ہیں۔

ہمارے بعض قریبی اعزہ غالی شیعی ہیں۔

میں لڑکپن میں بیمار تھا۔ ایک حکیم صاحب نے علاج کیا میں صحتیاب ہو گیا والد ماجد نے اپنی عادت کے برخلاف اہی سے کہا آپ نے میرا دل خوش کر دیا۔ بتائیے آپ کے حق میں کیا دعا کاروں؟ حکیم صاحب نے کہا (یہ دعا کیجئے کہ) میں نوکر ہو جاؤں۔ اس زمانے میں بلکہ اسی رات سو روپیہ تنخواہ (مع سواری) پر نوکر ہو گئے۔ جب حکیم صاحب نے آکر بتایا تو حضرت نے زبان مبارک سے فرمایا آپ کا حوصلہ ہی پست تھا کہ دنیا اور دہی اس کے حقیر حصے پر کفایت کی۔

ہمارے خاندان میں طب کا بھی مشغلہ تھا

(ص ۳۲) شیعیوں سے قرابت : بعضے از اقربا قریبہ ماشیم غالی اند (ص ۳۴) کرامت : در وقت طفلی بیمار بودم۔ حکیمے تمادی می کرد۔ بہ شدم۔ والد ماجد اہی را حکم فرمودند کہ مارا خوش ساختی۔ بگو در حق تو دعائے کنم۔ ہر چند خلاف وضع شریف بود لیکن فرمودند۔ عرض کرد کہ نوکر شوم۔ در ہون ہنگام بلکہ شب صد روپیہ را مع سواری تعیناتی نوکر شد۔ چون آمدہ عرض کرد۔ آن حضرت از زبان مبارک فرمود : ہمت شما قاصر بود کہ بر دنیا آئی ہم حقیر اعتنا کردید۔

(ص ۴۳ - ۴۴)

طب : حکمت ہم در خاندان ما ہم ہوں

لے یہ اشارہ غالباً میر قمر الدین منت کی طرف ہے۔ یہ نہ صرف شاہ صاحب کے عزیز بلکہ شاگرد بھی تھے۔ شاہ صاحب نے تھالذناقت نامی رسالہ انہی کیلئے لکھا تھا لیکن مولانا فخر الدین دہلوی سے امداد اور اودھ کے امراء کے روابط کے نتیجے میں اثنا عشری ہو گئے تھے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو "فضائل صحابہ و اہل بیت" پاک اکیڈمی، کراچی۔

مقدمہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے۔ (ص ۶۲)

بود۔ چنانچہ مجدد لے بزرگوار دُعا لے فقیر  
دوامی کردند۔ والد ماجد و بندہ موقوف  
ساختہ۔ (ص ۲۲)

ہر چند کہ والد ماجد مارا بنا بر دوا  
و طبابت بحسب مصلحت دیگر منع فرمود۔  
بودند۔ لیکن خوب چیز است بلکہ گویا جان  
بخشی ست (ص ۲۳)

وصیت نامہ : ارشاد شد کہ وصیت  
نامہ والد ماجد نقل کردہ بگیرند۔ بسیار  
نافع ست۔ (ص ۴۵)

مسلک فقہی : درین مقدمہ اختیار

چنانچہ جد بزرگوار (شاہ عبدالرحیم) اور میرے  
چچا (شاہ اہل اللہ) مطب کیا کرتے تھے۔ والد  
ماجد اہم میں نے یہ سلسلہ موقوف کیا۔

اگرچہ والد ماجد نے کسی مصلحت سے  
علاج اور طب کرنے سے ہمیں منع کر دیا  
تھا لیکن (یہ طب) ہے خوب چیز۔ بلکہ  
(بعض حالات میں تو) گویا جان بخشی ہے۔  
فرمایا : والد ماجد کا رسالہ وصیت  
نامہ نقل کر کے رکھیں، بہت مفید چیز  
ہے۔

اس (تقلید کے) مسئلہ میں والد بزرگوار

۱۔ شاہ ولی اللہ تبارق الولایت مطبع احمدی، دہلی، ص ۸۴ : "در طب  
حدس ایشان بغایت سلیم و رسا بود :

۲۔ شاہ اہل اللہ دہلوی علوم دینیہ کے فاضل اور صاحب تصانیف ہونے کے  
علاوہ باقاعدہ طب بھی کرتے تھے : "مکملہ ہندی" اور "مکملہ یونانی" دو رسالے بھی طب میں  
تالیف کیے تھے۔ زندگی کا بڑا حصہ اپنے ناہمال لپہلت ضلع مظفر گڑھ یو۔ پی،  
بھارت میں بسر کیا۔ وہیں مزار بھی ہے۔ وفات ۱۲۸۶ھ

۳۔ اصل نام التمامۃ الوضیۃ فی النصیحتہ والوصیۃ ہے۔ فارسی میں ایک مختصر  
سار سالہ ہے پہلے ہوگلی سے عبداللہ بن بہادر علی نے پھر مولوی سعید احمد نے مطبع  
احمدی (دہلی) سے اور اب (۱۳۹۳ھ) شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدر آباد نے شائع کیا ہے  
اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اسی خانوادے کے تین مزید وصیت ناموں کے ساتھ  
اسے مدون کیا ہے۔

حضرت والد ماجد خوب ست یعنی اگر یکے از مجتہدان بآن عمل کرده باشد ترجیح حدیث است عمل کنند والا ترک دہد چرا کہ خالی از سبب سکوت ہمہ ہا نیست و این چنین شاید چہار حدیث خواہد بود۔

(ص ۹۱)

### ایک فتویٰ :

آن حضرت فرمود کہ ابی داؤد حدیث نقل می کنند کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم جامہ خون آلود حیضی زنہ را برائے صفائی از نمک شستن فرمودہ بود۔ چون نمک ہم چیز محترم است و طعام ہم محترم پس دست شد کہ از آرد وغیرہ اگرچہ آرد گندم باشد دست باید شست۔ لیکن چیز ہائے دیگر سوائے طعام کہ دین مادہ بکار می برند بہتر است والا آرد ہم جائز باشد (ص ۹۰)

### ایک جزیرہ :

شخصی از قبلہ گاہی عرض می کرد کہ در جزیرہ رفتہ بودم۔ سن جاسوائے ناچیل

کامسک خوب ہے کہ اگر ائمہ مجتہدین میں سے کسی ایک نے بھی اس حدیث پر عمل کیا ہے تو ترجیح حدیث کو دی جائے گی ورنہ حدیث کے بجائے قول مجتہد پر عمل کیا جائے گا اس لئے کہ تمام ائمہ مجتہدین کا سکوت بے سبب نہیں ہو سکتا اور اس قسم کی احادیث جن پر کسی ایک امام کا بھی عمل نہ ہو شاید تعداد میں چار ہوں گی۔

(اس سوال پر کہ کھانے کے بعد آٹے سے ہاتھ دھونے کا کیا حکم ہے ؟) آپ نے فرمایا ابو داؤد نے حدیث بیان کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک عورت کو خون حیض سے آلودہ کپڑوں کو نمک سے دھو کر صاف کرنے کا حکم دیا تھا۔ اور چونکہ نمک بھی محترم چیز ہے اور کھانا بھی، اس لئے آٹے وغیرہ سے چاہے وہ گہیوں کا آٹا ہی کیوں نہ ہو ہاتھ دھونا درست ہے۔ لیکن کھانے کی چیزوں کے علاوہ جو اس کام میں لائی بھی جاتی ہیں ہاتھ دھونا بہتر ہے ورنہ آٹا بھی جائز ہے۔

ایک شخص نے حضرت قبلہ گاہی سے عرض کیا کہ میں ایک جزیرے میں گیا تھا وہاں کھوپرے اور مچھلی کے علاوہ کھانے

و ماہی از قسم طعام نمی شود . مگر این کہ از ملک دیگر بر بند . چنانچہ آن کس را ہشتاد و دو طعام از ترکیب ہمیں دو ہزار می دانم لے . (ص ۱۱۸)

### چین میں بلی :

در ملک چین گربہ کم تر می شود و موش با بسیار جری . شخصی از والد ماجد نقل می کرد کہ ہمراہ من گربہ بود . تا جائے کہ در چین می روند رفتم . و دیدم کہ گلولہ ہا زان در وقت طعام راجہ برائے دفع موشاں می ہتاند من گفتم جانورے در ہند بہ پان صد روپیہ می آید . از آوازش موشاں می رسد . چنانچہ فرخستہ . از آوازش

کی اور کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی تھی . لہذا یہ کہ کسی دوسرے مقام سے لے آئیں چنانچہ اس شخص کو بیاسی کھانے راہنی دو چیزوں سے پکانا آتے تھے .

چین میں بلی بہت کم ہوتی ہے اور اور چوہے بڑے ولیر ہوتے ہیں . ایک شخص نے والد ماجد سے بیان کیا کہ میرے ساتھ (سفر میں) ایک بلی تھی اور چین میں جہاں تک جاسکتے ہیں میں گیا میں نے دیکھا کہ چوہوں کی کثرت کی وجہ سے راجہ کے کھانے کے وقت گلولہ باز چوہوں کو بھگانے کیلئے کھڑے رہتے ہیں . میں نے کہا ہندوستان میں ایک جانور پانچ سو روپیہ میں آتا ہے اس کی

لے یہ تین واقعات جہاں لازماً انہو د بے اصل نہیں کہے جاسکتے وہاں ان کی صحت کا یقین بھی مشکل ہے ، ہم صرف اس لئے نقل کر رہے ہیں کہ یہ قلعے شاہ ولی اللہ کی مجلس میں بیان کیے گئے تھے . ہمارے ان بزرگوں کی مجالس نری تشکث اور علمی موضوعات کے لئے ہمہ وقت وقف نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان میں مطالبات اور دلچسپ گفتگوؤں کی بھی گنجائش ہوتی تھی . ذرا تصور کیجئے ابلاغ و دعوت کی خاطر ربط عوام میں ان بزرگوں کو کس درجہ ریاض کرنا پڑتا ہوگا . شاہ ولی اللہ کے سامنے ایک سیاح اپنی "سفر بیہی" سنارہا ہے اور وہ بڑی "سجیدگی" سے اسے سن رہے ہیں . !



بالکل موٹاں رمیدند۔

(ص ۷۱)

آواز سے پوچھتا ہے بھاگ جاتے ہیں چنانچہ  
میں نے بتی وہیں فروخت کر دی اور اس  
کی آواز سے پوچھتا ہے بھاگ گئے۔

عجیب قصہ ہے ایک شخص کشمیری  
حضرت قبلہ کے سامنے قسمیں کھا کھا کر  
کہتا تھا کہ میں جنوبی ہند میں ایک راجہ  
کے یہاں باورچیوں کے زمرہ میں ملازم ہو گیا  
تھا۔ راجہ کے مرنے کے بعد وہاں کے  
دستور کے مطابق راجہ کی لاش کو اس کے  
خدام کے ساتھ جن میں بھی شامل تھا ایک  
مخونہ کمرہ میں بند کر دیا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں  
کہ رات کو وہ مہیب فرشتے جیسا کہ حدیث  
میں آیا ہے آئے۔ میں ان کے خوف سے  
ایک کونے میں دبک گیا۔ مجھے نہیں معلوم  
راجہ سے کیا سوال و جواب ہوئے۔ آخر  
فرشتوں نے اس کو مارنا شروع کیا اور اتنا  
مارا کہ اس کے اعضا ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ہم  
لوگ درشت سے بے ہوش ہو گئے بلکہ بعض  
تو مر گئے میں کلمہ پڑھتا تھا۔ فرشتوں نے  
میری طرف دیکھا اور یہ کہہ کر کہ یہاں کیوں  
آگیا تھا مجھے کشمیر پہنچا دیا۔ فرشتوں کی مار  
سے راجہ کی لاش کے جو ریزے میرے بدن  
پر چھٹ کر لگ گئے تھے ان کی سوزش محسوس

عذابِ قبر۔ قصہ عجیب است۔  
پیش حضرت والد قسم غلیظ می گفت  
یعنی کشمیری بے طرف ملک دکن رفت  
پیش راجہ در فرقہ باورچیان نوکر شد۔  
بعد مردنش موافق دستور آن جا من  
جلد جماعتہ خدام خاص این کس را ہم  
در سردارہ نہادند۔ چہ می بیند وقت  
شب دوفرشتہ مہیب چنانچہ در حدیث  
آمدہ است آمدند۔ از خوف آن ہا بگوشہ  
رفت۔ معلوم نیست مارا کہ چہ سوال  
و جواب شد۔ آخرش او را می زدند۔  
اعضائش ریزہ ریزہ شدند۔ ما ہم  
بے ہوش شدیم و بعضے مردند۔ من کلمہ  
می خواندم و فرشتہا جانب من دیدند و  
ما را بعد از گفتن کہ چرا آمدہ بودی۔  
در کشمیر رسانیدند۔ پارچہ از اعضائش  
کہ بر بدن من ریزہ شدہ رسیدہ بود۔  
سوزش آن نمی رفت ہر چند معائبہ  
کردم یہ نمی شد۔ در دہلی آمدم پیش  
بزرگان و اطباء رجوع کردم بیچ فائدہ

نشہ نہ شد۔ مگر تم شہا ابورضا محمد درود فرمودند تا حسینیکہ بر دست کف زوہ بر آن جامی مالم تسکین می نمایند بخت تنگ ہستم۔

(ص ۶۸، ۶۹)

چچا ابوالرضا محمد نے درود پڑھ کر میرے ہاتھ پر دم کر دیا تھا۔ جب تک ہاتھ متاثر تھے پھر پھیلتا رہتا ہوں سکون رہتا ہے بہت تنگ ہوں۔

### شاہ صاحب کی ایک رباعی (ص ۱۰۳) :

در صحبت اہل دل رسیدم بے پس درویشہ کنان زما کے یک نفسے  
از چشمہ آب زندگانی قمے وز آتش وادی مقدس قمے  
مدار بخش نامی قوال کی درخواست پر شاہ عبدالعزیز نے والد ماجد کی ایک غزل  
عنایت فرمائی (ص ۱۰) :

من ندانم بادہ ام یا بادہ را پیانہ ام عاشق شوریدہ ام یا عشق ہاجانانہ ام  
بتلائے حیرتم جان گویت یا جان جان اصطلاح شوق بسیارست ومن دیوانہ ام  
میل ہر غصہ بود سوئے مقر علیش جذبہ اصل ست سرشورش مستانہ ام

لے شیخ ابوالرضا محمد بن شیخ وجیہ الدین شاہ ولی اللہ کے چچا اور شاہ عبدالرحیم کے بڑے بھائی اور استاد و مربی تھے۔ شاہ ولی اللہ نے "افسان الکلیفین" کا باب دوم (ص ۸۶-۱۵۲) "شوارق المعرفۃ" کے نام سے آپ کے حالات میں تحریر فرمایا ہے۔ حالات اور تصرفات و کرامات کے ساتھ آپ کے فاضلانہ اور عارفانہ ملفوظات اور دو رسالوں "تفسیر بسم اللہ" اور "اصول الولاية" کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ جن سے علوم دینیہ میں آپ کے فضل و کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔ نبیرہ حضرت مجدد شیخ عبدالاحد گل دو وحدت سے آپ کے مراسم واد و اخلاص تھے۔ شاہ صاحب نے شوارق میں (مناشیہ فقیر برصوفہ آستانہ)

شوقِ مونی در غور آورد نارِ طور را      در نہاد طبعِ ہمتش می زند پروانہ ام  
لے امین برستم نام تہد و ہمت ست      ہد ازل پیش از زمان تعمیر شد میخانہ ام  
ایکت اور غزل

گر بگلشن بگزری گل بردخت مفتون شود      در نہائی قامت خود سرور، موندن شود  
کار با معنی ست دانا نہ بانام و نشان      ہد بہ لیلیٰ نہار تو بیدا گر مجنون شود  
مردِ مخلص را جہان یکسر محلِ رفت ست      شیدہ گر خالی ست گر بادش بد ہار شود  
دوباعی :

در محبت اہل دل رسیدم ہے      بس درویدہ کنان زما کسے یک نفسے  
از چشمہ آب زندگانی قدحے      وز آتش وادی مقدس تپے

احاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ نون بزرگوں کے کئی مکاتیب نقل فرمائیے ہیں۔ ان مکاتیب میں تاریخ ادبِ اردو کے طلبا کیلئے دلچسپی کا سامان وہ دہرے ہیں جو طیفین کے سناج فکر ہیں۔ ان دہروں کی اہمیت یہ ہے کہ حضرت عبدالاحد وحدت (ف ۱۳۵۷ء) ولی دکنی (یا گجراتی) کے استاد گلشن کے استاد تھے۔ شیخ عبدالاحد پر ایک مفصل مضمون زیر قلم ہے۔ اس میں یہ دہرے نقل کیے جائیں گے۔

لے      حیاتِ ولی (ص ۵۰۶) میں یہ شعر غزل میں نہیں ہے مگر ”حرید شعر ہیں“  
با اعمال و انیشِ حسنِ دگر در کار شد      چشم اور اسر مسام یا زلف او ما شانام  
غفل از خود ماند از صورت جو برد آئینہ      تا ترا بشناختم جانان ز خود و گناہ نام  
بے      بید مجنوں پر شاہ عبدالعزیز نے بھی (ص ۳۴) طبع آزمائی فرمائی ہے :

ز نازک طبع غیر از خود نہائی با نہی آید  
درخت بید را دیدم کہ دائم بے ثمر باشد

مگر حیاتِ ولی میں اس شعر کو شاہ ولی اللہ سے منسوب کیا گیا ہے۔ (ص ۵۱۱)

ایک قطعہ :

اپنے والد ماجد (شاہ ولی اللہ) کے

بہنیں تشریف لے جانے اور وہاں ایک

لوگے کی شیخ آدم بنوری کی شان میں

مختاری کرنے اور اس سے والد ماجد

کی ناخوشی کا ذکر کر کے ان کا یہ قطعہ

پڑھا

زبان زد کہ در طہ قیہ مخدوم آدم

تو آدمی بنوری و ما آدمی شریف

(اقبال ریویو)

تشریف بدین والد ماجد

خود و بد گفتی صاحبزادہ و حق شیخ

آدم بنوری لے و ناراضی شان

(ص ۱۰۳)

شخصی بخودہ گیری ما صاحبزادہ فتاد

گفت کہ حرف راست گویم زارنج

# المسوی بن احادیث الموطا

مکرم

حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۴ سال پہلے مکرم

میں مولانا عبد اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جا بجا

مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات

زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شرح پر مؤلف امام نے جو مبسوط مقدمہ لکھا

تھا۔ اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

دلائل کی پڑے کی نفیس جلد۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

قیستہ : بیش رودی

لے شیخ آدم بن اسماعیل بنوری ، حضرت امام ربانی کے خلفاء میں سے تھے۔

۱۰۰۰ء میں وفات پائی۔

# کسانی

محمد مرسی خولی

مترجم سعید احمد

کوفہ کے ائمہ نحو کا شیخ اور ان ادائیں علماء میں سے ایک ممتاز شخصیت، جنہوں نے مضبوط قواعد پر لغت کی بنیاد رکھی۔ ایک ایسا انسان جس نے کبھی کسی علمی مناظرے میں شکست نہیں کھائی !!

عربی ادب کی تاریخ ایسے علمی مناظروں سے بھری پڑھی ہے جو کہ کسی فن پر اس کے مخصوص ماہرین کے درمیان ہوا کرتے تھے اور یہ مناظرے دوسری اور تیسری صدی ہجری میں تو نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا جب علماء نے علوم کے قواعد بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ تمدن سے پہلے کسی خاص فکر پر پہنچنے کیلئے اس قسم کے مناظروں کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تاکہ علمی چیمپان بین ہو اور غور و خوض سے کسی نص یا خبر صحیح سے سند لی جائے۔

لغت اپنے مختلف مواد کے لحاظ سے اتنی اہم تھی کہ بحث و نظر کے بعد اس کے حاصل کرنے پر علماء شدید توجہ فرماتے تھے، اس میں بحث کیلئے کسی لغزش کا خطرہ

نہ تھا۔ جب عرب اقوام کا اختلاط اور سروکار عربی زبان سے نابلد لوگوں سے ہوا تو لغت عربیہ کے تدوین کی شدت سے ضرورت محسوس ہوئی۔ بصرہ، کوفہ اور بغداد میں علماء لغت کے باہمی مناظروں کی محفلیں گرم ہو گئیں۔ جس میں الفاظ کے معانی پر کھل کر مباحث ہوتے تھے اور عجیب و غریب تحقیقات سامنے آ جاتی تھیں۔

ان مناظروں کی تاریخ یاد دلانے کیلئے علمی دنیا کی ایک بہت بڑی شخصیت (جو کہ جملہ مناظرین میں سے قوی الطبع اور ماسخ القدم تھے) خصوصی عمرک ہوتی ہے حتیٰ تو یہ ہے کہ اس کو ایسا مناظر کہا جائے جس نے کبھی کوئی شکست نہ کھائی ہو بلکہ وہ ہے علی بن حمزہ کسائی۔

کسائی اور ان کا علمی مرتبہ کسائی اپنے ہم عصر علماء میں بلند مرتبت کے مالک کسائی اور ان کا علمی مرتبہ تھے۔ وہ کوفہ کے ائمہ فو کے شیخ، دنیا کے سات مشہور قاریوں میں سے ایک اور عربی قواعد کے اداسی موسسین میں سے ایک تھے۔

یہ تو معروف ہے کہ اس کی کوفہ میں نشو و نما ہوئی اور صدر علماء کوفہ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد بغداد چلے گئے۔ جہاں اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ خلیفہ مہدی اس کے علمی قدر و منزلت سے واقف ہوئے اور انہوں نے اس کو اپنے بیٹے رشید کی تعلیم کیلئے مقرر فرمایا۔ جب رشید خلافت کا والی ہوا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی تعلیم و تربیت کا کام بھی کسائی کو ہی سپرد کیا۔ کسائی نے اس خدمت کو خوش اسلوبی سے ادا کیا اور اس کے بعد رشید نے ان کو معلین و مؤذنین کے طبقے سے بڑھا کر اپنا مولس اور ہم جلس بنا دیا۔

کیا تو میرے ساتھ بیٹھتا ہے حالانکہ بولنے میں غلطی کرتا ہے؟

یہ عجیب بات ہے کہ جو شخص اس علمی مرتبے پر پہنچا، اس نے اپنی جوانی کا سارا زمانہ اور ادھیڑ پن عمر کا اداسی حصہ، علم سے نہایت دور ہو کر گزاریا۔ اگر کوئی

قیادہ شناس اسے دیکھ کر یہ کہتا کہ "مستقبل میں علم کا امام ہوگا تو وہ اس کو مذاق سمجھتا لیکن ہوا یہ کہ کسائی کا ایک دوست عالم تھا جس کے ساتھ اس کی عام بیٹھک ہوتی تھی، ایک روز کسائی حسب معمول اس دوست عالم کے پاس گئے موبخت تھکے ہوئے تھے دوست نے اس کی حالت دریافت کی کسائی نے یہ جملہ کہا "لَقَدْ عَیْنَتْ" اس پر وہ عالم ناراض ہو کر کسائی سے مخاطب ہوا "أُتَجَابِلِیْنِی وَ أَنْتَ تَلْعَنُ؟" کیا تو میرے ساتھ بیٹھتا ہے حالانکہ بولنے میں غلطی کرتا ہے؟ کسائی نے غلطی کی وضاحت طلب کی تب وہ فرمانے لگے کہ ایک موقع تو وہ ہوتا ہے جب کوئی کسی معاملہ میں حیران ہوتا ہے اور اس سے بچنے کا حیلہ نہیں پاتا اگر تیری یہ کیفیت ہے تو تجھے عَیْنَتْ غُف کھنا چاہئے تھا اور اگر تیرا ارادہ تھکان سے خبر دینے کا تھا تو تجھے "أَغِیْثَتْ" کھنا چاہئے تھا۔ کسائی کو اس سے شرم محسوس ہوئی اور فوراً اٹھ کر چلے گئے اور لوگوں سے پرچھا کہ غوک تعلیم کون دیتا ہے؟ لوگوں نے اس کو معاذ بن مسلم المرء کی طرف رہنمائی کی تب کسائی نے اس کی اس وقت تک صحبت اختیار کی جب تک اس کے جملہ علم کو ختم کیا۔

آپ نے اپنے اس علم کو کس سے لیا ہے؟ کسائی نے اپنے سے غلط علم کا عار حاصل کیا صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جس عالم نے اس کی غلطی نکالی تھی اس سے علم میں بڑھنے اور فائق ہونے کا بھی ارادہ کیا اس لئے بصرہ کی طرف روانہ ہوا اور وہاں بصرہ کے بڑے عالم خلیل بن احمد کے حلقہ درس میں داخل ہو گیا۔ خلیل کی ہمت علم اور معرفت نے اس کو حیران کر دیا لہذا ایک مرتبہ ان سے یہ سوال کیا کہ "آپ نے اس علم کو کس سے لیا؟" خلیل نے کہا کہ "عبدالغدر اور تہامہ کے وہاں سے کسائی نے بھی جلدی سے وہاں جانے کی تیاری کی وہاں پہنچ کر باوینہ نشینوں سے لغت کے غرائب اور نوادہ الفاظ کو سنتا اور جمع کرتا رہا۔ یہاں تک کہ ان فوائد کے لکھتے وقت پندرہ بوتلیں سیاہی کی خرچ کر دیں۔ اور جو یاد کیا تھا وہ اس کے علاوہ

تھا۔ اس کے بعد علم کی دولت سے مالا مال ہو کر کوفہ کی طرف لوٹے۔

**کسائی کا پہلا علمی مناظرہ** کسائی کو اس کے بعد، اس کے سوا کسی چیز کی حاجت نہ رہی کہ اس نے جو علم حاصل کیا ہے کوفہ کے جہور اہل علم اس کا اعتراف کریں تاکہ اس کو جامع مسجد میں درس دینے کا موقع مل جائے، اس کیلئے سب سے قریب طریقہ اس کے پاس یہ تھا کہ لوگوں کے سامنے وہاں کی کسی بڑی علمی شخصیت سے علمی مناظرہ کرے تاکہ جہور علماء اس کی قدر و منزلت کو سمجھ سکیں۔

کسائی کا ایک شاگرد علف بن ہشام بزاز روایت کرتا ہے کہ کسائی اذان فجر کے ساتھ کوفہ کی مسجد بیس میں داخل ہوئے۔ وہاں ملک کے سات مشہور قاریوں میں سے ایک قاری حمزہ بن حبیب زیات قرات کے صدر اور شیخ تھے۔ اس کا یہ معمول تھا کہ روزانہ نماز فجر کے بعد تلاذہ کا قرآن سنتے تھے اور ان سے قرات میں اگر غلطی ہوتی تھی تو اس کی دلائل کے ساتھ اصلاح بھی کرتے تھے اس روز جب نماز ختم ہوئی تو کسائی، قرات کیلئے آگے بڑھا اور اس نے سورۃ یوسف کی تلاوت شروع کر دی جب بھیڑیے کے قعر پہنچا تو اس نے قَاٰكِلَةُ الذِّبْنِ ہمزہ کے بغیر پڑھا۔ لوگ اس کو گھورنے لگے اور حمزہ قاری نے اس کی مدستی فرمائی۔ تب کسائی نے ان سے دریافت کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ کے اس قول ذَاالتَّقَاتِ الْحَوْتُ میں بھی الحوت کو ہمزہ کے ساتھ پڑھوں؟ حمزہ بن حبیب نے جواب فرمایا کہ نہیں۔ کسائی نے کہا کہ کیا وجہ ہے کہ الذئب پر ہمزہ پڑھتے ہو اور الحوت کو ہمزہ نہیں دیتے حالانکہ دونوں یکساں ہیں۔ قَاٰكِلَةُ الذِّبْنِ، فَالتَّقَاتِ الْحَوْتُ۔ یہ سن کر حمزہ نے اپنے شاگرد خلاد احوال کی طرف آنکھ اٹھائی۔ یہ ان کے تمام شاگردوں میں سے بڑے صاحب کمال تھے خلاد اہل مجلس میں سے گفتگو کیلئے آگے بڑھا۔ مناظرہ کی مجلس گرم ہوتی۔ لیکن کسائی کو کسی طرح بھی خاموش نہ کر سکا۔ آخر مجبور ہو کر خلاد کسائی سے مخاطب ہوا کہ اللہ آپ پر رحمت کرے تم ہی ہمیں فرق سمجھاؤ۔ کسائی کہنے لگے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ



جب تو کسی شخص کو بھیڑیے کی طرف نسبت کرتا ہے تو اس طرح کہتا ہے۔ "قَدْ اسْتَذَابَ الرَّجُلُ" یعنی آدمی بھیڑیا بن گیا اور اگر تو اس طرح جملہ کہے گا "قَدْ اسْتَذَابَ" ہمزہ کے سوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تو نے اس کی فاعل کی طرف نسبت کی یعنی آدمی لاغر ہو گیا۔ اور جب تو کسی کو پھیل کی طرف نسبت کرتا ہے تو اس طرح کہتا ہے "اسْتَخْثَّ الرَّجُلُ" ہمزہ کے سوا ہوگا جس کے معنی ہوں گے کہ اس نے بہت کھایا کیونکہ پھیل بھی بہت کھاتی ہے اس کا پریش نہیں بھرتا۔ اور یہاں ہمزہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمزہ "ذَنْبٌ" مفرد یا جمع سے ساقط نہیں ہوتا۔ اور ان کو یہ شعر پڑھ کر سنایا ہے

ایھا الذنب وایہ وایہ انت عندی من اذنب ضایات

کسائی نے اس مناظرے سے اپنا مقصد حاصل کیا، کوفہ کے جمہور علماء نے اس کے علمی تفوق کا اعتراف کیا اور ان کے درمیان اس کا علمی مرتبہ اتنا بڑھتا گیا کہ جب تک وہ کوفہ کو چھوڑ کر بغداد نہ گئے تب تک وہاں کے علماء کے صدر اور شیخ رہے۔

کسائی کا بغداد میں ایک منظرہ  
کسائی کوفہ کو چھوڑ کر بغداد چلے گئے۔  
لیکن بغداد میں پہنچنے سے پہلے اس

کی علماء لغت کے ایک یگانہ عالم کے لقب سے شہرت ہو گئی تھی کسائی پر یہ لازم تھا کہ وہ اپنے متعلق علمی شہرت کو سچا ثابت کرے اور لغوی مناظروں سے اس کو اور بڑھائے۔

ایک دن یہ ہوا کہ کسائی اور قاضی ابویوسف، رشید کے پاس بیٹھے تھے، قاضی ابویوسف "نحو کی خدمت" کر رہے تھے اور یہ کہہ رہے تھے کہ "وَمَا السَّخُو" یعنی نحو کیا ہے؟ کسائی کو اتنے بڑے عالم سے یہ جملہ سن کر حیرت ہوتی اور ان سے کہا کہ آپ کا اس شخص کے متعلق کیا خیال ہے جس نے دوسرے شخص سے یہ جملہ کہا

”أَنَا قَاتِلُ غُلَامِكَ“ اور پھر ایک دوسرے آدمی نے بھی اسے یہ کہا ”أَنَا قَاتِلُ غُلَامِكَ“۔ کہا کسائی نے پوچھا کہ آپ ان دونوں میں سے کس کو پکڑیں گے؟ ابو یوسف نے فرمایا دونوں کو۔ ۲۷ دن رشید نے یہ جواب سن کر کہا اَخْطَاَتُ یعنی تم نے جواب میں غلطی کی۔ ہارون عربیت کے عالم تھے، ابو یوسف شرمائے اور کہنے لگے کَيْفَ ذَلِكَ؟ وہ کیسے۔ کسائی نے کہا، غلام کے قتل کی پاداش میں اس کو پکڑا جائے گا جس نے اَنَا قَاتِلُ غُلَامِكَ امانت کے ساتھ کہا ہے۔ کیونکہ یہ فعل ماضی کی خبر ہے۔ اور معنی ہوں گے میں نے تیرے غلام کو قتل کیا۔ باقی جس نے اَنَا قَاتِلُ غُلَامِكَ غلام کی زبرد کے ساتھ کہا اس کو گرفتار کیا جائے گا کیوں اس صورت میں یہ مستقبل ہے اور معنی ہوں گے میں تیرے غلام کو قتل کروں گا۔ جیسے قرآن مجید میں آیا ہے وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُرَىٰ فَاعْلَمُوا ذَلِكُمْ نَعْلَمُ اَلَا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ اگر یہاں تین نہ ہوتی تو سخت جائز نہ ہوتا۔

بغداد میں کسائی کا سب سے بڑا مشہور مناظرہ  
**بچھو اور بھڑکا قصہ**  
 وہ ہے جو ان کے اور بصرہ کے غویوں کے  
 امام سیبویہ کے درمیان برائے کی مجلس میں علماء کے سامنے ہوا تھا یہ مناظرہ کسائی  
 کے ایک سوال پر چھینے پر ہوا تھا۔ اس نے سیبویہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ اس  
 میں کس طرح پڑھیں گے کُنْتُ اَنْظَرْتُ اِنْ الْعَقْرَبَ اَشَدَّ لَسْعَةً مِنَ الزَّبَابِ  
 فاذا هو حي، اور فاذا هو اياها؟ سوال پر چھینے کا مطلب یہ تھا کہ حوی رفع  
 کے ساتھ پڑھا جائے گا یا ایتاھا نصب کے ساتھ۔ سیبویہ نے کہا کہ میں ”فاذا  
 حوی“ کہوں گا اور زبرد ناجائز ہے۔ کسائی نے کہا کہ آپ نے غلطی کی ہے عرب  
 دونوں طرح کہتے ہیں۔ سیبویہ کو اپنے خیال پر اصرار تھا۔ اور کسائی دونوں چپوں  
 پر زور لگا رہے تھے۔ یحییٰ برکی نے چند بدویوں کو جو کہ اس کے دروازے پر  
 کھڑے تھے فیصلے کیلئے بلایا۔ انہوں نے کہا کہ ”بات وہی ہے جو کسائی  
 نے کہی۔“

یہ ہے مشہور مناظرہ کا خلاصہ ، جس کے نتیجے میں سیبویہ نے بغداد کو چھوڑ دیا اور فارس میں اپنے قریہ تبینارہ کی طرف چلے گئے اور وہاں عین جوانی اور شباب کے عالم میں غمگین ہو کر وفات پا گئے ۔

سیبویہ کی شکست اور پھر جلدی وفات پا جانا ، ان دونوں نے اس مناظرے کو مورد بحث بنا دیا ہے ۔ سیبویہ کے معادن کسائی کی کسر شان کے پیچھے لگ گئے اور اس کو جاہل کہنے لگے ۔ اور انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ مناظرہ کسائی کی سوچی سمجھی سازش تھی ۔ کسائی کو سیبویہ کی شخصیت کا علم تھا اور اس سے ڈرتا تھا اس لئے وہ ان بدؤں کو لالچ دے کر لے آیا تھا ۔ جنہوں نے اس کے حق میں شادی دے دی ورنہ کسائی جانتا تھا کہ حق سیبویہ کی طرف ہے ۔ اس کے سوا اور بھی کسائی پہ تہمتیں رکھی گئیں ۔ جن کے بیانی سے مضمون طویل ہو جائے گا ۔

حق بات یہ ہے کہ کسائی کی علمی زندگی کی تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ خصم کو ہر طرح شکست دینے سے بلند تھے اس نے جو حق سمجھا تھا اس کو پیش کیا ۔ اصل بات یہ ہے کہ کوفے اور بصرے کے نو کے دو در سے مختلف نظریات کے حامل ہیں کوفے والے لغت میں وسعت کے قائل ہیں اس لئے وہ عرب کے کلام میں شاذ و ضرورت کو بھی لے لیتے ہیں اور اس کو غلط نہیں کہتے اور ان پر دوسرے الفاظ کو قیاس کرنا بھی جائز قرار دیتے ہیں ۔ ان کے برعکس بصرے کا مدرسہ جس کا قائد سیبویہ ہے اس میں غشی کرتا ہے اور جب تک کثیر الودود و متواتر کلام انہیں ہوتا تب تک اس کو نہیں لیتے اور اس کے خطا ہونے کے قائل ہیں ۔ اس پر قیاس کرنے کو بھی جائز نہیں کہتے ۔ دونوں اماموں نے اپنے اپنے مذہب اور عقیدہ کے موافق بات کی تھی ۔ اس میں کسائی کو اپنے ساتھ اہراب کو ملا کر سازش کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ کسائی اس طرح یہ حرکت کر سکتے تھے حالانکہ اس کے علم و صداقت کے اس کے ہم عصر بھی قائل ہیں ۔ ابن العزلی کہتا ہے کہ میں نے کبھی کسائی کو جھوٹ بولتے نہ دیکھا ۔ اسحاق موصلی کہتا ہے کہ میں نے کسائی سے نحو کا زیادہ جاننے والا نہیں دیکھا اور نہ کوئی تفسیر

میں اس سے بہتر اور نہ مسائل کے جواب میں اس سے کوئی زیادہ حاذق تھا۔

**خیالی مناظرہ** کسائی کے مخالفین نے اس کے حق میں ایک عجیب

افزار کی جو حکایت لکھی ہے یہ وہ مناظرہ ہے جس

کے متعلق کہتے ہیں کہ کسائی اور دو حذاق متکلمین کے درمیان ہوا تھا۔ اور کسائی کو اس میں بُری طرح شکست ہوئی۔

عبدالرحمن بن علی یزدادی لغوی اپنی کتاب جلاء المعرفۃ میں لکھتا ہے کہ

ابراہیم نظام اور ضراد کوئی دونوں رشید کے پاس گئے اور ان کا

”تضا و قدر“ کے متعلق باہمی ایسا دقیق مناظرہ ہوا جس کو رشید

بھی نہ سمجھ سکے۔ تب رشید نے اپنے ایک غلام سے کہا کہ ان دونوں

کو کسائی کے پاس لے جا۔ تاکہ اس کے سامنے باہمی مناظرہ کریں اور

پھر کسائی تجھے یہ بتائے گا کہ دونوں میں کون کامیاب رہا؟ جب یہ

دونوں عالم رشید سے اٹھ کر کسائی کی طرف جانے لگے تو راستے میں

نظام نے ضراد سے کہا کہ تجھے معلوم ہے کہ کسائی صرف علمِ نحو اور حساب

کا عالم ہے تجھے اس سے نحو کا مسئلہ پوچھنے کیلئے تیار رہنا چاہئے لوی میں

اس سے حساب کا مسئلہ پوچھوں گا اور اسی طرح ہم اس کو اس کے ساتھ

مشغول رکھیں گے کیوں کہ اگر وہ ہم سے علمِ کلام کی علمی باتیں سنے گا جن

کو اس نے پہلے نہیں سنا وہ ان کو نہیں سمجھتا تو ڈر ہے کہ وہ ہمیں نہایت

کہے گا۔ جب دونوں اس کے پاس پہنچے تو اس کو سلام کیا۔ اور ضراد

مخاطب ہو کر کہنے لگا کہ اللہ آپ کو ٹھیک رکھے میں آپ سے نحو کا ایک مسئلہ

پوچھتا ہوں۔ کسائی نے کہا کہ کیا پوچھتے ہو؟ ضراد نے کہا کہ فاعل اور

مفعول بہ کی کیا تعریف ہے؟ کسائی نے کہا کہ فاعل کو ہمیشہ رفع (پیش)

ہوتا ہے اور مفعول بہ ہمیشہ نصب (زبر) ہوتا ہے۔ یہ سن کر ضراد نے کہا،

کہ پھر آپ ضربِ نرید میں نرید کو پیش کیوں دیتے ہو حالانکہ آپ

نے کہا ہے کہ مفعول بہ ہمیشہ منصوب ہوتا ہے کسائی نے کہا کہ یہ نائب فاعل ہے۔ تب ضرار نے کسائی سے کہا تو پھر آپ نے عبارت میں غلطی کی کیوں کہ۔ آپ نے اس طرح نہیں کہا کہ وہ مفعول جس کا فاعل مذکور نہیں ہوتا وہ مرفوع ہوتا ہے۔

اس کے بعد ابراہیم آگے بڑھا اور کسائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا اللہ آپ کو ٹھیک رکھے میں آپ سے حساب کا ایک مسئلہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کسائی نے کہا بولو۔ ابراہیم نے پوچھا کہ دس کا جذر کیا ہے؟ کسائی نے کہا کہ جملہ حساب والوں کا اتفاق ہے کہ دس کا جذر نہیں ہوتا۔ ابراہیم نے پوچھا کہ کیا اللہ کو دس کا جذر معلوم ہے؟ کسائی نے کہا کہ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے تب ابراہیم نے کہا کہ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اللہ جب ہر چیز کو جانتا ہے تو اس نے اس کو انبیاء میں سے اپنے کسی نبی کو یہ علم دیا ہوگا اور نبی نے اپنے کسی برگزیدہ ساتھی کو بتایا اور یہ علم اس طرح نقل ہوتا ہوا آیا۔ یہاں تک کہ دس کے جذر کا علم میرے پاس پہنچا اور میں اس کا جذر جانتا ہوں۔ تم نہیں جانتے۔ اور تم اپنی گفتار میں غلطی ہو۔

اس قصہ میں آتا ہے کہ اس کے بعد کسائی نے غلام سے کہا کہ ان دونوں کو امیر المؤمنین کے پاس لے جاؤ۔ اور ان سے یہ کہو کہ یہ دونوں زندقہ ہیں کافر ہیں۔ لیکن غلام بڑا عقلمند تھا اس نے رشید کو سارا قصہ سنایا۔ رشید نے دونوں کیلئے اچھے انعام کا حکم دیا اور ان کو واپس کیا۔

اس واقعے کی سادگی کو دیکھ کر ہی اس کے جعلی اور من گھڑت ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ یا قوت جس نے اس قصے کو گمشدہ کتاب سے نقل کیا ہے خود کہتا ہے کہ یہ حکایت مجھے مصنوعی معلوم ہوتی ہے۔ اور میں اس کو اس لئے لکھا ہے کہ ایک عالم کے خط سے اس کو پایا ہے۔

کسائی اور سیبویہ کے درمیان جو مناظرہ ہوا

**کسائی کا آخری مناظرہ**

تھا اس کو دیکھ کر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سیبویہ

عظیم علمی شخصیتوں میں سے آخری شخصیت ہوگی جس سے کسائی کا مناظرہ ہوا۔ سیبویہ

خلیل کے بعد بصرہ کے سب سے بڑے غوی تھے۔ اس کے علاوہ مرتبت کی دلیل صاحب "الکتاب" ہونا کافی ہے۔ آج تک اس کتاب سیبویہ سے بڑھ کر کوئی کتاب غویں نہیں لکھی گئی۔

کسائی نے اس کے بعد علم و فضل کی ایک بلند چٹان ہو کر زندگی بسر کی جس کے وفور علم کے اس کے ہم عصر بھی معترف تھے۔ یہ اس مناظرے کے قصبے سے ظاہر ہوتا ہے جو کہ شاید اس کا اور ایک دوسرے عالم "فراہ" کے درمیان آخری مناظرہ تھا۔

فراہ کہتا ہے کہ ایک غوی عالم نے میری مدح کرتے ہوئے کہا کہ تم کسائی کے پاس کیوں آتے جاتے ہو۔ حالانکہ تم بھی اس جیسے غوی ہو؟ میرے اندر اس کی تعریف سے غرور پیدا ہوا اور میں کسائی کے ساتھ ایک ہمسری حیثیت سے مناظرہ کرنے لگا۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو اس کے سامنے اس طرح پایا جیسے کوئی پرندہ اپنی چونچ سے سمندر سے پانی لے رہا ہو۔

کسائی کی وفات ۱۱۸۷ھ میں ہوئی اور یہ وہ سال ہے جس میں فقیہ محمد بن حسن شیبانی کی وفات ہوئی۔ یہ دونوں رشید کے ساتھ "رے" کے سفر میں شریک تھے خلیفہ نے ان دونوں کی وفات سے اپنے حزن اور غم کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا ہے کہ "رے" کے اندر ایک ہی دن میں فقہ اور نحو دونوں مدفون ہو گئے۔"

## ملحات

شاہ ولی اللہ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے، اس میں وجود سے کائنات کے ظہور تدریجی اور تجلیات پر بحث ہے یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ قیمت : دو روپے

تذکرہ حضرت مرشدنا حاجی شیر محمد شاہ صاحب باجر مدنی گھوٹکی والا رحلہ

نتیجہ فکر مولانا دین محمد ادیب فیروز شاہی

آن شیر حق و شیر محمد ز جهان رفت	در عہد برین نزد خداوند تعالیٰ
یکسو شدہ در ذکر خدا نحو ہی ماند	بنمودہ ز دل دور ہمہ غیر خدا را
پردہ انہ پی شمع رسالت ز ازل گشت	بی تاب پی شاہ رسل بود سراپا
در کوئے حبیب حق و زریہ اقامت	تا آنکہ سفر کرد ازین ملک پہ عقبی
بی عون مددگار سکونت بہ مدینہ	مقدمہ کے نیست بجز بخشش مولیٰ
ملی کرد مقامات طریقت بہ ریاضت	در خدمت بابرکت آن اشرف و اعلیٰ
از شیخ طریقت بشدہ پیر طریقت	شد را انما سوائے خداوند تعالیٰ
بنوشت کتابی بہ حجج بہرج آن شیخ	بود آن بہ مناسک حج علامہ یکتا
تاریخ بفرمودہ مراتب غیبی	مقدمہ مخادیم بگو سال ادیب!

۱۳۸۵ھ

ذکر حضرت پیر عبدالستار جان صاحب سرہندی مجددی غفرلہ تعالیٰ

عبدالستار رفت از دنیا	چونکہ او را رسید حکم خدا
عالم و فاضل مدیم مثال	داشت در علم دین یدِ ملوئی
گوہر از معدن عہد بود	در جمال و کمال دان یکتا
رحمت و مغفرت زحق یا بد	باب رحمت شود ز بہر شوا
از طفیل رسول بر جانش	رحم فرما کریم ! صبح و مسا
مستجاب از ادیب یارب کن	ہرچہ کردم ز تو سوال و دعا

عبدالستار، عارف رحمن

ہست سال وصال او بہ خدا

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحابِ علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہلِ قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُن کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا جریدہ

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جو شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا



Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

# شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین جلیانی سندھ یونیورسٹی  
پروفیسر جلیانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے  
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر پیر حاصل  
بجائیں کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

## المسومین جادیش الموطا

تالیف الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب تاریخ سے ۲۲ سال پہلے تحریر ہوئی اور انامہ اللہ شاہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں جگہ جگہ نامور  
کے تشریحی مباحث ہیں مگر حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فاضل شرح اہم غنی پر آپ نے دوسرا مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی متن  
ہے شاہ صاحب نے المستوی میں الموطا اہم کتاب کہنے سے پہلے سے ترتیب دیا ہے اہم کتاب کا کہنا وہ اقوال میں وہ باقی مہندس سے مفروضہ حضرت کر  
دینے لگے ہیں الموطا کے بڑے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے نو تفسیری نکالت  
محی ثانی کر دیئے ہیں۔  
دلائل کثیرے کی نفیس جلد دو حصوں میں قیمت ۲۰۰ روپے

## ہمعات

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔  
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی  
تربیت و تزکیہ سے جن بلبل و منازل پر گزر جاتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔  
قیمت دو روپے

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ مجاوی

شاہ ولی اللہ اکبر دہلوی کا علمی مجلہ

(۱۰) ۷۱

ماہنامہ

الرحیم

شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکبر دہلوی، صدر، حیدر آباد

بجلیں اذارت

ڈاکٹر عبدالواحد علی پوتا،

مخدوم امیر احمد

مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

# الرحیم

جلد ۴ | ماہ مارچ ۱۹۶۷ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ | نمبر ۱۰

## فہرست مضامین

صفحہ	میر	شذرات
۶۵۰	ظافر قاسمی	اندلس کی عظمت
۶۵۳	عباد اللہ فاروقی	علامہ ابن حزم
۶۵۷	ڈاکٹر عبدالواحد بالیپوٹہ	اسلام اور مرکزیت
۶۶۷	حافظ رشید احمد ارشد	مفتی کفایت اللہ
۶۷۲	علامہ موسیٰ جبار اللہ	اسلام اور بیمہ
۶۸۷	مولانا غلام رسول چہر	مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور حدیث { اور ان کی خدمات
۷۲۱		

## نوٹ

اس اشاعت میں الرحیم کے دستوری صفحات سے آٹھ صفحات زائد  
دئے گئے ہیں۔

## شذرات

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے قیام کو صرف تین سال کا مختصر عرصہ گزرا ہے۔ اس مدت میں اکیڈمی نے حجۃ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے علوم اور فلسفہ اسلام کے اشاعت کی جو بے لوث خدمت سرانجام دی ہے وہ اس کے نادر علمی ذخیروں کی مطبوعات سے عیاں ہے، اس مرتبہ شذراتہ کو ہم ان چند مقتصد علماء، ادباء اور دانشوروں کے آثار کی نذر کرتے ہیں جنہوں نے بغیر نفیس اس اکیڈمی کے دفتر میں تشریف لاکر اس کی مطبوعات، کتب خانہ اور علمی کام کا معائنہ کر کے اپنی رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ ایسے زائرین میں غیر ملکی ادیب اور عالم بھی ہیں، لیکن یہاں صرف چند ملکی ادباء اور دانشوروں کی آراء پیش کی جاتی ہیں:

مولانا محمد عبدالقدوس صاحب صدر شعبہ اسلامیات پشاور یونیورسٹی فرماتے ہیں،  
 ”آج مجھے شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی زیارت کرنے کا شرف ملا، مولانا .... ریسرچ پروفیسر نے اکیڈمی کی مطبوعات اور اکیڈمی کی زیر تکمیل تالیفات کا روشناس کرایا، میں یہ کہنے میں جھجک محسوس نہیں کرتا کہ قدیم علمی ذخیرہ سے کما حقہ، رابطہ قائم کرنے کی جو خدمت اکیڈمی انجام دے رہی ہے وہ اس ملک میں اپنی مثال آپ ہے۔ میری دہلیہ کہ اللہ تعالیٰ اکیڈمی کے کارکنوں کو ہمت دے کہ ان کی وجہ سے ہمارے اسلاف کے کارنامے زندہ ہوں اور ان سے قوم کو استفادہ کی سعادت بھی نصیب ہو۔ اکیڈمی کی بنیاد رکھنے والے حقیر اصحاب کو بھی اللہ تعالیٰ اپنے اسس کا بخیر کا اجر عطا فرمائے“

مولانا محمد عبدالرشید نعمانی ریڈر جامعہ اسلامیہ بھاولپور کی رائے گرامی:  
 حامداً و مصلیاً و مسلماً اما بعد، شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں حاضر ہوا۔ حضرت فاضل مولانا .... سے پہلے سے نیاز حاصل ہے، ان کی علمی خدمت اور فضل و کمال سے متعارف ہوں۔ اکیڈمی کی خوش قسمتی ہے کہ ایسا فاضل اس کی خدمات علمیہ پر متعین ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے علوم سے جو موصوف کو مناسبت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کی نگرانی میں امید ہے کہ اکیڈمی اپنے شایان شان روز افزوں ترقی کرتی رہے گی اور ملک و ملت کو حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم و نظریات سے پوری طرح روشناس ہونے کا موقع ملے گا۔

اب تک اکیڈمی کی جو کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ تحقیقی و تحشیہ اور کتابت و طباعت کے حسن و خوبی سے پوری طرح آراستہ ہیں۔

کیا ہی اچھا ہو جو مولانا کی تحقیقی و تحشیہ کے ساتھ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی بے بہا کتاب حجۃ اللہ البالغہ اور ان کی گراں مایہ تصنیف ازالۃ الخفا کے نئے ایڈیشن اکیڈمی سے شائع ہو کر اہل علم کے دیدہ و دل کو منور و فروزاں کریں۔

پروفیسر فضل الرحمن صاحب ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی کی رائے گرامی  
آج شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں آنے اور اسے دیکھنے کا موقعہ خدائے دیا۔ میں اکیڈمی کی بعض مطبوعات خصوصاً ”الرحیم“ سے واقف تھا اور جو حضرات یہاں کام کر رہے ہیں ان کو جانتا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اتنی کثیر مطبوعات کر رہے ہیں اور اتنی اعلیٰ پایہ، اللہم زدہ فرد۔ حضرت شاہ صاحب کے فکر کی ترجمانی کی موجودہ زمانے میں از حد ضرورت ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اعلیٰ مطبوعات کرنے کا کام اس اکیڈمی سے زیادہ سے زیادہ ملے، یہ اسلام اور پاکستانی اسلامی ثقافت کے احیاء کا ایک فعال ادارہ ثابت ہو رہا ہے۔

پاکستان کے ممتاز دانشور جناب ممتاز حسن صاحب ڈائریکٹر نیشنل بینک کی رائے  
مولانا قاسمی نے آج مجھے شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں دعوت دے کر میری عزت افزائی کی ہے۔  
یہ ادارہ اپنی علمی سعی و کوشش کی وجہ سے پاکستان کے مقتدر ترین اداروں میں سے ہے۔ شاہ ولی اللہ پر جو کام اب تک ہوا ہے وہ قابل قدر ہے۔ مجھے امید ہے کہ شاہ صاحب کے معاشی اور معاشرتی افکار پر تحقیقی روشنی ڈالی جائے گی، ان موضوعات پر مستقل تصنیفات کی

ضرورت ہے کسی ملک اور قوم کا مقام دنیا میں اسی وقت بلند ہوتا ہے جب وہاں اہل علم پیدا ہوں۔

لا فخر الا لاهل العلم انہم علی الہدٰی لمن اہتدی ادلاء  
شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں ایک بہت بلند پایہ علمی اور تحقیقی ادارہ بننے کی صلاحیت  
موجود ہے اور مجھے امید ہے کہ یہ صلاحیت بروئے کار آئے گی۔

اکیڈمی کے کتب خانہ کے متعلق ڈاکٹر خواجہ صلاح الدین صاحب ڈاکٹر انسٹی ٹیوٹ  
آف کیمیکل ٹکنالوجی پنجاب یونیورسٹی کی رائے :-  
اکیڈمی کا یہ کتب خانہ نادر و نایاب کتابوں کا خزانہ ہے اس گنج ہائے گراں مایہ کی حفاظت  
قومی و ملی فرض ہے، پاکستان میں اس پایہ کے کتب خانے بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔

پاکستان کے مشہور مؤرخ سید حسام الدین راشدی کی رائے گرامی  
اکیڈمی کا کتب خانہ نہایت بہترین ہے، مولانا کا حسن انتخاب کیا کہا جائے! ان کی ذات  
گرامی سے یہی امید ہے کہ یہ ادارہ ایک دن شاندار ہوگا، اس وقت تک جو بھی کام ہوا  
ہے وہ قابل اطمینان ہے اور روشن مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

سندھی کے مشہور ادیب اور طباعت کتب کے سرجناب محمد براہیم جویو اعزازی ناظم سندھی ادبی بورڈ کی رائے :-  
شاہ ولی اللہ اکیڈمی میں حاضر ہو کر محترم... کا شرف زیارت حاصل ہوا، اس ادارے نے تین سال  
کے مختصر عرصے میں جو علمی کام کیا ہے وہ یہاں کے علماء، ادباء اور علمی و تحقیقی اداروں کے لئے ایک طرف  
باعث فخر ہے تو دوسری طرف شعل راہ بھی ہے۔ محنت، خلوص، اعلیٰ مقصدیت کے معجزہ کار فرماؤ کو اگر دیکھنا  
ہے تو اس ادارے کے مختصر عرصے میں کام کو دیکھنا چاہئے۔ میں نہایت ادب اور احترام سے اس  
ادارے کے کارپردازوں کی خدمت میں یہ عرض رکھوں گا کہ اپنی اشاعت کے دائرے میں سندھی تراجم  
اور تصانیف کو اولیت دی جائے تاکہ اس خطے کے لوگ زیادہ سے زیادہ فیض حاصل کر سکیں۔

# اندلس کی عظمت

## ظافر قاسمی

چالیس سال قبل تاریخ اسلام کا سبق پڑھتے ہوئے اساتذہ نے یہ بتایا تھا کہ اندلس گم شدہ فردوس ہے۔ یہ اندونہنگ تعمیرِ جم میں اور ہم سے بعد کو آنے والوں کے نفوس میں اندلس کے ساتھ نقش کے مانند ہو گیا۔ اس کے بعد جب کبھی اندلس یاد آتا ہے تو اس کا یہ وصف بھی لازمی طور پر یاد آجاتا ہے۔ اور ہمارے خیالات کے سامنے ایک اعلیٰ تہذیب کا نقشہ پیش کرتا ہے جو کسی دور میں قائم ہوئی اور پھر ختم ہو گئی۔

**مراقی اور گریہ** | جملہ مسلمان عام طور پر اور عرب خاص طور پر اس مصیبت پر آنسو بہاتے رہے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں جب دس سال کا تھا تو ادبِ اندلس کے خاتم ابوالبقا صالح بن شریف رزندی کا یہ قصیدہ یاد کیا تھا:-

لکل شیء اذا ماتم فقصان	ہر ایک شے جب کال کو پہنچتی ہے تو نقصان پذیر ہوتی ہے۔
فلاینر بطیب العیش انسان	اس لئے کسی بھی انسان کو عمدگی عیش پر مفرور نہ ہونا چاہیئے۔
ھی الامور کما شاهد تھا، دول	یہاں کی چیزیں بدلتی رہتی ہیں جیسا کہ میرا مشاہدہ ہے۔
من سرکا زمن، ساعته اذمان	کہ اگر ایک وقت کوئی خوش بھی رہا تو اس سے طویل زمانہ وہ تکلیف میں پڑے گا۔

وهذه الدار لا تبقى على احد	یہ دنیا کسی کا ساتھ نہ دے گی۔
ولایدر و مر على حال لها شان	اور نہ کسی ایک حال پر رہے گی۔
این الملوك ذوا الیجان من یمن	میں کے تاج دار بادشاہ کہاں گئے۔
والیمنه کما لک	اور انہ کو تابع و تاجدار کہاں گئے۔



واین ما شاده شداد فی ارم؟  
واین ما ساسه فی القریس سلسان؟  
واین ما حازه قازون من خصب؟  
واین عاد و شداد و قحطان؟  
اقی علی البکل امر لا مرد له ،  
حتی قضوا فکان القوم ما کانوا  
وصل ما کان من ملک ومن ملک  
کما حکى عن خیال اللطیف و سنان

شداد نے ارم میں جو پائدار باغ بنایا تھا وہ کہاں گیا ۔  
اور ساسان نے ایران میں جو سیاست چلائی وہ کہاں گئی۔  
قازون نے جو سونا جمع کیا تھا وہ کہاں گیا۔  
اور خود عاد، شداد اور قحطان کہاں چلے گئے۔  
ہر ایک پر وہ چیز (موت) آئی جو لوٹ نہیں سکتی۔  
یہاں تک کہ یہ چل بسے اور ان کا نام و نشان نہ رہا۔  
اور یہ سب حکومتیں اور سلاطین  
مانند خواب رہ گئے۔

اس مثنوی سے چار صدی قبل دوسرے کئی مثنوی ہیں، کیونکہ اندلس کے شہر یکے بعد دیگرے  
مسلمانوں کے دشمنوں کے ہاتھوں ختم ہوتے رہے، جس سے شعرا میں درد و حزن کا دریا جوش  
ماتا رہا اور ان کی زبانوں پر بے اختیار غم کی کہانیاں جاری ہوتی تھیں اور ان کے اشعار میں آہ و  
بکا کی کیفیت نمودار ہوتی تھی۔ اس مصیبت کا احساس نہ صرف مسلم عربوں میں رہا لیکن مسیحی  
عرب بھی اس غم میں ان کے شریک تھے۔ ابو الفضل ولید بن طغر ۱۹۳۹ء کا مسیحی لبنانی معاصر  
ادیب کا قصیدہ اس کا شاہد موجود ہے، اس قصیدے کے کچھ اشعار ملاحظہ فرمائیں :-

و کو مساجد اعلینا ما ذنہا  
فا طلعت انجما منها معالینا  
تلك المساجد صارت للعدی بیعا  
بعد الاثمۃ لا تقوی السرہابینا  
یا ایہا المسجد العانی بقصر طیبۃ  
هل تذکرک الاجراس تاذینا

اور کتنی مساجد تھیں جن کے مناروں کو ہم نے بلند بنایا۔  
پھر ان سے ہماری بزرگیاں بلند ستاروں کی طرح نمودار ہوئیں۔  
اب یہ مساجد دشمنوں کی کنیسا بنیں ہیں۔  
انہ کے جانے کے بعد راہبوں کو دوست نہیں رکھتیں۔  
اے دشمنوں کے ہاتھ میں مقید قرطبہ کی مسجد۔  
کیا تجھے یہ جرس اذان یاد دلاتے ہیں۔

اور محرابوں کے اندر صورتیں جو واضح و کھائی دیتی ہیں۔  
اور منبروں کی آوازیں نہیں بلا رہی ہیں۔

ایک متوقع آفت | میرے خیال میں اندلس کی تباہی، مسلمانوں کے عقلا، حکماء

اور مفکروں کے ہاں کوئی غیر متوقع اور ناگہانی چیز نہ تھی اور جب سے ان کے قدموں نے اس سرزمین کو روندنا تھا اس وقت سے یہ خطرہ پیش نظر تھا۔ اس لئے وہ قوم کو ہمیشہ خوف و ڈرتے رہے کہ اگر انہوں نے اللہ کی رسی کو (متحد ہو کر) نہ پکڑا اور آپس میں تفرقہ ڈالا تو ایک دن ان کا برا ہتھ ہو گا۔ مسلم عقلا نے باہمی اختلاف کے برے نتائج کے سلسلے میں جو کچھ اپنی تالیفات میں صراحت کی ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ اسی طرح عرب کے ادبا نے بھی اپنے مثالی کلام میں اتحاد کے متعلق بہت کچھ کہا ہے۔

مسلمانوں کے باہمی اختلاف کے نتائج پر سب سے پہلے طارق بن زیاد کو اس صحت متنبہ ہوا جب وہاں پہنچنے کے بعد کشتیوں کو جلانے کا حکم دیا اور اپنے لشکر سے یہ مشہور خطاب کیا۔  
 ”تم جان لو کہ اس جزیرے میں تمہاری حالت ان یتیموں سے بھی بدتر ہے جو کجخیل  
 کے دست و خون پر حاضر ہوئے ہوں۔ خدا تمہارے لئے سوا صبر اور صداقت کے اور کوئی چیز نہیں۔“  
 اندلسیوں کے ہاں اس شعور کا عام احساس مجھے ان کے آثار سے نمایاں نظر آیا جن کو میں نے ۱۹۶۲ء میں اندلس میں دیکھا۔ میں نے طلیطلہ جرج کے عجائب خانہ میں ایک ریشمی چادر دیکھی جس پر عربی زبان کے واضح الفاظ میں یہ لکھا ہوا تھا ”النصر والتحکیم والفتح المبین لمولانا ابوالحسن امیر المؤمنین“ یعنی نصر الہی اور تمکین اور فتح ممین امیر المؤمنین مولانا ابوالحسن کے لئے الخ۔ بعینہ یہ عبارت غرناطہ کے قصر حمراء کی دیواروں پر بھی متعدد جگہ نام کی تصویر سے منقوش پائی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ دعا صرف نصر اور فتح کی نہ تھی لیکن تمکین اور قبضہ رہنے کا لفظ بھی ساتھ ساتھ تھا، اس سے خلق اور پریشانی کے شعور کا پتہ لگتا ہے۔  
 اندلس کی تاریخ داخلی اختلافات اور نزاعوں سے بھری پڑی ہے،  
**ابو حفص بن برد** وزیر کاتب، ابو حفص بن برد اصغر پہلا شخص ہے جس نے وہاں کے مسلمانوں کو باہمی اختلاف کے برے نتائج سے خوف دلایا اور یہ کہا :-

”اب وقت آ پہنچا ہے کہ تم اپنے خوابیدہ عقلوں کو بیدار کرو! آپس کے کینوں اور دشمنیوں کو باہر پھینک دو اور تیروں کو ان کے تھیلوں میں اور تلواروں کو ان کے میانوں میں اور بھالوں کو ان کی جگہوں میں رکھو اور تم یہ جان لو اللہ تم پر

قدرت رکھتا ہے اور تمہاری پیشانیوں کو پکڑ سکتا ہے۔ اللہ کے غضب سے ڈرو  
اس کا کم سے کم غضب یہ ہے کہ وہ اپنی نعمتیں تم سے روک لے اور تمہیں مختلف  
مصائب میں گرفتار کرے۔ اسی طرح اپنے طویل کلام اور خطبے میں ان کو ڈرانا رہا۔

کاشش! مسلمان اپنے اندرونی اختلافات کو چھوڑتے اور اقتدار کی ہوس میں لیک  
دوسرے پر حملہ آور نہ ہوتے۔ سب سے المناک بات یہ ہوئی کہ آپس کی لڑائیوں میں  
اپنے ان عیسائی دشمنوں سے بھی مدد کے طالب ہوئے جو اندلس میں مسلمانوں کی تباہی  
منتظر تھے۔ کتاب الحلل السندیہ کا صاحب لکھتا ہے کہ اندلس میں مسلمانوں نے ایک ایسے  
دروازہ کھولا جس سے دوسرے داخل ہو رہے ہیں۔

ابو حفص بن برد، اندلس میں باہمی متحارب مسلمانوں کو ملک سے جلا وطنی کے متعلیٰ  
ڈراتے ہوئے کہتا ہے مجھے یہ تیرہ بچہ ہے کہ تم نصاروں سے عسکری مدد لے کر اسلامی ملک پر  
کرانے کا خیال رکھتے ہو، اور وہ یہاں آکر مسلمانوں کے آثار طائیں گے، ان کے اموال کی بیخ  
کریں گے، مسلمانوں کا خون بہائیں گے، ان کے بیٹوں کو غلام بنائیں گے اور ان کی عورتوں  
خدمت لیں گے، اگر نعوذ باللہ یہ بات ہوگئی تو اس سے تم اپنے وطن سے نکلنے کے لئے تیار  
جاؤ اور یہ ایسا جرم ہے کہ تباہی کی خبر دے رہا ہے۔ یہیں یہ بھی ڈر ہے کہ نصاریٰ ملک  
اندرونی اختلاف سے واقف ہو جائیں اور پھر وہ ہم پر حملہ آور ہو جائیں یہ ایک ایسا سانحہ  
کہ جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ ابن برد ایک فریق سے زور دے کر یہ کہہ رہا ہے۔ ”مجھے معلوم ہو  
کہ تم الموفق امی الجیس کے ساتھ مل گئے ہو اور مظفر ابو محمد کا مقابلہ کرنا چاہتے ہو اور اس کو شک  
دینے کے لئے ہر ایک فریق نصاروں سے مدد کا طالب ہے اور تم یہ چاہتے ہو کہ ان کے ذمہ  
تم اپنا بدلہ لو گے اور اپنے خطے کی حفاظت کرو گے، لیکن اس سے جو دوسرے فتنے اور مص  
برپا ہوں گے جس سے کوئی منصف یا ظالم بچ نہیں سکتا، کیا تم ان سے بے خبر ہو؟ وہ تو مس  
مردوں کو ختم کریں گے، بچوں کو یتیم اور عورتوں کو رانڈ بنائیں گے، خون بہائیں گے، مل و  
کی لوٹ مار کریں گے، وطن سے ان کے باشندوں کو نکالیں گے، اس کے بعد وطن خالی کرنے  
سوا کوئی چارہ نہ ہوگا، اللہ اس بُرے انجام سے محفوظ رکھے۔“

# علامہ ابن حزم

عباد اللہ فاروقی

علی بن حزم کی ولادت اندلس میں آخری ماہ رمضان ۳۸۴ھ بمطابق ۹۹۲ء میں ہوئی۔  
 قول ابن بشکوال ابن حزم تمام علماء اندلس میں جامع ترین عالم تھے۔ آپ حافظ، محدث، فقیہ  
 بہتہ، سیاستدان ہونے کے علاوہ دیگر کئی علوم میں جہارت تامہ رکھتے تھے۔ ابن خلکان کا خیال  
 ہے کہ ابن حزم کا خاندان بنو امیہ سے تھا۔ ان کے جدِ اعلیٰ پہلے پہل اسلم لائے۔ اور فارس  
 ترک کر کے اندلس میں سکونت اختیار کر لی، ان کا نام یہ زید تھا۔

ان کا حسب نسب حسب ذیل ہے:-

ابو محمد علی بن احمد بن سعید بن غالب بن صالح بن طیب بن معدان بن سفیان بن زید  
 بن زید بن الوسفیان بن حرب بن امیر بن عبد شمس اموی۔

ان کے والد ابو عمر احمد دولت عامریہ کے وزیر تھے۔ بادشاہ ابو تمام منصور تھا۔

عہ ذہبی نے ہی خلف لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۳۔

ابن خلکان و تذکرۃ الحفاظ للذہبی۔

ابو عمر احمد کا شمار بڑے بڑے عالموں میں ہوتا تھا۔ سارا بلاد مغرب ان کے محسن انتظام اور محسن اخلاق کا معرفت تھا۔ ابن حزم کا ماحظہ نہایت قوی تھا اور بہت ہی ذکی اور ذہین تھے۔ یہ پہلے شافعی تھے لیکن بعد میں ظاہری ہو گئے۔ یعنی قیاس کو نہیں مانتے تھے۔ اور ظاہر حدیث پر عمل کرتے تھے۔

ابن خلکان اور صاحب شذرات الذہب ابن العماوی کے بیان کے مطابق انہوں نے حدیث کی تحصیل ۳۹۹ میں شروع کی لیکن ذہبی نے اپنی کتاب تذکرۃ الحفاظ میں تحصیل حدیث کی ابتدا سنہ ۳۹۹ بتائی ہے۔ علامہ شبلی نے مؤخر الذکر کے بیان کو تسلیم کیا ہے۔

علمی ذوق ان کو اپنے والد سے ترکہ میں ملا جو بلاد اندلس کے وزیر ہونے کے باوجود اعلیٰ علمی ذوق رکھتے تھے اور ان کے ارد گرد علماء اور فضلا کا مجمع رہتا تھا۔ چنانچہ انکے کھولتے ہی انہوں نے اپنے ارگرد علم ہی علم دیکھا، اور بڑے ذوق و شوق سے اس کی تحصیل میں لگ گئے۔ علم کے بحر ذخائر میں ابن حزم نے بھی خواجی کی اور علم و حکمت کے وہ موق نکلے کہ جن کی چمک اور دک سے آج بھی دنیا کی آنکھیں خیرہ ہیں۔

تذکرۃ الحفاظ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے والد کے انتقال کے بعد منصور (دولتِ علمیر کے حکمران) نے ان کو وزیر مقرر کیا تھا۔ ان کے والد کا انتقال ذی قعدہ ۴۱۹ میں ہوا۔ اس طرح یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی وزارت کا زمانہ یقیناً ۴۱۹ کے قریب قریب ہے۔ منصور کے انتقال کے بعد مستظہر باللہ عبدالرحمن بن ہشام نے ان کو اپنا وزیر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ تو انہوں نے وزارت کے کاموں میں دلچسپی لی۔ لیکن رفتہ رفتہ علمی شوق وزارت پر غالب آیا۔ انہوں نے وزارت چھوڑ دی اور اپنا تمام وقت علوم و فنون کے حاصل کرنے میں لگا دیا۔ کتاب و سنت کے علاوہ ان کو دنیا کے مروجہ مذاہب پر بڑا عبور تھا۔ اپنی مشہور کتاب ”المسل والاخل“ میں علامہ ابن حزم نے ملاحدہ، فلاسفہ یہود و نصاریٰ وغیرہ کے عقائد و خیالات

نقل کرتے ہیں اور ان کا رد لکھا ہے۔

غیر مذاہب کے رد میں علماء اسلام نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ مگر ان کی کتاب کو جو اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے وہ کسی اور مصنف کو حاصل نہیں ہوئی۔ دوسروں نے مذہب کے رد پر زیادہ زور دیا ہے اور مذاہب کے اصول و نظریات پر کم تو بھری ہے مگر علامہ ابن حزم کی خصوصیات یہ ہیں کہ انہوں نے غیر مذاہب کے عقائد و خیالات کو اصلی صورتوں میں پیش کیا ہے۔ اور پھر دلائل و براہین سے ان کے مسلمات اور کلیات پر ضرب لگائی ہے۔ تورات اور انجیل کے محرف ہونے پر ابن حزمؒ نے جو حقائق بحث کی ہے اس سے ان کی دقت نظر اور گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔

ابن حزم ابتدا میں قرآن و حدیث کے مطالعہ میں مستغرق رہتے، فقہ سے ان کو کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، مگر ان کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے ان کو فقہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور پھر تو اس فن میں انہوں نے وہ کمال پیدا کیا کہ امام داؤد ظاہری کے ماننے والوں میں کوئی ان کے برابر کا نہیں گزرا۔ اور فرقہ ظاہریہ کے لئے ان کی کتابیں ”المحلی“ اور ”کتاب الاحکام“ وغیرہ سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ تذکرۃ الحفاظ میں فی سبیلہ نے ابو محمد عبد اللہ بن محمد بن مغربی کے حوالے سے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک عظیم علم فقہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عبد اللہ بن مغربی کا بیان ہے کہ ابن حزم ایک جنازے کے ساتھ گئے اور مسجد میں جا کر جنازے کے دفن ہونے کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ ایک شخص نے ان سے کہا کہ مسجد میں بغیر نماز کے بڑھے ہوئے بیٹھ جانا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ مسجد میں ہر آنے والے کو ”تحتیہ المسجد“ پڑھنی چاہیے۔ اس شخص کے توجہ دلانے پر ابن حزم نے فوراً نفل نماز ادا کی۔ دفن کے بعد واپس ہوئے تو انہوں نے مسجد میں داخل ہوتے ہی جلدی سے نماز کی نیت باندھ لی۔ اور ”تحتیہ المسجد“ پڑھنا چاہی۔ ایک دوسرے شخص نے ان کو نماز پڑھنے سے منع کیا کیونکہ عصر کی

۱۔ مقالات شنبلی جلد چہارم ص ۳۵۔

۲۔ الملل والنحل ص ۴۸ باب الکلام علی التصاری۔

از ہو چکی تھی۔ اور عصر کی نماز کے بعد نفل وغیرہ نہیں پڑھے جاتے۔ ابن حزم بہت نحیف  
 تھے اور وہاں سے سیدھے اپنے استاد کے پاس آئے اور ان سے اس واقعہ کو بیان کیا  
 ہوں نے موطا امام مالک اور اس قبیل کی دو مری کتابیں پڑھنے کی ہدایت کی۔ چنانچہ ابن حزم  
 نے مسلسل تین سال تک بڑی دیدہ ریزی اور عرق ریزی سے فقہی کتابوں کا مطالعہ کیا۔

اس واقعہ کے بعد یا اس سے قبل ایک روز انہیں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا  
 بلنسیہ میں قیام پذیر تھے اور وہاں فقہ کے درس میں ایک روز شریک ہوئے۔ انہوں نے  
 حض فقہی مسائل کو گوں سے دریافت کئے جس کا ان کو جواب دیا گیا۔ ابی حزم نے جب ان  
 کے جوابات پر اعتراض کیا تو لوگوں نے ان سے کہا کہ یہ علم آپ کے پس کا نہیں۔ اس جملہ سے  
 ان کے پندار کو ٹھیس لگی اور اس علم کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو گئے۔

علامہ ابن حزم نے اپنی ایک کتاب "کتاب التقریب بعد المنطق میں عام فلاسفہ اور منطق  
 نے ذکر سے ہٹ کر ایک نئی راہ اختیار کی اور اپنی کتاب میں جتنی بھی شالیں دیں وہ ساری کی  
 ماری فقہ سے مشبوط ہیں۔

عام طور سے متاخرین اور متقدمین نے فقہ حدیث اور تفسیر وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ  
 فلسفہ اور منطق کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ ابن حزم وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے  
 عام روش کے خلاف منطق و فلسفہ ہی میں فقہ کو داخل کرنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی  
 مددگار کامیاب رہے۔ گو یہ روش عام نہیں ہو سکی مگر بہر حال ان کا یہ کام لائق صد تحسین ہے۔  
 ابن حزم شاعر بھی تھے۔ مضامین کے ساتھ ان کی شاعری بھی مسلمہ تھی۔ ان کی عمر کا بیشتر حصہ  
 ناظرے اور مباحثے میں گزرا۔

آپ کی وفات ۵۴۸ھ میں ہوئی جب کہ آپ کی عمر ۷۲ برس تھی۔

**تصانیف ۱۔** ابن حزم نے ہر قسم کے علوم پر قلم آزمائی کی۔ اور اربع (ابن حزم  
 کے بیٹے) کا بیان ہے کہ انہوں نے اپنے والد کی تصنیفیں جو جملے اور خاشاک ہونے سے نکال رہی تھیں  
 چار سو جلدوں میں اور اتنی ہزار اوراق پر مشتمل تھیں۔ ان کی مشہور تصانیف جن کا تذکرہ علامہ  
 نسیم الدین ذہبی۔ علامہ ابن خلدون۔ علامہ ابن العساکر۔ ابو صاحب مروۃ الجنان ابو محمد عبد اللہ

بن اسد وغیرہ نے اپنی کتابوں میں کیا ہے وہ حسب ذیل ہیں :-

- (۱) المحلی (یہ کتاب مصر میں گیارہ جلدوں میں چھپی تھی یہ کتاب الاحکام فی اصول الاحکام (آخر جلدوں میں) - (۲) الاصل الی فهم الخصال - (۳) کتاب الفضل فی المل والنحل (۵) کتاب اظہار تبذیل الیہود والنصارى، کتابین التوراة والانجیل - (۶) التقریب بعد المنطق والمدخل (۷) کتاب الصانع فی رد علی من قال بالتقلید - (۸) کتاب شرح احادیث الموطا - (۹) کتاب الجامع فی صحیح الحدیث - (۱۰) کتاب منعی الاجماع (یہ کتاب بھی مراتب الاجماع کے نام سے بین سال قبل مصر میں چھپی تھی - (۱۱) کتاب کشف الالتباس بین الخلیفہ واصلی القلیس (۱۲) سیرۃ النبویہ وغیرہ -

امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ اور جمہور علماء کے رد میں بھی علامہ ابن حزم نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا تذکرہ انہوں نے اپنی کتاب المحلی میں کیا ہے۔  
امام غزالی رحمۃ اللہ ابن حزم کی ذہانت، حفظ اور ذکاوت کے بڑے معترف تھے۔  
ذہبی ان کو مجتہد مانتے تھے، ان کا قول ہے کہ ان میں اجتہاد کے سارے شرائط پائے جاتے ہیں اور یہ طائے کبار میں سے ہیں۔ ابن حزم کی ایک کتاب ”طوق الحمام“ نے یورپ میں بہت شہرت حاصل کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا روسی انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں۔ انگریزی مترجم اے۔ آر۔ نیگل (A.R. NYGL) اور روسی مترجم ایم۔ اے۔ سیلر (M-A SALLAR) ہیں۔

## (ب) اشتراک دولت

ابن حزم فرماتے ہیں کہ قرآن مجید نے اشتراک دولت کا ایک مکمل مربوط اور متوازن نظام پیش کیا ہے۔ اسراف و تبذیر کی ممانعت کی گئی ہے۔ اموال میں سائل و محسوم کے



حقوق مقرر کئے گئے۔ اسی طرح تقسیم وراثت کا قانون بھی نافذ کیا گیا ہے تاکہ ہر نسل کی ساری دولت پوری سوسائٹی میں تقسیم ہو جائے۔

اسلام دولت کے ماخذوں کا مالک انسان کو نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کو قرار دیتا ہے۔ انسان کی ملکیت ذاتی کی نفی کی گئی ہے۔ انسان 'امین' تو ہو سکتا ہے لیکن مالک نہیں۔ مالک حقیقی ذات باری تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔ مختصر یہ کہ اسلامی نظام میں 'مالک' کے معنی صرف تمتع کے حقوق ہیں اس طرح اسلام ساری دولت کو تمتع کی حیثیت دیتا ہے 'تمتع' سے 'استفادہ' کرنے پر محدود اور شرائط عائد کئے گئے ہیں۔ فرد اور ملت میں جو ربط ہے اس کو قائم رکھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ تمتع سے استفادہ حاصل کرتے وقت بنی نوع انسان کی ضروریات کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ اس کیلئے شرائط ہیں جس کی نگران اسلامی حکومت قرار پاتی ہے۔ تاکہ معاشی توازن اور سماجی انصاف برقرار رہے۔

اسلام کے سب سے بڑے دشمن وہ لوگ ہیں جو اسلام کے قانون وراثت پر قانون رواج CUSTOMARY LAW کو ترجیح دیتے ہیں، یا وہ لوگ ہیں جو دولت کی مساوی تقسیم کو روکنے کیلئے 'ہبہ' یا 'وصیت' کے قانون کی آڑ لیتے ہیں، یا پھر وہ لوگ بھی ہیں جو مذہبی پیشوائی کے دھوپ میں مال کا ناجائز حصول کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چپے اور اپنے خاندان کیلئے زکوٰۃ و صدقات حرام قرار دے کر مذہبی اور معاشی اصلاح کی تاریخ میں ایک انقلابی قدم اٹھایا۔

اسلام سرمایہ داری کی مکمل بیخ کنی کرتا ہے، اسلام میں سودی عناصر کو بے دخل کیا گیا ہے۔ اور سود خوار سرمایہ داروں کے خلاف محاذ جنگ بنایا گیا ہے اسی طرح ذخیرہ اندوزی اور زراعت دوزی کو روکا گیا ہے اور تباہ کن ناجائز اجارہ داریوں کا خاتمہ کیا گیا۔ محفوظ اور ترقی پذیر سرمایہ پر سماجی تحفظ کا ٹیکس (یعنی زکوٰۃ) عائد کیا گیا ہے، اس کے منکرین کے خلاف جہاد کو واجب ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر زکوٰۃ کے محاصل وغیرہ احتیاجات کی تکمیل کیلئے ناکافی ہوں تو زکوٰۃ کے بعد بھی امراء اور انبیاء کے مال میں اہل احتیاج کا حق رہتا ہے۔ غرض ضرورت و احتیاج باقی ہے تو حق بھی باقی رہتا ہے

فقہ اسلامی کا واضح اور صریح اصول ہے کہ ادائے زکوٰۃ کے بعد مالی دولت میں غریبوں کا حق ختم نہیں ہو جاتا۔

ابن حزم فرماتے ہیں :

صح عن الشعبي ومجاهد وطائوس وغيرهم كلهم يقول في المال سوى الزکوٰۃ - (المحلّ جلد ۶ ص ۱۵۱)

صحیح روایت سے یہ ثابت ہے کہ شعبی و مجاہد و طاؤس وغیرہ سب کی یہ رائے ہے کہ زائد مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی اہل حاجت کا حق ہے۔  
عن ابن عمر انه قال في مالك حق سوى الزکوٰۃ۔

ابن عمرؓ سے بھی یہی روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا : تیرے مال میں علاوہ زکوٰۃ کے بھی حق ہے۔

حاجت مندوں کا حق تسلیم کرنے کے بعد اس کی حد کا سوال سامنے آتا ہے، کم سے کم حد بنیادی احتیاجات کی تکمیل اور کفایت ہے، اس حد تک سرمایہ داروں پر محال لگائے جاسکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے :

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَلَيْسَ لَكُمْ حَقٌّ مِّمَّا كَسَبْتُمْ بِاَيْدِيْكُمْ فَاَنْتُمْ لَا تَكُوْنُوْنَ مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ اَلَيْسَ لَكُمْ حَقٌّ مِّمَّا كَسَبْتُمْ بِاَيْدِيْكُمْ فَاَنْتُمْ لَا تَكُوْنُوْنَ مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (سورۃ معارج)

علامہ ابن حزم بنیادی احتیاجات کی فقہی تشریحوں فرماتے ہیں کہ ہر شخص کو ضروریات زندگی کم سے کم اس معیار کی فراہم ہونی چاہئے۔

(۱) غذا ، ایسی غذا جو اُن کی زندگی اور ضروریات کا رکن ہوگی کیلئے ناگزیر ہو۔

(۲) لباس ، ایسا لباس جو کہ گرمی سردی میں صحت و قوت کو برقرار رکھے۔

(۳) مکان ، ایسا مکان جو بارش اور گرمی کے برے اثرات سے انہیں محفوظ

رکھے۔ اور راستوں پر چلنے والوں کی نظروں سے ان کی خلوت کی پردہ داری ہو سکے۔

(المحلّ جلد ۶ ، مسئلہ ۷۲۵)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اہل قربت کو ان کے حقوق دو اور مسافر کو بھی۔

وَأَمَّا ذَا الْقُرْبَىٰ حَقُّهُ وَالْمُسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ (سورہ نبي ۸۱)  
قیام و طعام کی ضروریات کے علاوہ طبی اور تعلیمی ضروریات کی تکمیل بھی اس  
ہے۔ نص قرآنی سے یہ ثابت ہے کہ مساکین کی ضروریات پورا نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے  
لَمْ تَكُنْ مِنَ الْمُسْلِمِينَ وَ لَمْ تَكُنْ كُطْعَمُ الْمُسْكِينِ (سورہ مدثر ۱۰)

ہم خدا کے آگے جھکتے نہ تھے اور مساکین کے پیٹ بھرنے کا سامان نہ کرتے  
تقسیم و دولت کے متعلق حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا فتویٰ ملاحظہ ہو

عن محمد بن علی بن ابی طالب انه سمع علی بن ابی طالب یقول ان  
تعالیٰ فرض علی الاغنیاء فی اموالهم بقدر ما یکنی فقر اہم ، فان جلعوا او  
وجهدوا فیمنع الاغنیاء ، وحق علی اللہ تعالیٰ ان یحاسبہم یوم القیام  
یعذبہم علیہ۔ (المحلی جلد ۶ ص ۱۵۸)

حضرت محمد بن علی بن ابی طالب سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت علی  
فرماتے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مال میں اہل حاجت کا اس قدر حق فرض  
جو ان کی بنیادی ضرورت کو کافی ہو سکے۔ اگر اغنیاء کے مال کو روکنے سے لوگ  
اور ننگے رہیں یا تنگی میں مبتلا ہوں تو قیامت میں حق تعالیٰ کا محاسبہ اور عذاب ان  
حق ہے۔

اسلام بعض حالات میں دولت کی مساویانہ تقسیم کو جائز قرار دیتا ہے۔ ایک  
حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کی معیت میں تین سو صحابی سفر کر رہے تھے، زاد راہ ختم  
تھا، جن کے پاس زاد راہ باقی تھا، وہ حضرت ابو عبیدہؓ نے حکم دے کر سب میں تقسیم  
کر دیا۔ ابن حزمؒ المحلی میں فرماتے ہیں :

سمع من ابی عبیدۃ بن الجراح وثلاث مائۃ من الصحابۃ رضی اللہ عنہم  
ان زادہم فنی . . . . . فامرہم ابو عبیدۃ . . . . . فجمعوا زادہم

فی مزدورین و جعل یقتطعون لہا ما علی السواد ، فہذا اجماع مقطوع بہ من اصحابہ رضی اللہ عنہم الخ۔ (المحلی، جلد ۶ ص ۱۵۸)

ابو سعید بن جراح اور تین سو دس صحابیوں سے یہ روایت صحیح ثابت ہے کہ ایک بار فوج کا زبور راہ سفر ختم ہو گیا تو حضرت ابو سعید نے حکم دیا کہ لوگ اپنے توشوں کو توشہ دانوں میں اکٹھا کر لیں اور اس کے بعد غذا سپہ میں مساوی تقسیم کرتے رہے پس اس مسئلہ پر صحابہؓ کا قطعی اجماع ہے اور ان میں سے کسی کو اس سے اختلاف نہیں۔  
چھوڑ کر قحط یا فوجی ضرورت کی وجہ سے ایسی معاشی صورت حال پیدا ہو گئی ہو کہ سرمایہ داروں سے ان کی ضرورت کی تکمیل کے بعد ان کے بقیہ زائد اموال یا زائد منافع پر اہل ملک کی معاشی حال بہتر بنانے کیلئے حکومت کا قبضہ ضروری ہو تو یہ بھی جائز ہے۔ بلکہ واجب ہے۔

عن ابی سعید الخدردی ، عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من کان معہ فضل ظہر فلیعده بہ من لا ظہر لہ ، ومن کان بہ فضل من زاد فلیعده بہ علی من لا زاد لہ ، قال فذکر من اصناف المال ما ذکر حتی رأینا اللہ لا حق لاحد منا فی الفضل ، قال ابو محمد ، ہذا اجماع الصحابہ رضی اللہ عنہم (المحلی جلد ۶ ص ۱۸۵)

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جس کے پاس سودی کا زائد اونٹ ہو چاہئے کہ وہ اس شخص کو دے جس کے پاس سواری نہیں ہے۔ جس کسی کے پاس زائد توشہ ہو اسے وہ اس شخص کو دے جس کے پاس توشہ نہ ہو۔ ابو سعید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اموال کا تذکرہ فرماتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ ہم لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ زائد از ضرورت مال میں ہم میں سے کسی کا کوئی حق نہیں ہے۔

ایک موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے وصال سے پہلے فرمایا :

قال عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ لو استقبلت من امری ما استبدت

لاخدت فضول اموال الاغنیاء فقسمتها علی فقرام المهاجرین ، وھذا إسناده فی غایۃ الصلحۃ والمجلدات (المجلد ۶ ص ۱۱۵۸) حضرت عمر بن الخطابؓ نے فرمایا اگر مجھے پہلے ہی اس امر کا اندازہ ہوتا جو بعد کو ہوا تو میں اغنیاء کے پس ماندہ سراپاؤں اور زائد اموال کو لے کر فقراء و مہاجرین میں تقسیم کر دیتا۔ اس کی سند غایت درجہ صحیح اور قوی ہے۔

(اسلام) اس بات کی بھی اجازت دیتا ہے کہ حکومت پر پیدائشی دولت کے فلاح کو ملک کی معیشت کی اصلاح کیلئے اپنے قبضہ میں کر سکتی ہے۔

خلیفۃ اسلام حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ و حضرت ابوبکرؓ کی ہجرت کی تائید سے یہ فیصلہ نافذ فرمایا کہ "جنگ قادسیہ کے بعد عراق کی جو زمین 'السواد' مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی ہے اس کا چوتھائی حصہ 'بھیلہ' کے سپرد کر دیا جاتے۔ کیونکہ غزنی شاہوں کا چوتھائی حصہ اس قبیلہ کے سرکردوں پر مشتمل تھا۔ اس قبیلہ کے دو تین سالہ قبضہ کے بعد اجتماعی مفاد کے لحاظ سے یہ مناسب معلوم ہوا کہ ان زمینوں کو حکومت اپنے قبضہ میں لے لے، حضرت عمرؓ نے انہیں قبیلہ حضرت ہریر بن عبد اللہ کو آمادہ کیا کہ اس زمین سے ان کا قبیلہ اپنا قبضہ اٹھالے۔ لہذا اس کو حکومت کے سپرد کر دیا۔

خیبر و نجران کی زمینوں کا تخیلہ ان ہی اصولوں پر ہوا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت حسب ضرورت ایسے اقدامات کر سکتی ہے۔

امام مالکؒ نے بھی یہی مسلک اختیار کیا۔ فرماتے ہیں کہ کلیدی صنعتوں پر حکومت کا قبضہ جائز ہے۔

قال مالک ، تصیر الارض للسلطان

(المجلد ۸ صفحہ ۲۳۸)

# اسلام اور مرکزیت

ڈاکٹر عبدالواحد علی پورٹا

اسلام ایک بین الاقوامی انسانیت ماحمہ کا دین ہے جس کا بنیادی نقطہ توحید، اور  
 زوری وصف وحدت ہے، جو نظام اسلام پر مبنی ہے درحقیقت وہ ساری انسانیت پر  
 وی اور انسانی زندگی کے جملہ مراحل پر مشتمل ہے۔ اسلام انسانیت کے مختلف اقوام  
 رب ہوں یا عجم، سفید قام ہوں یا سید قام، زمانہ حاضر میں رہتے ہوں یا مستقبل میں آنے  
 والے ہوں سب کے لئے دین کامل ہے، اسلامی نظام ہر ایک کے لئے باعث فلاح اور  
 بہبودی ہے اللہ تبارک و تعالیٰ فرمے گا۔

یہ ظاہر ہے کہ اسلام جیسا جامع اور بین الاقوامی نظام جس میں ایک طرف اس قدر  
 پاک اور متنوع ہے کہ اس میں ہر قوم بلکہ ہر فرد شامل ہو کر دنیوی اور اخروی فلاح حاصل کر سکتا  
 ہے تو دوسری طرف اس میں وحدت اور توحید کی بنیاد کا قائم رہنا بھی ضروری ہے۔ ایسے جامع  
 نظام کے لئے ضروری ہے کہ ایسے مخصوص مرکزی نقاط پر مشتمل ہوں جن کے محور پر سارا نظام قائم  
 رہے اور ان مرکزی نقطوں سے ہر عمل، کیفیت اور انفرادی خواہ اجتماعی مسائل کا براہ راست  
 تعلق ہو، اس طرح اس کی مرکزیت رہنا ہوگی جس سے دین میں وحدت، امت میں وحدت

انسانی مساعیات اور اعمال میں یک جہتی ظہور پذیر ہوگی۔ یہ تمام اوصاف دین و اسلام سے ملتے جلتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس میں تاہد چلتے کی صلاحیت ہے۔ یہ دین ابتدا انسانیت سے لے کر اس کے ارتقائی شکل اسلام تک ایک ہی رہا کیوں کہ اس کا مرکز یا اصلی بنیاد ایک ہوتا چلا آیا ہے، اگرچہ تفصیلات اور نتائج کے لحاظ سے اس کی مختلف شکلیں اور انگ الگ صورتیں دیکھنے میں آتی رہیں۔

چند اسلام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اپنی مشہور تصنیف ”حجۃ اللہ الباقیہ میں فرماتے ہیں :  
 ”ان اصل الدین واحد والشرائع والمناہج مختلفۃ“ یعنی دین کی بنیاد ایک ہے لیکن اس کی قانون اور عملی صورتیں مختلف ہوتی رہیں۔

شاہ صاحبؒ نے اس نقطے کو بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے جس سے دین کے مرکزی نقطے واضح ہو جاتے ہیں اور اس طرح دین کی وحدت بھی ثابت ہو جاتی ہے اور امت مسلمہ میں یکانیت اور وحدت ایک لازمی اور ضروری جز ثابت ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے ”شرع لکم من الدین ما وحی ہم نوحاً والذی اوحیت الیک وما وصیناہم ابراہیم وموسىٰ وهیثمیٰ ان اقموا الدین ولا تتفرقوا فیہ“ یعنی اس نے دین میں سے تمہارے لئے اسی کو ہی قانون بنایا جس کی ہم نے وحدت کی نوع کو اور جس کو آپ کی طرف وحی کی اور ہم نے اس کی وحدت کی ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرق نہ ڈالو!

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک دین ایک رہا ہے اور اس کے نظام میں وحدت کو اہم مرکزی نقطہ قرار دے کر اس کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہی کہ اس کی مرکزیت سے غرض ہو کہ تفرقہ ڈالنے اور فرقہ فرقہ بننے سے روکا گیا ہے۔ ایک دوسری آیت میں نور و انوار نقطوں میں فرمایا گیا ”ان ہذا امتک امۃ واحداۃ انا ربکم فاتقون“ بیشک آپ کی امت ایک امت ہے، میں ہی تمہارا پروردگار ہوں، مجھ سے ڈرو۔

قرآن کے مشہور مفسر امام عابدؒ اس کی تفسیر میں اس طرح فرماتے ہیں ”امتیہ

ما محمد وایہم دینا واحداً" اسے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے فجر کو اور دوسرے گوشتر انبیاء کو ایک ہی دین کی وصیت کی ہے۔

ان آیات اور مجاہد کی تفسیر سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل میں دین ایک ہے اور اس کی وحدت قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بعض ایسے مرکزی اور بنیادی نقطے ہوں جن کی وجہ سے اس کی یگانگت اور وحدت قائم رہے۔

دین و اسلام میں اسی وحدت کو قائم رکھنے کے لئے چند مرکزی باتوں پر زور دیا گیا ہے اور ان کی اس قدر اہمیت برقرار رکھی گئی ہے کہ ان کو نظر انداز کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ ان کو چھوڑنے سے دین کی بنیادی شکل اور اعلیٰ نظام کو نقصان پہنچا ہے اور انسانیت کو نقصان اٹھانا پڑے گا اور امت کے نظام کے متزلزل ہونے کا خطرہ بھی رہے یہ مرکزی نقطے جن پر اسلامی نظام قائم ہے یہ ہیں۔ عقیدہ، توحید، شاعر اللہ جس میں کعبۃ اللہ، نبی اللہ اور قرآن مجید شامل ہیں اور ان میں سے ہر ایک نقطہ وحدت کا مظہر ہے۔

توحید ایک ایسا مرکزی نقطہ ہے جس پر ایمان لانے اور اس پر اپنی حیات کو منظم کرنے سے ساری انسانیت ایک ہو جائے گی یعنی ایک ہی اللہ کی عبادت کی جائے اور۔ کو ہی اپنا پروردگار اور اپنی ماحیات کا پورا کرنے والا سمجھا جائے گا۔ اسی کو خیر و شر کا مالک اور ہر السموات والارض سمجھا جائے۔ جب یہ عقیدہ اور یہ عمل سب انسانوں کا ہو تو کوئی دوا نہیں کہ باہمی اتفاق اور وحدت رونما نہ ہو، اس لئے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی ہر چیز مالک اور معطی ایک پروردگار کو سمجھے جو زمین و آسمان کا خالق ہے۔ حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہی نعرہ تھا "انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفا وما انا من المشرکین" یعنی میں اپنے چہرہ کو اس ہستی کی طرف موڑتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے میں جملہ باطل ادیان سے منہ موڑ کر ایک خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔

ایک دوسری آیت میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ہر ایک مومن کو چاہیے کہ اس کی زندگی موت، عبادت اور قربانی وغیرہ جیسے مراسم سب کے سب اللہ کے لئے ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے



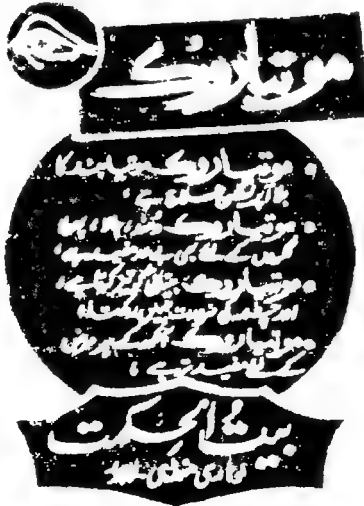
”ان مخلوق و فاسق و حیای و محقق علیہ رب العالمین لا شریک لہ“ یعنی میری نماز میری قربانی، میری زندگی اور موت سب کے سب اللہ کے لئے ہے جو جہاں کا پروردگار ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

دوسرے مرکزی نقطوں کو اس طرح سمجھنا چاہیے کہ جب اللہ کی توحید ثابت ہوگی تو لامحالہ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس کی طرف سے انسانیت کی ہدایت اور رہبری کے لئے ایک ایسی ہستی پر بھی ایمان لانا ضروری ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے ہدایت کے لئے وحی اتاری ہو اور اس کو شریعت میں نبی اور رسول کہا جائے اور وہ وحی کتاب الہی ہوگی۔ اس آخری شریعت میں یہ ہستی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ پر جو وحی اتاری گئی وہ قرآن مجید ہے جس سے ہر تنگ انسانیت ہدایت حاصل کرتی رہے گی اور اس کی ضیا پاشی ساری دنیا کو منور کرتی رہے گی۔ اسی طرح کعبۃ اللہ بھی وحدت کا مرکزی نقطہ ہے جس کی طرف دنیا کے اسلام کا ہر فرد مسلم متوجہ ہو کر نماز ادا کرتا ہے اور جہاں تمام دنیا کے مسلمان جمع ہو کر حج ادا کرتے ہیں اور اس کو درجی مرکز تسلیم کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات اور اس کے نظام حیات میں اس کی مرکزیت اتنی واضح اور نمایاں ہے کہ اس کا کوئی بھی پہلو بیچے تو اس میں یہ مرکزیت واضح طور پر نظر آتی ہے مثلاً حلالہ کو دیکھیں اس میں ایک طرف عبادت کا مرکز باری تعالیٰ ہے تو دوسری طرف عبادت کے فوائد کا مرکز انسانیت اور انسانی معاشرے میں وحدت اور یکگاہی پیدا کرنا اور اس کو ایک نقطہ پر جمع کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہ چیز نماز اور خاص طور پر نماز پنجگاہت، حج اور زکوٰۃ سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ یہ سب اللہ کی ذات اقدس کیلئے ادا کی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے انسانی فرد کی روحانی ترقی و معاشرے کی بہتری، وحدت، مساوات اور باہمی اخلاقت و محبت بھی حاصل ہوتی ہے۔

مسجد میں امام کی اطاعت اور غلبہ وقت کی تابعداری اگر اسلامی تعلیمات کا ایک اہم حصہ ہے تو دوسری طرف اس سے اسلامی معاشرے کا ایک مرکز قائم رہنے کا بھی ثبوت ملتا ہے، امیر کی اطاعت، قومی انتشار اور اختلاف سے بچائی ہے۔ اس لئے ایک حدیث میں

آگے ہے کہ اگر دو مسلمان سفر پر جائیں تو سفر سے پہلے آپس میں ایک کو امیر منتخب کیا جائے۔ اسلام میں شرک کے بعد تفرقہ بازی کو بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے، دراصل توحید کو ترک کرنا اور شرک میں الجھ جانا تفرقہ بازی کا باعث بنتا ہے، اس لئے متعدد بار توحید کی تاکید کی گئی ہے اور قرآن مجید میں ”الحدود الموقفی“ مضبوط رسی کو پکڑنے کا حکم صادر فرمایا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے پیغمبر کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو اولوالامر ہیں ان کی بھی اطاعت کرو! ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم“ یہ حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ سب ہمارے اسلامی معاشرے کے مرکزی نقطے ہیں اور ان سے وابستہ رہنے سے قوم کی طاقت اور قوت بڑھتی رہتی ہے اتحاد مضبوط ہوتا ہے نزاع اور باہمی اختلاف میں سے قوی قوت کی قیادت ملتی یا قائم رہتی ہے اس سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ ارشاد باری ہے: ”لا تنازعو فتفتشوا وتذهب بربکم“۔



# مفتی کفایت اللہ صاحب

رشید احمد ارشد ایم۔ اے

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اپنے زمانے کے مشہور و معروف عالم تھے۔ آپ کی ملی قابلیت نہ صرف ہندو پاکستان میں مسلم مفتی بلکہ برصغیر ہند اور دیگر اسلامی ممالک کے علماء و فضلاء بھی اسلامی علوم میں آپ کی قابلیت کو تسلیم کرتے تھے۔ آپ کی وفات سے جو غم پیدا ہو گیا ہے اس کا بظاہر نہ ہونا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ ہم اپنے مایہ ناز علماء اور کابر قوم کو فراموش کرتے جا رہے ہیں وہ حضرات جو بیس، پچیس سال پیشتر ہندوستان کے گوشے گوشے میں مشہور تھے، موجودہ نسل ان کے ناموں سے اب بالکل نا آشنا ہے۔ تاہم یہ قوم کے بزرگوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے نو نبالوں کو اسلاف سے روشناس کرائیں اور ان کا تعلق ماضی سے بالکل منقطع نہ کریں۔

بد قسمتی سے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی اس قومی تناغل کا شکار ہو گئے

لے لیکھو رشید موعی جامعہ کراچی۔

ہیں۔ اب کوئی بھولے سے بھی ان کا نام نہیں لیتا ہے۔ بالخصوص پاکستان کی نئی پود اُن کے نام سے نا آشنا ہے اور ہندوستان میں بھی شاید چند ہی بزرگ ہستیاں ہوں گی جو حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہوں گی۔

یہ خاکسار بھی ان خوش قسمت افراد میں شامل ہے جنہوں نے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا تھا۔ اور ان کے شہرہ آفاق مدرسہ امینیہ میں علوم اسلامیہ کی تحصیل کی تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے طویل عرصہ حضرت مفتی صاحب کی صحبت میں نہیں گزارا، میں ان کا ادنیٰ شاگرد ہوں۔ تاہم گزشتہ زمانے کی یاد تازہ کرنے اور نئی نسل کو حضرت مفتی صاحب کے نام سے روشناس کرانے کی اس خیال سے جسارت کر رہا ہوں کہ حضرت مفتی صاحب کے تلامذہ میں سے وہ بزرگ ہستیاں جو اُن سے زیادہ فیض حاصل کر چکی ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کے علمی کمالات پر مزید روشنی ڈالیں گی تاکہ ہمارے نوجوان طلباء اور علماء آپ کے کارناموں سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

آپ کا آبائی وطن شاہجہاں پور (یوپی) محلہ سن رتی ہے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی جناب عنایت اللہ بن فیض اللہ بن خیر اللہ

### ابتدائی حالات

عن عہد اللہ ہے۔

آپ کا سلسلہ نسب شیخ جمال بینی تک پہنچتا ہے جو بین میں موتیوں کی تجارت کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ اتفاق ہوا کہ شیخ جمال بینی یہ سلسلہ تجارت پانی کے جہاز میں سوار تھے کہ اچانک جہاز غرق ہو گیا مگر خوش قسمتی سے شیخ جمال زندہ بچ گئے۔

چنانچہ اس کم عمری کے زمانے میں بھوپال کے ایک شخص انہیں ہندوستان لے آئے اور یہیں انہوں نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے ان کی شادی کر دی۔ ان سے جو نسل پھیلی انہی میں حضرت مفتی صاحب کے آہار و اجداد بھی تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۸۷۵ء بمقام شاہجہاں پور پیدا ہوئے۔ آپ نے عربی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اموازیہ شاہجہاں پور میں مولوی حافظ بدھن خان اور مولوی عبید الحق خاں صاحب سے حاصل کی۔ اس کے بعد مولوی عبید الحق خاں صاحب نے آپ کو مدرسہ شاہی

مراد آباد میں داخلہ کرایہ وہاں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہیں داخل ہو گئے۔

اساتذہ ۱۵۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ نے مندرجہ ذیل اساتذہ سے تعلیم حاصل کی (۱) مولانا منقعت علی صاحب (۲) مولانا حکیم محمد حسن صاحب (برخوردار حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ)۔ (۳) مولانا غلام رسول صاحب (۴) مولانا خلیل احمد انبیسٹوی۔ حدیث کی تعلیم آپ نے مولانا عبد العلی میرٹھی اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندی سے حاصل کی۔

آپ ۱۳۱۵ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔  
**تعلیم و تدریس**  
 تعلیم سے فارغ ہوتے ہی آپ اپنے قدیم استاد مولانا عبیدالحق صاحب کے حکم کے مطابق مدرسہ عین العلم میں مدرس ہوئے۔ تقریباً پانچ سال تک آپ وہاں اسلامی علوم کی تعلیم دیتے رہے، اور مفتی کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے وہیں آپ نے ایک رسالہ ”البرہان“ کے نام سے جاری کیا تھا۔

جب ۱۹۰۳ھ مطابق ۱۳۲۱ھ میں آپ کے استاد مکرم مولانا عبیدالحق خان صاحب کی وفات ہوئی تو آپ مولوی امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ کے بے حد اصرار پر دہلی تشریف لائے، اور یہاں مدرسہ امینیہ کے صدر مدرس اور مفتی مقرر ہوئے۔ پہلے حضرت مولانا نور شاہ صاحب کشمیری صدر مدرس تھے مگر بعض مجبوریوں کی بنا پر آپ استعفی دے کر اپنے وطن تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے اس منصب پر آپ کا تقرر ہوا۔

اس زمانے میں مدرسہ امینیہ تاریخی سنہری مسجد چاندنی چوک میں تھا اور اس کا سرمایہ نہایت قلیل تھا، اس لئے آپ کی تنخواہ بیس روپے ماہوار مقرر ہوئی۔ اس میں تعلیم و تدریس کے علاوہ اقامہ کی خدمت بھی شامل تھی۔ تاہم آپ نے اس قلیل تنخواہ پر قناعت کر کے تعلیم و تدریس کا کام شروع کر دیا۔

بہت جلد آپ کی تعلیم و اقامہ کی شہرت دور دراز کے علاقوں میں ہو گئی۔ لہذا دور کے علاقوں سے کثیر تعداد میں طلبہ مدرسہ امینیہ میں داخل ہونے لگے۔

جب مولانا امین الدین صاحب باقی مدرسہ امینیہ ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۴۸ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو حضرت مفتی صاحب اس مدرسے کے مہتمم و منصرم ہوئے۔  
**تنظیم مدارس** | دہلی آنے کے بعد آپ نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ تمام عربی مدارس کی تنظیم کی جائے اور اس کے انتظامی قواعد و نصاب یکساں ہوں۔ اور داخلے کے لئے بھی تمام مدارس میں مشترکہ قواعد کا نفاذ ہو۔

اس مقصد کے لئے دہلی آنے کے دوسرے سال یعنی ۱۹۲۹ء مطابق ۱۳۴۹ء میں مدرسہ امینیہ کے سالانہ جلسہ میں آپ نے اتحاد اور تنظیم مدارس پر نہایت عمدہ تقریر کی۔ آخر کار آپ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو پاکستان کے سب سے بڑے مدرسہ دارالعلوم دیوبند تنظیم نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ دوسرے مدارس کے طلباء کو اس وقت تک داخل نہیں کریں گے جب تک کہ وہ اپنی نیک چلنی کی سند نہ پیش کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے منتظمین اس پر بھی رضامند ہو گئے تھے کہ وہ مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل طلبہ اپنے جلسے میں دستار بندی کریں۔

چنانچہ ۱۹۱۰ء میں مدرسہ امینیہ کے دس فارغ التحصیل طلبہ کو دعوت دے کر دیوبند کے سالانہ جلسے میں بلایا گیا اور تمام مجمع کے سامنے دستار بندی کی گئی۔ ان دس علمائے مولانا حافظ سید محمد حسین شاہ (فرزند ارجمند پیر جماعت علی شاہ صاحب) اور مولانا حافظ سید محمد صاحب (موجودہ مفتی دارالعلوم دیوبند) بھی شامل تھے۔

۱۹۱۳ء میں جب جنگ بلقان ہو رہی تھی حضرت مفتی صاحب نے جنگ کے مسئلہ پر مدین کی امداد کے لئے چندہ جمع کیا۔ جس کی کل میزان ۳۸۹۴ روپے اور نوپائی تھی۔  
**جمعیتہ علمائے ہند کی تحریک** | ۱۹۱۵ء کے بعد جبکہ انگریزوں نے جنگ عظیم میں حصہ لیا تو شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی کو گرفتار کر کے

۱۔ ”مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی“ از مولانا حفیظ الرحمن صاحب و اصطفیٰ فرزند اکبر رحمہ  
 مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم۔ مطبوعہ دہلی ص ۳۷-۵۷۔

میں نظر بند کر دیا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں انگریزوں کے خلاف جذبہ نفرت پیدا ہوا۔ اور آزادی کی تحریک تقویت پکڑنے لگی۔ اسی آثار میں اتحادیوں نے اسلامی خلافت کو ختم کرنے کی سازش کی۔ اس سے تمام اسلامی ممالک میں ان کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اور مسلمانان ہند نے بھی یہ ضرورت محسوس کی کہ اسلامی خلافت کے تحفظ کے لئے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں۔ لہذا ۲۲ نومبر ۱۹۱۹ء میں دہلی میں خلافت کمیٹی قائم ہوئی۔ اسی زمانے میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ محسوس کیا کہ تمام علمائے ہند کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ لہذا آپ نے ”جمعیت علمائے ہند“ قائم کرنے کی تحریک چند علماء کے سامنے پیش کی انہوں نے اس کی تائید کی۔ اور اس تحریک کو بروئے کار لانے کے لئے جدوجہد کرنے لگے۔ ایسے علماء میں سے مولانا ابوالحسنات عبدالباری فرننگی علی، مولانا محمد سجاد بہاری، مولانا شام اللہ امرتسری اور مولانا آزاد سبحانی اس تحریک کے روح رواں تھے۔

جس زمانے میں خلافت کمیٹی کے اجلاس دہلی میں ہو رہے تھے اسی زمانے میں تمام علماء کو خفیہ طور پر ایک مقام پر اکٹھا کر لیا گیا تھا۔ اور جس روز علماء کا یہ خفیہ جلسہ ہونے والا تھا اسی دن بعد نماز فجر بہت سے علماء درگاہ سید حسن رسولؑ نما میں حاضر ہوئے۔ اور دہلی کے اس مقدس بزرگ کے حزار کے سامنے انہوں نے یہ قول و قرار کیا۔

”موجودہ گورنمنٹ کے خلاف ہماری کارروائیاں بصیغہ راز رہیں گی

اور حکومت کی جانب سے جو سختیاں ہم پر کی جائیں گی ان پر ہم ثابت قدم

رہیں گے۔ نیز آپس میں عقائد کے اختلاف کو نہیں آنے دیں گے۔“

لے حضرت سید حسن رسولؑ نما جنہی کی درگاہ کے سامنے علماء کرام نے تحریک آزادی کی جدوجہد کا آتما ز کرنے اور جمعیت علماء ہند کی بنیاد ڈالنے کا عہد کیا تھا۔ بہت بڑے عالم اور درویش کامل تھے علماء کا طبقہ ہمیشہ ان کا معتقد رہا۔ اور اس موقع پر بھی اپنے قول و قرار کو مقدس بنانے کے لئے انہی کی درگاہ کا انتخاب کیا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ حضرت رسولؑ نما ساری عمر بڑے امرار و حکام کے مخالف رہے۔ لے مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ صفحہ ۷۵۔

**صدر جمعیتہ علمائے ہند** | اس کے بعد نماز عشاء کے بعد علمائے کرام کا ایک جلسہ ہوا اور انہوں نے "جمعیتہ علمائے ہند" کی داغ بیل ڈالی۔  
 رت مفتی کفایت اللہ صاحب اس کے صدر اور مولانا احمد سعید صاحب ناظم مقرر ہوئے۔  
 رت مفتی صاحب تاحیات مرکزی جمعیتہ علمائے ہند کے صدر رہے۔

صدر جمعیتہ علمائے ہند کی حیثیت سے آپ تمام قومی اور سیاسی جلسوں میں شریک تے رہے۔ بلکہ بیرونی ممالک میں بھی جواہر کافرنسین ہوتی تھیں ان میں شرکت کرنے کے لئے ہی کو دعوت دی جاتی تھی۔ جب سلطان ابن سعود نے شریف حسین کو شکست دے کر بیت حجاز پر قبضہ کر لیا تھا تو اس نے تمام اسلامی ملک سے نمائندے بلا کر ۲۶ ذیقعدہ ۱۳۱۵ھ بمطابق ۱۹۲۵ء میں مکہ معظمہ میں مؤتمر حجاز منعقد کی۔ اس وقت آپ کی رات میں علمائے کرام ایک وفد گیا تھا، وطن جا کر آپ نے اس مؤتمر کی کاروائی میں نہایت لگن سے حصہ لیا تھا۔

آپ ۱۳۲۸ھ میں مؤتمر فلسطین میں بھی شریک ہوئے اور جمعیتہ علمائے ہند کے وفد قیادت فرمائی۔

**بدوبند کے مصائب** | آپ نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں بھی نمایاں حصہ لیا اور دو مرتبہ قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔  
 ۱۔ مرتبہ آپ تحریک سول نافرمانی کے جرم میں ۱۳۱۵ء میں اپنے گھر سے گرفتار ہوئے۔ آپ پچھ ماہ قید بامشقت کی سزا ہوئی اور آپ گجرات جیل بھیجے گئے۔

دوسری گول میز کانفرنس ۱۳۱۵ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ سول نافرمانی کی تحریک جاری کی۔ اس موقع پر دفعہ ۴۴ کی خلاف ورزی کے جرم میں آپ کو آزار پارک کے جلسہ میں تیار کیا گیا اور اٹھارہ ماہ قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ اس وقت آپ سنٹرل جیل میں محبوس رہے۔

**نہائے عربیہ کا احتجاجی جلسہ** | آپ کی گرفتاری سے دہلی کے مسلمانوں میں بالعموم نہائے عربیہ کا احتجاجی جلسہ اور طلبائے عربیہ میں بالخصوص تحریک آزادی



مجھے اپنی رمایا بنا کر اس کا موقع دے دیا کہ میں اس کے ملک میں اطمینان سے رہوں۔

یہاں آپ بیٹی حقہ دوم ختم ہوتی ہے۔ تیسرا حصہ جس میں ترکی اور ترک قوم کے حالات ہوں گے، مصنف مرتب فرما رہے ہیں، خدا کرے یہ جلد مکمل ہو، اور اس طرح اس تاریخی دور کے واقعات جو اب تک پردہ خفا میں تھے، دنیا کے سامنے آئیں اور آج آزادی کی نعمتوں سے مستمتع ہونے والے جانیں کہ اس آزادی کی صبح کو نزدیک کرنے میں کتنوں کی پوری زندگیاں مسلسل اندھیری راتوں میں گزری ہیں۔

مارچ ۱۹۵۷ء کے ”الرحیم“ میں آپ بیٹی حقہ اول کے تبصرے کے آخر میں اس نہایت اہم اور ساتھ ہی ساتھ بے حد دلچسپ کتاب کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا تھا کہ محترم ظفر حسن ایبک کی آپ بیٹی، ایک ایسا تاریخی وثیقہ ہے جسے برصغیر کی اسلامی تاریخ کے ہر طالب علم اور سیاسیات سے علمی و عملی دلچسپی رکھنے والے ہر چھوٹے کارکن اور ہر بڑے لیڈر کو پڑھنا چاہیے۔ یہ شخص گزرے ہوئے واقعات کا مجموعہ نہیں، بلکہ اس میں عبرتیں اور سبق ہیں جو ہمارے لئے آئندہ کے لئے مشعل کا کام دے سکتے ہیں۔

ظفر حسن صاحب نے آپ بیٹی لکھ کر مسلمانانِ برصغیر کی بہت بڑی خدمت کی ہے اور قی تاریخی کا وہ باب جو زینتِ طاقِ نسایں بن گیا تھا، اسے انہوں نے دوبارہ ہمارے لئے تازہ کر دیا ہے، ہمیں امید ہے کہ کوئی مسلمان پڑھا لکھا گھرانا اس کتاب سے خالی نہ رہے گا۔

یہاں ہم یہی الفاظ آپ بیٹی کے حصہ دوم کی اشاعت پر دہراتے ہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ظفر حسن صاحب کو طویل عمر عطا ہو تاکہ وہ حضرت مولانا سندھی اور اپنی جدوجہد کے بارے میں اور لکھ سکیں۔

محمد سرور

بہتر سے بہتر علاج اور کافی توجہ اور غور و پراخت کے مرض میں اسب تک کوئی افاقہ نہیں ہے۔ خدا بھی ہنم نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے اور دیگر احباب و متوسلین سے بھی درخواست کیجئے۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

والتلازم

آپ کا

(حفيظ الرحمن ۳۱/۵۲ م)

**وفات ۱۔** یہ خط مولوی صاحب موصوف نے آپ کی وفات سے تین چار ہفتے پیشتر تحریر کیا تھا، میں ابھی دوسرا خط لکھنے نہ پایا تھا کہ آپ کی وفات کی اندوہناک خبر موصول ہوئی اور یہ معلوم ہوا کہ آپ ۱۳، ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء ویکم جنوری ۱۹۵۳ء کی درمیانی شب یعنی شب پنجشنبہ کو ۱۰۰۰ حجے اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ ابھی ۱۹۵۳ء کا نیا سال نمودار نہیں ہوا تھا کہ آپ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

آپ کو جہڑولی میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے حزار کے اعاط کے قریب دفن کیا گیا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر شریف انسی سال کی تھی۔

ذاتی تاثر :- مجھے افسوس رہا کہ میں اپنی کم عمری، طبعی جھجک اور کم آمیزی کے باعث آپ کا فیض صحبت حاصل نہیں کر سکا۔ اور آپ سے علمی استفادہ صرف حلقہٴ درس تک محدود رہا۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت کی وجہ سے دہلی سے باہر ہی رہا۔ اور جب دہلی آتا تھا تو اپنی طبعی کاہلی کی وجہ سے بہت کم ملاقات کا شرف حاصل کر سکتا تھا اس لحاظ سے میرا حضرت مفتی صاحبؒ سے رابطہ بہت ہی کم رہا۔ تاہم حضرت مفتی صاحب کی شفقت و عنایت اس کم آمیزی کے باوجود کم نہ تھی۔ اور آپ میرے تمام حالات سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ ملازمت یا دیگر امور میں جب کوئی حضرت مفتی صاحبؒ سے میرے بارے میں کچھ دریافت کرتا تھا تو آپ کلمہٴ خیر سے یاد فرماتے تھے۔

آخری خط :- پاکستان آنے کے بعد جب حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی

نے وفات پائی تو کراچی کے ایک علمی ماہنامے کی فرمائش پر میں نے ہندوستان علماء کو خطوط لکھے کہ وہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی یاد میں اپنے گرامی قدر خیالات تحریری شکل میں ارسال فرمائیں تاکہ اُن کی یاد میں ایک ضخیم ”شیخ الاسلام نمبر“ شائع کیا جائے۔ میرے ان خطوط کے جواب میں کوئی مقالہ موصول نہ ہوسکا۔ اور اکثر حضرات نے خطوط بھی نہیں دیا۔ تاہم چند علماء نے معذرت کے خطوط لکھے ان میں سب سے پہلے مفتی صاحبؒ کا نوازش نامہ موصول ہوا تھا۔ جس میں اپنی پیرائہ سالی اور علالت کی کوئی مضمون لکھنے سے معذرت کا اظہار کیا گیا تھا۔

یہ آپ کا آخری خط تھا جو مجھے موصول ہوا۔ کسے خبر تھی کہ اس کے تھوڑے بعد آپ بھی شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے پاس عالم بالا میں پہنچ جائیں گے۔ ہند پاکستان کا یہ آخری بے مثل عالم اور فقیہ مفتی، علم و فقہ کی محفلوں کو سونا چھوڑ کر کے لئے رخصت ہو جائے گا۔

وما کان قیسٌ ھلکۃ ھلکۃ واحد ولکنتہ بنیان قوم تھتھامہ

**اخلاق و عادات** | حضرت مفتی صاحبؒ سادہ طبیعت، نہایت سنجیدہ اور ذرا تھے۔ آپ کے وقار کا رعب سب پر غالب تھا۔ مگر یہ کا وقار تھا۔ ورنہ آپ نہایت خوش اخلاق اور مریجاں و مریج تھے۔ اپنا کام خود کرتے عالم ہونے کے باوجود اپنے دنیاوی امور نہایت خوش اسلوبی اور سلیقے سے سرانجام دیتے تھے۔ اپنی ذات کے لئے کفایت شعار تھے۔ بلکہ مدرسہ کی تعمیر میں بھی نہایت سلیقہ و کفایت شکاری کا ثبوت دیا تھا۔

**مدرسہ امینیہ کی توسیع** | جب مدرسہ امینیہ سنہری مسجد سے کشمیری دروازہ پانی پتیاں میں منتقل ہوا تو مسجد کی عمارت مدرسہ بالکل ناکافی تھی لہذا آپ نے طلبہ کی تعلیم و اقامت کے لئے مزید کمرے بنوائے تعمیر کی نگرانی خود کی۔

آپ نے مسجد کے دونوں طرف طلباء کی اقامت کے لئے کمرے بنوائے۔

کے کمروں میں اساتذہ درس دیتے تھے۔ وہیں آپ کا دفتر کتب خانہ اور دارالافتاء تھا۔ اس سے اوپر کی منزل میں آپ نے دارالحدیث اور مہمان خانہ تعمیر کرایا۔ اسی طرح آپ نے اس دارالعلوم کو محنت اور ذاتی نگرانی کے ساتھ ہر حیثیت سے مکمل کرایا۔

**بے مثل حافظہ** | بچپن ہی سے آپ نے بلا کا حافظہ پایا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں آپ کی ذہانت اور حافظہ کا یہ حال تھا کہ مجالس درس میں جو کچھ آپ سنتے تھے وہ اسی وقت یاد ہو جاتا تھا۔ آپ کو دوبارہ دیکھنے اور یاد کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ کے رفقاء درس کا بیان ہے کہ آپ نے بہت جلد تمام علوم عربیہ میں کمال حاصل کر لیا۔ آپ نہ صرف علوم اسلامیہ کے ماہر تھے بلکہ عربی لغت و ادب سے بھی بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ اور عربی قصائد لکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت مسیح الملک حکیم اجل خانؒ کی وفات پر آپ کا عربی مرثیہ میں نے خود اخباروں میں دیکھا۔

**عربی ادب میں مہارت** | حضرت مفتی صاحبؒ عربی ادب کی کوئی کتاب نہیں پڑھاتے تھے۔ اس لئے میں براہ راست آپ سے عربی ادب کی تعلیم حاصل کر سکا۔ تاہم بالواسطہ میں نے کچھ استفادہ کیا تھا۔ اس کی صورت یہی ہوئی کہ مدرسہ امینیہ کے تعلیمی زمانے میں حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادے مولوی حفیظ الرحمن صاحب کے ساتھ میں مولوی عالم کے امتحان کی تیاری کرتا تھا۔ اس امتحان میں بی اے عربی کو درس بھی شامل تھا۔ اسے ہم دونوں مولوی اکرام اللہ عیاضی پانی پتی کی نگرانی میں مل کر پڑھتے تھے۔ جو ادب و تاریخ میں خاصی مہارت رکھتے تھے۔

مولوی حفیظ الرحمن صاحب اپنے والد محترم سے سب سے معلقہ اور بعض دیگر کتابیں بھی پڑھتے تھے۔ لہذا انہیں حضرت مفتی صاحبؒ سے عربی ادب میں براہ راست استفادہ کا موقع ملتا تھا، اور وہ مفتی صاحب کی ادبی اور تعوی تعقیقات سے ہمیں مستفید کرتے تھے۔ ان معلومات سے ہمیں یہ اندازہ ہوتا تھا کہ حضرت مفتی صاحب عربی ادب کا نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے، اور عربی لغت و ادب پر آپ کی محنتانہ نظر تھی۔

## یادگار تعلیمی سال

حضرت مفتی صاحب مدرسہ کے اہتمام و انصرام اور اثناء کے کاموں میں بے حد مشغول رہتے تھے۔ اس لئے آپ صرف دورہ حدیث میں آخری سال کے طلباء کو صحیح بخاری شریف اور جامع ترمذی پڑھاتے تھے۔ لہذا ہمیں براہ راست صرف ایک سال حضرت مفتی صاحب سے استفادہ کا موقع ملا۔ اور یہی سال ہماری تعلیم کا آخری اور یادگار سال تھا۔

میں نے سن ۱۹۶۳ء میں تعلیم سے فراغت حاصل کی تھی۔ سن ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۳ء کے سال سیاسی حیثیت سے پُر آشوب سال تھے۔ لہذا آپ کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ آپ اپنی گونا گوں مصروفیات کے ساتھ حدیث کی ان دونوں ضخیم کتابوں کو ختم کرا دیں۔ تاہم اس قلیل مدت میں آپ نے جس انداز میں درس دیا وہ کئی سالوں پر بھاری ہے۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ وہ ”حاصل عمر“ ہے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔

آپ کا طریقہ تعلیم و تدریس نہایت دلکش اور عام فہم تھا۔ ہر حدیث پر آپ نہایت عالمانہ اور دلکش انداز میں تقریر فرماتے تھے۔ اس وقت ہر موضوع پر آپ ایسی سیر حاصل بحث کرتے تھے کہ اس کا کوئی گوشہ تشنہ تکمیل نہیں رہتا تھا۔ ان مباحث کے ضمن میں آپ تمام اختلافی مسائل کی گتھیاں سلجھا دیتے تھے۔ آپ کے الفاظ نہایت سچے تلے ہوتے تھے۔ اور جس طرح آپ فتویٰ نویسی میں موزوں اور مختصر الفاظ کے ذریعہ مسائل کو ذہن نشین کما دیتے تھے اسی طرح آپ درس حدیث میں متعلقہ مباحث پر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے۔

تصانیف ۱۔ آپ نے تصانیف کا بہت کم ذخیرہ چھوڑا ہے۔ تاہم ”تعلیم الاسلام“ کے چار حصے آپ کی قابل قدر یادگار ہے اور آج بھی کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں اس قدر آسان زبان میں بچوں کو اسلام کے بنیادی مسائل سمجھائے گئے ہوں۔ مجھے اس بات کا غرر حاصل ہے کہ میں نے اپنی ابتدائی تعلیم میں انہی رسائل کے ذریعہ اپنی مذہبی تعلیم کی بنیاد مستحکم کی تھی۔

مجموعہ فتاویٰ و مضامین | ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبارات و رسائل میں سے آپ کے مضامین خطبات اور مقالات کو جمع کیا جائے۔

ہیں کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ آپ ساری عمر فتویٰ نویسی کا کام کرتے رہے۔ اس پ کے فتاویٰ کا وسیع ذخیرہ جمع ہو گیا ہوگا۔ لہذا اگر انہیں مناسب ترمیم و ترتیب ماتہ شائع کر دیا جائے تو ہمارے خیال میں یہ ایسا طبعی کارنامہ ہوگا جو اسلامی فقہ کی تازہ وسعتوں کو ظاہر کر سکے گا، اور اس طرح ہمیں حالاتِ حاضرہ اور موجودہ مسائل کو فقہ سے ہم آہنگ کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

**عزت و خود داری** | مدرسہ امینیہ میں آپ بیس روپے ماہوار پر صدر مدرس مقرر ہوئے تھے۔ اس میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہونے کے بعد آخر میں کی تنخواہ دو سو پچاس روپے ماہوار مقرر ہوئی تھی۔ اس کے بعد منظمہ کمیٹی نے بہت لٹش کی مگر آپ نے گرائی اور اعزاجات کی کثرت کے باوجود تنخواہ میں مزید اضافہ قبول فرمایا۔

جس زمانے میں آپ کی تنخواہ چالیس پچاس روپے سے زیادہ نہ تھی اس وقت یہ مالیہ کلکتہ میں آپ کو پانچ سو روپے ماہوار پر بلایا گیا۔ مگر آپ نے اس ملازمت کو قبول فرمایا کیونکہ آپ مذہبی خدمت کے لئے ضمیر کی آزادی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اور اس راہ میں سے بڑی قربانی کرنے کے لئے تیار تھے۔

اسی طرح جب حکیم اجمل خاں صاحب نے یہ کوشش کی کہ نظامِ دکن کی طرف دیگر کی طرح آپ کا بھی وظیفہ مقرر ہو جائے تو آپ نے ازراہ خود داری و غیرت اسے قبول نہیں کیا اور آخر وقت تک عیالدار ہونے کے باوجود آپ تنگدستی میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ علمی قابلیت کی بدولت ہر خاص و عام سے آپ کی عزت و احترام ہی قسم کی کوتاہی نہیں ہوئی۔

**ایسی نویسی** | فتویٰ نویسی آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ فتویٰ لینے والے حضرات وقت

آپ کے فرزند اکبر مولوی حفیظ الرحمن واصف دہلوی کے خطوط سے معلوم ہوا کہ انہوں نے کے مجموعہ فتاویٰ کو مکمل کرایا ہے اور اس کی کتابت شروع ہو گئی ہے (ارشاد)

مقررہ کے علاوہ رات دن کے ہر حصہ میں آتے تھے۔ اس لئے آپ نے اپنی مدد کے لئے ایک نائب مفتی بھی مقرر کر لیا تھا، تاہم ضرورت مند حضرات آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اور راہ چلتے یا گھر پر وقت بے وقت رات کے وقت بھی پہنچ جاتے تھے۔ آپ ان کی بے قاعدگیوں کو ہنسی خوشی برداشت کر لیتے تھے۔ بلکہ ہر حالت میں آپ ان سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے اور ان کا کام فوراً کر دیا کرتے تھے۔ انہیں انتظار میں نہیں رکھتے تھے۔

**شاگردوں پر شفقت** | اپنے شاگردوں پر بھی آپ کی شفقت بے پناہ تھی۔ آپ ان کی ترقی کے لئے ہر قسم کی مدد کرنے کے لئے تیار تھے۔

اور ان کی تقریبات میں بغض نفیس شرکت فرماتے تھے۔

آخر زمانے میں آپ بہت بوڑھے اور ضعیف ہو گئے تھے، تاہم جب میں نے انہیں اپنی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کی دعوت دی تو آپ دور دراز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس میں شریک ہوئے۔

**بیعت** :- آپ مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔ مگر بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ آپ نے کسی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ آپ اپنے زہد و تقویٰ کا حال چھپاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے کسی کو مرید نہیں کیا، اور جو کوئی اس مقصد کے لئے آتا تھا۔ اسے دیگر مشائخ کے پاس بھیج دیتے تھے۔

**مخصوص تلامذہ** | آپ کے ہزاروں شاگرد ہند اور پاکستان، برما، ملائیا، انڈونیشیا اور دیگر اسلامی ممالک میں موجود ہیں۔ آپ کے مشاہیر تلامذہ کی تعداد بھی

کافی ہے۔ انہی میں سے مندرجہ ذیل حضرات ہیں :-

- (۱) مولانا احمد سعید صاحب مرحوم ناظم جمعیتہ علمائے ہند۔ (۲) مولانا اعجاز علی صاحب مرحوم استاد ادب دارالعلوم دیوبند۔ (۳) مولانا مفتی سید جہدی حسن صاحب صدر مفتی دارالعلوم دیوبند (۴) مولانا مفتی محمد عید الغنی پٹیلوی شاہ جہانپوری شیخ الحدیث و صدر مفتی مدرسہ امینیہ دہلی۔ (۵) مولانا محمد حسن صاحب دوحدی۔ (۶) مولانا حافظ عبدالغنی صاحب۔ (۷) مولانا مفتی عبدالصمد صاحب کراتی، قاضی القضاۃ ریاست قلات (پاکستان)۔

اولاد، آپ کی افاد میں سے دور کے اور دو لڑکیاں بقید حیات ہیں۔ یہ مقسم مسرت ہے کہ میرے ہندرس اور صدیق کرم جناب مولانا حفیظ الرحمن آصف جو آپ کے فرزندِ کبر ہیں حضرت مفتی صاحب کے بعد آپ کے کام کو خوش اسلوبی کے ساتھ چلا رہے ہیں اور مدرسہ امینیہ کے مہتمم کی حیثیت سے اچھا کام کر رہے ہیں۔ آپ اردو زبان کے نہایت خوشگوار شاعر اور عمدہ شاعر ہیں۔ شاعری میں حضرت سائل دہلوی کے شاگرد ہیں اور مختلف اخبارات و رسائل میں ادبی اور قومی موضوعات پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ آپ نے حضرت مفتی صاحب کی وفات کے بعد مدرسہ امینیہ کی تاریخ اور حضرت مفتی صاحب کے حالات پر ایک مفصل مقالہ ماہنامہ ”الہلال“ کے تعلیمی نمبر ماہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں شائع کرایا۔ پھر نظر ثانی کے بعد یہی مقالہ اخبار ”الجمعیۃ“ کے سنڈے ایڈیشن میں ۱۹۵۷ء میں قسط وار شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد مزید ترمیم و اضافہ کے ساتھ یکم جنوری ۱۹۵۸ء میں ایک کتبچی کی صورت میں شائع ہوا اس سے ہمیں مفتی صاحب کے بارے میں مزید معلومات حاصل ہوئیں جس کے لئے ہم مولانا موصوف کے بے حد ممنون ہیں۔

**روض الریاحین** جناب مفتی کفایت اللہ صاحب کی نایاب تصانیف میں ایک عربی قصیدہ مع حواشی بھی ہے جس کا نام روض الریاحین ہے۔ یہ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۰ء میں مطبع افضل المطابع دہلی میں چھپا تھا اور ۱۳۲۹ھ یعنی ایک سال پہلے یہ عربی قصیدہ مدرسہ امینیہ دہلی کے سالانہ جلسے میں پڑھا گیا تھا۔

اس عربی قصیدہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے مشاہیر اساتذہ دیوبند کے علمی اور مذہبی کارناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کا باقاعدہ اردو ترجمہ بھی مفتی صاحب نے خود کیا ہے اور مختصر حواشی بھی اپنے قلم سے تحریر فرمائے ہیں۔ قصیدہ کے مشکل الفاظ کی تشریح عربی زبان میں ہے اور مشاہیر علمائے ہند کے مختصر حالات اردو میں تحریر فرمائے ہیں۔

یہ رسالہ شائع ہوتے ہی نایاب ہو گیا تھا اور ہمیں بھی اپنے زمانہ طالب علمی اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی کوئی علم نہیں تھا کیونکہ یہ دوبارہ شائع نہیں ہوا۔ حال ہی میں یہ ہمیں مفتی صاحب کے صاحبزادے مولانا حفیظ الرحمن آصف دہلوی کی عنایت سے موصول



ہوا ہے۔ اس کے ذریعہ صرف ہمیں مفتی صاحب کی ابتدائی تصنیف کا عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اعلیٰ قسم کا نمونہ حاصل ہوا ہے جس سے صرف عربی شاعری میں آپ کی قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ عربی اشعار کا اردو زبان میں با محاضہ اور سلیس ترجمہ بھی کر سکتے ہیں۔

مزید برآں اس کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ اس کے حواشی میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے قلم سے مشاہیر کے مختصر حالات اردو زبان میں شائع ہوئے ہیں۔ اس لئے ایک عینی اور مستند راوی ہونے کی حیثیت سے یہ نادر تحریر علمائے دیوبند کے حالات کی تحقیق کرنے والوں کے لئے مستند مواد کا کام دے گی اور عوام کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی۔

## المُسَوَّى من احادیث الموطا

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۴ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی کے زیر انتظام چھپی تھی۔ اس میں جابجا مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شروح پر مؤلف امام نے جو مبسوط مقدمہ لکھا تھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

قیمت:۔ بیس روپے

# اسلام اور بیمہ

معتمد علامہ موسیٰ ہار اللہ

مترجم، مولانا مطیع اللہ افغانی

موجودہ حالات میں علماء کرام کے سامنے جو جدید مسائل آئے ہیں ان میں سے لائیٹ انشورنس یا بیمہ کا مسئلہ بھی ایک ہے جو اب تک طے نہیں ہوا اور تحقیق طلب ہے، دنیائے اسلام کے نامور عالم علامہ موسیٰ ہار اللہ نے اس کی تحقیق میں ایک رسالہ بنام ”تامین الحیاة“ عربی زبان میں لکھا تھا، جس کا مولانا مطیع اللہ افغانی نے اردو میں ترجمہ کیا تھا اور جناب عہد احمد سبزواری ایم، نے بھوپالی نے ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمایا تھا، اُس دور میں علامہ مرحوم زندہ تھے۔ یہ کتابچہ ۱۹۴۶ء میں لطیفی پریس دہلی میں چھپا تھا، جس کو ہم بلا کسی تغیر اور تبدیل کے یہاں شائع کر رہے ہیں تاکہ اس مسئلے کے جلد پہلو سامنے آسکیں اور تحقیق کا کوئی گوشہ مخفی نہ رہے۔

(مدیر)

**مقدمہ** | زیر نظر کتاب حضرت رئیس عصر، فاضل اجل، علامہ موسیٰ ہار اللہ صاحب قبلہ کی ایک کتاب ”تامین الحیاة والاموال والاملاک“ کا اردو ترجمہ ہے۔ حضرت علامہ دوس کے رہنے والے ہیں اور علماء اسلام میں بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں۔ آپ کی ولادت ۱۸۸۷ء میں دوس کے ایک شہر دوستوف ٹٹن میں ہوئی۔ بچپن ہی سے

آپ کو تحصیل علم اور سیاحت سے کافی دلچسپی رہی۔ نوجوانی میں مختلف ملکوں کی سیر کی چنانچہ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کے علمی مرکزوں کا دورہ فرمایا اور اس زمانے میں آپ تین ماہ تک بھوپال میں بھی مقیم رہے۔

آپ عربی ترکی، اور روسی میں کافی جہارت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلغاری، یوگوسلاوی، فرانسیسی زبانیں بھی جانتے ہیں، فارسی اور اردو سے بھی کافی واقفیت ہے۔ آپ کی ڈیڑھ سو کے قریب مطبوعہ کتابیں موجود ہیں۔ سب سے اہم کتاب ”القانون المدنی للاسلام“ ہے۔ آپ کی تیس کتابیں عربی میں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں سے ”فقہ القرآن“ سب سے اہم اور بڑی کتاب ہے جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ فارسی میں ”کلیات حافظ کی شرح“ آپ کی مطبوعہ کتاب ہے، روسی زبان میں خود آپ نے کوئی کتاب نہیں لکھی۔ البتہ آپ کی متعدد کتابوں کا ترجمہ روسی زبان میں ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے متعدد مقالات اور مضامین روسی اخباروں میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ آپ نصف دنیا میں گھوم چکے ہیں۔ بلا دیورپ میں فنلینڈ، ناروے، سویڈن، پولینڈ، یونان، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، چیکوسلاواکیا، ہنگری، جرمنی، فرانس، بلا واسلامیہ قفقاز، ترکستان، ترکی، ایران، عراق، عرب، افغانستان اور مصر آپ جا چکے ہیں۔ جاپان اور چین کا بڑا حصہ بھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ دو مرتبہ ہندوستان بھی آپ آچکے ہیں۔ ان مختلف النوع ممالک کی سیاحت اور زبانوں کے ادب کے مطالعہ نے آپ میں فراخ حوصلگی، وسعت نظر، خور و فکر اور قہمت کی عادت اور پیچیدہ مسائل کی باریکیوں تک پہنچنے کی ایسی اچھی صلاحیت پیدا کر دی ہے۔ جس کی مثال دوسرے علماء میں بہت کم نظر آتی ہے۔

آپ کا بڑے بڑے مشاہیر اور نامور لوگوں سے ملنے کا بارہا اتفاق ہوا ہے جن میں کمال اتاترک مرحوم، نادر شاہ مرحوم، مولانا برکت اللہ صاحب بھوپالی، علی بزدوان، مفتی عابد (شاگرد رشید حضرت علامہ جمال الدین افغانی)، عصمت انیسو سلطان ابن سعود، لبنان، اسٹالین ٹراسکی وغیرہ شامل ہیں۔ آپ کے علم و فضل کے اعتبار سے روس کے مسلمانوں پر آپ کا بڑا گہرا اثر ہے۔ اسی وجہ سے ۱۹۳۳ء میں آپ کو بلاوین کی حالت میں روسی مسلمانوں کے متفقہ طور پر پوٹین

ہم کے واسطے روسی غاصبہ منتخب کیا۔ اور آپ نے مؤرخین روسی مسلمانوں کی غاصبہ کی فرمائی۔  
مسلمان اور عالم ہونے کی حیثیت سے آپ بالمشوریک تحریک اور اس کے بعد آنے والی  
یہ یا اس کی ترقی پسند صورت اشتعالیت سے ذرہ برابر متاثر نہ ہوئے۔ اور آپ کا یہ  
رہا کہ تنہا اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اخوت، مساوات اور دوا داری کی تعلیم دی  
شتر اکید اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچتی، نیز دنیوی نقطہ نظر سے بھی ایک مفید حد تک انفرادی  
اور ذاتی اخلاک کے جذبے کے بغیر دنیا کا کوئی نظام ترقی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ علی و شوارپ  
نہ ان کو ان دونوں کو بڑی حد تک اشتراکی نظام میں داخل کر لیا گیا۔ ساتھ ہی آپ نے ان قدیم  
می درس گاہوں کی بربادی بھی دیکھی تھی۔ جن میں زار کے زمانہ میں "ترویس" (روسی بنانا)  
بعد میں بالمشوریک یا اشتراکی بنانے پر زور دیا جانے لگا تھا۔ اور آپ نے روسی مسلمانوں کو مصلحت  
کے لئے ان کے واسطے علیحدہ پنچ سالہ تعلیمی نظام مرتب کیا۔ اشتراکی حکومت کو آپ کی یہ  
رمیاں ناگوار گذرنے لگیں۔ مگر وہ آپ کے علمی احترام کی بنا پر آپ کو کوئی سخت سزا  
اچاہتی تھی۔ اس لئے بڑی رد و قد کے بعد آپ کو مختصر سزا مدت کے لئے قید کر دیا۔ رہائی  
پر آپ برلن چلے گئے، اور وہاں ایک کتاب "مراجعت من بہ مل اسلامیہ" لکھی، جس کا روسی  
نام ترجمہ ہوا۔ اور جب کچھ عرصہ کے بعد آپ روس آئے تو آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کی وفات  
مد آپ کو رہا کر دیا۔ مگر پانچ سال کے لئے جلا وطن کر دیا۔ جلا وطنی کے بعد آپ واپس  
لوٹ آئے۔ لیکن حالات نامناسب رہے۔ اس لئے آپ نے حکومت سے باہر جانے کی  
ت چاہی۔ مگر حکومت نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس بنا پر آپ خفیہ طور پر تھان  
اور وہاں سے ہندوستان ہوتے ہوئے چین اور پھر جاپان چلے گئے، آغاز جنگ سے  
پ جاپان سے پھر ہندوستان آئے۔ اگرچہ آپ کا کسی سیاسی جماعت یا انجمن سے کوئی  
نہ تھا مگر حکومت ہند نے آپ کو نظر بند کر دیا۔ اور پانچ سال کے بعد رہا کیا۔ آپ کی نظربندی  
نہ تین سال سو پال میں گذرے جہاں آپ نے بڑی خاموشی سے زندگی گزاری۔ اور  
کی تہائی کاموں اور غور محسوس مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ چنانچہ  
پال کے قیام کے دوران میں آپ نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے سات شائع ہو چکی ہیں۔

حضرت علامہ ایک ترقی پسند نڈر رگ ہیں۔ خدا کے قائل اور رسول کی اتباع کے چل چلے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ”القانون المدنی للاسلام“ میں یہ ثابت کیا ہے کہ جن اسلامی حکومتوں نے اسلامی قوانین کو چھوڑ کر یورپین قوانین اختیار کئے ہیں۔ انہوں نے اچھا نہیں کیا ہے۔ وہ اشتراکیت کے پکے دشمن ہیں۔ سو نہ صرف دارالاسلام بلکہ دارالحرب میں بھی ناجائز اور حرام سمجھتے ہیں۔ آپ کے خیال میں اسلام کے قوانین عام ہیں اور وہ زمان اور مکان کی تید سے آزاد ہیں۔ لہذا مقام یا وقت بدل جانے سے ان میں کوئی تبدیلی یا ٹپک پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود آپ جان اور مال کے بجائے کو نہ صرف جائز سمجھتے ہیں بلکہ اس کو مفید خیال کرتے ہوئے اس کی بیش از بیش اشاعت کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ حالانکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہندوستانی علماء کی اکثریت یہ کہنا جائز قرار دیتی ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ بیسے کی جتنی فتویٰ موجود ہیں ان میں سے کوئی بھی شکل ایسی نہیں جس میں ربا و قمار یا دھوکا میں سے کوئی ایک نہ پایا جاتا ہو، اب رہا یہ امر کہ بیمہ کے معاملات میں ربا و قمار کے ذکر نہیں کیا جاتا۔ بلکہ منافع بیمہ کو دوسرے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ تو اس کی وجہ سے حقیقت پر ربا و قمار شرعاً تبدیل نہیں ہو سکتی جس طرح کہ بیع عینہ بھی ایک بیع ہی ہوتی ہے مثلاً زید نے عمر سے ایک گھوڑا سو روپیہ میں قرض خریدا اور تم تین ماہ میں ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اسی اثنا میں زید کو نقد رقم کی ضرورت ہوئی۔ اس نے وہی گھوڑا عربی کو پچاس روپیہ نقد میں واپس فروخت کر دیا۔ نیز تین ماہ کے بعد قرض کے سو روپیہ اور مزید عمر کو ادا کئے اسی قسم کی بیع کو بیع عینہ کہتے ہیں جو فقہاء کے نزدیک حرام ہے، حالانکہ ربا کا اس میں قطعی بھی تذکرہ نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس میں بھی مال کا حقیقت ربا پائی جاتی ہے اس وجہ سے باوجود عدم تذکرہ ربا کے وہ بھی ناجائز ہے۔

بعض علماء اس کو تاوان اور آمدنی غیر مکتسب کہتے ہیں۔ اور یہ دونوں مسلمانوں کے لئے ناجائز ہیں۔ اس لئے بیمہ کا جواز بھی ثابت نہیں ہوتا۔ حضرت علامہ نے جس نقطہ نظر سے بیمہ کے مسئلے کو پیش کیا ہے۔ وہ اس بات کا مستحق ہے۔ کہ اس پر مسلمان عوام اور علماء کرام خصوصاً غور فرمائیں اس پر اعتراض کی خاطر نظر نہ ڈالنا چاہیے۔ بلکہ ٹھنڈے دل سے تمام نکات کو سامنے رکھ کر کوئی

نیکو کرنا چاہئے۔ دراصل یہ وقت کی ایک اہم بیکار ہے۔ اس کو سرسری نظر سے دیکھ کر میں جاسکتا ہوں۔

بعض ملکوں میں اس نے بڑی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ انگلستان میں آج کل "نیفل" نسبل "پر جو بحث ہو رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ وہاں کی ساری آبادی کا بیمہ کر دیا جائے۔ جس کا مقصد بیماری اور بے روزگاری کا بیمہ ہر قسم کی ملازمت سے سبکدوشی بد تشن "امداد و حسرت" خاندانوں، بیواؤں، اور یتیموں کی کفالت اور اموال کی صورت ملا و غیرہ جیسی شکلیں شامل ہوں گی۔ یہ ہر شخص کو کرنا ہو گا۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔ اس اسکیم کے ابتدائی مصارف ۵۴ کروڑ پونڈ ہوں گے۔ مگر اس کا مقصد انگلستان کے ہر باشندے میں بہت اور پریشانی کے زمانے میں کفالت اور دستگیری ہو گا۔

میں کوئی عالم نہیں، مولوی نہیں، مثلاً نہیں، حتیٰ کہ دینی علوم کا بتدی تک نہیں۔ مگر میری خواہش کہ اس مسئلے پر غور کرتے وقت اگر میری مندرجہ ذیل معروضات کو بھی پیش نظر رکھا جائے یہ فیصلہ کرنے میں کوئی مدد مل جائے۔

(۱) سب سے پہلی صورت "تاوان" کی ہے، یعنی جب کسی بیمہ کنندہ یا اس کے ورثہ کو مدت سے قبل اور مقررہ اقساط داخل کئے بغیر کسی ناگہانی اور غیر متوقع سبب کی بنا پر پوری رقم ملنی تو کیا اس کی شکل تاوان کی ہو جاتی ہے۔ دراصل تاوان وہ معاوضہ ہے جو کسی کو نقصان پہنچا کر مل کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں کہہ دو نقصان نہیں اٹھاتا بلکہ وہ زائد رقم اپنے محفوظ فنڈ سے ادا کر دیتی ہے۔ پھر چونکہ کاروبار بڑے پیمانے پر ہوتا ہے اس لئے نقصان کی تلافی دوسری طرف کے نفع سے جاتی ہے۔ کہنی کو ذاتی طور پر کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ ہر کاروبار نفع کی خاطر کیا جاتا ہے۔ نقصان صورت میں اچھی سے اچھی کہنی بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ پھر ایک اور بات بھی ذہن میں رکھنا ہے۔ کہ اموات کے مقابلہ میں پیدائش کی شرح زائد ہوتی ہے۔ یہی صورت ناگہانی اور غیر متوقع حادثہ ہے۔ جو جملہ بیمہ کے تناسب سے بہت کم پیش آتے ہیں۔

لہذا مجموعی حیثیت سے کہیں کو کوئی تاوان دینا ہی نہیں پڑتا ہے۔

دوسری صورت غیر متنبہ آمدنی کی ہے۔ مگر ہر غیر متنبہ کردہ آمد نا جائز نہیں ہوتی

مثلاً کسی دوست یا عزیز کا عطیہ، ورثہ یا ترکہ میں معقول رقم کا ملنا، خون کا معاوضہ، کسی کی اعانت اور بار بار بھی غیر مکتب آمدنیوں کے ذیل میں آتی ہے، مگر اسلام میں ان کی اعانت نہیں ہے یہی صورت بیمہ کی ہے۔ جہاں تعاون اور شراکت کے تحت ایک رقم ملتی ہے۔

(۳) جو کسی کمپنی میں بیمہ کرتے ہیں وہ کمپنی کے شراکت دار بن جاتے ہیں، کیونکہ کمپنی ہر دوسرے یا تیسرے سال اپنے جملہ کاروبار کا حساب لگا کر منافع علیحدہ بحال دیتی ہے اور اس میں کچھ رقم محفوظ فنڈ میں داخل کر کے باقی رقم 'یونٹس' کے نام سے جملہ حصہ داروں کو تقسیم کر دیتی ہے اس منافع کی مقدار معین نہیں ہوتی۔ کسی مرتبہ زیادہ ہوتا ہے اور کسی مرتبہ کم۔ اور کبھی بالکل نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے کاروباروں میں ایک مقررہ شرح سے کم منافع ملنا یا منافع کا بالکل نہ ملنا بھی ٹھیک قسم کا نقصان ہے اور جب شراکت دار کسی کاروبار کے نفع و نقصان میں برابر کے ہی شریک ہوں تو ایسا کاروبار ناجائز نہیں ہو سکتا۔

(۴) ایک اعتراض یہ ہے کہ بیمہ کمپنیاں سودی کاروبار کے ذریعہ نفع حاصل کرتی ہیں، اور جب ان کے سرمایہ میں سود کا جزو شامل ہو جاتا ہے تو مسلمانوں کیلئے یہ جائز نہیں ہو سکتا۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو آج ہر قسم کی سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتیں ناجائز ہو جاتی ہیں، کیونکہ تنخواہ، وظیفہ، امداد، منصب یا پیشی جو سرکاری خزانوں یا غیر سرکاری تحویلوں سے ملتی ہیں ان میں مشتبہ اور ناجائز آئیٹمز کا جزو شامل ہوتا ہے۔ کیونکہ حکومت کے خزانوں میں سود اور شراب وغیرہ کی آمدنی بھی داخل ہوتی ہے اور ان کو الگ الگ رکھنے کا کوئی انتظام نہیں ماری آمدنیوں ملا دی جاتی ہیں۔ اور ان ہی میں سے تنخواہیں اور وظیفے ادا ہوتے ہیں۔ میرے خیال سے تو وہ اسلامی حکومتیں بھی جو سود اور شراب وغیرہ کی آمدنیوں کے جواز کی قائل نہیں ہیں اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ آج کل بین الاقوامی صورت ایسی ہو گئی ہے کہ ان میں سے بیشتر حکومتوں کو معاہداتی طریق کے تحت غیر اسلامی حکومتوں سے ساحل سمندر یعنی یا فضائی راستوں کے استعمال کا معاوضہ یا معدنیات وغیرہ کے اجاروں کی رقم ملتی ہے جو غیر اسلامی حکومتوں کے ان خزانوں سے ادا ہوتی ہے جہاں حلال و حرام کی کوئی تفریق نہیں، اور اس طرح یہ جو اسلامی حکومتوں کے خزانوں کی پاک رقموں کو بھی گندہ کر دیتا ہے۔ اس طرح تو یہ مسئلہ بھائے سلجھنے کے اور زیادہ الجھ جائے گا۔ غالباً یہ مشکل صرف اس طرح حل ہو سکتی ہے مگر اس کو

دیکھا جائے کہ جس آدمی کو جس خدمت یا کام کا معاوضہ مل رہا ہے وہ خدمت یا کام فی قسم حرام زائد کر وہ تو نہیں۔ دوسرے وہ خدمت دیانتداری اور صداقت کے ساتھ انجام دی جا رہی ہے یا اگر یہ دونوں صورتیں موجود ہیں تو اس کو جو معاوضہ مل رہا ہے وہ اس کے لئے جائز اور حلال ہے۔ صورتِ بیہ کی ہے، یعنی اگر بیہ کنندہ یا اس کے وارث خود سود نہیں لیتے تو ان کو کہیں سے جو قسم ہے وہ ان کے لئے جائز ہے۔

(۵) اسلام کے دو مسائل قسامہ اور ویت میں بڑی مشابہت پائی جاتی ہے۔ قسامہ یعنی خون کی ت میں محلہ والوں پر قسم کے لازم آنے کی صورت ہے کہ اگر کسی محلے میں مقتول پایا گیا جس کے قاتل ل معلوم نہیں تو مقتول کا وارث اس محلے والوں میں سے پچاس آدمی چھانٹے اور ان سے قسم لی ئے کہ بخدا نہ ہم نے قتل کیا، اور نہ ہم اس کے قاتل کو جانتے ہیں۔ قسم کھالینے کے بعد محلے والوں تول کی دیت لازم ہوگی۔ اگر مقتول دریا کے کنارے لٹکا یا بندھا ہوا ملے تو جو گاؤں وہاں سے ہ نزدیک ہوگا اس پر قسامہ لازم آئے گا۔ اگر مقتول کشتی میں ملے تو جو اس میں سوار ہوں اور طر ان پر دیت اور قسامہ لازم آئے گا۔ اگر مقتول شاداع عام یا جامع مسجد میں ملے تو دیت بیت المال دی جائے گی۔ یہی صورت عام دیت کی ہے کہ دیت قاتل پر لازم ہے اگر اس میں دیت ادا کرنے صلاحیت نہ ہو تو اس کی برادری یا رشتہ داروں پر۔ اور اگر اس کے قبیلے کے لوگ اتنے نہ ہوں کہ حساب سے پڑتے پڑتے تو اس میں عصبات کی ترتیب کے لحاظ سے دوسرے قبیلے یا رشتہ یں کو ملایا جاسکتا ہے اور اگر سارے قبیلے میں دیت ادا کرنے کی صلاحیت نہ ہو بعض اور صورتوں یت المال میں تمام مسلمانوں سے دیت دلوائی جائے گی۔

ان مسائل پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اول تو اسلام نے ہر مسلمان کی جان کا ضمان اور ساری مسلم قوم کو بتایا ہے۔ اور اگر وہ اپنے اس فرض کو انجام نہ دے تو اس کو اس کا کفارہ دیت ن میں ادا کرنے پر تیار رہنا چاہیئے، جو ایک کفالت عمومی کی شکل ہے۔ دوسرے اس کفالت عمومی کو قدر اہمیت دی کہ بعض صورتوں میں تاوان تک کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ مثلاً قسامہ کی صورت اگر مقتول کو محلے والوں یا مقام قتل کے پاس والے گاؤں والوں نے قتل نہیں کیا اور قاتل کا کوئی نہ چلا تو حوام کو جو دیت دینا پڑے گی دراصل وہ تاوان ہی ہوگی۔ بلکہ وہ اس صورت میں بھی تاوان



ہے جب کہ وہ قسم کھاتے ہیں کہ ”نہ تو ہم نے قتل کیا اور نہ ہم قاتل کو جانتے ہیں“ لیکن ان سے دیت دلوائی جاتی ہے۔ تیسرے دیت کا جو معاوضہ بصورت رقم یا جنس ادا کیا جاتا ہے حقیقتاً وہ مقتول کے گوشت اور پوست کا معاوضہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ ذمہ داریوں، فرائض اور کفالتوں کا معاوضہ ہے جو مقتول پر بحیثیت باپ، شوہر، اولاد یا اور کسی رشتے کے لحاظ سے عائد ہوتی تھیں۔ گویا اسلام قتل (یعنی ناگہانی موت کی ایک صورت) میں پسماندگان اور اعزاء کی کفالت پر بڑا زور دیتا ہے۔ یہی صورت بیمہ کی ہے جہاں قبل از وقت موت یا حادثے کی صورت میں اس کو یا اس کے وارثوں کو خاندان کی کفالت کے واسطے شراکت ملوثی میں سے ایک رقم (جو معین ہو چکی ہے) مل جاتی ہے جو نہ قمار ہے نہ تاوان اور نہ غیر مکتسب آمدنی۔ اور نہ داخل شدہ رقم کا سود ہو سکتا ہے۔ کیونکہ فرض کیجئے بت نے پچیس سال کے واسطے ایک ہزار روپیہ کا بیمہ کر لیا اور ابھی اس نے صرف ۹ ماہ کی قسطیں یعنی پچیس روپے داخل کئے تھے کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اور پچیس کے شرائط کے مطابق ورثہ کو ایک ہزار روپیہ مل گیا ظاہر ہے کہ ۹۷۵ روپیہ کی رقم جو زائد ملی وہ کسی صورت میں بھی پچیس روپیہ کا چھ ماہ کا سود نہیں ہو سکتی۔

پچیس کے سلسلے میں ایک مام غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنی رقم کا بیمہ کرتا ہے تو اس کی پالیسی پختہ ہونے کے بعد اس کو جو زائد رقم ملتی ہے وہ سود ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں بلکہ قسطوں پر جو رقم پھیلائی جاتی ہے۔ وہ سب ملا کر اس رقم سے زائد جو جاتی ہے جتنی رقم کی اصل پالیسی کہلاتی ہے، اور پالیسی پختہ ہونے کے بعد جو رقم ملتی ہے دراصل وہ وہی زائد رقم ہوتی ہے جو خود بیمہ کنندہ نے زائد داخل کی تھی منافع والی پالیسی میں وہ ”بونس“ اور شامل ہو جاتا ہے جو پچیس سال کے عرصہ میں کمپنی نے وقتاً فوقتاً تقسیم کیا۔ ذیل کے نقشے سے یہ چیز اور واضح ہو جائے گی۔

عمر وقت بیمہ	مدت بیمہ	سلازہ قسط	ادا ہونے والی رقم	قیمت اصل پالیسی	زائد رقم جو ادا کی گئی	غیر منافع والی پالیسی
۴۵ سال	۲۵ سال	۵٪	۱۲۵۰	۱۶۰۰۰	۲۵۰	
عمر وقت بیمہ	مدت بیمہ	سلازہ قسط	ادا ہونے والی رقم	قیمت اصل پالیسی	زائد رقم جو ادا کی گئی	منافع والی پالیسی
۴۵ سال	۲۵ سال	۵۷/۶	۱۴۳۴	۱۶۰۰۰	۴۳۴/۶	

زیادہ سے زیادہ احتیاط کا تقاضا یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمان غیر منافع والی پالیسی خریدے تاکہ ”بونس“ کی شکل میں جو منافع ملتا ہے اور جس میں سود کے جزو کا شامل ہونے کا ہے اس سے بھی محفوظ رہ سکیں۔

مجموعی حیثیت سے ہندوستان میں جیسے کاروبار بہت کم ہے ۱۹۳۷ء میں یہ کم کی تعداد ۳۷۹ تھی جن میں ۱۴۷ بیرونی کمپنیاں تھیں اور خالص منافع کی تعداد ۲۴ روپیہ تھی جس میں سے صرف ۴ لاکھ ہندوستانی کمپنیوں کا منافع تھا اور باقی دو کروڑ لاکھ غیر ہندوستانی کمپنیوں کا۔ اگرچہ بدلیسی کمپنیوں کی تعداد کم تھی مگر ان کا منافع زائد ہونے پر ہے کہ یہ ”زندگی“ جائداد، عمارتوں، آگ، جہاز رانی وغیرہ مختلف کاموں کا بیمہ کرتی ہیں۔ ہندوستانی کمپنیاں زیادہ تر زندگیوں کا بیمہ کرتی ہیں اور اس میں منافع کم ہوتا ہے۔

مملکت میں ۲۳۲ ہندوستانی کمپنیاں ہیں اور ان میں صرف دو مسلمانوں کی کمپنیاں ہیں۔ ۱۰ کمپنیاں ایسی ہیں جن میں ایک ایک مسلمان ڈائریکٹر اور چند چھتے دار مسلمان ہوتے ہیں ان سب کی تعداد ایسی ہی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ اس لئے سخت ضرورت ہے کہ مسلمان بیمہ کی طرف توجہ کریں بلکہ مسلمان اپنی کمپنیاں بھی قائم کریں اور اس کاروبار کو بھی سے زیادہ اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش ہونا چاہیئے۔

ہندوستان ایک غریب ملک ہے، دوسرے ملکوں کے مقابلے میں یہاں کی سالانہ کمپنیاں بہت ہی ادنیٰ ہے۔ کھیتی اور کرڈھتیسوں کا تناسب آبادی کے لحاظ سے ہی کم ہے۔ اور ہندوستانی مسلمان ہندوستانی قوموں سے اکثر پست اور مفلس ہیں۔ یہ تجارت اور کاروبار میں زیادہ مشغول نہیں۔ مسلمانوں میں جو خلل خلل خوش حال نظر ہیں۔ ان کے اخراجات بھی زیادہ، معیار زندگی اعلیٰ، اور ان کو پوس اندازی کی عادت نہیں۔ اس لئے جب وہ ناگہانی طور پر کسی حادثے یا موت کا شکار ہو جاتے ہیں تو ان کے ماندگان اور اعزاء کا جو حال ہوتا ہے، اس کی سینکڑوں مثالیں ہم روزمرہ اپنے گرد و پیش دیکھ سکتے ہیں۔ مفلسی اور تنگدستی سے عاجز آکر ہر سال سینکڑوں بیوائیں اور یتیم لاوارث

بچے مشنری اور دوسرے مبلغوں کے آغوش میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ایسے خاندانوں کی کفالت کی جائے، اور اس کے واسطے یمہ سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ بہت سے خوش حال گھرانے بگڑ جانے کے بعد نہ تو اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتے ہیں اور نہ اپنے بچوں کی شادی کر سکتے ہیں، لیکن ان کو کوئی دقت نہ ہو اگر یہ تعلیمی پالیسیاں اور شادی کی پالیسیاں خرید لیں، اور ہر ماہ ایک چھوٹی سی رستم داخل کر کے ضرورت کے وقت ایک معقول رقم پانے کے مستحق ہو جائیں۔

حضرت علامہ نے مسلمانوں کو اپنے اموال کے ایک حصے کو بصورت وقف کرانے کا جو مشورہ دیا ہے وہ بہت ہی صائب ہے، بلکہ میری رائے میں تو موجودہ اوقاف کا ہیہ ہو جانا بھی ضروری ہے تاکہ ایک طرف تو اوقاف کی موجودہ خرابیوں کی اصلاح ہو سکے، اور دوسری طرف مستحقین وقف صحیح طور پر استفادہ کر سکیں، جو واقفین کا اصلی مقصد ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ اوقاف محض چند آدمیوں کے قبضے میں جا کر ان کی ہوس و جاہ پرستیوں کا شکار بن جائے۔ مولوی مطیع اللہ خاں صاحب افغانی جنہوں نے اس رسالہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے خود ایک دہ دمنڈ اور صاحب بصیرت انسان ہیں ان کے دل میں قوم کی خدمت کی سچی تڑپ ہے، ان میں خاموشی سے کام کرنے کی عادت ہے۔ وہ مسائل حاضرہ سے کافی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اردو دلائل طبقہ کو ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ایک علامہ روزگار، فاضل اہل کے گراں قدر اور قیمتی خیالات سے ہمیں روشناس کرایا۔ اور غالباً علامہ کی یہ پہلی کتاب ہے جس کا ترجمہ اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر ترجمہ یا مقدمہ میں کوئی لغزش نظر آئے تو اس کو نظر انداز فرما دیا جائے کیونکہ اصل مقصد روح ہے نہ کہ ظاہری رنگ اور روپ۔ اور نہ اہل دانش ایسی معمولی باتوں کو اہمیت دیا کرتے ہیں۔ فقط

محمد احمد سبزواری ایم، اے۔ بھوپال

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لائف انشورنس اور بیمہ خواہ بڑھاپے، عجز اور موت کے بعد پیش آنے والے خطرات کی انسداد اور اندفع کی بنا پر کرایا جائے، یا کسی بھی ایسی تباہی اور نقصان رسیدگی کی پیش بندی کے لئے کرایا جائے جب انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کی انجام دہی سے عاجز اور بے بس ہو جاتا ہو، تو یقیناً ایک اچھی اور بہترین دور اندیشی ہے۔ لائف انشورنس اور بیمہ یا اس قسم کی دوسری کمپنیاں سب کی سب اقتصادی خوش حالی کے خاطر وجود میں لائی ہوئی تمدنی اور شہری مفاد کی ایجادات ہیں، کچھ عرصہ پہلے انسان ان کے نام سے بھی ناواقف اور نا آشنا تھا، لیکن آج ہر فرد بشر بلا تخصیص ایک کفالت عمومی کی شکل میں اس سے مستفید ہوتا ہے۔ دنیا کے مظلوم اور غریب افراد، تمدن اور تہذیب یافتہ دنیا کے باشندے ایک عرصہ دراز سے اس کفالت عمومی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ سالہا سال کی جانفشانی کے بعد دنیا کی کاوشیں بار آور ثابت ہوئیں، اور یہ کامیابی بھی انسانی سوسائٹی کے انہی علماء، فضلاء اور برگزیدہ افساد کی مرہونِ منت رہی جو ہمیشہ انسانیت اور دنیا کی مظلوم آبادی کی بھلائی اور خوش حالی کی خاطر ایک سرگرم جدوجہد اور انتھک کوششوں میں منہمک رہتے ہیں۔ سینکڑوں تکلیف و تجربہ کے بعد وہ اپنی مسلسل محنتوں کے پھل سے انسانیت اور بشریت کی عام آبادی کو مستفید کرتے ہیں انسانیت کی شہری اور تمدنی ترقی ہمیشہ ان ہی اولوالعزم اور باہمت افراد کی اُن گنت کوششوں کے سر رہی ہے۔ بشریت کا ارتقا آسمانی پرواز، بڑی اور بحری سہولتیں اور آسانیاں بھی ان ہی کی بے شمار محنتوں، اور بے نظیر کوششوں کے ثمرات اور نتائج ہیں۔ اقتصادی مشکلات اور تمدنی راستوں کی رکاوٹیں بھی صرف یہی حضرات دور کر سکے۔ اس قسم کی تمام جدید اسکیمیں جو اجتماع انسانی کی بھلائی کی خاطر وجود میں لائی جاتی ہیں وہ سب ان حضرات علماء، اہل تجربہ، اور مجتہدینِ کرام کے دماغوں کے ثمرات ہوتے ہیں جو سالہا سال تک ان تجربات میں بشریت کی بھلائی کے خاطر صرف کرتے ہیں۔ ان تدابیر کو وجود میں لانے کے بعد ان کی عام منفعت سے ہر شخص بغیر کسی تخصیص کے مستفید ہوتا ہے، امیر اور غریب یکساں طور پر ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی اجتماعی حقیقت ہے جس کے مشاہدہ کے لئے معمولی سی بصیرت

اور ذرا سی بینائی کی ضرورت ہے۔ تاریخ کے مختلف دور سے اس کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ کفالت عمومی کا فائدہ ہر حصوں کو کتنا عام رہا ہے۔ اسی کھلی ہوئی حقیقت کی طرف خداوندِ عالم ارشاد فرماتا ہے:-

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ (جہاد کی ہماری رضا مندی کی خاطر) ہماری راہ میں سُبُلَنَا طَوَّرَنَا اللَّهُ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ جہاد کی ہم ضرور ان کو نیک راستے بتائیں گے ، بلا شک و شبہ خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔ (۶۹ : ۲۹)

انسانیت کی بھلائی اور فلاح کے وسائل فراہم کرنے کے لئے خواہ کوئی بھی کوشش کرے اس شخص کا اس آیت کریمہ کے غموم میں داخل ہونا ایک یقینی امر ہے۔ یہ کسی کے بھی بس کی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں تحریف کرے یا اس کے نظم کو بدل دے، کتاب اللہ کے کسی عام حکم کی تخصیص کرے، اور نہ کسی کی اتنی طاقت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی عام کے فائدے کو خاص کرے۔

(۱) مال کا بڑھنا اور زیادہ ہونا ایک طبعی اور فطری امر ہے۔ اسی طرح (۲) مال از روئے شریعت اسلامیہ ایک قسم کا چشمہ خیر ہے جو ہمیشہ جاری ہے اور اس کے علاوہ (۳) مال اپنی منفعت عامہ کے اعتبار سے اجتماع انسانی کے لئے اپنی دنیوی خوبیوں کے ساتھ ایک قسم کا خداوندی آرام و آسائش ہے مندرجہ بالا تینوں خوبیوں کو خداوندِ دو جہاں نے ہر قسم کے مال میں ودیعت اور امانت کیا۔ مال کی نمو اور زیادتی کا ہر شخص مختلف طریقوں سے مشاہدہ کرتا ہے۔ کاشتکار کھیتی میں، باغبان باغ میں، نسل کش نسل کشی میں، تاجر تجارت کی منڈیوں میں۔ غرض ہر شخص مختلف طریقوں سے اس کی منفعت کا اندازہ لگا سکتا ہے، لیکن آج کل مال کی منفعت کے ایسے ایسے وسائل فراہم ہو چکے ہیں جو پہلے تھے، اور ان سے صرف بزرگترین سلطنت اور بڑے سے بڑا بادشاہ زیادہ سے زیادہ اقتصادی فائدہ اٹھا رہے۔ آج کل دراصل ان ہی ملکوں کی سلطنتیں ہیں جو اقتصادیات میں بے نظیر جہارت رکھتی ہیں۔ مادہ قدیم میں ثروت اور دولت مندی تہہ تہہ رکھے ہوئے منجمد سرمایہ کا نام تھا جو معاون، کان اور خزانوں کی صورت میں ہوا کرتا تھا۔ ان خزانوں کے دروازے مقفل تھے۔ ان کی کنجیوں کے دھیر بھی بدلتے نہ تھے۔

ابوچھر ہوا کرتا تھا۔

لیکن آج دولت اور سرمایہ کے ڈھیر کی کوئی حیثیت اور حقیقت نہیں، اور نہ اس کا کسی گروہ میں شمار ہے، نہ ایسی دولت سوسائٹی یا خود ملک کے لئے مفید تصور ہے، جب تک کہ وہ اقتصادیات کے ماہر اور ذہین لوگوں کے ہاتھ میں گردش نہ کرے، جس کو یہ لوگ موقع سے کسی مفید تجارتی کاروبار میں اپنی اقتصادی جہارت اور ذہانت سے استعمال کرتے ہیں، بعض اوقات اتنا کثیر نفع کھاتے ہیں جو اس المال مل سرمایہ سے کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ یہ ذہانت اور تجربہ جس سے اقتصادیات کے بڑے ماہر فائدہ اٹھاتے ہیں کوئی مذہبی یا فقہی پیشوا اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات مادی ماہر مال کو اس طرح گردش دیتے ہیں جہاں ربا اور سود کا نام تک نہیں ہوتا ہے نیک اس کا اثر یا وجود ہو۔

اسی اصلی دلیل اور اسی بنیادی علت کی بنا پر خدائے تعالیٰ نے سرمایہ اور دولت کے لگانے کو حرام فرمایا ہے۔ (۳۴: ۹)۔ کیونکہ مال کا بہترین نفع امتداد اور گردش ہی کی صورت میں ہوتا ہے، نہ یہ کہ سونے اور چاندی کے ڈھیر لگائے جائیں کیونکہ مال کا بہترین معاون مددگار ثابت ہونا۔ اس صورت کے بغیر ناممکن ہے۔ زکوٰۃ کے بار بار فرض ہونے کا بھی یہی نام ہے۔ اس لئے کہ نصاب کا مقتضی اور منشا یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ دولت سے نفع حاصل کیا جائے اور مالک مال کا یہ فرض ہے کہ وہ منڈی میں اپنے مال سے نفع طریقوں سے فائدہ اٹھائے (نہ یہ کہ گھر میں ڈھیر لگائے اور اس کے وجود کی پوجا کرے)۔

مداوندی:

لَا يَكُونُ ذُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ تاکہ دولت صرف امراء ہی کے قبضوں میں نہ رہے۔ (۷۱: ۱۵۹)

ہماری رہبری فرماتا ہے کہ قانون الہی کا مقتضا یہ ہے کہ مال کو زیادہ سے زیادہ امتداد پھیلاؤ کا موقع دیا جائے تاکہ سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ افراد اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اجتماع انسان کو ہر قسم کا آرام اور آسائش نصیب ہو۔ افلاس وغریبی انسانیت سے دور ہو۔

مدنیت اور شہریت بشری ہمیشہ سیراب اور خوش حال رہے۔

لفظ ”اتفاق“ جو آیت کنز (۳۴، ۹) میں مذکور ہے اور بھی اس کے علاوہ جتنے مقامات پر یہ لفظ مذکور ہوا ہے اس سے بھی یہی مقصد ہے کہ مال دولت کو نفع بخش اور مفید طریقوں پر استعمال میں لانا چاہیے تاکہ افراد ایک دوسرے کے دست نگر اور محتاج نہ رہیں اور اس طرح انسانی سوسائٹی کے غریب افراد کسب حلال اور سود مند کمائی کے عادی بن جائیں اگر اتفاق سے مروج معنی مراد لئے جائیں کہ لوگ صدقات اور خیرات کے عادی بن جائیں اور صدقات اور خیرات ہی کو ذریعہ معاش بنائیں تو اتفاق کا نتیجہ گمراہی ہی ہوگا، جو مفید ہونے کی بجائے ایک کھلی ہوئی ہلاکت اور تباہی ہے، اور اسی کا بھل ہے جس کو آج کل ہم چکھ رہے ہیں۔

کتاب اللہ نے شرعی نقطہ نظر سے صوف مال کے وجود ہی کو امداد باہمی اور بہترین کفالت عمومی کا ایک جاری چشمہ قرار دینے پر اکتفا نہیں کیا ہے کہ تجارتی اور منصفی صورت میں اس کے ڈھیر کے ڈھیر آسمان کی طرف عمودی شکل میں مرتفع ہوں۔ بلکہ اس نے انسان کو اس بات کی دعوت دی ہے کہ دولت کو پہلے تمہارت اور منفعت عمومی کے لئے سطح زمین پر افقی شکل میں پھیلا دیا جائے تاکہ ہر فرد بشر مساویانہ طور پر اس سے مستفید ہو سکے۔ اور آخر کار نتیجے میں عمودی شکل میں اپنے مرکز کی طرف لوٹے، تاکہ اجتماع انسانی اور بشری سوسائٹی میں کوئی ایک بھی محتاج اور غریب نہ رہے، اور دنیا کی آبادی کا ہر فرد خوش حالی سے زندگی بسر کر سکے۔ اگر مال اور دولت کا استعمال اس طریقہ پر نہ ہو تو دولت یقیناً خدا کے حکم کے خلاف ایک مٹھی بھر افراد کے ہاتھ میں اکٹھی ہوگی اور اس فعلی قبیح کا نتیجہ سوائے قتل و خوریزی کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

اگر غور کیا جائے تو دنیا میں جتنی بھی لڑائیاں لڑی گئی ہیں اکثر اسی غلطی اور بے انصافی کا نتیجہ ہیں۔ تمدن اور شہریت کو جب بھی نقصان پہنچا ہے وہ اسی کوتاہی کا ثمرہ ہے۔ انسانی آبادی اور اچھی مدنیت جب بھی تباہ اور برباد ہوئی ہے صرف اسی غلط اصول اور خود غرضی سے ہوئی ہے۔

کسی مذہبی فقیہ، دینی پیشوا، یا گزشتہ زمانے کے دینی وسائل کے مقلد کالین موجود۔  
روباری وسائل پر بے سوچے سمجھے اعتراض کرنا یقیناً لغو اور بے بنیاد ہے، اگر ان میں  
سے کسی حضرت کا قول اعتراض کی حد سے بڑھ کر تحریری حکم تک پہنچے تو بلا شک و شبہ یہ نہ صرف  
ان کی زیادتی ہی ہوگی، بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھوٹ منسوب کرنے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔  
یہ حضرات کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جن کے متعلق خدائے تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

اِنْ تَشْرَعُوا لَهٗمْ مِنَ الدِّينِ مَآلًا  
مَّاۤ اُذِنَ بِهٖ اللّٰهُ  
انہوں نے عوام کے لئے ایسا دین ایجاد کیا جس  
کی کہ خدانے اجازت نہیں دی ہے۔

قُلْ اَللّٰهُ اٰذِنٌ لِّكُمْ اَمْرًا عَلٰی  
اَللّٰهِ تَفْعَلُوْنَ  
کیا خدانے تم کو ایسا کرنے کی اجازت دی ہے یا  
تم خدا پر جھوٹ بولتے ہو؟

مقلدین کے ایسے استدلال جو کسی چیز کی حلت اور حرمت یا جواز اور عدم جواز کے  
تعلق ہوتے ہیں ان کی بنیاد عموماً دو باتوں پر ہوتی ہے (۱) یا تو وہ اپنی نادانستہ جہالت کی  
جسے ایسے استدلال پیش کرتے ہیں (۲) اور یا پھر دانستہ طور پر اپنے استدلال کی غلطی کو  
بانٹتے ہوئے وہ ایسا کرتے ہیں اور اس طرح عوام کو غلط راستہ پر لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔  
اگر کوئی شخص کسی چیز کو بطور احتیاط کے حرام قرار دے تو اس کے اس احتیاطی حکم میں  
رکسی حلال چیز کو حرام قطعی قرار دینے میں کوئی فرق نہیں اس احتیاط کی بیماری نے اکثر لوگوں  
سے یا تو حلال قطعی کو حرام کرایا اور یا حرام قطعی کو حلال کرا دیا۔ حالانکہ ہمارے لئے یقین کے  
سوا کوئی بھی بہتر طریقہ نہیں ہو سکتا اور ہم کو اسی یقین ہی کا اعتبار کرنا چاہیئے۔ کیونکہ صرف  
یہی ہماری نجات کا راستہ ہے۔ احتیاط سے استفادہ کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ نہ تو احتیاطاً  
ہم کسی چیز کو حلال قرار دیں اور نہ حرام، تا وقتیکہ ہم کو کوئی نص صریح نہ جائے۔ ہاں احتیاط سے  
اس وقت ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے جب کہ کسی چیز کے حلال قرار دینے میں انسانیت کی خاطر  
کوئی کھلی ہوئی فلاح نظر آجائے اور یا کسی امر کے حرام قرار دینے میں ہم کو کوئی کھلا ہوا فساد نظر  
آجائے گویا حلت اور حرمت میں ہمیشہ فلاح یا فساد نظر رہنا چاہیئے۔ اس کے علاوہ ہر  
احتیاط جو دین میں زیادتی پیدا کرتی ہو یا اس کے سبب سے دین میں نقصان کا خوف ہو وہ



یقیناً لغو، بے سود اور باطل مطلق ہے۔ ہر سچے مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسی اعتیاد کو اعتیاد کی تلقین کرنے والے کے سر پر دے مارے خداوندِ عالم کے ارشاد و گرامی کا بھی یہی مقصد ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا قَصَفْنَا لَكُمْ أَلْسِنَتُكُمْ  
الْكَذِبَ هَذَا حَلَالٌ وَهَذَا حَرَامٌ  
جن چیزوں کی تمہاری زبانیں وصف اور تعریف کرتی ہیں۔ ان کو حلال یا حرام کہہ کر خدا پر جھوٹ کی تہمت نہ لگاؤ۔

جس طبعیت اور عقلیت کو تسلیم کرنے سے کوئی نفع شرعی انکار کرے تو اس سے کسی بھلائی کی امید نہیں، اور جس دعویٰ کی حقیقت اور صحت کا اعتراف علم اور عقل نہ کرتے ہوں، اس سے بھی کسی فائدہ اور فلاح کا واسطہ نہیں ہے۔ ہاں جو علم اور عقل کے خلاف برائی کا ارتکاب نہ کرنا ہو، اور نہ فضیلت بشری، اور صلاحِ عام کو ہاتھ سے جانے دیتا ہو، بلا شک و شبہ شریعتِ الہی اور دینِ اسلامی بڑی خوشی سے اس کا استقبال کرتا ہے غرض یہ کہ دینِ خداوندی ہر شرافت اور فضیلت، بھلائی اور صلاحِ بشری کا خیر مقدم کرتا ہے۔

چونکہ لفظ ”تأمین“ (جو بیمہ کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے) اپنے معنی کے لحاظ سے خاص اور ظاہر ہے اس لئے میں اس کو اس مسئلہ میں بار بار ذکر کرتا ہوں، اور لفظ ”تأمین“ قرآن کریم میں متعدد جگہ مذکور ہے۔ مثلاً ”وَلَا تَقُولُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ إِنَّا كُنَّا فِي الْكَلَامِ كُنْتُمْ مُؤْمِنًا“

قرآن نے عموماً لفظ ”أمن“ کو ذکر کیا ہے جیسے:-

”أَمْ أَمْسَتْكُمْ مَنَ فِي السَّمَاءِ أَنْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا“

اسی معنی میں لفظ ”ایمان“ کا بھی ذکر ہوا ہے:-

”وَأَمَّنْهُمْ مِّنْ خَوْفٍ“ (۱۷: ۶۷)

میراجی یہ گوارا نہیں کرتا ہے کہ اس مقدس لفظ ”تأمین“ کو عالمیانہ روایاتی محاورات میں استعمال کر کے رسوا کروں، اور نہ یہ دل پسند کرتا ہے کہ اس لفظ کو کمپنیوں کے اسما اور نام کے لئے مروج کرا دوں، خواہ وزنِ افعال عربی میں کتنی وسعت اور گنجائش کیوں نہ ہو۔ البتہ

عثمانی میں اس مفہوم کی ادائیگی کے لئے لفظ ”سیغورطہ“ استعمال کیا جاتا ہے میرے خیال میں یہ اصطلاح انگریزی لفظ (Security) سے وضع کی گئی ہے، جس کے معنی تائین و حفاظت کے ہیں۔ فارسی اور اردو میں لفظ بیمہ اس مفہوم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے بیمہ کے معنی خوف اور خطر کے ہیں۔ ”بیمہ“ نسبت کے لئے بڑھادی گئی ہے۔ عراق والوں نے بیمہ سے تشبیہ بنایا ہے جس کے معنی خوف اور خطر سے بچانے کے ہوتے ہیں، اور بیمہ کو باب تفصیل میں لے جانے سے ازالہ کے معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جس طرح خداوند عالم فرماتا ہے:

رَاٰلَا مَا ذَکَّبْنٰهُ (۳: ۵)

”ذکاء“ اصل میں خون کی طبعی اور غریزی حرارت کو کہتے ہیں اور خون بہانے کے بعد یہ حرارت باقی رہتی ہے۔ ”باب تفصیل تزکیہ“ میں لے جانے کے بعد اس کے معنی حرارت غریزی کے ازالہ کے ہو گئے۔ اس بنا پر لفظ ”بیمہ“ (ازالہ خوف و خطر) کا تائین یا بیمہ کے لئے عربی زبان یا غیر عربی میں استعمال کرنا زیادہ بہتر اور مناسب ہے۔ اور دیگر مشترک المعنی الفاظ میں سے اشتباہ سے زیادہ محفوظ ہے۔ مال اور دولت، زندگی اور بڑھاپا، یا کسی اور چیز کا بیمہ ہو جب کہ انسان اپنے فرائض اور ذمہ داریوں کے انجام دہی سے عاجز و ناتوان ہو جاتا ہے اس کو تائین کہتے ہیں۔

یہ ایک کملی حقیقت ہے کہ بیمہ کمپنیاں نہ تو آنے والے خطرات کو دفع کر سکتی ہیں اور نہ کسی شخص کا خوف اور ڈر کم کر سکتی ہیں اور نہ مقدمہ میں لکھی ہوئی تباہی کو روک سکتی ہیں۔ ان کمپنیوں کا کام صرف اتنا ہے کہ پیش آمدہ خطرات اور مقدمہ نقصانات کی تلافی بطور ضمانت اور کفالت عمومی کے کرتی رہیں، اسی طرح ان کی ممبری اور رکنیت بھی ایک امر اختیاری ہے جو شخص ان میں سے کسی کمپنی کا رکن بننا چاہے اس کو سالانہ یا ماہانہ ایک رقم مقررہ داخل کرنا پڑتی ہے۔ مقررہ رقم کی مقدار جسے بیمہ کرانے والا کمپنی کے حوالہ کرتا ہے۔ اس کی مطلوبہ ضمانت کی نسبت سے ہوا کرتی ہے، جب کمپنی بیمہ کرانے والے کو اس کے نقصان کی تلافی کی ضمانت دیتی ہے تو مال مجموعہ مشترک سے دیا کرتی ہے اور کمپنی اس رقم کو بیمہ کرانے والے کو بطور اعانت اور تلافی نقصان کے اپنے قانون اور قاعدے کے مطابق

دیتی ہے، داس لئے کہ یہ رقم بیمہ کرانے والے کی جمع کی ہوئی رقم کا نفع اور سود ہے، بلکہ کے اصول اور قاعدے کے مطابق ایک قسم کی عائد کردہ اور مقررہ اعانت اور کفالت عمومی ہے۔ جسے وہ اپنے ہر رکن کے ساتھ روا رکھتی ہے۔ بیمہ کا فائدہ یا تو خود بیمہ کرانے والے ہی کو پہنچتا ہے اور یا پھر اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ کو۔ غرض کہ کمپنی کا ممبر کسی وقت بھی اپنے مجموعہ مشترک رقم کے نفع سے مستفید ہو سکتا ہے۔

جب کسی انسان کو اس بات کا خطرہ ہو کہ مرنے کے بعد میرے چھوٹے، ناہل، عاجز اور بوڑھے ماں باپ، اور دوسرے اعداء فاقہ کشی سے مرنے لگیں گے یا دربارہ ٹھوکریں کھاتے پھریں گے تو ایسے ممکنہ واقعات کی پیش بندی کے لئے زندگی کا بیمہ یقیناً اس قسم کے مصائب اور مشکلات سے بچنے کی آسان ترین شکل ہے، اور ایسی صورت بیمہ کرانے والے کے مرنے کے بعد اس کے بچوں کو کسی بھی مشکل سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ بلکہ مرنے کے بعد بیمہ شدہ رقم اور اس کے فوائد سے اسی کے بچے مستفید ہوں گے۔ عالم کے حکم کی تعمیل کی یہی ایک بہترین صورت ہے۔

وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكَوْا ذُرِّيَّتَهُمْ  
ضَعْفًا ضَعْفًا عَلَيْهِمْ۔  
جو لوگ اپنے چھوٹے بچوں کو فاقہ کشی کی حالت  
دانستہ چھوڑ کر مریں گے۔ وہ خدا کے خوف  
نیا دہ مستحق ہیں۔ (۹۱)

بلا شک و شبہ نظم آیت کریمہ نے (ولیعش) کو صلہ ذکر ہونے کے بعد مفعول سے بے پردا کر دیا ہے اور کسی چیز کا بجائے دو دفعہ کے ایک دفعہ اس طرح سے ذکر کرنا کہ مفعول کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آجائے یقیناً انتہا درجہ کی بلاغت اور فصاحت ہے چنانچہ آیت میں صلہ الذی لَوْ تَرَكَ ذُرِّيَّتَهُ ضَعْفًا ضَعْفًا عَلَيْهِمْ لِيَخْشَ مِنْ آيَاتِنَا كَمَا ضَعْفًا ضَعْفًا کے ذکر کرنے کے بعد مخاطب بڑی آسانی سے کلام کے مفہوم کو سمجھ رہا ہے۔ صلہ میں ”لو“ بطور شرطیہ کے استعمال ہوا کرتا ہے مثل ”رَبِّمَا يَوْذُو الذِّينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ“ (۲۰:۱۵)

قرآن میں ایسی مثالیں بہت سی ہیں جہاں صلہ نے فعل کو مفعول سے مستغنیٰ

بے پروا کر دیا ہے۔ جیسا،

”وَمَا يَتَّبِعِ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ“ (۶۶:۱۰)

آیت میں ”یَدْعُونَ“ کے مفعول کے ذکر نے ”وَمَا يَتَّبِعِ“ کے مفعول کے ذکر کرنے کی حاجت کو پورا کر دیا۔ اب اصل عبارت یوں ہوگی ”الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ شُرَكَاءَ لَا يَتَّبِعُونَ شُرَكَاءَ“ ان يَتَّبِعُونَ (الظن) ”جو لوگ خدا کے سوا دوسرے باطل معبودوں کی پوجا کرتے ہیں وہ حقیقتاً ان کی پوجا نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنے ظن باطل کی پیروی کرتے ہیں۔ دوسری مثال ”وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَهُمْ يَكْفُرُونَ“ ہر چیز میں سے ایک چیز دی گئی۔ تیسری مثال۔  
وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَهُمْ يَكْفُرُونَ

یہاں پر بھی ”وَإِذْ أَخَذْنَا“ کے مفعول کا ذکر نہیں کیا ہے۔ حالانکہ اصل عبارت یوں ہے  
وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَهُمْ يَكْفُرُونَ  
مفہوم عربی زبان میں ادا ہو سکتا ہے ”وَإِذْ أَخَذْنَا“ کا مفعول ”لَعَنَّاهُمْ“ دونوں صورتوں میں عموم مستغرق ہے۔ لفظ ”کَلَّ“ دوسری صورت بہ نسبت اول (من کل شیء) سالتموہ اولہ تسئلوہ کے زیادہ عام ہے۔ اور شمولیت بھی اس کی زیادہ ہے۔ خداوندِ عالم کے کرم کے ساتھ بھی دوسری صورت زیادہ مناسب ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے کہ اگر تم خدا کی نعمتوں کو گننا چاہو تو یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ اہل تفسیر کتاب اللہ کے نظم کی اصلاح کی خاطر اس آیت میں خارجی مفعول فرض کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ جس طرح کتاب اللہ کی دیگر آیات یا دوسری کتابوں کی اصلاح نظم کی خاطر یہ حضرات اپنی عادت اور معمول کے مطابق کرتے ہیں حالانکہ خدا کی کتاب اور اس کا کمال اس قسم کی ہر اصلاح اور ہر عیب سے بری اور بالاتر ہے۔ اس کی ذات گرامی ہر مادی حاجت سے بری، اور بلند تر ہے۔ لیکن پھر بھی مفسرین کرام اس قسم کی جرأتیں کرتے ہیں۔

اس آیت کریمہ کے معنی اگرچہ مفسرین کرام اور اولیاء عظام کے بیان کی بنا پر بھی صحیح اور درست ہو سکتے ہیں، لیکن یہ بھی ایک کھلی حقیقت ہے کہ یہ فرضی اور تقدیری مداخلت کتاب اللہ تعالیٰ کے نظم اور سیاق بیان کو اپنی بہترین بلاغت اور فصاحت سے ہٹا دیتی ہے

کیونکہ فرضی اور تقدیری مداخلت کی صورت میں ربط عبارات اور آیت کا نظم اپنے مفہوم اور مطلب کو اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں کر سکتا جس طرح کہ وہ اس وقت موجودہ صورت میں ادا کر رہا ہے، حالانکہ آیت وراثت ہی کے معاملہ میں نازل ہوئی ہے اور اسی ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اتاری گئی ہے۔

اس آیت کے سلسلہ میں میری گزارش ایک تسلیم شدہ امر ہے، اور یہ صرف میری ہی خالصانہ جدوجہد اور کوشش کا نتیجہ ہے، جس میں نہ تو کتاب اللہ کے نظم کی اصلاح کا دعویٰ ہے اور نہ اس میں کسی فرضی اور تقدیری مداخلت کا جھگڑا ہے۔ میرے خیال سے تو کتاب اللہ کے ساتھ ہی بڑا و ایک بہتر طریقہ ہے اور کتاب اللہ کی بلاغت اور فصاحت کو بحال رکھنے کے لئے یہی ایک سب سے زیادہ مناسب اور موافق راستہ ہے اس لئے کہ کتاب اللہ کا مقصد بھی اصل قانون الہی ہی کا بیان کرنا ہے اور چھوٹے اور ناتواں بچوں کی حالت ضعیف کی اہمیت جتنا ہے۔

اب یہ بات قابل غور رہ جاتی ہے کہ بیمہ کا جواز کس دلیل یا کس حجت سے ثابت ہے؟ تو اس کے متعلق عرض ہے کہ عصر جدید اور دورِ حاضر میں بیمہ کمپنیاں تمام کی تمام ایک قسم کی کفالت عمومی کی شکل میں تقریباً ہر جگہ اور ہر شہر میں موجود ہیں اور ہر شخص کمپنی کی مخصوص اور مقررہ رقم کی ادائیگی کے بعد اس کا عمر اور حقتہ دار بن سکتا ہے اب یہ کہ وہ رقم بڑا نہ ہو یا کم تو اس سے ہم کو کوئی بحث نہیں ہے چونکہ رقم ایک قسم کی ضمانت مطلوب ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ مختلف کمپنیوں میں اس کی حیثیت مختلف ہوتا ہم مقصد سب کمپنیوں کا قریب قریب ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ ان کمپنیوں کے شرعی جواز کے لئے تین دلیلیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ان میں سے ہر حکم کی تعمیل ہر مسلمان پر شرعاً فرض ہے۔ قرآن، حدیث اور اتباع صحابہ رضی اللہ عنہم کی رو سے ہر مسلمان پر لازم ہے کہ ان کی تعمیل کرے۔ ان دلائل سے نہ صرف اس قسم کی کمپنیوں کی ایجاد اور اختراع ثابت ہوتی ہے بلکہ ان کی ایجاد کی ضرورت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے ان اصولوں پر عمل کرنا بھی ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اور ان احکام پر مطلع ہونے کے بعد کسی مسلمان کی اس معاملہ میں کوتاہی یا غفلت یقیناً قابل مواخذہ۔ سوسائٹی، معاشرہ اور جماعت

کی اصلاح کے لئے ان میں سے صرف ایک ہی دلیل کافی ہے۔ چہ جائیکہ تین کی تلاش و جستجو کی جائے۔

انصیحت مبنی محترم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: "الدین النصیحة، قيل لمن يا رسول الله، قال لله ولنبيه ولكتابه ولعامة المؤمنين"

دین دوسرے کی بھلائی ہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا کس کی خوشنودی یا کس کی پیروی کی خاطر۔ آپ نے ارشاد فرمایا خدا، رسول، تمام مسلمانوں کی خوشنودی اور بھلائی، اور خدا کی کتاب کے فرمانبرداری کی خاطر۔

نصیحت کے معنی ہیں دوسرے کی بھلائی چاہنا۔ رسول خدا نے اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں بھی ارشاد فرمایا ہے۔ "أَنْ تَقْبَلَ لَأَخِيكَ مَا قَبِهَ لِنَفْسِكَ"۔ اپنے مسلمان بھائی کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔ قرآن میں بھی یہ لفظ مختلف جگہ استعمال ہوا ہے۔ وَنَعَصْتُمْ لَكُمْ بِمَا نَبَايَ بِلَهَارِي بَهْلَانِي چاہی۔ "إِنِّي لَكُمَّا لَمِنَ النَّاصِحِينَ" میں تم دونوں کی بھلائی چاہتا ہوں۔ نصیحت کے یہی معنی لینا یقیناً تقویٰ اور پرہیزگاری کی روح، عدل اور انصاف کی بنیاد ہے۔ اور یہی معنی لے کر مسلمان اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔ اور بہتر سے بہتر طریقہ پر رسول اللہ کے ارشادِ گرامی کی تعمیل کر سکیں گے۔

۲۔ رعایت:۔ اس لفظ کے معنی ذمہ دار ہونے اور حفاظت کرنے کے آتے ہیں قرآن کریم نے بھی اس معنی میں اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ "فَمَا رَهَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا" انہوں نے اس کی کوئی مناسب اور کماحقہ حفاظت نہ کی۔ شارع اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ "کلکھ راج وکلکھ مسؤل عن رعیتہ" تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اس کی ذمہ داری کے متعلق پوچھا جائے گا۔ چنانچہ اس ارشادِ محترم کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ہر مسلمان اپنی ذمہ داریوں سے خود کو سبکدوش کرنے کے لئے اللہ کی مخلوق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ اور اس پر لازم ہے کہ دل کھول کر انسانیت اور بشریت کی خدمت کرے۔ سوسائٹی اور معاشرہ کو خوش حال بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ سرگرم کوشش میں مصروف رہے۔ گویا اس طرح لفظ رعایت کی

عمومیت اور شمولیت بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی وسعت اور عموم کہ لفظ نصیحت میں تھی اس طرح سے گویا دونوں لفظ از روئے اہمیت مساوی قرار پائے۔

**تیسری دلیل کفالت:**۔ اس لفظ کفالت کے معنی تاوان اور ضمانت مطلوب

کے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس لفظ کفالت کا بھی متعدد جگہ تذکرہ ہے۔ ”كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا“

”وَقَدْ جَعَلْنَاهُ اللَّهُ عَلَيْهِ كُفَيْلًا“ حضرت زکریا (علیہ السلام) حضرت مریم (علیہا السلام)

کے کفیل تھے۔ اور تم نے خدا کو اپنا نگران بنایا۔ کفالت کی دو قسمیں ہیں۔ خاص اور عام۔ دو

قسم سے سبکدوش ہونا ہر مسلمان اور ہر فرد مومن کا فرض ہے اور اس پر لازم ہے کہ وہ سبک

اور معاشرہ کی بھلائی کی خاطر اپنے آپ کو اس فرض سے بری کر دے۔ تکافل عمومی اپنے متعارف

اور مفاد عامہ کی خاطر ایک بہترین اصل ہے۔ اور شرع اسلام میں اس کی کترین مثال ”اصاط

الاذی عن الطريق یحبہ۔ راستہ سے کوڑے کرکٹ اور کانٹے کو دور کرنا اسی کے معنی ہیں

اور ارشاد خداوندی: ”تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ“

اللہ کی خوشنودی اور لوگوں کی بھلائی کی خاطر خدا کی مخلوق کی رضامندی کے معاملہ میں ایک

دوسرے کی امانت اور امداد کرو۔ اور دوسروں کے ظلم و ستم کی حالت میں ایک دوسرے کا

ساتھ مت دو۔ اسلام کی آمد سے پہلے بھی عرب میں ”ولاء“، تعالف، اجارہ اور

دیت جاہلیت کے زمانے میں کفالت عمومی کی شکل میں موجود تھی۔ اور تکافل عمومی کی صورت

میں ان پر عمل ہوتا تھا۔ اسلام کے آنے سے پہلے بھی یہ چیزیں تمام کی تمام عملی شکل میں موجود

تھیں۔ اگر کوئی شخص دوسرے کو قتل کرتا تو مقتول کی دیت پہلے قاتل ہی پر لازم آتی تھی

جس میں قاتل کا قبیلہ بھی مقتول کی دیت کی ادائیگی میں شریک ہوتا تھا۔ قاتل کے قبیلہ پر

مقتول کی دیت قانون تعاون اور تکافل ہی کی بنا پر لازم آتی تھی۔ دیت کی ادائیگی یا تو ایک

تواونٹ یا ایک ہزار سونے کے دینار اور یا دس ہزار چاندی کے درہم کی رقم کی صورت

میں ہوا کرتی تھی۔ اسلام کے آنے کے بعد کتاب اللہ اور نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دیت

کے نئے جاہلیت کے زمانے کے اسی مروجہ اجتماعی قانون کو بحال رکھا اور اس کو قانون خداوندی

قرار دے کر زیادہ سے زیادہ پختہ اور مستحکم کر دیا۔ اگر جاہلیت کے زمانے میں دیت کی ادائیگی

صرف قاتل کے قبیلہ ہی پر لازم آیا کرتی تھی تو اب تمام اہل اسلام کے "بیت المال" سے اس کی ادائیگی ہونے لگی گویا اس قانون کو زیادہ سے زیادہ رواج دینے میں جو بھی آسانی ممکن ہو سکتی تھیں ان سب کو جہاں کیا گیا۔ کفالتِ عمومی کو جتنی وسعت دی جاسکتی ہے اتنی وسعت دی گئی۔ اگر سچ پوچھا جائے تو اس سے بڑھ کر شاید ہی کوئی قانونِ عمومی اور کوئی کفالتِ عام اتنی وسعت پاسکے۔

خلیفۃ المسلمین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی دفاتر اور دواوین کی تدوین اور ترتیب کے بعد دیت کی ادائیگی کو بیت المال ہی پر لازم کر دیا تھا چنانچہ اہل دیوان اور دفتر سینکڑوں قبائل سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی اس معاملہ میں ایک دوسرے سے تعاون کرتے تھے۔ حالانکہ اس سے قبل دیت صرف قاتل اور اس کے قبیلہ ہی پر لازم آتی تھی۔ لیکن اسلام نے اس کفالتِ عمومی کو اتنی وسعت دی کہ ہزاروں قبائل کو اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا شریک بنا دیا۔ پھر حضرت عمرؓ کا یہ حکم تمام صحابہ کرامؓ کے روبرو اور سب کے سامنے تھا اور ان کی موجودگی میں اس پر عمل درآمد کر لیا گیا، لیکن چونکہ اس کی بنیاد نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضع کردہ اور مقرر کردہ سنت پر تھی۔ اس لئے کسی نے بھی اس کی مخالفت نہ کی۔ اور پھر ایک قسم کی کفالتِ عمومی ہی تو تھی تو اس کی مخالفت کیونکر کی جاتی؟

امام الائمہ اور شمس الائمہ مسوط (۲۴، ۱۲۵) میں ارشاد فرماتے ہیں؛ اہل علم نے دیت کی ادائیگی کو اہل دیوان ہی پر لازم کر دیا ہے؟ آج بھی اس کی شدید ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی بھلائی اور اپنی اقتصادی حالت کی بہتری اور سدھار کی خاطر مختلف طریقوں سے اس نظامِ اسلامی کو زندہ کریں۔ موجودہ افلاس، تنگدستی اور احتیاج کی وجہ سے ہر کچھ بڑھے مسلمان کا اولین فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ پر پہلی فرصت میں غور کرے، تاکہ مسلمانوں کے تعاون سے کفالتِ عمومی ضرورت کے وقت ایک منظم شکل میں منظر عام پر آجائے۔ آج ہماری مساجد کے امام مدراس دینیہ اور دنیویہ کے اساتذہ اور طلباء کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہم کو اس سلسلہ میں اب مزید غفلت نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم اس کے بعد بھی خواب غفلت میں پڑے رہے تو انجام بہت ہی برا ہو گا۔



اشھود گرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی دوڑ و زمانہ چال قیامت کی چل گیا

یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ بیمہ کمپنی کا رکن یا ممبر بننا ایک اختیاری بات ہے اور کسی تباہی کے وقت جو رقم کمپنی بیمہ کرانے والے کو دیتی ہے وہ ایک قسم کی کفالت عمومی اور اعانت عامہ ہوا کرتی ہے۔ اور یہ رقم بیمہ کرانے والے کی جمع کردہ رقم کا نفع نہیں ہوتا۔ کمپنی جب تمام سرمایہ اور سب مال مجموعہ مشترک رقم کو کسی مفید کام میں لگاتی ہے یا اس رقم سے تجارتی کاروبار کرتی ہے تو اس قسم کی تجارت یقیناً مضاربت مشروع ہی کی ایک شاخ ہوا کرتی ہے۔ اس قسم کی تجارت کے منافع بھی مضاربت ہی کے منافع کی طرح ہوتے ہیں جن کی صحت اور حوازیں کسی کوشک اور شبہ کی گنجائش نہیں ہو سکتی یہ نہ تو قرآن کریم کا حرام کردہ بیا اور سود ہے، اور نہ یہ رقم بیمہ کرانے والے کی رقم کا نفع ہے بلکہ یہ ایک قسم کی اعانت ہے جس کے ذریعہ متوقعہ اور واقع ہونے والی تباہی کی اندفاع اور پیش بندی مقصود ہوتی ہے نہ معلوم بعض حضرات بے سوچے سمجھے اس کو سودی کاروبار کیسے کہہ دیتے ہیں۔

فدا خیال تو فرمائیے ہم فرض کرتے ہیں، آج ایک شخص پانچ روپیہ ماہانہ کے حساب سے دو ہزار کی رقم کے واسطے اپنی زندگی کا بیمہ کرتا ہے۔ اور بیمہ کے تمام مراحل طے ہو جانے کے دوسرے روز وہ مر جاتا ہے۔ شرکت یا کمپنی دو ہزار روپے کی رقم اس کے وارثوں کو ادا کرتی ہے۔ اب یہ بتایا جائے کہ یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ یہ دو ہزار کی رقم اس کے پانچ روپیہ کے ایک دن کا نفع یا سود ہے۔ اب جب کہ ہمارا مندرجہ بالا بیان صحیح قرار پایا تو خدا کا فضل اگر شامل حال رہے تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس لئے اب ہم کو یہ کہنے میں ذرا بھی خوف اور خدشہ نہیں کہ بیمہ اور انشورنس یقیناً موجودہ زمانے میں مفاد عامہ کے لئے ایک بہترین چیز ہے، اور اس کی بہتری اور اچھائی میں کسی فقیہ اور عقلمند کوشک کرنا بظاہر نا ممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر کوئی بزرگ اس امر کی حقانیت اور صداقت سے انکار فرماتے ہیں اور امت مرحومہ کے حق میں اس کی بھلائی سے روگردانی کرتے ہیں تو ہم کو چاہیئے کہ ایسے لوگوں سے شریفانہ طریقہ سے درگزر کریں، اور ان کی ہٹ دھرمی کے اعتراضات کو خندہ پیشانی سے سن لیں۔ اگر اسلامی حکومتیں اور مسلمان سرمایہ دہار مل کر

ایک بڑی رقم کا بیمہ کرائیں یا اسلامی سلطنتیں اپنی رعایا کے ہر فرد پر زندگی یا دیگر اموال کے بیمہ کو بیمہ کمپنیوں کے اصول کے مطابق واجب اور لازم کر دیں تو ایسا کرنا یا کرنا یقیناً ان حکومتوں اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہوگا۔ اگر دولت مند اور سرمایہ دار مسلمان اپنے اموال کے ایک مخصوص حصہ کو بصورتِ بیمہ وقف کرائیں تو یہ وقف اپنی برکت اور فائدہ مندی کی وجہ سے یقیناً مفید ترین وقف ہوگا، اور ایسے وقف کرنے والے کا شمار بہترین اور ممتاز ترین واقفین میں ہوگا۔ (آج ہر جگہ کے مسلمان جس غربت اور افلاس میں مبتلا ہیں وہ کسی صاحبِ دیدہ سے پوشیدہ نہیں ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ مسلمان اس راہ میں جلد سے جلد عملی قدم اٹھائیں)۔

آج کل بیمہ کمپنیوں سے فائدہ اٹھانا صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایسا کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے کسی عقلمند اور دور اندیش فقیہ کا اس سے انکار کرنا میرے خیال سے تو ناممکن ہے۔ یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ بیمہ ہی وہ بہترین طریقہ اور آسان ترین صورت ہے جس کے ذریعہ آیت مذکورہ (وَلْيَضْحَكُوا الَّذِيْنَ كُوْنُوْا تَرْكُوْا) پر عمل ہو سکتا ہے۔ اور صرف اسی طریقہ سے اس آیت کو بہترین عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے لیکن میرے اس کہنے کا مقصد دوسرے اہل تفسیر کے ارشادات کا رد بھی نہیں ہے بلکہ ان کے علاوہ ایک طریقہ مزید فائدہ حاصل کرنے کا بتانا مقصود ہے اگر مفسرین کرام کی تفسیرات کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو میری گزارش اور میرا بیان کردہ طریقہ بھی یقیناً زیادہ سے زیادہ قابل عمل اور فائدہ مند ہے۔

جس زمانے میں بصرہ میں مقیم تھا تو حضرت سید محمد ذکیر صاحب جن کا ”مہمیت فکیر“ کے نام سے مشہور ہے۔ اور بصرہ کے بزرگ ترین اور شریف ترین لوگوں، علم دوست اور مہمان نوازوں میں ان کا شمار ہے، ان حضرت کے یہاں اکثر میری آمد و رفت رہتی تھی۔ ایک دن بھرے مجمع میں میرے اور صاحب خانہ کے درمیان بیمہ کے متعلق بحث ہو رہی تھی صاحب خانہ یعنی حضرت محمد ذکیر صاحب نے فرمایا، ”ہم اپنے اموال اور زندگی کی تبیین ڈیڑھ فی صدی پر نہیں کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ہم اللہ تعالیٰ کے یہاں  $2\frac{1}{2}$  فی صدی سے زیادہ پر اس کا بیمہ کراچکے ہیں“ یہ سب سے پہلا اتفاق تھا جب کہ میں نے لفظ تبیین ایک عرب

ادیب کی زبان سے سنا۔ سید محمد ذکیر صاحب کی زبان سے یہ کلمات سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اس لئے کہ زکوٰۃ دنیوی اور اخروی معاملات کے لئے انسان کے نفس اور مال دونوں کے لئے بہترین بھلائی ہے، اور مؤمن کے مال اور نفس کے واسطے مفید ترین گارنٹی اور ضمانت ہے، جو سوسائٹی اور معاشرہ کے اقتصادی نقصانات کی تلافی کر دیتی ہے۔ اس گفتگو سے مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ اور کیوں نہ ہوتی جب کہ انہوں نے مجھ سے ایک ایسی بات کہی جو میرے دل کو بھاتی تھی، ایسی صورت میں مجھے لازماً خوش ہونا چاہیئے تھا۔

اس کے بعد پھر کسی روز ایک علمی مجلس میں بیہ کا ذکر چھڑ گیا، اہل مجلس نے میری رائے معلوم کرنی چاہی، میں نے متذکرہ بالا خیالات کو ظاہر کیا۔ چنانچہ اہل مجلس میں سے ایک فقیہ صاحب نے مبالغہ آمیز الفاظ میں میرے خیالات کو پسند کیا اور مجلس میں سے ایک نوجوان نے بھی خواہش کی کہ میں اپنے اس بیان کو قلم بند کر کے ان کے حوالہ کر دوں۔ میں نے بھی ان کی یہ خواہش پوری کرنے کا وعدہ کیا، اور اپنے خیالات چند صفحات پر لکھ کر ان کے حوالہ کر دیئے۔

چند روز بعد ایک مختصر رسالہ انگریزی زبان میں چھپا ہوا میری نظر سے گزرا، جس کو کسی مسلمان نے بیہ اور بینک کے سودی کاروبار کے متعلق نقل کیا تھا۔ رسالہ کا مضمون یہ تھا کہ حضرت محترم شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم دہلوی نے بیہ اور بینک کے سود کو دارالحرب میں جائز قرار دیا ہے۔ اور رسالہ والے صاحب نے کتب فقہیہ میں فقہاء کا مشہور مقولہ ”لادبا بین مسلم و حربی فی دارہ“ کو بھی نقل کیا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا افسوس ہوا، ذرا دیکھئے تو:-

(۱) اس قسم کے رسائل ایک ایسی قوم کی زبان میں نشر ہوتے ہیں جس کا تمدن اپنی انتہا پر پہنچ چکا ہے۔

(۲) فقہ اسلام سے ایسے جملے نقل کئے جاتے ہیں جن کے مفہوم اور معنی کو نقل کرنے والا خود بھی نہیں جانتا ہے۔

(۳) پھر یہ اقوال ان برگزیدہ ائمہ کرام کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں جن کی ذات گرامی

قطعا ایسی نسبتوں سے پاک ہے۔

(۴) اس کے علاوہ علماء ہند ان تمام حالات اور ان واقعات کو دیکھتے ہوئے بھی

خاموش رہتے ہیں؟

کتنی تعجب خیز ہے یہ حقیقت! اور اس سے بڑھ کر تعجب خیز ہمارا سکوت اور خاموشی۔

ان حالات اور ان واقعات سے متاثر ہو کر میں نے ان چند اوراق کو جو بصرہ میں اس نوجوان کے حوالہ کئے تھے چھپانے کا ارادہ کیا۔ اس امید پر کہ شاید اس کے ذریعہ وہ عام اشتباہ دور ہو جائے جو فاسد افکار و غلط افہام کی شکل میں بڑے بڑے فقہاء کے دماغوں میں جاگزیں ہو کر گھونسلہ بنا چکا ہے۔ اور اچھے اچھے عقلمندوں کے دماغی توازن کو بھی تباہ کر چکا ہے۔ خدا کرے میری یہ آرزو پوری ہو جائے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ لڑائی چھڑ جانے کے بعد مسلم اور غیر مسلم دونوں کے خون، مال اور تمام حقوق کی عصمت اور حفاظت بالکل جاتی رہتی ہے، اور کسی کے مال و دولت کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ان دونوں میں سے خواہ کوئی بھی ہو جب دارالحرب اور میدان جنگ میں پہنچے گا تو نہ تو اس کے نفس کی کوئی گارنٹی اور ضمانت دے سکتا ہے اور نہ اس کے مال و دولت کی۔ بلکہ جس طرح بھی کسی سے ہو سکے گا وہ دوسرے کو لوٹنے کی کوشش کرے گا۔ پس عدم ربا تا اختتام حرب ہے نہ یہ کہ ربا حلال ہے۔ بلکہ اصلی ملت اور حقیقی سبب یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے خون، مال اور تمام حقوق کی عصمت و حفاظت جاتی رہی ہے۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی کسی چیز کا مالک نہیں رہا ہے۔ بلکہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کو اس بات کی عام اجازت ہے کہ وہ اپنے مخالف کا مال جتنا، اور جیسے لینا چاہے لے سکتا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کہ ہمارے فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ”لادبا بین الوالد وولدہ“ یعنی باپ اور بیٹے کے درمیان ربا اور سود متحقق نہیں ہو سکتا۔ یا ”لاربا بین الرجل واهله“ یعنی شوہر اور بیوی کے درمیان ربا اور سود نہیں ہے۔ ہمارے فقہاء کے ان اقوال سے علت ربا ثابت نہیں ہو سکتی ہے۔ بلکہ ان کا یہ ارشاد عدم ربا کا فائدہ دیتا ہے۔ اور ان کے اس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ان کے درمیان ربا اور سود کا متحقق اور ثابت ہونا غیر متصور اور ناممکن ہے۔ اس لئے کہ

والد کو والد ہونے کی وجہ سے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح اور جتنا چاہے اپنے لڑکے کے مال سے صرف کرے۔ یہ مقصد نہیں کہ وہ خود اور فروخت کے ذریعہ ایسا کر سکتا ہے۔ بعض اوقات بعض فقہاء اپنے وہم اور ظن کی بنا پر بطور مغالطہ کے یہ بات دلیل اور حجت کی طرح پیش کرتے ہیں اور اس کو سنت اور حدیث کی طرف بطور سند کے منسوب کرتے ہیں۔

(۱) حضرت کھول رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی مہتمم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ”لادبا بین المسلمین و اهل الحرب فی دار الحرب“ یعنی مسلمانوں اور ان سے لڑنے والوں کے درمیان میدان جنگ میں رہا اور سود نہیں ہے۔

روایت میں حضرت کھول کا درجہ ایک ثقہ نام کا ہے، اور اس کے علاوہ آپ کا مرسل بھی محدثین کے نزدیک مقبول ہے۔ اگر کوئی شخص مسلمان اہل الحرب سے مال لے تو یہ اس کا کام ہے، اور ایسا کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اس کے ایسا کرنے کا مقصد یہ نہیں کہ شرع اسلام نے رہا، قرار اور جتنے کو حلال قرار دیا ہے۔ بلکہ جنگ نے مال کی عصمت اور حفاظت کو باطل کر دیا ہے اور اب مال بجائے معصوم اور محفوظ ہونے کے مباح قرار پایا ہے۔ اور اب مسلمان جس مال پر قبضہ کرتا ہے وہ مباح ہے۔ پس شرع اسلام مال مباح کا واپس لینا مسلمان پر واجب نہیں کرتا۔ صرف استیلا اور غلبہ ملکیت کے لئے کافی نہیں بلکہ ساتھی مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اس مال پر قبضہ کر کے اپنے دار، دارالاسلام کو منتقل بھی کر دے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مال کی حفاظت صرف دار ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے۔

(۲) حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حفاظت کی، اور آپ نے شرط لگائی۔ پھر حفاظت اور شرط کی مدت میں نبی مہتمم کے حکم سے اضافہ فرمایا۔ روم نے فارس پر غلبہ پایا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے شرط جیت لی۔ اور اپنا مشروط لے لیا۔ حضرت شاربغ اسلام نے اس کی اجازت دے دی۔ اگرچہ جو ہازی اور قاربازی اسلام میں حرام تھے۔ حضرت شاربغ اسلام کی اجازت دینے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلی وہ تو یہ ہے کہ یہ پہلی ہمت تھی جس کی وجہ سے کتاب اللہ کی حفاظت اس کے منکرین پر ثابت ہو گئی۔

(۳) اس کی وجہ سے اسلام کا غلبہ اس کے دشمنوں پر ثابت ہو گیا۔

(۴) اس وقت تک کہ شریف دارِ شرک تھا۔

(۵) حضرت صدیق کا ایسا کرنا نہ تو مخاطرت تھی، نہ شرط اور نہ جوابازی تھی۔ بلکہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ روم فارس پر غلبہ پائے گا۔ اس لئے حضرت صدیقؓ کا عمل نہ تو جوابازی قرار پایا سکتا ہے اور نہ قمار۔

نبیؐ محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکات سے اس شرط پر گشتی طوی تھی کہ اگر میں نے تم کو بچھاڑا تو تمہاری بکریوں کی ایک تہائی میری ہو جائیگی۔ چنانچہ آپؐ نے تین مرتبہ رکات کو بچھاڑ کر اس کی تمام بکریاں جیت لیں۔ لیکن شرافتِ نفس کا ثبوت دیتے ہوئے آپؐ نے اس کی تمام بکریاں اسے واپس کر دیں۔ رکاتِ اداس وقت تک کافر تھا۔ نہ تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طائی تھی، اور نہ اسلام سے جنگ۔

نبیؐ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ کسی کے مال کو بری بگاہ سے دیکھے، بلکہ کافر اور مسلمان دونوں کے مال کی رحمت اور حفاظت برابر تھی۔ جس طرح ایک مسلمان کے مال کی حفاظت ہو کر تھی اسی طرح کافر کے مال کی نگہبانی ہوتی تھی۔

(۷) غزوہٴ اُحد کے موقع پر کسی مشرک مقتول کی نش خندق میں گر پڑی، اس کے حاصل کرنے کے لئے ایک معتدبہ رقم فدیہ پیش کی گئی۔ حضور محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اس رقم کے لینے سے منع فرمایا اور نعلش بلا فدیہ ورثہ کے حوالہ کر دی۔ اہل عراق کا یہ مقولہ کہ ”کفار کا خون اور مال ہمارے لئے حلال ہے“ اسلام سے روگردانی نہیں بلکہ یہ ایک قسم کا سیاسی جملہ ہے جو جاننا زانو اسلام کو رغبت دلانے کے لئے معرکہ جنگ کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ اس کے فائدے کا احساس صرف زمانہ جنگ ہی میں کیا جاسکتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ کیا دارالحرب میں مسلمان اور غیر مسلم حربی کے درمیان بیا اور سود جائز ہے؟ آپؒ نے فرمایا ”کیا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہے؟“ سائل نے کہا ”نہیں“ امام مالکؒ نے فرمایا ”پھر تو کوئی حرج نہیں ہے“ (کتاب مدونہ جلد ۳ ص ۲۸۱) اور اگر معاہدہ ہو گیا تو ایسی صورت میں جنگ باقی نہیں رہے گی اور

اب اس وقت میں مال کا سود کے ساتھ لینا یا دینا جائز نہ ہوگا۔ اس لئے کہ مسلمان کا تعلق دارالاسلام سے ہوگا اور اہل اسلام کہیں بھی ہوں ان کے لئے سود کا لین دین ناجائز ہے۔ یہ بات کسی فقیہ کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ مسلمان کے لئے کافر کے مال کو سود کے ساتھ لینے کو اس کی رضامندی اور خوشی پر محمول کرے، کیونکہ اس نے یہ مال مع ربا حکم عقد کی بنا پر لیا ہے۔ یعنی عام خرید و فروخت کی طرح یہ معاملہ بھی انصاف سود کے ساتھ طے قرار پایا ہے، اسی وجہ سے سود دینے والا سود دینے پر مجبور ہے، بصورت دیگر اگر حکم عقد کی صورت نہ ہوتی، تو کافر مسلمان کے ایسے فعل پر نہ تو کبھی رضامند ہوتا اور نہ اس بات پر آمادگی کا اظہار کرتا۔ اگر مسلمان کے اس فعل کو دارالحرب میں اس تاویل کے ساتھ جائز قرار دیا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس عمل کو دارالاسلام میں بھی اسی تاویل کے ساتھ جائز قرار دیا جائے۔ وہاں بھی ہم یہی کہہ سکیں گے کہ دارالاسلام میں بھی ایک درہم کو تو درہم کے بدلہ میں دے دیا گیا لیکن دوسرا درہم مسلمان نے بطور ہبہ کے اپنی خوشی اور رضامندی سے دیا ہے۔

کتاب مذہبیہ کے بیان کے مطابق دین اور قانون کے اعتبار سے دار صرف دو ہیں ۱۔

(۱) دارالاسلام اور (۲) دار غیر اسلام۔ اسلام کے مقابلہ میں تمام ادیان ایک دین اور ایک ملت مانے جاتے ہیں، جن کو دار کفر اور دار شرک سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فقہاء کرام کے نزدیک دار صرف دو ہیں (۱) دارالاسلام (۲) دارالشرک و دار الکفر۔ لیکن یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ دارالاسلام اور دار الکفر ہونے کی وجہ سے اسلام کا عدل اور انصاف نہیں بدلتا، اور نہ اس کے انصاف پر اس اختلافِ داریں کی وجہ سے کوئی اثر پڑتا ہے۔ مسلم اور غیر مسلم دارالاسلام میں ہوں یا دار الکفر میں، ان دونوں کا خون، مال اور تمام حقوق ہر حالت میں صرف انسانیت کی بنا پر معصوم اور محفوظ ہیں۔ گویا ان کے خون اور مال کی حفاظت کلمہ اور دار کی وجہ سے نہیں بلکہ اسلام کے عدل اور انصاف کی بنا پر ہے۔

دار کا اختلاف یا تو طبعی ہوتا ہے یا جغیاتی اُمم اور حکومت کی وجہ سے ہوتا ہے لیکن ان میں سے ایک بھی اسلام کے عدل اور انصاف پر اثر انداز نہیں، بلکہ اسلام کی نگاہ میں ہر امت ہر قوم اور ہر دار کے عصمت اور امان موجود ہے، اور یہ امن و انصاف نفسِ انسانیت کی بنا پر ہے

دین اور کلمہ کی وجہ سے اس کا ثبوت نہیں۔ اسی وجہ سے خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:-  
 وَاللّٰهُ يَذُّهُوُاٰلِیْ دَارِ السَّلَامِ۔ خدا سلامتی کے گھر کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔  
 یَاٰیہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً (۲۰۸:۱۲) ایمان والو! تم سب کے  
 سب امن میں داخل ہو جاؤ۔

عرشِ عزت اور کرسیِ مدد و انصاف کی طرف سے یہ ایک عام آسانی خطاب ہے،  
 جو زمین پر بسنے والے ہر فرد و بشر کے لئے ایک طرح کی خوشخبری ہے۔

خداوند دو جہاں کا قول ”رَأٰی الَّذِیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ“ خدا کے نزدیک برگزیدہ  
 دین صرف اسلام ہی ہے۔ کبھی ہی معنی ہیں کہ ہر فرد و بشر صلح و آشتی، امن و سلامتی کے ساتھ  
 زندگی بسر کرتا رہے، انسان کا کوئی فرد دوسرے پر نہ تو زیادتی کر سکے، نہ اس کی آبروریزی کرے،  
 نہ شرف انسانی، حرمت بشری اور عصمت کو نقصان پہنچا سکے۔

وَلَا یَجْتَعِلُوْا السِّلْمَ فَاَجْفَحْ لَهَا۔ اگر وہ لوگ صلح پر آمادہ ہوں تو آپ بھی ان سے  
 صلح کر لیجئے۔ تمام روئے زمین مددِ اسلام اور اس کی عزت کے حکم میں دار و احد قرار پاتا ہے۔  
 نہ تو اس میں اختلافِ ادیان کا کوئی اثر ہوتا ہے، نہ ہنسیاتِ اُمم اس میں کوئی تغیر اور تبدل کر سکتے  
 ہیں بلکہ ہر فرد و بشر عصمتِ دم، و عصمتِ مال اور تمام انسانی حقوق میں ایک مسلمان کی طرح  
 ہی ہے، یہی فتویٰ اسلام ہے یہی اس کا بین الاقوامی معاملاتی، معاشرتی بے مثل قانون ہے،  
 اسلام کا فتویٰ اپنے احکام اور قوانین کے متعلق بالکل عام، اجتماعی اور بین الاقوامی ہے اگرچہ  
 اسلام کے قضیات اور قوانین کا نفاذ صرف دولتِ اسلام اور حکومتِ اسلامی تک ہی محدود ہے۔  
 نہ تو ایک دار دوسرے کے لئے دارِ حرب قرار پاسکتا ہے اور نہ ایک ملت اور قوم دوسری

قوم کے لئے محارب قرار پاسکتی ہے، جب تک یہ دونوں ایک دوسرے کے خلاف اعلانِ  
 جنگ کر کے امن و امان کی فضا کو جنگ کے شعلوں میں نہ بدل ڈالیں۔ آج کل کی لڑائیوں میں  
 ہر شخص کے سامنے یہ بالکل یک کھلی ہوئی حقیقت ہے اور ہر شخص بڑی آسانی سے اس کا  
 مشاہدہ کر سکتا ہے کہ موجودہ جنگ (۳۹ تا ۱۹۴۷ء) کے زمانے میں کسی شخص کی جان و مال اور  
 تمام حقوق کی کوئی بھی عصمت اور حفاظت باقی نہ رہی تھی۔ یہی وہ حقیقی جنگ ہے جس کی بنا پر



کی کہ روس انڈین نیشنل کانگریس کو ملی مدد دے تاکہ وہ انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھ سکے۔ نیز افغانستان کو بھی اس معاہدے میں شریک کیا جائے۔ ان تجویزوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے روسیوں کی اہانت سے مولانا ترکی آگئے۔ اور کوئی چار سال بعد ترکی سے حجاز تشریف لے گئے تاکہ حج پر آنے والے دوستوں کے ذریعہ ہندوستان اور افغانستان سے تعلقات قائم کر سکیں۔

ظفر حسن صاحب اس وقت تورکوس میں رہ گئے، لیکن کچھ عرصہ بعد وہ بھی ترکی پہنچے۔ اور مولانا کے ساتھ رہنے لگے۔ وہاں سے مولانا اور ان کی طرف سے ”ہندوستان کی آزادی اور آزاد ہندوستان کی حکومت کے لئے“ ایک پروگرام مرتب کر کے شائع کیا گیا۔ اس پروگرام کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:-

مجوزہ سروراجیہ (سب کاراج) پارٹی ہندوستان کو ایک ملک تصور نہیں کرے گی۔ ہندوستان کے تین حصے ہوں گے۔ اس کا نظام حکومت وفاقی ہوگا۔ فوائد عامہ کے تمام ذرائع قومی ملکیت میں دے دیئے جائیں گے۔ انفرادی اور ذاتی ملکیت محدود کر دی جائیں گی، ملک کی زمینیں قومی ملکیت قرار ہوں گی اور نظام زمینداری منسوخ کر دیا جائے گا (ان جمہوریوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی، پارٹی فاروقی اعظم کے فیصلے کے مطابق زمینداروں کو زمین کی ملکیت چھوڑنے پر اور امام ابوحنیفہ کے فیصلے کے مطابق مزارعت چھوڑنے پر مجبور کرے گی)۔ ہر ایک جمہوریت اپنی اکثریت کے مذہب کو اپنا سٹیٹ مذہب قرار دے سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ مذہب پارٹی کے اقتصادی اور اجتماعی اصولوں کا مخالف نہ ہو۔ مرکزی حکومت ہند کا مذہب سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

مصنف اس پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

۱۹۲۴ء میں جب یہ پروگرام مرتب کیا گیا تھا، ہندوستان کی فضا اور ہندو مسلم تعلقات اتنے خراب نہ تھے جیسے کہ ۱۹۴۷ء میں اور بعد میں نئی اصلاحات ملنے پر ۱۹۴۷ء میں ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے مسلمانوں کو

تمام حقوق قابل حرمت اور عصمت ہیں۔

اس بات کو ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں کہ حقوق کی عصمت اور حرمت صلی اسلام کے رو سے نفس انسانیت کی وجہ سے ثابت ہوتی ہے۔ دار، کلمہ اور دین کے سبب سے ان کی حرمت اور عصمت متحقق نہیں ہوتی۔ جو شخص ہندوستان کو دار الحرب قرار دے کر اس میں غیر اقوام کے بینکوں کے سودی کاروبار اور ربائی عمل کو حلال اور جائز قرار دیتا ہے اس پر ”نادان دوست سے عقلمند دشمن اچھا ہے“ والی مثل صادق آتی ہے، اس لئے کہ اس قول کی موجودگی میں ہندوستان کے مسلمانوں کا اپنے وطن اور اپنے گھروں ہونے کے باوجود ان کے مال، خون اور تمام حقوق کی عصمت اور حفاظت جاتی رہتی ہے، اب تو ہندوستان میں کسی مسلمان کا خون محفوظ رہتا ہے اور نہ گھر اور نہ بنک میں ان کے مال کی حرمت باقی رہتی ہے۔

اب اس بے چارے جان بوجھ کر فقیہ بننے والے کی مثال اس ریچھ کی سی ہے جس نے اپنے دوست کو نکھیوں کی تکلیف سے بچانے کی خاطر اس کے سر پر بھاری پتھر چھینک کر ہمیشہ کے لئے اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے کہنے والے کے قول کے مطابق ہم ہندوستان کو دار حرب ہی فرض کر لیتے ہیں۔ لیکن ذرا یہ تو بتایا جائے کہ کس کے مقابلہ پر ہندوستان کو دار حرب قرار دیا جائے؟ آیا خود ہندوستانیوں ہی کے مقابلہ پر؟ یا بیرون اقوام یورپ اور ان کے بینکوں کے مقابلہ پر؟ ہر صورت میں نتیجہ وہی ہے کہ کسی ایک شکل میں بھی مسلمان کے جان و مال کی حرمت اور عصمت باقی نہیں رہتی ہے۔ بلکہ مسلمانوں کا مال بینک والوں کی ملکیت قرار پا جاتا ہے۔ مسلمان نہ تو ربا اور سود کا مطالبہ کر سکتا ہے اور نہ اس مال اور سرمایہ کو طلب کر سکتا ہے۔ چنانچہ ایسی صورت میں مسلمان اپنے تمام حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق حضرت امام اعظم شاہ ولی اللہ صاحب محترم حضرت امام شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت محترم مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی آراء بعد میں آنے والے

علمائے کرام سے مختلف تھیں۔ ان تین حضرات ائمہ مجتہدین عظام میں سے ایک بھی اپنے دین اور اپنے فقہ کے ذریعہ حیلہ کی جستجو نہیں کرتا تھا، چہ جائیکہ یہ حضرات ہندوستان میں بینک کے سودی کاروبار کو جائز قرار دیتے، بلکہ ان میں سے ہر ایک کو اس بات کا علم تھا کہ شارع اسلام علیہ السلام جب بھی کسی سے معاہدہ کرتے تھے تو معاہدہ کرنے والے سے اس بات کو تسلیم کراتے تھے کہ وہ کبھی کسی سودی کاروبار یا ربائی عمل سے سروکار نہیں رکھے گا، جس طرح کہ قرآن کریم بھی صاف الفاظ میں اس کا اعلان کرتا ہے:-

”وَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِمِثْقَاتِ الْإِثْمِ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ“۔ اگر تم سودی کاروبار کو نہیں چھوڑو گے تو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی کا اعلان کرو۔

اگر میں گمراہی پر ہوں تو یہ میری گمراہی یقیناً میرے ہی سر ہے۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی تھپہ رہبر غیرت اسلام ہی کی بنا پر میری رہبری کرے گا، میں تہہ دل سے اس کا ممنون ہوں گا۔ خداوند عالم کی طرف کسی سچی بات کو منسوب کرنا میرا شیوہ اور فرض ہونا چاہیے۔

فقط

موسیٰ جار اللہ غفرلہ

## ملکات

شاہ ولی اللہؒ کی حکمت الہی کی یہ بنیادی کتاب ہے۔ اس میں وجود سے کائنات کے ظہور مبنی اور تجلیات پر بحث ہے۔ یہ کتاب عرصہ سے ناپید تھی۔ مولانا غلام مصطفیٰ قاسمی نے ایک قلمی نسخے کی تصحیح اور تشریحی حواشی اور مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔

قیمت : دو روپے

# مولانا ابوالکلام آزاد کا تصور حدیث و احادیث کی خدمت

مولانا غلام رسول مہر

بیادرید مگر ایس جا بود زباندا نے  
غریب شہر سمنہائے گفتنی دارد

”الرحیم“ کی اشاعت اکتوبر میں ایک تحریر شائع ہوئی ہے، جس میں ابوسلمان صاحب شاہ جہان پوری کے ایک مقالے پر تبصرہ فرماتے ہوئے ایک بزرگوار نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور کو ہدف بنایا۔ وہ مقالہ مولانا مرحوم کا نہ تھا کہ مذکورہ بالا تقریب کے لئے کوئی بعید سے وجہ جواز بھی ذہن میں آسکتی۔ یقیناً اس میں ”ترجمان القرآن“ جلد دوم سے بعض اقتباسات لیے گئے تھے، لیکن نہیں کہا جاسکتا کہ ان اقتباسات کے نظم و ترتیب یا ان سے اغذتائج یا طریق استدلال کو مولانا آزادؒ کی ذات گرامی سے کوئی بعید سا بھی تعلق تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ انہیں زیر انتقاد لانے کے لئے اک گود اضطراب و بے تابی کا حقیقی سبب کیا ہوا؟

ذمہ داری کا تقاضا | جس کتاب سے یہ اقتباسات لئے گئے تھے وہ تیس سال سے چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس کے کئی ایڈیشن (مستند و غیر مستند) چھپ چکے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس تک دسترس مشکل تھی۔ اگر صاحب تحریر جنہوں نے

”الرحیم“ کی ”مقصدیت“ کے لئے خاص تڑپ کا اظہار فرمایا، گراں بہا ذمہ داری کا احساس رکھتے اور اصل کتاب دیکھ لیتے تو انہیں یہ اندازہ کرنے کا یقیناً بہتر موقع مل جاتا کہ آیا وہ مفہوم واقعی درست و محکم ہے جو زیر نظر مقالے کے سرسری مطالعے سے مولانا نے مروجہ کے نقطہ نگاہ کے متعلق انہوں نے سمجھا، اہل تحقیق کا شیوہ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی چیز سرسری طور پر دیکھیں پھر جو فرد آپ کے سامنے آجائے اس پر تعریف کی بجلیاں گرانے میں مصروف ہو جائیں۔

**تین کتابیں** | مولانا ابوالکلامؒ نے ۱۹۱۵ء میں فیصلہ کیا تھا کہ قرآن مجید کے فہم و مطالعہ کے سلسلے میں تین مختلف ضرورتوں کے لئے تین چیزیں مرتب کر دی جائیں۔

پہلا کہ انہوں نے خود ”ترجمان“ کی جلد اول کے آغاز میں اختصاراً فرمایا تھا یعنی،

۱۔ عام تعلیم کے لئے ترجمہ، جسے انہوں نے ”ترجمان القرآن“ سے موسوم فرمایا۔

۲۔ مطالعے کے لئے تفسیر، جس کا صرف ایک نمونہ یہ سلسلہ تفسیر فاتحہ ”ترجمان“

جلد اول کے ساتھ شائع ہوا یا قرآن مجید کے سلسلے میں بعض تاریخی مباحث کا ایک ٹکڑا جلد دوم میں سورہ کہف کے ساتھ شامل کیا۔

۳۔ اہل علم و نظر کے لئے مقدمہ، جس کا صرف ایک نمونہ ”ام القرآن“

کے ساتھ چھپا ہے۔ مولانا نے کئی مرتبہ فرمایا کہ مقدمے میں قرآن مجید کے

تمام بنیادی مطالب چوبیس عنوانوں کے تحت مرتب کر دیئے گئے ہیں۔ اس

کتاب کے مطالعے کے بعد قرآن مجید کے متعلق انشاء اللہ کوئی ضروری

مسئلہ باقی نہ رہ جائے گا۔

**ترجمان کا دائرہ بحث** | غرض ”ترجمان“ صرف عام تعلیم کے لئے تھا۔ اس کا مقصد

یہ تھا کہ مطالب قرآنی کے فہم و تدبر کے لئے ایک ایسی کتاب

تیار ہو جائے، جس میں کتب تفسیر کی تفصیلات تو نہ ہوں، مگر وہ سب کچھ ہو، جو قرآن کو ٹھیک

ٹھیک سمجھ لینے کے لئے موعی ہے۔ ترجمے کے ساتھ نوٹ اس غرض سے شامل کئے گئے کہ متعلقہ

آیات کے متعلق مختصر الفاظ میں مطالب و معارف کا مزید ذخیرہ جمایا ہو جائے۔ یہ نوٹ تشریح

و وضاحت کا ایک حریزہ درج ہیں۔ ورنہ قرآن کا مطلب صاف سمجھ لینے کے لئے اصل ترجمہ

کفایت کرتا ہے عموماً اس سے زیادہ طلب و ضرورت بھی نہیں ہوتی ۔

یہ تفصیل ”ترجمان القرآن“ کا دائرہ تحدید و بحث واضح کرنے کی غرض سے عرض کرنی پڑی۔ یہ کتاب قرآن مجید کی تفسیر نہ تھی کہ اس میں ہر مسئلے کے ایک ایک پہلو پر سیر حاصل ہمیش کی جاتیں۔ البتہ اہل شوق کا امرار بڑھ گیا تو دوسری جلد میں مولانا نے بعض اہم مطالب کی مزید توضیح و تفہیم کے لئے مختلف سورتوں کے آخر میں کچھ مباحث دیئے ، لیکن کتاب کا عام دائرہ بحث وہی رہا ، جو ابتدا میں مقرر کر لیا گیا تھا اور اسے تفسیر کا درجہ حاصل نہ ہوا۔ نومبر ۱۹۱۵ء میں مولانا نے ایک طرف ”ابلاغ“ جاری کیا ۔

### ابلاغ کی بجلیاں

ساتھ ہی ”ترجمان القرآن“ لیتھو میں اور ”البيان“ ٹائپ میں چھپونے کا انتظام کر لیا۔ ساتھ ساتھ مقدمہ بھی ٹائپ میں چھپنے لگا۔ اچانک مارچ ۱۹۱۶ء میں انہیں بنگال سے اخراج کا حکم ہو گیا اور وہ رانچی (صوبہ بہار) چلے گئے۔ خیال تھا کہ ”ابلاغ“ بھی جاری رکھیں گے اور ”ترجمان“ و ”البيان“ کی اشاعت میں بھی غفلت نہ پڑے گا۔ مقدمہ ”البيان“ کے ساتھ ساتھ چھپتا جائے گا، مگر ابلاغ بند ہو گیا پھر پے درپے تلاشیاں ہوئیں۔ تین مرتبہ کلکتہ میں اور دو مرتبہ رانچی میں۔ ان میں تمام مسودے ، کتابت شدہ یا مطبوعہ فرمے ، یادداشتوں اور نوٹوں کے بیش بہا ذخیرے پولیس نے اکٹھا لئے۔ سالہا سال کے بعد ان کا جو حصہ واپس ملا وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اس سے کوئی کام لیا جاسکتا ۔

مقدمے کی طباعت کی تصدیق یوں ہوئی کہ اب اس کا ایک نامکمل اور خستہ فرمہ ملا جسے ام القرآن کے ساتھ چھاپا گیا۔ اس کے آغاز میں مقدمے کے پانچویں باب کا ذکر ہے۔ گویا یہ فرمہ پانچویں باب سے بعد کا ہے ۔

”ترجمان“ میں مولانا کی کوشش یہ تھی کہ مفصل بحثیں نہ چھیڑیں ، مگر کوئی ضروری معاملہ عام اصحاب کے لئے غلبان

### ایک آیت کی تشریح

کا باعث ہو تو اسے اختصاراً صاف کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے سورۃ انبیاء کے آخری مباحث میں اس معاملے کی بھی تشریح فرمائی ، جسے بعض مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ

منسوب کر کے ایک روایت کی توثیق کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

سورۃ انبیاء کی ایک آیت ”ثَالِثُ لَا كَيْدَ لَكُمْ اَصْنَامُكُمْ الْاَلِهَ“ کو بعض اصحاب نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین باتوں میں سے ایک قرار دیا تھا جو خلاف واقعہ یا ”کذب“ تھیں۔ مولاناؒ نے اس آیت کی تشریح فرمائی اس کا موقع اور محل واضح کر دیا، جس کے بعد اسے خلاف واقعہ سمجھنے کے لئے کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایسی دوسری بات ”قَالَ رَاقِي سَقِيْهُ“ قرار دی جاتی ہے جو سورۃ صافات میں ہے۔ مولاناؒ نے فرمایا کہ اس کی تشریح تو سورۃ صافات میں آئے گی۔ تاہم اس کا کوئی بھی مطلب ٹھہرایا جائے، اس سے جھوٹ کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ میں بیمار ہوں، اسے جھوٹ کیوں سمجھا جائے؟ باقی رہی تیسری بات کہ حضرت نے بعض مصالح کی بنا پر اپنی اہلیہ کو بادشاہ کے روبرو بہن کہا تو مولاناؒ نے فرمایا، یہ بات قرآن میں کہیں نہیں آئی، تورات میں ہے اور تورات کے موجودہ نسخے کی صحت کا ذمہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔

**غیر معصوم کی شہادت اور یقینیاتِ دین** | ظاہر ہے کہ مولاناؒ نے ”ترجمان“ کے دائرہ بحث و نظر کے اندر

رہتے ہوئے اصل شے کو بے بنیاد قرار دیا۔ ان کا اسلوب تحریر ذہنی الجھنوں ہی کا ازالہ نہیں کرتا بلکہ دل میں روح یقین تازہ کر دیتا ہے۔ فرمایا کہ قرآن نے نبی کا جو سب سے بڑا وصف قرار دیا ہے، وہ اس کی سچائی ہے۔ نبوت ایک میرہ ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا۔

مولاناؒ کو علم تھا کہ صحیحین کی ایک روایت اس اصل سے متعارض بنائی جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں انہوں نے ”صحت“ و ”عصمت“ کی بحث پھیری۔ یعنی یہ کہ روایت کی صحت کا مطلب ہے، ایسی صحت، جیسی اور جس درجے کی عصمت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے۔ عصمت کا اعتقاد نہیں۔ غیر معصوم کی شہادت ایک لمحے کے لئے بھی یقیناً سب بنیہ کے مقابلے میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ مان لینا پڑے گا کہ اللہ کے رسول کا قول نہیں اور۔

ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا اور نہ زمین شق ہو جائے گی۔

**مولانا آزاد کا موقف** | یہ اصل مسئلے کی اصولی حیثیت تھی، لیکن مولانا نے روایت سے قطع نظر نہیں کیا بلکہ فرمایا :-

۱۔ یہاں ہم نے اصل واضح کر دی، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ روایت مشہور کے متن و اسناد پر نظر ڈالی جائے، اس کے لئے ”البیان“ کا انتظار کرنا چاہیے۔

۲۔ قرآن کے بعد دین کی ان کتابوں میں جو انسانوں نے ترتیب دی ہیں، سب سے زیادہ صحیح کتابیں ”جامع بخاری“ اور ”جامع مسلم“ ہیں، ان کی ترجیح محض شروط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے چونکہ یہ دو باتیں (شہرت اور قبول) تاریخ اسلام میں صرف انہی کتابوں کے حصے میں آئیں و لیس لہذا ثالث اس لئے ان کی ہستی بجائے خود ایک دلیل صحت ہو گئی۔ صحیحین کی روایت محض اس لئے بھی قوی تر سمجھی جائے گی کہ وہ صحیحین کی روایت ہے۔ دوسرے جامع کی روایات کتنی ہی شروط بخاری و مسلم پر نکال کر دکھادی جائیں لیکن وہ اس قوت کا ہم پتہ نہیں ہو سکتیں۔

**بے تعلق نکتہ آفرینی** | غرض صحیحین کا درجہ ترجیح مسلم، روایت کے متن و اسناد پر نظر ڈالنا لازم، پھر معلوم نہیں تبصرہ نگار بزرگ نے ان حقائق کو نظر انداز فرما کر بعض عجیب و غریب نکات کہاں سے پیدا کر لئے اور انہیں اصل مبحث سے کیا علاقہ تھا؟ مثلاً :-

- ۱۔ صحت حدیث کی قطعیت کا یہ معیار کہ کہیں کسی حدیث یا روایت کا قرآن مجید سے تعارض نہ ہو، خود محدثین کرام رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی حقیقت میں نگاہوں سے اوجھل رہا۔
- ۲۔ جب امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ اپنی اپنی صحیح میں اس حدیث کو جو مولانا کے اس تصور حدیث کی بنیاد ہے نقل کر رہے تھے، اس وقت عصمت انبیاء جیسا اہم اور بنیادی مسئلہ ان سے پوشیدہ نہ تھا۔



۳۔ احادیث و روایات کا بیشتر حصہ (کذافی الاصل) ظاہری اعتبار سے متعارض نظر آتا ہے مگر خود محدثین و فقہاء کرام نے اپنی دقت نظر اور مزاج شناسی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عمدہ مذاق سے ہمیشہ فنِ تعمیر سے کام لیا جس سے یہ ظاہری تعارض بھی ختم ہو جاتا ہے۔

۴۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خود حدیث و روایت ہی کو جو متعارف معیار کے مطابق درست ہے، حرف غلط کی طرح موقوف کر دیا ہو۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ”کذب“ کی حدیث کو حجت بنا کر تشلیک کی راہ پیدا کرنا کسی طرح بھی ممکن نہیں، حالانکہ خود قرآن مجید میں اس کا قرینہ موجود ہے۔

**کوئی کیا کہے؟** | ان ارشادات گرامی کو، جو یقیناً حجیت حدیث سے عشق و محبت کا کرشمہ ہیں، اصل معاملے سے کیا تعلق ہے؟ ایک شخص محض حدیث کی حجیت ہی کو لازم نہیں مانتا۔ یہ اعلان بھی کرتا ہے کہ بخاری و مسلم کو تمام دو لوہین حدیث پر ترجیح ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ زیرِ غور روایت کے متن و اسناد پر نظر ڈالنا ضروری ہے، مگر اسے ”البيان“ پر موقوف رکھتا ہے کیونکہ ”ترجمان“ کا دائرہ بحث محدود ہے۔ آخر اسے یہ جملانے کا کون سا موقع اور محل تھا کہ محدثین کی نظروں سے یہ اوچھل نہ تھا اور بخاری و مسلم کی حقیقت میں ٹکائوں سے یہ پوشیدہ نہ تھا یا ظاہری تعارض کو فنِ تعمیر سے ختم کر دیا گیا یا حدیث معیار متعارف کے مطابق درست تھی اسے حرف غلط کی طرح موقوف کر دیا گیا۔

**صاحبِ تحریر کا معاملہ** | سوال یہ ہے کہ مولاناؒ نے کہاں کسی حدیث کو حجت بنا کر تشلیک کی راہ پیدا کی جس کے لئے بقول جرگ محترم قرآن میں قرینہ موجود ہے؟ کیا اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ کی نظر پہلے حدیث پر جاتی ہے اس کے بعد آپ قرآن سے قرینے پیدا کرتے ہیں؟ غالباً اسی وجہ سے مولانا نے پہلے آپ حضرات کے پیدا کردہ ”قرینوں“ کا صفایا کیا، پھر لکھا کہ اصل روایت کی جانچ چڑتال بھی ضروری ہے۔

غالباً مولانا کو اسی لئے یہ لکھنا پڑا کہ ہر گوشے کی طرح اس گوشے میں بھی متاخرین افراط و تفریط میں پڑ گئے ہیں۔

”ایک طرف فقہائے حنفیہ ہیں، جنہوں نے یہ دیکھ کر کہ بخاری و مسلم کی مرویات کی زردان کے مذہب پر پڑ رہی ہے، اس امر کی کوشش شروع کر دی کہ ان دونوں کتابوں کی صحت کی قوت کسی نہ کسی طرح کمزور کی جائے۔۔۔ حالانکہ صحیحین کی ترجیح محض ان شرائط کی بنا پر نہیں بلکہ شہرت اور قبول کی بنا پر ہے اور اس پر تمام امت کا اتفاق ہو چکا ہے۔ دوسری طرف عام اصحاب حدیث ہیں، جنہوں نے اس باب میں ٹھیک ٹھیک تقلید کی وہی چادر اوٹھ لی ہے جو فقہائے مقلدین کے سروں پر انہوں نے دیکھی تھی اور اسے پارہ پارہ کر دینا چاہا تھا۔ ان کے سامنے جو نبی بخاری و مسلم کا نام آجاتا ہے، بالکل درمائدہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ پھر کوئی دلیل و حجت بھی انہیں اس پر تیار نہیں کر سکتی کہ ان کی کسی روایت کی تضعیف پر اپنے آپ کو راضی کر سکیں“

**سنگ دلی اور بے انصافی** | زمانے کی ستم ظریفی نہیں، انتہائی سنگ دلی اور بے انصافی ملاحظہ ہو کہ جس فرد فرید نے ۱۹۱۳ء سے

زندگی کے آخری سانس تک پورے چھیالیس سال حجیت حدیث کے قیام و ثبات میں گزار دیئے اور مسلسل تحریری و تقریری دعوتوں سے حدیث کی اہمیت از سر نو قائم و استوار کر دی اس پر یہ الزام مانڈ کرتے وقت ایک محبت حجیت حدیث کو تامل نہیں ہوتا کہ حدیث میں تشکیک کی راہ پیدا کی جا رہی ہے۔

او بہ ہلاک من خوش است، من بہ بقائے عمر او

و ساعدۂ وفا نگر، یار چنین و من چنان

لیکن شکوہ زبان پر نہیں آسکتا۔ راو دعوت حق کے یہ وہ کانٹے ہیں کہ اگر داعی حق

کا دامن ان سے تارتا رہے جو اور اس کا جسم زخموں سے لالہ زار نہیں جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ دعوت کا حق ادا نہیں ہوتا ہے

آزار از جراحت بیگانگان رسد

مرہم منہ کہ زخم دل از آشتنا رسید

شاید کلمہ ہمدانی نے ایسے ہی حالات میں کہا تھا ہے

خارے اگر بہ پائے طلب ناخلیدہ ماند  
از سر گیر راہ بہ پایاں رسیدہ را  
نواستدگان کرام کے ملاحظے کے لئے ان کوششوں کا سرسری سا ذکر غالباً  
بے محل نہ ہو جو مولاناؒ نے ابتدائے دور خدمت سے مقام حدیث کی استواری کے لئے  
فرمائیں۔ جن کے پیش نظر کہا جاسکتا ہے :

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے  
یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ گھر کو میں ،

**ایک مثال** | ۱۹۱۳ء کے اوائل کا واقعہ ہے۔ ریح الاول کا مہینہ قریب تھا، کسی  
صاحب نے سوال کیا کہ میلاد کے سلسلے میں بعض روایتیں بیان کی جاتی  
ہیں جو بڑا بہت غلط معلوم ہوتی ہیں۔ میں نے بطور تود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے  
متعلق ایک تحریر مرتب کی ہے، جب وہ چند علماء کی خدمت میں پیش کی گئی تو وہ ہر دم ہونے کہ  
ان میں وہ واقعات موجود نہیں، جو بیان کئے جاتے ہیں۔ ”میں نے ایک عالم سے پوچھا کہ آیا  
وہ صحیح ہیں اور مستند تاریخوں یا احادیث میں ملتے ہیں؟“ تو جواب ملا کہ ملتے ہیں، مگر آج کل کے  
نیچریوں اور لامذہبوں کو ان کے ماننے میں تامل ہے۔

موصوف نے وہ تمام واقعات بھی ایک ایک کر کے لکھ دیئے۔ ساتھ ہی لکھا کہ  
آیا ایسے واقعات عقل میں آتے ہیں؟

مولاناؒ نے ”الہلال“ میں بیان کردہ واقعات کی حقیقی حیثیت واضح فرمادی اور  
ان سب کو بے اصل و غلط بتایا، مگر ساتھ ہی لکھا:-

”روایات کی صحت و عدم صحت کی نسبت ضمناً جس خیال کا اظہار آپ  
نے (مستقصر نے) فرمایا۔ افسوس کہ فقیر اس سے متفق نہیں۔ یہ ایک نہایت  
خطرناک اصولی غلطی ہے۔ جس میں زمانہ حال کے مدعیان تحقیق و اجتہاد اور  
رہروادین مادہ تطبیق عقل و نقل برسوں سے مبتلا ہیں۔ آپ نے بار بار اس  
سوال کو دہرایا کہ اگر یہ روایات صحیح ہیں تو آیا عقل میں آسکتی ہیں؟ جواباً گزارش

ہے کہ روایات تو صحیح نہیں لیکن یہ اصول کب صحیح ہے کہ جو واقعہ عقل میں نہ آئے وہ یکسر غلط اور موضوع ہے؟

آپ بلا تامل پہنچتے کہ یہ واقعات اصول فقہ روایت کی بنا پر کہاں تک صحیح اور قابل قبول ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ صرف اتنا ہی پوچھ لینا آپ کے مقصد کے لئے کافی ہے، لیکن یہ کہاں کا اصول تحقیق اور معیار تمیز حق و باطل ہے کہ واقعے کی صحت کے لئے پہلی شرط عقل کی تصدیق ہے؟ آپ لوگ بے تکلف یہ جملہ کہہ دیا کرتے ہیں، مگر نہیں سمجھتے کہ یہ کیسی سو فسطائیت کی راہ ہے جو اس طرح آپ کے سامنے کھل جاتی ہے؟

**مثل کوئی معیار نہیں** | ہر واقعے کی صحت کے لئے پہلی چیز اصول روایت اور صحت نقل کی شرائط کا اجتماع ہے اور پس نہ کہ زید و بکر کی عقل میں ا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ مارکونی کی ٹیلی گرام (بے تاریخ پیغام رسانی) کو آپ کی عقل تسلیم کرتی ہے بن جب اول مرتبہ اس کی ایجاد کی خبر یورپ کے کسی مستند پپے میں دیکھی ہوگی تو اس کی پ نے تصدیق کی تھی یا نہیں؟

آپ کو معلوم نہیں، یہی وہ سرحد ہے جہاں (باوجود اتحاد مقصد و اصول) مجھے آج کے مصلحین مذہب سے الگ ہونا پڑتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ جس حدیث اور جس روایت کو اپنے خود ساختہ معیار عقلی سے ذرا سے الگ پاتے ہیں، مٹا اس سے انکار کر دینے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں۔۔۔ حالانکہ اگر انہیں علوم دینیہ کے حصول کا موقع ملا ہوتا اور م وفن پر نظر ہوتی تو وہ دیکھتے کہ اسی مقصد کو اصول فقہ کے ساتھ حل بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ یا ضرورت ہے کہ ان روایات کی تغلیط محض اس وجہ سے کر دی جائے کہ وہ ہماری عقل میں ہیں آتیں؟ جب کہ اصول مقررہ حدیث و آثار، طریق جرح و تعدیل روایت، تحقیق و نقد روایت اور شہادات موثقہ ارباب علم وفن کی بنا پر بغیر کسی دقت کے ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ روایات ہی پایہ اعتبار سے ساقط ہیں اور اصول فقہ کے اعتبار سے لائق احتجاج نہیں اس طرح یہ بررشتہ اصول کو ہاتھ سے دینے اسی منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

مولاناؒ کی خدمت حدیث | یہ محض ایک مثال ہے۔ مولاناؒ کی پوری حیات دعوت  
ایسی مثالوں سے معمور ہے۔ یہاں ایسے بزرگوں کی کمی

نہیں جن کی زندگیاں علم حدیث کے پڑھانے میں بسر ہوئیں اور انہوں نے اس وسیع سرزمین میں  
یہ علم از سر نو زندہ کیا، جو دین کے اہم مآخذ میں سے ہے۔ لیکن نئے تعلیم یافتہ طبقہ میں حدیث  
کی عظمت و اہمیت پیدا کرنے کا جو اہم کام مولاناؒ نے انجام دیا، اس میں کوئی ان کا شریک  
وسہم نہیں۔ ”الہلال“ و ”البلاغ“ کی جلدوں میں سینکڑوں مضمون مل جائیں گے، جو احادیث  
کی شروح کے حامل ہیں اور یہ شروح ایسے دل آویز انداز میں کی گئی ہیں کہ پڑھتے ہی ہر شخص کے  
دل میں اتر جاتی ہیں۔ لیکن قدر شناسی کی یہ عجائب کاری ملاحظہ ہو کہ اسی شخصیت پر اس سلسلے  
میں تشکیک کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مولاناؒ آج اس دنیا میں موجود نہیں لیکن ہوتے بھی  
تو اس کے سوا کیا کہتے کہ:-

نیشکر آ پنخاں خورد کس ز دست دوست

کا زادگاں ز دست مبارز سنان خورد

اور سب کچھ چھوڑ دیجئے۔ ”ترجمان القرآن“ ہی کو دیکھ لیجئے۔ مسلسل و متواتر احادیث  
کے حوالے موجود ہیں، ان سے اپنے پیش کردہ مطالب کی توثیق کی گئی ہے۔ کہیں بخاری کا حوالہ  
ہے، کہیں مسلم کا اور کہیں اصحاب سنن کا۔ کیا یہ حدیث میں تشکیک کا ثبوت ہے؟ کیا اسے  
راہ تشکیک پیدا کرنے سے تعبیر کیا جائے گا؟ حدیث سے عشق و محبت مستم بھی لیکن اس کا یہ  
طریقہ نہیں کہ جوش غیرت کا سرمایہ اپنوں ہی پر صرف کر دیا جائے اور مولانا محمد علی مرحوم کے ایجاد  
کردہ محاورے کے مطابق ”پورس کے ہاتھی“ بن کر اپنی ہی صفوں کو پامال کر ڈالا جائے۔  
ایک نہایت عجیب نکتہ | ایک نہایت عجیب نکتہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ”کذب“ کی شرعی  
اور لغوی حیثیت معلوم کر لی گئی ہوتی۔ اس سے اُمت  
پر سہولت و تسہل کی کتنی راہیں کھل گئی ہیں۔

سبحان اللہ! اُمت مرحوم پر سہولت و تسہل کی راہیں کھولنے کا کتنا عمدہ طریقہ سوچا گیا  
ہے؟ یعنی پہلے ایک جلیل القدر پیغمبر جو سچائی کے مقام بلند پر فائز اور معصوم ہے ”کذب“

کا اثبات کیا جائے، اس کے لئے قرآن مجید میں کوئی وجہ و سبب موجود نہ ہو تو تفسیر بالرائے سے ایسے پہلو پیدا کرنے چاہئیں کہ روایت پر زرد نہ پڑے۔ پھر ”کذب“ کی شرعی اور لغوی حیثیت کی توضیح کی جائے اور بتایا جائے کہ یہاں یہ لفظ ان معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ جس میں اسے قرآن حکیم نے بے شمار مقامات پر استعمال کیا ہے، حتیٰ کہ ”لَعَنْتُ اللہَ عَلٰی الْكَافِرِیْنَ“ بھی موجود ہے۔ بلکہ اس کے خاص اور محدود معنی ہیں۔ اگر خدا کا ایک بندہ کہتا ہے کہ قرآن مجید میں اس اصدق الصادقین کے متعلق کوئی ایسی بات ثابت نہیں، جسے جھوٹ کہا جاسکے تو اس کے متعلق بے تکلف کہہ دیا جائے کہ وہ حدیث کے سلسلے میں راہ تشکیک پیدا کرتا ہے!

رونے سے اسے ندیم ملامت نہ کرے  
آخر کبھی تو عتدہ دل واکرے کوئی

**احترام حدیث کی حیثیت** | پھر میرے محترم بزرگ نے صرف بخاری اور مسلم کا احترام سیکھا ہے اور احترام بھی ایسا کہ وہ قرآن حکیم کی آیت کو معافی ظاہرہ و باہرہ سے بچا دینے پر ہم تن تیار ہیں، بلکہ اس میں کسی کو تامل ہو تو اس پر تشکیک کی خدنگ افگنی کے لئے آمادہ ہیں۔ مگر مصیبتیں کی کسی روایت پر مزید غور و فکر یا تحقیق متن و اسناد کی اجازت دینے پر بھی رضامند نہیں۔ کیا انہیں معلوم ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے ۱۹۱۷ء میں اعلان فرمایا تھا کہ صحیح بخاری اس دنیا کی بہترین کتاب ہے؟ آپ کو یہ حقائق تو یاد نہ رہے، صرف یہ یاد رہ گیا کہ مولانا کی ایک تحریر سے حدیث میں تشکیک کا راستہ کھلتا ہے۔

تمہیں لے دے کے ساری داستان سے یاد ہے اتنا  
کہ مالگیر ہند و گنیش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

**تاریخ اسلام کی بہترین کتاب** | ۱۹۱۷ء میں مولانا شبلی مرحوم و مغفور کی وفات پر مملکت میں ایک جلسہ تعزیت ہوا تھا جس میں مولانا آزاد نے ”شبلی کی حیات علمی و ادبی“ پڑھ کر گھنٹہ تقریر فرمائی تھی، اس میں تدوین علوم

کا ذکر فرماتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ متقدمین کی کتابیں متاخرین کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ اس ضمن میں فرمایا :-

” نہ صرف عظمت موضوع و نفس مضمون کے لحاظ سے، بلکہ طرز تصنیف و ترتیب ضبط مطالب اور محسن تقسیم و تنظیم کے لحاظ سے بھی تاریخ اسلام میں بہترین کتاب صحیح بخاری لکھی گئی ہے اور کوئی اسلامی تصنیف اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ امام بخاریؒ کے بعد بقیہ اصحاب صحاح، جامعین سنن و معاجم و مسانید نے نئے نئے اسلوب مطالب پیدا کئے مگر کوئی کتاب صحیح بخاری تک نہ پہنچ سکی اور یہ میں محض حدیث کی قدیم خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ یقین کیجئے اس فن تصنیف کو پیش نظر رکھ کر، جو ترقی یافتہ علمی زبانوں میں آج پایا جاتا ہے، میں نے علیٰ وزن البصیرۃ یہ رائے قائم کی ہے “

(البلاغ ۱۷، ۲۴، دسمبر ۱۹۱۵ء)

یہ اس جلیل القدر ہستی کا اعلان ”صحیح بخاری“ کے متعلق ہے اور آج کا نہیں باون سال پیشتر کا اعلان ہے اور یہ رائے اس نے ترقی یافتہ علمی زبانوں کے مروجہ فن تصنیف کی بنا پر قائم کی تھی۔

خیال کن تو کجائی و ماکب و اعظ

بھی کہہ دوں کہ ”قَالَ اللَّهُ لَا كَيْدَ أَصْنَاكُمْ الْخ“ اور ”قَالَ رَأَيْتُ سَقِيمًا“ تو بجز اللہ ہر شاہ کذب سے بالکل پاک ہیں، واللہ کہ

قرآن کے الفاظ سے خواہ خواہ وہ معنی نکالنے کی کوشش کی جائے، جو ان سے نہیں نکلتے، لیکن تورات کی جو روایت اس سلسلے میں پیش کی جاتی ہے، وہ بھی بدابہت ناقابل قبول ہے۔ مولانا نے تو یہ فرما کر معاملہ ختم کر دیا تھا کہ تورات کے موجودہ نسخے کی صحت کا ذمہ ہم نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن میری گزارش ہے کہ اس سلسلے میں تورات کا بیان خود لبریز اضطراب ہے مثلاً،

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت سارہ کی عمریں صرف دس برس کا فرق تھا کیونکہ تورات کی روایت کے مطابق جب حضرت سارہ کو حضرت اسحق علیہ السلام کے پیدا ہونے کی بشارت ملی،

تب ابراہام سرنگوں ہوا اور ہنس کر دل میں کہنے لگا کہ کیا تیرا برس  
کے بڑے سے کوئی بچہ ہوگا اور کیا سارہ کے جو نوٹے برس کی ہے ،  
اولاد ہوگی۔ (پیدائش باب ۱۷ آیت ۱۸) -

۲۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام حاران سے کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو  
ان کی عمر پچھتر برس کی تھی۔ (پیدائش باب ۱۲ آیت ۵) گویا اس وقت حضرت سارہ پینسٹھ  
برس کی ہوں گی۔

۳۔ بادشاہ مصر کے روبرو، حضرت سارہ کو بہن قرار دینے کا معاملہ (حسب روایت  
تورات) اس سے بھی بعد پیش آیا اور حضرت سارہ اس وقت تک پینسٹھ برس سے متجاوز  
ہوں گی۔

پھر کیا کوئی فرد بہ سلامت ہوش و حواس یہ ماننے کے لئے تیار ہو سکتا ہے کہ جو خاتون پینسٹھ  
اور ستر برس کے درمیان تھی، اس سے شاہ مصر شادی کے لئے مضطرب ہوا ہو گا یا ہو سکتا تھا؟  
غرض عبارت ”کذب“ کے دوستوں پہلے گر چکے تھے۔ رط تیسرا ستون تو وہ درحقیقت  
ستون نہیں محض وہم کی تخلیق ہے۔

برق افگنی کے مزید کرشمے | صاحب تحریر کے ابرغیظ کی برق افگنی اس معاملے پر  
ختم نہیں ہوئی، بعض اور مطالب بھی اس کی زد میں  
آگئے ہیں، ایک مقام پر تو انہوں نے کمال ہی کر دکھایا، فرماتے ہیں،

”وہ خود (یعنی مولانا آزاد) محض ماہرین آثار قدیمہ کی تحقیقات اور روایات  
کو، جو سراسر ظنی اور وہی ہوتی ہیں، بنیاد بنا کر قرآن مجید کی تفسیر اور نتائج کا  
استخراج کرتے ہوئے حدیثی اور روایتی تفسیر قرآن میں بہت سی ”بوا العجیوں“  
کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ظنی اور وہی تحقیقات تفسیر قرآن کا  
مستند ترین ماخذ ہے۔ چنانچہ قرآن کے ذوالقرنین کو وہ قطعی طور پر سامریں خیال  
کرتے ہیں، حالانکہ مولانا کے اس قطعی یقین کا ماخذ قرآن کا فرمودہ نہیں“

بے اصل و اساس | میں اس عبارت کو ”کذب“ قرار دوں تو شاید اس لفظ کی



”شرعی اور لغوی حیثیت“ کا مسئلہ سامنے آجائے البتہ یہ عرض کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ محض بے اصل و اساس ہی نہیں صریح اقرار ہے۔ کیونکہ ”ترجمان القرآن“ کی دونوں جلدوں کے ویش بارہ سو صفحات بلکہ ابتدائے آخر تک مولانا کی تحریرات کے ہزاروں صفحات میں سے ایک سطر یا سطر کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہیں پیش کیا جاسکتا، جس میں اثری تحقیقات کو ”مستند ترین“ تفسیر کہا گیا ہو، مانا گیا ہو یا اس حیثیت میں اس سے کام لیا گیا ہو۔ جس آیت کی تفسیر سے تہمت کذب کا قطعی ازالہ کیا گیا، اس میں بھی کہیں اثری تحقیقات کا نام نہ زیر غور نہیں آیا۔ صرف آیت کے موقع و محل کی تشریح الفاظ کے مطابق کھول کر کی گئی اور بتایا گیا کہ اس مفہوم کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن نہ یہ ”حدیثی اور روایتی تفسیر“ کی ”بوالعجبی“ ہے، نہ اس میں آثارِ قدیمہ کی سراسر غلطی اور وہی تحقیقات کا کہیں ذکر آیا ہے۔ نہ کسی مقام پر قرآن مجید کی کسی آیت یا اس کے کسی ٹکڑے کی تشریح آثارِ قدیمہ کی بنیاد پر کی گئی ہے البتہ اگر آثارِ قدیمہ کی کوئی چھان بین قرآن مجید کے کسی بیان کی مؤید ثابت ہوتی ہے تو اسے تائید میں پیش کر دینا گناہ نہیں۔ اصولِ عربیت، سیاق و سباق یا کسی بھی مستند طریقے سے اس تفسیر پر اعتراض کیا جاسکے تو ضرور کیجئے لیکن اقرار کی بت تراشیوں سے کام لینا تو بے چارگی کی دلیل ہے۔ جو کم حوصلہ افراد کا آخری مامن ہے۔

کیا یہ مقصدیت ہے جس کی جزو حیثیت کے احساس نے آپ کو اضطراب کے شعلہ زار میں پہنچایا؟ کیا یہ قرآن و احادیث میں گہری بعیرت سے پردا مانی ہے اور کیا اسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی تعلیمات سے کامل واقفیت کی آئینہ داری سمجھا جائے گا؟

اے حسن گراز راست نہ رنجی، سنے ہمت

ناز این مہ، یعنی چہ؟ کمر ہیچ و دھاں ہیچ

کیا یہ سمجھا جائے کہ آپ کے پاس چونکہ کوئی صحیح اور مستند بات کہنے کے لئے تھی نہیں لہذا امیر پھیر سے ایک چیز گھڑی اور اس مرحوم کے ذمے لگا دی جو جواب دہی کے لئے اس دنیا میں موجود نہیں۔ یہ طریقہ اخلاقی، دینی، شرعی اور عام انسانی نقطہ نگاہ سے جو حیثیت رکھتا ہے، اس کی توضیح غیر ضروری ہے۔ یقین رکھیں کہ مولانا نے چھالیس سال کی علمی اور

داعیانہ زندگی میں اس نوعیت کا ایک لفظ بھی اپنے لئے کبھی جائز نہیں سمجھا اور یہ بھی یقین رکھیں کہ علم حدیث کی حکمیت کو ایسے افسوسناک شیعوں سے قطعاً کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ باقی رہا ”سائرس“ کا معاملہ تو بزرگ محترم! جب میں کے ایک متبع کو ذوالقرنین کا تاج پہنایا جاتا رہا تو وہ بھی ”فرمودہ خدا“ تھا۔ جب سکندر یونانی کو اس مسند پر بٹھایا گیا جو کتنا ہی بڑا فاتح ہو لیکن سخت ظالم اور بت پرست تھا اور اپنا سلسلہ نسب جو پیڑ دیوتا سے ملتا تھا تو وہ بھی درست تھا۔ پھر ترقی کی تو دارا گشتاپ کیانی سے جوڑ دیا، اس وقت بھی ”فرمودہ خدا“ کے طلب گاروں میں سے کسی کی زبان نہ کھلی حالانکہ صرف تاریخی اعتبار سے بھی یہ باتیں اتنی فرومایہ اور غیر معقول تھیں کہ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کہا جائے۔ مولانا نے خالص تاریخی نیز بعض صحائفِ تورات کے اشاروں کی روشنی میں ایک ایسی شخصیت متعین کرنے کی کوشش کی، جس پر قرآن کے ذوالقرنین کا لباس غیر موزوں نہ ہو۔ تاہم انہوں نے کہیں نہیں کہا کہ آپ اسے مندر مانیں، کہیں نہیں لکھا کہ یہ ”فرمودہ خدا“ ہے۔ ذوالقرنین کو ”سائرس“ ماننا عقائدِ اسلام کا جزو نہیں۔ ساتھ ہی یقین رکھیں کہ تَالَهُ لَكَ كَيْدَنْ اَصْنَا مَكْرَهُ الخ بہر حال ہر شاہ ”کذب“ سے پاک و مبرا ہے اور مولانا کا یہ ارشاد بہر حال حق ہے اور ہمیشہ حق رہے گا:

”نبوت ایک سیرت ہے، جو صرف سچائی سے بنتی ہے، حقیقت

اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے، خواہ وہ کسی شکل اور کسی درجے میں ہو، نبوت

کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا“

صرف اتنا اور کہ

آخر بواہو سس نے حسن پرستی شعار کی

اب آبروئے شیوہ اہل نظر گر گئی

آخری گزارش | یہ باتیں تو ایسی تھیں، جو مجھ فرمایہ علم و عقل کی سطح سے بہت اونچی تھیں، لیکن میرے محترم بزرگوار خفا نہ ہوں تو ایک بات اور بھی گوش گزار کرنے کا خواہاں ہوں۔

موصوف نے ابومسلمان صاحب شاہ جہان پوری کا ذکر جن افسوسناک الفاظ حد درجہ ناخوشگوار انداز اور حوصلہ شکن طریق پر کیا، اس کے لئے وہ کون سے وجہ جواز کر سکتے ہیں؟ فرض کیجئے میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں یا تحریر میں مجھے مشاقی کا درجہ حاصل نہیں اور بالغ نظری و تحقیق سے بھی عاری ہوں لیکن لکھنے کا شوق ہے، خدمت کی تہ ہے تو کیا مجھے اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے جب تک قرآن و حدیث میں گہری بیہ سے دامن پڑ نہ ہو جائے اور جب تک شاہ ولی اللہ رحمہ کی تعلیمات سے وسیع واقفیت کے درجے پر نہ پہنچ جاؤں؟ یہ سب کچھ بھی بزرگوار محترم کے معیار پر پورا اترنا ضرور ہے، ورنہ رد کر دیا جائے گا۔ کیا انہوں نے کبھی سوچا کہ ان اوصاف سے متصف لوگ تو گریزوں مسلمانوں میں سے شاید بہت ہی کم نکلیں لیکن ہر مسلمان کے لئے اس اوصاف سے متصف ہونا تو لازم ہے۔ مثلاً گفتار میں نرمی اور ملائمت، انداز حوصلہ شکنی کا نہیں بلکہ حوصلہ افزائی کا ہو، اسلوب ایسا ہو کہ متعلقہ شخص کو اپنی کوتاہیوں کی تائید کا موقع ملے نہ کہ اس کا دل دھیم ہو جائے۔ مولانا رومؒ نے فرمایا تھا:

علم را بر دل زنی یا رے بود

لیکن بزرگوار محترم نے تو علم سے یہ کام نہیں لیا بلکہ وہی صورت پیدا کر چاہی کہ:

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

قرآن مجید کے ارشاد میں ”حکمت“ اور ”موعظہ حسنہ“ کی تاکید ہے، لیکن موصوف نے جو کچھ فرمایا وہ تو ان دونوں عنوانوں میں سے کسی کے بھی تحت نہیں آتا۔ کیا مجھ ایسے طالبانِ علم کو کفایتِ ہمدانی کا ہم زبان ہونا چاہیئے؟ جو کہتا ہے:

زاهدان این زمان معیار حق و باطل اند  
ہدچہ را منکر شوند این قوم باور می کنم

# شاہ ولی اللہ اکبڑی

## اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔

۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکبڑی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل علم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔

۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُن کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا اجرا۔

۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کا

غرض سے ایسے موضوعات پر جو سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع

Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

# شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین بلبانی سندھ یونیورسٹی  
پروفیسر بلبانی ایم۔ اے۔ بعد شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے  
اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر پیر حاصل  
بجائش کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

## المسومین جادیش الموطا

تالیف \_\_\_\_\_ الامام ولہ اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی پیشہ ور کتاب آج سے ۲۲ سال پہلے مکتومکتوب میں مولانا عبد اللہ سندھی مرحوم کے زیرِ قلم لکھی گئی تھی جس میں جو کچھ مولانا مرحوم  
نے تشریحی حدیث میں شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فاسی شرح لکھی پر آپ نے برسوں بعد مقررہ کتاب اس کا حلیہ کر  
کے شاہ صاحب کے السنوی میں الموطا امام مالک کے نسخے سے ترتیب دی ہے۔ امام مالک کے وہ اقوال ہیں جو وہ اپنی جہت میں سے منفرد تھے صرف کر  
ہے۔ گئے ہیں اور ان کے وابستہ متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے توضیحی کلمات  
دلائل کتب سے کی تفسیر بعد دو حصوں میں قیمت ۱۰۰ روپے

## ہمعات

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔

اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے نفس انسانی  
قرابت و نزکیہ سے جن بلبلہ منازل پر فائز ہوتا ہے، اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔

قیمت دو روپے

محمد سرور ہرنر پبلشر نے سعید آرٹ پریس حیدرآباد سے چھپوا کر شائع کیا،

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ سجاولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

۴ (۱۱)

ماہنامہ  
الرحیم



شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدر آباد

جلیسِ اذاریت \_\_\_\_\_

ڈاکٹر عبدالواحد علی پوتا،  
مخدوم امیر احمد

\_\_\_\_\_ مدیر:

غلام مصطفیٰ قاسمی

# الرحیم

جلد ۴ || ماہ اپریل ۱۹۶۷ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ || نمبر ۱۱

## فہرست مضامین

۶۳۸	مدیر	شذرات
۶۴۱	مولانا افتخار احمد بلخی	جرح و تعدیل
۶۵۹	ستیدہ حنا	شاہ ولی اللہ کی ایک نمایاں خصوصیت، تطبیق
۶۷۳	مولانا ابوالفتح محمد صغیر الدین	تقسیم علوم دین صاحب یناسیح کی نظر میں
۶۸۷	طفیل احمد قریشی	اندلس کے ایک مشہور قاضی { ابوالولید باجی
۶۹۶	پروفیسر محمد ایوب قادری	منقہ عنایت احمد کاکوردی
۸۰۵	وقار راشدی	مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام { چہل غازی
۸۱۰	محمد سرور	تلخیص و تبصرہ



## شذرات

ماہ فروری کے شمارے میں رویت ہلال کے بارے میں چند گزارشات پیش کی گئی تھیں ، ہمیں افسوس ہے کہ جس علوم نیت اور حسن مقصد کے تحت انہیں پیش کیا گیا تھا، اُن کو اس حیثیت میں ہمیں دیکھا گیا اور ہمارے بعض بزرگوں کو یہ گزارشات اور انہیں پیش کرنے کا انداز ناگوار گزارا اور انہوں نے ان کے بارے میں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ ہمیں اس کا دلی رنج ہے۔ ہم اپنے ان بزرگوں سے عرض کریں گے کہ ”الرحیم“ کے پیش نظر پہلے دن سے یہ ہے کہ ملک میں علوم دینیہ کا وقار بڑھے۔ وہ اپنی اہمیت و افادیت میں اس مقام پر آجائیں ، جہاں آج دوسرے علوم ہیں۔ اس کے ساتھ علماء کرام کا معاشرے میں مرتبہ بلند ہو۔ حوام اور حکومت اُن کی باتوں پر کان دھیں اور انہیں اپنا مرشد و رہنما سمجھیں۔ دین دنیا سے الگ تھلک مسجد یا مدرسہ میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ وہ قومی زندگی کو مقصدیت دے۔ روح دے۔ اخلاق رہنمائی بخشنے اور اس طرح ملت پاکستان کی تشکیل نو ہو سکے۔

—\*—

رویت ہلال کا معاملہ تو سال میں ایک بار ہوتا ہے۔ اب یہ معاملہ رفت گزشت ہو گیا اس لئے اس پر مزید بحث بے کار ہوگی۔ خدا کرے ایک سال بعد جب عید الفطر آئے تو اس طرح کی بد مزگی پیدا نہ ہو اور حکومت جو ہر حال میں ملک و قوم کی سیاسی اجتماعی انتظامی قوت کا منظم ہوتی ہے، اس کے فیصلے کو سب مانیں اور کم سے کم عید وغیرہ کے موقعوں پر تو پاکستان کے اندر پوری ملت متفق و متحد نظر آئے۔

ہم نے فروری کے شمارے میں عرض کیا تھا اور اب پھر پوری درد مندی کے ساتھ اور بصدر عجز و نیاز عرض کریں گے کہ ایک قومی اسلامی حکومت میں علماء کرام کا جو رول ہونا چاہیے، اور جو آج دوسرے آزاد مسلمان ملکوں میں فی الواقع ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں کے اکثر علماء کرام اس رول کو اپنانے کے لئے تیار نہیں۔ اور اس ضمن میں وہ ذہنا اور علما اُنس

فضائیں رہتے ہیں جو اس برصغیر میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی۔ ان میں سے بہتوں کو اب تک یہ معلوم نہیں کہ اس دور میں جب کہ حکومتوں کا کام صرف پرونی حلوں کو روکنا اور اندرونی طور پر امن قائم نہیں رہا، بلکہ عوام کے لئے روزگار بہم کرنا، ان کے لئے طبی امداد، مکان، تعلیم اور اس طرح کی دوسری ضروریات زندگی مہیا کرنا بھی حکومتوں کے فرائض میں داخل ہے، اور جو حکومت جس قدر بھی ان فرائض کی ادائیگی میں قاصر ہوتی ہے، اُسی قدر اسے نااہل سمجھا جاتا ہے۔ حکومتوں کا عمل دخل قومی زندگی کے ہر شعبے میں بدرجہ بڑھتا جائے گا۔ اور خاص طور سے ملکوں کی معاشی اور ترقیاتی ضرورتیں کچھ اس قسم کی ہوتی جا رہی ہیں کہ حکومتوں کو عوام و خواص کی آمدنی اور خرچ پر زیادہ سے زیادہ کنٹرول کرنا پڑے گا۔

غرض یہ منصوبہ بندی کا دور ہے۔ صرف معاشی منصوبہ بندی نہیں۔ بلکہ پوری قومی و ملکی زندگی کی منصوبہ بندی کا۔ یہ وقت کی ضرورت ہے اور جو ملک اپنے ہاں اس طرح کی منصوبہ بندی نہیں کرے گا، وہاں کسی قسم کی ترقی نہیں ہو سکے گی اور اشیاء و فلکات عام ہوگی۔ ان حالات میں حکومت پاکستان کو ملک کی مذہبی زندگی کی جملہ سرگرمیوں کو کسی نہ کسی نظام کے تحت لانا ہوگا، اور اس وقت ہمارے ہاں جو فرقہ وارانہ انداز کی ہے، تصادم ہے، انتشار ہے اور اس کی وجہ سے عام فساد ہے، اسے روکنا پڑے گا۔ اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں، تمام مسلمان ملکوں میں فساد ہے، اور یہاں بھی یہ ہوگا۔ اس کے بغیر حکومت اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی۔

ہمارے بزرگوں کو ان بدلتے ہوئے حالات کی تاریخی منطق کو سمجھنا چاہیے اور بجائے اس کے کہ وہ حکومت، ہمارے نزدیک حکومت سے مراد کسی خاص شخص کی حکومت نہیں، بلکہ ادارہ حکومت سے متصادم ہوں اور ہر مسئلے پر خواہ وہ رویت ہال کا ہو، خواہ عائلی قوانین میں ترمیمات اور قائدانی منصوبہ بندی کا، حکومت کے خلاف ہم چلائیں، وہ ”الدین نصیحتہ“ کے فرمودہ عائلی پر عمل کر کے حکومت کو صحیح مشورے دیں اور اس کی کوتاہیوں کی اصلاح کریں۔ وہ ہر معاملے میں حکومت کے حریف بن کر میدان سیاست میں نہ کودیں۔ اور اسے آئے دن یہ چیلنج نہ دیں کہ دیکھ لیا، عوام ہماری سنتے ہیں، حکومت کی نہیں۔ اس طرح کا تصادم خطرناک ہے،

حکومت کے لئے اتنا نہیں جتنا علماء کے لئے۔ ترکی اور دوسرے مسلمان ملکوں کی مثالیں آپ کے سامنے ہیں۔ فروری کے الرحیم میں جو کچھ عرض کیا گیا تھا، اس کا محرک یہ جذبہ تھا۔ اس سے غرض الزام یا تہدید نہ تھی۔

۳ مارچ ۱۹۷۷ء کو مولانا علی محمد کا کے پوتا کے انتقال سے سرزمینِ سندھ ایک ممتاز و متبحر عالم سے محروم ہو گئی ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ مرحوم نے درس نظامی کی تکمیل سندھ میں کی پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر دہلی گئے۔ اور پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا، جس میں وہ اول آئے تھے۔ مرحوم اور نیشنل کالج لاہور میں تھے کہ مولوی شفیع مرحوم کی وساطت سے وہ علامہ اقبال کی خدمت میں پہنچے جنہیں رویت کے مسئلے میں مسلمانوں کے قدیم فلسفے سے کچھ معلومات حاصل کرنا تھی۔ مولانا علی محمد کا کے پوتا نے قدیم فلسفے سے یہ معلومات جمع کیے کہ علامہ مرحوم کو پیش کیں۔ جن کا اعتراف انہوں نے ایک خط میں کیا تھا، جو مولانا کا کے پوتا کے پاس تھا اور جسے وہ بڑے فخر سے رکھتے تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی جب ہجرت کے بعد واپس وطن آئے اور پیر چھٹڈو میں درس دینا شروع کیا، تو مولانا کا کے پوتا نے بھی اُن سے شاہ ولی اللہ صاحب کی چند کتابیں پڑھیں۔ مرحوم کی ساری زندگی درس و تدریس میں گزری۔ وفات سے پہلے کوئی دو سال تک شاہ ولی اللہ کالج منصورہ ڈیپارٹمنٹ (سندھ) میں مدرس رہے۔ مولانا مرحوم عربی، فارسی اور سندھی کے بڑے اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے حضرت مولانا تاج محمود امروٹی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر عربی میں جو مثنوی لکھا تھا۔ اس کی یاد اب تک دلوں میں تازہ ہے۔

قارئین الرحیم نے جناب ابوبکر شبلی صاحب کے مقالات بار بار پڑھے ہوں گے، افسوس وہ بھی گزشتہ ماہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ مرحوم کی عربی میں بڑی اچھی دستگاہ تھی اور سندھی میں آپ نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں۔ جناب ابوبکر شبلی مولوی عزیز احمد صاحب کے داماد تھے۔ جن کی ساری عمر مولانا سندھی کی رفاقت میں گزری اور مولانا کے ساتھ افغانستان، روس اور حجاز میں رہے۔ مرحوم کا وطن موضع تھر بچانی ضلع سکھر (سندھ) تھا اللہ تعالیٰ عنہ بقی رحمت کرے۔

# جرح و تعدیل

مولانا افتخار احمد پٹنی استاد شعبہ معارف اسلامی - کراچی یونیورسٹی

”جرح و تعدیل“ اصول حدیث کی اصطلاحوں میں ایک اہم اصطلاح ہے اور مشہور محدث حاکم نیشاپوری (متوفی ۵۰۴ھ) نے تو جرح و تعدیل کو علم حدیث کا پہل اور اس کی بلند ترین منزل تک رسائی کے لئے ایک بڑی سیر بھی قرار دیا ہے۔

**تعریف** | راوی کے اوصاف و خصائل کی تحقیق کے بعد اُس کے اُن عیوب کا اظہار جو اُس کی روایت میں عارج ہوں، جرح کہلاتا ہے، اور راوی کے اوصاف و خصائل کی تحقیق کے بعد یہ بتانا کہ راوی ثقہ ہے، تعدیل کہلاتا ہے۔ یہ دونوں (جرح و تعدیل) بقول امام حاکم دراصل دو انواع ہیں، جن میں ہر نوع مستقل ایک علم کی حیثیت رکھتی ہے۔

**مختلف آراء کیوں؟** | جرح و تعدیل کی مذکورہ تعریف سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک تو یہ کہ جرح و تعدیل نقداً حدیث کے مختلف طریقوں میں

۱۔ معرفۃ علوم الحدیث نوع ۱۸۔

۲۔ شرح نخبۃ الثکر (علامہ ابن عمر مقلائی متوفی ۸۵۲ھ)۔

۳۔ معرفۃ علوم الحدیث نوع ۱۸۔

ایک طریقہ ہے اور اس کا تعلق حدیث کے نفس مضمون سے نہیں بلکہ راویان حدیث یا نامتبر ہونے کے بیان سے ہے، اور دوسری بات یہ کہ چونکہ علم جرح و تعدیل کا مقہ اس کی غرض و غایت یہ ہے کہ اسناد کے تمام رواۃ میں سے ایک ایک راوی کو جرح کی کسوٹی پر اچھی طرح پرکھ کر حدیث کی صحت و سقم معلوم کی جائے، اس لئے اس راویوں کی ان صفات و خصوصیات پر وسیع اور گہری نظر ہوئی چاہیئے، جن سے ان کو کہہ روایات متاثر ہو سکتی ہیں اور چونکہ ان صفات و خصوصیات کا یکساں علم سب نہیں ہوتا، بلکہ اس کا بہت کچھ دار و مدار ذرائع معلومات پر اور راویوں کے مالہ و ماعا و اقیث حاصل کرنے میں محنت و کاوش پر ہے، اس لئے راویوں کی ثقافت کے ضعف اور عدم اعتبار کے بیان کرنے میں مختلف ائمہ فن مختلف نقطہ نظر پیش کرتے اس کے باوجود بقول علامہ طاہر البزازی (متوفی ۱۳۳۸ھ) تنقید روایات کے ائمہ میر طبقہ واحد کے دو ناقدین کبھی کسی ضعیف راوی کی توثیق پر متفق نہیں ہوئے اور نہ کہ راوی کی تضعیف پر متفق ہوئے، یعنی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ طبقہ واحد کے دو ناقدین نے متفقہ طور پر کسی ضعیف راوی کو ثقہ قرار دے دیا ہو یا کسی ثقہ راوی کو ضعیف ٹھہرا اس صورت حال کی بنا پر آسانی یہ بات سمجھی جاسکتی ہے کہ ائمہ فن کے نزدیک و تعدیل کے باب میں جو فرق مراتب ہے وہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا، ایک قدرتی نتیجہ ہے معلومات کی کمی بیشی اور رواۃ کی حالتوں کے ایک ایک جزیرہ کی چھان بین میں محنت و کے درمیان فرق کا۔

راویوں کے انواع درجات | دوسری بات قابل ذکر یہ ہے کہ اعداد صحت و سقم کے باب میں چونکہ راویوں

لے توجیہ النظر فی اصول الاثر ص ۱۱۶ (یہ قول دراصل علامہ ذہبی کا ہے، چنانچہ و تعدیل پر گفتگو کرتے ہوئے اس کا حوالہ علامہ ابن حجر نے اپنی شرح نخبہ الفکر میں دیا۔

عدالت اور ضبط دونوں کا لحاظ ہوتا ہے، اس لئے ان دونوں (عدالت و ضبط) کے درجات کے تفاوت کے لحاظ سے روائے کے اوزاع درجات نو تک پہنچتے ہیں۔

- ۱۔ عدالت اور ضبط دونوں میں اعلیٰ درجہ
- ۲۔ عدالت میں اعلیٰ درجہ اور ضبط میں متوسط درجہ
- ۳۔ عدالت میں اعلیٰ درجہ اور ضبط میں ادنیٰ درجہ
- ۴۔ ضبط میں اعلیٰ درجہ اور عدالت میں متوسط درجہ
- ۵۔ عدالت اور ضبط دونوں میں متوسط درجہ
- ۶۔ عدالت میں متوسط درجہ اور ضبط میں ادنیٰ درجہ
- ۷۔ عدالت میں ادنیٰ درجہ اور ضبط میں اعلیٰ درجہ
- ۸۔ عدالت میں ادنیٰ درجہ اور ضبط میں متوسط درجہ
- ۹۔ عدالت اور ضبط دونوں میں ادنیٰ درجہ

اسی لحاظ سے جرح و تعدیل کے بھی متعدد اور متفاوت درجات پیدا ہوتے ہیں  
یعنی عدالت اور ضبط دونوں پر جرح یا صرف عدالت پر جرح یا صرف ضبط پر جرح، پھر  
ہر ایک سے متعلق شدت اور نرمی کے لحاظ سے جرح کے مدارج و مراتب ہیں۔ علیٰ هذا  
القیاس تعدیل کے باب میں۔

۱۔ عدالت۔ یعنی مسلمان ہونا۔ عاقل و بالغ ہونا۔ اور ایسے ملکہ کا حامل ہونا جو تقویٰ اور  
مروت کا سبب بنا رہے۔ تقویٰ سے مراد شرک جلی و خفی اور فسق و بدعات سے پاک صاف ہونا  
ہے، اور مروت کا مطلب ہے تعصب کا نہ ہونا، ضد کا نہ ہونا اور وقار کا مالک ہونا۔ (شرح نخبۃ النظر)  
۲۔ ضبط یعنی قوت یا دداشت۔ اس کی دو قسمیں ہیں (۱) ضبط صدر، یعنی سنی ہوئی روایات  
کو اس طرح یاد رکھنا کہ بوقت ضرورت بلا تکلف اور بلا وقت ٹھیک ٹھیک دہرا سکے۔  
(۲) ضبط کتاب، یعنی مسومات کو لکھ بھی لینا اور ابتدائے سماع حدیث سے انتہائے ادانک ہر  
قسم کے تغیر و تبدل سے بچائے رکھنا۔ (شرح نخبۃ النظر)۔ ۳۔ توجیہ النظر و معیار الاعتدال۔

تفہیم مدارج کے لئے الفاظ | اس بنا پر تعدیل کے مراتب و مدارج کرنے کے لئے ائمہ فقہ نے متعدد داور

الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں، مثلاً تعدیل کے لئے اوثق الناس - ثقة ثقة - ثقة حجة حجة - حافظ عالم - ثقة - متقن - صدوق - مامون - لایا۔ وغیرہ کہ ان الفاظ اور فقروں سے تعدیل کے درجات کا تفاوت باسانی سمجھ میں آجائے مثلاً کسی راوی کے بارے میں اوثق الناس کا فقرہ استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے اور ضبط دونوں میں اعلیٰ درجہ کا مالک ہے اور ثقة ثقة کے الفاظ استعمال کرنے یہ ہے کہ راوی کا مرتبہ درجہ اول کے راوی سے کم ہے، و علیٰ ہذا القیاس۔

اسی طرح جرح کے اظہار کے لئے متعدد اور مختلف الفاظ استعمال ہوتے ہیں اکذب الناس - کذاب - فیہ ضعیف - فیہ لین - فیہ جھالہ - لیس لیس بشی - لایکتب حدیثہ وغیرہ کہ ان الفاظ اور فقروں سے جرح کے تفاوت باسانی سامنے آجاتا ہے، مثلاً کسی راوی کے بارے میں اکذب الناس کا مطلب یہ ہے کہ دعوے کوئی گویا اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، اور کسی کے بارے فیہ ضعف کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عدالت اور ضبط دونوں میں مذکورہ اد سے بھی گرا ہوا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ ایک اہم بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ائمہ فقہ نے کہا۔ تعدیل پر مقدم ہے، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ جرح کی وجوہ معلوم اور مستند ہو اگر جرح کے اسباب و وجوہ معلوم نہ ہوں یا مستند نہ ہوں تو تعدیل مقدم ہے ناجائز جرح مقبول نہیں، نیز صرف ایک محدث کی جرح یا صرف ایک کی تعدیل کافی نہیں ہے۔  
ضبط و حفظ پر جرح کے اسباب و وجوہ | راویوں کے ضبط و حفظ پر جرح کے ذیل اسباب و وجوہ ہیں -۱-

۱۔ غلطی۔ یعنی راوی اپنے ضبط و حفظ میں کمی کے سبب روایت میں غلطی اور بکثرت غلطی کرے، ایسے راوی کی روایت کو منکر کہتے ہیں۔

۲۔ غفلت۔ یعنی راوی کے ضبط و حفظ میں کمی اُس کی غفلت و بے توجہی کا نتیجہ ہو۔ ایسے راوی کی روایت کو بھی منکر کہتے ہیں۔

۳۔ فریم۔ یعنی راوی میں وہم پایا جاتا ہے اور اس کے وہمی ہونے کی بنا پر اس کے ضبط و حفظ میں کمی آگئی، ایسے راوی کی روایت معطل کہلاتی ہے۔

۴۔ سوء حفظ۔ یعنی راوی نسیان اور حافظہ کی خرابی کا شکار ہو گیا۔ اگر سوء حفظ لازم ہے، یعنی مستقل طور پر حافظہ نے جواب دے دیا ہے تو ایسے راوی کی روایت شاذ کہلاتی ہے اور اگر سوء حفظ اُسے لازم نہیں ہے بلکہ کبھی کبھار ہوتا ہے تو اس کی روایت غلط کہلاتی ہے۔

۵۔ مخالفت ثقات۔ راوی کا کسی روایت میں ایسی بات کرنا جو دوسرے ثقات کی بیان کردہ اُس روایت کے خلاف ہو، اس کی متعدد صورتیں ہیں۔

•۔ مدرج الاسناد۔ سلسلہ سند میں کچھ بڑھا دیا گیا۔

•۔ مدرج المتن۔ متن حدیث میں کوئی زیادتی کر دی گئی ہے۔

•۔ مقلوب۔ متن حدیث کے الفاظ میں تقدیم و تاخیر کر دی جائے۔ مثلاً روایت

میں جس جگہ جھوٹے دہاں خفی کہہ دیا گیا اور جہاں خفی ہے دہاں جھوٹ کہہ دیا گیا،

یا سند کے اسار میں تقدیم و تاخیر کر دی جائے۔ مثلاً قرۃ بن کعب کو کعب بن

قرۃ کہہ دینا۔

•۔ مضرب۔ کسی مقام پر تبدیلی ہے، لیکن کوئی مخرج نہیں ہے۔

•۔ مصحف۔ متن یا سند کے کسی کلمہ کے نقطہ میں تغیر کر دیا جائے اور

صورۃ الخط باقی رہے۔ مثلاً ابن مراحم کو بعض نے ابن مزاحم



کہہ دیا ہے۔

• تحریف۔ متن یا سند کے کسی کلمہ کا اعراب بدل دیا جائے اور  
باقی رہے۔ مثلاً عقیل کا تلفظ عقیل سے کرنا۔

واضح رہے کہ کسی راوی کو اس کے ضبط و حفظ کی بنا پر مجروح قرار دینے کے لئے  
نہیں کہ اس میں یہ سارے اسباب و وجوہ پائے جائیں، بلکہ ان میں سے کسی ایک کا بھی  
اُس کے مجروح ہونے کے لئے کافی ہے۔

عدالت پر جرح کے اسباب و وجوہ | رہے عدالت پر جرح کے اسباب و وجوہ  
انہی میں سے پانچ بیان کئے ہیں۔

۱۔ کذب۔ یعنی راوی اپنی بیان کردہ روایت میں کذب کا مرتکب ہوا۔ ایسے  
عدایت موضوع کہلاتی ہے۔

۲۔ اتہام کذب۔ یعنی راوی کا اس روایت میں تو کذب ثابت نہ ہوا جو اس نے یہ  
ہے، مگر دوسرے معاملات میں اُس پر دعوے کوئی کا الزام و اتہام ہے۔  
راوی کی روایت متروک کہلاتی ہے۔

۳۔ فسق۔ یعنی راوی گناہ کبیرہ کا مرتکب پایا گیا یا گناہ صغیرہ کا بار بار ارتکاب کرتا رہا۔  
ایسے راوی کی روایت کے لئے بھی مکر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ جہالت۔ یعنی راوی کا اپنے نام یا حالات کے لحاظ سے نامعلوم ہونا۔ ایسے راوی  
مبہم کہلاتی ہے۔

۵۔ بدعت۔ یعنی کسی ایسے عقیدے کا اختیار کرنا جو کتاب و سنت کے خلاف ہے  
ایسے عمل کو عبادت قرار دے دینا جس کی کوئی اصل کتاب و سنت میں  
راوی کی روایت مُبتدع کہلاتی ہے۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ ۱۱۔ ۱۲۔ ۱۳۔ ۱۴۔ ۱۵۔ ۱۶۔ ۱۷۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۲۰۔ ۲۱۔ ۲۲۔ ۲۳۔ ۲۴۔ ۲۵۔ ۲۶۔ ۲۷۔ ۲۸۔ ۲۹۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۲۔ ۳۳۔ ۳۴۔ ۳۵۔ ۳۶۔ ۳۷۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۴۰۔ ۴۱۔ ۴۲۔ ۴۳۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۶۔ ۴۷۔ ۴۸۔ ۴۹۔ ۵۰۔ ۵۱۔ ۵۲۔ ۵۳۔ ۵۴۔ ۵۵۔ ۵۶۔ ۵۷۔ ۵۸۔ ۵۹۔ ۶۰۔ ۶۱۔ ۶۲۔ ۶۳۔ ۶۴۔ ۶۵۔ ۶۶۔ ۶۷۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۰۔ ۷۱۔ ۷۲۔ ۷۳۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۶۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔ ۸۰۔ ۸۱۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔ ۸۷۔ ۸۸۔ ۸۹۔ ۹۰۔ ۹۱۔ ۹۲۔ ۹۳۔ ۹۴۔ ۹۵۔ ۹۶۔ ۹۷۔ ۹۸۔ ۹۹۔ ۱۰۰۔

بدعت کی دو شاخیں ہیں۔ (۱) کا قرآنہ بدعت۔ یعنی اختیار کیا ہوا وہ عقیدہ یا بطور عبادت کیا جانے والا وہ فعل و عمل جو نصوص قطعیہ کے صریحاً خلاف ہو۔  
(۲) قاسقانہ بدعت۔ جو نصوص قطعیہ کے صریحاً خلاف نہ ہو۔

یہاں یہ بات بھی مد نظر رہے کہ عدالت کے لحاظ سے کسی راوی کے مجروح ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں یہ سارے اسباب و وجوہ پائے جائیں بلکہ ان میں سے کسی ایک کا بھی پایا جانا اس کے مجروح ہونے کے لئے کافی ہے۔

**ماحصل** | اب ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ محدثین جو کسی روایت کے متعلق صحیح، حسن، شاذ، مقلد یا متروک وغیرہ کہتے ہیں، تو اس سے ان کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ مطلب یہ ہوتا ہے کہ راویوں کی عدالت اور ان کے ضبط کے پیش نظر روایت کا یہ مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔ مثلاً وہ جب کہتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے تمام رواۃ اپنی عدالت اور اپنے ضبط کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کے مالک ہیں (اور سند متصل ہے) یا مثلاً وہ جب یہ کہتے ہیں کہ یہ روایت متروک ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے کسی راوی پر کذب کا الزام و اتہام ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاسی اور راویوں کے متعلق اس قسم کی تمام باتیں اُس ریکارڈ میں محفوظ ہیں۔ جس کو ”اسماء الرجال“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اور جس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔

**ضرورت و اہمیت** | رہی یہ بات کہ اس جرح و تعدیل کی ضرورت و اہمیت کیا ہے؟ وہ کون سے اسباب تھے جن کی بنا پر محدثین کرام کو راویوں کے حالات کی چھان بین کے لئے مکر بستہ ہونا پڑا اور اس انتہائی مشکل کام کے لئے سیکڑوں محدثین نے اپنی عمریں صرف کر دیں۔ ایک لیک شہر گئے، راویوں سے ملے، اُن کے پڑوسیوں سے ملاقاتیں کیں، اُن کے حلقہ تعارف سے رابطہ پیدا کیا اور جو رواۃ زندہ نہ تھے، اُن کے دیکھنے والوں اور اُن کے حالات و خصائل سے واقفیت رکھنے والوں سے معلومات

حاصل کیں اور اس طرح راویان حدیث کی بچی زندگی، ان کے مجلسی طور طریقوں اور سرگرمیوں کی بابت مکمل معلومات بہم پہنچائیں حالانکہ یہ کوئی خوشگوار کام نہیں ہوتا اخلاق و کردار کے ایک ایک جزئیہ اور ان کے ظاہر و باطن سب کو کر دیا جا۔ یہ کہ یہ کوئی خوشگوار کام نہیں ہے بلکہ بظاہر اس عانت کے خلاف بھی معلوم ہے جستجس اور تدابیر کی بابت دی گئی ہے۔

تو بات یہ ہے کہ وضع احادیث کے فتنے کے بعد دو ہی لاپیں تھیں۔ وضائیں کی ناملاد کو ششوں کے سامنے سپرد دل دی جاتی اور یہ اعلان کر دیا جاتا کہ چو ڈیبر میں بہت سے سنگیزے مل گئے ہیں اس لئے یہ تمام سرمایہ کسی قدر و قیمت کا کسی شمار کے قابل نہیں اور احادیث کا سارا ذخیرہ ناقابل اعتبار و استناد ہے اور کو چاہئے کہ وہ احادیث و سنن سے بالکل قطع تعلق کر لے بلکہ سب کو دور یا برد کر دے ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ایک نامعقول بات بھی ہوتی اور دین کو سخت نقصان والی بلکہ اس کے انہدام کی موجب بھی ہوتی۔ نامعقول بات تو اس لئے ہوتی کہ رکھنے والا کوئی شخص ہیروں کی اس پوری مقدار کو اٹھا کر پھینک دینے کی احتمالہ حرکت کرے گا جس میں کچھ مصنوعی اور نقلی ہیروے مل گئے ہوں، بلکہ اس کی روش یہ ہوگی خود ہیروں کی پرکھ رکھتا ہے تو ان نقلی ہیروں کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دے گا جو اس میں مل گئے ہیں، اور اگر وہ خود پرکھ نہیں رکھتا تو معتد صرفوں سے اس کے لئے مدد دے دین کے لئے سخت نقصان دہ اس لئے ہوتا کہ حدیث و سنت دین کا ایک سرچشمہ دینی سند و حجت ہے۔ اتباع رسول، اطاعت رسول اور اسوۂ رسول کی پیروی ہے۔

لَا تَحْشَسُوا وَلَا تَحْشَسُوا ..... وَلَا تَدَابِرُوا وَلَا تَوَاعِبُوا اللَّهُ انْهَوْنَا  
یعنی کسی کی مخفی حالت کی گردن نہ کرو اور نہ عیب جوئی کرو ..... اور نہ پیچھے پیچھے  
برائی بیان کرو اور اسے اللہ کے بندو، بھائی بھائی بن کر نہ ہو۔ اور ترمذی میں یہ روایت ہے کہ  
اذیت نہ پہنچاؤ اور نہ ان کو کسی عیب و معصیت کا ہدف بنا کر ذلیل و تشریف نہ کرو اور نہ ان کی عیب جوئی نہ

ہو کر محض قتل کے بل بوتے پر نہ قرآن پر عمل ممکن ہے اور نہ ایسا عمل اسلام کو مطلوب اور عند اللہ معتبر ہے۔

اس لئے ضروری تھا کہ جعلی احادیث و روایات کی مکھیوں کو صحیح احادیث کے دودھ سے نکال کر پھینک دیا جائے اور یہی وہ دوسری راہ تھی جو وضع احادیث کے فتنے کے بعد اس کے انسداد کے لئے اختیار کی گئی۔

رہی تجسس اور تدابیر والی بات، تو معاملہ چونکہ دین کا تھا، رسولؐ اور رسولؐ کے ارشادات اور رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کا تھا اور امت کی اصلاح اور ملت کی بقا کا تھا، اس لئے اس داعیہ، اس مقصد اور اس نقطہ نظر سے خلوص نیت کے ساتھ، دین کی خیر خواہی اور حفاظت کی غرض سے یہ کام کرنا اس ممانعت کی زد میں نہیں آتا، جو تجسس اور تدابیر کی بابت دی گئی ہے۔ لذت نفس کی خاطر جو عیب چینی کی جائے، یا معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا کرنے یا کسی کی ذاتی تذلیل و رسوائی کی نیت سے جو تجسس اور تدابیر ہو وہ ناپسندیدہ اور ممنوع ہے۔ چنانچہ محدثین کرام اور ائمہ رجال نے یہی جواب دیا تھا، جب ان کے سامنے تجسس اور تدابیر کی ممانعت کے قبیل کی باتیں کی گئیں۔ مثلاً

• — ابو بکر بن خالد نے ایک مرتبہ یحییٰ بن سعید القطان سے کہا کہ :-

لے نہ صرف یہ کہ اس ممانعت کی زد میں نہیں آتا بلکہ قرآن و حدیث کی رو سے دین اور اس کے نظام کو فساد اور بگاڑ سے محفوظ رکھنے کے لئے اہل علم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ یہ کام کریں مثلاً ارشادِ الہی ہے کہ اِذَا جَاءَ كُفْرًا فَاِنتَهِ فَاِتْهِمُوا۔ یعنی جب کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔ اور ارشادِ رسولؐ ہے کہ ”قاجر کا خطرہ کب تک مول لیتے رہو گے، اس کو بے پردہ کر دو، تاکہ لوگ اس سے چوکتے ہو جائیں اور اس سے بچیں“۔ پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ ”عبداللہ ایک صالح شخص ہیں۔ بنیادی طور پر تعدیل ہی تو ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک شخص کے متعلق یہ فرمان کہ ”اپنے قبیلے کا بڑا انسان ہے“ بنیادی طور پر جرح ہے۔ نیز خلقانہ لاشدین اور دوسرے بہت سے صحابہ نے روایت اور شہادت کے باب میں جرح و تعدیل کی ہے۔

”کیا آپ کو اس بات کا خطرہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کی روایات آپ نے ترک کر دی ہیں، وہ کل قیامت کے دن عدالت الہی میں آپ کے مدعی بنیں؟“

یحییٰ بن سعید القطان نے جواب دیا کہ ۱۔

”اُن کا مدعی ہونا اور مجھے اُن کا مدعا علیہ بننا منظور ہے اور پسند ہے۔ برنسبت اس کے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدعا علیہ بنوں اور وہ میرا گریبان پکڑیں اور فرمائیں کہ میری حدیث سے کذب کو دور کیوں نہیں کیا؟“

۲۔ ابو تراب نخشی نے امام احمد بن حنبل سے ایک مرتبہ کہا کہ ۱۔

”علماء کی غیبت اور عیب جوئی نہ کیا کیجئے“

انہوں نے جواب دیا کہ ۱۔

”وَمِنْكَ، هَذَا نَصِيحَةٌ، لَيْسَ هَذَا عَيْبَةٌ“

(افسوس ہے تم پر، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ نصیحت ہے، دین کی غیر خواہ

ہے، یہ غیبت نہیں ہے)۔

۲۔ عبد اللہ بن مبارک سے ایک صوفی منش بزرگ نے ایک مرتبہ کہا کہ ۱۔

”غیبت اور عیب جوئی کرتے ہو؟“

انہوں نے جواب دیا کہ ۱۔

”آپ تو چپ ہی رہتے، جب کہ آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ اگر لوگوں کی تحقیق نہ کی جائے تو حق و باطل کے درمیان تمیز کیسے ہوگی اور ہم حق کو باطل سے کس طرح پہچان سکیں گے؟“

سارے رخنے بند کئے گئے | یہ بات پہلے اشارتاً بیان کی گئی ہے کہ جرح و تعدیل وضع احادیث کی انسدادی تدبیروں میں ایک نہ

اور عظیم تدبیر تھی، جو محدثین نے اختیار کی۔ لہذا مناسب ہے کہ وضع احادیث اور اس کی انسدادی تدابیر پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے، تاکہ جرح و تعدیل سے متعلق جو بات کہی گئی ہے، اس کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے۔

جہاں تک وضع احادیث کا تعلق ہے تو اس کا سراغ پانے کے لئے اس بدترین تحریک کی طرف اشارہ کافی ہے، جو حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری چند برسوں میں فتنہ پر داز غنامر نے چلائی تھی اور جس کے نتیجے میں خلیفہ راشد کی شہادت کے سانحہ سے امت مسلمہ دوچار ہوئی۔ اس تحریک کا سرغنہ عبداللہ بن سبا تھا۔ یہی ابن سبا وہ شخص ہے جس نے جعلی احادیث گھڑنے کی ابتداء کی، چنانچہ علامہ ابن حجر عسقلانی امام شعبی (متوفی ۳۳۸ھ) کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ:-

اول من کذب عبد اللہ بن سبا۔ سب سے پہلے جس نے جھوٹی حدیث گھڑی وہ عبداللہ بن سبا تھا۔

غرض خلافت راشدہ کے آخری دور ہی میں سہائیوں اور منافقوں نے مسلمانوں میں اختلاط و ارتباط پیدا کر کے اپنی مقصد ہماری کے لئے احادیث گھڑ کر پھیلائی شروع کر دی تھیں۔ لیکن اس وقت بہر حال صحابہ تھے، جن کا کسی فتنہ پر داز کے قول کو صرف کذب کہہ دینا ہی اُس کے ابطال کے لئے کافی تھا، پھر بھی انہوں نے فوراً اس کا نوٹس لیا اور امت مسلمہ کو یہ رہنمائی دی کہ کسی روایت کو قبول کرنے کے لئے راوی سے شہادت طلب کی جانی چاہیے، جس کی داغ بیل حضرت عمرؓ ڈال گئے تھے، اور دوسرا معیار یہ دیا کہ اسلامی کلیات اور اسلامی تعلیم کی روح سے جو احادیث مطابق ہوں، صرف انہی کو قبول کرنا چاہیے، اور قرآن جس نور و بصیرت اور حکمت و دانش کو آدمی میں پیدا کرتا ہے، اُس کے مخالف جو چیزیں ہیں، ان کو ترک کر دینا چاہیے، چنانچہ اس کی جانب حضرت علیؓ نے

اس طرح رہنمائی فرمائی کہ ۱۔

حدّثوا الناس بما یعرفون ودعوا  
ما ینکرون -  
لوگوں سے وہی حدیث بیان کرو جو ایسے امور  
موافق ہو، جن کو لوگ جانتے پہچانتے ہیں اور  
ان کے لئے نامانوس ہوں، ان کو چھوڑ دو۔

اور اس کی تشریح میں صاحب فتح الملہم یہ لکھتے ہیں کہ ۱۔

”یعنی مانوس، جانی پہچانی روایتوں کے جو موافق ہوں یا ان میں صحت  
کی نشانیوں اور سچائی کی علامات پائی جائیں۔“

اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے مشہور شاگرد علقمہ نے اس انداز میں بیان کیا  
”حدیثوں میں بعض حدیثیں ایسی ہیں کہ ان کی روشنی دن کی روشنی کی  
مانند پہچان لی جاتی ہے اور بعض ایسی ہیں جن کی تاریکی رات کی تاریکی جیسی ہے  
جس سے تم مانوس نہ ہو سکتے۔“

اور ربیع بن خثیم اس طرح سمجھاتے ہیں کہ ۱۔

”بعض حدیثیں ایسی ہوتی ہیں جن کی روشنی دن کی روشنی جیسی ہوتی  
ہے جس سے ہم ان (کی صحت) کو جان جاتے ہیں اور بعض ایسی ہوتی ہیں جن  
کی تاریکی رات کی تاریکی جیسی ہوتی ہے جس سے ہم ان (کے سقم) کو پہچان  
لیتے ہیں۔“

معروف و مانوس اور منکر و غیر مانوس باتوں میں تمیز کرنے کا یہ فکری و عقلی معیار  
بنیاد ہے جس پر آگے چل کر محدثین کرام نے ایک مستقل علم ”علم الدیۃ“ کی عاریت کمر  
یعنی عہد صحابہ کے بعد جب اسلام دشمن عناصر کی سرگرمیاں بڑھنے لگیں اور جعلی احادیث  
اشاعت کے باب میں ان عناصر کی ناپاک کوششیں تیز ہو گئیں تو ان کی کارستانیوں کے

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۲ بحوالہ تدوین حدیث - ۲۔ ملاحظہ ہو تدوین حدیث -

۳۔ ابن سعد ج ۶ ص ۱۲۹ بحوالہ تدوین حدیث - ۴۔ معرفۃ علوم الحدیث فقہ -

و اسناد کے لئے نقد احادیث کا باضابطہ اہتمام کنا پڑا اور اس کے لئے حضرت علیؓ وغیرہ صحابہ کرام کی دی ہوئی روشنی، یعنی متذکرہ بالا معیار کی رہنمائی میں دلالت اور اس کے اصول کی باضابطہ تدبیریں عمل میں آئی۔

یہ دلالت گویا وہ اندرونی شہادت ہے جس سے حدیث کے نفس مضمون پر بحث ہوتی ہے اور حدیث کے نفس مضمون کی تنقید و تنقیح کے لئے محدثین کرام نے دلالت کے اصول و ضوابط مقرر اور مدقون کئے۔

یہ اصول و ضوابط خطیب بغدادی، ابن الجوزی، حافظ ابوالسحاق، سخاوی اور ابن حجر عسقلانی اور دوسرے ائمہ فہن نے اپنے اپنے طور پر بیان کئے ہیں، اور ان سبھوں کو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بڑے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ) نے اپنی کتاب ”عمالہ نافہ“ میں جمع کر دیا ہے، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر وہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ جو نص قرآنی یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے اس طرح مخالف ہو کہ کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو۔

• جو شرعی اصول و قواعد یا عقل، یا حس و مشاہدہ یا مشہور تاریخی واقعہ کے خلاف ہو۔  
• جس کو تنہا ایک ہی شخص ایسے لوگوں سے روایت کر رہا ہو کہ ان کے دوسرے شاگرد

لے بلکہ بظرف غائر دیکھا جائے تو بقول مولانا شبلی نعمانی معلوم ہوگا کہ دراصل قرآن نے اس معیار کی رہنمائی کی ہے۔ وہ اس طرح کہ حضرت عائشہؓ پر جب بعض منافقین نے تہمت لگائی تھی تو قرآن نے حضرت عائشہؓ کی برائت و طہارت بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ وَلَوْ لَا ذَاکَ سَبَّحْتُمُوکَ قُلْتُمْ مَا یَکُونُ لَنَا انْ یَکْفَرَ بِهَذَا مِنْهَا شَیْءٌ هَذَا ابْنُ مَرْثَدٍ عَظِیْمٌ۔ یعنی جب تم نے سنا تو کیوں نہیں کہہ دیا کہ ہم کو ایسی بات بولنا روا نہیں، سبحان اللہ! یہ بہتان عظیم ہے۔ عام اصول کی بنا پر اس خبر کی تصدیق کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے کہنے والوں (راویوں) کے نام دریافت کئے جاتے، پھر دیکھا جاتا کہ وہ صحیح یا نہیں، پھر ان کی شہادت لی جاتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں فرمایا کہ سننے کے ساتھ ہی تم نے کیوں نہیں کہہ دیا کہ یہ بہتان عظیم ہے کیونکہ یہ ایسی منکر اور نامعقول بات تھی جو واضح طور پر روایت اعتبار کئے جانے کے قابل نہیں تھی (سیرۃ النبی ص ۱۰۷)۔



اس روایت کو بیان نہیں کرتے۔

• روایت ایسی ہو جس کا جانا اور جس پر عمل کرنا ہر مکلف پر فرض ہے مگر اسے تنہا ایک ہی شخص بیان کر رہا ہے۔

• روایت اپنے الفاظ کے لحاظ سے قواعد عربیہ پر پوری نہ اترتی ہو یا اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے نبوت کی شان اور وقار کے خلاف ہو۔

• روایت میں کسی کو کسی کام کے کرنے میں انبیاء کی طرح مستحق ثواب گردانا گیا ہو۔

• روایت معمولی باتوں پر بڑے بڑے انعامات کے وعدے یا ادنیٰ اسی بات پر سخت ترین عذاب کی دھمکی پر مشتمل ہو۔

• روایت اہل بدعت کے کسی عقیدہ و مذہب یا عمل کی ترہان یا اس کو تقویت پہنچانے والی ہو (بدعت کا اصطلاحی مفہوم پہلے گزر چکا ہے)۔

لیکن ان اصول و قواعد میں بعض قدر قیامیاں تھیں، مثلاً:-

۱۔ روایت کے معیار سے کام لینے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہ بات واضح ہو سکتی ہے کہ روایت کے اصول و ضوابط کی رو سے روایت غلط نہیں ہے، یعنی نفس مضمون پر کوئی جرح وارد نہیں ہوتی، لیکن یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اندرونی شہادت یا قرآن کی شہادت پر کوئی جرح وارد نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حدیث واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو کیونکہ نہ ہر جھوٹی بات نامعقول ہوتی ہے اور نہ ہر معقول بات کا ارشاد رسول ہونا ضروری ہے۔ ایک ایسی گھڑی ہوتی بات ہو سکتی ہے، جو ہر لحاظ سے معقول ہو، قرآن کے خلاف بھی نہ ہو، اس و مشاہد یا مشہور تاریخی واقعات کے بھی مخالفت نہ ہو، اور اس پر ان اصول و ضوابط کے کسی پہلو سے زد نہ پڑ رہی ہو اور کوئی فتنہ پرور اسے رسول کی طرف منسوب کر دے۔ اسی طرح ایک ایسی صحیح بات بھی ہو سکتی ہے، جو بجائے خود تو گھڑی ہوئی اور جھوٹی نہ ہو اور انتہائی معقول بھی ہو، لیکن وہ حدیث رسول نہ ہو بلکہ مثلاً کسی کا کوئی حکیمانہ قول ہو، مگر اسے رسول کی طرف منسوب

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو تدوین حدیث اور معرفۃ علوم الحدیث، نوع ۱۹۔

کر کے بیان کیا جائے۔ اب اگر صرف اندرونی شہادت اور درایت کے اصول و ضوابط پر پورا اتنا ہی کسی روایت کو حدیث رسول قرار دینے کے لئے کافی ہو تو مذکورہ دونوں طرح کی باتیں حدیث رسول قرار پا جائیں گی، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوگی۔

۲۔ درایت کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہوئے انہی روایات کے مضامین کی صحت و سقم کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، جن کا تعلق عالم حوادث و واقعات کے ساتھ ہو لیکن دینی امور میں بہت سے ایسے مراحل بھی آتے ہیں، جہاں بات غیب میں چلی جاتی ہے، تو پھر درایت کے معیار پر پرکھ کر غیب میں شریک ہو جانے والے مضامین روایات کی جانچ کی شکل کیا ہو سکتی ہے۔

۳۔ اس معیار کا استعمال کوئی آسان کام بھی نہیں، کیونکہ اس معیار کی نوعیت یہی تو ہے کہ چند کلی اصول و ضوابط بنا دیئے گئے ہیں، جن کی روشنی میں حدیث کے مضمون کی صحت و سقم کے بارے میں فیصلہ کیا جاتا ہے، لیکن:-

نہ ہر کسر برتر اشد قلندری داند

یعنی اس کے استعمال کا صحیح سلیقہ انتہائی دشوار ہے۔ اس کے لئے بے انتہا مشق و مزاوت اور تجربہ و مشاہدہ کی ضرورت ہے، جس طرح طب، کہ اس کے ذریعہ سے انسان تشخیص امراض کے کلی علامات و آثار اور اسباب و علل سے واقف ہو جاتا ہے، مگر محض طب جان لینے سے آدمی عاذق طبیب نہیں بن جاتا بلکہ تشخیص امراض میں درک و جہارت کے لئے نہ جانے کتنے پا پڑیلینے پڑتے ہیں۔

اس طرح درایت کے معیار پر عمل کرنے سے کا حق عہدہ برآ ہونا دشوار بھی تھا اور یہ معیار اپنی بعض قدرتی خامیوں اور غلا کی وجہ سے احادیث کی تنقید و تنقیح کے لئے کافی بھی نہ تھا، اس لئے ناگزیر تھا کہ محدثین کرام جعلی روایات کے سارے پھر دروازوں کو بند کرتے۔

لے چنانچہ بعض اسلام دشمن واضعین حدیث نے اپنی انفرادی بات کو حدیث رسول بنا کر ان دونوں پھر دروازوں سے رخصت کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

اس بنا پر روایت کے لئے سند حدیث کا بیان کرنا ایک لازمی اور اہم شرط قرار دی گئی اور یہ التزام کیا گیا کہ بیان کی جانے والی ہر روایت یا اخذ کی جانے والی ہر روایت سند کے ساتھ بیان اور اخذ کی جائے۔

پھر سند کے ساتھ حدیث روایت کئے جانے کی اس پابندی کا یہ مطالبہ اور تقاضا تھا کہ رواۃ حدیث کے حالات و سوانح کی چھان بین کی جائے، ورنہ پھر سند حدیث کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا اور خاتمہ پُری کے لئے زید، عمرو، بکر کا ایک سلسلہ بنا کر دکھایا جاسکتا تھا، اور بعض عیاروں نے ایسا کرنا بھی چاہا تھا، لیکن ان کی چل نہ سکی۔

لہذا راویوں کے اخلاق و کردار کے ایک ایک گوشے کی انتہائی احتیاط اور دیدہ وری کے ساتھ تحقیق و تفتیش کی گئی، اور سینکڑوں محدثین نے اپنی عموس اس کمشن کام کے لئے وقف کر دیں اور جانکاہ مشقتیں اٹھا کر ایک ایک گاؤں، ایک ایک شہر، ایک ایک قریہ گئے، دانہ دانہ جمع کیا یہاں تک کہ اسماء الرجال کا وہ عظیم الشان فن مدون ہو گیا، جس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ اس حیرت انگیز کارنامہ کو دیکھ کر آج اغیار تک یا عرفین کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ:-

”کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو، جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کے پورے پورے حالات معلوم ہو سکتے ہیں“

(ڈاکٹر اسپرنگر - جرمن مستشرق)

یہی ”اسماء الرجال“ وہ ریکارڈ ہے جس میں راویوں کی وہ ساری صفات و خصوصیات کافی تحقیق و تفتیش کے بعد درج اور محفوظ کر دی گئی ہیں، جن سے اُن کی بیان کردہ روایتیں متاثر ہو سکتی ہیں۔ اسی ریکارڈ کی بنا پر راوی کے معتبر یا نامعتبر، ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس فیصلے کے بعد روایت کی جو نوعیت متعین ہوتی ہے اور جس درجہ میں شریک ہونے کا وہ حق حاصل کرتی ہے، اسی درجہ میں وہ روایت جگہ پاتی ہے۔

اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ سند اور کیفیت رواۃ کے لحاظ سے محدثین نے احادیث کے

مختلف درجات قائم کئے ہیں، کسی کو متصل کہا جاتا ہے، کسی کو مرسل اور منقطع۔ کسی کے لئے صحیح کی اصطلاح ہے، کسی کو حسن کہتے ہیں، اور کوئی ضعیف کے شمار میں آتی ہے، پھر کوئی صحیح لذات ہے، کوئی صحیح بغیرہ، کوئی حسن لذات ہے اور کوئی حسن بغیرہ۔ اسی طرح ضعیف کی مختلف شاخیں پھوٹی ہیں، کسی کا نام مقل ہے، کسی کو شاذ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، اور کوئی منکر کہلاتی ہے۔

## تالیفات

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ صحابہ کی بابت قرآن شہادت دیتا ہے کہ **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلْعَالَمِينَ** (تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے میدان میں لائی گئی ہے) اور ”خیر امت“ بھی کیسے؟

..... وَلَٰكِنَّ اللَّهَ حَبِيبٌ إِلَىٰكُمْ  
الَّذِينَ آمَنُوا وَتَتَىٰ لَهُ فِي قُلُوبِكُمْ  
وَكَثْرَةٌ مِّنْكُمْ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ  
وَالْعُصْيَانَ (الحجرات)

..... لیکن اللہ نے تمہارے (صحابہ) لئے ایسا  
کو محبوب بنا دیا ہے، اور اس (ایمان) سے  
تمہارے دلوں کو مزین کر دیا ہے اور کفر و  
فسق اور معصیت سے تمہیں متنفر کر دیا ہے۔

یہی نہیں بلکہ قرآن نے صحابہ کرام کو یہ دستاویز صدق و مصفا بھی عطا فرمایا ہے کہ **رَضُوا** اللہ عنہم ورضوا عنہ۔ اس لئے صحابہ کرام کے بارے میں امت مسلمہ کا بالاتفاق یہ فیصلہ ہے کہ الصحابة كلهم عدول صدوق (سارے صحابہ عدالت اور صداقت کا منصب رکھتے ہیں) اس بنا پر ظاہر ہے کہ اس علم (جرح و تعدیل) کے حیطہ عمل میں وہ (صحابہ) آتے ہی نہیں، لہذا لامحالہ اس علم کی کارفرمائی کا آغاز دو مرتبہ تابعین سے ہونا چاہئے تھا اور یہی ہوا۔ لیکن واضح رہے کہ جرح و تعدیل سے صحابہ کا بالاتر ہو نا ایک الگ بات ہے، لیکن بجائے خود اسامہ الرجال کی تدوین میں ان کے حالات و سوانح سے غفلت نہیں برتی گئی ہے، بلکہ ان کے حالات و سوانح پر مشتمل تالیفات بھی کی گئی ہیں۔

ویسے تو بہت سے تابعین تھے جن کی رائے جرح و تعدیل کے باب میں موثق مانی جاتی ہے، مگر دوسری صدی ہجری کے آخری زمانے میں خاص طور پر اس کی طرف توجہ ہونا

لگی اور متعدد محدثین تنقید رجال کے لئے اٹھے اور علامہ طاہر الجزائری کی تحقیق کے مطابق سب سے پہلے جرح و تعدیل کے فن میں یحییٰ بن سعید القطان (متوفی ۱۹۸ھ) نے ایک کتاب لکھی، لیکن علامہ سخاوی (متوفی ۷۹۰ھ) کے افادات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان سے پہلے متعدد ارباب علم و فضل نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا، مثلاً شعبۂ بن الحجاج متوفی ۱۹۸ھ، حماد بن سلمہ متوفی ۱۶۱ھ اور عبد اللہ بن المبارک متوفی ۱۸۱ھ وغیرہ۔ ان دونوں باتوں میں تطبیق اس طرح دی جاسکتی ہے کہ صاحب توجیہ النظر کی منشا یہ ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان نے سب سے پہلے اس فن کو تدوینی شکل دے کر باضابطہ ایک مستقل اور مدوں کتاب اس فن میں لکھی اور ان سے پیشتر کی تالیفات کی نوعیت باضابطہ تدوین کی نہیں تھی بلکہ وہ قلمی یادداشت کی حیثیت رکھتی تھیں۔

غرض یحییٰ بن سعید القطان کے بعد دوسرے بہت سے محدثین نے تالیفات کیں، مثلاً ابو داؤد طیالسی متوفی ۲۴۰ھ، محمد بن سعد (صاحب طبقات) متوفی ۲۴۰ھ، یحییٰ بن معین متوفی ۲۴۳ھ اور امام احمد بن حنبل متوفی ۲۴۱ھ وغیرہ۔ پھر جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھا گیا تالیفات کا دائرہ پھیلتا گیا اور بے شمار محدثین نے بے شمار کتابیں تالیف کیں، مثلاً امام بخاری متوفی ۲۵۶ھ امام مسلم متوفی ۲۶۱ھ، احمد بن عبد اللہ العجلی متوفی ۲۴۱ھ، ابو زرعة متوفی ۲۶۱ھ، ابو حاتم متوفی ۲۴۵ھ، امام ترمذی متوفی ۲۷۹ھ، ابن خزمہ متوفی ۳۱۱ھ، محمد بن عمر والقیلی متوفی ۳۲۲ھ، ابن ابی حاتم متوفی ۳۲۷ھ، ابن جہان متوفی ۳۵۲ھ اور ابن عدی متوفی ۳۶۵ھ وغیرہ۔

ان میں سب سے زیادہ مشہور اور جامع کتب ابن عدی اور ابن ابی حاتم کی ہیں۔ ان کے علاوہ اسرار الرجال اور طبقات سے متعلق چند مشہور کتابیں یہ ہیں:-

- ۱۔ طبقات (ابن سعد)
- ۲۔ تذکرۃ الحفاظ (علامہ ذہبی متوفی ۷۴۸ھ)
- ۳۔ میزان الاعتدال (علامہ ذہبی)
- ۴۔ تہذیب التہذیب (علامہ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ)
- ۵۔ لسان المیزان (علامہ ابن حجر عسقلانی)

۱۔ توجیہ النظر ص ۱۱۳ - ۲۔ الاعلان بالتواریخ لمن ذم التاريخ ص ۳۳۹ - ۳۴۱  
۳۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو علامہ سخاوی کی کتاب "الاعلان بالتواریخ لمن ذم التاريخ" ص ۳۳۸ - ۳۴۰

# شاہ ولی اللہؒ کی ایک نمایاں خصوصیت - تطبیق

سیدنا

یوں تو شاہ ولی اللہ صاحبؒ بے شمار خوبیوں کے مالک تھے اور قدرت کی جانب سے بہترین دل و دماغ اور فہم و بصیرت لے کر آئے تھے۔ اور ان صلاحیتوں سے کام لے کر آپ نے دین و ملت کی جو عظیم القدر خدمات انجام دیں، اُن کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ آپ کی تصانیف بے شمار ہیں اور تقریباً ہر موضوع پر ہیں۔ آپ کی تعلیمات اور تہنیتات کا دائرہ نوع انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ ہر موضوع پر آپ نے ان گنت عقلی و نقلی شواہد فراہم کئے ہیں اور جس مسئلہ کو لیا ہے اس کے افہام و تفہیم میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ آپ کی تصنیف فیوض الہیہ سے یہ اندازہ بہ خوبی ہو سکتا ہے کہ کس طرح مشیت نے آپ کو مسلمانوں کی اصلاح حال پر مامور فرمایا۔ اور یہ اسی تائید الہی کا فیض تھا، جس نے آپ کو اس قدر وسعت نظر بخشی۔ یہ وسعت نظر شاہ صاحبؒ کی ایک نمایاں خصوصیت ہے جس سے کام لے کر آپ نے کئی مختلف فیہ مسائل اور مقصود مگر وہوں کے درمیان تطبیق اور اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوشش فرمائی۔

مثال کے طور پر مسئلہ نسخ کو لیجئے، یہ ایک مسئلہ تھا جس کے حل کرنے میں علماء کرام

صدیوں سرگرداں رہے اور منسوخ آیات کا شمار بڑھتے بڑھتے پانچ سو تک پہنچ گیا۔ علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے منسوخ آیات کی روز افزوں تعداد سے گھبرا کر اور عام مسلمانوں کی زندگی پر اس کے جو غلط اثرات پڑ رہے تھے، اُن سے پریشان ہو کر بڑی تحقیق و تحقیق کے بعد منسوخ آیات کی تعداد گھٹا کر صرف انیس<sup>۱۹</sup> رہنے دی۔ لیکن بات پھر بھی نہیں بنی کیونکہ قرآنِ مکیم میں نسخ تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اکثر آیات اور احکامات کو دوسری آیات و احکامات کے ذریعہ منسوخ قرار دیا جاسکتا ہے۔ آخر کار شاہ صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا اور بڑی عمدگی سے یہ بات ثابت کر دی کہ قرآنِ کریم میں نسخ سرے سے ہے ہی نہیں۔ گو مصلحت وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا یہ نظریہ آپ نے فی الوقت واضح نہیں کیا۔ آپ کے سب سے بڑے شارح مولانا عبید اللہ سندھی نے آپ کے ارشادات کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بات صاف کر دی کہ آپ قرآنِ مکیم میں نسخ کے قائل نہ تھے کیونکہ جن پانچ آیتوں میں آپ نسخ تسلیم کرتے ہیں، اگر آپ کے طریقے کے مطابق اُن کی تفسیر و تاویل کی جائے تو اُن کا حل بھی کچھ ایسا دشوار نہیں۔ مذکورہ پانچ آیتوں میں سے ایک آیت کریمہ اِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمْ الْمَوْتُ (کی تاویل خود مولانا سندھی کا ذاتی تجربہ ہے جس کی رو سے اُن کے لئے اپنی غیر مسلم والدہ کے حق میں وصیت کرنے کی ایک صورت نکل آئی۔ فرماتے ہیں: گو مندرجہ بالا مثال میں ایک عمومی اور مطلق حکم کو خصوصی حالات کے تحت مقید کر دیا گیا ہے۔ تاہم اس کی کوئی ممانعت نہیں ہے اور اب میں اس آیت کو منسوخ قرار دینے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ مولانا سندھیؒ کے بیان کے مطابق باقی چار آیات کی تطبیق بھی نہایت آسان ہے۔ وہ یوں کہ یا تو نسخ آیت کو اولیٰ اور بہتر کے حکم کے ماتحت سمجھیں اور منسوخ کو غیر اولیٰ کے تحت رکھیں۔ یا یہ کہ ایک عزیمت پر دلالت کرتی ہے دوسری رخصت پر۔

۱۔ سیوطی۔ الاتقان۔ لے مولانا عبید اللہ سندھی۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۷۷ تا ۷۸۔

۲۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۷۷ تا ۷۸۔

۳۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۷۷ تا ۷۸۔

غرض نسخ شاہ صاحب کے نزدیک ایک اجتہادی امر تھا اور وہ اس میں متاخرین کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے۔ فرماتے ہیں:-

وفيها اختلافهم في النسخ والمحق عندی ان ذلك بالاجتهاد واستنباط.

اور فرماتے ہیں۔ صحابہ و تابعین نسخ ما استعمال می کردند بغیر معنی کہ مصطلح اصولیان

است و این باب واسع است و عقل را در آنجا جولانی هست و اختلاف را گنجا نشینے۔

اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ آیت ما من نسخ من ایه... خود کلام پاک کے نسخ پر دلالت کرتی ہے تو یہ بات فہم سے بالا ہوگی اور مسئلہ کو جتنا سلجھائیں گے وہ اور الجھتا چلا جائے گا۔ لیکن اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ پچھلی کتب ساویہ کے بعض احکامات کے بارے میں ہے تو پھر بات بالکل آسان ہو جاتی ہے اور کتنی خود بہ خود سلجھ جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہود پر اونٹ کا دودھ اور گوشت حرام کر دیا گیا تھا۔ جب کہ شریعت اسلامیہ میں یہ جائز اور مباح ہے۔ یا جس طرح اُن پر یوم سبت کی حرمت فرض کی گئی تھی جب کہ اسلام میں یوم جمعہ کو فضیلت بخشی گئی۔

اب سوال یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے واشکاف الفاظ میں نسخ سے انکار کیوں نہیں کیا۔ یا رائے عامہ کی مخالفت کرتے ہوئے یہ نظریہ کیوں نہیں قائم کیا کہ یہاں نسخ سے مراد دراصل پچھلی کتب ساویہ کے بعض احکامات ہیں۔ تو جن اصحاب نے شاہ صاحبؒ کی تصانیف کا بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یہ بات اچھی طرح جان سکتے ہیں کہ شاہ صاحب دینی اور قومی مصالح کا لحاظ رکھنا از بس ضروری سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ لحاظ اصلاحی کام کا ایک لازمی جزو ہے۔ ارتقاات میں رواسم کے باب میں انہوں نے اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ جب نئی شریعت آتی ہے، وہ پچھلے رسوم و رواج اور عقائد کو یکسر مٹو دینا بود نہیں کر دیتی بلکہ اُن کا جائزہ لے کر ان میں جو مثبت قسم کے رجحانات ہوتے ہیں، اُن کو جوں کا توں رہنے دیتی ہے اور جو منفی قسم کے رسوم اور رجحانات ہوتے ہیں، اُن کو پوری شدت اور طاقت سے نیست و نابود کر دیتی ہے اور جو رسوم و رواج مثبت اور منفی رجحانات کے بین بین ہوتے



ہیں، اُن کے منفی جزو کی اصلاح کر کے اُنہیں قائم رکھتی ہے۔ یہی طریقہ انبیاء کرام کا رہا۔ خود قرآن حکیم میں بھی اس حکمت علی سے کام لیا گیا ہے۔ حومت عمر کے احکامات اس کی تین مثال ہیں۔ پہلے ارشاد ہوتا ہے: **فِيهِمَا دِشْمٌ كَثِيرٌ وَمَنَافِعٌ لِّلنَّاسِ**۔ سا یہ بھی واضح کر دیا جاتا ہے کہ **دِشْمٌ كَثِيرٌ مِّنْ نَّفْعِهِمَا**۔ پھر رفتہ رفتہ جب قوم ایک خاص ترکیب کے مطابق تیار ہو جاتا ہے اور بہیمیت پر ملکیت غلبہ حاصل کر لیتی ہے۔ صاف طور پر روک دیا جاتا ہے۔

”يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْشَبُوا الْخَيْمَ وَالْمَيْسِرَ وَالْأَنْصَابَ وَالْأَزْلَاجَ مِنَ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوا لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ“

ہر وہ شخص جو غلوں میں دل سے قوم کی اصلاح کرنی چاہتا ہے، اسے یہی طریقہ کار کرنا چاہیے تاکہ دین حق زیادہ سے زیادہ پھیل سکے۔ اور لوگوں کے دل اُسے آسانی کے ساتھ کرنے پر مائل ہو جائیں۔ ہذا ان کی تمام تر رسوم و عقائد کو اک دم غلط کہنے کا نفسیاتی ایک اثر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بد دل ہو کر ایک سرے سے داعی کی بات ہی سننے انکار کر دیں اور اس طرح اپنا ہی نقصان کر بیٹھیں۔ نسخ کے باب میں شاہ صاحب بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور جو کچھ وہ مصلحت وقت کے پیش نظر صاف طور پر نہ کہ وہ اُن کے بعد آنے والوں نے سمجھا دیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کو حنفی طریقہ اختیار کرنے کی ہدایت کا کیونکہ جس ملک کے لوگوں میں وہ اصلاحی کام پر مامور ہوئے تھے، اُن کی اکثریت حنفی کی پیرو تھی۔ یہی معاملہ تفضیل شیعین کے بارے میں پیش آتا ہے۔ شاہ صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تفضیل کی طرف مائل ہیں لیکن اُنہیں ہدایت کی جاتی ہے وہ اسی طبع سے متاثر نہ ہوں۔ پس اسی طرح نسخ کے باب میں انہوں نے حکمت علی سے کام لے کر ہوئے تطبیق کی راہ سمجھا دی اور اجتہاد کا دروازہ کھول دیا تاکہ بعد میں آنے والے ان کے ذریعہ بات رفتہ رفتہ واضح ہو جائے۔

آیات قرآنی کے بعد احادیث کا مسئلہ آتا ہے۔ یہاں بھی بعض احادیث تاریخ

بعض منسوخ - ابن خلدون کے نزدیک ناسخ و منسوخ کی بحث علم حدیث کا اہم ترین اور صعب ترین حصہ ہے۔ اور امام زہری کا کہنا ہے کہ جس تحقیق نے فقہار کو تھکایا، اور عاجز کیا وہ یہ ہے کہ آنحضرت کی احادیث میں ناسخ کون سی حدیث ہے اور منسوخ کون سی؟ شاہ صاحب نے یہاں بھی اپنی غیر معمولی فہم و بصیرت سے کام لے کر مختلف احادیث میں فقہارانہ جہارت اور خوش اسلوبی سے تطبیق فرمائی ہے۔ شاہ صاحب کی تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جس تحقیق نے فقہار کو تھکایا اور عاجز کیا تھا۔ شاہ صاحب نے کس خوبی سے اسے سلجھایا۔ مثال کے طور پر حضورؐ کی وہ حدیث کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے ملک پر حملہ آور ہوگا وہ مغفور ہے۔ اور اس لشکر کا سپہ سالار یزید بن معاویہ تھا۔ اب حضورؐ کے اس فرمان اور یزید کی بد اعمالیوں کی مزا کے متعلق حضورؐ کے ارشادات گرامی کے درمیان تضاد واقع ہو گیا۔ مذکورہ حدیث کو صحیح ماننے کی صورت میں (اور نہ ماننے کی کوئی وجہ بھی نہیں) یزید کو یقینی طور پر جنت کا متحق ماننا پڑتا ہے اور اگر اس کی بد اعمالیوں کے باعث جن کی تاریخ گواہ ہے) اور حضورؐ کے ان ارشادات کی روشنی میں اس کو دوزخی یا گنہگار قرار دیتے ہیں تو لازمی طور پر حدیث کا انکار لازم آتا ہے۔ مدتوں یہ مسئلہ زیر بحث رہا اس پر خوب خوب معرکہ آلائیاں ہوئیں لیکن حل کوئی نہ پیش کر سکا۔ آخر شاہ صاحب نے مسئلہ زیر بحث کو بڑی خوبی سے یہ کہہ کر حل کر دیا کہ جہاد ماضی کے گناہ دھو تا ہے۔ مستقبل کے گناہوں یا اعمالوں کو جو نہیں کرتا۔ یزید سے بعد میں جو گناہ سرزد ہوئے ان کا حساب کتاب اور جزا و جزا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہے۔

اس طرز پر ناسخ و منسوخ احادیث کے بارے میں شاہ صاحب کے تمام کام کا اندازہ

لگایا جاسکتا ہے۔

جہاں تک فقہ کا تعلق ہے، اس میں بھی مختلف مکاتب فکر سے وابستہ لوگوں کے

تصحب اور تنگ نظری نے اپنا رنگ جار رکھا تھا۔ ابتداء یہ صرف مکاتب فکر نے اختلاف رائے کم اور اتفاق رائے زیادہ پایا جاتا تھا۔ فقہ کا ہر طالب علم یہ بات کہ امام شافعیؒ نے فقہ حنفی میں امام محمد اور مالکی فقہ میں خود امام مالک سے اکتفاء تھا اور ایسا کرنے میں کسی قسم کی عارتصوّر نہیں کی تھی۔ اسی طرح اُس زمانے میں ایک پیرو اکثر دوسرے مکاتب فکر سے اکتساب فیض کرتے رہتے تھے۔ یہ بات بہ الثمیں ہے کہ حنفی فقہ ہو یا شافعی فقہ۔ مالکی فقہ ہو یا حنبلی فقہ ان کا اصل منبع اور سنت رسول اللہ ہی ہے۔ ایک ہی چمن ہے جس سے سب نے خوشہ چینی کی۔ یہی سرچشمہ ہے جس سے چند نہریں نکل کر مختلف اطراف میں بہہ رہی ہیں۔ لہذا ان اگر پایا بھی جائے گا تو وہ فروغی ہو گا نہ کہ اصولی۔ لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ تنگ نظری اور تصحب بڑھتا گیا۔ یہ اس لئے ہوا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا تھا نے اس معاملہ میں اس قدر غلو کیا کہ وہ تحریکیں جو صرف مکاتب فکر یا مسلک کی رکھتی تھیں، رفتہ رفتہ مذاہب کی شکل اختیار کر گئیں اور اُن کے پیروؤں نے ایک کو دوسرے مسلک کے مقابلے میں یوں پیش کیا جیسے ایک شریعت کو دوسری کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس صورت حال کو بہت محسوس بھی ایک تقدیری امر تھا کہ شاہ صاحب کے والد اور چچا فقہ حنفی کے پیرو تھے، ان کے بعض اساتذہ فقہ شافعی سے تعلق رکھتے تھے۔ یوں ان کی اثر پذیر طبیعت کو ہوئی۔ آپ نے واضح الفاظ میں یہ حقیقت جملادی کہ مائتہ المسلمین کی صلاح و دار و مدار اس بات پر ہے کہ وہ چاروں مذاہب کی اقتدا کریں۔ یہی نہیں بلکہ ایک میں جب آپ حضور نبی کریمؐ سے ان مذاہب اربعہ کے بارے میں دریافت فرماتے: جواب لیا ہے ان المذاهب والطرق کلھا سواء لافضل لواحد علی الالہ اسلام کی روح کو اگر سمجھا جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے۔ دین، دین فطرت کہلاتا ہے اور جو اپنے سے پہلے بانیان مذاہب کی عظمت کا واشکا میں اعلان کرتا ہے اور اس کے پیرو اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ لا نفرق بینو منهم الا۔ وہ بھلا ایک ہی فخر مبارک کے خوشہ چینوں اور ایک ہی منبعِ علم سے چمنی ملد آبدی کرنے والوں میں کیسے تفریق کر سکتا ہے۔ شاہ صاحبؒ اس اختلاف کو مٹا

ان مذاہب کے پیروؤں کو باہم متفق کرنے کے بڑے آرزو مند تھے۔ مسلک حنفی اور اُس کے بعد دوسرے درجے پر مسلک شافعی کی مقبولیت دیکھ کر آپ اس نتیجے پر پہنچے کہ دونوں مسلک مقبولیت کے درجے کو پہنچے ہوئے ہیں اور ملاء اعلیٰ کا مقصود بھی یہی ہے کہ ان دونوں مذاہب کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور امام مالک کی عظیم الشان تصنیف کو اس سلسلہ میں حکم بنایا جائے۔ یہ موطا وہی ہے جس کے متعلق امام شافعیؒ نے ارشاد فرمایا تھا اگر آسمان کے نیچے کتاب اللہ کے بعد صحت و درستگی میں امام مالک کی کتاب موطا سے بڑھ کر کوئی کتاب نہیں۔“

شاہ صاحبؒ نے اپنے مسلک کے پیروؤں کے لئے حنفی فقہ کے ساتھ شافعی فقہ کا مطالعہ بھی لازمی قرار دیا۔ اور مجازاً ان کے متعلق کہا جاتا ہے انہ حنفی عملاً و حنفی و شافعی تعلیمًا۔ اور ایک موقع پر خود کو الشافعی درسگاہی فرمایا۔ شاہ صاحبؒ نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا اس کا لب لباب یہ ہے کہ ان امور کو اختیار کیا جائے جو سنت رسول سے قریب ہیں۔ باہمی اختلافات دور کرنے کی بھی ایک احسن صورت ہے۔ چنانچہ سنت اور فقہ حنفی کی تطبیق کے سوال پر فرماتے ہیں۔ ”بھر پر ایک ایسا مثالی طریقہ مشکف ہوا ہے جس سے غلط سنت اور فقہ حنفی میں تطبیق دینے کی کیفیت معلوم ہوئی۔ وہ اس طرح کہ امام ابو حنیفہؒ، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ میں سے جس کا قول سنت سے قریب ہو میں اس قول کو اختیار کروں۔“

موطا کو حکم بنانے میں بھی یہی حکمت پوشیدہ ہے کیونکہ اس میں ورج شدہ احادیث زیادہ تر ان صحابہ کرام سے منقول ہیں جنہوں نے نبی کریمؐ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آپؐ کے ارشادات گراہی اپنے کانوں سے سنے تھے، اور خود ان کی زندگیاں اسی اسوۂ حسنہ کا نمونہ تھیں۔ سنت سے اس قدر قریب پہنچ کر وہی اختلافات باقی نہیں رہ سکتے اور یہی شاہ صاحبؒ کی تعلیمات کا حقیقی منشا تھا۔

تصوف کے معاملے میں بھی شاہ صاحبؒ نے یہی طریقہ کار اختیار کیا اُن کا نام نہاد مسلم معاشرے کا دور انحطاط تھا۔ تصوف کی آڑ میں شیعہ بازی ہو رہی تھی نام نہاد پیروں اور صوفیوں کی گرم بازاری تھی۔ کرامتوں اور خوارق کی بھرمار تھی۔ شاہ صاحبؒ نے اس صورت حال سے لوگوں کو خبردار کیا۔ فرماتے ہیں :-

زمانے کا رنگ بدل گیا ہے اور مذہب کا چشمہ بہت کدڑ ہو گیا ہے اور ہر پوشش جو مسلمانوں کو ظاہراً رونق دے رہی ہے، حقیقت میں اسلامی نہیں۔ تم پانچ طرح کے لوگوں سے اپنے تئیں بچاؤ۔ ایک بے حیا صوفی سے جو رفع تکلیف کے لئے حیلہ کرتا ہے، اور اپنے مجازی امور میں توقف نہیں کرتا۔ اس زمانے کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دینا چاہئے اور کبھی اُن کا مرید نہ ہونا چاہئے، کیونکہ آج کل یہ لوگ طرح طرح کی بدعات اور رسومات میں مبتلا ہیں۔ شہرت، رجوع خلق، مریدوں کی کثرت دیکھ کر دھوکا نہ کھانا چاہئے اور نہ ہی ان کی کرامتوں سے دھوکا کھانا چاہئے۔ عوام کا رجحان اور غلو رسم و رواج کی بنا پر ہوتا ہے اور رسمی امور کبھی قابل اعتبار نہیں ہوا کرتے۔ آج کے کرامت پرستوں نے عام طور پر طلسمات اور شیعہ بازی کو کرامت سمجھ رکھا ہے۔ اَلَا مَا شَارَ اللہ۔ انہیں شیعہ بازیوں کو وہ کرامت کہہ کر مخلوق کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ دل کا حال بتا دیا اور آئندہ پیش آنے والے واقعات معلوم ہو جائیں اور یہ امر بہت آسان ہے۔

خور کرنے کی بات ہے۔ کہاں تصوف اور کہاں شیعہ بازی، طلسمات اور پیش گوئیاں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ مسلم قوم عملی طور پر سرگرم نہیں رہی تھی۔ جہد للبقا کا جذبہ سینوں میں سرد پڑ گیا تھا، ذہنوں میں شکست خوردگی کا رنگ پختہ ہو گیا تھا اور وہ قوم جو کسی زمانے میں بقول علامہ شبلی نعمانی

وہ قوم جو جان تھی جہاں کی  
تھے جس پے شار فتح و اقبال  
جو تاج تھی فرق آسمان کی  
کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال  
قیصر کو دیے تھے داغ جس نے  
مٹی کر دیئے تھے چراغ جس نے

روما کے دھوپیں اٹا دیئے تھے اٹلی کو کتوں جھکا دیئے تھے

اور جس قوم کی علی سرگرمیوں اور ترقیوں کا یہ عالم تھا۔

گھٹا لک پہاڑوں سے بلحا کے اٹھی پڑی چار سو ایک ایک دھوم جس کی  
کڑک اور چپک دور دور اس کی پہنچی جو ٹیگس پہ گرجی تو گھٹا پہ برسی  
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی  
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

اس قوم کی بے علی کا اب یہ عالم تھا کہ اہل ثروت طبقہ بطیر بازی، کبوتر بازی اور  
اسی قسم کی دوسری بازیوں میں مصروف تھا۔ اور صوفیہ کا طبقہ خانقاہوں اور ٹکیوں میں  
ذکر و فکر اور مراقبہ اور مکاشفہ میں مصروف تھا۔ یہ حالت سراسر جہادِ زندگانی سے فرار کے  
متراوف تھی اور لطف یہ کہ یہ لوگ اپنی طاعات و عبادات پر نازاں بھی تھے۔ اور تصوف کا  
وہ چشمہ صافی جس کا منبع خود حضورِ انور کی ذاتِ گرامی اور حضور کا اسوۂ حسنہ اور صحابہ کرام کی  
عملی زندگیاں تھیں، عرب سے نکل کر ایران میں آیا تو ایرانی و یونانی فلسفہ نے اسے گدلا کیا۔  
اور جب ہندوستان کی سرزمین پر پہنچا تو بدھ ازم اور ویدانتا کے چشموں میں مل کر غلط راستوں  
پر بہہ نکلا۔ اور مسلمانوں کا ایک کثیر گروہ ترکِ دنیا کر کے ہمدن طاعات و عبادات میں  
مصروف ہو گیا۔ جذبہ جہاد و قناعت کے جذبے سے بدل گیا، اور پیکرِ تسلیم و رضا بن کر ہاتھ  
پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہنا سب سے بڑی عبادت تصور کی گئی۔ اور اسے تصوف یا معرفت  
انہی کا نام دیا گیا۔ شاہ صاحب نے اس صورتِ حال کی طرف توجہ فرمائی اور اصلاحِ حال کی  
پوری پوری سعی کی۔

اپنی مشہور عالم تصنیف حمد اللہ الباقی میں تحصیل سعادت کے طریقوں پر روشنی ڈالتے  
ہوئے انہوں نے بڑی وضاحت سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ان کی رائے میں تحصیل  
سعادت کے دو طریقے ہیں۔ پہلا یہ کہ بہیشت کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔ اس طرح  
کہ دنیا اور امورِ دنیا سے مکمل بے رغبتی پیدا ہو جائے اور اپنی تمام تر توجہ عالمِ جبروت کی

لے مثنوی صبح امید۔

لے مدرس۔ قدو جزو اسلام۔

طرف منطف کر لی جائے جیسا کہ اشراقیین اور صوفیاء میں سے مجذوبوں کا طریق اس طریق میں تین بڑی خرابیاں ہیں ۔

(۱) ایسے لوگ دنیا میں بہت کم تعداد میں ہیں ۔

(۲) اس میں سخت ترین ریاضتیں ، کامل ترین یکسوئی ، اور سب سے بڑھ کر ترک کامرہ آتا ہے جس کی سرحدیں بدھ ازم اور ویدانتا سے جا ملتی ہیں ۔

(۳) ایسے لوگوں کا دعوت الہی کے مبلغین اور مصلحین فی الارض میں شمار نہیں ؛ نتیجہ یہ نکلا کہ یہ طریقہ مقصد تخلیق کو پورا نہیں کرتا ۔ اور اگر اکثر لوگ اس ط اختیار کر لیں تو دنیا برباد ہو کر رہ جائے ۔

تحصیل سعادت کا دوسرا طریقہ وہ ہے کہ قوتِ بہیمیہ کی اصلاح کی جائے کی کچی دور کر کے اسے قوتِ ملکیہ کے تابع کر دیا جائے ۔ انبیاء کرام اسی دوسرے کو قائم کرنے کے لئے تشریف لائے ۔ اور اسی طریقے کے پیشوا مغہبین اور اصلاح کہلاتے ہیں اور یہی لوگ دین و دنیا کی ریاست اور منصب امامت کے ہوتے ہیں ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام کا کردار اسی طریقے کا مظہر تھا ۔ عباد صوفیائے کرام جیسی محویت اور استغراق ، دنیوی امور میں درستگی اور اصلاح ، اعلا الحق میں سرگرمی اور جوش ، صلہ رحمی ، حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی ۔ قدسی انما الاعمال بالنیات کی روشنی میں اگر دیکھئے تو ان کا مرنہ جینا چلنا پھرنا ، اٹھنا بیٹھنا ، جنگ و صلح ، محبت و عداوت ، سب کچھ رضائے الہی کے ہر علمین اس کی خوشنودی اور مرضی ہمیشہ نظر ۔ قرآن کریم کی روشنی میں دیکھئے میں رحیم ، کفار پر شدید عیب جینوں پر داغ لائے سجدہ ، دلوں میں نور ایمان ، داغ اللہ کا نام بلند کرنے کا سودا ۔ مرنے والا اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے ۔ حضورؐ معراج المومنین کہہ کر معرفتِ الہی کا دروازہ ہر کلمہ گو پر کھول دیا اور اس طرح کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ استعداد والے لوگ اپنی اپنی استعداد کے مطابق جو شخص جس قدر نماز اور ذکر الہی کے اسرار سے واقف ہوگا اور جس قدر اس

و خشوع سے کام لے گا، اسی درجے کی معرفت یا معراج اسے حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ شاہ صاحبؒ نے مختلف اوقات میں مختلف اوراد و اذکار کے اسرار بیان فرما کر حقیقی تصوف کی طرف رہنمائی فرمادی۔ ظاہر ہے اپنے نفس کی معرفت حاصل کرنے والا ہی معرفت الہی حاصل کر سکتا ہے اور جو شخص حقوق العباد ادا نہیں کر سکتا اس سے یہ توقع کیونکر ہو سکتی ہے کہ وہ حقوق اللہ بطریق احسن ادا کر سکے گا۔ بقول شیخ سعدیؒ:

تو کارِ زیں را نگو ساختی کہ بر آسمانست پرداختی

غرضیکہ شاہ صاحبؒ نے اسلامی تصوف کو یونانی، ہندی اور بدھ ازم کے غیر اسلامی اثرات سے پاک کر کے پیروانِ اسلام میں حقیقی اسلامی اسپرٹ پیدا کرنے کی بڑی کامیاب کوشش فرمائی ہے۔ اور مسلمان جو اہل سیاست اور اہل مذہب، یا دنیا دار اور دین دار کے دو گروہوں میں بٹ گئے تھے ان کو اپنی تطبیق دینے کی حیرت انگیز صفت کام میں لا کر متحد کرنے کی سعی بلیغ فرمائی۔

امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی کے زمانے سے مسئلہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود نے خامی شہرت حاصل کی اور اس سلسلے میں علماء کے درمیان کافی اقتراق و انتشار رہا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی حیرت انگیز صلاحیت تطبیق کو کام میں لا کر انہیں باہم منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

ان دونوں نظریوں کے درمیان کوئی معقول فرق نہیں۔ محض الفاظ کا اختلاف ہے۔ ورنہ ان کا مقصود ایک ہی ہے (یعنی وجود حقیقی کی وحدت اور یکسانی ثابت کرنا)۔ چنانچہ ابن عربی کے اس قول میں کہ ممکنات کے حقائق اس وجود منبسط کے نام اور صفات ہیں اور حضرت مجدد کے قول میں کہ ممکنات کے حقائق وہ عداات ہیں جن پر اس وجود منبسط کے اسماء اور صفات کے انوار کا عکس پڑتا ہے، کوئی فرق نہیں۔ بس تعبیرات کا معمولی سا فرق ہے اور اس فرق کی تعبیرات ممکن ہیں اور جب تعبیرات ممکن ہیں تو پھر خواہ مخواہ



ملتِ اسلامیہ میں افتراق و انتشار کو کیوں راہ دی جائے۔

پروفیسر ضیاء الدین صاحب رقم طراز ہیں: ۱۔ شاہ صاحبؒ میں دین کے امور میں جو اس قدر وسعت نظر پائی جاتی ہے جس سے بڑھ کر وسعت کا تصور نہیں ہو سکتا۔ اس کا برتر وہ ایک مشاہدے میں یوں بیان فرماتے ہیں: ۱۔

میرے لئے اللہ تعالیٰ کی تدلیٰ اعظم ظاہر ہوئی تو میں نے اُسے غیر متناہی پایا۔ اور اپنے نفس کو بھی غیر متناہی پایا۔ میں نے دیکھا کہ گویا میں ایک غیر متناہی ہوں جو دوسرے غیر متناہی کے مقابل ہے اور میں اس غیر متناہی کو اپنے اندر نگل گیا ہوں۔ اور میں نے اس غیر متناہی میں سے کچھ باقی نہیں چھوڑا، اس کے بعد جو میں نے اپنے نفس کی طرف جو ع کیا تو کچھ دیر تک میں اپنے نفس کی اس وسعت و عظمت سے حیرت میں رہا لیکن پھر یہ حالت مجھ سے جاتی رہی۔

یہی وسعت نظر ہیں شاہ صاحب کی ان تحریروں میں ملتی ہے جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ کے دو بڑے گروہوں کے مخالف نظریات اور عقائد کو تطبیق دینے میں فرمائی ہے اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان سب سے بڑا اور بنیادی مابہ التزاع مسئلہ افضلیت شیخینؒ اور فضیلت حضرت علیؑ کا ہے۔ جہاں تک شاہ صاحبؒ کے ذاتی عقائد کا تعلق ہے (اور ایک انہیں پر کیا موقوف ہر اہل دل کے لئے حضرت علیؑ کی شخصیت اپنے اندر حد درجہ کشش رکھتی ہے۔ تمام صوفی شعرا بلکہ غیر صوفی شعرا بھی حضرت علیؑ سے اپنے کمال عقیدت کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ مثلاً مولانا روم فرماتے ہیں:۔

اے از ہمہ عصیاں بری، مردانِ عالم را سہی علم محمدؐ را دری مستان سلامت میکنند  
اندر سمانامت علیؑ، اندر زمین نامت ولی در علم دیں تو کا علیؑ مستان سلامت میکنند

اور

اے واقفِ علم الیقین      اے کاشفِ عین الیقین  
اے صاحبِ حق الیقین      مستانِ سلامت می کنند

اہلِ دل حضرات میں شاہ صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حضرت علیؑ سے اپنے تعلق خاطر کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ فرماتے ہیں۔ جہاں تک علوم ولایت کا تعلق ہے تو اس میں بلاشبہ حضرت علیؑ سب سے افضل ہیں۔ حضرت علیؑ حضور نبی کریمؐ اور اولیائے کرام کے مابین واسطہ ہیں۔ لیکن اس وفور عقیدت کے باوجود انہوں نے جادۂ اعتدال سے سرگرم و گردانی نہیں کی۔

پروفیسر غلام حسین جلیانی رقم طراز ہیں:۔ شاہ صاحب کا طبعی رجحان حضرت علیؑ کی افضلیت کی طرف تھا۔ مگر انہیں مکاشفے میں اس طبعی رجحان سے متاثر نہ ہونے کی ہدایت کی گئی۔ جس پر وہ کاملاً کاربند رہے۔

فرماتے ہیں:۔ شیخین کی افضلیت سے مراد یہ نہیں کہ وہ نسب، شجاعت، قوت اور معرفت میں حضرت علیؑ سے افضل تھے۔ بلکہ یہ کہ ان کے ہاتھوں اسلام کو زیادہ نصیب پہنچا اور یہی فضیلت سے مراد ہے۔

ایک اور موقع پر اس بات کو زیادہ واضح کر کے فرماتے ہیں:۔ وہ مقصدِ الہی جو حضورؐ کی ذاتِ گرامی میں صورت پذیر ہوا تھا، وہ بالکل اسی صورت میں ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے کارناموں میں ظہور پذیر ہوا۔ یعنی منصبِ نبوت کی جتنی تکمیل ان دونوں بزرگوں کے ہاتھوں انجام پائی، وہی ان کی فضیلت کا باعث بنی۔

اس کے علاوہ دوسرے متنازعہ فیہ مسائل مثلاً ظہورِ مہدی اور بارہ اماموں یا خلفاء

۱۔ علامہ الدین مخدوم علی احمد صابر پیران گلبر۔ ۲۔ فیوض الحرمین مشہد ۲۲۔

۳۔ الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین۔ ۴۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۳۲۶۔

۵۔ التقریبات جلد اول۔

اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اختلافات دور کرنے میں شلو صاحبؒ کی ذات ایک امتیازی خوبی کی حامل تھی۔ اور ظاہر ہر تضاد رفع کر کے انہیں مطابقت پیدا کرنے میں آپ کو یرغیوں حاصل تھیں۔

۳۷ شاہ ولی اللہ کی تعلیم ص ۱۴۲

# تقسیم علوم دین صاحب "ینابیع" کی نظر میں

مولانا ابو الفتح محمد سفیر الدین۔ استاد سندھ یونیورسٹی۔ حیدر آباد

اس سے پہلے "ینابیع الحیوۃ الابدیہ" کا ایک سرسری جائزہ لیا جا چکا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف عظام نے اس ضخیم کتاب میں کن کن امور سے بحث کی ہے اس شمارہ میں اس کتاب کے باب دوم کا خلاصہ ہدیہ تارئین ہے۔  
(اس باب میں دین اسلام کے علم اور اس کے علما کا ذکر ہے اور یہ تیرہ فصلوں پر مشتمل ہے۔)

## فصل اول

(اس فصل میں علمائے دین کے چار طبقے شمار کرائے ہیں۔ ان کے علاوہ دو اور کو شیطانی فوج سے تعبیر کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ  
علمائے دین اسلام چہار طائفہ اند۔ محدثین، فقہاء، متکلمین و صوفیہ۔ و باقی ہمد جنود ابلیس و لشکر و جلال اند ؟  
پھر ان چار گروہوں کی تعریف بیان کی ہے جو مختصراً درج ذیل ہے :

لے صاحب ینابیع الحیوۃ الابدیہ لاطلاب نقشبندیہ، حاجی ابوالحسن داہری نقشبندی نواب شاہ (سندھ) کے بزرگ بارہویں صدی ہجری میں گزرے ہیں۔ (ہدیہ)

(۱) **محمدین** :- یہ حضرات ظاہر حدیث اور ظاہر آیت قرآنیہ پر عمل کرتے

یہ شب و روز حفظ و نقل احادیث میں اور صبح و صیغ و ضعیف اور ناسخ و منسوخ کے علم اور راویوں کے احوال کی تحقیق میں مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ اصول اسلام کے ہیں۔ اور مسلم روایت یعنی علم حدیث کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جو اہل احادیث کے فقہ اور پرکھنے والے ہیں۔ ان کے تمام عبادات اور معاملات کا مدار ظاہر احادیث و آیہ پر ہے۔ اسی طرح ان کے عقائد کا دار و مدار بھی ان ہی ظاہر آیات و احادیث پر۔ بجز متشابہات کے کہ ان کو ظاہر پر معمول نہیں کرتے ہیں بلکہ یا تو حکومات کے مطابق کی تاویل کرتے ہیں یا ان کے علم کو حق تعالیٰ کے حوالہ کرتے ہیں۔

(۲) **فقہاء** :- یہ وہ لوگ ہیں جو محدثین سے علم احادیث اخذ کر کے ان

بایکچوں پر غور و فکر کرتے ہیں اور عبادات و معاملات کے جن مسائل میں نصوص ظاہر موجود نہ ہوں، ان کو نصوص کے مطابق ولایت النص اور اشارة النص کے ذریعے متنا کرتے ہیں اور اصول فقہ کے قواعد اجتہاد کے قیاس کے ذریعے نصوص سے مسائل ا کرتے ہیں۔ یہ لوگ فقہ حدیث کے ساتھ مخصوص ہیں۔

(۳) **مستکملین** :- یہ وہ لوگ ہیں جو محدثین اور فقہاء سے علم اخذ کرتے ہیں

اور عقاید ایمان کو دلائل عقلیہ و نقلیہ کے ذریعے مستحکم کرتے ہیں۔ اہل بدعت و کفر و ضلالت کے دلائل کا ابطال کرتے ہیں۔ یہ علم ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۴) **صوفیہ** :- یہ وہ حضرات ہیں جو ان تینوں مذکورہ گروہوں سے فی

اسلام کا علم اخذ کرتے ہیں اور اصول و فروع میں ان کے تابع ہیں اور دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مسئلہ میں ان کی مخالفت نہیں کرتے ہیں تمام رسوم و معاد میں ان کی پیروی کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک گروہ کو علوم عالیہ اور احوال سنہ کے ساتھ مخصوص کیا ہے اور ممتاز بنایا ہے۔ جو لوگ تھوڑے مدعی ہیں اور علماء کی ان چار قسموں سے خارج ہیں تو ایسے لوگ ابلیس کے لشکر ہیں۔

اس ضمن میں ان لوگوں کے اقوال بھی بیان کئے ہیں جنہوں نے علماء کی صرفیت پر جماعتیں شمار کی ہیں، چنانچہ عقائد سنیہ کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے۔ اس میں آویز مریدین، مصنفہ شیخ ابوالنجیب سہروردیؒ سے نقل کیا ہے کہ علمائے اہل سنت و جماعت تین ہیں، محدثین، فقہاء اور صوفیہ۔ انہوں نے متکلمین کو اس میں شمار ہی نہیں کیا ہے پھر قوت القلوب، مصنفہ شیخ ابوطالب کئی سے نقل کیا کہ انہوں نے چار قسمیں بیان کی ہیں جن میں متکلمین کو بھی شمار کیا ہے۔ اس اختلاف کو نقل کرتے ہوئے مصنف نے اس کی توجیہ بیان کی ہے کہ جن لوگوں نے متکلمین کو علماء میں شمار نہیں کیا ہے، ان کی نظر میں یہ ہے کہ چونکہ فقہاء نے ایمان کے ضروری عقائد کا ذکر کر دیا ہے اس لئے یہ علم فقہ میں داخل ہے اور جن لوگوں نے علم کلام اور متکلمین کو دین اسلام کے علم اور علماء میں شمار کیا ہے، وہ اس پر مبنی ہے کہ چونکہ اہل بدعت و کفر کے دلائل عالم میں پھیل گئے اس لئے مخالفین کے دلائل کا ابطال اور عقائد دین کا ثابت کرنا ضروری ہو گیا، چنانچہ دین اسلام کی حفاظت کیلئے علم کلام یقیناً پڑھنا چاہئے۔ اگر علم کلام نہ ہوتا تو تمام مسلمان مخالفین کے دلائل کو اپنالیتے اور ان کی پیروی کرنے لگتے پھر تو اہل سنت و الجماعت کا مذہب باقی نہ رہتا اور اس جماعت میں خلل اور فساد پیدا ہو جاتا۔

## فصل دوم

اس فصل میں اس امر سے بحث کی ہے کہ علم کلام کس قدر فرض اور کس قدر مباح اور کس قدر ممنوع ہے، چنانچہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔  
 ”علم کلام بقدر ضرورت اعنی بقدر کہ عقائد ایمان بدان سلامت ماند از آسیب فساد و شکوک و زلل، و معصون گردند از لوث بدعت و خلل“

لے الفقہ الاکبر جو محض عقائد کی کتاب ہے اور امام ابوحنیفہؒ کی طرف منسوب ہے۔ اس کتاب کا نام اس امر کی دلیل ہے کہ عقائد کے مسائل بھی فقہ میں داخل ہیں ۱۲

فرض عین است

یعنی علم کلام کا اس قدر حاصل کرنا فرض عین ہے کہ ایمان سلامت رہ سکے اور شکوک و شبہات کی آفت سے محفوظ رہ سکے، کیونکہ عقائد ایمانیہ کو فساد سے بچانا ہمیشہ فرض ہے۔ اور ہر ایک کے لئے ضروری ہے کہ عقائد کے منافع اور مضرتوں کا علم حاصل کرے تاکہ بدعت و کفر سے نجات پائے اور قیامت کے دن عتاب جہادندی میں نہ پڑے۔ قلماء معکے دن پہلے ہر شخص سے اس کے عقائد ہی کے متعلق پرسش ہوگی اس کے بعد نماز کا حساب ہوگا۔ مگر نیکر بھی قبر میں عقائد ہی کے متعلق سوال کیوں گے۔

قدر ضرورت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہر شخص کو اتنا معلوم ہونا چاہئے کہ سارا عالم اپنے تمام اجزاء کے ساتھ حادث اور مخلوق ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے سوا کوئی چیز قدیم اور ازلی نہیں ہے۔ صانع عالم واحد ہے۔ وہ صفات کمال کے ساتھ متصف ہے اور اس کی تمام صفات قدیم ہیں۔ وہ نقص و زوال کی صفات سے منزہ ہے۔ کسی چیز میں اس کے سوا کوئی مؤثر نہیں۔ ذات و صفات افعال میں اس کے مثل کوئی چیز نہیں۔ اس کی ذات یا اس کی کسی صفت کی کثر عقل میں نہیں آسکتی۔ اس کے علاوہ اسی امور کا علم ہونا چاہئے جو توحید کے متعلق اجماع صحابہ اور سلف صالحین سے ثابت ہیں۔ نیز علامات قیامت، مسائل معاد یعنی مذاہب قبر، حشر، نشر، سوال، میزان وغیرہ اور دیگر انبیاء و رسل اور ان کی کتابوں اور فرشتوں کے متعلق علم ہونا چاہئے۔ قضاء و قدر پر ایمان ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے دفاعی حکمت میں غور و خوض نہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ ممنوع ہے۔ اور اہم کبرای کے مسائل معلوم ہونے چاہئیں۔ اگر اس قدر علم حاصل کر لے تو بہ تقریباً اندیہ بدعت و ضلالت اور عقائد اسلامی میں فساد سے محفوظ رہے گا۔

فقہ، کلام اور تصوف کا باہمی تعلق

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے ترجمہ مشکوٰۃ کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف

لکھتے ہیں کہ حدیث جبریل (علیہ السلام) کی شرح میں شیخ مذکور نے لکھا کہ "اسلام" سے فقہ کی طرف اشارہ ہے کیونکہ فقہ اعمال و احکام شریعہ کے بیان پر مشتمل ہوتا ہے

در "ایمان" سے اعتقادیات کی طرف اشارہ ہے جن سے علم کلام میں بحث ہوتی ہے اور "احسان" سے اہل تصوف کی طرف اشارہ ہے کیونکہ عبادت کو پورے اخلاص اور توجہ الی اللہ کے ساتھ ہونا چاہئے۔ اور تصوف کے تمام معانی جو مشائخ طریقت نے صراحتہ یا اشارتہ بیان فرمائے ہیں سب اسی اخلاص سے متعلق ہیں۔ اور دین اور اس کے اعمال کی بنیاد فقہ، کلام اور تصوف پر ہے۔ یہ تینوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی ایک دوسرے کے بغیر وجود میں نہیں آسکتا اور نہ تام ہو سکتا ہے۔ چنانچہ تصوف فقہ کے بغیر متصور نہیں ہو سکتا کیونکہ احکام الہی فقہ کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتے اور فقہ تصوف کے بغیر تام نہیں ہو سکتا کیونکہ عمل اخلاص کے بغیر تام نہیں ہوتا اور یہ دونوں ملکہ کلام کے بغیر باطل ہوں گے اور مست نہ ہوں گے کیونکہ یہ دونوں محبت ایمان پر موقوف ہیں اور کلام ان دونوں کے بغیر کامل نہ ہوگا۔

**متکلمین کے غیر ضروری مباحث** | متکلمین نے علم کلام میں بحث سے ایسے امور سے بحث کی ہے کہ نہ تو

کتاب اللہ میں ان کا ذکر ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین ہی سے اس قسم کی بحث منقول ہے۔ بلکہ صحابہ اور تابعین نے تو ان مباحث سے سکوت فرمایا ہے متکلمین کے اس طرح کے چند مسائل درج ذیل ہیں۔

(۱) جو ہر فرد یعنی جزء الذی لا یتجزی کا اثبات اور ان سے اجسام کا مرکب ہونا۔

(۲) عرض دو زمانوں میں باقی رہتے ہیں۔

(۳) اللہ تعالیٰ کی صفات نہ عین ذات ہیں نہ غیر ذات۔

(۴) صفات الہیہ کا تعدد اور ان فی نفسہ ان صفات کا اتحاد و تغایر اور حوادث کے

ساتھ صفات الہیہ کے تعلقات کی کیفیت۔

(۵) صفات قدیمہ سات یا آٹھ ہیں باقی تمام صفات حادث ہیں۔

(۶) مسئلہ قدیم کثرت نزاع۔

(۷) کلام الہی میں ان کا شدید اختلاف۔



جمہور فقہاء و محدثین اور ائمہ مجتہدین اس قسم کی بحثوں سے منع کرتے ہیں  
ان کو بدعتِ قبیحہ قرار دیتے ہیں۔

**مشکلمین کی تین طرح کی غلطیاں** | مشکلمین نے تین طرح کی غلطیاں  
جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) فقہاء و محدثین کے مذاہب کی بعض مسائل میں مخالفت کی ہے چنانچہ  
ان مسائل کے ایک مسئلہ یہ ہے کہ مشکلمین صفاتِ فعلیہ کو قدیم نہیں مانتے۔ حالانکہ  
سنت و الجماعت کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تمام صفات خواہ ذاتیہ ہوں یا فعلیہ سب  
ہیں۔ اس قسم کی غلطیاں اشعر یہ کے کتابوں میں بہت زیادہ ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ علمِ کلام میں مخالفین مثلاً معتزلہ اور فلاسفہ وغیرہ کے دلائل  
کئے گئے ہیں تاکہ ان کے دلائل معلوم کر کے ان کا رد کیا جائے اور جواب دیا جائے۔ اور  
کے دلائل بیان کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تذبذب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور حق  
حقہ میں تزلزل پیدا ہوتا ہے۔

غرض علمِ کلام کے متعلق مصنفِ علم کی رائے یہ ہے کہ قدر ضرورت سے  
اس علم میں مشغول ہونا بدعتِ قبیحہ ہے نہ کہ مطلقاً اس علم میں مشغول ہونا بدعت ہے  
جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے "شرح فقہ اکبر" میں لکھا ہے کہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ  
ہے کہ صحابہ توحید و نبوت کے دلائل کے متعلق مباحثہ کرتے تھے اور ان دلائل چیزوں  
متعلق دلائل بیان کرتے تھے۔

امیر شریف قدس سرہ نے "شرح مواقف" میں تصریح کی ہے کہ علمِ کلام بدعت  
ہے اور فرماتے ہیں کہ علمِ کلام کا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے۔ ہر شہر میں ایک دُ عالم  
کلام کے ہونے چاہئیں۔ تاکہ لوگ شبہات میں نہ پڑیں اور ان سے رجوع کر سکیں  
امام ابو حنیفہؒ نے اپنے صاحبزادے حمادؒ کو علمِ کلام میں مناظرہ کرتے ہوئے  
دیکھا تو اس سے منع فرمایا۔ حماد نے عرض کیا کہ ابابا جان آپ مجھے تو منع فرماتے ہیں  
لیکن آپ کو مناظرہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا کہ ہم جو مستطوع

تھے تو اس بات سے ڈرتے رہتے تھے کہ کہیں ہمارا ساتھی غلطی اور لغزش میں نہ مبتلا ہو جائے اور تم لوگ جو مناظرہ کرتے ہو تو اپنے مقابل کو لغزش میں مبتلا کرنا چاہتے ہو اور جو شخص مقابل کو لغزش میں مبتلا کرنا چاہے تو گویا اس کو کفر میں ڈالنا چاہتا ہے اور جو دوسرے کو کفر میں ڈالنا چاہے وہ خود کافر ہو جائے قبل اس کے کہ اس کا مقابل کافر ہو۔ جس لوگ نے علم کلام سے منع کیا ہے وہ اسی قسم کے مناظرہ اور جھل پر محمول ہے۔

## فصل سوم

دین اسلام کے علوم مقصودہ | دین اسلام کے علوم مقصودہ میں تین علوم کو شمار کیا ہے، تفسیر، حدیث، فقہ۔

اور جو ان علوم کے وسائل ہیں، ان کو بھی مقاصد کے حکم میں داخل کیا ہے۔ باقی علوم کو شیطانی فوج کی داستانیں اور افسانے کہتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ

”در بیان آنکہ علوم مقاصد دین اسلام سے علم اند - تفسیر و حدیث و

فقہ - و در بیان آنکہ علوم وسائل حکم مقاصد دارند، و باقی ہر سمرات و

افسانہائی جیوش و بلیس است“

پھر اس کی تائید میں ابو داؤد و ابن ماجہ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں جو حضرت

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

”العلم ثلاثۃ“، آیۃ محلّۃ“ او سنۃ قائمۃ“ او فروعۃ“ عادلۃ“ و

ما کان یولیٰ ذلک فهو فضلی“

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ آیت محکمہ سے مراد وہ علم

ہے جس میں کتاب اللہ کی آیات حکمت اور متشابہات کی تاویل صحیح سے بحث کی جاتی

ہے۔ اس کو علم تفسیر قرآن کہتے ہیں جو قواعد اصول اور علوم عربیہ ادبیہ کی مہارت

و عذاقت پر موقوف ہے۔

نسبت قائمہ سے مراد احادیث ثابۃ کا علم ہے۔ یہ علوم عربیہ کی مدد سے اس علم

میں فقط پر موقوف ہے نیز حفظ اسانید اور احوال رجال اور اقسام حدیث کے علم پر موقوف ہے۔

قرینہء عادلہ سے مراد اجماع امت کا علم ہے۔ اور مجتہد کا وہ قیاس بھی اسی علم سے متفرع ہوتا ہے جو کہ ان تینوں علوم سے مستنبط ہوتا ہے۔

جو علم کہ مجتہد کے قیاس اور اجماع سے تعلق رکھتا ہے اس کو فقہ اور کلام کہتے ہیں یعنی اگر وہ مسائل تعبدی ہیں لیکن اعتقادی نہیں ہیں تو ان کو فقہ کہتے ہیں اور اگر اعتقادی مسائل ہیں تو ان کو علم کلام کہتے ہیں۔ لیکن سلف صالح اعتقادی مسائل میں قیاس کو جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔ اس لئے علم کلام ان کے نزدیک تفسیر و حدیث کے علم میں داخل ہے علم نہیں ہے۔

دینی سے معلوم ہوا کہ اسلامی علوم تین ہیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ۔ اور تمام علوم کا حاصل اور نچر تصوف ہے۔ تمام علوم کی غایت تصوف ہے۔ تصوف کے بغیر یہ تینوں علوم کفر و فحاش ہیں۔ اگر کوئی شخص ان علوم میں تصوف کو کام میں نہ لائے تو اس کے حق میں یہ تینوں علوم دھال ہوں گے۔

علم اور علمائے کی فضیلت احادیث نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں بیان کرنے کے بعد بتایا ہے کہ مغربی

### علوم ادبیہ کی اہمیت

محدثین اور مجتہدین میں سے ہر ایک کے لئے علوم ادبیہ کا سیکھنا لازمی ہے ورنہ غلطی اور خطا کا مرکب ہوگا اور کبھی منزل مقصود تک نہ پہنچے گا۔

عرف میں پوراہ علوم ادبیہ مشہور ہیں۔ معارف العلوم میں علوم ادبیہ کا شمار کرتے ہوئے لغت، نحو، صرف، اشتقاق، معانی، بدیع، بیان، تجوید، ان آٹھ علوم کا وجوب اہل سنت والجماعت کی کتابوں سے ثابت ہے۔ باقی چھ علوم یعنی علم خط، محاضرات، مراسلات، عروض، قافیہ، فرض شعر کو مستحبات میں سے شمار کیا ہے۔ علامہ جلال الدین زمخشری نے بارہ علوم شمار کر ائے کیونکہ بدیع کو معانی بعد بیان کے ذیل میں شمار کیا اور تجوید کو الگ علم شمار نہیں کیا۔

ان تمام علوم کی تعریفات بیان کرنے کے بعد آخر میں کہا ہے کہ اکثر علوم ادنیٰ جو مفسر، محدث اور مجتہد پر واجب ہیں اور باقی علوم جو مستحب ہیں، یہ سب تحقیق کے حق میں ہیں جو کہ ائمہ دین ہیں تاکہ یہ حضرات تفسیر اور شرح حدیث اور اجتہاد میں غلطی نہ کریں باقی عوام مقتدی، جو ان کے علوم پڑھتے ہیں اور خود کوئی تعارف نہیں رکھتے ہیں تو ان کے لئے تین علوم یعنی لغت، صرف اور نحو کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

## فصل چہارم

اس فصل میں ان علوم سے بحث کی ہے جو کہ ممنوع ہیں اور ان علوم علوم ممنوعہ میں علوم فلسفہ اور کتب معتزلہ اور ان غیر ثقہ لوگوں کی کتابوں کو شمار کیا ہے جو صحیح اور غیر صحیح میں امتیاز نہیں کرتے۔ اور باطنی گروہ کی وہ تفسیریں اس میں داخل ہیں جو کتب معتدہ مشہورہ کے مخالف ہیں۔

مجاہد علی ملاؤ الدولہ سمنانی رحمہ اللہ میں مذکور ہے کہ جب خلفائے راشدین موجود تھے کسی نے بھی یونانیوں کی حکمت نہیں سیکھی۔ جب خلفائے راشدین رحلت کر گئے تو ابلیس لعین نے بعض صحابہؓ کے دل میں اس علم کے واقعات القا کئے پھر رفتہ رفتہ یہ بدعت اسلامی فرقوں میں رائج ہو گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ یونانی علوم کے عربی میں منتقل ہونے سے پہلے بھی کچھ لوگ اس کے مسائل سیکھتے تھے۔ کیونکہ ابو نصر فارابی جس نے ان علوم کو عربی میں منتقل کیا اور مترجم اس کا لقب تھا یہ متأخر ہے۔

وہ اللہ تعالیٰ جمع البہار میں امام غزالی رحمہ اللہ سے منقول ہے کہ دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے بڑی مصیبت اور آفت یونانی فلسفہ کے عربی میں منتقل ہونے سے پہنچی۔ اس لئے کہ اس کے تمام علوم دلائل عقلیہ کے ذریعے ثابت کئے گئے ہیں۔ اور شرع شریف میں ان علوم سے تعرض نہیں کیا گیا ہے اور نہ ان کا اثبات و نفی مذکور ہے۔ مسلمان اس میں خود کرنے سے باز نہ آئیں گے۔ اور جو شخص ان علوم کو سنتا ہے اور ان کے مسائل دیکھتا ہے کہ سب کے سب عقلی دلائل سے ثابت ہیں تو اس کو ان علوم کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے

اور ان علوم کو حق سمجھتے لگتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ اسلام کا دار و مدار سہ قطعی دلائل کے انکار اور چیل پر ہے۔ (اس طرح وہ دین اسلام سے ۱۰۰

(۱) دھریکے۔ فلاسفہ کو اکثر

### طبقات فلاسفہ

میں ہوا ہے۔ ان فلاسفہ میں سب نے  
تھے جنہوں نے صانع عالم کا انکار کیا اور خیال کیا کہ دنیا اسی طور پر  
ہو گئی ہے۔

(۲) طبیعیاتین۔۔ دریائی لوگ طبیعیات تھے۔ جب ان لوگوں نے  
اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب صنعتیں دیکھیں اور اعضاء کی تشریح کے ذریعے  
راز معلوم ہوئے تو انہیں یقین ہوا کہ اس دنیا کا کوئی صانع ہے جو کہ حکیم اور  
چونکہ اس طرح کی عجیب و غریب ترتیب از خود کبھی نہیں ہوتی ہے اس لئے خالق  
پر مجبور ہوئے۔ لیکن چونکہ ان کے خیال میں حیوان کے مزاج کو قوائی حیوانی کے قوا  
داخل تھا۔ اس لئے وہ اس کے قائل ہوئے کہ موت کے وقت مزاج کے باطل  
کے فنا ہونے کے بعد حیوان دوبارہ لوٹ نہیں سکتا۔ چنانچہ حشر و قیامت  
کے منکر ہو گئے۔ یہ دونوں گروہ 'زندقیوں' میں سے ہیں۔

(۳) الہیاتین۔۔ یہ فلاسفہ کے آخری طبقہ کے لوگ ہیں، اس میں 'ستا  
کے شاگرد' افلاطون' ہیں۔ اور افلاطون کا شاگرد 'ارسطو' تھا۔ ارسطو تمام  
کا شاگرد نہ تھا بلکہ ایک مخصوص علم میں شاگرد تھا۔ ارسطو سلطان سکندر حکیم  
اور اس کا ذریعہ بھی تھا۔ تفسیر رحمانی میں 'سورہ کہف' میں مذکور ہے کہ سکندر دو  
سلطان سکندر حکیم جو سکندر منیر کہا جاتا ہے۔ دوسرا سکندر کبر و القزین جس  
اختلاف ہے۔ یہ تینوں حکیم سلطان سکندر کے زمانے میں تھے۔ یہ تینوں 'و  
طبیعیاتین کے دلائل کا ابطال کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کا مذہب دھریہ اور  
مذہب سے ممتاز ہو گیا۔ لیکن افلاطون نے سقراط کے بعض مسائل کی اور ارسطو  
کے بعض مسائل کی تردید کی ہے۔ اسی طرح ارسطو کے تبعیین مثلاً 'فالمائی' بعد

نے بھی تردید کی ہے لیکن ان کی تردید سے بعض چیزیں رہ گئی ہیں۔ بیش مسائلی ایسے ہیں جن میں ان لوگوں نے غلطی کی ہے ان میں سے تین مسئلے تو ان کی تکفیر کا سبب ہیں۔ (۱) حشر اجماد کی نفی۔ دوسرے باری تعالیٰ سے علم جزئیات کی نفی۔ تیسرے عالم کا تدبیر ہونا۔ باقی مسائل میں انہیں 'بدعتی' کہا جائے۔

(۲) افعال و افعال اور اس کے متبعین کو اشراقیین کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کا دار و مدار کہاں رہد اور بیاضات شاقہ پر تھا۔ اور اسی طرح وہ اشرافِ قلوب حاصل کرتے تھے۔ بعض اشرافین کے دلوں کا اشراف اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے دلوں ہی میں 'مناظرہ' کرتے اور سوال و جواب کرتے تھے۔ اسلئے اور اس کے متبعین 'مشائین' کہے جاتے ہیں، کیونکہ یہ ہمیشہ سلطان سکند کے ہر کاب رہتے تھے اور ساتھ ساتھ چلتے تھے۔

لفظِ فلسفہ اور سفسطہ کی تشریح | 'فلاسفہ' اور 'فلسفہ' 'فیلاسوفہ' سے ماخوذ ہے۔ 'فیلا' یونانی زبان

میں محبت کرنے والے کو کہتے ہیں اور 'سوفہ' کے معنی ہیں 'حکمت'۔ اس مجموعہ کا معنی ہوا کہ حکمت سے محبت کرنے والا۔ اور حکمت سے مراد حقائق اشیاء کا علم ہے۔ آخری الف کو حذف کر کے اس کو مخفف کیا گیا تو 'فیلاسوف' ہوا اور دونوں الف حذف کر کے 'فیلسفہ' ہوا۔ جب عربی زبان میں اس کو منتقل کیا تو اس کے چاروں حروف علت یعنی یا، واو اور دونوں الف کو حذف کر دیا اور اس کے آخر میں تار مصدری کا اضافہ کیا تو 'فلسفہ' ہو گیا جس کے معنی ہیں 'حکمت سے محبت کرنا'۔

'سفسطہ' 'سوفہ اسطہ' سے ماخوذ ہے۔ 'سوفہ' بمعنی حکمت اور 'اسطہ' یونانی زبان میں 'خط کو زینت دینے والے' کو کہتے ہیں۔ جب ان دونوں الفاظ کو مرکب کیا تو 'سوفہ' کے الف کو اور 'اسطہ' سے ہمزہ کسورہ کو حذف کر دیا۔ 'سفسطہ' ہو گیا اور جب مصدر بنایا تو 'سفسطہ' ہمزہ کو حذف کیا اور تار مصدری آخر میں اضافہ کیا۔ 'سفسطہ' ہو گیا۔

سفسطہ، خط اور باطل کلام کو کہتے ہیں۔ سفسطائیہ کے تین گروہ ہیں۔ سفسطائیہ، سفسطائیہ اور لا افسطہ۔

مجلس شیخ علاؤ الدین سمنانی میں مذکور  
مقدمین حکمائے یونان انبیاء علیہم

## بحث تکفیر ابوعلی سینا

مخالفہ و شرائع کے مخالف تھے یہاں تک کہ افلاطون کا زمانہ آیا تو اس نے  
تردید کی اور بہوں کو باطل کیا۔ لیکن بہتر اصول میں انبیاء کا مخالف رہا  
پھر ارسطو نے ان بہتر مسائل کی تردید کی لیکن وہ بھی ۲۳ مسائل میں انبیاء  
مخالف رہا۔ یہاں تک اس امت مکرّمہ میں ابوعلی بن سینا کا زمانہ آیا تو اس  
مسائل کا ذکر کر کے ابطال کیا۔ لیکن تین مسائل میں شرائع انبیاء کی مخالف  
سبب سے اہل اسلام نے ابوعلی بن سینا کی تکفیر کی لیے

تمام اہل اسلام ان تین مسائل کی وجہ سے 'ابوعلی' کی تکفیر کی طرف  
بلکہ بہتوں نے تو تصدیق کے ساتھ تکفیر کی ہے لیکن خود رسالہ تقسیم  
واسامی 'آن' میں کہا ہے کہ میں ان علوم میں کوئی مسئلہ شریعت کے خلاف نہ  
اگر کوئی مسئلہ بظاہر خلاف شریعت نظر آئے تو تاویل صحیح کے ذریعے سبب میں  
لوگ ابوعلی سینا کی تکفیر کرتے تھے تو اس نے یہ دو اشعار کہے۔

چون من کسی مؤمن و متقن نبود در دہر شلم یکی متقن نہ  
چون من بیک دہر او ہم کافر شد پس وہ یکی دہر مؤمن نہ  
اگر یہ کہا جائے کہ ابوعلی نے ان نصوص کو ظاہر معنی پر محمول نہیں  
ان کی تاویل کی ہے جو کہ علم الہی کے عموم اور مشرّاجساد اور محدث عالم کے  
وارد ہیں اور کفر نصوص کے انکار کی صورت میں ہوتا ہے نہ کہ تاویل کی صورت  
ابوعلی نے ان کا انکار نہیں کیا ہے ؟ تو اس کا جواب حاشیہ خیالیہ پر  
کہ ضروریات دین کے مسائل کے متعلق جو نصوص وارد ہیں، ان سے تاویل کے

لے اس سلسلہ میں مقالہ نگار کی رائے محفوظ ہے، کسی آئینہ موقع پر  
اس کے متعلق بحث کی جائے گی۔

بالاجماع کفر ہے۔ اور اہل سنت والجماعت کا اجماع ضوایات دین پر متفق ہو چکا ہے۔ اور اجماع کی مخالفت بھی کفر ہے۔ عقائد سنیہ کے فصل رابع کے آخر میں شرح مقاصد سے نقل کیا ہے کہ جو شخص عالم کے قدیم ہونے اور حشر جساد کی نفی کا اعتقاد رکھے، وہ کافر ہے۔ نیز مجالس علاؤ الدلہ سمنانی میں مذکور ہے کہ شیخ محمد الدین بغدادی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی تو آپؐ سے عرض کیا کہ ابن سینا کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایسا شخص ہے کہ اسی نے اللہ تعالیٰ سے بغیر میرے واسطہ کے اور اللہ تعالیٰ کی محبت کے ملنا چاہا پس آگ میں گر پڑا۔ جمال الدین حلبی سے بھی خواب میں یہی کہا گیا کہ وہ ایسا شخص ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کے باوجود اس کو گمراہ کیا۔

شکوئی معنوی کے یہ چند اشعار بومصلیٰ کی مگرابی پر دلالت کرتے ہیں ۷

نورِ چشم خود نورِ دست	نورِ چشم از نورِ دلہا حاصل ست
نورِ دل خود حاصل از نورِ خدا ست	نورِ حق از نورِ دلہا کی جُدا ست
فلسفی زین نور نابینا شدہ	کورہ دل زین بومصلیٰ سینا شدہ
بومصلیٰ سینا ازین رمزی نگفت	در غطاء فلسفی آسودہ خفت
نورِ حق داں در دل ایمانیان	شد اذنان ویراں دُکان یونانیان
ہر کہ ادیس نور را بینا بود	تشریح او کی کار بوسینا بود
کار بوسینا ست تصویرِ رجال	لا جرم کارش شدہ عینِ فُضال

علوم فلاسفہ کی اصل تین ہیں۔ اہلیات، طبیعیات، ریاضیات۔ اور ان علوم کے اتنے اقسام ہیں

### علوم فلاسفہ کی اصل

کہ ان کی تعداد تقریباً پچاس تک پہنچ جاتی ہے، جن میں اکثر کا سیکھنا سکھانا حرام ہے اور بعض کا سیکھنا سکھانا مباح ہے۔ چنانچہ علم دین کے حاصل کرنے کے بعد علم تشریح الاعضاء بعد علم طب کا حاصل کرنا مستحب ہے۔ اور مناظرہ، حساب اور مساحت کا علم حاصل کرنا مباح ہے۔ اور علم نجوم کا اس قدر حاصل کرنا مباح ہے کہ اوقات کی شناخت ہو سکے اور قبلہ معلوم کیا جاسکے اور سمندر میں راستہ دریافت کیا جاسکے اور اس سے



زیادہ حرام ہے۔ باقی فلسفہ کے تمام علوم حرام ہیں۔ یہاں تک کہ علم ہیئت یا باطل ہے کیونکہ علم ہیئت کے اکثر مسائل مخصوص نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منہج ان کے ایک یہ ہے کہ تمام فلاسفہ اس پر متفق ہیں کہ آفتاب کی گردش گردش کی وجہ سے ہے۔ ورنہ آفتاب ساکن ہے اور آسمان متحرک ہے۔ آفتاب کی حرکت آسمان کی حرکت کی وجہ سے ہے اور یہ اس حدیث کے خلاف ہے جو صحیحین میں مروی ہے کہ جب غروب آفتاب ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ کہ تمہیں معلوم ہے کہ یہ کہاں جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ زیادہ جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جاتا ہے یہاں تک عرش کے نیچے سجدہ کرتا۔ مشرق سے طلوع کی اجازت چاہتا ہے تو اس کو طلوع کی اجازت دی جاتی ہے۔ قاضی بیضاوی نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں اقوال حکماء کی پیروی کی۔ صحیحین کی یہ روایت حکماء کے مذہب کے باطل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

**علم منطق** | علم منطق کا حاصل کرنا حرام ہے۔ جیسا کہ فقہاء اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔ ملا علی قاریؒ نے بھی شریعہ میں فقہ اکبر میں اس علم کو دلیل کفر سے تعبیر کیا ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے ایک رد تحریم کے متعلق لکھا ہے لیکن اس منطق سے مراد فلاسفہ کی منطق ہے۔ اہل اس مراد نہیں ہے جسے علم کلام کہا جاتا ہے۔

**علم کیمیا** | اس علم کا حاصل کرنا اور مطالعہ کرنا اگرچہ جائز ہے لیکن چونکہ یہ منافی ہے اور اس سے اوصاف ذمیدہ پیدا ہوتے ہیں اس مشغول ہونا بہت بُرا ہے۔

(اور فلاسفہ کے جو علوم تہذیب اخلاق اور ریاضت نفس سے متعلق ہیں ان کو کے سامنے پیش کرنا چاہئے اگر اس کے مطابق ہوں تو ان پر عمل جائز ہے ورنہ نہیں فلسفہ مثلاً علم سحر، موسیقی، دیرنگات، رمیا وغیرہ یہ سب سب بالاعتقاد حرام ہیں۔

لے بخاری، کتاب التفسیر باب سورۃ یس۔

# اندلس کے ایک مشہور قاضی ابوالولید الباجی

طفیل احمد قریشی

موسیٰ بن نصیر فاتح اندلس نے جب رمضان ۳۰۳ھ (نومبر ۹۱۷ء) میں شہید ہوا، اس وقت اندلس کے علاقوں پر اسلامی پرچم لہرایا تو مختلف عرب قبائل میں ان علاقوں میں مستقل آباد ہونے کے لئے آنے لگے۔ ان میں سے ابوجہاز کے قبیلے اور قوطانی قبائل بھی تھے۔ جو دسویں صدی کے اوائل میں بطلیوس میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ مغربی اسپین کا شہر بھی ہے اور صوبہ بھی۔ اس کا موجودہ نام 'بیڈاجوز' یا 'بڈا ہوس' ہے۔ اندلس کے اس مشہور فقیہ (ابوالولید) کا تعلق اسی قبیلے سے ہے۔ آپ کے والد خلف بن سعد بطلیوس کے ممتاز علماء میں شمار ہوتے تھے۔ جن کے ہاں ۳۰۳ھ (۹۱۷ء) بروز دوشنبہ نصف شب کے قریب آپ کی ولادت ہوئی۔ والدین نے نام سلیمان رکھا۔ ابوالولید کنیت ہے۔ چنانچہ تذکرہ نویس آپ کا پورا نام قاضی ابوالولید سلیمان بن خلف بن سعد بن ابوب

لے حسین موسیٰ، فیہ الاندلس، ص ۳۷۱، قاہرہ، ۱۹۵۹ء۔

لے محمد عنایت اللہ، اندلس کا تاریخی جغرافیہ، ص ۱۵۸، حیدر آباد، ۱۳۲۵ھ ۱۹۰۶ء

بن دارث التیمی البابی لکھتے ہیں: آپ کی ولادت کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ کے والد نے بعلبوس کو تیر باد کہا اور باجہ میں آکر آباد ہو گئے۔ آج کل یہ شہر صوبہ 'المیتو' کا صدر مقام ہے۔ اور پرتگال کے دارالحکومت 'لوزین' (لشبونہ) کے جنوب مشرق میں پچانوے میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ یہ وہ دور ہے جب اشبیلہ میں بنو عباد کی حکومت تھی اور باجہ کا علاقہ انہی کے زیر اثر تھا۔ اسی شہر کی مناسبت سے آپ صوف ابو الولید البابی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔

## تحصیل علم

آپ کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں تذکرہ نویسوں نے کوئی زیادہ تفصیلات نہیں دیں۔ ظاہر ہے آپ نے اپنی ابتدائی تعلیم کے مراحل باجہ ہی میں اور گران غالب یہ ہے کہ گھر پر ہی طے کئے۔ البتہ تیس سال کی عمر میں جب آپ مختلف علوم سے بہرہ ور ہو گئے تو مزید تعلیم کے لئے آپ نے مشرق کا رخ کیا۔ یہ سفر ۳۲۵ھ میں آپ نے اختیار فرمایا۔ سب سے پہلے آپ مصر تشریف لے گئے اور وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچے۔ فقہی مسلک کے اعتبار سے چونکہ آپ مالکی تھے اس لئے آپ نے اس دور کے مشہور مالکی عالم ابو ذر احمد بن محمد بن عبد اللہ بن عفر الانصاری (المتوفی ۳۴۵ھ) سے استفادہ کیا۔ خصوصاً ان سے سماعت حدیث فرمائی۔ تذکرہ نویس ابو ذر کو ابن سبک بھی لکھتے ہیں اور اسی نام سے وہ زیادہ مشہور بھی ہیں۔ عبد الغافر تاریخ نیشاپوری میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

کان ابو ذر زاہدا ودعا، عالما سخیا لا یدخر شیئا، و صار کبیر مشیختہ

۱۔ ابن خلکان، وفيات الاعیان ج ۲ ص ۱۵۲، قاہرہ، ۱۳۶۷ھ، ۱۹۴۸ء

علامہ مقرئ، نفح الطیب، ج ۱ ص ۳۵۳، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ

ابن بشکوال، القصد ۱۹۶ھ، قاہرہ، ۱۳۶۷ھ، ۱۹۵۵ء

۲۔ ندیس کا تاریخی جغرافیہ ص ۱۴۱

۳۔ نفح الطیب ج ۱ ص ۳۵۳

المحرم مشارالیه فی المنصوف تدریج علی الصبیح تخریجاً حسناً دکان

حافظاً کثیر الشیوخ ..... الخ

( ابوذر زابد، پرہیزگار، عالم اور سخی تھے۔ وہ کچھ بچا کر نہیں رکھتے تھے۔ وہ حرم کے مشائخ میں سب سے بڑے ہو گئے۔ تصوف میں ان کا پایہ بلند تھا انہوں نے صبح بخاری کی تخریج کی۔ وہ حافظ تھے اور انہوں نے بہت سے شیوخ سے روایت کی..... )  
مکہ میں ابوالولید تین سال رہے۔ اس دوران آپ نے چار ج بھی کہے۔ قیام مکہ کے دوران آپ نے اپنے استاد ابوذر کے ہمراہ مختلف مقامات کے سفر بھی کیے۔

مکہ مکرمہ سے آپ بغداد تشریف لے گئے اور یہ عباسی خلیفہ ابو جعفر عبداللہ بن محمد قائم بامر اللہ (تخت نشین ۳۲۷ھ) کا دور تھا اور وہاں علماء کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ قیام بغداد کے دوران ایک طرف تو آپ نے علمی مباحث و مجالس میں اپنی صلاحیتوں سے اہل مشرق کو متعارف کرایا۔ دوسری جانب مختلف فقہی مسالک اور ائمہ حدیث سے استفادہ بھی فرمایا۔ چنانچہ ابوالطیب الطبری شافعی، قاضی ابوعبداللہ الحسن بن علی الحمیری حنفی، شیخ ابواسحاق الشیرازی اور ابن العروس المالکی وغیرہ کا شمار انہی علماء میں ہوتا ہے جن سے آپ نے مختلف علوم و فنون میں استفادہ کیا۔ بغداد میں آپ کی ملاقات مشہور عالم حافظ ابوبکر الخطیب سے بھی ہوئی۔ اور بقول علامہ مقرئ یہ ملاقات علمی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مشرق اور مغرب کے دو عالموں کو جو اتفاق سے البابی سے عمریں بھی بڑے تھے، البابی سے روایت کرنے اور البابی کو ان سے روایت کرنے کا بھی شرف حاصل رہا۔ مشرق کے عالم سے مراد تو حافظ ابوبکر الخطیب ہیں اور مغرب کے عالم ابو عمر بن عبداللہ ہیں بلکہ خطیب بغدادی نے البابی کے دو شعر لکھے ہیں جنہیں بقول ان کے البابی اپنے بارے میں پڑھا کرتے تھے۔

إِذْ كُنْتُ أَعْلَمُ عِلْمًا يَقِينًا      بَأَنَّ جَمِيعَ حَيَاتِي مَصْنَعَةٌ

فلم لا اکون ضعیفًا بها واجعلها فی صلاح وظ  
 (جب میں یہ جانتا ہوں کہ میری ساری زندگی صرف ایک ساعت ہے  
 نہ اسے احتیاط سے گزاروں - اور اسے نیکی و طاعت میں صرف  
 ابوالولید الباجی بغداد میں تین سال ٹھہرے اس مرحلے میں آپ  
 انیال لوگوں سے ملے اور ہر مکتبہ فکر کی مجالس میں شریک ہوئے بلکہ اس  
 اپنے فقہی مسلک (مالکی) کے علاوہ اخلاف، شواخ اور حنا بلکہ کے فقہی مکات  
 کیا۔ ان دنوں مذہب ظاہری کے کچھ علماء بھی اپنے فقہی مسلک کی اشاعت  
 تھے۔ آپ نے اس مسلک کو بھی بتدریج رد کیا۔ قیام بغداد میں آپ نے دس و تندر  
 حدیث کے لئے بھی کافی وقت نکالا۔ بغداد سے آپ نے موصل کا رخ کیا اور  
 ایک مشہور عالم جعفر السمانی کے ساتھ رہے اور ان سے حدیث، رجال، ف  
 میں استفادہ کیا۔ کہا جاتا ہے کہ موصل میں ایک سال قیام کے بعد آپ دمشق  
 گئے اور حلب کے قاضی بھی مقرر ہوئے۔

مکہ، بغداد اور موصل میں قیام کے دوران متذکرہ علماء کے علاوہ  
 سے استفادہ فرمایا، ابن بشکوال، ابن عاقط ابو عبد اللہ محمد بن علی الصور  
 حقیقی، عاقط ابوالنجیب، ابوالفتح الخاجیری اور ابو علی العطاء وغیرہ۔  
 اور اضافہ کرتے ہیں۔

آپ نے وطن حزیہ (اندلس) سے ۳۲۹ھ میں رخصت سفر باندھا تھا۔  
 بغداد، دمشق اور دیگر مقامات میں آپ کا قیام کل تیرہ سال رہا ہے۔  
 کے مختلف ملی چشموں سے سیراب ہو کر آپ تقریباً ۳۳۹ھ میں واپس آنا  
 لے آئے۔

تیرہ سال مشرق میں قیام کے بعد جب آپ واپس وطن پہنچے تو آپ  
 کا چرچا اندلس میں پہلے ہی دور دور تک ہو چکا تھا۔ عوام اور خواص نے آپ کو

یا۔ لیکن وطن آکر جب آپ نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی تو حالات کو کافی پریشان  
کُن پایا۔

سب سے پہلے آپ کی نظر اپنے ملک کی سیاسی صورت حال پر پڑی۔ اندلس  
کی تاریخ میں اس دور کو طوائف الملکی کا دور کہا جاتا ہے۔ 'بنو امیہ' کی شیع اقتدار  
گل ہونے کو تھی۔ اموی سلطنت کچھ تو بیرونی حملوں کی وجہ سے اور کچھ اندرونی خلفشار  
سے کمزور ہو چکی تھی۔ مختلف حلقوں کے رؤساء اور اہماء علی طوط پر خود مختار ہوتے جا رہے  
تھے۔ مزید یہ ہے کہ ان کی آپس کی سیاسی مناقشت اور سیاسی دھڑے بندیوں نے عجیب  
صورت حال پیدا کر دی تھی۔ ان حالات میں مختلف خود مختار قسم کے رؤساء کو ایک جگہ جمع  
کرنا مشکل ترین کام فرود تھا مگر ابوالولید نے بہت نہ ہاری اور وہ ذاتی اثر کو استعمال کرتے  
ہوئے رؤساء کے درمیان مختلف قسم کے اختلافات ختم کرانے میں کافی حد تک کامیاب  
ہو گئے بلکہ

جیسا کہ ہم بتاتے ہیں اندلس کی عدالتوں میں مالکی فقہ کے مطابق فیصلے ہوتے  
تھے۔ اور عوام میں بھی اس فقہ کا چرچا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک نیا فقہی مذہب  
بھی مختلف حلقوں میں اپنایا جا رہا تھا، جسے ظاہری مذہب کہا جاتا ہے۔ اندلس میں اس  
فقہی مسلک کے داعی علامہ ابن حزم تھے جو نہ صرف ابوالولید الباجی کے سمعہ ہیں بلکہ  
علم و دانش میں بھی ممتاز علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ جب ابوالولید وطن لوٹے تو ابن حزم  
اپنے فقہی مسلک کی اشاعت میں سرگرم کام تھے۔ چنانچہ ابوالولید نے نہ صرف اس فقہی مسلک  
کے زور کو کم کرنے میں مالکی فقہاء کا ساتھ دیا بلکہ خود علامہ ابن حزم سے مناظرے کئے۔  
ابن علی شافروں میں ابن دون کی نوک جھونک بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ ایک  
موقعہ پر الباجی نے ابن حزم پر طنز کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے، میں نے چوکی دار  
کے چراغ کی روشنی میں تعلیم پائی ہے" ابن حزم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "تو پھر

مجھے بھی معذور فرمائیے، میں نے بھی سونے چاندی کے منبروں پر تعلیم پائی ہے بلکہ ان جملوں سے دونوں کی شخصیت پر بھی نظر پڑتی ہے۔ ابو الولید نے شہر شہر پھیر کر اور سکالیف و مصائب برداشت کر کے علم حاصل کیا۔ اس کے برعکس ابن حزم دیر زائے تھے۔ آپ کی تعلیم بھی رئیس زادوں کی طرح ہوئی۔ فقہی اختلاف اور اس نوک جھونک کے باوجود علامہ ابن حزم، ابو الولید کے علمی تبحر کے معترف تھے۔ ابن بسام نے ایک روایت لکھی ہے کہ

بلغنی انه ابن حزم كان يقول لو لم يكن لا مصحاب المذهب المائتي

بعد عبد الوهاب الا مثل ابی الولید الباجی لکھا ہوں۔

(مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ ابن حزم فرماتے تھے۔ عبد الوہاب کے بعد مالکیوں میں الباجی کے علاوہ اگر اور کوئی (جتید عالم) نہ بھی ہوتا تو ان کے لئے کافی تھا بلکہ)

ابو الولید الباجی جہاں اچھے مدبر اور متکلم ثابت ہوئے وہاں وہ ایک ممتاز فقیہ بھی ہیں مشرق کے طویل سفر میں مختلف فقہی مسائل کا جو جامع مطالعہ آپ نے کیا اس سے اندس والوں کو بھی آپ نے استفادہ کرنے کا موقعہ دیا۔

ظاہر یہ ہے اور مختلف علماء سے علمی مناظروں، مختلف امراء کو سیاسی طوع پر ایک دوسرے کے قریب لانے کے بعد جو وقت بھی آپ کے پاس بچتا، آپ وہ درس و تدریس میں صرف کرتے اور طالب علموں کو علمی استفادہ کا موقع دیتے۔ اندس میں ان دنوں کسی عالم کے علمی تبحر کا اعتراف اُسے قضا کے مہدے کی پیشکش کی صورت میں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آپ کو 'سرقسطہ' کا قاضی بنا دیا گیا۔ سرقسطہ اس دور میں اندس کا ایک صوبہ تھا جسے آج کل 'ساگوستا' یا زاراگوزا بھی کہا جاتا ہے۔ اس صوبہ کے مشہور شہر 'لارده'، 'طلعه ایوب'، 'طرسونہ'، 'وشقہ'، 'تمریط' اور 'مدینہ سالم' وغیرہ تھے جہاں نے میں آپ

۱۔ ابو زہرہ، ابن حزم، قاہرہ۔ ۱۳۶۳ھ - ۱۹۵۲ء بحوالہ معجم الادباء ج ۱۲ ص ۲۴

۲۔ فتح الطیب ج ۱ ص ۲۵۳۔ ۳۔ اندس کا تاریخی جغرافیہ ص ۲۴

اس علاقے کے قاضی بنائے گئے، یہاں ابو ایوب سلیمان (المتوفی ۱۲۳۵ھ) کے بیٹے جوہر احمد المقدماثر (المتوفی ۱۲۴۵ھ) کی حکومت تھی۔

## تصنیفات

ابو الولید الباجی کی تصنیفات جو ہم تک قلمی صورت میں پہنچی ہیں، ان کی نفع الطیب کے مصنف نے ایک فہرست پیش کی ہے جس

سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ سیاسی تدریسی اور عدالتی مصروفیات کے باوجود آپ نے جو شہ پارے چھوڑے، وہ پانچویں صدی ہجری کے اسلامی علوم کی فہرست کتب میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ان میں کچھ کتب حدیث اور کچھ فقہ میں ہیں۔ چند کتابیں اصول حدیث، اصول فقہ، تفسیر اور علم کلام پر بھی ہیں۔ چنانچہ آپ کی مشہور کتابوں کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) التصدیق الی معرفة التوحید

(۲) السراج فی الخلاف

(۳) التبیین لمسائل المہتدین فی اختصار فرق الفقہاء

(۴) ترتیب الحجاج۔

(۵) شرح المنہاج۔

(۶) سنن المنہاج۔

(۷) احکام الفصول فی احکام الاصول۔

(۸) الاشارة فی اصول الفقہ۔

(۹) تفسیر قرآن الحکیم۔

(۱۰) التعلیل والتہتم لمن خرج عنہ الجملی فی الصبیح۔

(۱۱) شرح مؤلفا (جس کو الاستیفاء اور المنسقی میں بانٹ دیا گیا ہے اور جوسات

جلدوں پر مشتمل ہے اور مالکی فقہ کی اہم تری کتب سمجھی جاتی ہے)



(۱۲) المعانی فی شرح الموطا (جو بقول چند لوگوں کے بیس جلدوں پر مشتمل ہے)

(۱۳) کتاب الایماء (پانچ جلدوں میں)

(۱۴) اختلاف الموطات

(۱۵) کتاب الحدود

(۱۶) سنن الصالحین

(۱۷) مختصر المختصر فی مسائل المدونة.

## شعروادب

ابوالولید الباجی ممتاز عالم اور قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب اور شاعر بھی تھے۔ ان کی شریکاری کا اندازہ تو ان کتب سے لگایا جاسکتا ہے، جو مختلف کتب خانوں اور آثار قدیمہ کے مختلف مراکز میں موجود ہیں۔ لیکن ان کی نظم کے بیشتر نمونے مختلف تصانیف میں ملتے ہیں۔ کہیں کہیں الباجی خود بھی اشعار نقل کر جاتے ہیں لیکن مضمون چونکہ خالص علمی ہوتا ہے اس لئے تحقیق کتب میں اشعار نقل کرنے سے وہ اکتنا ہی کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ ان کے اشعار منتشر ہیں اور مختلف کتب میں صرف تذکرہ ملتے ہیں۔

## وفات

قاضی ابوالولید نے ۱۹ رجب ۷۷۷ھ جمعرات کی رات داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور رباط میں صفة البحر میں دفن کئے گئے نماز جنازہ آپ کے صاحبزادے ابوالقاسم نے پڑھائی لے آپ کے یہ صاحبزادے خود بھی اچھے عالم تھے ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

سکن مرقسطہ وغیرھا وروی عن ابیہ معظم علیہ وخلفہ بعدہ.

وفاته فی حلقته وغلب علیہ علم الاصول ... بق

۱۔ ابن بشکوال ج ۱۔ ص ۱۹۹۔ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۱۱۔ نفح الطیب ج ۱

۳۵۳۔

نفح الطیب ج ۲ ص ۲۵۰۔

یعنی وہ سراسر وفیرہ میں رہے اور اپنے والد (ابوالولید) سے روایت کی۔ علم میں ان کا مقام بلند ہے۔ اپنے والد کی وفات کے بعد ان کے حلقہ میں ان کے جانشین ہوئے۔ علم اصول فقہ میں انہیں کافی دسترس تھی :

ابوالولید الباجی کی وفات سے نہ صرف ایک مالکی فقہ کے ممتاز عالم کی کمی ہوگئی بلکہ اہل اندلس ایک اچھے مدبر اور قاضی سے بھی محروم ہو گئے۔ ابوعلی بن سکرہ کا یہ قول آپ کی جملہ صفات کی نشان دہی کرتے ایک جامع ترین بیان ہے کہ

مارأيت مثل أبي الوليد الباجي ، وما رأيت احدا على هيئته وسمته  
وتوقيره مجلسه - (فتح الطيب ج ۱ ص ۲۵۳)

یعنی میں نے ابوالولید الباجی جیسا کسی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی آپ جیسی شخصیت وضع اور مجلسی دہدہ کا سا کوئی نظر آیا ۔

## قاضی ابوالولید الباجی کی ایک نظم کے چند شعر

مغنی زمن المكارم والكرام	سقاء الله من صوب الغمام
وكان البر فعلا دون قول	فصار بعد فطقا بالكلام
وزال النطق حتى لست تلقى	فنى بسخو برقر للسلام
وزاد الامر حتى ليس الا	مغنى بالاذى او بالملام

(اچھائیوں اور اچھوں کا زمانہ گیا، اللہ اس زمانے کو بادل سے سیراب کرے۔ اس زمانے میں قول کے بجائے عمل کی تھی، پس وہ محض زبانی بن کر رہ گئی۔ اور وہ زبانی بھی نہ رہی یہاں تک کہ تو کسی کو جواب میں سلام تک کہتا نہیں پاؤ گے۔ اور معاملہ اس حد سے بھی آگے بڑھ گیا کہ اور اب اذیت اور طعنت کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔)

## مفتی عنایت احمد کا کوری

پروفیسر محمد ایوب قادری ایم اے

**خاندان** | مفتی عنایت احمد بن منشی محمد بخش بن منشی لطف اللہ ، کہا جاتا ہے کہ ان کے اجداد میں امیر حسام نامی ایک شخص بغداد سے آکر قصبہ 'دیوہ' ضلع بارہ بنگی میں سکونت پذیر ہوئے اور اپنے صاحبزادے ضیاء الدین کی شادی وہیں کی اور وہیں کے قاضی مقرر ہوئے۔ قصبہ 'دیوہ' میں جس محلہ میں امیر حسام نے قیام کیا وہ مجاہدی محلہ مشہور ہوا۔ جس کو بعد میں 'مجاہدی' کہا جانے لگا۔ اسی مناسبت سے امیر حسام کی اولاد بھی 'مجاہدی' کہلائی۔

باقی مولف مشاہیر کا کوری لکھتے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے کہ امیر حسام ، محبت بن یوسف ثقفی حاکم عراق کی اولاد سے ہیں۔

**سکونت کا کوری** | مفتی عنایت احمد کے دادا منشی غلام محمد کی نسل کا کوری میں تھی۔ مفتی صاحب کے والد ، منشی محمد بخش اور چچا شیخ عبدالحسیب نے اپنے نانہالی تعلق کی بناء پر کا کوری میں سکونت اختیار کر لی۔ پھر ان کے تمام قریبی اعزا بھی کا کوری آکر سکونت پذیر ہو گئے اور

’کا کوروی‘ کہلانے لگے۔ اب بھی ان کا بڑا خاندان وہاں سکونت پذیر ہے۔

**پیدائش** مفتی عنایت احمد صاحب ۹ شوال ۱۲۳۵ھ کو بمقام ’دیوہ‘ پیدا ہوئے۔

**تحصیل علم** مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم کا کوروی میں حاصل کی، جب تیرہ سال کی عمر ہو گئی تو تحصیل مسلم کی غرض سے ’رام پور‘ گئے۔ وہاں

مولوی سید محمد صاحب بریلوی سے صرف و نحو اور مولوی حیدر علی صاحب ٹونکی د مولوی نور الاسلام سے دوسری درسی کتابیں پڑھیں۔ رام پور میں درسی کتابیں ختم کرنے کے بعد ’دہلی‘ پہنچے۔ وہاں شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۳ھ سے کتب حدیث سبقتاً پڑھیں اور سند حاصل کی۔ دہلی سے ’علی گڑھ‘ آئے، جہاں مولانا بزرگ علی مارہروی شاگرد شاہ عبدالعزیز دہلوی و شاہ رفیع الدین دہلوی جامع مسجد کے مدرسے میں دینی خدمات انجام دے رہے تھے۔ یہ مدرسہ ہمد محمد شاہی میں نواب ثابت خان عامل کول (علی گڑھ) نے اپنی عالیشان تعمیر کردہ جامع مسجد میں قائم کیا تھا۔ علی گڑھ میں مفتی عنایت احمد نے تمام منقولی اور مقولی کتابیں مولانا بزرگ علی سے پڑھیں اور فارغ التحصیل ہوئے۔ بعد فراغ اسی مدرسے میں مدرس مقرر ہو گئے۔ کیونکہ ۱۲۳۳ھ میں مولانا بزرگ علی کا انتقال ہو گیا تھا۔

**ملازمت** ایک سال تک مدرسے میں مدرس رہے۔ اس کے بعد مفتی و مصنف کے مدرسے پر ’علی گڑھ‘ ہی میں تقرر ہو گیا۔ اسی زمانے میں مولوی

لطف اللہ علی گڑھی المتوفی ۱۲۳۳ھ کے تلامذہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولوی لطف اللہ مفتی صاحب کے نامور شاگرد گزرے ہیں۔ مولوی سید حسین شاہ بخاری نے بھی اسی زمانے میں مفتی صاحب سے پڑھا ہے۔

**اجلاس میں سبق** مولوی سید حسین شاہ بخاری فرمایا کرتے تھے کہ مفتی صاحب محمد کو ’ہدایہ‘ اجلاس میں پڑھایا کرتے تھے۔ جیسے

ہی کسی مقدمہ سے فرصت ہوتی اشارہ ہوتا میں پڑھنا شروع کر دیتا تھا پھر کوئی

سرکاری کام آجاتا تو اس میں مصروف ہو جاتے۔ اس دو گونہ مشغولیت کے باوجود مسائل اس طرح ذہن نشین کرا لیتے کہ کبھی فراموش نہ ہوتے، آپ طلبہ سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی تعلیم کے زمانے میں ہی مفتی صاحب کا تبادلہ علی گڑھ سے 'بریلی' ہو گیا تھا۔ مولوی لطف اللہ صاحب بریلی ساتھ گئے، وہاں جلد کتب درسیہ ختم کیں۔ فجر کی نماز کے بعد مفتی صاحب قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے مولوی لطف اللہ صاحب خدمت میں حاضر رہتے تھے دورانِ تلاوت اگر کوئی مشکل صیغہ آتا تو مفتی صاحب مولوی لطف اللہ صاحب کو حل کر دیتے تھے۔ جب مفتی لطف اللہ صاحب تعلیم سے فارغ ہو گئے تو مفتی صاحب نے ان کو اپنے اجلاس کا سرشتہ دار مقرر کیا۔

**قیام بریلی** | بریلی کے قیام کے زمانے میں مفتی صاحب صدر امین ہوئے، درس و تدریس کا سلسلہ برابری جاری رہا۔ بریلی کے تلافیہ میں قاضی عبدالجلیل،

مولوی قدا حسین منصف اور نواب عبدالعزیز خان مشہور لوگ گزرے ہیں۔ آخر الذکر حافظ الملک نواب حافظ رحمت خان کے پوتے تھے۔ درس و تدریس کے ساتھ ساتھ تعزین و تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس زمانے میں بریلی میں مفتی عنایت احمد صاحب کے ہم وطن مولوی رضی الدین بن ملیم الدین المتوفی ۱۳۳۸ھ صدر الصدور تھے۔ مفتی صاحب ۱۳۳۸ھ میں آگرہ کے صدر اعلیٰ مقرر ہوئے، ابھی بریلی سے روانگی عمل میں نہیں آئی تھی کہ ۱۳۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی۔ مفتی صاحب آگرہ نہ جا سکے۔

**انقلاب ۱۳۵۷ء** | نواب خان بہادر خان نبیو حافظ الملک حافظ رحمت خان نے روہیلکھنڈ میں علم جہاد بلند کیا اور فوجی حکومت قائم

کی تو حکومت کو خزانہ کی ضرورت ہوئی، زیند ادوں سے مالگنداری وصول کی گئی۔ امراء اور مہاجنوں سے عطیات لئے گئے۔ فوجی حکومت کی مالی مدد کیلئے مفتی عنایت احمد صاحب نے فتویٰ دیا۔ جب تحریک آزادی ناکام ہو گئی اور ملک پر انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہو گیا تو یہ فتویٰ انگریزوں کے ہاتھ لگ گیا۔ چنانچہ مفتی صاحب گرفتار ہوئے۔ مقدمہ چلا اور عبور دریائے شور کی سزا تجویز ہوئی۔

## قیامِ انڈمان

مفتی عنایت احمد صاحب نے جزیرہ انڈمان میں بھی درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ جزیرہ انڈمان میں

ان کے پاس کسی علم کی کوئی کتاب نہ تھی محض اپنی قوتِ حافظہ پر مختلف فنون میں سلسلے تصنیف کئے۔ وطن واپس آکر کتابیں دیکھیں تو تمام مسائل حرف بحرف صحیح تھے۔

ایک انگریز کی فرمائش پر 'تقوم البلدان' کا ترجمہ کیا جو دو برس میں ختم ہوا۔ اور وہی ترجمہ رہائی کا سبب بنا۔ ۱۳۷۷ھ میں مفتی صاحب رہائی پا کر کاکوری آئے۔ مولوی لطف اللہ صاحب علی گڑھی نے تاریخ رہائی لکھی اور خود کاکوری حاضر ہو کر پیش کی ہے

چون یہ فضلِ خالقِ ارض و سما      دوستام شد ز قیدِ غم رہا  
بہر تاریخِ خلاص آں جناب      بدوشتم بہنِ استاذی نجبا

## قیامِ کان پور

انڈمان سے واپس آکر مفتی صاحب نے مستقل قیام کان پور میں کیا۔ وہاں مدرسہ فیض عام قائم کیا جو کان پور کی مشہور

دینی درسگاہ ہے۔ کان پور کے مسلمان تاجر مدرسہ کے مصارف برداشت کرتے تھے۔ ان میں حافظ بن خوردار خاص طور سے مشہور تھے۔ مفتی صاحب اپنے مصارف کیلئے صرف یہی تیس روپیہ ماہانہ تنخواہ لیتے تھے۔ بڑا مولانا نواب حبیب الرحمن خان شروانی، اسی مدرسہ کا فیض بالآخر 'ندوة العلماء' کی شکل میں ظاہر ہوا۔

## سفرِ حج

دو سال کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ مدرسہ فیض عام کان پور میں مولوی سید حسین شاہ بخاری کو مدرسہ ثانی مقرر کر کے حج کو روانہ ہو گئے۔ مفتی

صاحب ہی امیرِ حجاج تھے۔ اس زمانہ میں جہاز ہوا کی مدد سے چلتے تھے۔

## شہادت

جدہ کے قریب جہاز پہاڑ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ مفتی صاحب بحالت نماز احرام باندھے ہوئے تھے غرقِ شہید ہوئے۔ یہ واقعہ، ارشوال

۱۳۷۹ھ کا ہے۔ ۵۲ برس کی عمر پائی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔

اس سعیدہ علم کے ساتھ ناقد تصنیف کا ایک مستودہ بھی غرقاب ہوا جس کی تلافی ناممکن

ہے۔ مفتی عنایت احمد صاحب نے چالیس فنون کے ایک ایک مسئلے کا انتخاب کیا تھا

اور ہر ایک مسئلہ پر چالیس ورق لکھنے کا التزام اس صفت کے ساتھ ۔  
مسئلہ بھی بے نقط ہو اور اس پر پوری بحث بھی شگفتہ عبارت میں اسی التزام  
کی جائے ۔ تفسیر میں ”وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا“ کی آیت اور حدیث میں ”کُلُّ  
حَرَامٍ رَدَاهُ مُسْلِمٌ“ متنب فرمائی تھی ۔ بڑا حقہ مکمل ہو چکا تھا ۔

**تلامذہ** مفتی صاحب کے تلامذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے ان میں سے  
نامور مدرس ہوتے ۔ چند نام یہ ہیں ۔

مولوی سید حسین شاہ بخاری ، مولوی امیر الدین احمد بخاری ، مولوی لطف  
علی گڑھی ، مولوی حافظ عزیز الدین صاحب عباسی ، مولوی حافظ قراہ عبدالعز  
بریلوی ۔ منشی مقصود احمد وغیرہ ۔

**متصانیف** مفتی عنایت احمد صاحب کی تصانیف بھی بہت ہیں جو آ  
علم و فضل پر دال ہیں ۔ خاص بات یہ ہے کہ آج تک  
صاحب کی کتابوں پر کسی نے اعتراض نہیں کیا اور مفتی صاحب نے اردو میں جو  
لکھے ہیں ان کی زبان نہایت صاف اور با محاورہ ہے مضامین اخلاقی اور ا  
ہیں ۔ ایک مختصر سائنس جمع کر لیا تھا اسی کی مدد سے مفتی صاحب کی یہ تصا  
طبع ہو کر تقسیم و شائع ہوتی تھیں ۔

شرح ہدایۃ الحکمتہ ، صددا شیوازی ، تصدیقات حمد اللہ اور شرح  
پر بھی حواشی لکھے ہیں ۔ اب آپ کی جملہ تصانیف کا علمدہ طلحہ ذکر کیا ۔  
**علم الفرائض** کتاب کے نام سے مضمون ظاہر ہے ۱۲۶۷ھ میں  
گئی ۔ نام تاریخی ہے ۔

**ملخصات الحساب** فن ریاضی پر مفید رسالہ ہے ریاضی کے ابتد  
آسان پیرائے میں تحریر کئے ہیں یہ کتاب بھی  
میں لکھی گئی ۔ نام تاریخی ہے ۔

تصدیق المسیح لردع کلم القبیح | نام سے مضمون ظاہر ہے ۱۲۶۸ء میں کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

الکلام المبین فی آیات رحمۃ اللعالمین | یہ فہم تصنیف ہے ۱۲۶۸ء میں کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

معجزات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نہایت شرح و بسط سے کیا ہے۔

غمان الفردوس | ۱۲۶۷ء میں یہ رسالہ لکھا گیا نام تاریخی ہے۔ بخاری کی ایک حدیث کی شرح ہے۔ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے

پہلے باب میں معاصر متعلقہ زبان کا بیان ہے اور دوسرا باب حضور خاص کے گناہوں پر مشتمل ہے۔

بیان قدر شب برات | یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے شب برات کے فضائل میں۔ ۱۲۶۷ء میں لکھا گیا ہے۔ نام تاریخی ہے۔

رسالہ در مذمت میلہ ہا | یہ رسالہ ۱۲۶۷ء میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے۔ مسلمان ہندوؤں کے میلوں میں شرکت کرتے ہیں اس کے رد میں لکھا گیا ہے۔

فضائل علم و علمائے دین | نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۱۲۶۷ء میں کتاب لکھی گئی۔ نام تاریخی ہے۔

محاسن العمل الافضل | یہ کتاب بھی ۱۲۶۷ء میں لکھی گئی۔ نام بھی تاریخی ہے۔

فضائل درود و سلام | فضائل درود و سلام میں یہ کتاب ۱۲۶۷ء میں لکھی۔

ہدایات الاضاحی | نام سے کتاب کا مضمون ظاہر ہے تاریخی نام ہے۔ ۱۲۶۷ء میں لکھی گئی۔



الدر الفرید فی مسائل القیام والعیاد نام سے مضمون کتاب ظاہر ہے ۱۹۳۷ء میں مرتب ہوئی نام تاریخی ہے۔

وظیفہ کریمہ اوراد و وظائف پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں انڈمان میں لکھی گئی۔ کتاب طبع ہو چکی ہے۔

نجستہ بہار گلستان کے طرز پر فارسی شعر میں یہ کتاب لکھی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں انڈمان میں تالیف کی۔

علم الصیغہ عربی صرف کا نہایت جامع رسالہ ہے آج تک داخل نصاب ہے کوئی حافظ وزیر علی صاحب تھے ان کی تحریک پر یہ رسالہ لکھا گیا اس کا دوسرا نام قوانین جزئیہ حافظیہ بھی ہے۔ یہ رسالہ بھی ۱۹۳۷ء میں انڈمان میں لکھا گیا۔ نام تاریخی ہے۔ یہ رسالہ ایک مقدمہ، چار ابواب اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے۔

احادیث الحبیب المتبرکہ مفتی صاحب نے ۱۹۳۷ء میں انڈمان کے قیام کے دوران پچالیس حدیثوں کا یہ مجموعہ مرتب کیا۔

رسالہ طبع ہو چکا ہے۔

تواتر حبیب اللہ جزیرہ انڈمان میں یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں سرکاری ڈاکٹر محمد امیر خان کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی جس کا ذکر مفتی صاحب نے دیباچہ میں کیا ہے۔ واقعات نہایت تفصیل سے بقید تاریخ لکھے ہیں۔

سیرت کے مضمون پر مختصر اور جامع کتاب ہے۔

ترجمہ تقویم البلدان جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے ایک انگریز کی فرمائش پر یہ کتاب عربی سے اردو میں انڈمان کے قیام میں ترجمہ ہوئی اور

بھی ترجمہ رہائی کا سبب بنا۔

نقشہ موقیع النجوم یہ کتاب ہیئت حبید (فیضانورثی) پر لکھی ہے۔ بعض انگریزوں نے اس کو پسند کیا۔ اور مؤلف تذکرہ مشاہیر

کا کوری نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مشرطامسن ایفٹنٹ گورنمنٹ مغلطی و مشتی نے جو علم ہیئت کے عالم تھے اس کو خاص طور سے پسند کیا اور اسی کتاب کی وجہ سے مفتی صاحب کو خان بہادر کا خطاب ملا۔

یہ بیان کچھ مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اس وقت تک خطاب کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا۔ اگر خطاب ملتا تو شمس العلماء نہ کہ خان بہادر۔ پھر اس خطاب کا ذکر یا حوالہ ان کی کسی کتاب میں نہیں ہے۔

**لوامع العلوم و اسرار العلوم** | اس کتاب کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اس میں چالیس علوم کا خلاصہ لکھنا پیش نظر تھا ہر علم کا نام بھی بے نقط تھا مثلاً علم التفسیر کا نام علم کلام اللہ، علم حدیث کا نام علم کلام الرسول، فقہ کا نام علم الاحکام وغیرہ۔ یہ کتاب مفتی صاحب کے ساتھ غرق ہو گئی۔ حواشی کو چھوڑ کر مفتی صاحب کی جملہ تصانیف کی تعداد بیس ہے جو معلوم ہوئی ہیں۔ ان میں سے چھ کتابیں 'وظیفہ کریمہ'، 'نجمتہ بہار'، 'علم العینہ'، 'احادیث الحبیب المتبرک'، 'تواریخ حبیب اللہ' اور 'ترجہ تقویۃ البدان' تو انڈمان میں لکھی گئی ہیں اور خیال یہ ہے کہ ضحان الفردوس، بیان شب قدر و شب برات، رسالہ حدیث میلہ، فضائل علم و علمائے دین، حماس العمل الافضل، فضائل درود و سلام اور ہدایا الانسانی بریلی کے قیام کے دوران لکھی گئیں یہ ساتوں کتابیں ۱۳۳۷ھ میں تالیف ہوئیں اور اس وقت مفتی صاحب کا قیام بریلی میں تھا۔

**تبحر علمی** | مفتی عنایت احمد کا علم و فضل مسلم ہے۔ ان کی تصنیفات اس پر دل ہیں کہ منقول و منقول ہر دو علوم میں انہیں تبحر حاصل تھا۔ تمام علوم بہت محنت سے پڑھاتے تھے۔ ریاضی میں خاص امتیاز حاصل تھا ادب کا ذوق تھا۔ جب مفتی صاحب کا پنور میں مقیم تھے تو روزانہ شام کو میدان میں ہوا خوری کیلئے تشریف لے جاتے تھے۔ مولوی سید حسین شاہ بخاری سے اکثر علمی و ادبی تذکرے ہوتے تھے۔ مفتی صاحب کو اردو اساتذہ کا اکثر کلام یاد تھا۔

## مفتی صاحب کی تحریرات

مفتی عنایت احمد صاحب نے اپنے استاذ مولف بزرگ علی صاحب مارہروی کی بعض کتب پر تہ اور دیگر تحریرات اپنے قلم سے لکھی ہیں۔ وہ کتابیں مولانا نواب حبیب الرحمن خان شروا مرحوم کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ اس طرح مفتی عنایت احمد صاحب کی اصل تحریر بھی موجود ہے۔

یہ مضمون مندرجہ ذیل کتابوں کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔

**ماخذ** تذکرۂ مشاہیر کاکوری، مؤلف مولوی محمد علی حیدر۔ مطبوعہ امجد لطیف لکھنؤ ۱۹۳۶ء۔ (۲) استاذ العلماء وحالات مولانا لطف اللہ علی گڑھی (مؤلف نواب حبیب الرحمن خان شروانی (۳) توارخ حبیب اللہ (۴) علم الصیفہ (۵) فضائل الفردوس (۶) بیان شب قدر و شب براءت۔ (۷) حیات حافظ رحمت خاں (۸) باغی ہندوستان (۹) مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد دوم۔

## المسوی من احادیث الموطا

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ مشہور کتاب آج سے ۳۴ سال پہلے مکہ مکرمہ میں مولانا عبید اللہ سندھی کے زیر انتظام چھپی تھی۔ اس میں جایا مولانا مرحوم کے تشریحی حواشی ہیں۔ مولانا نے حضرت شاہ صاحبؒ کے حالات زندگی اور ان کی الموطا کی فارسی شرح پر مؤلف امام نے جو بیسوط مقدمہ لکھا اس کتاب کے شروع میں اس کا عربی ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔

ولایتی کپڑے کی نفیس جلد۔ کتاب کے دو حصے ہیں۔

قیمت ۱۔ بیسویں روپے

# مشرقی پاکستان کے صوفیائے کرام چہل غازی

دفاعی ایڈیٹر

چہل غازی کسی ایک بزرگ کا نام نہیں بلکہ ان چالیس صوفیائے کرام کا تذکرہ ہے جو سرزمین مشرق پاکستان میں بغداد جیسے دُور افتادہ مقام سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی خاطر تشریف لائے تھے۔ عرب، ایران اور عراق سے جو بزرگوار دین بنگال میں وارد ہوئے ان میں چہل غازی کی جماعت بھی قابل ذکر ہے۔ ابتداء میں ارض پاک کا یہ مشرقی حصہ ہندومت اور بدھ مت کے زیر اثر تھا۔ ۱۲۰۷ء سے ۱۲۰۸ء تک بدھ مذہب کے پیرو دھرم پال اور سین ماجاؤں کی حکومت کے بعد یہاں مسلمانوں نے قدم جمائے۔ ۱۱۹۹ء میں اختیار الدین محمد بختیار خلجی نے سین خاندان کے آخری حکمران کشمن کی ماجد خانی پر قبضہ کیا۔ ۱۲۰۲ء تک نہ صرف بنگال اس کے زیرِ چنگ آ گیا بلکہ دُور تک شجر اسلام کی بڑیں مضبوط ہو گئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سلطان قطب الدین ایبک (جس کا عہد حکومت ۱۲۰۶ء سے ۱۲۱۰ء تک ہے) سارے ہندوستان کا بادشاہ بن چکا تھا۔

بختیار علی نے اپنے دور میں بنگالہ میں دانشوروں، عالموں اور ورڈیش کی بہت بہت افزائی کی، اس زمانے میں فضا ایسی تھی کہ دور دور تک اللہ اور اس کے رسول کا نام یوں نظر نہ آتا تھا۔ اکتے دکتے مسلمان کسی گاؤں قصبے میں ہوتے تو ہندو انہیں ہر طرح پریشان کرتے طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتے۔ غرض یہ کہ ان کا جینا حرام کر دیتے۔ ایسے بہت شکن ماحول اور کفر و الحاد کی فضا میں آفتاب توحید طلوع ہوا اور اسلامی تہذیب و تمدن کی کرنیں پھوٹیں صوفیائے کرام نے عوام میں اسلامی رجحانات اور دینی میلانات پیدا کئے۔ خصوصاً دینچ پور اور اس کے نواحی علاقوں میں جی اللہ والوں نے تصوف کے درس دیتے، اللہ کی تعلیمات اور رسول کے پیغامات کو عام کیا، ان میں سید نقیس الدین شاہ، ہمیش پیر، مولانا عطا کے علاوہ 'چہل غازی' کی جماعت کا خاص حصہ ہے۔

'چہل غازی' نے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ (۱۱۸۶-۱۲۲۷ء) سے بیعت کی تھی۔ آپ اپنے وقت کے ایک بلند پایہ صوفی اور صاحب عرفان تھے۔ بختیار کاکیؒ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ (۱۲۳۶-۱۳۰۳ء) جیسے شاہ حقیقت اور سلطان طریقت کے خلیفہ تھے بلکہ یہ وہی خواجہ اجمیری ہیں جن کے فیوض و کرامات سے برصغیر پاک و ہند کا چہرہ چہرہ فیضیاب ہے اور جن کی درگاہ مبارک لاکھوں زائرین کیلئے مرکز زیارت و منبع فیض ہے۔ حضرت بختیار کاکیؒ کے لاتعداد مرید اور عقیدت تھے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سلطان آتش بھی ان کے خاص متبعین تھے۔ 'چہل غازی' نے حضرت بختیار کاکیؒ سے رشد و ہدایت حاصل کی اور جب وہ اسرار و رموز سے واقف ہو گئے اور ان کا باطن تجلیات الہیہ و تعلیمات دینی سے منور ہو گیا تو حضرت بختیار کاکیؒ نے ہدایت فرمائی،

”بنگال جاؤ! وہاں اللہ کے دین اور رسول کے پیغام کو عام کرو۔“

مرشد کی ہدایت پر چالیس صوفیائے کرام کا ایک گروہ بنگال کیلئے روانہ ہوا۔ مختلف

ملاحوں سے گزرتے ہوئے یہ قافلہ صوبہ بہار کے ایک مقام 'مونگیر شریف' میں نیمہ رن ہوا۔ حضرت فتح زین الدین ہسپتال میر کارواں تھے۔ اس کے بعد بزرگان دین کی یہ جماعت بنگال پہنچی اور دیناج پور میں قیام پذیر ہوئی۔ ۱۹۷۷ء میں ان کے پیر سالک حضرت اختیار کاکی رح کا وصال ہوا۔ 'چہل غازی' ان کی وفات کے بعد بنگال پہنچے۔ دیناج پور راجہ گوپال کے زیر اقدار تھا۔ راجہ دیناج پور سے تین میل کے فاصلے پر گوپال گنج میں رہتا تھا۔ گوپال گنج بت پرستی کا گہوارہ تھا۔ وہاں کا شاندار مندر آج بھی اس بات کی نشاں دہی کرتا ہے۔ راجا راجہ کے ظلم و تشدد سے عاجز آچکی تھی، ان کی زندگی تنگ تھی۔ ہر فرقے کے ہندو زبوں حالی کا شکار تھے۔ 'چہل غازی' کا دروہ مسعود نہ صرف دیناج پور بلکہ گوپال گنج کے باشندوں کیلئے بھی نیک خال ثابت ہوا۔ اسلام میں ذات پات، فرقہ پرستی کا کوئی سولہ نہ تھا۔ انسانی حقوق برابری تھے۔ مساوات، رواداری، تقویٰ اور نیکیاں ایسی چیزیں تھیں جن سے ہندو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ حضرت شیخ زین الدین ہسپتال بغدادی رح اور ان کے ساتھیوں کے حسن اخلاق، غیر معمولی اخلاص اور موثر باتوں نے حوام کے دلوں پر اس قدر اثر کیا کہ لوگ جوق درجوق بت پرستی کے بجائے خدا پرستی کی طرف مائل ہونے لگے۔ ان حالات میں راجہ بد کھلا اٹھا اور طیش میں آکر اپنے وزیر بل رام کو سپاہیوں کے ساتھ بھیجا کہ چہل غازی کو گرفتار کر کے آئیں تاکہ انہیں سزا دی جائے اور اشاعت اسلام سے باز رکھا جائے بل رام چہل غازی کے آستانہ پر پہنچا اور غضب ناک لہجے میں بولا :

"ہم تمہیں گرفتار کرنے آئے ہیں :

حضرت زین الدین ہسپتال رح نے نہایت اطمینان سے نرم لہجے میں کہا :  
فیتروں کے پاس کیا لینے آئے ہو ہمارے پاس اللہ کے نام کچھ نہیں۔  
یہ زمین، یہ آسمان سب کچھ اللہ کا ہے جس نے اللہ کو اپنا لیا ہے، اس کے  
دل میں کسی کا خوف غالب نہیں ہو سکتا :

پھر آپ نے قرأت کے ساتھ قرآن کی ایک آیت پڑھ کر سنائی۔ آپ کا انداز اس قدر  
شرابہ دلہندہ تھا کہ بل رام بہت متاثر ہوا، حضرت ہسپتال رح کے قدموں پر گر پڑا اور ...

مشوف ہر اسلام ہوا۔ اس نے حضرت سہیل رح سے بیعت کی۔ مابقی ملازمت ترک کر کے حلقہ اور باب تصوف میں شامل ہو گیا۔ پھر اللہ کی عبادت اور رسول کے اتباع میں اس قدر محو ہو گیا کہ اس کے دم سے اس مملکت میں اسلام دور دور تک پھیل گیا۔ یہ وہی بل مام ہیں جو بعد میں گھوڑا پیر کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے رشد و ہدایت کا سلسلہ مدفون جاری رہا۔ ان کا مزار چہل غازی کے مقبرے کے احاطے میں زیارت گاہ خلافت ہے۔

راجہ گوپال نے وزیر بل مام کو درویشوں کی گرفتاری کیلئے روانہ کیا تھا لیکن اس نے بت فروشی پر بت شکنی کو ترجیح دی اور اسلام قبول کیا۔ راجہ نے اسے اپنی توہین محسوس کی۔ بھاری لشکر لے کر چہل غازی پر روٹ پڑا۔ چہل غازی کی جماعت نے حضرت سہیل بنعلدی کی سرکردگی میں راجہ کا مقابلہ کیا لیکن اللہ کے حکم سے شہید ہوئے۔

یہ چالیس مشائخ کبار شہر دیناج پور سے تین میل شمال کی جانب دیران و سنان میدان میں آسودہ ہیں، جس احاطے میں وہ مدفون ہیں وہ احاطہ "مزار چہل غازی" کے نام سے مشہور ہے۔ بظاہر ایک ہی لمبی قبر نظر آتی ہے لیکن اس کی لمبائی اکاٹھ ہاتھ یعنی ۵ فٹ ۱۱ انچ یعنی ایک ہاتھ ہے۔

اس احاطہ "مزار چہل غازی" سے متصل ایک مسجد ہے۔ اس مسجد کے آس پاس بھی کچھ قبریں ہیں جن میں بعض پختہ اور بعض کٹی ہیں۔ اس مسجد کے محراب پر جو الفاظ عربی میں کندہ ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اے ایمان والو! اللہ تمہارا مددگار ہے۔ وہ بڑا کارساز اور رحیم و کریم ہے۔ سلطان محمود کے بیٹے ابو الجہاد کو ایک شہیر کے دور میں یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اس کے تحت و تاج کی حفاظت کرے وزیر اتر خان کے حکم سے اس کے ایک امیر نصرت خان نے اس مسجد کی مرمت کرائی اور اس میں نقش و نگار بنوا کر اس کی خوبصورتی کو دوبالا کیا۔ مزاروں کی تعمیر و مرمت بھی وہ بدہوشی نگہانی میں کر داتا رہا۔" ۴

یکم دسمبر ۱۳۵۷ مطابق ۱۶ صفر ۱۳۷۵ھ

۔ وہ زمانہ تھا کہ مذکورہ بالا مسجد میں چالیس مقتدا تھے وہی عبارت دریافت میں رہتے تھے، مسجد پر دفتی رہتی تھی، اذان سے ساری قضا گونج اٹھتی تھی۔ ان کی کے بعد احاطہ مزار چہل غازی، زیارت گاہ خاص و عام تھا۔ حرطاف روشنی لیکن آج ان کے مزار پر کوئی چراغ نہیں جلتا۔ مسجد ویران پڑی ہے۔ نہ دلنشانی دیتی ہے۔ نہ کوئی نمازی دکھائی دیتا ہے۔ مسجد کے در و دیوار اب محل اختیار کر رہے ہیں۔ مسجد کے آس پاس کے مقبرے بھی نیست و نابود ہیں۔ صرف چہل غازی کی پستقیں غلط لمبی قبر ابھی باقی ہے جو ان کی شہادت بتی اہل توحید پرستی کی نشان دہی کر رہی ہے۔

## حضرت شاہ جلال مینی سلہٹی

ابھٹ میں حضرت شاہ جلال کی آمد کی داستان بڑی دلچسپ اور روحانیت سے پُر ہے۔ نو سال پہلے جب حضرت شاہ جلال سلہٹ تشریف لائے، اس وقت اسلام بادشاہ برہان الدین نامی ایک شخص تھا، جو وہاں کے راجہ گوڑگو بند کے ظلم و ستم۔ رولیت یوں بیان کی جاتی ہے کہ برہان الدین کے گھر میں ایک بچہ پیدا ہوا، اس کاوت کی خوشی میں ایک گائے ذبح کی۔ راجہ نے اس کے لخت جگر کو اُس کے لرویا۔ اور برہان الدین کا داہنا ہاتھ کاٹ دیا۔ جب یہ خبر ملار الدین غلیبی تک نے راجہ کو مزادینے کے لئے فوج بھیجی، لیکن وہ کامیاب نہ ہوئی۔ بیان کیا ہم حضرت جلال کے ہاتھوں سے ہوئی۔ حضرت نے حکومت سپر سالار کو سونپی، ان میں لگ گئے۔



# تَلْخِصٌ وَتَبَصُّرٌ

مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن صاحب  
کی  
آپ بیتی کا دوسرا حصہ

”الرحیم“ کے شمارہ بابت مارچ ۱۹۶۵ء میں جناب ظفر حسن صاحب ایک کپشن آرٹری (ریٹائرڈ) ترکش آرمی حال ساکن استنبول کی غیر معمولی تاریخی اہمیت کی کتاب ان کی آپ بیتی حصہ اول پر تبصرہ کیا گیا تھا۔ صاحب موصوف کی آپ بیتی کا حصہ دوم شائع ہو گیا ہے۔ پہلے صفحے میں ظفر حسن صاحب نے اپنی آپ بیتی ۱۹۱۵ء سے شروع کی تھی، جب کہ انہوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران لاہور کے بعض کالجوں کے طالب علموں کے ساتھ اس غرض سے وطن کو الوداع کہی کہ وہ افغانستان کے راستے ترکی پہنچیں، اور وہاں ترکی افواج کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑیں۔ اور اس طرح ایک طرف عالم اسلام کو انگریزی استعمار سے نجات دے، اور دوسری طرف سرزمین پاک و ہند اُس کے جنگل سے نکل سکے۔ افغانستان پہنچتے ہی یہ طالب علم گرفتار کر لئے گئے۔ اور چار سال تک جب کہ امیر حبیب اللہ خاں قتل کر دیئے گئے، یہ نظر بند رہے۔ اور ان کی اس نظر بندی کی وجہ یہ تھی کہ ان طالب علموں کی ہجرت کے بعد پنجاب کے اُس وقت کے لیٹیننٹ گورنر ریمیل ایڈرڈ

کا ایک بیان اخبارات میں چھپا تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ اگر ان طالب علموں میں سے کوئی پکڑا گیا تو اُسے ہندوستان کی سرحد پر سب سے پہلے درخت پر لٹکا کر پھانسی دی جائے گی۔ اتفاق سے امیر حبیب اللہ خاں کے پرائیویٹ سیکرٹری کی نظر سے یہ بیان گزرا، اور اس نے برطانوی حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انہیں نظر بند کرنے کا حکم دے دیا۔ اور جب وہ ایک دفعہ نظر بند ہو گئے تو پھر کون ان کا پرسان حال ہوتا۔

اسی زمانے میں مولانا حبیب اللہ سندھی بھی کابل پہنچے۔ مولانا کی کوششوں سے ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھیوں کی نظر بندی کی تکلیفیں کچھ کم ہو گئیں۔ اور ان کو کچھ آرام ملا۔ مولانا نے ان بہادر نوجوانوں کی حوصلہ افزائی فرمائی، اور وہ انہیں اپنی سیاسی سرگرمیوں میں شریک کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ ظفر حسن صاحب مولانا کے خاص معتمد بن گئے، اور نہ صرف مولانا سے انہوں نے علوم دینیہ پڑھے، بلکہ وہ مولانا کے سیاسی رفیق اور دست راست کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔

امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کے بعد جب امیر امان اللہ خاں برسرِ اقتدار آئے، تو افغانستان نے جو اب تک انگریزوں کے بالواسطہ ماتحت تھا۔ انگریزوں سے جنگ چھیڑ دی۔ اس جنگ میں ظفر حسن صاحب سہ سالہ سردار محمد نادر خاں کی جو بعد میں افغانستان کے فرمانروا بنے سمیت میں تھے۔ نادر خاں نے ٹھل پر حملہ کر کے اُسے انگریزوں سے آزاد کر لیا تھا اس معرکے میں ظفر حسن صاحب کی بیاضی کام آئی تھی۔ ان کی بتائی ہوئی پیمائش کے مطابق جب گولہ پھینکا گیا تو اُس سے قلعہ ٹھل کے گوداموں میں آگ لگ گئی اور قلعہ معمر ہو گیا۔ بعد میں ظفر حسن صاحب کو دربار شاہی میں نادر خاں نے پیش کرتے ہوئے یہ کلمات کہے۔

اس نوجوان کی عمر کم ہے، لیکن اس نے ایسی بہادری دکھائی ہے

کہ فوج کے بڑے بڑے اور تجربہ کار افسروں کو مات کر دیا ہے۔۔۔

اس طرح ظفر حسن کے نادر خاں اور ان کے خاندان سے تعلقات بڑھے جو

مولانا سندھی کی رفاقت کے بعد مصطفیٰ کے قیام کابل کا سب سے قابل ذکر اور یادگار

کا رنامہ ہے ۔

آخر ایک وقت آیا کہ مولانا سندھی کو افغانستان چھوڑنا پڑا ۔ اور وہ اس لئے حکومت افغانستان نے انگریزوں سے مفاہمت کر لی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی سرزمین پر انگریز دشمن سرگرمیاں جاری رہیں ۔ ظفر حسن اگر چاہتے تو وہ بڑی عزت اور آرا سے کابل میں رہ سکتے تھے ، لیکن انہوں نے اپنے استاد و مرشد اور اپنے سیاسی قاب ساتھ دیا ۔ اور وہ بعض اور نوجوانوں کے ساتھ کابل سے روس روانہ ہو گئے ۔

مولانا سندھی ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے تھے ، اس سے چند ماہ پہلے مار ۱۹۱۵ء میں ظفر حسن صاحب اور ان کے ساتھی مدد افغانستان میں داخل ہوئے ، پورے سات سال اس سرزمین میں گزارنے کے بعد ۱۳ اکتوبر ۱۹۲۲ء کو مولانا سندھی اور ان کے ساتھ ظفر حسن اور ان کے رفقاء روسی ملاقات میں پہنچے ، اور یہاں سے زیر نظر کتاب روداد شروع ہوتی ہے ۔

اُس زمانے میں بخارا اور تاشقند کی حالت بہت زیادہ خراب تھی ۔ لکھتے ہیں ۔  
 "ادن کے وقت ہم نے شہر کا ایک چکر لگایا ۔ بازار میں دکانوں میں مال بالکل دھوا  
 دیہاتی ترکمن جو لمبے لمبے پوسٹے اور سر پر بڑے بڑے بالوں والی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے  
 جن سے ان کی شکلیں بڑی ڈراؤنی سی معلوم ہوتی تھیں ، کچھ کھانے پینے کی چیزیں بیچنے  
 کے لئے بازار میں لائے ہوئے تھے ۔ ان جگہوں پر بہت بھیڑ بھاڑ تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا  
 کہ شہر کے لوگ اپنی ضروریات زندگی کو انہیں دیہاتیوں کی لائی ہوئی چیزوں کو خرید کر پورا کر  
 تھے ۔ ہر طرف افراط فزی معلوم ہوتی تھی ۔ صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا "۔

بخارا پر بالشویکی قبضے سے قبل امیر بخارا کی حکومت تھی ، جس کی حیثیت زار رو  
 کے دور میں ہندوستانی راجوں نوابوں کی سی تھی ۔ انقلابیوں نے امیر کو نکال کر بخارا کو برا  
 راست اپنے قبضے میں لے لیا تھا ۔ ظفر حسن صاحب بخارا کی اس تہوں حالی سے بے حد متا  
 ہوتے ہیں ان کا دل دکھتا ہے ، اور وہ لکھتے ہیں ۔

"بخارا جو ایک زمانے میں اسلامی تہذیب اور علم کا مرکز تھا ، جہاں امام بخاری

جیسے جید علماء پیدا ہوئے تھے اور جہاں ابن سینا اور شیخ نقشبندی جیسے فلاسفہ، حکیم اور صوفی رہ چکے تھے، آج کل ایک ویران سا قصبہ ہو گیا تھا۔ پرانے مدرسے اور مسجدیں خراب حالت میں پڑی ہوئی تھیں۔  
 بخارا سے یہ قافلہ تاشقند پہنچتا ہے اس کی حالت بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ مصنف لکھتے ہیں کہ ترکستانی غریب اور اُن پڑھ ہیں اور روسی جہاں جو زیادہ ترقی یافتہ ہیں وہاں کثرت سے آباد ہو رہے ہیں۔

ان دنوں تاشقند میں کمیونزم کی تعلیم دینے کے لئے ایک ”مشرقی یونیورسٹی“ تھی جس میں ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان آئے ہوئے اور پھر وہاں کے حالات سے بد دل ہو کر روس پہنچے ہوئے بعض مسلمان نوجوان بھی تھے، جن کو ہندوستان میں کمیونسٹ انقلاب کرانے کے لئے تعلیم دی جا رہی تھی۔

مولانا سندھیؒ اولاً ایک عالم دین تھے ان کی سیاست کا تمام تر محور عالم اسلامی کو انگریزوں کی خلائی سے آزاد کرانا اور برصغیر کو اُن کے قبضے سے نجات دلانا تھا۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے وہ افغانستان بھیجے گئے تھے۔ اور اب جو وہ روس جا رہے تھے تو اُن کے پیش نظر یہی تھا کہ وہاں سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد ہو سکے گی۔ غرض مولانا ایک سچے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قوم پرست اور حب وطن سیاسی رہنما تھے۔ بعینہ ظفر حسین صاحب کے بھی یہی معتقدات تھے، لیکن ان کا ایک ساتھی جس کا پہلا نام محمد علی اور بعد میں خوشی محمد تھا، کمیونسٹ بن چکا تھا۔ جب یہ قافلہ بخارا میں مقیم تھا تو ایک رات خوشی محمد نے مولانا سندھیؒ کو بتایا کہ اگر وہ روس میں کمیونسٹوں کی تائید نہیں کریں گے تو وہ بھوکے مر جائیں گے۔ کیونکہ وہاں تو مذہبی پیشواؤں اور پابند مذہب لوگوں کے لئے رہنما بھی ممکن نہیں ہے۔

مولانا کو اس سے بڑا دکھ ہوا۔ مصنف لکھتے ہیں کہ مجھے قلعہ ہوا کہ ہمارے مرشد جنہوں نے ہمیں دینی اور دنیوی تعلیم و تربیت دی تھی، آج بے مانگی کی وجہ سے ایسے شخص کے محتاج ہو گئے ہیں، جس نے اُن کے سارے احسانات کو پس پشت ڈال کر ان پر

حکم چلانے کا ارادہ کر لیا ہے۔

ظفر حسن صاحب کا ایک صندوق جس میں ان کے گرم کپڑے تھے، روسی سرحد پر چوری ہو گیا تھا۔ اور وہ سخت تکلیف میں تھے۔ اُن کے پاس بس باؤں سونے کے انگریزی پونڈ رہ گئے تھے، جو انہوں نے کابل میں نوکری میں کمائے تھے۔ ظفر حسن صاحب نے اپنی یہ پونجی مولانا کی نذر کی۔ اور کہا کہ آپ اسے جس طرح چاہیں خرچ کریں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔

مولانا سے ظفر حسن صاحب کی عقیدت، خلوص اور ان کے لئے سب کچھ نثار کرنے کی یہ ایک مثال نہیں۔ کابل، اس کے بعد روس اور پھر ترکی میں ظفر حسن صاحب نے مولانا کے آرام اور خوشی کے لئے ہر تکلیف برداشت کی، اور اس پر اُن کو غرہ ہے۔ اور وہ اُسے اپنے لئے ایک سعادت سمجھتے ہیں۔

دریائے آمو کو پار کر کے جو افغانستان اور سوویت یونین کی حد فاصل ہے، یہ لوگ کاشی (کاشی) پہنچے تھے، وہاں سے ریل گاڑی لی، اور یہ بخارا گئے مصنف لکھتے ہیں۔ لکاشی سے لے کر ماسکو تک ہم ہندوستانی انقلابی ہونے کی وجہ سے روسی گورنٹ کے جہان مانے گئے تھے۔ ہم کو سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیا گیا تھا۔

ماسکو میں اس وقت جو ہندوستانی موجود تھے، آپ بیتی میں اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کی طرح مصنف کو بھی ماسکو یونیورسٹی میں داخل ہونا پڑا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:-

..... ”قبلہ مولانا نے مجھے حکم دیا کہ میں یونیورسٹی میں داخل ہو جاؤں۔ اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ میرے ذریعہ کمیونسٹوں کے اصول

تسلیم اور کمیونزم کے بنیادی عقائد کا پتہ لگائیں تاکہ آزاد ہندوستان میں ایسا نظام قائم کر سکیں جو کمیونزم کا توڑ ہو اور ہندوستان کے عوام اس نظام سے ایسے خوشحال بنیں کہ کمیونزم کے پروپیگنڈے پر کان نہ دے دیں اور اس کے چمندے میں نہ چنیں اس کے علاوہ ان کا یہ مقصد بھی تھا کہ کمیونزم جو مذہب کا دشمن ہے اس سے ہندوستان میں اپنے مذہب کو بچانے کے لئے

کچھ تدبیریں سوچیں۔ نیز اس بارے میں بھی اپنی واقعیت بڑھائی لکھیوں  
سے انگریزی سامراج کو نیست و نابود کرنے اور ہندوستان کو آزاد کرانے  
میں مدد لینے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟

مولانا سندھی تو روسی حکومت کے جہاں تھے، وہ تو ہوٹل میں مقیم رہے، لیکن  
ظفر حسین صاحب کو یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں بھیج دیا گیا، اور وہ باقاعدہ کیونزیم  
کی تعلیم پانے لگے۔ اس زمانے میں بھی موصوف برابر نماز پڑھتے رہے۔ اس کا ذکر کرتے  
ہوئے وہ لکھتے ہیں: ”ماسکو یونیورسٹی میں تو نماز روزے کا نام لینا بھی ممکن نہ تھا۔ میں  
بڑی مشکل سے چاہپائی پریٹ کر اور سر کے اشارے سے نماز ادا کیا کرتا تھا۔ اور کبھی بھار  
اگر موقع مل جائے تو فضل الہی قربان سے جس کو یونیورسٹی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک  
چھوٹا سا کمرہ ملتا تھا، اجازت لے کر نماز پڑھ لیا کرتا تھا“ ظفر حسن صاحب  
نے قربان صاحب کی اس ”جرات“ اور ”احسان“ کا بڑی ممنونیت سے ذکر کیا ہے۔  
ماسکو سے ایک دفعہ مصنف اور ان کے ساتھی لینن گراڈ گئے۔ مولانا سندھی بھی  
ان کے ساتھ گئے۔ روسی حکومت نے خبر بھیج دی کہ مولانا سرکاری جہاں خانے کی بجائے  
مصنف کے الفاظ میں ”روسی مسلمانوں کے مذہبی لیڈر موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر جہاں  
ہوں گے۔ موسیٰ جار اللہ صاحب ایک بڑے جید عالم اور خدا پرست سیاسی لیڈر تھے  
جن کی قدر و منزلت نہ صرف روسی مسلمانوں کی نظروں میں بہت زیادہ تھی، بلکہ سارا  
عالم اسلام (انہیں) جانتا تھا۔۔۔“

ظفر حسن لکھتے ہیں کہ ”لینن گراڈ میں موسیٰ جار اللہ صاحب کے گھر رہتے ہوئے  
مجھے بالکل آزادی سے نماز پڑھنا نصیب ہوئی“

مصنف ہر روز ماسکو یونیورسٹی میں کیونسٹ استادوں سے کیونزیم پر لیکچر  
سنتے تھے، وہ بورڈنگ ہاؤس میں کیونسٹ طالب علموں کے ساتھ رہتے تھے، لیکن  
اس کے ساتھ ساتھ ان کے الفاظ میں ”میں ہر روز شام کے وقت یونیورسٹی کے لیکچر  
ختم ہونے پر ہوٹل لوکس میں جا کر اس روز پڑھے ہوئے سبقوں کا خلاصہ قبل مولانا صاحب

کو سنا کر تا تھا، جس سے ان کو کمیونسٹ نظریوں، کمیونسٹ اصول حکومت، لیبر مینٹ اور کمیونسٹ انٹرنیشنل یعنی تھرڈ انٹرنیشنل جس کو مختصراً کو مینٹرن کہا جاتا تھا، کے بارے میں آہستہ آہستہ کافی سے زیادہ معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس سلسلے میں کمیونسٹ تعلیم کے وہ پہلو جو اسلامی احکام اور عقائد کے خلاف تھے، وہ بھی قبلہ مولانا صاحب پر واضح ہو گئے تھے۔ میرے دل میں اس مضر تعلیم کی وجہ سے اسلام کے بارے میں شک و شبہ اور ذہنی تشویش پیدا ہو سکتی تھی، میں اس کو قبلہ مولانا صاحب کی خدمت میں عرض کر کے ان سے اس کا شافی اور اطمینان بخش جواب اور صورتحال پوچھ لیا کرتا تھا اس لئے خداوند کریم کے فضل سے میرے ایمان میں کوئی تزلزل واقع نہیں ہوا۔

اس سلسلے میں ظفر حسن صاحب نے مذہب پر کمیونزم کے بعض اعتراضات اور مولاناؒ نے ان کو جس طرح رفع کیا، اُس کی مثالیں دی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:-

اس مقولہ (مذہب لوگوں کے لئے افیون ہے) کو روسیوں نے ماسکو کے سُرخ میدان میں ایک نمایاں جگہ پر کندہ کر دیا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ مذہبی عقیدے لوگوں پر ایسی فحشی طاری کر دیتے ہیں کہ وہ غاصبوں سے اپنے حقوق طلب کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ مذہب ذاتی ملکیت کو جائز قرار دینے کی وجہ سے (کارل مارکس کے نظریہ کے مطابق) مالداروں کی حمایت کرتا ہے۔ اور ان کے مال پر غریبوں اور ناداروں کو دست دلائی کرنے سے روکتا ہے۔ اور اس طرح ان لوگوں کو اپنے حقوق طلب کرنے سے منع کرتا ہے۔ قبلہ مولانا صاحبؒ نے اس زہریلے نظریے کو رد کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ اسلامی قانون وراثت، دولت کو صرف چند ایک لوگوں کے ہاتھ میں جمع ہونے نہیں دیتا۔ زکوٰۃ مالداروں پر ایک ایسا ٹیکس ہے کہ اس کے ذریعہ سوسائٹی کے محتاجوں کو مدد دی جاتی ہے۔

(مسلسل)

# شاہ ولی اللہ الہیڈمی

## اغراض و مقاصد

۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور ان کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھوانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیدمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرا اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے مکتب فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا جملہ۔  
۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کی غرض سے ایسے موضوعات پر جی سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا





Monthly "AR-RAHIM"  
Hyderabad

# شاہ ولی اللہ کی تعلیم !

از پروفیسر غلام حسین جالبانی سندھ یونیورسٹی  
پروفیسر جالبانی ایم۔ اے صدر شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کتاب ہے  
اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اُس کے تمام پہلوؤں پر پیر حاصل  
بجٹیں کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

## المسوکن اجارہ الموطا

تالیف \_\_\_\_\_ الامام ولی اللہ دہلوی

شاہ ولی اللہ کی مشہور کتاب آج سے ۳۲ سال پہلے مکتومکرم میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے زیر اہتمام چھپی تھی اس میں مجاہد گیلانی  
کے تشریحی حاشیے ہیں بشرط میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح اسفندی برآپ نے جو سب سے مقدمہ لکھا تھا اس کا عربی ترجمہ  
ہے شاہ صاحب نے الموطا میں الموطا امام مالک کے نسخے سے ترتیب دیا ہے امام مالک کے وہ اقوال جن میں وہ باقی مجتہدین سے متفرق تھے حذف کر  
دینے گئے ہیں الموطا کے روایت متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی حجت سے توسیع کی نکات  
میں شامل کر دیئے ہیں۔  
دہلوی کے نسخے کی تفسیر جلد دوم مقصود میں  
قیمت ۱۰ روپے

## ہمعات

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اُس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔  
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے بغیر انسانی  
تر بیت و تزکیہ سے جن بلب و منازل پر فائز ہوتا ہے اس میں اُس کا بھی بیان ہے۔  
قیمت دو روپے

بیادگار الحاج سید عبد الرحیم شاہ سجاوولی

شاہ ولی اللہ اکیڈمی کا علمی مجلہ

۶ (۱۲)

ماہنامہ

الترغیہ

شعبہ نشر و اشاعت شاہ ولی اللہ اکیڈمی صدر حیدر آباد

مجلس اذارت \_\_\_\_\_

ڈاکٹر عبد الواحد ملے پوتا،

مخدوم امیر احمد

\_\_\_\_\_ مدیر:

علامہ مصطفیٰ قاسمی

# الرحيم

جلد ۴ | ماہ مئی ۱۹۶۷ء مطابق محرم ۱۳۸۷ھ | نمبر ۱۲

## فہرست مضامین

۸۱۸	مدیر	شذرات
۸۲۱	مولانا محمد عبد الحلیم چشتی	چہل حدیث شاہ ولی اللہ
۸۲۹	مترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری	امداد فی آثار الاعداد
۸۴۱	ڈاکٹر جمال الدین الیشال	شیخ ابوالحسن شاذلی
۸۵۹	ترجمہ حافظ عباد اللہ فاروقی	مصباح العرفان
۸۶۷	شبیر احمد خاں غوری	سیالکوٹی عبقریت کا ایک نادر شاہکار { المدۃ الثمینہ }
۸۷۴	عقان سلجوق	شہر گلستان - شیراز
۸۸۹	محمد سرور	تلخیص و تبصرہ

## شذراتے

۱۹۱۴-۱۹۱۸ء کی پہلی جنگ عظیم کے بعد جب اسلامی ملکوں میں قومی آزادی اور اصلاح و ترقی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی کی تشکیل جمید میں اپنے ہاں کے علمائے دین سے مدد لینے کی چندوں حضرت محسوس نہ کی، اور مسلمانوں کی قومی زندگی کی تعمیر میں علماء بحیثیت مجموعی جو تعلیمی و اصلاحی کردار انجام دے سکتے تھے، اس کی اہمیت نہ سمجھی۔ اس کا جو ثمار و عمل ہوا اس کی تفصیلات چند سال پہلے دنیائے کے سامنے آچکی ہیں۔ ایک مسلمان ملت میں علماء کا ایک مستقل مقام ہے۔ اور تاریخ نے انہیں ایک ایسی حیثیت دی ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مسلمانوں کے ہاں مسجد صرف ایک عبادت گاہ ہی نہیں بلکہ وہ ان کی اجتماعی زندگی کا بھی ایک مرکز ہے اور مسجد کے ذریعہ عوام مسلمانوں کے جس آسانی سے رابطہ قائم ہو سکتا ہے، ہرگز ہاں اس طرح کا اور کوئی ادارہ اب تک وجود میں نہیں آ سکا۔ مانا کہ ہر اسلامی ملک میں صنعتیں لگ رہی ہیں اور ان کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں لیکن مسجد کی مرکزیت اب تک باقی ہے اور بیچ وقت نمازوں کے علاوہ جمعہ کی نمازیں، ان میں جس طرح اجتماع ہوتا ہے اسے دیکھ کر کوئی بھی قومی قیادت مسجد اور اس کے ساتھ علماء کی اہمیت اور قومی زندگی کی اصلاح و ترقی میں ان کے مفید عنصر ہونے سے انکار نہیں کر سکتی۔

جس دور میں اس وقت ہم داخل ہو رہے ہیں اس کی سب سے بڑی ضرورت قومی پیداوار کو بڑھانے کی ہے۔ مگر ہماری قومی پیداوار نہ بڑھی تو اس وقت ہمارا جو حال ہے کہ باہر سے اناج و دواؤں کے ہم ملتے مرنے سے بچ رہے ہیں آگے چل کر اس سے بُرا حال ہو گا۔ قومی پیداوار نہ بڑھنے سے بیکاری پھیلے گی، تن و حاشائے کو کپڑا اور سر چھپانے کو چھت تک میسر نہیں آئے گی۔ ہم اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دے سکیں گے۔ اور ملک کے دفاع کا معاملہ تو بے شمار خوجہا ہوتا ہے اسے پورا کرنا تو اور مشکل ہو گا۔ قومی پیداوار کو صرف مادی ذرائع سے بڑھایا نہیں جاسکتا اس لئے قوم کے اخلاق میں اچھے ہونے چاہئیں اس میں معنوی قوت ہونی چاہئے اس کے سامنے زندگی کا کوئی بلند نصب العین ہونا چاہئے۔ آج یہ سب لازم صرف اس طرح پورے کیے جاسکتے ہیں کہ عوام کو تحریک کرنے اور ان کی تہذیب و اصلاح میں قومی قیادت کو علمائے دین کا پیدا تعاون حاصل ہو۔

یہ زمانہ نظری بحثوں کا نہیں اور نہ اس میں مذہبی مناظروں اور حجادوں کے کچھ حاصل ہو گا ہر اسلامی ملک کو سنگین مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اور وہ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، زیادہ سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ ان مسائل

سے عہدہ برآجہ نے کئے پوری قوم کو متحرک ہونا پڑے گا۔ سب کو اپنی کادر کی ٹھکانی پڑے گی ہر شخص کو جہاں بھی وہ ہے زیادہ مستعدی سے کام کرنا ہوگا یہ علوم کی مجموعی طاقت اعلان کا عزم ہی ہے جو قوم کو ترقی کی راہوں پر چلنے کے قابل بنا سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں علوم میں یہ روح پھونکنے اور انہیں خود اپنے لئے پوری قوم کے لئے مفید و مثبت اور محسوس کام کرنے کے قابل بنانے میں عمل کے کام بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ ہمارے ان بزرگوں کی تجربہ بن امور کی طرف ہو اور وہ سمجھیں کہ کرنے کے یہ کام ہیں انہیں میں خدا کی مخلوق کی بہتری ہے انہیں میں مسلمانوں کی بہتری ہے انہی سے 'پاکستان' مضبوط ہوگا خوشحال ہوگا اور اس کا نام بلند ہوگا اور ظاہر ہے انہی سے خدا تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی راضی ہوں گے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ کھوار اوقاف مغربی پاکستان کی مثل امارے 'پاکستان اکیڈمی برائے ترقی دیہات' پشاور نے پشاور میں علماء کرام کا ایک اجتماع کرایا۔ جس میں ان احمد پور نور و نگر کی گیا۔ یہ اجتماع یاسین مارچ ۱۹۶۷ء سے ۱۵ مارچ تک ہوا۔ اس میں بعض ممتاز علماء کے علاوہ بالخصوص تحصیل پشاور کے دیہات کے ائمہ و خطباء و حضرات شریک ہوئے۔ اکیڈمی مذکورہ کے ڈائریکٹر نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا کہ میری تجویز یہ ہے کہ علماء اگر کوئی فنی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دیں اور روحانی ترقی کے ساتھ ساتھ نوکری کی مادی ترقی کے لئے بھی پیش کریں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف علماء کی اپنی حالت بہتر ہو جائے گی بلکہ علوم انسانی میں غریب کی نصرت و نجات حاصل کریں گے۔ سوچو نہ یہ بھی کہا کہ علماء کو ضروری تربیت دینے کے لئے اکیڈمی میں اتھارم کیا گیا ہے۔ جس سے علماء کو خاطر خواہ فائدہ پہنچ سکتا ہے اور ان کی وساطت سے دیہاتی علوم کی حالت بھی سدھر سکتی ہے۔

اس سلسلے میں ہم یہ بتلا دیں کہ دنیائے اسلام کی عظیم ترین اور قدیم ترین درسگاہ جامعہ ازہر قاہرہ میں بھی اب اس کا التزام کیا گیا ہے کہ وہاں سے جو بھی علماء و اہل فارغ ہو کر نکلیں ان کا ذریعہ معاش صرف امامت و خطابت تک محدود نہ ہو بلکہ ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی فن ہو جس سے وہ اپنی روزی کما سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ دینی کام بھی کر سکیں مثلاً جامعہ ازہر میں علوم دینی کے ساتھ ساتھ زراعت، پھل اگانے، شہد کی مکھیاں اور خرباز پالنے، پنیر بنانے اور اس طرح کے دوسرے کاموں کی تربیت دی جاتی ہے نیز جانوروں کے علاج، دانتوں کے علاج اور ایسے ہی دوسرے پیشوں کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ جب یہ علماء دیہات میں جائیں تو وہ دینی زندگی کے ساتھ دنیائی زندگی بھی مصلح کا کام بھی انجام دے سکیں۔ 'پاکستان اکیڈمی برائے ترقی دیہات' پشاور نے علماء کا اجتماع کر کے قوم و ملک کی ایک نہایت اہم ضرورت کو پورا کرنے کی طرف پہلا قدم اٹھایا ہے خدا کرے یہ قدم دفعہ

کے لئے مختصر راہ بنے۔ علماء کرام خود قوم کی اس ضرورت کو سمجھیں اور جس طرح وہ دینی معاملات میں قوم کی رہنمائی کرتے ہیں، دیہاتی زندگی کو بہتر بنانے اور عوام کی حالت سدھارنے میں بھی پیش قدمی کریں۔ خود بھی معاشی لحاظ سے خود کفیل ہوں اور دیہاتی عوام کو بھی خود کفیل بنائیں۔

پشاور کے اس پھر روزہ اجتماع علماء میں جہاں ان عنوانات پر مقالات پڑھے گئے۔ ترقی اور اسلام، سائنس اور قرآن، دیہاتی زندگی کی ارتقاء میں علماء و ائمہ مساجد کا حصہ، اہل علم اور کسب معاش، رفاہی کاموں میں علماء کا حصہ۔ وہاں دیہاتی زندگی کے مختلف شعبوں پر بھی تقریریں ہوئیں مثلاً زراعت کے مسائل، باہمی پروری و مگس بانی، بیماریاں اور ان کا علاج وغیرہ۔ اس کے علاوہ علماء کو سنٹ ایڈ کی علی تربیت دی گئی۔ تربیت کس طرح بنائے جاتے ہیں، انہیں تجربہ کر کے بتایا گیا۔ شہد کی مکھیاں پال کر ہم کتنا فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس کے بارے میں معلومات بہم کی گئیں۔

انگریز جب اس برصغیر میں آیا، تو وہ اپنے ساتھ ایسا نظام تعلیم، نظام معاشرت، نظام حکومت، نظام اقتصادیات اور نظام تمدن لایا، اور ان نظاموں کے اثرات اس قدر دور رس تھے کہ اگر اُس وقت ہمارے علماء مسجدوں اور دینی مدارس کے ذریعہ انگریز کے لائے ہوئے ان نظاموں کے بعض غریب اسلام اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اٹھ نہ کھڑے ہوتے، تو آج اس برصغیر کے مسلمانوں کی حالت کچھ اور ہوتی۔ ہمارے ان بزرگوں نے اجنبی حاکموں کی اسلام دشمن کارروائیوں کو ناکام بنایا۔ اور ہر طرح کی مصیبتیں اور ذلتیں برداشت کر کے اس سرزمین میں اسلام کے جھنڈے کو سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ مسجد اور دینی مدرسے وہ حصہ تھے، جنہوں نے انگریزی تسلط کے ثقافتی یلغار کا مقابلہ کیا۔

ظاہر ہے اب وہ زمانہ نہیں رہا، اس وقت ہماری اور ضرورتیں ہیں، اس ملک کو مضبوط، خوش حال اور ترقی یافتہ بنانا ہے اور اس کے لئے مذہب، اخلاق اور روحانیت بھی اُسی قدر ضروری ہیں، جس قدر کاغذات اور دوسرے مادی ذرائع۔ بلکہ سچ پوچھئے تو معنوی طاقتیں ہی مادی ذرائع پیدا کرتی ہیں۔

پاکستان اکیڈمی برائے ترقی دیہات پشاور اور محکمہ اوقاف مغربی پاکستان قابل مبارک ہیں کہ انہوں نے ہمارے اس اجتماع کا انتظام کر کے قوم کو ایک ایسی راہ دکھائی ہے کہ اگر اُس پر چلا گیا، تو نہ صرف علماء خاص کر دیہات کے ائمہ و خطباء کی معاشی پریشانیاں دور ہو سکیں گی، بلکہ وہ قومی زندگی میں ایک نئی روح اور تعمیری جذبہ عمل پیدا کر سکیں گے۔ دین اور دنیا کی دونوں کو ختم کرنے کا یہی طریقہ ہے۔

# چہل حدیث شاہ ولی اللہ

مولانا محمد عبدالحلیم چشتی

محدثین کے یہاں کتب حدیث کے اقسام سترہ ہیں۔ چھٹی قسم اربعینات ہے۔  
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ عمائد النفع میں رقمطراز ہیں:-

اقسام تصانیف حدیث شش اند، جوامع و مسانید و معاجم و اجزاء  
و رسائل و اربعینات۔ (اور اربعینات کی تعریف یہ کی ہے) از تصانیف  
احادیث کہ آثر اربعین نامند یعنی چہل حدیث، دیک باب یا ابواب متفرقہ  
بیک سند یا اسانید متعددہ جمع نمایند و اربعینات، ہم بشمار اندیدہ و  
شنیدہ می شوند۔

حاجی خلیفہ التوفی ۱۲۹۶ھ، کشف الطنون عن اسامی الکتاب و الفنون، طبع استانبول

۱۳۶۰ھ ج ۱ ص ۵۲ میں لکھتے ہیں:-

اربعینات کی جمع و ترتیب میں محدثین کے مقصد گوناگوں رہے ہیں بعض  
نے توحید و صفات کی احادیث کو ذکر کیا ہے۔ بعض نے احکام ہی کی حدیثوں  
کے نقل کرنے پر اکتفا کی ہے۔ بعض نے صرف عبادات سے متعلق حدیثوں کو  
بیان کیا ہے۔ بعض نے نصیحت اور یادِ آخرت سے متعلق حدیثوں کو جمع



کیا ہے۔ بعض تے صرف صحیح سند سے چالیس حدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔  
بعض نے اعلیٰ سند کی چالیس حدیثوں کو مرتب کیا ہے۔ بعض نے لمبی لمبی حدیثوں  
کو جمع کیا ہے۔

ایک حدیث میں ایسی چالیس حدیثیں جن کا تعلق اصول یا فروع دین سے ہو، یاد  
کرنے اور نشر و اشاعت کرنے پر شفاعت رسول کی بشارت آئی ہے۔ اس وجہ سے قدما نے  
اس موضوع پر قلم اٹھایا اور سب سے پہلے عبداللہ بن المبارک المتوفی ۸۵ھ نے "اربعین"  
چہل حدیث لکھی اور پھر اس سلسلہ کو بڑا قبول عام حاصل ہوا۔ اور ہر نامور محدث نے  
کتاب الاربعین لکھی، جن میں سے بعض محدثین کی اربعینات کی ایسی شہرت ہوئی کہ نامور  
محدثین نے ان کی ضخیم ضخیم شرحیں لکھیں۔ چنانچہ محی الدین نووی کی کتاب الاربعین کا شمار  
اسی قسم کی اربعینات میں کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے مشہور محدثین۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی المتوفی ۱۲۵۲ھ۔  
میردلف ثانی شیخ احمد مرہندی المتوفی ۱۲۳۴ھ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی المتوفی  
۱۱۶۹ھ کی اربعینات مشہور ہیں۔ شاہ ولی اللہ کی "چہل حدیث" اردو ترجمہ اور فوائد کے  
ساتھ کئی بار زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔

غالباً سب سے پہلے اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کی سعادت سید احمد شہید کے  
خلیفہ سید عبداللہ بن سید بہادر علی بن سید حسن بن سید جعفر مدنی ثم ترمذی، ثم لاہوری ثم  
"سوانی" صاحب مطبع احمدی کو حاصل ہوئی۔ موصوف نے اس کا اردو میں ترجمہ کر کے اپنی  
"تفسیر مقبول" کے مطبع احمدی کلکتہ سے ۱۲۵۳ھ میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ راقم کے  
کتب خانہ میں موجود ہے جو کتاب مذکور کے ۱۲۴ھ سے ۱۲۵ھ تک پھیلا ہوا ہے۔

اس ترجمہ کے چار سال بعد اس کا دوسرا ترجمہ مع فوائد محمد مصطفیٰ خاں بن محمد روشن  
حنفی المتوفی ۱۲۶۹ھ صاحب مطبع مصطفائی کاپنور و لکھنؤ نے اپنے مطبع سے ۱۲۵۸ھ میں  
حسبہ اللہ شائع کیا۔ موصوف کا بیان ہے ۱۔

در ماہ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۸ھ مقدسہ مطبع مصطفائی واقعہ محمود نگر

ذیر اکبری دروازہ من محلات بیت السلطنت لکھنؤ حسبہ اللہ محمد مصطفیٰ خان  
ولد حاجی محمد روشن عفا عنہا الرحمن طبع نمود۔

یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے زبان و بیان کے اعتبار سے مختلف ہے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس رسالہ میں اگرچہ مختصر حدیثوں کا انتخاب کیا ہے  
لیکن ہر حدیث ’دبیا بجاہ اندر‘ کا مصداق ہے۔ اور پھر مضامین کے اعتبار سے  
تنوع بھی خوب ہے۔ عقائد، اعمال اور اخلاق، غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایت  
کا سامان اس مختصر میں ہے۔ یہ محسن انتخاب شاہ ولی اللہ کے ذہن اور افتاد طبع کا پورا  
پورا غماز ہے اور اپنی افادیت کی وجہ سے بار بار شائع کئے جانے کے لائق ہے۔

آج سے ایک سو اٹھائیس برس پہلے محمد مصطفیٰ خان نے پہلی حدیث ”کا جو ترجمہ  
اور فوائد شائع کئے ہیں اُن کی زبان قدامت کے باوجود نہایت صاف، سلیس اور رواں  
ہے اور فوائد بہت مختصر و جامع ہیں، یہی ترجمہ و فوائد ہدیہ ناظرین ہے۔  
”چشتی“

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	شروع اللہ کے نام سے جو مہربان ہے رحم والا۔
اَمَّا بَعْدُ الْحَمْدُ وَالصَّلٰوةُ فَهٰذِهِ	پہچھے تعریف خدا کے اور درود محمد مصطفیٰ کے
اَرْجُوْنَ حَدِیْثًا مُّسْنَدَةً بِالسَّنَدِ	یہ چالیس حدیثیں مُسْنَد ہیں صحیح
الصَّحِیْحِ اِلَى النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ	سند کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک
وَسَلَّمَ مَبَانِیْنِهَا یَسِیْرَةٌ وَمَعَانِیْنِهَا	ان کے بول تھوڑے ہیں اور مقصد بہت
کَثِیْرَةٌ لِّیَدْرِسَهَا رَاغِبٌ خَیْرٌ	ہیں کہ بڑے ان کو بھلی بات چاہنے والا

فہا حدیث مُسْنَد صحیح سند کی وہ ہے کہ جس کی روایت کا سلسلہ آگے پیچھے ایک دوسرے سے رسول خدا  
صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچے اور اُس کے راوی متقی لوگ ظاہر شرع پر چلتے ہوں یا دین قصور نہیں اور دین  
کے راہ میں میبغ نہیں رکھتے ہوں جیسا کہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں اپنے سے آنحضرت تک ۱۱۱

رَجُلًا أَنْ يُدْخَلَ فِي زُمْرَةِ الْعُلَمَاءِ  
 لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَالشَّيْءُ مَنْ  
 حَفِظَ عَلَى أُمَّتِي أَرْبَعِينَ حَدِيثًا  
 فِي أَمْرِ دِينِهَا بَعَثَهُ اللَّهُ تَعَالَى  
 فِيهَا وَكُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ  
 شَافِعًا وَشَهِيدًا قَالَ الْفَقِيرُ  
 وَلَهُ اللَّهُ عَفَى عَنْهُ شَا فَهَنِي  
 أَبُو الطَّاهِرِ الْمَدَنِيُّ عَنْ أَبِيهِ  
 الشَّيْخِ إِبْرَاهِيمَ الْكُرْدِيِّ عَنْ  
 زَيْنِ الْعَابِدِينَ عَنْ أَبِيهِ عَبْدِ  
 الْقَادِرِ عَنْ جَدِّهِ يَحْيَى عَنْ جَدِّهِ  
 الْمُحِبِّ عَنْ عَمِّ أَبِيهِ أَبِي الْيَمَنِ  
 عَنْ أَبِيهِ شَهَابٍ أَحْمَدَ عَنْ أَبِيهِ  
 رَضِيِّ الدِّينِ عَنْ أَبِي الْقَاسِمِ هِنِ  
 السَّيِّدِ أَبِي مُحَمَّدٍ عَنْ وَالِدِهِ أَبِي  
 الْحَسَنِ عَنْ وَالِدِهِ أَبِي طَالِبٍ  
 عَنْ أَبِي عَلِيٍّ عَنْ وَالِدِهِ مُحَمَّدٍ  
 زَاهِدٍ عَنْ وَالِدِهِ أَبِي عَلِيٍّ عَنْ

واسطے امیدواری اس کی کہ  
 جتنے میں بموجب فرمانے نبی کے  
 اور سنا جو یاد رکھے میری امت  
 نفع کے چالیس حدیثیں دین کے  
 کا قیامت میں اللہ تعالیٰ اُس کو فقیہ  
 اُس کا قیامت کو سفارشی اور گواہ  
 ولی اللہ معاف ہو بھول چوک اُم  
 سامنے روایت کی ابو طاہر مدنی سنا  
 شیخ ابراہیم کردی سے اُم  
 زین العابدین سے اُس نے اپنے  
 سے اُس نے اپنے دادا یحییٰ سے  
 دادا محب سے اس نے اپنے باپ کے  
 اس نے اپنے باپ شہاب احمد سے  
 باپ رضی الدین سے اس نے ابی ال  
 نے سید ابی محمد سے اپنے باپ ابو  
 سے اس نے اپنے باپ ابی طالب  
 نے ابی علی سے اُس نے اپنے باپ  
 سے اُس نے اپنے باپ ابی علی سے

وفاقہ یعنی جویم والا سمجھا خدا اور رسول کی بات ۱۲ منہ سلمہ ربہ  
 وفاقہ یہاں سے بیان ہے سند صحیح کا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث  
 سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک ذکر راویوں کا کرتے ہیں تو ان سے جو خبر دار  
 جان لیں ۱۲ منہ سلمہ ربہ

أَبِي الْقَاسِمِ عَنْ وَالِدِهِ أَبِي مُحَمَّدٍ  
عَنْ وَالِدِهِ الْحُسَيْنِ عَنْ وَالِدِهِ  
جَعْفَرٍ عَنْ أَبِيهِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ  
أَبِيهِ زَيْنِ الْعَابِدِينَ عَنْ أَبِيهِ  
الْإِمَامِ الْحُسَيْنِ عَنْ أَبِيهِ عَلِيِّ  
بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ  
قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ  
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

لَيْسَ الْخَبْرُ كَالْمُعَايَنَةِ وَبِهِ  
الْحَرْبُ خُذْ عَةً وَبِهِ الْمُسْلِمُ  
مِرَاةُ الْمُسْلِمِ وَبِهِ الْمُسْتَشَارُ  
مُؤْتَمَنٌ وَبِهِ الدَّلَالُ عَلَى الْخَيْرِ  
كَفَاعِلُهُمْ وَبِهِ اسْتَعِينُوا عَلَى  
الْحَوَائِجِ بِالْكِفَافِ وَبِهِ اتَّقُوا النَّارَ  
وَكُنُوا بِشِقِ تَمَرَةٍ وَبِهِ الدُّنْيَا سِجْنُ  
الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ وَبِهِ الْحَيَاءُ

ابی القاسم سے اس نے اپنے باپ ابی محمد سے  
اس نے اپنے باپ حسین سے اس نے اپنے  
باپ جعفر سے اُس نے اپنے باپ عبد اللہ سے  
اس نے اپنے باپ امام زین العابدین سے اس نے  
اپنے باپ امام حسین سے اُس نے اپنے باپ علی  
بن ابی طالب سے راضی ہو اللہ ان سب سے  
کہ فرمایا حضرت علیؑ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم نے

خبر دیکھنے کے برابر نہیں ہے اور اسی ہلکا  
لڑائی دھوکے کا نام ہے۔ ایک مسلمان  
دوسرے مسلمان کا آئینہ ہے اور جس مشورت کی جا  
اُسے امانت داری لازم ہے اور نیک کام کا بتانے والا  
ثواب میں کرنے والے کے برابر ہے۔ تھوڑا سا ہوا کا مول  
میں چھپا کر ایک دوزخ سے بچو آدھا  
ہی چھوڑا دے کر سہی۔ دنیا قید خانہ ہے  
ایماندار کا اور بہشت ہے کافر کی۔ شرم

و مثل مشہور ہے شنیدہ کہ بود مانند دیدہ ۱۲ منہ

و یعنی رو بہ واس کے عیب جتا رہے اور پیٹھ پیچھے اُس سے دل صاف رہے ۱۲ منہ سلمہ رب

و یعنی جو اُس کے حق میں بہتر اس کو کہہ دے اور اس کے بھید سے کسی کو خبر نہ کہے ۱۲ منہ

و یعنی چپکے چپکے اس کی تدبیر میں رہو کہ شہر حاسد سے بچو ۱۲ منہ سلمہ رب

عہ یہ جو نشانی پہ پہ کی ہے اس کے یہ معنی کہ اسی اسناد سے روایت ہے یہ بھی

حدیث ۱۲ منہ سلمہ رب

خَيْرٌ كُلُّهُ وَبِهِ عِدَّةُ الْمُؤْمِنِينَ  
 تَاْخِذِ الْكَفَّ وَبِهِ لَمْ يَحْلُ الْمُؤْمِنِينَ  
 اَنْ يَهْجُرَ اَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثَةِ اَيَّامٍ  
 وَبِهِ لَيْسَ مِنَّا مَنْ غَشَّاهُ وَبِهِ  
 مَا قَاتَلَ وَكَفَى خَيْرٌ مِّمَّا كَثَرَ  
 وَ اَلْهَى وَبِهِ التَّرَاجُعُ فِي هَيْبَتِهِ  
 كَالْتَرَاجُعِ فِي قِيَمِهِ وَبِهِ الْبَلَاءُ  
 مُوْكََّلٌ بِالْمَسْطِقِ وَبِهِ النَّاسُ  
 كَالْمُسْتَنَنِ الْمُسْطِ وَبِهِ الْغِنَى غِنَى  
 التَّغْنِي وَبِهِ التَّعْيِيْدُ مَنْ  
 وَ عِظٌ بِغَيْرِهِ وَبِهِ وَاِنْ مِنْ  
 الشَّعْرِ لِحِكْمَةٍ وَاِنْ مِنْ  
 الْبَيَّانِ لِسِحْرٍ اَوْ بِيهِ عَفْوُ الْمُلُوكِ  
 اِبْقَاءُ الْمُلُوكِ وَبِهِ الْمَرْءُ مَعَ

سراسر بہتر ہی ہے۔ ایمان دار کا وعدہ کرنا  
 جیسا کہ ہاتھ پکڑ لینا و لٹال نہیں ایمان دار  
 کہ اپنے بھائی کو چھوڑے تین دن سے زیادہ  
 و۔ وہ ہم سے نہیں جو ہماری خیانت کیے و  
 جو تھوڑی چیز ہو اور نعمت کہہ بہتر ہے اس سے جو بہت  
 اور فحلت میں ڈالے۔ دلی چیز کا پھیر لینے وا  
 جیسے وہ شخص کہ اپنی مے کو کھا جاوے۔ ۱۵۔ بڑا  
 مقرر ہے بولنے پر و۔ ۱۶۔ آدمی جیسے  
 کٹھنی کے دندانے و سب پر وہی وہ جو دل  
 بے پرواہی ہو ۱۷۔ نیک بخت وہ ہے۔  
 دوسرے کا حال دیکھ کر آپ غموار ہو جائے۔ اور البتہ  
 بعضے شعر تو سراسر حکمت ہی ہوتے ہیں اول البتہ  
 تقریر تو مادہ ہوتی ہے و کتابا و شاہوں کی بخشہ  
 ملک باقی رکھنے کا سبب ہے و۔ آدمی اس کے ساتھ

و یعنی مومن نے جب زبان سے وعدہ کیا پھر اس کے خلاف ہرگز نہیں کرتا ۱۲ منہ سلمہ رب  
 و یعنی اگر تین دن خفگی رہے تو روا ہے اور اگر نہ رہے تو اور بھی بہتر ہے۔ مراد دنیا  
 ناخوشی ہے ۱۲ منہ سلمہ رب

و یعنی اسلام کے طریق پر نہیں جو مسلمانوں سے دعا بازی کرے ۱۲ منہ سلمہ رب  
 و یعنی اکثر بولنے سے آدمی بلا میں گرفتار ہوتا ہے اگر چپ رہا کرے تو بچا رہے ۱۲ منہ سلمہ رب  
 و یعنی اگر بعضوں میں خلل ہو تو سب میں ہو ۱۲ منہ سلمہ رب  
 و یعنی آدمی سن کے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے ۱۲ منہ سلمہ رب  
 و یعنی اگر زیادہ تیزی کرے تو رعیت ویران ہو جاتی ہے ۱۲ منہ سلمہ رب

مَنْ أَحَبَّ وَبِهِ مَا هَلَكَ أَمْرُهُ  
رَفَّ قَدْرُهُ وَبِهِ الْوَلَدُ لِلْعَرَّاشِ  
لِعَا هِرَ الْحَجَرُ وَبِهِ الْيَدُ الْعُلْيَا  
يَرْكَبُ مِنَ السَّيِّدِ الشُّغْلَى وَبِهِ  
يَشْكُرُ اللَّهُ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ  
بِهِ حُبَّتْ السَّمَى يُعْمِي وَيُصِمُّ  
بِهِ جُمُوعُ الْقُلُوبِ عَلَى حُبِّ  
نَا أَحْسَنَ إِلَيْهَا وَبُغْضٍ مَنْ أَسَاءَ  
بِهَا وَبِهِ الثَّأْبُ مِنَ الذَّنْبِ  
مَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ وَبِهِ الشَّوْهُدُ بَرِي  
لَا يَرَاهُ الْعَايِبُ وَبِهِ إِذَا جَاءَكَ  
بِرَيْسُ قَوْمٍ فَالْكَرْمُوكَا وَبِهِ الْيَمِينُ  
تَلَحُّظُهُ تَدْعُ الدِّيَارَ الْبَلَاغِ  
بِهِ مَنْ قَتَلَ دُونَ مَالِهِ

جس سے محبت رکھتا ہے۔ نہ برباد ہو اور آدمی  
جس نے اپنی حقیقت پہنچانی۔ لڑکا عورت کا  
اور مرد حرام کار کو پتھر ل۔ اوپر کا ہاتھ  
بہتر ہے تلے والے ہاتھ سے ل۔ ۲۵  
خدا کا حق نہ مانے گا جس نے لوگوں کا حق نہ مانا۔  
دوستی چیز کی تجھ کو اندھا اور بہرا کر دیتی ہے ل  
احسان کرنے والے کی محبت پر  
دل بنائے گئے اور بُرائی کرنے والے کی  
عداوت پر ل۔ گناہ سے توبہ کرنے والا  
بے گناہ کے برابر ہے ل۔ حاضر دیکھتا ہے  
اس کو کہ غائب نہیں دیکھتا ل جب کسی قوم  
کا سردار آوے تم پاس تو اس کی تعظیم کرو۔ تجھوٹی  
قسم ملکوں کو اُجاڑتی ہے ۔  
جو اپنے مال کے بچانے سے مارا جاوے

۱۔ یعنی اگر زنا سے لڑکا پیدا ہو تو اُس کی ماں مالک ہے باپ مالک نہیں ۱۲ منہ  
۲۔ یعنی دینے والا بہتر ہے سائل لینے والے سے ۱۲ منہ  
۳۔ یعنی جس چیز کی محبت تیرے دل میں جی پھر اس کا عیب تجھ کو نظر نہیں پڑتا اور اگر کوئی اس  
بُرائی بیان کرے تو تو اُس کو دل سے نہیں مُستنا ۱۲ منہ سلمہ ربہ  
۴۔ یعنی تجھ سے محبت اور موزی کی عداوت دل کی پیدائشی صفت ہے ۱۲ منہ  
۵۔ یعنی توبہ کرنے سے گناہ معدوم ہو جاتے ہیں ۱۲ منہ  
۶۔ مثل مشہور ہے ۔ شنیدہ کئے بود مانند دیدہ ۔ یعنی جب تک نہ دیکھے  
یہ کو آنکھوں سے اُس کی گواہی نہ دے ۱۲ منہ

تو وہ بھی شہید ہے۔ ۳۳ کاتوں کا اعتدال نیت ہے و  
 قوم کا سردار اُن کا خدمت گار و۔  
 سب کاموں میں میانہ روی بہتر ہے و۔  
 الہی برکت دے میری امت کے اول روز  
 کے جانے میں روزِ پنجشنبہ کے ۳۴ گنا ہے کہ محتاجی  
 کفر ہو جاوے و۔ ۳۵ سفرِ مذاب کا ایک  
 ٹکڑا ہے و۔ ۳۶ مجلسیں امانت داری  
 کے ساتھ ہوتی ہیں و۔ سب سے بہتر  
 توشہ پرہیز گاری ہے۔

فَهُوَ شَهِيدٌ وَبِهِ الْأَعْمَالُ بِالرَّيَّةِ  
 وَبِهِ سَيِّدُ الْقَوْمِ خَادِمُهُمْ  
 وَبِهِ خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَطُهَا  
 وَبِهِ اللَّهُمَّ بَارِكْ فِي أَمَّتِي فِي  
 بُكُورِهَا يَوْمَ الْخَمِيسِ وَبِهِ كَادَ الْفَقْرُ  
 أَنْ يَكُونَ كُفْرًا وَبِهِ أَسْفَرُ قِطْعَةٍ  
 مِنَ الْعَذَابِ وَبِهِ السَّجَالِسُ  
 بِالْأَمَانَةِ وَبِهِ خَيْرُ  
 الرِّزْقِ التَّقْوَى۔

وَصَلَّى اللَّهُ تَعَالَى عَلَى خَيْرِ خَلْقِهِ  
 مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَاصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

۱ یعنی اگر نیت صحیح ہے تو عمل بھی صحیح ہے اور اگر نیت خراب تو عمل بھی خراب ۱۲ منہ  
 ۲ یعنی سردار کو لازم ہے کہ اپنی قوم سے غافل نہ ہو اور خدمت کرے ۱۲ سلمہ ربہ  
 ۳ یعنی کمی اور زیادتی خوب نہیں ۱۲ منہ سلمہ ربہ  
 ۴ یعنی بھٹے قسم کا فقر آدمی کو کافر کرتا ہے اس سے بچا کرے ۱۲ منہ سلمہ ربہ  
 ۵ یعنی بے حاجت آدمی کو سفر نہ چاہیے کہ مفت محنت اور مشقت میں پڑ جاتا ہے ۱۲ منہ  
 ۶ یعنی مجلس کی بات باہر نہ کہے ۱۲ منہ سلمہ ربہ

# امداد فی مآثر الاجداد

مؤلفہ: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

مترجمہ: پروفیسر محمد ایوب قادری ایم لے

حمد لله الذی بنعمته تمام تعریف اس خدا کے لئے ہے جس کی  
تم الصالحات و علی فضله نعمت سے نیکیاں پوری ہوتی ہیں۔ اور اس کے  
عول فی جمیع الحالات کرم پر حالت میں رجوع کیا جاتا ہے۔  
وبسم الله الرحمن الرحيم و صلی الله علی سیدنا محمد  
والہ وصحبہ اجمعین۔

اس کے بعد فقیر ولی اللہ بن شیخ عبد الرحیم کہتا ہے کان اللہ تعالیٰ لهما فی الآخرۃ  
اولیٰ (اللہ تعالیٰ ان دونوں کے لئے آخرت اور اس دنیا میں ہو جائے) کہ یہ چند ورق  
فقیر کے بعض بزرگوں کے احوال کے بیان میں ہیں، اس کا نام امداد فی مآثر الاجداد  
ناگیا ہے، حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (اللہ ہمارے لئے کافی ہے اور وہ اچھا وکیل ہے)  
شیدہ نہ رہے کہ اس فقیر کا سلسلہ نسب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک اس طرح پہنچتا ہے۔  
سب نامہ فقیر ولی اللہ بن شیخ عبد الرحیم بن شہید وجیہ الدین بن معظم بن منصور بن

ذیلی عنوان مترجم نے قائم کئے ہیں۔



احمد بن محمود بن قوام الدین عرف قاضی قادن بن قاضی قاسم بن قاضی کبیر عرف قاضی  
بدہ بن عبد الملک بن قطب الدین بن کمال الدین بن شمس الدین مفتی بن مشیر ملک  
بن محمد عطار ملک بن ابو الفتح ملک بن عمر حاکم ملک بن عادل ملک بن فاروق بن جویس  
بن احمد بن محمد شہر یار بن عثمان بن ماما بن ہمایوں بن قریش بن سلیمان بن عفان  
بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ وعنہم اجمعین۔

۱۔ الثورة الهندیہ (باغی ہندوستان) میں عبدالشاہ دغاں شروانی نے شیر الملک شاہ ایرانی بن شاہ  
عطار الملک بن ملک بادشاہ لکھا ہے (الثورة الهندیہ ص ۱۳، بخور ستمبر ۱۹۷۷ء)۔

۲۔ شروانی صاحب نے صرف ”حاکم“ لکھا ہے (الثورة الهندیہ ص ۱۲)۔

۳۔ شروانی صاحب نے ”تارون“ لکھا ہے ایضاً ص ۱۲۔

۴۔ شروانی نے ”احمد نامدار“ لکھا ہے ایضاً ص ۱۲۔

۵۔ در نسخہ الف ”ماہان“ اور شروانی صاحب نے ”دامان“ لکھا ہے۔

۶۔ در نسخہ الف ”عفان بن عبد اللہ بن محمد بن عبد اللہ بن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ“ حضرت عبداللہ

(ف س ۷۳) بن عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارہ فرزند (۱) ابوبکر (۲) ابو عبیدہ (۳) واقد (۴) عبداللہ (۵) عمر

(۶) عبدالرحمن (۷) سالم (۸) عبید اللہ (۹) حمزہ (۱۰) زید (۱۱) بلال (۱۲) ابوسلمہ تھے (کتاب الطبقات

الکبیر (ابن سعد) جلد چہارم ص ۱۵ طبع برلن ۱۳۲۳ھ) و تہذیب التہذیب جلد پنجم ابن جریر مطبوعاتی

حیدر آباد دکن (۱۳۲۷ھ) ان میں سے کسی فرزند کا نام عفان یا محمد نہیں ہے۔ شاید یہاں یہ بات خالی

از دلچسپی نہ ہو کہ فاروقیان ہند کے بعض خاندان (مدرا س، گویا متو، اودھ، امدوہ، پچھراویں

(ضلع مراد آباد) شیخ پور (بدایوں) تھانہ بھون، جو پور) اپنا شجرہ نسب، حضرت عبداللہ بن عمر

کے ایک صاحبزادے ناصر الدین یا ناصر سے ملاتے ہیں حالانکہ کتب رجال میں ای کے کسی فرزند

کا نام ناصر الدین یا ناصر نہیں ہے، تاریخ و انساب سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو فاروقیان ہند

پاکستان کے شجروں پر تحقیقی کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں شیخ وحید احمد مسجد ساکن شیخ پور (ضلع

بدایوں، یوپی) نے جو خاندانی اعتبار سے فریدی فاروقی ہیں، اپنی کتاب ”سوانح حضرت بابا فرید الدین گنج شکر

ص ۵۷-۵۸) میں نہایت مبعرانہ اور محنت مندی کی ہے جو پاک اکیڈمی (۱۹۷۱ء) حیدر آباد (کراچی) کے شائع ہوئی۔

پرانے نسب ناموں میں جو رہنک میں اور شاہ ارزانی بدایونی کے خاندان میں موجود ہیں کہ جن کا نسب سالار حسام الدین بن شیر ملک سے ملتا ہے (ان میں) ایسا ہی پایا گیا ہے اور پرانے زمانے میں "ملک" تعظیم کے لئے تھا جیسے ہمارے زمانے میں "خان"

۱۔ بدایوں کے سلسلہ میں مختلف کتب تواریخ، مختلف خاندانوں کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شجرے خاکسار کے پیش نظر ہیں مگر ان بزرگ "شاہ ارزانی" کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا۔  
 ۲۔ شاہ ارزانی بدایونی کی اولاد میں مشہور عالم و فاضل مولانا فضل حق خیر آبادی (ف ۱۸۶۱ء) بیان کئے جاتے ہیں شاہ ولی اللہ دہلوی نے شاہ ارزانی کو بصراحت شیر ملک کے بیٹے "سالار حسام الدین" کی اولاد میں بتایا ہے (خاکسار کے پیش نظر امدادی مآثر الاجداد کے تین مختلف مطابع کے مطبوعہ نسخے موجود ہیں۔ تینوں میں شیر ملک کے لڑکے کا نام سالار حسام الدین لکھا ہے) مگر مولانا فضل حق خیر آبادی کے سوانح نگار مولوی عبدالشہید خاں شیروانی (الثورة الهندية ص ۱۲-۱۳) اور مفتی نظام اللہ شہابی (مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء ص طبع کراچی ۱۹۵۷ء) نے ان کو بغیر کسی حوالے اور شاہ ولی اللہ کی اس صراحت کو نظر انداز کرتے ہوئے شیر ملک کے ایک اور بیٹے "بہار الدین" کی اولاد میں شاہ ارزانی کو بتایا ہے۔ گو پامتوں کے انساب پر مولوی مصطفیٰ علی خاں گوپاموی (ف ۱۲۳۸ھ) کا مشہور رسالہ "تذکرۃ الانساب" (طبع مدراس ۱۹۵۵ء) خاکسار کے پیش نظر ہے اس میں انہوں نے شاہ ارزانی کا اوپر کا سلسلہ مطلق نہیں دیا ہے۔ عبدالشہید خاں شیروانی اور مفتی شہابی صاحب نے کہیں اپنے اسخذ کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ نہیں بتایا کہ شاہ ولی اللہ کی صراحت کے باوجود انہوں نے سالار حسام الدین کی بجائے بہار الدین کیوں لو رکھا ہے۔

شیروانی صاحب نے بہار الدین کو مفتی بدایوں بھی لکھا ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ کس تاریخ یا کتاب کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔

۳۔ "ملک" کا لفظ آج بھی پنجاب میں تعظیم کے لئے بولا جاتا ہے۔

کا لفظ ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

**قیام رہتک** (یہ بات) پوشیدہ نہ رہے کہ ہمارے بزرگوں میں سب سے پہلے جس نے شہر رہتک میں اقامت اختیار کی وہ شیخ شمس الدین مفتی ہیں اور یہ رہتک، ہانسی اور دہلی کے درمیان ایک شہر ہے۔ دہلی سے تیس کو س دور قبلہ کی طرف واقع ہے۔

شروع میں جب ہندوستان فتح ہوا تو سادات اور قریش بڑی تعداد میں وہاں قیام پذیر ہوئے اور اس علاقہ کا کوئی دوسرا شہر اس سے زیادہ آباد اور بارونتی نہ تھا اور زمانہ گزرنے کے ساتھ وہ آبادی اور رونق ختم ہو گئی تھی۔

**شمس الدین مفتی** یہ بزرگ (شیخ شمس الدین مفتی) عالم اور عابد شخص تھے اور قریش کی نسل سے پہلا جو شخص اس شہر (رہتک) میں آیا اور جس کی وجہ سے شعائر اسلام ظاہر ہوئے اور کفر کی کثرت ختم ہوئی، وہ وہی (شمس الدین مفتی) تھے اور ان کے لئے در نسخۃ الف «سادات و قریش شراواں» و در نسخۃ مجتہبائی «سادات و قریش فراواں»۔  
لے یہ بیان محتاج ثبوت ہے۔

۳ لے رہتک میں ایک صدیقی شیوخ اور دوسرا قریشی شیوخ کا خاندان آباد ہے یہ خاندان آخر تک امتیاز و اقتدار کے حامل رہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے آثار الابداد اور پرورش منظر الحق صدیقی (الملکۃ السلفیہ لاہور ۱۹۶۲ء)۔

۴ لے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کے زمانہ کا تعین نہیں کیا ہے لیکن شمس الدین، سیدنا عمر فاروق کی اٹھارویں یا انیسویں پشت میں ہیں، رہتک کے صدیقی خاندان کے مورث قاضی قوام الدین کی آمد ابتدائی عہد تعلق (۱۲۲۵ء تا ۱۲۳۵ء) بیان کی جاتی ہے یہ زمانہ ساتویں صدی ہجری کا شروع ہے۔ قاضی قوام الدین، سیدنا صدیق اکبرؓ کی سترھویں پشت میں بیان کئے جاتے ہیں (ماثر الابداد ص ۱۱) علم انساب کی رو سے ایک صدی میں تین پشتیں گزرتی ہیں اس لئے ان بزرگوں (مفتی شمس الدین اور قاضی قوام الدین) کے آمد کے زمانہ کا تعین ٹھیک معلوم ہوتا ہے مگر بظاہر تقدم قاضی قوام الدین کو ملتا ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔

عجیب حالات میں سے ایک بات یہ ہے بعض لوگ ذکر کرتے ہیں، واللہ اعلم کہ انہوں (شیخ شمس الدین مفتی) نے وصیت کی کہ نماز کے بعد ان کے جنازہ کو اس مسجد میں رکھ دیں کہ جو ان کی عبادت گاہ اور اعتکاف گاہ تھی اور تھوڑی دیر کے لئے اسے (مسجد کو) خالی چھوڑ دیں اس کے بعد اگر (جنازہ کو) موجود پائیں تو اسے دفن کر دیں ورنہ واپس چلے آئیں۔ چنانچہ ایسا ہی عمل کیا گیا جب ایک گھڑی کے بعد دیکھا تو جنازہ کا نشان موجود نہ تھا۔

جب حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) قدس سرہ اس حکایت کو بیان کرتے تھے تو وہ اس کی تائید کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس زمانہ کے سلسلہ چشتیہ کے مشائخ کے حالات کی کتابوں میں اس واقعہ کو میں نے دیکھا ہے۔ ہر چند ان بزرگ کے نام کو معلوم کیا مگر معلوم نہ ہوا۔

بعض قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زلزلے میں مسلمانوں میں ذی اقتدار (شخص) اس قسم کے قصبات میں سکونت اختیار کرتا تھا تو قضاء، احتساب اور افتاء وغیرہ کے اعتبار سے قصبہ کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوتی تھی۔ اور بغیر اس (منصب) کے بھی قاضی، محتسب اس کو پکارتے تھے لہٰذا واللہ اعلم۔

اس بزرگ (شمس الدین مفتی) کے زندگی کے دن پورے ہونے کے بعد ان کی اولاد میں لائق ترین کمال الدین مفتی تھے جو ان کے طریقہ پر ان امور کے ذمہ دار ہوئے۔ اور ان کے بعد ان کے لڑکے قطب الدین اور ان کے بعد اُن کے لڑکے عبدالملک نے اسی انداز پر اپنی زندگی کے دن گزارے۔

قاضی بدہ بن عبد الملک | ان بزرگوں کے گزرنے کے بعد عہدہ قضا کا منصب ان شہروں میں قائم ہوا۔ قاضی بدہ بن عبد الملک مذکور نے

لہٰذا قاضی و محتسب کے باقاعدہ سرکاری منصب تھے، لہٰذا ان مناصب کے بغیر کسی کو قاضی و محتسب کیسے پکارا جاسکتا تھا۔ آج کل بھی کسی کو جج یا پرنسٹنٹ پولیس ایفیسر منصب کے نہیں پکار سکتے ہیں۔

اپنی موروثی ریاست کی حفاظت کی وجہ سے منصب قضاہ اختیار کیا۔ ان کے بعد ان کے دو لڑکے ہوئے، ایک قاضی قاسم کہ جو اپنے باپ کے انتقال کے بعد ان کے جانشین ہوئے۔ دوسرے لڑکے منگن تھے ان کے بعد ان کے ایک لڑکے ہوئے جن کا نام یونس تھا۔

**قاضی قاسم** | قاضی قاسم کے دو لڑکے ہوئے۔ ایک قاضی قادن کہ جو اپنے باپ کے جانشین اور شہر کے رئیس تھے۔ بظاہر ان کا نام عبدالقادر یا قوام الدین ہے۔ ہندوؤں کی زبان پر نام بگڑ گیا۔ واللہ اعلم۔ دوسرے لڑکے کمال الدین تھے اور ان (کمال الدین) کا ایک لڑکا رہا کہ جس کا نام نظام الدین تھا۔

**شیخ محمود** | قاضی قادن کے دو لڑکے ہوئے۔ شیخ محمود و شیخ آدم کہ جن کا عرف بھائی خاں تھا۔ ان کی نسل باقی رہی۔ شیخ محمود اپنے خاندان میں بزرگ تھے۔ اور کسی سبب سے انہوں نے عہدہ قضاہ اختیار نہ کیا اور سرکاری ملازمت اختیار کر لی اور انہوں نے اس

لے شاہ ولی اللہ نے شمس الدین مفتی کے پڑپوتے قطب الدین کے گزرنے کے بعد ان شہر (رہتک وغیرہ) میں عہدہ قضاہ کا قیام بتایا ہے۔ حالانکہ آغا ز مضمون میں رہتک میں سادات و قریش کی کثیر آبادی بتائی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اس علاقہ کا سب سے زیادہ بارونق شہر تھا تو گویا ڈیڑھ دو سو برس تک وہاں عہدہ قضاہ قائم نہ ہوا حالانکہ آثار الاعداد (ص ۷) کے مؤلف نے بتایا ہے کہ ۱۲۲۰ھ تا ۱۲۲۵ھ کے درمیان (شروع ساتویں ہجری میں) (یعنی مفتی شمس الدین کے زمانے میں) رہتک کے قاضی قوام الدین مقرر ہوئے اور اس کے بعد یہ عہدہ ان کی اولاد کے پاس رہا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ رہتک کے علاوہ کسی اور قصبہ کے قاضی مقرر ہوئے ہوں گے یہ بھی نہیں آیا کہ ہندوؤں کی زبان پر کیوں بگڑا: شجرہ میں تو مسلمانوں نے ان کو قاضی قادن لکھا ہے، اور پھر شیخ بدہ بھائی تلن اور منگن تو بالکل ہندی نام ہیں، شاہ صاحب نے ان کی توجیہ نہیں فرمائی۔

۱۷ درختہ الف ”الدین“۔

۱۸ مسلم عہد حکومت میں ”عہدہ قضا“ ایک سرکاری منصب تھا (لاحظہ ہو دی ایڈمنسٹریشن آف دی سلطنت آف دہلی از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ص ۱۶۱ (لاہور ۱۹۷۲ء)۔

ملازمت میں زمانہ کے سردو گرم دونوں دیکھے۔ ان کے ظاہری حالات رہتک کے صدیقیوں کی طرح تھے۔ ان کی شادی سوئی پت کے سادات کی ایک لڑکی آفریدیہ سے ہوئی اور اس شادی کا نتیجہ شیخ احمد تھے۔ شیخ احمد بچپن میں رہتک سے چلے گئے اور شیخ عبدالغنی بن شیخ عبدالحکیم کے ساتھ انہوں نے نشوونما پائی۔ انہوں (شیخ عبدالغنی) نے اپنی لڑکی کے ساتھ ان کی شادی کر دی اور ایک مدت تک ان (احمد) کی تربیت کی۔ اس کے بعد وہ رہتک واپس آ گئے۔ قلعہ کے باہر ایک عمارت بنا کر اپنے عزیزوں اور متعلقین (رعایا) کو اپنے ساتھ رہنے کو جگہ دی۔

**شیخ منصور بن احمد** | شیخ احمد کے بعد ان کے بیٹوں میں سے دو کی اولاد باقی رہی۔ ایک شیخ منصور تھے جو شجاعت و حلم وغیرہ صفات ریاست سے متصف تھے۔ انہوں نے پہلے شیخ عبداللہ بن شیخ عبدالغنی مذکور کی لڑکی کے ساتھ شادی کی جو ان کے اموں تھے۔ جس کا نتیجہ شیخ معظم اور شیخ اعظم ہوئے۔ اور پھر اس کی وفات کے بعد دوسری شادی کی جس سے شیخ عبدالغفور اور اسمعیل پیدا ہوئے۔ اور دوسرے شیخ حسن تھے جو منضبط الحال اور صاحب جمعیت تھے۔ اُن کے دو لڑکے محمد سلطان اور محمد مراد تھے۔ حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) نے محمد مراد کو دیکھا تھا۔

**شیخ مراد** | ان (محمد مراد) کی قوت گرفت کا عجیب مشاہدہ کیا گیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسی شمال کی عمریں اٹکوٹھے اور شہادت کی انگلی میں دینار کو لے کر (نقوش کو) مسل ڈالتے تھے اور اس کو دوہرا کر دیتے تھے۔

جب انہوں نے حضرت والد ماجد (شیخ عبدالرحیم) کو بچپن میں دیکھا تو کہا کہ اس لڑکے سے میرے دل پر رعب و مہمیت طاری ہوتی ہے جیسا کہ اس کے دادا شیخ معظم کے دیکھنے سے ہیبت آتی تھی۔ اس صفحہ کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ مطالعہ کرنے والا

لے درس الف "فریدہ"۔ لے درس الف "علم"۔

سے پیرا گراف کے آغاز سے اس جگہ تک نسخہ الف میں عبارت ہے ربط اور مغلق ہے۔

(سلسلہ) نسب کے اس حصہ پر مطلع ہو جاتے کہ اس سے صلہ رحم مقصود ہوتا ہے یہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :-

تَعَلَّمُوا مِنْ أُنْسَابِكُمْ مَا تَصِلُونَ  
بِهِ أَرْحَامَكُمْ فَإِنَّ صَلَاةَ الرَّحْمِ  
مَحَبَّةٌ لِّفِي الْأَهْلِ مَثْرَاةٌ فِي الْمَالِ  
مُسَاةٌ فِي الْأَثَرِ - رواہ الترمذی والحاکم  
اپنے نسب کا علم حاصل کرو جس کے ذریعہ  
سے رشتہ داریاں قائم رہیں کیونکہ صلہ رحم  
محبت کا ذریعہ ہے اس کی بدولت مال بڑھتا  
ہے اور عمر بڑھتی ہے۔

**شیخ عبدالغنی** | اس فقیر (شاہ ولی اللہ) نے شیخ عبدالغنی مذکور کی بعض اولاد سے سنا ہے کہ وہ (شیخ عبدالغنی)، اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔ عالم اور صاحب تقویٰ تھے اور جلال الدین اکبر بادشاہ ان کو بزرگ اور ذی عظمت سمجھتا تھا۔ اس کے بعد جب بادشاہ نے بے دینی اور گم راہی اختیار کر لی تو وہ محبت کا تعلق ختم ہو گیا۔ اور دونوں طرف سے پوری پوری نفرت ظہور پذیر ہوئی۔ ایک مدت کے بعد بادشاہ کو چتور کی مہم پیش آئی تھی۔ اس طرف لگتا رہو میں بھیجی جاتی تھیں اور فتح حاصل نہیں ہوتی تھی۔

لے ترمذی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ حدیثنا احمد بن محمد، حدیثنا عبد اللہ بن المبارك عن عبد الملك بن عيسى الثقفی عن یزید مولی المنبجث عن ابی ہریرۃ عن النبی جلد اول ص ۱۹۲ (مرتبہ مولانا احمد علی سہارن پوری طبع مکتبہ رحیمیہ دیوبند)۔  
لے شیخ عبدالغنی کو، عالم ہستی اور اکبر بادشاہ کی نظر میں بزرگ اور ذی عظمت بیان کیا گیا ہے۔  
بادشاہ کی بے دینی اور گم راہی اختیار کرتے پر بادشاہ سے محبت کا تعلق ختم ہوا اور نفرت ظہور پذیر ہوئی۔ دور اکبری کی کسی تاریخ، اکبر نامہ، آئین اکبری، طبقات اکبری اور منتخب التواریخ وغیرہ میں ان بزرگوار کا کوئی ذکر نہیں ملتا، ملا عبد القادر بدایونی تو ان بزرگوار کا ضرور ذکر کرتے ان کی تاریخ بھی ان کے ذکر سے خالی ہے۔

۱۵۷۵ء مطابق ۱۵۷۶ء میں فتح کیا اور نئے مذہب کا ابراہم فتح چتور کے بارہ برس بعد ۱۵۸۷ء مطابق ۱۵۸۸ء میں ہوا۔ لہذا یہ کہانی بالکل بے بنیاد ہوئی۔

اسی زمانے میں ایک رات کو امام ناصر الدین شہیدؒ بن امام محمد باقرؒ کے مزار (درگاہ) میں بعض اعتکاف کرنے والوں نے بیداری کی حالت میں دیکھا کہ ایک سردار اور اس کی جماعت، آلات جنگ کے ساتھ آئی ہے اور ان کے پاس ایک مشعل تھی۔ وہ اس مزار کے قہر میں داخل ہو گئے (کسی معتکف نے) خیال کیا کہ مسافر ہیں کہ زیارت کی غرض سے آئے ہیں وہ آگے بڑھا تو اُس نے دیکھا کہ وہ رئیس (جماعت) قبر میں داخل ہوا اور اس جماعت میں سے ہر ایک آدمی ایک قبر میں داخل ہو گیا۔

کسی نے اُس سے سوال کیا کہ یہ رئیس کون ہے اور یہ جماعت کیا ہے اس نے کہا کہ حضرت امام (ناصر الدین) ہیں، شہیدوں کی جماعت کے ساتھ ہیں۔ اُس نے پھر سوال کیا کہ کہاں گئے تھے اور کیا کیا؟ اس نے کہا کہ چٹوڑ کو فتح کرنے کے لئے گئے تھے اور اُس کو اس وقت اس برج کی طرف سے فتح کر لیا۔

شیخ عبدالغنی کو جب یہ واقعہ معلوم ہوا تو انہوں نے فتح کی بشارت اور صورت واقعہ اسی طرح بادشاہ (اکبر) سے عرض کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد چٹوڑ کی فتح بے کم و کاست اسی طریقہ سے عمل میں آئی یہ بادشاہ (اکبر) نے امام (ناصر الدین) کے مزار کے لئے بارگاہِ معاف کئے اور شیخ عبدالغنی کے حوالے کر دیئے۔

مسئلہ وحدت الوجود | خواجہ محمد ہاشم کشمی نے شیخ مجدد حضرت شیخ احمد سہروردی قدس سرہ سے

لے در نسخہ الف "آں" کہ بے معنی است، امام محمد باقر کا کوئی فرزند امام ناصر الدین نہیں ہے و امام محمد باقر کے کسی فرزند کا متصل دہلی اس وقت آنا تاریخی واقعات کے خلاف ہے لہذا ان کی اولاد میں ناصر الدین شہیدؒ والوی کا ذکر ملتا ہے اور ان کو مرتبین شجرہ نے انیسویں پشت میں دکھایا ہے ان کا مزار بر والہ متصل ہاشمی واقع ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ اصریٰ اور حامد علی نقوی ص ۱۶۳ و مراجع النسب از سراج الحق ص ۲۱-۲۲ (ضیاء الاسلام) پس قاضیان ص ۱۳۴۔

نہ چٹوڑ کا تفصیلی حال "اکبر دی گریٹ مغل ص ۸۱-۹۶" (انگریزی) میں ملاحظہ ہو۔



نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میرے والد بزرگوار (شیخ عبدالاحد) ایک راز معلوم کرنے کی غرض سے ایک مدت تک شیخ عبدالغنی کی ملاقات کے جو یاں رہے۔ اس لئے کہ شہر سون پت کے ایک عمر اور بزرگ درویش تھے اُن سے اُن (شیخ عبدالغنی) کو یہ راز پہنچا تھا اور وہ راز یہ تھا جو انہوں نے بتایا کہ میرے مرشد جو تھے وہ میرے نانا تھے، انہوں نے اپنے انتقال کے وقت مجھے ایک شوریدہ کار درویش کی معیت میں اپنے پاس بلایا تاکہ القاء نسبت کریں اور (باطنی فیض) عطا فرمائیں۔ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے معاملہ حقیقت کا ایک لاد (ہیں) بتایا۔ اس (راز) کے سننے ہی وہ درویش تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور میں اُسی طرح حیران و سرسیمہ جان اپنی جگہ برقرار رہا۔

حضرت والد (شیخ عبدالاحد) اُن (شیخ عبدالغنی) سے اس بات کے سننے کے خواہش مند تھے کہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اتفاق کی بات کہ شیخ مذکور کو کسی جہم کی وجہ سے سہرند سے گزرنا پڑا۔ جب وہ سہرند میں تو کارواں مراٹے میں ٹھہرے۔ ہمارے والد بھی وہاں پہنچے، مزاج پر سی اور ملاقات کے بعد تنہائی کی درخواست کی اور اُس راز سربستہ کے ظاہر کرنے اور بتانے کی التماس کی۔ شیخ عبدالغنی نے اُس (راز) کو اُن سے بیان کر دیا۔ جب ہمارے والد (شیخ عبدالاحد) شیخ (عبدالغنی) کے پاس سے باہر آئے تو شیخ جمیل الدین نے جو صاحب دل، فاضل اور والد (شیخ عبدالاحد) کے خلفاء میں سے تھے اُن (والد) سے پوچھا کہ آپ نے (اس راز) کو معلوم کیا والد صاحب نے فرمایا کہ ہاں کیا۔ (پھر پوچھا) وہ کیا مسئلہ تھا کہ جو انہوں نے بتایا۔ فرمایا وہی مسئلہ تھا جس پر ہم ہیں اور جو ہمارے طریقہ کی جان ہے یعنی یہ سب کچھ (کائنات) جو دکھلائی دیتا ہے واحد حقیقی ہے کہ جو کثرت کے عنوان میں نمودار ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ درویش سادہ لوح تھا اور جیسے ہی یہ وزنی راز اس کے کان میں پڑا تو اس کا حوصلہ اس (راز) کا تحمل نہ کر سکا اور وہ ہلاک ہو گیا اور

چوں کہ شیخ عبدالغنی، عالم، صاحب تمکین اور راز سے آشنا تھے، اس لئے اپنی جگہ برقرار ہے۔  
**شیخ معظم** | شیخ معظم بدرجہ اتم شجاعت وغیرہ سے متصف تھے اور اس سلسلہ میں

عجیب عجیب واقعات ہیں (جو حد شمار سے باہر ہیں۔ حضرت والد بزرگوار (شیخ عبدالرحیم) فرماتے تھے کہ شیخ منصور کو کسی راجا سے لڑنا پڑا۔ انہوں نے لشکر کا مینہ (داسنا حصہ) شیخ معظم کے سپرد کیا اور اس وقت اُن کی عمر بارہ سال کی تھی۔ سخت لڑائی ہوئی، اور دونوں طرف سے بہت سے لوگ قتل ہوئے۔ اسی دوران میں کہنے والے نے شیخ معظم سے کہا کہ شیخ منصور شہید ہو گئے اور ان کی تمام فوج بھاگ گئی، اُن (شیخ معظم) کی رگ غیرت حرکت میں آئی، کفار کے رئیس (کے مارنے) کا قصد کیا۔ اس دوران میں جو کوئی اُن کو روکتا تھا وہ اُس کو زخمی یا قتل کر کے سامنے سے ہٹا دیتے تھے، بہت کوشش کے بعد راجا کے ہاتھی تک پہنچ گئے۔ سردارانِ کفار میں سے ایک شخص نے مقابلہ کیا۔ انہوں نے تلوار کی ایک ضرب سے اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور اُس کے اعلیٰ اجہم کو گھوڑے کے نیچے ڈال دیا۔ (اس کے بعد) بہت سے لوگوں نے ان کو گھیر لیا، اُس راجا نے سب کو منع کیا اور ڈانٹا اور کہا کہ یہ شخص اتنی کم عمری میں ایسی جواں مردی اور جرات کرتا ہے، یہ بات عجائب روزگار میں سے ہے۔

(راجا نے) اُسی وقت شیخ معظم کے دونوں ہاتھوں کو چما اور نہایت احترام کیا۔ اور اُس غصہ کا سبب دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرے والد شہید ہو گئے۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں حملہ کروں اور واپس نہ جاؤں جب تک کہ یا تو راجہ کو قتل نہ کر دوں یا خود نہ مارا جاؤں، راجا نے کہا کہ اُس آدمی نے جھوٹ کہا تھا، تمہارے والد زندہ ہیں اور اُن کے (شکر کے) جھنڈے فلاں جگہ نظر آرہے ہیں۔ اُسی وقت شیخ منصور کے پاس آدمی بھیجا کہ ہم نے اس لڑکے کی وجہ سے صلح کی ہے اور جو کچھ وہ (شیخ منصور) اُس راجا سے چاہتے تھے اُس نے قبول کیا اور وہ واپس آ گئے۔

**ڈاکوؤں سے مقابلہ** | حضرت والد (شیخ عبدالرحیم) نے موضع شکوہ پور کے ایک بوڑھے

لے شاہ ولی اللہ دہلوی نے زمانہ کاشمیر نہیں فرمایا۔

کسان سے سنا۔ (یہ موضع) شیخ معظم کا تعلق تھا کہ ایک مرتبہ تقریباً تیس سو ڈاکوؤں نے اس گاؤں میں ڈاکا ڈالا۔ اُس وقت شیخ معظم بھی وہاں تھے۔ اور وہاں اُن کی اولاد، بھائیوں اور بنی اعمام میں سے کوئی موجود نہ تھا۔ لوگوں نے اس حادثہ کی اُن کو خبر کی اس وقت دسترخوان بچہ چکا تھا، کھانا آیا۔ انہوں (شیخ معظم) نے کسی محبت یا جلدی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اور باطمینان تمام حسب معمول کھانے سے قانع ہوئے۔ ہاتھ دھوئے، پھر کہا میرے ہتھیار لاؤ، اور میرے گھوڑے کو حاضر کرو۔ جب سوار ہوئے تو دیہاتیوں کا ایک ہتھیار بند کر وہ آیا۔ انہوں نے سب کو واپس کر دیا اور فرمایا کہ میں بہت تیزی سے جاؤں گا اور تم میرے گھوڑے کی دوڑ تک نہ پہنچ سکو گے۔ لیکن راوی کو جو گھوڑے کی دوڑ میں برابر ہو سکتا تھا ساتھ لیا تاکہ وہ اپنی قوم کو اس موقع سے خبردار کر سکے جو ڈاکوؤں سے واقع ہو۔ پس وہ دوڑے یہاں تک کہ ان ڈاکوؤں کو جالیا کہ جو اپنے ٹھکانوں پہنچ چکے تھے، اور غمخت انگیز کلمات کہہ کر (اس) جماعت کو میدان میں لائے، اسی وقت ایک تیرے دو آدمیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ جب انہوں نے دو یا تین تیر اس انداز سے ملاحظہ کئے تو اس جماعت کے دلوں پر بہت رعب غالب آیا، وہ زندگی سے ناامید ہو گئے اور انہوں نے فریاد کرنی شروع کی کہ ہم توبہ کرتے ہیں اور ہمیں معاف کیجئے۔ شیخ معظم نے فرمایا کہ تمہاری توبہ یہی ہے کہ خود اپنے ہتھیار اتار دو اور ہر ایک دوسرے کے ہاتھ باندھے۔ پھر سواری، ہتھیار، گھوڑے لے کر چلو، یہاں تک کہ اس گاؤں تک پہنچو۔ (انہوں نے) ایسا ہی کیا اور اُس طریقہ سے جو اُن کے مذہب میں مقرر تھا، قسم موکہ کھائی کہ پھر اس قصبہ کے بدخواہ نہ ہوں گے، اور شیخ معظم کی صواب دید سے کبھی تجاوز نہ کریں گے۔

اولاد۔ غرض شیخ معظم کے سید نور الجبار سون پتی کی لڑکی سے جو ایک علی نسب سید تھے اور اُن (نور الجبار سون پتی) کے ذی عزت بزرگ، علم و فضل سے آراستہ تھے، تین لڑکے پیدا ہوئے۔ (۱) شیخ جمال (۲) شیخ فیروز (۳) شیخ وحید الدین۔

(مسلسل)

# شیخ ابوالحسن شاذلی

ڈاکٹر جمال الدین ایشال

مشیر ثقافت سفارت جمہوریہ متحدہ عربیہ متقیم رباط - مراکش

شیخ ابوالحسن شاذلی کبار صوفیہ میں سے ایک ممتاز صوفی اور ان کے قطبوں میں سے ایک قطب تھے۔ وہ مغرب اقصیٰ (مراکش) میں پیدا ہوئے اور عمر کا ایک بڑا حصہ انہوں نے یونیس اور مصر میں گزارا۔

شیخ ابوالحسن شاذلی نے اپنا ایک عظیم مکتب تصوف قائم کیا جس کے متبعین اور مریدین اب تک دنیا کے ہر حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مکتب تصوف سے بہت سے طریقے نکلے جو سب فرقہ شاذلیہ کی طرف منسوب ہیں۔

شیخ ابوالحسن شاذلی مغرب اقصیٰ کے شہر سبتہ کے قریب ایک گاؤں غارہ میں ۵۹۲ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اور ان کا پورا نام نور الدین ابوالحسن علی بن عبدالحبار ابن یوسف تھا۔ وہ قبیلہ عوان میں سے تھے، جو مغرب اقصیٰ کا ایک بہت بڑا قبیلہ تھا۔ اسی قبیلے میں سے مشہور ولی اللہ سیدی عبدالرحیم القناتی ہیں۔ ان کا مزار مصر کے شہر قندیس ہے۔ شیخ شاذلی کی ابتدائی زندگی غارہ گاؤں میں گزری۔ وہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اور قرآن حفظ کیا۔ پھر ان کا مزید تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ ہوا

اور اس کے لئے وہ تونس آئے۔ اگرچہ مغرب اقصیٰ کے کئی بڑے شہر جیسے سبتہ مراکش اور فاس قریب تھے، لیکن انہوں نے اُن کی بجائے تونس کا قصد کیا۔ اور اس کی وجہ وہ سیاسی و علمی حالات تھے جن سے اُس وقت مغرب اقصیٰ اور بالعموم عالم اسلامی گزر رہا تھا۔

عالم اسلام میں چوتھی صدی عیسوی میں شیعہ مذہب کو کافی کامیابی حاصل ہو گئی تھی اور اس کے عروج سے دو بڑی شیعہ سلطنتیں قائم ہو گئی تھیں، جن کا عالم اسلام کے مشرق اور مغرب دو حصوں میں غلبہ تھا۔ مغرب میں تو فاطمی سلطنت تھی، جس کے ماتحت تمام بلاد مغرب، مصر، یمن، حجاز اور شام تھے۔ اور مشرق میں بویہیہ سلطنت تھی اور وہ عراق پر قابض تھی جو دولت عباسی کا مرکز تھا۔

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری میں شیعہ مذہب کے اس غلبہ کے خلاف بڑا سخت رد عمل ہوا۔ اور فاطمیہ اور بویہیہ سلطنتوں کے ضعف کے ساتھ سُنی مذہب از سر نو قوت پکڑنے لگا۔ چنانچہ بہت سی سُنی حکومتیں وجود میں آئیں جن کے پیش نظر ہر جگہ شیعہ سلطنتوں اور شیعہ مذہب کو ختم کرنا تھا۔

مشرق میں سلجوقیوں اور اتابکوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ مصر اور شام میں ایوبی اور سالیک برسرِ اقتدار آ گئے اور مغرب اور اندلس میں موحدین کی سلطنت معرضِ وجود میں آئی۔ ان سُنی سلطنتوں کے بعض فرمانروا سنی مذہب کی حمایت میں حد سے زیادہ غلو رکھتے تھے اور وہ ہر فکری تحریک اور ہر فلسفیانہ رائے کو شیعہ مذہب کی طرف واپس جانے کا رجحان سمجھتے تھے۔ کیونکہ شیعہ مذہب میں فلسفہ اور پہلوؤں کے علوم پڑھے جاتے تھے اور وہ ان سے بہت حد تک متاثر بھی تھا۔

اور یہی وہ زمانہ ہے جس میں عالم اسلام بہت سی سلطنتوں میں بٹ گیا۔ اور یہ سلطنتیں ایک دوسرے سے الگ تھلک ہوتی گئیں، اسی زمانے میں عالم اسلامی کمزور ہوا اور مسیحی یورپ کو شام میں سلجوقیوں کے ذریعہ داخل ہونے کی جرأت ہوئی اور اندلس میں چھوٹی چھوٹی قائم شدہ مسلمان حکومتوں کو ختم کر کے عیسائیوں نے اپنی حکومت قائم کرنے کا

اس عجیب و غریب فضائیں روحانی زندگی کو فروغ ہوا، تصوف کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں اور بڑی کثرت سے صوفیا پیدا ہوئے۔ بات یہ ہوئی کہ اسلامی معاشرے نے باہر سے حملہ آوروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو عاجز پایا تو مسلمان اس عظیم قوت کی تلاش میں لگ گئے، جس میں اُن کو اپنی اس مصیبت میں پناہ مل جائے اور اس کے دامن سے وابستہ ہو کر وہ نفسی اطمینان حاصل کر سکیں۔ چنانچہ وہ تدین (دین داری) کی طرف مائل ہوئے اور اس میں بہت آگے بڑھ گئے اور اسی طرح عبادت اور زہد میں بھی۔ اور ان سب سے ان کا مقصد روح کا سکون حاصل کرنا اور پریشانی اور قلق و اضطراب کے عوامل کو جو انہیں گھیرے ہوئے تھے، اللہ کی بارگاہ میں پہنچ کر جھلانا تھا۔ اسی وجہ سے چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں صوفیانہ سرگرمیوں کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ان دو صدیوں میں صوفیاں دو حصوں میں منقسم ہو گئے۔ ایک تو وہ تھے جو خالص روحانی زندگی بسر کرتے تھے۔ اور دوسرے وہ جنہوں نے تصوف کو فلسفہ سے اور روحانیت کو فکر سے مخلوط کر لیا۔ شیخ شاذلی کے زمانے میں مغرب میں تصوف کے یہ دونوں مکتب بروئے کار تھے۔

مغرب اقصیٰ کے شہر فاس میں چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں ایک بہت بڑے صوفی شیخ ابو یوسف بن یلتور تھے۔ اور مغرب اور اندلس کے ہر حصے سے لوگ اُن کا رخ کرتے تھے۔ وہ ان سے استفادہ کرتے۔ ان کے ارشادات سنتے اور اُن سے خیر و برکت حاصل کرتے۔ شیخ ابو یوسف کے پاس آنے والوں میں ایک بزرگ قطب غوث ابو یوسف تلمسانی تھے۔ وہ شیخ ابو یوسف کے پاس کئی سال رہے اور روزوں، نمازوں، زہد و تقشف اور عبادت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو کر اُن کا طریقہ اخذ کرتے رہے۔ چنانچہ جب انہوں نے اپنے مرشد ابو یوسف کی روحانیت سے فیض حاصل کر لیا تو وہ شرق کی طرف روانہ ہو گئے تاکہ وہاں کے مشائخ تصوف سے بھی اخذ فیض کریں۔ خاص طور سے شیخ عبدالقادر جیلانی سے جو عراق کے اس زمانے میں قطب تھے۔

اس سفر کے بعد ابو یوسف مغرب واپس آئے اور بجایہ میں انہوں نے امامت اختیار کر

اُن کی شہرت اپنے مُرشد ابو یزید سے بھی بڑھ گئی اور لوگوں نے انہیں غوثِ کالقبر دیا۔ شیخ ابومدین کے سامنے کئی بڑے بڑے علماء نے زانوئے تلمذ طے کیا، جن میں سب سے پیش پیش مشہور فیلسوف صوفی محی الدین عربی اور شیخ ابوبہد اللہ محمد بن حراز تھے، آخر الذکر شیخ شاذلی کے مرشدوں میں سے ہیں۔

اس وقت مغرب میں موعدین کی سلطنت قائم تھی۔ اُن کے بعض فرمانروا تو فکری زندگی کا خیال رکھنے والے اور علماء اور مفکرین کی حوصلہ افزائی کرنے والے تھے اور ان میں سے بعض بڑے خشک اور اصحابِ فکر اور فلسفے دلچسپی رکھنے والوں پر سختی کرنے والے تھے۔ پہلے گروہ کے حکمرانوں میں ایک خلیفہ موعدی ابویعقوب یوسف بن عبدالمؤمن ہیں۔ یہ وسیع الفکر، محب العلم اور علماء کے اور بالخصوص فلسفیوں کے دوست تھے، انہوں نے ان میں سے ایک کافی تعداد کو اپنا مقرب بنایا۔ ان کے دربار میں مغربی فلسفی ابن طفیل تھے، اور وہ اُن فلسفیوں میں سے ہیں جنہوں نے فلسفہ اور تصوف میں امتزاج پیدا کیا۔ ابن طفیل ہی مشہور قصہ حمی بن یفغان کے مصنف ہیں، جس میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عقل اور شریعت آخر میں دونوں ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اور یہ ابن طفیل ہی تھے، جنہوں نے اپنے دوست فلسفی ابن رشد کو خلیفہ مذکور کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے ابن رشد کا خیر مقدم کیا، اُسے اپنا مقرب بنایا اور اشبیلیہ کا قاضی مقرر کیا۔

لیکن مغرب اقصیٰ کے مسلم معاشرے نے اُس وقت خلیفہ موعدی ابویعقوب کی یہ پالیسی پسند نہ کی۔ کیونکہ سُنی ردِ عمل بڑا موثر اور قوی تھا۔ سنی معاشرہ اس معاملے میں بڑا سخت تھا اور فلسفہ اور فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والوں کو ناپسند کرتا تھا۔ چنانچہ خلیفہ مذکور کے بیٹے اور اس کے جانشین خلیفہ ابویوسف یعقوب نے لوگوں کی مرضی کے سامنے تسلیمِ خم کیا۔ اور علماء، فلسفیوں اور اصحابِ فکر پر سختی کی۔ اور اُس کے عہدِ حکومت میں ان کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی کے دورِ اقتدار میں ابن رشد پر زندقہ کا الزام لگا اور ۱۱۹۱ء میں اُس پر مقدمہ چلا۔ اسی طرح

عظیم فلسفی ابو مدین سقیتیوں کا نشانہ بنے۔ خلیفہ نے انہیں بجا یہ سے ان پر مقدمہ چلانے کے لئے بلوایا اور وہ زنجیروں میں بندھے ہوئے لائے گئے۔ جب وہ تلمسانی پہنچے، بیمار ہوئے اور ۵۹۴ھ میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اس فضا نے جہاں فکر کی تنگی تھی اور گھٹن، سختی اور دار و گیر کا عمل دخل تھا، اصحابِ فکر و فلسفہ و تصوف میں سے بہتوں کو مغربِ اقصیٰ چھوڑنے پر آمادہ کیا۔ ان میں سے سب سے مقدم شیخ محی الدین ابن عربی تھے۔ انہوں نے اندلس اور مغرب کو ۵۹۸ھ میں جب کہ وہ فلسفہ میں اپنے استاد ابن رشد اور تصوف میں اپنے مرشد ابو مدین کے حشر دیکھ چکے، ترک کیا۔ ان حالات میں یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کہ شیخ شاذلی مغربِ اقصیٰ کے بڑے شہروں سے مُنہ موڑ لیتے، ٹیونس میں علوم کی تکمیل کے لئے وہاں کا رخ کرتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغربِ اقصیٰ کے مقابلے میں ٹیونس کی فضا بہتر تھی اور ایک حد تک وہاں آزادیِ فکر و درس تھی۔ ٹیونس میں اس وقت کئی بڑے بڑے صوفی تھے۔ مثال کے طور پر شیخ محمد صالح بن بنسار، شیخ ابو محمد محدوی اور شیخ ابو سعید الباجی، یہ سب غوثِ ابو مدین کے مرید تھے۔ شیخ شاذلی کو جب وہ ٹیونس میں علم حاصل کر رہے تھے، ان عظیم بزرگوں کا زمانہ ملا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ شاذلی کی ان سے ملاقاتیں ہوئی ہوں گی۔ ان کے سامنے انہوں نے زانوئے تلمذ طے کیا ہوگا اور ان سے استفادہ کیا ہوگا۔ اس زمانے میں ٹیونس کی فضا ابو مدین اور اُن کی روحانیت کی خوشبو سے جھک رہی تھی۔ اور وہاں ان کے یہ سارے مرید تھے، جو ان کے طریقے پر عمل پیرا تھے، شاذلی اس فضا سے بہت زیادہ متاثر ہوئے اور اسی وقت سے تصوف اور صوفیہ کی زندگی سے انہیں شغف ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے ابو عبد اللہ بن حرازم سے جو ابو مدین کے شاگرد تھے طریقت اخذ کی اور ان کے ہاتھوں سے خرقہ تصوف پہنا۔

شیخ ابو الحسن شاذلی اپنے گاؤں غمارہ سے ۶۰۰ھ کے قریب ٹیونس گئے۔ اُس وقت ان کی عمر دس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہاں انہوں نے تعلیم شروع کی۔ ٹیونس



کے علماء سے فقہ مالکی اور علوم لغت، ادب، نحو اور صرف اور علوم دین تفسیر، حدیث اور کلام پڑھے۔ وہ اُس وقت تک ان حلقہ ہائے درس میں بیٹھے، جب تک کہ وہ ان سب علوم میں ماہر نہیں ہوئے۔ بعد ازاں تصوف نے انہیں کھینچا۔ اور وہ صوفی کی محبت میں بیٹھے۔ سب سے پہلے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انہوں نے ابو عبد اللہ محمد بن حازم کے ہاتھ سے فرقہ پہنا۔

یہ فضالتھی جن کے اطراف و اکناف میں ایک طرف ابن رشد، ابن طفیل اور ابن عربی جیسے فلسفیوں کے افکار و آراء گونج رہے تھے۔ اور دوسری طرف اس کی دستوں میں قطب و غوث ابومدین، ابو عبد اللہ بن حازم اور ابوسعید الباجی جیسے صوفیہ کی روحانیت موجزن تھی، اس فضا میں جہاں علم اور فکری آزادی کی قوتیں رجحیت اور سنی سخت گیری کی قوتوں سے نبرد آزما تھیں۔ ابوالحسن شاذلی کی شروع میں نشوونما ہوئی اور انہوں نے ابتدائی علوم حاصل کئے۔ لیکن جیسے ہی وہ جوانی کو پہنچے، انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی تشنگی دور نہیں ہوئی اور علم اور معرفت کی ان کو چاہیں تھی وہ نہیں بچی۔ چنانچہ انہوں نے مشرق کی سیاحت کا قصد کیا تاکہ پہلے تو وہ فریضہ حج ادا کریں اور مدینہ طیبہ اور روضہ نبوی کی زیارت کریں، پھر مشرق کے شیوخ سے تکمیل علوم کریں۔

ہم معین طور پر نہیں جانتے کہ شیخ شاذلی نے مشرق کی طرف اپنا پہلا سفر کب کیا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ اس کی ابتدا ۱۱۵۱ھ کے قریب ہوئی، جب کہ ان کی عمر بائیس سال کی تھی، کیونکہ اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہم سنتے ہیں کہ وہ اپنے شیخ ابوالفتح واسطی سے عراق میں ۱۱۵۸ھ میں ملے۔

شیخ شاذلی نے اپنی اس سیاحت کی ابتدا یوں کی۔ سب سے پہلے وہ اسکندریہ پہنچے اور مصر سے گزر کر حجاز میں داخل ہوئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ پھر وہ فلسطین، شام اور عراق گئے۔ وہ جس شہر میں جاتے وہاں کے علماء اور فقہاء کی خدمت میں پہنچتے ان سے احذر علم کہتے اور ان کے حلقے میں بیٹھ کر ساعت کہتے۔ اس سلسلے میں وہ

زیادہ تر عابدوں، زاہدوں اور صوفیوں سے ملتے۔ اس سیاحت کے دوران وہ سب سے زیادہ شیخ ابوالفتح واسطی سے متاثر ہوئے، جو شیخ احمد الرفاعیؒ کے سب سے بڑے مرید تھے۔ شیخ ابوالفتح واسطی کا رفاعی صوفیہ کے ہاں بڑا بلند مقام تھا جس کی بنا پر انہیں مصر میں رفاعی طریقے کو پھیلانے کے لئے بھیجا گیا۔ شیخ واسطی ۶۱۳ھ میں اسکندریہ پہنچے، وہ ایک مدت وہاں مقیم رہے جس کے دوران وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے اور انہیں رفاعی طریقے کی دعوت دیتے۔ موصوف اسکندریہ کی مسجد عطاردین میں درس دیا کرتے تھے۔ اُن کے اور اسکندریہ کے علماء اور فقہاء کے درمیان بہت سے علمی مناظرے اور مجادلے ہوئے، اُن کا اسکندریہ میں ۶۳۲ھ میں انتقال ہوا، اور اُن کا مزار اب بھی ابوالدردار کے مزار کے پاس موجود ہے۔

جب شیخ ابوالفتح واسطی کا اسکندریہ میں انتقال ہوا، تو عراق کے رفاعیوں کو اس کا بڑا قلق ہوا چنانچہ انہوں نے ایک اور قطب کو جو اس وقت اُن کے ہاں مقیم تھا، اس مقصد کے لئے منتخب کیا اور اُسے مصر بھیجا تاکہ وہ وہاں رفاعی صوفیہ کا سربراہ بنے۔ بعد میں اس قطب کی بڑی شہرت ہوئی۔ اور اس نے خود اپنا ایک طریقہ جاری کیا۔ یہ قطب کبیر سیدی احمد بدوی ہیں، جنہیں صوفیاء رفاعیہ نے ۶۳۵ھ میں عراق سے مصر بھیجا تھا کہ وہ رفاعی طریقے کے متبعین کے امور کی نگرانی کریں سیدی احمد بدوی ۵۹۶ھ ۶۹۹ھ میں مغربِ اقصیٰ میں پیدا ہوئے اور مصر کے شہر طنطا میں ۶۷۵ھ ۷۷۶ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

یہ ہی عظیم عالم شیخ ابوالفتح واسطی، جن سے شیخ شاذلی عراق کے دوران قیام میں

---

لے احمد الرفاعی ایک مشہور صوفی تھے۔ وہ عراق کے علاقے واسطی کے ایک گاؤں حسن میں پیدا ہوئے۔ ان کی قبر اُم عبیدہ گاؤں میں ہے جہاں بڑی کثرت سے لوگ زیارت کو جاتے ہیں۔ وہ ۵۱۲ھ ۱۱۱۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۸ھ ۱۱۸۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

طے اور ان سے استفادہ کیا۔ موصوف بتاتے ہیں کہ عراق میں ان سے بڑے کسی اور عالم سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں: ”میں عراق پہنچا اور بہت سے مشائخ سے ملا، مجھے شیخ ابوالفتح الواسطی سے کوئی بہتر نہیں ملا۔“

مشرق کے مختلف شہروں کی سیاحت کے دوران شیخ شاذلی کی سرگرمیاں صرف طلب علم تک محدود نہ تھیں، بلکہ انہیں اپنی متلعلم گشتہ کی تلاش تھی۔ وہ قطب کی تلاش میں تھے۔ قطب کون ہوتا ہے۔ اس بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال و آراء ہیں۔ صوفیہ میں سے جس نے سب سے پہلے قطب کے متعلق کچھ کہا ہے وہ ذوالنون مصری ہیں۔ صوفیہ کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر زمانے میں بہت سے قطب ہوتے ہیں۔ اور ان قطبوں میں سے ایک خاص قطب سب کا سربراہ ہوتا ہے، جسے قطب غوث کہا جاتا ہے۔ یہ امر خود شیخ شاذلی کی ایک گفت گو سے جو انہوں نے اپنے ایک مرید شمس الدین بن کیتک سے کی، واضح ہوتا ہے:

ابن کیتک روایت کرتے ہیں کہ ایک دن میں اپنے مرشد شیخ شاذلی کی خدمت میں حاضر تھا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ میں اُن سے قطب کے بارے میں پوچھوں میں نے ان سے کہا۔ میرے آقا قطب کے کیا معنی ہیں؟ شیخ شاذلی نے فرمایا۔ قطب بہت سے ہیں، ہر گروہ میں جو صوفی مقدم ہوتا ہے وہ اس گروہ کا قطب ہے۔ باقی رہا قطب غوث جو فرد جامع ہو، وہ ایک ہی ہوتا ہے۔

کتاب الفاخر کے مصنف نے قطب غوث کی تعریف یوں کی ہے: ”وہ رجل عظیم اور سید کریم ہوتا ہے۔ مبہم علوم اور اسرار میں سے جو پوشیدہ باتیں ہوتی ہیں، ان کی وضاحت کے لئے جب لوگ پریشان ہوتے ہیں، تو وہ اُس کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس سے لوگ دعا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ مستجاب الدعوات ہوتا ہے یعنی اُس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ کوئی قطب اس وقت تک قطب نہیں ہوتا جب تک کہ اُس میں اُن قطبوں کی جن کا وہ سربراہ جو تمام کی تمام صفات جمع نہ ہوں۔“

در اصل شیخ شاذلی ان اوصاف کے حامل قطب کو اپنی مشرق کی سیاحت کے

جو آپ کے ساتھ گزاری ہیں، یاد کر کے ہمیشہ دعائے خیر آپ کے لئے کیا کرتا ہوں۔ مجھ کو اپنا سچا دوست سمجھیں۔ اگرچہ مجھ سے آپ کی اُن خدمات کا جو آپ نے افغانستان کے لئے کیں اور میری معاونت میں مصروف رہے۔ اس کے صلہ اور معاوضہ میں شرمندہ ہوں۔ مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ مگر خداوند کریم سے اس کے معاوضے کے لئے درخواست ہے۔ انشاء اللہ امید ہے خدا ملاقات نصیب کرے (یار زندہ صحبت باقی)۔

اپنا قول و کراف عنقریب آپ کے لئے روانہ کروں گا، کیونکہ یہاں کوئی اچھی فوٹو نہ تھی ورنہ اسی ڈرک میں روانہ کرتا۔ جناب مولانا صاحب کی خدمت میں سلام پہنچے۔

فقط آپ کا دوست محمد نادر

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں کہ سردار سپہ سالار صاحب مرحوم نے مجھے فوراً سفر خرچ بھیج دیا۔ اور اپنی جلاوطنی کی حالت میں بھی انہوں نے میری مدد کی۔

۱۹۲۷ء تک مصنف افغانی پاسپورٹ پر ترکی میں مقیم تھے انہوں نے جب اس کی تجدید کرانی چاہی تو افغانی سفیر مقیم انقرہ نے انہیں بتایا کہ افغانی وزارت خارجہ نے اُن کو افغانی پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ شاید اس کی وجہ بقول مصنف اُن کی برطانیہ دشمن سرگرمیاں تھیں۔ ظفر حسن صاحب نے اس موقع پر ترکی رعایا ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس بارے میں ترکی حکومت نے اُن کے ساتھ غیر معمولی رعایت کی اور پانچ سالہ مدت قیام کی شرط زرم کر کے صرف ساڑھے تین سال ترکی میں رہنے کے بعد انہیں شہریت کے حقوق دے دیئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں :-

یہ رعایت میرے لئے ایک نعمت تھی۔ ترکی حکومت اور ترکی قوم نے ایک سخت نازک وقت میں مجھے اپنی آغوش شفقت میں جگہ دے کر مجھ پر ایسا احسان کیا کہ میں جب تک زندہ ہوں اس کو نہیں بھول سکتا۔ کیونکہ اس وقت دنیا پہ ہمہ وسعت خود میرے لئے اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ میں کہیں بھی آجا نہیں سکتا تھا اور کوئی ملک بھی مجھے انگریزوں کے پنجے سے اور اُن کی دست برد سے بچانے کا ذمہ نہ لینا چاہتا تھا۔ ترکی حکومت نے

فرمایا مرحبا اے علی بن عبد اللہ بن عبد الجبار۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے قسبی تعلق کا ذکر کیا۔ پھر فرمایا، اے علی! تم ہمارے پاس اپنے علم اور عمل کو بیچنے چھوڑ کر خالی آئے ہو۔ تم نے ہم سے دنیا اور آخرت کا علم لے لیا۔ میں یہ سن کر حیران رہ گیا۔ میں چند روز ان کے پاس رہا یہاں تک کہ اللہ نے میری چشم بصیرت کھول دی اور میں نے اُن کی کرامات اور خوارق دیکھے۔“

اب شیخ شاذلی کے دل کو قرار آ گیا کیونکہ ان کی قطب غوث سے ملاقات ہو گئی تھی۔ قطب نے اول لحظہ ہی میں قطبیت کی نشانی بتا دی تھی۔ انہوں نے شیخ شاذلی کو اُن کے پورے نام اور نسب کے ساتھ پکارا تھا، اور انہیں دنیا اور آخرت کے علوم تلقین کرنے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ اسی لحظہ سے شیخ شاذلی اپنے مرشد کی خدمت میں رہ پڑے۔ اُن سے اخذ علم و معرفت کرنے لگے اور ان کے شاگرد ہو گئے۔

شیخ شاذلی نے اپنے مرشد شیخ ابن مشیش سے اللہ کی محبت اور اس محبت میں فنا ہوتا لیا۔ اور ان کا یہ قول ہے: ”حالتِ سُکر اور حالتِ صحو ہر دو میں جامِ محبت برابر پیتے رہو، عجب بھی ہوش میں آویجا جاؤ، پیو۔ یہاں تک کہ برابر حالتِ سُکر رہے اور اس کے جمال میں غرق ہو کر محبت، شراب اور جامِ تک کو بھول جاؤ اور تم پر اُس کے جمال کا نور اور اس کے کمال و ملال کا تقدس ظاہر جائے۔“

شیخ شاذلی نے اپنے مرشد ابن مشیش سے ایمان، اللہ کا قوی اور کُل ایمان افذ کیا یہاں تک کہ وہ ہر چیز میں اللہ کو پانے لگے، وہ کہتے ہیں: ”ایمان کی نظر سے دیکھو تو اللہ کو ہر چیز کے اندر، ہر چیز کے پاس، ہر چیز کے ساتھ، ہر چیز سے قبل، ہر چیز کے بعد ہر چیز کے اوپر، ہر چیز کے نیچے، ہر چیز کے قریب اور ہر چیز کو محیط پاؤ گے۔ اس کے الاول والا آخر و الاظہر و الباطن کے وصف سے کُل کو مٹا دو، اور وہ ھو ھو ھو ہے۔ اللہ تھا اور اس کے ساتھ کوئی شے نہ تھی۔ اور وہ اس وقت ایسا ہی ہے جیسا تھا۔

شیخ ابن خیش نے اپنے مرید شیخ شاذلی کو تلقین کی کہ وہ مخلوق سے اعراض کرے اور اکیلے اللہ کی پناہ ڈھونڈے۔ شیخ شاذلی کا بیان ہے کہ سیاحت کرتے ہوئے وہ

ایک مرتبہ ایک غار کے پاس پہنچے تاکہ وہاں رات گزاریں۔ انہوں نے ایک آدمی کو باتیں کرتے سنا۔ انہیں تعجب ہوا کہ ایسی الگ تھلک جگہ میں ایک آدمی کیسے موجود ہے۔ انہوں نے ایسے آدمی کو جو رات کو باتیں کر رہا ہے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور غار کے اوپر ہی رات گزار دی۔ جب صبح ہوئی اور شیخ ابوالحسن شاذلی جاگے تو انہوں نے اس آدمی کو اپنے رب کو یوں پکارتے سنا: ”اے رب! ایسے لوگ بھی ہیں جو تم سے چاہتے ہیں کہ مخلوق ان کی طرف متوجہ ہو اور وہ اُسے مسخر کریں، اور اے رب! میں تم سے یہ چاہتا ہوں کہ مخلوق مجھ سے اعراض کرے اور میرے ساتھ کبھی اختیار کرے تاکہ تیرے سوا کوئی اور میری پناہ نہ ہو“

شیخ شاذلی کہتے ہیں: ”اس کے بعد وہ شخص غار سے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں وہ میرے مرشد شیخ ابن مشیش ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ کل رات میں نے آپ کو یہ باتیں کہتے سنا ہے۔ وہ مجھ سے فرماتے لگے۔ اے علی! تمہارے لئے بہتر یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ تو اپنے اللہ سے یہ کہے کہ ”اپنی مخلوق کے دل میرے لئے مسخر کر دے“ تو یہ کہہ ”اے رب تو میرے لئے ہو جا“ جب تمہارا رب تمہارے لئے ہو جائے گا تو ہر چیز تمہارے لئے ہو جائے گی“

یہ تھے وہ روحانی اصول و مبادی جو ایک بندے سے چاہتے تھے کہ وہ اللہ کی محبت پر پوری توجہ کرے اور اس محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دے، جن کی فضا میں شیخ ابوالحسن شاذلی نے اپنے مرشد ابن مشیش سے تربیت پائی۔ شیخ شاذلی کہتے ہیں: ”میں نے اپنے مرشد رحمۃ اللہ علیہ سے تحقیق کے درجے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا، ہوا و ہوس کو ترک کرو اور مولا کی محبت اختیار کرو۔ محبت کی نشانی یہ ہے کہ محب اپنے محبوب کے سوا کسی اور سے سروکار نہ رکھے“

شیخ شاذلی اپنے مرشد کی صحبت میں ہمہ تن عبادت میں لگ گئے۔ اور اس طرح انہوں نے دنیا کی محبت اور مخلوق کی طرف توجہ سے اپنے نفس کو پاک کر لیا۔ وہ پوری طرح اللہ کی محبت کی طرف متوجہ ہوئے اور اُس کی محبت میں فنا ہو گئے۔ جب انہیں

صفائی نفس حاصل ہو گئی اور وہ ولایت اور وراثتِ قطبیت کے اہل بن گئے تو ان کے مُرشد نے انہیں فاس سے ٹیونس جانے کا حکم دیا اور مستقبل میں اُن سے کیا ظہور ہوگا اس سے انہیں آگاہ کیا۔ مُرشد نے اُن سے کہا :- افریقہ کی طرف جاؤ، وہاں ایک شہر شاذلہ ہے اس میں سکونت اختیار کرو۔ پس اللہ تعالیٰ تمہیں شاذلی کے نام سے موسوم کرے گا۔ اس کے بعد تم ٹیونس شہر میں منتقل ہو جاؤ۔

شیخ ابوالحسن شاذلی نے فاس کو خیر باد کہا اور اپنے مُرشد کے ارشاد کی تعمیل کرتے ہوئے ٹیونس کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ اس شہر میں داخل ہونے لگے تو انہیں اہل شاذلہ میں سے ایک فقیر پکڑ ہارا ابوالحسن علی الابرقی ملا۔ شاذلہ ٹیونس شہر کے نواح میں ایک گاؤں ہے۔ شیخ شاذلی اس پکڑ ہارے کے ساتھ ہو گئے۔ اور دونوں شاذلہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں علی الابرقی نے شیخ شاذلی کے زہد اور تقویٰ کی بہت سی نشانیاں دیکھیں۔ وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔ ان کے ہاتھ پیرے اور اُن سے اپنے حق میں دُعا کرنے کو کہا۔ روایت ہے کہ شیخ ابوالحسن شاذلی کی برکت سے وہ شخص مالدار ہو گیا۔

شیخ ابوالحسن شاذلہ گاؤں کے ایک حصے میں اُترے۔ اور سب سے پہلے انہیں ایک مرد صالح ابو محمد عبداللہ بن سلامہ جیبی ملے جو اُن سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اور وہ ایک مدت سے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ جیبی نے اُن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :- میں ٹیونس میں سیدنا شیخ عارف ابو حفص جاسوس کی مجلس میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اُن کا ہاتھ پکڑا اور اُن سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنا مرید بنانا منظور کریں۔ میں نے اُن سے کہا۔ اے میرے آقا میں آپ کو اپنا مُرشد بنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے فرمایا۔ اے میرے بیٹے، اپنے مُرشد کا انتظار کریں یہاں تک کہ وہ مغرب سے آئے۔ وہ آنے والا سید حسنی بٹے اولیا میں سے ہوگا، وہی تیرا مُرشد ہے اور تو اس کی طرف منسوب ہوگا۔ پس جو بھی اہل مغرب میں سے فقرا آتے، میں اُن کا خیال رکھتا ہوں اُن کی صحبت اختیار کرتا۔ ہاں تک کہ اللہ - ج - راحہ کا اور مجھے

شیخ ابوالحسن کی ملاقات مدیترائی - چنانچہ میں نے اُن کو اپنا مرشد بنالیا اور اُن کی صحبت اختیار کی -

شیخ ابوالحسن نے شاذلہ میں اپنے مرشد ابن مشیش کے دستور کو اپنایا ، انہوں نے گاؤں میں سکونت اختیار نہیں کی۔ بلکہ شاذلہ کے قریب ایک پہاڑ زرخوان کے غار کو جس کے دامن میں یہ گاؤں آباد تھا، اپنا مسکن بنایا۔ یہ غار اُن کی خانقاہ تھی جہاں وہ رہتے اور عبادت کرتے تھے۔ اس غار میں شیخ شاذلی کی زندگی بہت پایا زہد و تقشف اور حد سے زیادہ عبادت کی تھی۔ اور اس زندگی میں اکثر اوقات اُن کے نئے مرید جیہیں ان کے ساتھ ہوتے۔

شیخ ابوالحسن کافی عرصہ شاذلہ میں رہے اور اس دوران اُن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ لوگوں نے اُن کی فضیلت اور اُن کا صلاح و تقویٰ دیکھا، اور اُن کی ولایت کے قائل ہو گئے۔ غرض جہاں تک اُن کے مرشد شیخ ابن مشیش کی پیشین گوئی کے پہلے جزو کا تعلق تھا، وہ عمل میں آگئی۔ اُس وقت سے ہی وہ شاذلی کے لقب سے معروف ہوئے۔ اُن کی شہرت پھیلی اور دور دور سے اُن کے پاس لوگ آنے لگے۔ کبھی کبھی وہ اپنی خانقاہ سے چل کر ٹیونس شہر میں آتے۔ وہاں ایک مکان میں ٹھہرتے، درس دیتے، وعظ کہتے۔ اور اس طرح اُن کی دعوت اور طریقے کی اُن کے مریدوں اور شاگردوں میں نشر و اشاعت ہوتی۔

شیخ ابوالحسن کے لئے ٹیونس کوئی اجنبی جگہ نہ تھی۔ وہ اس سے پہلے جب کہ وہ بچے ہی تھے، ٹیونس آئے تھے اور یہیں جوان ہوئے تھے۔ یہیں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اور بعد میں یہیں ان کے یہاں کے علماء اور فقہار سے مناظرے ہوئے اس دفعہ جو وہ ٹیونس آئے تو پورے مرد اور وافر علم رکھنے والے عالم اور صاحب حالات و کرامات صوفی تھے، اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہ تھی کہ ہر طرف سے لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں۔ ان سے علم حاصل کریں۔ ان سے آداب سیکھیں۔ ان کے درس، وعظ اور ارشادات سنیں اور اُن سے دعا اور برکت چاہیں۔ چنانچہ اُن کا حلقہ درس



بڑا وسیع ہو گیا اور ان کے متبعین اور مریدوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی۔ جب وہ درس دینے یا وعظ کہنے بیٹھتے تو ان کے ارد گرد بہت سے آدمی جمع ہوتے اور جب وہ چلتے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تو ان کی جلو میں سینکڑوں آدمی ہوتے۔  
 المنادی ”الکواکب الدریہ“ میں لکھتے ہیں، ”شیخ ابوالحسن جب سوار ہوتے تو بڑے بڑے فقرا اور دنیا والے ان کے ارد گرد ہوتے۔ ان کے سر پر جھنڈے بلند کئے جاتے اور ان کے آگے آگے پیالے بجائے جاتے۔“

شیخ شاذلی کی طرف لوگوں کے اس رجوع سے ٹیونس کے علماء اور فقہاء کا بغض و حسد بھڑک اٹھا۔ اور شیخ موصوف کو اس کی وجہ سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دنوں ٹیونس شہر کا قاضی اور عالم ابوالقاسم ابن البراء تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ لوگ اس سے تو دور بھاگتے ہیں اور شیخ شاذلی جہاں بھی جاتے ہیں ان کے ارد گرد حلقہ بنائے رہتے ہیں، تو اس سے اُسے بڑی تکلیف ہوئی۔ شیخ شاذلی جب ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں تو ان کے لئے جم غفیر کے جلوس ہوتے ہیں جن میں آگے آگے جھنڈے اور طبل ہوتے ہیں تو یہ چیز اُسے سخت اذیت دیتی۔

قاضی ابوالقاسم نے شیخ ابوالحسن شاذلی کے خلاف چالیس عینی شروع کیں۔ اُس نے شیخ کے خلاف ٹیونس کے سلطان ابو زکریا انقصی سے شکایت کی۔ اور یہ الزام لگایا کہ وہ حسنی علوی ہونے کی بنا پر اپنے لئے اقتدار چاہتے ہیں، جیسا کہ اس سے پہلے فاطمیوں نے خود ٹیونس پر اپنی حکومت قائم کی تھی۔ قاضی ابوالقاسم نے صرف اسی خطرناک تہمت پر اکتفا نہ کیا، بلکہ اس نے شیخ ابوالحسن شاذلی پر ایک اور تہمت بھی لگائی جو اس سے کم خطرناک نہ تھی۔ اور یہ تہمت تھی زندیقی، الحاد اور خراج از دین کی۔ اس سے قاضی ابوالقاسم کی غرض یہ تھی کہ جس طرح اس نے سلطان ٹیونس کو شیخ شاذلی کے خلاف کسایا ہے، اسی طرح وہ ٹیونس کے علماء اور فقہاء کو بھی ان کے خلاف کسائے۔  
 درۃ الاسرار کے مصنف لکھتے ہیں:- قاضی ابوالقاسم ابن البراء، سلطان ابو زکریا کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ یہ شخص اہل شاذلیہ میں سے ہے، گدھوں کا چور ہے اور

بزرگ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کے پاس ایک بڑی مخلوق جمع ہو گئی ہے، یہ فاطمی ہونے کا مدعی ہے، اور تیرے خلاف شورش کر رہا ہے۔

قاضی نے بڑی چالاکی سے کام لیا اور اس نے شیخ شاذلی پر جو تہمت لگائی تھی وہ بڑی خطرناک تھی۔ اس سے پہلے اسی ٹیونس میں عبید اللہ مہدی نے فاطمی خلافت قائم کر لی تھی۔ شیعہوں کا تو یہ عقیدہ بھی ہے کہ ایک مہدی آنے والا ہے، اور جب سے فاطمی خلافت ختم ہوئی ہے، وہ اسے دوبارہ قائم کرنے کی امید لگائے بیٹھے ہیں۔ اب شیخ ابوالحسن شاذلی حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کی اولاد میں سے ہیں، اور لوگ ان کا فاطمی ہونا مانتے ہیں۔ قاضی نے کہا کہ شیخ شاذلی کو جو قطب کہا جاتا ہے، تو یہ محض ایک پردہ ہے۔ اس کے معنی دراصل فاطمی امام اور مہدی کے ہیں۔ لیکن طاوہ یہ ہے کہ شیخ شاذلی نہ تو سیاست سے دلچسپی رکھتے تھے اور نہ وہ حکومت اور اقتدار کا سوچتے تھے۔ بلکہ ان کے عقائد بھی شیعوں کے نہ تھے۔ جب ان سے ان کے مرشد کے بارے میں پوچھا جاتا، تو وہ یہ جواب دیا کرتے تھے۔

”اس سے پہلے تو عبدالسلام بن شیش تھے۔ باقی اب میں دشاں دریاؤں سے سیراب ہوتا ہوں۔ ان میں سے پانچ تو انسانی ہیں اور پانچ آسمانی۔ پانچ انسانی دریا یہ ہیں: ۱۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ۔“

بہر حال سلطان ابوزکریا نے قاضی ابوالقاسم کی بات فوراً مان نہیں لی، وہ ایک دانش مند اور عادل حکمران تھا، اس نے حکم دیا کہ ایک اجتماع منعقد کیا جائے جس میں شیخ ابوالحسن شاذلی اور علما و فقہاء جمع ہوں اور شیخ شاذلی سے سوال جواب ہو، اور انہیں موقع دیا جائے کہ وہ اپنی صفائی پیش کریں۔

غرض یہ اجتماع منعقد ہوا۔ اور اس میں سلطان پر دے کے پیچھے بیٹھا ”دردہ اکبر“ کا مصنف لکھتا ہے، ”قاضی ابوالقاسم ابن البزار اور فقہاء کی ایک جماعت جمع ہوئی۔ سلطان پر دے کے پیچھے بیٹھا اور شیخ رضی اللہ عنہ آئے۔ فقہائے اُن سے اُن کے نسب

کے بارے میں بار بار پوچھا۔ شیخ نے اس کا جواب دیا، اور سلطان پر دے کے بیچے بیٹھا سن رہا تھا۔ انہوں نے شیخ سے تمام علوم کے بارے میں گفت گو کی۔ شیخ نے ان علوم کے متعلق اس طرح گفتگو کی کہ انہیں چپ کرادیا۔ وہ شیخ سے وہی علوم کے بارے میں تو بات کر نہیں سکتے تھے۔ شیخ اُن سے اکتسابی علوم کے متعلق گفت گو کرتے رہے۔

شیخ شاذلی نے قاضی اور اس کے ساتھیوں کا منہ بند کر دیا۔ شیخ کا پلہ بھاری پڑا اور سلطان کو نہ صرف شیخ کی بے گناہی کا یقین آگیا، بلکہ وہ اُن کی ولایت کا قائل ہو گیا۔ اُس نے قاضی اور اس کے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا، ”یہ شخص اولیائے کبار میں سے ہے اور تم اُس کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے“

قاضی ابوالقاسم ابن البراء نے محسوس کیا کہ صورت حال نازک ہے کیونکہ باہر اہل ٹیونس سب کے سب جمع تھے، اور مقدمے کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ قاضی نے سلطان کو شیخ شاذلی کے خلاف یہ کہہ کر بھڑکایا کہ اگر آپ نے اس شخص کو چھوڑ دیا تو لوگ جو باہر جمع ہیں، آپ کے خلاف ہو جائیں گے۔ لیکن سلطان نے قاضی کی اس بات پر بھی کان نہ دھرا۔ اُس نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا اور شیخ کو ٹھہرا لیا۔ اور اُن سے کچھ عرصہ بڑی اچھی طرح باتیں کرتا رہا۔ اس اثنا میں سلطان کا بھائی ابو عبد اللہ طیبانی آگیا، جو شیخ شاذلی کا عقیدت مند تھا۔ سلطان نے اُسے حکم دیا کہ وہ شیخ کو عزت و اکرام کے ساتھ اُن کو گھر پہنچا آئے۔

شیخ ابوالحسن شاذلی اس امتحان سے تو کامیاب نکل آئے، لیکن وہ محسوس کرنے لگے کہ ٹیونس میں اُن کا اب رہنا اچھا نہیں۔ وہ جانتے تھے کہ قاضی ابوالقاسم کو ان کے مقابلے میں جو شکست ہوئی ہے وہ اسے آسانی سے قبول نہیں کرے گا۔ اور وہ ضرور کوئی اور چال چلے گا۔ بہت ممکن ہے کہ ان کے متبعین اور قاضی کے ساتھیوں کے درمیان کوئی فتنہ اُٹھ کھڑا ہو۔ وہ تو صوفی ہیں اور امن سکون اور پُر صفا زندگی چاہتے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ٹیونس چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ وہ سفر کے لئے تدبیریں

کرنے لگے۔ سلطان نے جب یہ سنا تو اُسے دکھ ہوا اور جو شخص یہ خبر لے کر آیا سلطان نے اس سے کہا: میں اپنے ملک میں یہ کیا خبر سن رہا ہوں، ایک ولی اللہ ہمارے ہاں آئے وہ یہاں تنگ آگئے اور اب یہاں سے جا رہے ہیں۔

سلطان نے ایک آدمی کو شیخ کے پاس بھیجا، جو انہیں اس سفر کے ارادے سے روکے لیکن شیخ نے بڑے اچھے طریقے سے معذرت کی اور سلطان کے پیغام پر کو کہا: میں حج کی نیت سے جا رہا ہوں۔ خدا نے یہ پورا کر دیا تو میں انشاء اللہ تعالیٰ واپس آؤں گا۔

حج کے بعد واپس آنے کا وعدہ لے کر سلطان نے شیخ شاذلی کو سفر کی اجازت دی۔ ٹیونس سے روانہ ہونے سے قبل شیخ شاذلی نے قاضی ابوالعاسم کو ایک خط بھیجا، جس میں صرف ایک جملہ تھا اور اس میں قاضی، اس کی حرص و طمع اور اس کی نفرت و لینہ پر چوٹ تھی۔ شیخ نے اُسے لکھا: میں تمہارے لئے ٹیونس شہر خالی کر رہا ہوں۔ سلطان کے دربار میں قاضی کو جو شکست ہوئی تھی، اس کی بنا پر اس کا دل شیخ کے خلاف لینے سے بھرا ہوا تھا، اس نے شیخ کے خلاف ایک اور سازش کی۔ اُس نے سلطان مصر کو ایک عہد لکھا، جس پر دوسرے لوگوں کے بھی دستخط تھے۔ اس خط میں شیخ کا ذکر کرتے ہوئے ان پر یہ الزام لگایا کہ وہ علوی خاندان کے ہونے کی بنا پر فاطمی خلافت کی بجائی میں کوشاں ہیں۔ خط کے آخر میں یہ الفاظ تھے: یہ جو آپ کے ہاں پہنچ رہا ہے جس طرح اس نے ہمارے ہاں شورش کی تھی، اسی طرح تمہارے ملک میں شورش پاکرے گا۔

قاضی کا یہ خط لے کر ایک شخص بڑی سرعت سے شیخ کے مصر پہنچنے سے پہلے ہاں پہنچ گیا۔ اُس وقت مصر کا فرمانروا ابوبی خاندان کا بادشاہ الکامل تھا۔ ابوبی سنی المذہب تھے اور انہوں ہی نے مصر سے شیعہ مذہب اور فاطمی خلافت ختم کی تھی، اور وہ شیعوں، مرگرمیوں سے جو فاطمی خلافت کو واپس لانے کے لئے کی جا رہی تھیں، بہت ڈرتے تھے۔ نا جب یہ خط سلطان الکامل کے پاس پہنچا تو اس نے اس پر بہت دھیان دیا چنانچہ

جیسے ہی شیخ شاذلی اسکندریہ پہنچے، مصری حکومت کے کارندوں نے انہیں گرفتار کر لیا اور حراست میں انہیں قاہرہ بھیجا۔ جو نہی وہ قاہرہ پہنچے، انہیں قلعے میں لے جایا گیا جہاں قاضیوں، علماء اور فقہاء کی ایک مجلس منعقد کی گئی۔ سلطان نے شیخ شاذلی الزام لگاتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارے خلاف شہادت ہے۔ جو ٹیونس سے قاضی ابن البراء ابوالقاسم نے فراہم کی ہے۔ اس کے بعد سلطان نے شیخ کو وہ خط دکھایا۔

یہ شیخ شاذلی پر دوسرا مقدمہ تھا۔ شیخ نے جب اپنی صفائی میں تقریر کی، تو سب لوگ ان کی باتوں سے مبہوت ہو کر رہ گئے، اور سب سے زیادہ اثر سلطان پر ہوا۔ سلطان ایک عالم، تہذیب یافتہ اور وسیع الخيال آدمی تھا۔ اُس نے شیخ کا مقام پہچانا اور سمجھ گیا کہ اُن کے خلاف غرض مندوں نے تہمت لگائی ہے۔ اُس نے شیخ میں کوئی خطرناک بات نہ پائی۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ شیخ کا ارادہ مصر میں ٹھہرنے کا تو ہے نہیں، وہ توجع کو جانتے ہوئے مصر سے گزر رہے ہیں۔ سلطان نے اُن کی عورت و احترام کی۔ اس سلسلے میں شیخ ابوالحسن کہتے ہیں ”ہم سلطان الکامل کے ہاں قلعہ میں چند دن ٹھہرے، بلا سفرے ہم پر خوشی کا اظہار کیا۔ بعد میں ہم حج کو روانہ ہو گئے“

فریضہ حج ادا کرنے کے بعد شیخ بسرعت تمام ٹیونس واپس پہنچ گئے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ شیخ نے وہ سب کچھ بھلا دیا جو قاضی ابوالقاسم ابن البراء نے اُن کے ساتھ کیا، اور سلطان ٹیونس اور بعد ازاں سلطان مصر سے ان کے خلاف شکایت کی اور یہ بھی یاد رہے کہ قاضی ابن البراء بھی زندہ تھا اور ٹیونس کا بدستور قاضی تھا۔ بیشک شیخ کو یہ باتیں بھولی نہ تھیں، لیکن سلطان سے انہوں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کے لئے واپس ٹیونس پہنچے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم ایک اور مقصد تھا جس کی خاطر واپس ٹیونس آئے تھے۔ وہ اس لئے ٹیونس واپس آئے تاکہ اپنے مرید، اپنے ولی رفیق اور اپنے خلیفہ ابوالعباس المرسی سے ملیں۔ شیخ ابوالحسن شاذلی سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا:-

”مجھے ٹیونس واپس لانے والا یہ نوجوان، یعنی ابوالعباس المرسی ہے“

# مِصْبَاحُ الْعِرْفَانِ

حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ  
ترجمہ: حافظ عباد اللہ شاہ روتی

اے عزیز جان لے کہ حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے ایک لا انتہا سفر اور ایک پُر خطر راستہ مقرر کیا ہے۔ بے شمار لوگ نہ صرف اس سفر کے خطرات اور راستہ کی جہلک چیزوں سے بے خبر ہیں۔ بلکہ ان سے نجات حاصل کرنے کے ذرائع سے غافل ہیں۔ اس سفر کی منزلیں تو بہت ہیں۔ لیکن مختصراً اچھ ہیں جو عالم بقا کے مسافروں کی منازل اور مراتب کی اصل ہیں۔ اول مُسَلَبِ پدر، دوم رحم مادر، سوم فضائے عالم فانی (دنیا)، چہارم لحد، پنجم ہرگز، ششم دوزخ و بہشت جو ابدی ہیں۔ اور ان کی نعمتوں اور تکلیفوں کی انتہا نہیں ہے۔ بمصدق خلیلین فیہا مَا دَا صَتِ السَّمُوتُ وَ الْأَرْضُ (جب تک زمین و آسمان ہیں ان میں رہنا ہوگا)۔ پہلی اور دوسری منزل میں انسان کی تکمیل نہیں ہوتی۔ تیسری منزل میں انسان اپنے کمال پر پہنچتا ہے۔ اس دیوی منزل میں وجود انسانی کے نقد کو وَلَنْبَلُوْا نَکْمُ حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِیْنَ مِنْ مَّنْکُمْ کے امتحان کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں۔ اس منزل میں جس کو دُنیا کہتے ہیں، سعادت حاصل ہو سکتی ہے۔ دُنیا ایک سرائے ہے جو قیامت کے جھگڑ کے سرے پر بنائی گئی ہے، اور

تجھے اس سرائے میں اٹھو و نما کے بعد چند دن کی جہلت دی گئی ہے، تاکہ یہاں سے قیامت کا زادِ راہ لے جائے۔ ان جہلت کے دنوں میں ظاہر و باطن کی نعمتیں بھی تجھے عطا کی گئی ہیں۔ انبیاء کے ذریعہ آسمانی کتابیں نازل کی گئی ہیں۔ اس طرح حجتِ الہی تجھ پر مضبوط کر دی گئی ہے۔ سعادت و شقاوت کے حصول کی کیفیت بھی بیان کر دی گئی ہے اور نیکی کی نعمت و عذاب کی شدت سے آگاہ کر دیا گیا ہے تاکہ اگر تو چاہے تو اس چند روزہ زندگی کو سعادتِ ابدی کی کچی اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کے حصول کا ذریعہ بنا سکے۔ ورنہ تجھے اختیار ہے کہ دوسرے جہان کے عذاب کی گرفت اور ہمیشہ کی حسرت و ندامت و افسوس کے لئے سامانِ جہنم کرے۔ بدیت

بادشاہی ذوقِ معنی بردن است      نے ہندو و ظلم بر خود کردن است  
گر چہ کسی سرفرازی بایست      ترک ملک بے نیازی بایست  
فی المثل گر صد جہاں است آن تو      آنچہ بغیر کسی تو آن ست آن تو  
گردیں رہ بندہ گر آزادہ      مے نہ بینی آنچہ نعتِ مستلہ  
چوں تو در دنیا نہ گردی سرفراز      در قیامت چوں شوی از اہل راز

بادشاہی ذوقِ حقیقت کا نام ہے جو اپنے نفس پر ظلم و تشدد کرنے سے صاف نہیں ہوتا۔ اگر تجھے کسی کی مانند سرفرازی چاہیے تو بے نیازی کے ملک کو ترک کرنا چاہیے، اگرچہ تنہا جہاں تیری ملکیت میں ہیں۔ جو کچھ تو (آخرت کے لئے) نیچے گا وہ حقیقت میں تیری ملکیت میں ہوگا۔ اس راہ میں خواہ تو غلام ہے خواہ آزاد۔ جو تو نے نہیں بھیجا تجھے دکھائی نہ دے گا۔ جب تو دنیا میں ہی سرفراز نہیں ہوا، تو قیامت میں کس طرح اہل راز ہو جائے گا۔

اے عزیز! عبادات جن سے کہ بندہ کو سعادتِ آخری حاصل ہوتی ہے، بہت سی ہیں، لیکن ان سب کا مجموعہ واصلِ تعظیمِ الامر اللہ والشفقۃ علی خلق اللہ (اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعظیم اور خلقِ اللہ پر شفقت) ہے۔ ان ہر دو صفات کا کمال مؤمن کے دو باروں ہونے کے اس روز چاہیے کہ لَا یَنْفَعُ مَالًا وَلَا بَنُونَ (مال اور اولاد

نفع نہیں دیں گے)۔ ان دونوں بازوؤں کے ذریعہ سراط کی گھاٹی سے بآسانی گزریں گے۔ اور ہمیشہ کے عذاب سے خلاصی پائے گا۔ پہلی قسم فرماں الہی کی تابعداری ہے۔ دوسری قسم احسان ہے جو بے شمار نیکیوں کی گنجی ہے۔ قسم اول حقوق اللہ ہیں جیسا کہ نماز، روزہ، تلاوت قرآن، معروف اور نہی عن المنکر وغیرہ۔ اور دیگر قسم عبادت مالی ہے جو خلقت سے تعلق رکھتی ہے۔ جیسا کہ زکوٰۃ، صدقہ، تعمیر پل و سرائے، غربا، مساکین و یتامیٰ کی تربیت، مایوس و مظلوم کی مدد وغیرہ۔

قسم اول میں سب سے افضل نماز ہے جو بدنی عبادت ہے اور اس قسم کے حقوق کا ادا کرنا سوائے اربابِ قلوب کے کسی سے نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ نماز کی حقیقت مناجات ہے۔ حضرت صمدیت مناجات میں مخاطب ہوتے ہیں، اور مطلق معروف مخاطبہ صرف عارف کامل محقق سے درست ہوتا ہے۔ قیام، قرأت، رکوع و سجود، تشہد، تکبیر اور تسلیم نماز کے ظاہری ارکان کی صورت ہیں۔ اور اس صورت کے لئے رُوح اور اس ظاہر کے لئے برہ اور معنی چاہئیں تاکہ حقیقت مطلوبہ حاصل ہو۔

اسے عزیز نماز غایت کی آگ کا شعلہ ہے۔ جو ہدایت کے انوار کی مشعل سے مخصوص این ازی کے دلوں میں روشن ہوتا ہے بمصداق الصلوة نور قلب المؤمن (نماز مؤمن کے دل کا نور ہے) تاکہ حقیقی نمازی معنی کی روشن شاعوں کی وجہ سے انوارِ جبروتی کا انعکاس ملکوتی آئینوں میں مشاہدہ کرے اور سُبْحَانَكَ اَيُّهَا رَبِّي اَلْاَفَاقُ وَفِيَّ اَنْعُمُهُمْ کے اسرار جو کائنات کے اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں مطالعہ کرے۔ یہاں تک کہ دنیائے صغیر و کبیر کو مشاہدات و دلائل کے ساتھ پردہ عدم میں ڈال دے۔ اور وہی تعینات کے وجود کی خس و خاشاک کو فنا کی آگ سے جلا دے، اور وجودِ حدوث کے بوجھ کی مشقت کے بغیر ہمت کا براق عالمِ جبروت کے میدان میں دوڑائے اور انوارِ جلال و جمال کے مشاہدہ سے فیضیاب ہو کر اور عادت و رسوم کی تکالیف کی ظلمت سے گزر کر عابد قافی ہو جائے۔ اس قسم کی نماز



ادا کرنے والا اس غافل کے کب برابر ہوتا ہے۔ جو نفسانی خطرات اور شیطانی وسوسوں کو سناٹے ہوئے سرزمین پر رکھتا ہے اور اٹھالیتا ہے۔ قیام اور رکوع رسمی طور سے ادا کرتا ہے اور فاتحہ غفلت سے پڑھتا ہے۔

اے عزیز! سورہ فاتحہ کی ایک آیت ہے **رَأَيْتَكَ نَعْبُدُ وَرَأَيْتَكَ نَسْتَعِينُ**۔ یعنی ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے ہی مدد چاہتے ہیں۔ پس جب تو حرص، نفس پرستی اور شیطانی احکام کی پیروی کرتا ہے۔ اور امور میں لشکر اور خزانہ کی امداد چاہتا ہے، تیرا یہ آیت پڑھنا جھوٹ ہوتا ہے۔ اور جھوٹ شریعت میں حرام ہے۔ خصوصاً حق تعالیٰ سے جھوٹ۔ چنانچہ آیت کریمہ **وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ** (جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتا ہے اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے) اس مطلب کو ظاہر کرتی ہے۔ جب یہ حقیقت تجھ پر واشگاف ہو جائے تو تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ عوام نماز کی حقیقت سے مطلق واقف نہیں۔ الا ماشاء اللہ۔ اگر تو نماز کی حقیقت اور اس کے اسرار کی واقفیت چاہتا ہے تو سن!

اے عزیز! قیام نماز کے حقوق کی ادائیگی وہ لوگ ٹھیک ادا کرتے ہیں جو عبودیت کے مقام کا جب قصد کرتے ہیں تو وجود کائنات کے نقوش کو اپنی لوح ضمیر سے محو کر دیتے ہیں اور ترک ماسوئے اللہ کے پانی سے ہاتھ دھو لے لیتے ہیں۔ اور ذکر کی شراب طہور سے مضمضہ (مُحَلّی) کرتے ہیں۔ اور زبانی خوشبوؤں سے استنشاق (ناک میں پانی ڈالتے ہیں) کرتے ہیں۔ اور لشری اخلاقِ رذیلہ کو استنشاق سے دور کرتے ہیں۔ اور حیا کے آبِ حیات سے منہ دھوتے ہیں۔ اور توکل کے زلال سے کلائیوں کو دھوتے ہیں اور اسی چشمہ سے سر کا مسح کرتے ہیں۔ اور کوشش کے قدموں کو استقامت کے پانی سے دھوتے ہیں۔ اور قبلہ کے استقبال میں حقیقی کعبہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور نیتِ تحریمہ میں روحانی مخاطبات کے عہدوں کی تجدید کرتے ہیں۔ اور نگہیں ہستی موجودات کے ذرات کو آفتابِ کبریا کے نور میں محو دیکھتے ہیں۔ اور سرفرازِ یدین میں فاسد و ہمہوں کے تعلقات اور باطل تصورات پس پشت ڈالتے ہیں۔ اور **سُبْحَنَكَ اللَّهُمَّ وَبِحَمْدِكَ** میں عالم تقدیس

میں پاک بازوؤں سے پرواز کرتے ہیں۔ اور تعوذ میں عصمت کے قلعہ میں پناہ گزین ہوتے ہیں۔ بسم اللہ میں عاشقانِ حقیقی کی صبح کی نود عنایت کے مشرق سے ہوتی ہے اور الحمد للہ میں حضرت نامتناہی کے افضال کا جاری رہنا مراتبِ علویات و سفلیات کے مظاہر میں مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں رحمتِ بیکراں کا دریا دیکھتا ہے اور بحرِ احدیت کے اسرار کی موجوں میں غرق ہو جاتا ہے اور ازل کا بحرِ ابد کے بحر سے مل جاتا ہے۔ اور مَلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور پھر دریائے وحدت کے غرقِ خدگان کو ساحلِ تکلیف پہنچے آتے ہیں اور رَایَاکَ نَعْبُدُ کہا جاتا ہے۔ پھر عالمِ اسباب کے مشرقین تکالیف کی امانت کے بوجھ کو سوختگانِ فراق کے پیش نظر کرتے ہیں۔ اس وقت بلبلِ زبانِ حال عنایتِ لایزال سے رَایَاکَ نَسْتَعِیْنُ کے نغمے گانے لگتی ہے اور جب رُوحِ بزرگ جو لاہوت کے فضا کی عنقا ہے، طبیعت کے کنوئیں کی گہرائی سے سالکانِ حضرت ذوالجلال کے مراتب و درجات پر نظر ڈالتی ہے، اور معراجِ ترقی پر چڑھتی ہے، تو فضل کی شاہراہ اُس کو نظر آ جاتی ہے تو اَهِدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ بول اٹھتی ہے۔ پس ندیمانِ مجلسِ انس سے جو عالمِ ارواح میں شرابِ خطاب است باہم پیٹتے ہیں، یاد کرتے ہیں۔ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ کہتے ہیں اور مردودِ دانِ بیچارہ کو غفلت کے میدان میں گم گشتہ دیکھ کر خَیْرَ الْمَخْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الْخَسَارَ لَیْنِ کہا جاتا ہے۔

ولیک ایں صفت رہبرِ و ان چلاک است      تو نازنین جہانی کجا توانی کرد  
نہ دستِ پائے اہل را فرو توانی بست      درنگ بونے جہاں را را توانی کرد  
اگر بہ آپ ندامت بر آوری غسلے      ہمہ کدورت دل را صفا توانی کرد  
تو منزل ہوسات از دو گام پیش نہی      نزول در حرم کسبیا توانی کرد  
لیکن یہ صفت چالاک راستہ چلنے والوں کی ہے تو نازنین جہاں کہاں کر  
سکتا ہے۔ نہ تو اُمید دستِ ویا کو باندھ سکتا ہے اور نہ جہان کے سنگ و لو کو چھوڑ  
سکتا ہے۔ اگر ندامت کے پانی میں غسل کرے تو دل کی تمام کدورتوں کی صفائی کر

سکتا ہے۔ اور اگر حرص کی منزل سے دو قدم آگے بڑھے تو حرم کبریا میں نزول کر سکتا ہے۔ اے عزیز! جب تو نے جان لیا کہ اس قسم کی عبادت تیرے جیسوں کی طاعت سے باہر ہے تو دوسری قسم کو الشفقة علی خلق اللہ غنیمت جان۔ کیونکہ اس کے اسباب تیرے لئے جہتا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کے حق میں شفقت اور احسان کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچنے کے لئے خلقت کے لئے بہت سے راستہ ہیں، اور ہر شخص اس راستہ سے جو اس کے حال کے موافق ہو، اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر سکتا ہے۔ وہ راستہ جس سے حکمران اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتے ہیں عدل اور احسان ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن خلقت سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا لیکن بادشاہوں سے اول سوال عدل اور احسان کے متعلق ہوگا۔

اے عزیز! تیرے ہاتھ اور زبان سے جو احسان بندگان حق کے لئے ہوگا وہ آخرت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، جسے فنا نہیں۔ آج جو توفیق اور طاقت تجھے حاصل ہے، اس سے باقی خزانے جمع کر لے تاکہ عاجز ہونے کے وقت وہ تیری مدد کر سکیں۔

اے عزیز! دنیا کا کام اس سے زیادہ سہل اور حقیر ہے جو لوگوں نے خیال کیا ہے۔ اور آخرت کا کام جو انہوں نے تصور کر رکھا ہے، اُس سے زیادہ مشکل ہے۔

احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن ایسے مقام ہوں گے جن کی ہیبت سے آسمان پھٹ جائیں گے۔ پہاڑ بادل کی طرح ہوا میں اڑیں گے۔ آسمان کے فرشتے زمین پر نزول کریں گے اور خلقت کے گرد گرد صفت باندھ لیں گے۔ آفتاب ایک نیزہ کے برابر ہوگا۔ لوگ پیاس کی شدت اور گرمی سے پسینے میں غرق ہوں گے۔ حضرت جباری اور قہاری صفت میں تجلی کئے گا۔ تمام انبیاء اور پیغمبر مدہوش ہوں گے۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس مقام کی ہیبت سے اسمعیل علیہ السلام کو بھول جائیں گے۔ یہ حال تو پیغمبروں کا ہے، اس سے اندازہ کر کہ عام خلقت کا کیا حال ہوگا۔ بادشاہ اور حکمرانوں کا کام نہایت مشکل ہے کیونکہ ہر شخص سے اس کے اپنے حال کی نسبت دریافت کریں گے۔ مگر عاکم سے رعایا کے متعلق پرسش ہوگی۔ اگر عفو اور مغفرت

کی توقع رکھتا ہے تو دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بندوں سے عدل اور احسان کر۔ رعایا یہ  
 بوڑھوں کے ساتھ تو بیٹے کی طرح رہ۔ جوانوں کے ساتھ بھائیوں کی طرح۔ اور ڑکھوں  
 کے ساتھ باپ کی طرح۔ مظلوموں کا مددگار، ظالموں کی بیخ کنی کرنے والا، بد معاشوں  
 تنبیہ کرنے والا۔ توبہ کرنے والوں کے لئے ناصح، تابعداروں کا مددگار، بات میں سچا، ع  
 میں پکا، نعمت کی حالت میں شاکر، محنت میں صابر، عمل میں غلصہ، ترقی میں متواضع او  
 خوبصورتی کی حالت میں پارسا ہو۔

اے عزیز! بادشاہ اللہ تعالیٰ کا وکیل، امین اور خزینہ ہوتا ہے تجھے چاہیئے  
 حرص، نفس پرستی اور شیطان کے مکر میں آکر اللہ تعالیٰ کے خزانہ میں تصرف نہ کر۔  
 اور حق دار کو حق پہنچائے تاکہ قیامت کی فضیلت اور عذاب سے بچا رہے۔

اے عزیز! تجھے چاہیئے کہ مسلمانوں کے مال کو اپنے نفس کے لئے خرچ نہ کر۔  
 اور جو امر کہ تجھ پر واجب کیا گیا ہے دوسرے کے حوالے نہ کرے۔ حکومت کی حالت پر  
 ضعیفوں کا رفیق ہے۔ نرمی سے بات کرے اور رعایا کو امر معروف کرے۔ امور دین کا  
 مستعدی سے جاری کرے۔ اگر کوئی شخص عبادت سے گریز کرے اس کے ساتھ سختی کرتا کہ  
 فاجروں کو عبرت اور ہدایت ہو۔ اطاعت حق کو نفس پرستی سے نہ۔ جب تجھ سے کوئی  
 قول یا فعل خلاف حق صادر ہو تو بہت جلد اس کے برابر اطاعت و احسان کر تا کہ  
 اس بُرائی کی تلافی مافات ہو جائے۔ اور کوشش کر کہ ہر روز کوئی ایسا عمل یا عبادت تجھ سے  
 جس کی حق تعالیٰ کے سوا کسی کو خبر نہ ہو۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بہت بڑا وسیلہ ہے۔ ذکر خفی جتنا ہم  
 سکے کر کیونکہ یہ وسیلہ کو مضبوط کرتا ہے۔ جب کسی کو کاخیر کے لئے کہے تو اڈل خود اس پر عمل کر۔

اے عزیز! حرام مال نہ کھا۔ حرام فعل نہ کر، ضعیفوں کو محروم نہ کر، اس طرح کرنے سے تو  
 درحقیقت اپنے آپ کو محروم کرتا ہے۔ اچھی طرح سے جان لے کہ ہر مراد کے بعد ناہرادی ہے  
 ہر فراخی کے بعد تنگی اور ہر آرام کے بعد محنت۔ پس اگر تیرے پاس نعمت تریا دہ ہے تو فضول خرچ  
 مت کر اور ضرورت کے مطابق خرچ کر، اور نعمت کے وقت مغلس اور مصیبت زدہ کے  
 مال کی طرف دیکھ۔ فراخی کے وقت محتاجوں کی مدد کر کیونکہ یہ اس کی جزا اور بدلہ ہو گا۔

اے عزیز! اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہر شخص کی بزرگی اس کے تقویٰ کے مطابق ہے۔ پس اگر کسی میں تقویٰ زیادہ ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ بزرگ ہے۔

اے عزیز! اگر تیری ولایت میں ایک بھی بھوکا تنگیا ظلم رسیدہ ہو اور تجھے اس کے حال کی خبر ہو پھر تو اس کی تلاش نہ کرے تو اہل تقویٰ کا مرتبہ تجھے نصیب نہیں ہوگا۔

اے عزیز! جس طرح سے مال آنا ہے چلا جاتا ہے۔ اگر حرام طریقہ سے آتا ہے تو حرام طریقہ سے ہی نکل جاتا ہے اور ایسے کام میں خرچ ہوتا ہے جو دنیا میں بدنامی اور قیامت کی گرفتاری کا سبب ہوتا ہے۔ اے عزیز! اگر کسی کے ساتھ شفقت اور نیکی کرے تو دوسرے کے ساتھ بے مروتی اور بدی نہ کرے کیونکہ بے مروتی اور بدی کا ذکرنا شفقت اور نیکی کرنے سے بہتر ہے۔

اے عزیز! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس کسی کو جنت کے لئے پیدا کیا گیا اس کے دل کو رحمت کا محل بھی بنایا گیا۔ اور جنت کے حاصل کرنے کے اسباب اس پر آسان کر دیئے۔ حق تعالیٰ کی عبادت کو اس کے دل میں شیریں کر دیا۔ اور جس کسی کو دوزخ کے لئے پیدا کیا گیا اُس کے دل کو رحمت کی سعادت سے محروم کر دیا گیا اور عبادت کے اسباب اس پر دشوار کر دیئے گناہ اس کے دل میں شیریں کر دیا۔ انصاف کی رُو سے اپنے دل میں سوچ کہ اپنے میں تو کیا پاتا ہے۔ اگر نیکی ہے تو فہماور نہ علاج میں مشغول ہو۔

اے عزیز! ہر حالت میں شاکر رہ، کیونکہ شکر راحت اور نعمت کی زیادتی کا موجب ہے اگر شاکر نہیں رہ سکتا تو جو کچھ پیش آئے اُس پر راضی رہ، کیونکہ خدا تعالیٰ کی رضا جمعیت اور فراغت کا موجب ہے۔ اگر راضی نہیں رہ سکتا تو جو کچھ پیش آئے تو اس پر صابر رہ۔ کیونکہ صبر کشائش کا موجب ہے اور اس مقام کے نیچے سوائے اہل دوزخ کے مقام کے کچھ نہیں۔

اعاذنا اللہ من العذابہ وخلصنا من شرور النفس و مکائد الشیطن و اخرجنا من تیبہ الحیرۃ و ظلمات الغفلۃ برحمۃ اللہ قریب مجیب۔

اللہ تعالیٰ اپنے عذاب کے الم سے بچائے، اور نفس اور شیطان کے لوہے کے شر سے غلامی سے اور حیرت اور غفلت کی ظلمت سے نکالے، بے شک وہ قریب ہے اور دعا کے قبول کرنے والا ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ اَتَّبَعَ الْهُدٰی ط

# سیالکوٹی عبقریت کا ایک نادر شاہکار الدرة الثمينة

شبیر احمد خاں غوری۔ علی گڑھ

سیالکوٹ کی خاکِ مردم خیز سے دو عبقری روزگار پیدا ہوئے۔ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی اور علامہ محمد اقبال۔ مؤخر الذکر پر بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر اول الذکر پر بہت کچھ لکھا باقی ہے، بالخصوص ان کے رسالہ ”الدرة الثمينة“ پر جو اسلام کی تفکیری سرگرمیوں میں نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ اس ضمن میں مندرجہ ذیل امور قابل غور ہیں۔

الف۔ ”الدرة الثمينة“ کو اسلامی علمِ کلام کی تاریخ میں واسطۃ العقد کی حیثیت حاصل ہے۔

---

۱۔ علامہ عبدالحکیم نے خود اس رسالہ کا کوئی نام تجویز نہیں کیا۔ انہوں نے اسے ایک عنوانِ مقالہ کی شکل میں بڑی عجلت سے مرتب کیا تھا۔ مزید تفصیل آگے آرہی ہے۔  
۲۔ اس کی تفصیل ”علمِ کلام کی تاریخ میں الدرة الثمينة کا مقام“ میں آرہی ہے۔

ب۔ یہ اسلامی ہندوستانی عبقریت کا عظیم کارنامہ اور فتاوائے تاتارخانیہ ہے  
حجۃ اللہ الباقیہ کے ہم مرتبہ ہے۔ لیکن فرنگ زدگی اور یورپ سے مرعوبیت کی وجہ  
جو احساس کمتری ہم پر طاری ہے اور جس کے نتیجے میں ہم اپنے اسلاف کے علمی  
موصوعی و حکمی کارناموں کے ساتھ غفلت و بے اعتنائی برتتے رہے ہیں، اُس کی  
”الہیات اعلیٰ“ کا یہ قابلِ فخر شاہکار عرصہ سے گوشہٴ معمول کی نذر ہو گیا ہے، یہاں  
اک بڑے بڑے فضلا بھی اس سے واقف نہیں ہیں۔

ج۔ اس سے ہندوستان اور ایران کے درمیان علمی و حکمی روابط کا صحیح اندازہ  
مکتا ہے۔

عہد فیروز شاہی (۷۵۲ھ - ۷۹۹ھ) کے مشہور فاضل و علم دوست امیر تاتارخاں کے  
رے مولانا عالم بن علار اندرپتی نے یہ مجموعہ فتاویٰ مرتب کیا تھا چنانچہ شمس سراج  
نے اپنی ”تاریخ فیروز شاہی“ میں لکھا ہے :-

”وہم چینی خان اعظم (تاتارخاں) طالبِ دین یک فتاویٰ راست کنایندہ۔ وَاں  
نوع بود کہ جملہ نسخ فتاوائے شہرِ دہلی بر خویش جمع کرد۔ در ہر مسئلہ و در ہر کلمہ کلاخلاف  
ب مفتی است در فتاوائے خود نوشتہ و آزا فتاوائے تاتارخانی نام داشتہ۔ و اختلاف  
ب مفتی حوالہ بصاحب اُن فتاویٰ کردہ۔ ایں چینی فتاویٰ موازنہ سی جلد مرتب شدہ“  
تاریخ فیروز شاہی از شمس سراج عقیف صفحہ ۳۹۱۔

اسی طرۃً حاجی خلیفہ چلیپی نے ”کشف الظنون“ (جلد اول صفحہ ۱۱) میں لکھا ہے :-  
”تاتارخانیہ فی الفتاویٰ :- للامام الفقیہ عالم بن علار الحنفی و ہو کتاب عظیم فی مجلدات  
فی مسائل المحیط البرہانی و الذخیرہ و الخانیہ و الظہیریہ“

”حجۃ اللہ الباقیہ“ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی مشہور تصنیف ہے جو اپنی شہرت کی  
بسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔

## (الف) علم کلام کی تاریخ میں الدرۃ الثمینہ کا مقام

اصطلاحی علم کلام کا آغاز اسلامی تعلیمات کو عقلی توجیہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کے ساتھ ہوا اور چونکہ اس کوشش کے علمبردار بالعموم مسئلہ ”کلام باری“ میں انہماک رکھتے تھے، اس لئے یہ کاوش ذہنی اسی اصطلاح سے موسوم ہوئی۔

تفصیلات میں گئے بغیر اتنا سمجھ لینا چاہیے کہ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں اس (علم کلام) کے خصوصی نمایندے ”معتزلہ“ (معتزلہ ثالثہ) تھے جن کا سید الطائفہ و اصل نظام الغزال تھا۔ واصل کا شاگرد عثمان بن خالد الطویل اور مؤرخ الذکر کا شاگرد ابوالندیل خلاف تھا جو معتزلی فکر کے اندر نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ ابوالندیل الخلاف کا شاگرد ابویوسف بن عبد اللہ بن اسحاق الشحام تھا اور اُس کا شاگرد ابوعلی الجبائی۔

معتزلہ کا آغاز راسخ العقیدہ مسلمانوں سے اعتقادی مسائل کے باب میں اختلاف کی بنا پر ہوا مگر مسلمانوں میں یونانی فلسفہ کے داخل ہونے پر جب اسلامی تعلیمات سے اس کا تضاد آشکارا ہوا تو طبقہ متکلمین ہی نے اس سیلاب کا مقابلہ کیا اور اس طرح وہ نظام فکر ظہور میں آیا۔ کلام بالمعنی الانحص (بمقابلہ فلسفہ) کہلاتا ہے اور جس نے خصوصیت سے فلسفہ کو اپنی تنقید و ردید کا موضوع بنالیا تھا۔

ابوعلی الجبائی کے شاگرد امام ابوالحسن اشعری تھے جو پہلے استاد کی طرح معتزلی مگر بعد میں بتوفیق ایزدی اعتزال سے تائب ہو کر اہل سنت والجماعت میں آئے تھے۔ اسے پہلے علم کلام سنی حلقوں میں بنظر ناپسندیدگی دیکھا جاتا تھا۔ مگر امام اشعری کے سنی بنانے کے بعد یہ بات ختم ہو گئی اور اس طرح ایک حیثیت سے ”سنی علم کلام“ کا آغاز اشعری سے ہوا۔

امام اشعری اپنے ہمراہ اپنے سابق اساتذہ کی اُن کاوشوں کو بھی لائے جو انہیں یونانی فلسفہ اور دیگر ملل و نحل کی تعلیمات کی تنقید و تردید کے سلسلے میں کی تھیں۔ امام اشعری کے شاگردوں میں استاذ ابوالقاسم اسفرائینی مشہور تھے۔ اُن سے



امام الحرمین نے پڑھا اور اُن سے امام غزالی نے۔ امام غزالی کی ”تہافت الفلاسفہ“ یونانی فلسفہ کی تنقید میں ایک بے مثل تصنیف ہے اور اسلام کے کلامی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

”تہافت الفلاسفہ“ کی ترتیب و تصنیف دو اصولوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ یونانی فلسفہ کی تنقید و تردید کے لئے امام غزالی نے ارسطو اور ارسطو کے فلسفہ کو سمجھنے کے لئے اُس کی اُن تعبیرات و توجیہات کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا جو ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا سے ماخوذ ہیں۔

۲۔ انہوں نے فلسفہ کے ان بیس مسئلوں کو اس تردید و تنقید کے لئے منتخب کیا جو اسلامی تعلیمات سے عموماً اور اہل سنت و الجماعت کے مسلک سے خصوصاً متصادم ہیں۔ لہذا ان مسائل بستگانہ کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے :-

(۱) وہ مسائل جن کا اسلامی فرقوں میں سے کوئی نہ کوئی فرقہ قائل ہے۔ ایسے مسائل کے قائل کی تکفیر نہیں کی جاسکتی، اُسے صرف بدعتی کہا جاسکتا ہے۔

(۲) وہ مسائل جن کا مسلمان فرقوں میں کوئی قائل نہیں ہے کیونکہ وہ اسلام کی بنیادی

تعلیمات کے قطعاً منافی اور ”کفر بواح“ کا مصداق ہیں۔

یہ تین مسئلے حسب ذیل ہیں :-

الف۔ قدم عالم۔

ب۔ نفی حشر اجساد، اور

ج۔ انکار علم باری تعالیٰ بجزئیات متغیرہ۔

گویا امام غزالی نے ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا کی براہِ راست تو نہیں البتہ ان مسائل شلثہ کے قائل ہونے کی بنا پر بالواسطہ تکفیر کی ہے۔

(اس امر کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کیونکہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کے ”الدرۃ الثمینہ“

کی اہمیت کو سمجھنے کے واسطے یہ بنیادی نکتہ کی حیثیت رکھتا ہے)۔

”تہافت الفلاسفہ“ نے فلاسفہ کے کیمپ میں کھابلی ڈال دی مگر کسی فلسفی کو اس کا

جواب دینے اور فلسفہ کی پوزیشن صاف کرنے کی جرات نہیں ہوئی، تا آنکہ اگلی صدی کے اندر دور مغرب میں ابن رشد اندلسی نے امام غزالی کے ”تہافت الفلاسفہ“ کا جواب ”تہافت التہافت“ کے عنوان سے مرتب کیا۔ اور اس طرح حکماء و متکلمین کی نزاع کے ایک نئے باب کا افتتاح ہوا۔

یہ صورت حال تقریباً تین صدیوں تک جابی رہی۔ اس عرصے میں بڑے بڑے حکماء اور متکلمین پیدا ہوئے۔ حکماء میں ابوالبرکات بغدادی، شہاب الدین مقبول، نجم الدین نجاشی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی، نجم الدین کاتبی قزوینی، اشیر الدین ابہری وغیرہم اور متکلمین میں امام رازی، قاضی ناصر الدین بیضاوی، ابوالشامہ محمود اصفہانی، قاضی عضد الدین الدیرجی، علامہ سعد الدین تفتازانی وغیرہم، جن کی تنقید اور باز تنقید سے فلسفہ و کلام کی ثروت میں ہمیش بہا اضافے ہوتے رہے مگر مسائل زیر بحث کا خاتمہ نہیں ہوا۔

آخر کار اس نزاع کا خاتمہ روم کے اندر سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ کی علم دوستی نے کیا۔ اُس نے فضلاء دربار کو حکم دیا کہ امام غزالی کے ”تہافت الفلاسفہ“ اور ابن رشد کے ”تہافت التہافت“ کے درمیان محاکمہ کریں۔ دربار میں بڑے بڑے علیل القدر عالم تھے، مگر اس کڑی کمان کے زہ کرنے کی جسارت صرف دو ہی فاضلوں نے کی، مولیٰ علاء الدین طوسی نے ”کتاب الذخیرہ“ میں اور مولیٰ خواجہ زادہ نے اپنی ”تہافت الفلاسفہ“ میں۔ سلطان نے دونوں کو نواز شہائے شاہانہ سے نوازا اور گرانقدر انعامات دیئے۔

اس طرح تین سو سال پرانی اس علمی و فکری نزاع کا خاتمہ ہوا۔ مگر جب دسویں صدی کے آغاز میں صفویوں نے قبیح سلطنت قائم کی تو ملک میں ”احیائیت پسندی“ اور ”پاستان پرستی“ کی تحریکیں بھی وجود میں آئیں اور عظمت ماضی کے جذبے نے قدیم مفکرین اور ان کے افکار کے ساتھ والہانہ عقیدت و وابستگی کو جنم دیا۔ لہذا مذکورہ الصدر مسائل ثلاثہ کی بنا پر امام غزالی نے ابونصر فارابی اور شیخ بوعلی سینا کی جو تکفیر کی تھی اس کا اذ سر نو جائزہ لیا گیا اور حکمائے مابعد نے ان دونوں کے مواقف

کی جو توجیہات کی تھیں، ان کو خصوصیت سے موضوع مطالعہ بنایا گیا اور اسی ”حکمانی تہ“ میں تبصرہ و تمہید کو مدعیان علم و فضل کا معیار کمال قرار دیا۔

ادھر دسویں صدی کے آغاز سے ہندوستان میں بھی ”معقولات“ (فلسفہ و کلام) کا رواج بڑھنے لگا۔ بعد میں اور عوامل نے بھی اس کی ترقی میں حصہ لیا اور آخر میں تو نصاب لہ بایونی نے لکھا ہے: ”در زمان سکندر (۸۹۴-۹۲۴ھ) شیخ عبداللہ طنبی... و شیخ عزیز اللہ... ہندستان آمدہ علم معقول را در اں دیار رواج دادند“۔  
لے یہ عوامل حسب ذیل تھے:-

- ۱۔ بابر نے جب ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد ڈالی تو اس کے ساتھ خراسان و ماوراء النہر کے بہت سے علماء بھی آئے۔ یہ لوگ عموماً معقولات میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔
- ۲۔ محقق دوانی جو اس عہد کے عظیم ترین مفکر اور فلسفی تھے ان کے بعض تلامذہ گجرات اور ہندوستان میں آئے چنانچہ عطیبہ ابو الفضل تبریزی، سعید ابو الفضل استرآبادی اور ملا عماد گجرات میں اور خواجہ جمال الدین محمود اور میر سید رفیع الدین صفوی (ہندوستان میں آئے۔ ان کے فہم گرم کی تاثیر سے یہاں معقولات کو خصوصیت سے ترقی ہوئی۔
- ۳۔ دسویں صدی کے آخر میں ایران کی محمدانہ تحریکیں ہندوستان میں داخل ہونے لگیں چنانچہ بایا نے سلطان محمد غیاثیہ کی اصلاحی کوششوں کے بعد لکھا ہے: ”اما اتحاد ازاں بلاد سرایت یابں ولایت کرد“ اور ان محمدانہ تحریکوں کی بنیاد اکثر مالات میں فلسفہ پر قائم تھی۔
- ۴۔ اسی زمانہ میں اکبر نے اسلام کی ضد میں دین الہی جاری کیا جس کی اساس فلسفہ پر تھی چنانچہ بقول بایونی اُس نے حکم دیا: ”الہیین از علوم غیر نجوم و حساب و طب و فلسفہ خوانند و عمر گرانی صرف آنچه معقول نیست صرف نکند“
- ۵۔ آخر میں امیر فتح اللہ شیرازی اکبر کی طلب پزدکن سے ہندوستان آئے اور ان کے آنے سے یہاں حکمت و معقولات کا رواج اور بھی زیادہ ہو گیا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے: ”تصانیف علمائے متاخرین ولایت... میر بہندوستان آورد۔ و در حلقہ درس انداخت... و ازاں عہد معقولات را رواج دیگر پیدا شد“

معقولات ہی معقولات چھا کر رہ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طالب علم خود کو ارسطو کے  
زماں سمجھنے لگا اور اپنے علم و فضل کے دعوے کو قوتِ بحث و مباحثہ کے ذریعہ ثابت  
کرنے لگا۔

یہ صورت حال تھی کہ ۱۵۶ھ میں شاہجہاں نے تاجدارِ ایران (شاہ عباس ثانی)  
کے ساتھ سیاسی و ثقافتی تعلقات کی تجدید کے لئے جان شاراغاں کو سفیر بنا کر بھیجا۔  
سفارت خانہ کے علمے میں دو شخص محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس بھی تھے،  
جنہیں اپنی معقولات دانی اور قوتِ بحث و حاضر جوابی پر ناز تھا۔ یہ لوگ کسی طرح  
وزیرِ اعظم ایران تک پہنچ گئے اور اظہارِ فضل و کمال کے لئے اُسے بھی مناظرہ کا چیلنج  
دے بیٹھے۔ وزیرِ اعظم (خلیفہ سلطان) نے جو علم علمائے عراق تھے، براہِ راست تو  
ان کے منہ آنا پسند نہیں کیا، صرف بر سبیلِ امتحان اتنا کہا :-

”امام غوالی... تکفیر ابو نصر فارابی و شیخ ابو علی سینا نمودہ و جمع

تاویل کلام حکماء کردہ اند۔ ایں مراتب را تقریر باید کرد۔“

لیکن ہندوستانی فضلاء کا علم محض بحثی تک محدود تھا، لہذا انہیں منہ کی  
کھانا پڑی، بقول سعد اللہ خاں علامی :-

”مدعیان دروغ بچوں شمع کشتہ بے فروغ ماندند باز مسلک

معقولیت دور افتادند“

(مسلک)

۱۔ بادشاہ نامہ عبدالحمید جلد دوم ص ۴۹۳۔

۲۔ تذکرہ باغستان لایم الدین الریاضی ورق ۶۸۴ الف۔ مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی۔

# شہر گلستان - شیراز

عقل سلجوق - لیکچر تاریخ اسلام اردو کالج کراچی

شیراز ایران کا بڑا حسین اور نہایت دل فریب شہر ہے ، اس شہر کی روح پرور آب و ہوا ، عطر بیز فضا ، یہاں کے باشندوں کی شگفتہ مزاجی اور عشوہ طراز حسیناوی کے تیکھے نقوش اس شہر کو بے مثال حسن اور تابندگی بخشتے ہیں۔ شیراز ایرانی تاریخ کے ہر دور میں ایک شاندار شہر رہا ہے۔ اور ہر دور کے شعراء اس دلکش شہر کی مدح سرائی میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ہر سیاح اس شہر گلستان کو جنت شادیں سمجھتا ہے اور ہر نوجوان اس شہر کی رعنائیوں میں کھو کر اپنے وطن عزیز کی یادیں فراموش کر دیتا ہے۔

شیراز قدیم ایرانی شہر 'اصطخر' کا ہم عصر رہا ہے۔ شکارگو یونیورسٹی کے پروفیسر کیمروں نے اصطخر کے کھنڈرات کی کھدائی میں ایسے کتبے برآمد کئے ہیں جن پر شیراز کا نام "شیراز اکش" کی شکل میں کندہ پایا گیا ہے۔ جن کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اصطخر کی تعمیر کے لئے شیراز سے معمار اور مزدور لائے گئے تھے۔ اور ان معماروں کو چاندی کے سکہ اجرت میں دیئے گئے تھے۔ یہ واقعہ ۲۵۰۰ ق م کا ہے۔

شیخ سعدیؒ کے مقبرے کے قریب ایک پہاڑی کے دامن میں دو نہایت قدیم

کنزئیں موجود ہیں جو اپنی وضع اور انداز کے اعتبار سے اصغر کے کنوئیں سے بہت ثلث رکھتے ہیں ان شہادتوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیراز اصغر کا ہم عصر ہے اور زمانہ قدیم ہی سے ایک اہم شہر یا ایک بڑی فوجی چھاؤنی ضرور رہا ہے۔ ساسانیوں کے عہد میں شیراز نے اپنا وقار برقرار رکھا۔ بادشاہ اردشیر ساسانی نے اپنا پرشکوہ دربار اسی شہر میں منعقد کیا تھا۔

امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ شیراز کی شہرت پر دینر پورے پڑتے گئے اور زمانہ قدیم کا یہ وضع دار شہر وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دیرالحواس تبدیل ہو کر رہ گیا۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مبارک عہد خلافت میں مجاہدین نے فاس پر پیش قدمی کر کے اصغر کا محاصرو کر لیا تو انہوں نے اس شہر کے کھنڈرات کے قریب اپنا پڑاؤ ڈالا تھا۔ بزاویہ کے عہد میں شیراز کی جانب توجہ دی گئی۔ چنانچہ محمد بن قاسم بن حقیل نے جو کہ مشہور اسی گورنر حاج بن یوسف کے داماد اور علم زاد بھائی تھے، موجودہ شہر کی بنیاد رکھی۔ واقعہ ۳۳۳ مطابق ۶۵۴ء کا ہے۔ شیراز کے مختار ہونے اور ترقی کرنے کا سب سے بڑا سبب 'المقدس' کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ یہ شہر صوبہ فارس کا مرکزی مقام تھا۔ فرض کیا جاتا تھا کہ شیراز تمام اسلامی سرحدوں کی اصوات اربعہ میں سے ہر سمت کے لحاظ سے ساٹھ فرسخ اور صوبہ کے چاروں گوشوں میں سے ہر ایک گوشے سے اسی فرسخ کے فاصلے پر واقع تھا۔

جب بنو عباس کا عہد شروع ہوا اور ایرانی اور مادراء النہر میں خاندانی حکومتیں قائم ہوئیں تو شیراز کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ اس لیے کہ مختلف ایرانی خاندانوں نے اس شہر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ چنانچہ اردشیر قرہ ساسانی کے بعد سب سے پہلے 'صفاریہ'

۱۔ روضۃ القفار۔ جلد ۱۲ ص ۱۲۸

۲۔ جغرافیہ خلافت مشرقی۔ ل۔ اسٹریک ص ۲۴۹

۳۔ جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۲۴۹

خانہ ان کے جلیل القدر فرماں روا عمرو بن لیث صفاری نے اس شہر کو اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ عمرو بن لیث صفاری نے شیراز میں بہت سی عظیم عمارتیں تعمیر کروائیں۔ ان میں سب سے مشہور 'مسجد متین' ہے، یہ واقعہ ۱۸۲ھ کا ہے۔

صفاریوں کے بعد دہلیویوں نے اس شہر کی طرف توجہ کی اور اسے اپنا دارالسلطنت بنایا دسویں صدی عیسوی میں اس شہر نے بہت ترقی کر لی تھی۔ اس وقت اس کا طول ایک سو سے لے کر دو سو تک ایک فرسخ تھا۔ اور اس میں آٹھ دروازے تھے۔ دہلیویوں ہی نے اس میں ایک شفاخانہ اور ایک کتب خانہ قائم کیا تھا اور پینے کے پانی کی ایک نہر جاری کی تھی۔

دہلیویوں کے عہد میں شیراز کے گرد مضبوط فصیل تعمیر کی گئی تھی۔ چنانچہ مصعصام الدولہ 'یا' سلطان الدولہ نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس کے بعد خاندان طغریہ کے حریف محمود شاہ 'انجو' نے اس فصیل کی مرمت کرائی تھی۔ لے

شیراز کو عروج اس وقت ہوا جب 'امیر ابو کلجبر' نے اصطخر کو ویران کر دیا اور وہاں کے باشندوں کو شیراز لاکر آباد کیا اور وہاں کی قیمتی عمارتی کٹڑی اور ساز و سامان کو شیراز کی تزیین اور آرائش کے لئے اُٹھا لیا۔ اصطخر تاریخ کے قدیم دور سے اب تک شیراز کا زیارت حریف رہا تھا مگر اب شیراز بھی بڑی فائز کا وہ شہر تھا جو سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا تھا۔

دہلیویوں کے بعد تائبک خاندان نے ۱۱۷۷ھ سے لے کر ۱۲۸۶ھ تک شیراز پر حکومت کی۔ اتابکوں کے عہد ہی میں گلستان شیراز کے 'بلبل' شیخ سعدیؒ نے ادبیات ایران میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔

یہ شہر کچھ ایسا دلکش اور جاذب توجہ تھا کہ ۱۲۵۸ھ میں وحشی منگولوں نے اس کے حُسن پر دست درازی کی کوشش نہیں کی جب کہ اور اسلامی شہروں میں

مینار بناتے تھے۔ اور تادوردنگار یادگاروں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اہل شیراز اس وقت بھی حوادثِ زمانہ سے محفوظ پرسکون زندگی بسر کر رہے تھے۔

منگولوں کے طوفان کے بعد قابکوں کو بھی زوال آگیا۔ ان کے زوال کے ساتھ ہی خاندانِ آمل مظفر کا اقبال شروع ہوا اور شیراز پر نئی بہار آگئی مگر یہ بہار بہت جلد خزاں کے تند و تیز جھونکوں میں تبدیل ہو گئی اور تیمور لنگ اپنے جلو میں تباہی و بربادی کے سمان لئے شیراز کے دروازوں تک پہنچا۔ 'شاہ منصور' نے تیموری افواج کا جھکڑ مٹا دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک رات شب جوں مار کر شاہ منصور تیمور کے پیچھے تک پہنچ گیا قسمت یاد رہی نہ تھی ایک منگول کے ہاتھوں منصور مارا گیا۔ تیمور نے شاہ منصور کی جرات کا بدلہ خاندانِ مظفر کے باقی ماندہ افراد سے لیا اور چینی کر انہیں قتل کر دیا فتح باب ہونے کے بعد تیمور نے 'باب سلم' اور 'باب سعادت' کے درمیان تختِ قراچہ باز میں قیام کیا۔ یہ دروازے 'یزد' کو جانے والی شاہراہ کی جانب کھلتے ہیں۔ اس موقع پر بھی شیراز کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

آمل مظفر کے زوال کے بعد صفوی خاندان نے ایرانی حکومت کی باگ ڈور سنبھالی ان کے عہد میں بھی شیراز پھٹنا پھوٹتا رہا مگر حکمران خاندان کی توجہ زیادہ تر 'اصفہان' کی جانب رہی اسی لئے شیراز کی اب وہ پہلی سی خصوصیت قائم نہ رہ سکی۔ مگر شیراز کے پر بہار تاختاؤں اور دلپذیر آب و ہوا سے کون آنکلیں پڑا سکتا ہے۔ لہذا جیسے ہی صفوی خاندان کا زوال ہوا اس شہر کے زبردست پرستار کریم خان زند نے زند خاندان یا وکیل خاندان کی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اب شیراز ترقی کی نئی راہ پر گامزن ہو گیا۔ اس خاندان کے حکمران بڑے خلوص سے حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ کریم خان زند نے جوہرِ محاط سے ایک جلیل القدر سلطان تھا انصاری کے طور پر اپنا لقب 'وکلی الرمایا' رکھا اس



انتساب کی وجہ سے اس خاندان کو 'دکیل' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

کریم خان زندہ نے شیراز میں اپنے گھر سے ارد نہ ٹٹنے والے اثرات چھوڑے ہیں۔ مگر اسے زیادہ عرصہ اطمینان حاصل نہ ہو سکا۔ قبیلہ قاجاریہ کے سردار آغا محمد نے آخر کار اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس طرح دکیلی خاندان کا عہد ختم ہو گیا۔

قاجاریوں کے عہد سے شیراز کا سیاسی زوال شروع ہو گیا اور رفتہ رفتہ تہران نے شیراز کی جگہ لے لی۔ مگر شیراز کی فطری رفائیاں برابر قائم رہیں۔ آج بھی اس کے باغات میں کثرت سے پھول کھلتے اور فوارے اُبلتے ہیں۔ نرم پھولوں سے لدی شاخوں پر ٹیلیں چھپاتی ہیں۔ آج بھی یہاں چشم غزال اور لبِ لعل شکر پارہ کی فروانی ہے۔ باوجود اپنا سیکا وقار کھو دینے کے شیراز اب بھی ایک مثالی حسین شہر ہے۔

شیراز اپنی پاکیزہ آب و ہوا کی بنا پر بہت مشہور ہے، مسلم جغرافیہ دانوں نے اسے اقلیم معتدل کے شہروں میں سے شمار کیا ہے۔ 'یا قوت موی' نے شیراز کے باغوں کی بہت تعریف کی ہے۔ آب و ہوا کی لطافت کی بنا پر شیراز بہت ہی سرسبز و شاداب ہے۔ بلی کثرت سے گلاب چنبیلی نرگس سوسن اور نسترن کے پھول کھلتے ہیں۔ موسم بہار میں یہاں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ہر طرف رنگ بکیر دیئے ہیں۔ لالہ کی کھیریں میں جیسے رنگ لگی ہوئی ہو۔ شاید شیراز کی آب و ہوا کی یہی سرسستی اور یہاں کے مناظر کی یہی خوش بلی ہے کہ دنیائے زیر دست شاعر فطرتِ حافظ 'یہاں پیدا ہوئے۔ حافظ شیرازی کی لیاات کے نعماتی تاثر کو شیراز کے جمالیاتی پہلو سے خاص تعلق رہا ہے۔ یقینی طور پر حافظ شیراز کے پڑ بھار مرزاؤں سے ہی اپنا شعری تاثر حاصل کیا ہے۔ ان کے اشعار میں رت کے جو مضامین اور بزمِ نئے و فروش کے جو تصورات ملتے ہیں وہ ان کے فطری ماحول کا غریب عکس ہیں یہ

شیراز کی آب و ہوا نے وہاں کے باشندوں کے رنگ روپ اور خط و حال پر گہرے اثرات

ڈالے ہیں۔ شیراز کی عشوہ طراز حسیناؤں ہی نے فارسی ادب میں معشوق کے سوتیلی بھ  
تصویراتی خط و خال کی ترجمانی کی ہے۔

شیراز میں میوؤں کی بھی بڑی فراوانی تھی اور اب بھی ہے۔ بالخصوص نارنج، لیموں  
انگور اور سیب شیراز میں بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ شیراز کے سیب کے بارے میں،  
یا قوت حموی نے بڑی عجیب بات یہ لکھی ہے کہ یہاں کے درختوں پر ایک جانب تو بڑے  
میٹھے سیب لگتے ہیں اور انہیں درختوں کی دوسری جانب انتہائی کھٹے۔

شیراز کے باغ بڑے خوبصورت اور خوشنما ہیں یہاں منگولوں نے بہت سے باغات  
لگائے تھے۔ یہاں کا مشہور باغ "باغ تخت" اس دور کی یادگار ہے۔ اس باغ کو  
ہلاکو خان کے بیٹے منگو خان کی بیوی نے لگوایا تھا۔ یہ باغ آج تک موجود ہے۔ 'باغ  
تخت' کے سوا 'باغ ارم'، 'باغ دلکشا' اور خلیلی باغات بھی بہت مشہور ہیں۔

ان باغات میں تین مختلف قسم کے پھول کھلتے ہیں۔ مگر سب سے خوبصورت پھول  
ایرانی گلاب ہے، جو ان باغوں کا جزو لاینفک ہے۔ گلاب کو فارسی ادبیات میں بڑا  
رومانی مقام حاصل ہے۔

شیراز کے ہی گلستانوں کے امتیازی حسن نے کئی سلاطین اور امراء کو متاثر کیا ہے  
ایران کے کئی شہروں میں انہی شیرازی باغوں کی نقل اتاری گئی ہے۔

تیورنگ نے جب اپنے پایہ تخت سمرقند کی تزئین و آرائش کرنی چاہی تو اس  
نے شیراز کے باغات سے متاثر ہو کر اس کے نمونے پر یہاں پر بھی باغات لگوائے۔ نہ  
صرف ان باغات کی روشنیوں اور کیاریوں کے انداز کو اپنایا گیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ شیراز کے  
باغات کے ناموں کو بھی یہاں استعمال کیا گیا۔ چنانچہ سمرقند اور شیراز دونوں شہروں میں  
'باغ تخت'، 'باغ ارم'، 'دلکشا' باغ وغیرہ کی موجودگی تاریخی شواہد سے ثابت ہے۔

شیراز نہروں کا شہر ہے اس شہر میں پانچ نہریں بہتی تھیں۔ یہ نہریں شہر کی

خوبصورتی اور آب و ہوا کی خوبی کی بڑی حد تک ذمہ دار تھیں۔ یہاں کی برتری اور شاندار اور پھر ہمارا باغات کے دلفریب مناظر اپنی آجودوں کے رہیہ منت تھے۔ ان نہروں کے کنارے کثرت سے خوشنما پھول اُگتے اور یہاں طریقہ مغلیں منعقد ہوتی ہیں۔

اہل شیراز کی صحت و تندرستی میں بھی ان نہروں کا بڑا حصہ تھا۔ یا قوت حموی کا بیان ہے کہ ان نہروں کا پانی 'جوہم' سے آتا تھا۔ ان نہروں میں سب سے بڑی اور خوشنما نہر 'رکن آباد' تھی۔ یہ نہر 'رکن الدولہ دلی' کے نام سے معنوں کی گئی تھی بلکہ اپنی طول و اس نہر کے بارے میں لکھتا ہے :

ایک نہر رکن آباد کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا پانی حد درجہ شیریں ہوتا ہے۔ گرمیوں گرم اور سرما میں سرد۔ اس نہر کا سرچشمہ ایک پہاڑ کے دامن میں ہے۔

'رکن آباد' اتنی خوش منظر نہر تھی کہ 'حافظ' یہاں کی زیرنگی اور دلکشی سے متاثر ہو کر پکار اُٹھے

بدہ ساقی نئے باقی کہ درجہت نواہی یافت

کنار آب رکن آباد و گلگشت معشوق را

شیراز میں بکثرت تاریخی عمارتیں موجود ہیں۔ ۱۷۷۷ء میں موجودہ شہر کی بنیاد لکھی گئی۔ چوتھی صدی ہجری میں یہ شہر بہت پھیل چکا تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس شہر میں آٹھ دروازے تھے۔

دلیلیوں ہی کے عہد میں شیراز کی آبادی اتنی گنجان ہو گئی کہ سلطان عضد الدولہ دلی کو اس شہر کے نواح میں نصف فرسخ کے فاصلے پر ایک نواحی بستی اپنے لشکریوں کے لئے بسائی پڑی۔ اس کے اطراف میں کثرت سے باغ لگوائے جو ایک فرسخ تک پھیلے

ہوئے تھے۔

رفتہ رفتہ شیراز ترقی کرتا گیا۔ یہاں تک کہ یہاں کے محلوں کی تعداد سترہ اور دروازوں کی تعداد گیارہ تک پہنچ گئی۔ مگر 'مستوفی' نے صرف نو دروازوں کے نام گنوائے ہیں۔

ان دروازوں کے علاوہ ایک دروازہ باب القرآن بھی تھا۔ یہ دروازہ ابھی تک موجود ہے۔ اور یہی وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہو کر ہم شیراز کا دلفریب نظارہ کر سکتے ہیں۔ باب القرآن کی تعمیر کا پس منظر بڑا دلچسپ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شیراز کی کشش و جاذبیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس شہر کو نظر بد سے بچانے کے لئے اس دروازے پر مصحف مقدس رکھا جاتا تھا یہ دروازہ آل بویہ کے دور حکومت میں تقریباً ایک ہزار برس پہلے تعمیر ہوا تھا مگر امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں شکستہ اور بوسیدہ ہو چکا تھا، شیراز کے ایک تاجر نے اسے حال ہی میں دوبارہ تعمیر کروایا ہے۔

شیراز کی تفصیل بڑی مضبوط تھی۔ اس کی تعمیر کا سہرا بھی آل بویہ کے سر ہے۔ فنونِ لطیفہ میں شیراز کا اپنا ایک الگ مکتبہ رہا ہے۔ شیرازی اسکول بتدریج کئی صدیوں تک ارتقائی منازل طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنا ایک مخصوص رنگ و مزاج حاصل کر لیا جو ایرانی فنونِ لطیفہ شیرازی مکتب کے نام سے موسوم کیا جانے لگا شیرازی مکتب کی بنیاد اس وقت پڑی جب کہ مشرقی ایران کے معمار اور صنعت جہنوں نے سلجوقیوں کے عہد میں فنونِ لطیفہ کے نادر نمونے تخلیق کئے تھے اور ہرات کے مکتب کی بنیاد رکھی تھی۔ ان میں سے ایک جماعت نے موصل کی راہ لی اور وہاں موصل کے مکتب کو پروان چڑھایا۔ اور دوسری جماعت نے شیراز کا رخ کیا، درحقیقت اسی وقت سے شیرازی مکتب کی باضابطہ ابتداء ہوئی۔ شیراز نے ابتداء ہی سے خاص ایرانی ثقافت اور مزاج کو اپنایا، اس لئے کہ کئی ایرانی خاندانوں نے یکے بعد دیگرے شیراز ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے تاریخی پس منظر کی وجہ سے شیرازی مکتب میں قدامت پسندی اور روایت پسندی کے میلانات صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ اہل

شیراز متقدمین کے نقش قدم سے انحراف پسند نہ کرتے تھے مگر اس کے برعکس ہرات والے جدت پسند تھے۔

شیرازی مکتب ایرانی اقدار کا حامل بلکہ پیش رو رہا ہے۔ مشہد کی بہت سی مساجد اور متبرک مقامات کے دلکش نقش و نگار ایک ایرانی معمار غیاث الدین ہی کے مرہون منت ہیں۔

شیرازی طرز اس قدر دلکش اور حسین ہے کہ تیمور لنگ نے مختلف اوقات میں اسے اپنا پایا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے دار السلطنت سمرقند کی تزئین و آرائش کے لئے شیرازی کاریگروں اور معماروں کو بلوایا تھا۔ تیمور لنگ کے پوتے ابراہیم کے عہد میں شیرازی بہت ہی خوبصورت ظروف، کتابوں کے زنگار، جروان اور مربع و مستور شاہنلے تیار کئے گئے تھے۔ ابراہیم خود بھی ایک ماہر خطاط تھا۔ اس نے اپنے فن کا کمال صطخر میں داریوش کے کتبے پر جو میخی خط میں کندہ ہے دکھایا ہے۔ شیرازی کی بہت سی فنی لطیفہ کی یادگاریں دنیا کے مختلف عجائب گھروں میں موجود ہیں۔ قاہرہ کے عجائب خانہ میں دو مربع شاہنلے جو ۱۳۹۳ھ سے متعلق ہیں موجود ہیں۔ ۱۳۳۵ھ سے متعلق شیرازی مصوری کے جو نمونے برلن کے عجائب گھر میں موجود ہیں وہ اس مکتب کی غیر معمولی کشش اور جاذبیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تہرانی کے عجائب خانوں، برٹش میوزیم اور اسے ڈی اسٹورا میوزیم میں بھی شیراز کے بہت سے آثار موجود ہیں۔

شیراز مسجدوں اور خانقاہوں کا شہر ہے۔ شیرازیوں کو کثیر تعداد میں مسجدیں موجود ہیں مگر چند مساجد کو بڑی تاریخی اہمیت حاصل ہے، جن کا یہاں تذکرہ کیا جاتا ہے :

’مسجد قتیق‘ یا جامعہ مسجد۔ تمام مساجد میں قدیم ترین مسجد ہے۔ آل صفار کے حکمران عمرو بن لیث صفاری نے اس کو ۲۹۲ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ ۱۳۵۱ھ میں تمام

امیر اسحاق بخونے اس کی توسیع کی اور ایک اور عمارت 'خدا خانہ' کے نام سے یہاں بنوائی۔ اس عمارت کو بطور کتب خانہ استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں قرآنی شریف اور سپارے رکھے جاتے تھے اس لئے اس عمارت کو بعض وقت 'بیت المصنف' بھی کہا جاتا تھا۔ یہ جمیع مسجد یا مسجد عتیق بڑی دلکش ہے۔ صحن کے چاروں نمازیوں کے لئے وسیع اور دور کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اس مسجد کی چھت سے شیراز کا منظر بڑا ہی خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ 'خدا خانہ' ایک چوکشہ عمارت ہے اس کے چاروں طرف چار مضبوط ستون ہیں۔ عمارت کے چاروں طرف تین تین مضبوط کمانیں بنی ہوئی ہیں۔

مسجد عتیق اور خدا خانہ کے نقش و نگار اور دیواروں پر کندہ عمارتیں اور آیات پڑھے ہی دیدہ زیب ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی کے مابینہ نار خطاط 'یحییٰ' نے ان چمکتے روشنی ٹائیلوں پر اپنی پوری فکھار ان صلاحیتیں صرف کر دی ہیں، اس طرح ان عمارتوں کے صحن اور خوبصورتی میں گویا چار چاند لگ گئے ہیں۔ ان عمارتوں میں استعمال شدہ ٹائیلز بھی بہت خوبصورت ہیں۔ یہ ٹائیلز چودھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان رنگین ٹائیلوں اور موزیک پر خطاطی کے فن کو صفویوں کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ مگر شیراز کی عمارتوں پر جو اس فن کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں انہیں صفویوں کے عہد کی ترقی کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔ 'خدا خانہ' اور مسجد کی تعمیر کا انداز اس عہد کے آتشکدوں کے انداز تعمیر سے ملتا ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ یہ عمارتیں کسی آتشکدہ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہوں گی یا کسی آتشکدہ ہی کو مسجد میں تبدیل کر دیا ہوگا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیراز میں فتح اسلام کے بعد بھی آتشکدے موجود تھے۔ دہلیوں کے عہد میں ان کی موجودگی کی واضح شہادتیں موجود ہیں۔ چنانچہ عضد الدولہ دہلی کے عہد میں شیراز میں دو آتشکدے موجود تھے۔ یہ واقعہ ۱۱۸۷ء کا ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس عہد سے تقریباً ایک صدی قبل یہاں ایک تیسرا آتشکدہ بھی موجود تھا، جسے سردیو لیت صفاری نے مسجد

میں تبدیل کر دیا۔ اس تاریخ پر پس منظر اور عمارت کی ساخت اور تزئین و آرائش میں ساسانی آتشکدوں کی جھلک اس مکان کو تقویت بخشی ہے۔

مسجد وکیل - کریم خان زند نے شیراز میں جو دلفریب عمارتیں بنوائیں ان میں ایک مسجد وکیل بھی ہے، یہ مسجد بڑی کشادہ اور وسیع ہے۔ اور بارہ ہزار مربع گز پر پھیلی ہوئی ہے۔ سردیوں کے موسم میں نمازیوں کے لئے بڑا وسیع ایوان بنایا گیا ہے، اسے شبستان کہتے ہیں۔ اس شبستان کی لمبائی سو گز اور چوڑائی ۵۰ گز ہے۔ شبستان کی چھت ۴۸ ستونوں پر قائم ہے اور ان پر حسین نقش و نگار بنائے گئے ہیں۔ مسجد کی دیواروں پر خوبصورت روشنی ٹائیلز لگے ہوئے ہیں۔ ان منقوش اور پتلموں ٹائیلوں کی بہار شمال اور جنوب دیوار پر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ مسجد وکیل کی حسین ترین اور تعجب خیز چیز اس کا منبر ہے۔ یہ منبر سنگ مرمر کے ایک ٹکڑے سے تراشا گیا ہے اس کی پیمائش ۲۰ × ۲۲ × ۲ فٹ ہے۔ سنگ مرمر کا یہ ٹکڑا مرمر سے لایا گیا تھا۔ دافع رہے کہ مرمر آذر بایجان کے علاقے میں ہے۔ مرمر سے شیراز تک یہ تقریباً ایک ہزار میل کی طویل مسافت طے کر کے یہاں لایا گیا تھا۔

مسجد نو - مسجد نو نہ صرف شیراز بلکہ سارے ایران کی حسین ترین مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ اس کی تعمیر کا پس منظر بڑا ہی رومانوی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سعد الدین زنگی فرمانروا شیراز نے یہ مسجد تعمیر کی تھی۔ زنگی کی ایک لڑکی بڑی ہی خوبصورت اور حسین تھی۔ لیکن طفولیت ہی سے وہ اکثر بیمار رہتی تھی۔ اپنی ادا اس طبیعت کو پہلانے کے لئے ننھی شہزادی باغ کی خوشبو پر چہل قدمی کیا کرتی تھی۔ اس کے باپ سعد الدین زنگی نے عہد کیا کہ اگر اس کی بیٹی صحتیاب ہو جائے تو وہ اس باغ کو ایک مسجد میں تبدیل کر دے گا۔ اس کی جو پیش پوری ہوئی اور شہزادی تندرست ہو گئی۔ چنانچہ سعد الدین زنگی نے اپنے عہد کے مطابق یہاں ایک خوبصورت مسجد تعمیر کر دی اور باغ کو مسجد کے صحن میں تبدیل کر دیا۔

جب وحشی منگولوں نے ایران پر قبضہ کیا تو اس خوبصورت شہزادی کو ہلاک و خان کے بیٹے منگو خان کی زوجیت میں دے دیا گیا۔ اس نیک دل خاتون کی توجہ سے شیراز میں بہت

سے باغ لگوائے گئے اور نئی عمارتیں بنوائی گئیں۔ مسجد نوشیروازی طرز کا ایک حسین اور نظر فریب امتزاج ہے۔

شیراز کے باشندے اپنی خوش وضعی اور خوش مزاجی کی بنا پر بہت مشہور ہیں۔ یہ لوگ فطری طور پر عبادت و ریاضت کی طرف میلان رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ اسی لئے شیراز میں کثرت سے مسجدیں اور خانقاہیں موجود ہیں۔ نہ صرف شیراز کے مزدہبی تقویٰ اور ورع میں شہرت تھی بلکہ دختران شیراز بھی اس میدان میں تھیں ان کی ہمدردی کا دعویٰ رکھتی تھیں۔ مشہور عالم سیاح ابن بطوطہ جب یہاں پہنچا تو یہاں کی عورتوں کی دنیا داری نے اس پر بڑا اثر کیا وہ لکھتا ہے۔

مازندگان شیراز اہل مصلح دین اور عفاف ہیں اور خاص کر عورتیں تو ان صفات سے زیادہ متصف ہیں۔ ان کا دستور یہ ہے کہ سب موزہ پہنتی ہیں۔ اور اسی طرح اوڑھ لپیٹ کر اور برقعہ اوڑھ کر باہر نکلتی ہیں کہ کوئی حصہ جسم کا دکھائی نہیں دیتا۔ صدقے اور اثبات میں بہت بڑھی چڑھی ہیں۔ ان کی ایک عجیب بات یہ ہے کہ سب جامع مسجد میں دو شنبہ پہنچی اور جمعہ کے دن وعظ سننے کے لئے جمع ہوتی ہیں۔ اکثر ان کا ہزار ہزار دو دو ہزار کا مجمع رہتا ہے۔ ہر عورت کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہوتا ہے جسے وہ سخت گرمی میں جھلکتی رہتی ہیں۔ میں نے اس قدر عورتوں کا مجمع کسی دوسرے شہر میں نہیں دیکھا۔ لے

اس شہر میں بہت سے بزرگ اور اہل اللہ رہتے تھے۔ جب ابن بطوطہ وہاں پہنچا تو محمد الدین اسماعیل بن محمد تداود بڑے بزرگ اور اپنے وقت کے 'قطب' تھے۔ اسی طرح شاہ چراغ لودہ دوسرے صوفیائے کرام شیراز کے آقدس کا باعث ہیں۔ شیراز کی خاک میں قطب وقت ابن خفیف مدفون ہیں۔ آپ کا مزار مبارک مرجع خلافت تھا اور ہے۔ ابن بطوطہ کے عہد میں یہاں ایک خانقاہ تھی جہاں لوگوں کو مفت لنگر تقیم ہوتا تھا۔



کے جہاز میں بیٹھ کر سو مالی لینڈ پہنچے۔ اور وہاں سے جدہ پہنچے۔ اس میں اتنی دیر ہو گئی کہ وہ مؤتمر اسلامی کے شرکار سے نہ مل سکے۔ ایک سال بعد ظفر حسن صاحب کی والدہ صاحبہ نے انہیں بامرارہ جہاز بلایا تاکہ وہ اُن سے دورانِ حج مل سکیں، تو وہ بھی بڑی مشکل سے جہاز پہنچ پائے تھے، کیونکہ راستے میں نہر سویز پڑتی تھی جو انگریزوں کے تسلط میں تھی۔

ظفر حسن صاحب نے سفرِ حجاز کے مصارف کی فراہمی کے سلسلے میں سردار محمد نادر خاں کو لکھا جو پیرس کی افغانی سفارت سے استعفا دے کر فرانس میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے۔ مصنف کی ان سے اردو میں خط و کتابت ہوتی رہی تھی۔ جنرل محمد نادر خاں کا مصنف کے نام ایک خط ملاحظہ ہو، جو اردو میں ہے۔

۳ مارچ ۱۹۲۵ء۔ پیارے بھائی ظفر۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے پاک ارادوں میں ظفر نصیب کرے۔ آپ کا خط مورخہ ۲۳ مارچ موصول ہوا جس کے مطالعے سے نہایت ممنون اور مسرور ہوں۔ خدائے کریم نے مجھ پر رحم فرما کر عمر دوبارہ نصیب کی ورنہ میں کہاں اور آپ کو مکتوب لکھنا کہاں۔ مگر جب تک قضا مقرر نہیں ہوئی، ساری آفات اور بلیات سے نجات (۹) اور جب قضا آئی تو کوئی اس کا علاج اور چارہ نہیں۔ ملاحظہ کیجئے تین اراکین سلطنت یورپ اور ایک جہا جہ ہندوستانی ارجبند محمد افضل کو ایک جیسی بیماری میں مبتلا ہو کر آپریشن کرانا پڑا۔ . . . . صدر اعظم جرمنی، لارڈ کرزن، لارڈ رابنسن سپہ سالار افواج ہند تینوں زیرِ خاک ہیں۔ اور ہمارے صادق بھائی افضل (مانتون) میں بحیرہ روم کے کنارے ہر جمع و شام ہواخوری کے مزے اڑا رہے ہیں۔ اور اکثر یہ میرے پاس آکر مجھ کو اپنی صحبت سے مسرور کرتے ہیں۔ . . . . الحمد للہ اب میری صحت بہت کچھ اچھی ہو گئی ہے۔ اور مرض قریباً ۲۵ دن سے رفع دفع ہو گیا ہے۔ خدا اس منحوس کا منہ پھر نہ دکھائے۔ . . . . آپ کا نہایت خوش نما فوٹو پہنچا۔ جسے دیکھ کر مجھ کو پیارا ظفر ٹھل کے میدان میں مع بندوق کے جو کاندھے میں ہمیشہ حامل رہتی تھی، نظر آتے ہیں۔ اور ان صحبتوں کو

بندھی ہوئی تھی۔ میں نے لوگوں سے اس کے متعلق دریافت کیا انہوں نے جواب دیا  
رات کے وقت کمان لئے جا رہا تھا ۵

فارس کے مرکزی مقام ہونے کی بنا پر اور کئی حکومتوں کا یکے بعد دیگرے دارالسلطنت  
ہونے کی وجہ سے شیراز تجارت کا زبردست مرکز بن گیا تھا۔ ایران کی بڑی بڑی  
شاہراہیں اس شہر سے ہو کر گزرتی تھیں۔ لہٰذا صوبے کے تمام بڑے بڑے شہروں کا  
سامان تجارت یہاں آتا تھا اور مشرقی ممالک کو جانے والے تمام تجارتی کارڈان یہاں ٹھہرتے تھے۔  
دہلیوں کے عہد میں شیراز کا مشہور بازار سوق الامیر، بڑا شاندار تھا۔ اس بازار میں خرید و  
فروخت کے لئے مختلف اشیاء کی دکانیں الگ الگ تھیں۔ ان دکانوں سے بیس ہزار دینار محصول  
کی سالانہ آمدنی تھی۔ شیراز کا دوسرا بڑا بازار بازار وکیل تھا، اس کی تعمیر کا سہرا کریم خاں سند کے سر  
ہے۔ اس کی لمبائی ۸۰۰ گز اور چوڑائی پچاس فٹ تھا۔ یہ بازار آج تک موجود ہے۔

شیراز کی میوہ منڈی بڑی شاندار تھی ماہین بطوطہ اس منڈی کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا تھا۔ یہ  
بازار مسجد عتیق کے شمالی دروازہ باب حسن کے سامنے واقع تھا۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ یہ بازار  
بڑا عجیب ہے۔ میں اسے دمشق کے باب البرید کے بازار پر ترجیح دوں گا۔ شیراز کی اس منڈی میں  
کثرت سے میوے فروخت کے لئے آتے تھے۔ یہ بازار کبھی بھی بچوں کی رنگینی اور جھک سے خالی نہ  
رہتے تھے (روقتہ الصفا جلد ۱ ص ۱۴۸)۔

شیراز نے ثقافتی میدان میں جو اہم کارنامے انجام دیے وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں  
ہیں خصوصاً ادبیات میں جو فضیلت شیراز کو حاصل ہے وہ کسی دوسرے شہر کو حاصل نہیں  
ہے، اس شہر میں شیخ سعدی پیدا ہوئے جنہیں کہ بیل شیراز کے لقب سے ملقب کیا جاتا ہے ان  
کی لازوال تصانیف گلستان و بوستان فارسی ادب میں ایک ناقابل فراموش باب ہیں۔

شاعری کے میدان میں حافظ شیرازی نے بھی بڑا بلند مقام حاصل کیا ہے ان کی غزلوں میں  
ہلاکی موسیقیت ہے۔ مناظر قدرت کی جو دلاویز عکاسی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ ان کے کلام  
میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ حافظ کی شاعری کی تمام خوبیاں اپنے دل کش پس منظر اور طمانیت  
سے بھرپور زندگی کی مہربان منت ہیں۔

اسلامی صحافت میں ایک خوشگوار اضافہ  
دارالعلوم کراچی کا دینی علمی اور اصلاحی ماہنامہ

# البلاغ کراچی

سرپرست :- حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان

مستقل عنوانات کی ایک جملہ

- — معارف القرآن حضرت مفتی محمد شفیع صاحب
- — درگاہ رسالت مولانا سلیم اللہ صاحب
- — ہلالی دنیا احمد عبداللہ مسدوسی
- — تراشے محمد تقی عثمانی
- — دل کی دنیا حضرت مفتی محمد شفیع صاحب
- — کل کے معمار دینی مدارس کے طلباء
- — جہان نو جدید معلومات

○ — مفید اور اصلاحی مضامین

○ — تحقیقی مقالے

○ — عالم اسلام کے حالات

○ — علمی لطائف

○ — دلچسپ معلومات

○ — پر مغز اداریے

ہر مسلمان کے لئے ایک دلکش پیغام

فی پرچہ ۵۰ پیسے سالانہ چھ روپے ضخامت ۶۴ صفحات سائز ۲۰×۳۰

پتہ :- ماہنامہ البلاغ دارالعلوم کراچی ۱۴

نوٹ :- ہندوستانی خریدار مولانا ظہیر الحسن صاحب خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ضلع مظفر نگر سے جمع کریں۔  
(مجموعہ ۱۳۸۶ء کا پرچہ شائع ہو گیا ہے ۵۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر نمونہ کا پرچہ منگوالیں)

# تلخیص و تبصرہ

مولانا سندھی کے ساتھی ظفر حسن صاحب  
کی

آپ بیتی کا دوسرا حصہ

(۲)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں ۱۔

۷ ایک روز ہمیں یونیورسٹی میں پڑھایا گیا کہ ذاتی ملکیت کو جو مذہب بھی جائز سمجھے، وہ قدامت پسندی ہے کیونکہ وہ غریبوں کو ملداروں کا غلام بناتا ہے اور اس کو استعمار یعنی EXPLIOTATION کہتا ہے۔ اس لئے ایسے مذہب کا قلع قمع ہونا چاہیئے۔

ایک ہندو طالب علم بینزی بھی ظفر حسن صاحب کا ہم جماعت تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہندومت میں تو ذاتی ملکیت کھلم کھلا موجود ہے، اس سے وہ ہندو کھسیانا سا ہو گیا۔ لیکن اُس نے مجھ سے پوچھا۔ کیا اسلام ذاتی ملکیت کی اجازت دیتا ہے میں نے کہا۔ ہاں۔ اس پر بینزی بڑے اطمینان سے بولا۔ پھر تو ہم کو ہندوستان سے ہندو ازم کے ساتھ اسلام کو بھی مٹانا ہو گا۔

ظفر حسن صاحب کے دل میں اس سے اسلام کے بارے شبہ پیدا ہوا، اور شام کو جب وہ مولانا کے پاس آئے تو اس کے متعلق دریافت کیا۔ مولانا کا جواب سب ذیل تھا۔

”قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے - لَإِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنْ الْمُؤْمِنِينَ  
أَنفُسَهُمْ بِأَنَّهُمْ لَهَا الْجَنَّةَ - یعنی اللہ نے مؤمنین کے مال کو اور ان  
کی جانوں کو ان سے جنت کے بدلے خرید لیا ہے۔ اس سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ ضرورت  
کے وقت مسلمانوں کو اپنی جانوں اور ذاتی مال سے دست بردار ہونا پڑ سکتا ہے۔ او  
ان کو خداوند کریم آخرت میں اس کے عوض جنت دے گا۔ یعنی اسلام میں ذاتی ملکیت  
اصول ضرورت کے وقت اٹھایا جاسکتا ہے۔“

ظفر حسن صاحب لکھتے ہیں - قبلہ مولانا صاحب کی اس تفسیر سے مجھے بہت اطمینان  
ہوا۔ اور میرا اسلام پر ایمان اور بھی زیادہ مضبوط ہو گیا۔

یہ سوال کہ تمام مذاہب میں زمین کا کسانوں کی ذاتی ملکیت ہونا لازمی ہے ایک روز  
زیر بحث آیا اور اس کی بنا پر ظفر حسن صاحب کے پروفیسر نے کہا کہ تمام مذاہب رجعت پسند  
ہیں، لہذا سقوہ ہستی سے مٹائے جانے کے لائق ہیں۔ شام کو جب مصنف مولانا کے پاس گئے  
تو ان سے یہی سوال پوچھا۔ مولانا نے فرمایا کہ اسلام میں ایسا نہیں۔ اور اس کے ثبوت میں  
حضرت عمرؓ کا وہ فیصلہ بیان کیا جس میں آپ نے ایران کی مفتوحہ زمینوں کو عرب فاتحین  
کی ذاتی ملکیت قرار دینے کے بجائے بیت امال کی ملکیت قرار دیا تھا۔ اس پر  
مصنف لکھتے ہیں :-

”میں نے اگلے روز یونیورسٹی میں حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کا اور اس  
اسلامی قانون کا ذکر اپنے پروفیسر سے کیا۔ اس پر وہ بہت اچھے میں پڑا  
اور کہنے لگا۔ اگر کوئی شخص ہم کو اسلام کے یہ احکام پہلے بتاتا تو نہایت کام بہت  
آسان ہو جاتا اور ہم کساڈل کو اپنی انقلابی صفوں میں بڑی آسانی سے داخل  
کر لیتے اور ہماری حکومت ان کی مخالفت سے بچی رہتی“

ما سکو میں مولانا کی روسی وزیر خارجہ پیرن سے تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ان پر  
ظفر حسن صاحب بھی بطور ترجمان ساتھ تھے۔ مولانا نے وزیر مذکور کے سامنے یہ تجویز پیش

# شاہ ولی اللہ اکیڈمی

## اغراض و مقاصد

۱۔ شاہ ولی اللہ کی تصنیفات اُن کی اصلی زبانوں میں اور اُن کے تراجم مختلف زبانوں میں شائع کرنا۔  
۲۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات اور اُن کے فلسفہ و حکمت کے مختلف پہلوؤں پر عام فہم کتابیں لکھانا اور اُن کی طباعت و اشاعت کا انتظام کرنا۔

۳۔ اسلامی علوم اور بالخصوص وہ اسلامی علوم جن کا شاہ ولی اللہ اور اُن کے محکمہ فکر سے تعلق ہے، اُن پر جو کتابیں دستیاب ہو سکتی ہیں، انہیں جمع کرنا، تاکہ شاہ صاحب اور اُن کی فکری و اجتماعی تحریک پر کام کرنے کے لئے اکیڈمی ایک علمی مرکز بن سکے۔

۴۔ تحریک ولی اللہی سے منسلک مشہور اصحاب علم کی تصنیفات شائع کرنا، اور اُن پر دوسرے اہل قلم سے کتابیں لکھوانا اور اُن کی اشاعت کا انتظام کرنا۔

۵۔ شاہ ولی اللہ اور اُن کے محکمہ فکر کی تصنیفات پر تحقیقی کام کرنے کے لئے علمی مرکز قائم کرنا۔  
۶۔ حکمت ولی اللہی اور اُس کے اصول و مقاصد کی نشر و اشاعت کے لئے مختلف زبانوں میں رسائل کا جرنل۔  
۷۔ شاہ ولی اللہ کے فلسفہ و حکمت کی نشر و اشاعت اور اُن کے سامنے جو مقاصد تھے، انہیں فروغ دینے کو غرض سے ایسے موضوعات پر جن سے شاہ ولی اللہ کا خصوصی تعلق ہے، دوسرے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنا۔



# شاہ ولی اللہ کی تعلیم!

از پروفیسر غلام رحیم بلبانی سندھ یونیورسٹی  
پروفیسر بلبانی (پ) اے صد شعبہ عربی سندھ یونیورسٹی کے برسوں کے مطالعہ و تحقیق کا حاصل یہ کہ:  
اس میں مصنف نے حضرت شاہ ولی اللہ کی پوری تعلیم کا احصاء کیا ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں پر  
بجائیں کی ہیں قیمت ۵۰ روپے ہے۔

## المسومین اجارۃ الموطا

تالیف ..... الامام ولی اللہ الدہلوی

شاہ ولی اللہ کی روش و کتاب آج سے ۲۲ سال پہلے مذکور قریں مولانا حمید اللہ مندی مرحوم کے زیر اہتمام چھپائی گئی تھی جس میں جگہ جگہ  
نے تشریحی حاشیے ہیں شروع میں حضرت شاہ صاحب کے حالات زندگی اور الموطا کی فارسی شرح مصنف پر آپ نے جو سہ ماہی مقدمہ لکھا تھا اس کا  
بہ شاہ صاحب کے مکتوبی میں الموطا امام مالک کے کتب سے ترقیب دیا ہے امام مالک کے وہ اقوال ہیں وہ باقی مکتوبین کے صفحہ ۱۰۰  
دینے گئے ہیں الموطا کے بواجے متعلق قرآن مجید کی آیات کا اضافہ کیا گیا ہے اور تقریباً ہر ایک آیت میں شاہ صاحب نے اپنی طرف سے تفسیر  
میں شامل کر دی ہے۔  
دو ایڈیشن کی قیمتیں ۵۰ روپے ہیں

## ہمعات

(فارسی)

تصوف کی حقیقت اور اس کا فلسفہ "ہمعات" کا موضوع ہے۔  
اس میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تاریخ تصوف کے ارتقاء پر بحث فرمائی ہے بغیر اپنا  
تربیت و تزکیہ سے جن ملبثہ و منازل پر فائز ہوتا ہے اس میں اس کا بھی بیان ہے۔  
قیمت دو روپے

(۴) اس وقت تک کہ شریف دارِ شرک تھا۔

(۵) حضرت صدیق کا ایسا کرنا نہ تو مغالطہ تھی، نہ شرط اور نہ جوابداری تھی۔ بلکہ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ روم فارس پر غلبہ پائے گا۔ اس لئے حضرت صدیقؓ کا عمل نہ تو جوابداری قرار پا سکتا ہے اور نہ قمار۔

نبیؐ محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکنا سے اس شرط پر گشتی طوی تھی کہ اگر میں نے تم کو پچھاڑا تو تمہاری بکریوں کی ایک تہائی میری ہو جائیں گی۔ چنانچہ آپؐ نے تین مرتبہ رکنا نہ کو پچھاڑ کر اس کی تمام بکریاں جیت لیں۔ لیکن شرافتِ نفس کا ثبوت دیتے ہوئے آپؐ نے اس کی تمام بکریاں اسے واپس کر دیں۔ رکنا اس وقت تک کافر تھا۔ نہ تو اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لڑائی تھی، اور نہ اسلام سے جنگ۔

نبیؐ محترم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کسی مسلمان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا تھا کہ وہ کسی کے مال کو بُری بگاہ سے دیکھے، بلکہ کافر اور مسلمان دونوں کے مال کی عصمت اور حفاظت برابر تھی۔ جس طرح ایک مسلمان کے مال کی حفاظت ہو کر تھی اسی طرح کافر کے مال کی نگہبانی ہوتی تھی۔

(۷) غزوہٴ اُحد کے موقعہ پر کسی مشرک مقتول کی نش خندق میں گر پڑی، اس کے حاصل کرنے کے لئے ایک معتبرہ رقم فدیہ پیش کی گئی۔ حضور محترم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اس رقم کے لینے سے منع فرمایا اور نعش بلا فدیہ ورثہ کے حوالہ کر دی۔ اہل عراق کا یہ مقولہ کہ ”کفار کا خون اور مال ہمارے لئے حلال ہے“ اسلام سے روگردانی نہیں بلکہ یہ ایک قسم کا سیاسی جملہ ہے جو جاننا زانِ اسلام کو رغبت دلانے کے لئے مرکزِ جنگ کے موقعہ پر بولا جاتا ہے۔ اس کے فائدے کا احساس صرف زمانہٴ جنگ ہی میں کیا جاسکتا ہے۔

حضرت امام مالکؒ سے پوچھا گیا کہ کیا دارالحرب میں مسلمان اور غیر مسلم حربی کے درمیان رہا اور سود جائز ہے؟ آپؒ نے فرمایا ”کیا تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ ہے؟“ سائل نے کہا ”نہیں“ امام مالکؒ نے فرمایا ”پھر تو کوئی حرج نہیں ہے“ (کتاب مروۃ جلد ۳ ص ۲۸۱) اور اگر معاہدہ ہو گیا تو ایسی صورت میں جنگ باقی نہیں رہے گی اور



میر اسحاق انجونسے اس کی توسیع کی اور ایک اور عمارت 'خدا خانہ' کے نام سے یہاں بنوا  
اس عمارت کو بطور کتب خانہ استعمال کیا جاتا تھا اور یہاں قرآن شریف اور سپارے رکھے  
جاتے تھے اس لئے اس عمارت کو بعض وقت 'بیت المصنف' بھی کہا جاتا تھا بلکہ  
جمعہ مسجد یا مسجد عتیق بڑی دلکش ہے۔ صحن کے چاروں نمازیوں کے لئے وسیع ایوان  
اور کمرے بنے ہوئے ہیں۔ اس مسجد کی چھت سے شیراز کا منظر بڑا ہی خوبصورت دکھائی دیتا  
ہے۔ 'خدا خانہ' ایک چوگوشہ عمارت ہے اس کے چاروں طرف چار مضبوط ستون ہیں۔  
عمارت کے چاروں طرف تین تین مضبوط کمانیں بنی ہوئی ہیں۔

مسجد عتیق اور خدا خانہ کے نقش و نگار اور دیواروں پر کندہ عمارتیں اور آیات  
پڑے ہی دیدہ زیب ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی کے مایہ ناز خطاط 'یحییٰ' نے ان  
چمکتے روشنی ٹائیلوں پر اپنی پوری فنکارانہ صلاحیتیں صرف کر دی ہیں، اس طرح ان عمارتوں  
کے صحن اور خوبصورتی میں گویا چار چاند لگ گئے ہیں۔ ان عمارتوں میں استعمال شدہ ٹائیلز  
بھی بہت خوبصورت ہیں۔ یہ ٹائیلز چودھویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان رنگین ٹائیلوں  
اور موزیک پر خطاطی کے فن کو صفویوں کے عہد میں بڑی ترقی ہوئی۔ مگر شیراز کی عمارتوں پر  
جو اس فن کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں انہیں صفویوں کے عہد کی ترقی کا پیش رو کہا جاسکتا ہے۔  
'خدا خانہ' اور مسجد کی تعمیر کا انداز اس عہد کے آتشکدوں کے انداز تعمیر سے ملتا ہے۔ یہ  
بات قرین قیاس ہے کہ یہ عمارتیں کسی آتشکدہ کی بنیاد پر تعمیر کی گئی ہوں گی یا کسی آتشکدہ  
ہی کو مسجد میں تبدیل کر دیا ہوگا۔ تاریخ کی مدق گردانی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ  
شیراز میں فتح اسلام کے بعد بھی آتشکدے موجود تھے۔ دہلیوں کے عہد میں ان کی موجودگی  
کی واضح شہادتیں موجود ہیں۔ چنانچہ عضد الدولہ دہلی کے عہد میں شیراز میں دو آتشکدے  
موجود تھے۔ یہ واقعہ ۱۱۹۲ء کا ہے۔ یہ بات قرین قیاس ہے کہ اس عہد سے تقریباً ایک  
صدی قبل یہاں ایک تیسرا آتشکدہ بھی موجود تھا، جسے عمرو بن لیث صفاری نے مسجد

کے علماء سے فقہ مالکی اور علوم لغت، ادب، نحو اور صرف اور علوم دین تفسیر، حدیث اور کلام پڑھے۔ وہ اُس وقت تک ابن حلقہ ہائے درس میں بیٹھے، جب تک کہ وہ ان سب علوم میں ماہر نہیں ہوئے۔ بعد ازاں تصوف نے انہیں کھینچا۔ اور وہ صوفی کی محبت میں بیٹھے۔ سب سے پہلے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، انہوں نے ابو عبد اللہ محمد بن حازم کے ہاتھ سے فرقہ پہنا۔

یہ فضا تھی جس کے اطراف و اکناف میں ایک طرف ابن رشد، ابن طفیل اور ابن عربی جیسے فلسفیوں کے افکار و آراء گونج رہے تھے۔ اور دوسری طرف اس کی وسعتوں میں قطب وغوث ابودین، ابو عبد اللہ بن حازم اور ابوسعید الباجی جیسے صوفیہ کی روحانیت موجزن تھی، اس فضا میں جہاں علم اور فکری آزادی کی قوتیں رجحیت اور سُنی سخت گیری کی قوتوں سے نبرد آزما تھیں۔ ابوالحسن شاذلی کی شروع میں نشوونما ہوئی اور انہوں نے ابتدائی علوم حاصل کئے۔ لیکن جیسے ہی وہ جوانی کو پہنچے، انہوں نے محسوس کیا کہ اُن کی تشنگی دور نہیں ہوئی اور علم اور معرفت کی ان کو جو پیاس تھی وہ نہیں بجھی۔ چنانچہ انہوں نے مشرق کی سیاحت کا قصد کیا تاکہ پہلے تو وہ فریضہ حج ادا کریں اور مدینہ طیبہ اور روضہ نبوی کی زیارت کریں، پھر مشرق کے شیوخ سے تکمیل علوم کریں۔

ہم معین طور پر نہیں جانتے کہ شیخ شاذلی نے مشرق کی طرف اپنا پہلا سفر کب کیا لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ اس کی ابتدا ۷۵۱ھ کے قریب ہوئی، جب کہ ان کی عرصہ بائیس سال کی تھی، کیونکہ اس کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ہم سنتے ہیں کہ وہ اپنے شیخ ابوالفتح واسطی سے عراق میں ۷۶۸ھ میں ملے۔

شیخ شاذلی نے اپنی اس سیاحت کی ابتدا یوں کی۔ سب سے پہلے وہ اسکندریہ پہنچے اور مصر سے گزر کر حجاز میں داخل ہوئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ پھر وہ فلسطین، شام اور عراق گئے۔ وہ جس شہر میں جاتے وہاں کے علماء اور فقہار کی خدمت میں پہنچتے ان سے اخذِ علم کرتے اور ان کے حلقے میں بیٹھ کر سماعت کرتے۔ اس سلسلے میں وہ

جب مولانا امین الدین صاحب بانی مدرسہ امینیہ ۱۹۲۸ء مطابق ۱۳۴۸ء میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے تو حضرت مفتی صاحب اس مدرسے کے مہتمم و منظم ہوئے۔ یہ تنظیم مدارس عربی مدارس کی تنظیم کی جائے اور اس کے انتظامی قواعد و نصاب یکساں ہوں۔ اور داخلے کے لئے بھی تمام مدارس میں مشترکہ قواعد کا نفاذ ہو۔

اس مقصد کے لئے دہلی آنے کے دوسرے سال یعنی ۱۹۲۹ء مطابق ۱۳۴۹ء میں مدرسہ امینیہ کے سالانہ جلسہ میں آپ نے اتحاد اور تنظیم مدارس پر نہایت عمدہ تقریر کی۔ آخر کار آپ کی ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو پاکستان کے سب سے بڑے مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے منتظمین نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ دوسرے مدارس کے طلباء کو اس وقت تک داخل نہیں کریں گے جب تک کہ وہ اپنی نیک چلنی کی سند نہ پیش کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دارالعلوم کے منتظمین اس پر بھی رضامند ہو گئے تھے کہ وہ مدرسہ امینیہ کے فارغ التحصیل طلبہ کی اپنے جلسے میں دستار بندی کریں۔

چنانچہ ۱۹۱۰ء میں مدرسہ امینیہ کے دس فارغ التحصیل طلبہ کو دعوت دے کر دیوبند کے سالانہ جلسے میں بلایا گیا اور تمام مجمع کے سامنے دستار بندی کی گئی۔ ان دس علماء میں مولانا حافظ سید محمد حسین شاہ (فرزند ارجمند پیر جماعت علی شاہ صاحب) اور مولانا حافظ سید محمد حسین صاحب (موجودہ مفتی دارالعلوم دیوبند) بھی شامل تھے۔

۱۹۱۳ء میں جب جنگِ بلقان ہو رہی تھی حضرت مفتی صاحب نے جنگ کے مسلمان مجروحین کی امداد کے لئے چندہ جمع کیا۔ جس کی کل میزان ۳۸۹۴ روپے اور نوپائی تھی۔

۱۹۱۵ء کے بعد جبکہ انگریزوں نے جنگِ عظیم میں حضرت جمعیۃ علمائے ہند کی تحریک

شیخ الہند مولانا عمود الحسن دیوبندی کو گرفتار کر کے ملا

۱۔ مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی "از مولانا حفیظ الرحمن صاحب و اصحف فرزند اکبر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب مرحوم۔ مطبوعہ دہلی ص ۳۷-۵۷۔